عظیم کتب سیریز 6

زوالِ مغرب

(جلد دوم)

تصنیف: اوسوالڈ سپینگلر

ترجمہ: ڈاکٹر مظفر حسن ملک

نیشنل بک فاؤنڈیشن

زوالِ مغرب (جلد دوم) تصنیف: اوسوالڈ سپینگلر ترجمہ: ڈاکٹر مظفر حسن ملک

THE GREAT BOOKS SERIES 6

THE DECLINE OF THE WEST (Vol. II)

By: Oswald Spengler

Translated by

Dr. Muzaffar Hassan Malik

زوالِ مغرب میں سپینگلر نے مصریوں کی تہذیب کے زوال سے لے کر دورِ جدید تک کا جائزہ لیا ہے اور ان کے زوال کے اسباب بیان کیے ہیں۔ اگرچہ وہ اپنی یورپی تہذیب کو منفرد اور ممتاز قرار دیتا ہے لیکن اس کے انجام سے بھی لرزاں نظر آتا ہے۔ استدلال و براہین کی بجائے وہ اپنے تجزیات کی بنیاد امثال و اعیان پر رکھتا ہے۔ اس کے لیے تاریخ سے پیکر تراشی کرتا ہوا وہ فکر و فلسفہ کے میدان میں جا نکلتا ہے۔

یورپی تہذیب کو سپینگلر یونان اور روما کی باقیات قرار دیتا ہے یا پھر اس کے نزدیک اس تہذیب کو ہم اپالو کی تہذیب کہہ سکتے ہیں۔ وہ اسے مکان پر حاوی تہذیب سمجھتا ہے، اسے ممتاز لیکن تباہ کن ہتھیاروں کی تہذیب کہتا ہے اور اس کی بنیاد صنعتی قوت کو قرار دیتا ہے۔

اپنے استدلال میں سپینگلر اگرچہ گوئٹے سے متاثر ہے اور معاصر کو "فاؤسٹ کی تہذیب" کا نام دیتا ہے لیکن وہ اپنے فکر کو نطشے سے بھی مستعار لیتا ہے۔ اپنے استدلال کی بنیاد وہ حیاتیاتی اور کائناتی مظاہر پر رکھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ تہذیب ہزار برس کی گردش ضرور مکمل کرے گی۔ اس کا دورِ عروج نشاۃ ثانیہ میں تھا اور اس کا عہدِ خزاں کا دور ہے جو اپنے موسم سرما کے انجام کو بس پہنچنے ہی والی ہے۔

Price Rs. 290/-

زوالِ مغرب
(جلد دوم)
تصنیف: اوسوالڈ سپینگلر

عظیم کتب سیریز ⑥

زوالِ مغرب

(جلد دوم)

مغربی افکار اور تہذیب کے بعض کمزور اور کھوکھلے پہلوؤں پر
ایک اہم علمی تنقید جو شہرۂ آفاق کتاب ٹھہری

تصنیف

اوسوالڈ سپینگلر

ترجمہ

ڈاکٹر مظفر حسن ملک

ادارۂ فروغِ قومی زبان
اسلام آباد

نیشنل بک فاؤنڈیشن
اسلام آباد

نگران : ڈاکٹر انعام الحق جاوید
ترجمہ : ڈاکٹر مظفر حسن ملک
فنی تدوین : ڈاکٹر عطش دُرّانی

اشاعت : مارچ، 2017ء
تعداد : 1000
کوڈ نمبر : GNU-627
آئی ایس بی این : 978-969-37-1002-1
طابع : ملٹی کلر، اسلام آباد
قیمت : -/290 روپے

نیشنل بک فاؤنڈیشن کی مطبوعات کے بارے میں مزید معلومات کے لیے رابطہ:
ویب سائٹ: http/www.nbf.org.pk یا فون: +92-51-9261125
یا ای میل: books@nbf.org.pk

فہرست مضامین جلد دوم

پیش لفظ	ڈاکٹر انعام الحق جاوید	11
دیباچہ	افتخار عارف	13
اوسوالڈ سپینگلر اور زوالِ مغرب	ڈاکٹر عطش دُرّانی	15
گزارش	ڈاکٹر مظہر حسن ملک	17

باب اول: ابتداء اور فطری مناظر 27
(ا) کائنات اور کائنات صغیر 27
نباتات اور حیوانات
تکوین اور تکوین بیدار
احساس، ادراک، فکر
مسئلہ حرکت
کیت۔ روح

باب دوم: ابتداء اور فطری مناظر 46
(ب) اعلیٰ ثقافتوں کا طبقہ 46
تاریخی صورت اور فطری صورت
انسانی اور عالمی تصویر
بنی نوع انسان بلا تاریخ

باب سوم: ابتداء اور فطری مناظر 76
(ج) ثقافتوں کے مابین روابط 76

اثرات
رومی قانون
مجوسی قانون
مغربی قانون

باب چہارم: شہر اور باشندے (نسلیں ۔ اقوام) 107
(ا) روحِ مدنیت 107

مائی سینیا اور کریٹ
کسان
تاریخ عالم شہری تاریخ ہے۔
شہری شکل و صورت
شہر اور ذہانت
عالمی شہر کی روح
عقم اور انتشار

باب پنجم: شہر اور باشندے (نسلیں ۔ اقوام) 133
(ب) باشندے، نسلیں اور زبانیں 133

تکوین کے دھارے اور تکوین بیدار کا اتصال
اظہار کی زبان اور ابلاغ کی زبان
ٹوٹم اور امتناعات
کلام اور گفتار
گھر بطور نسلی اظہار
قلعے اور معابد
نسل
خون اور زمین
کلام
ذرائع اور مطالب
الفاظ ۔ قواعد
زبان کی تاریخ

رسم الخط
ثقافتی زبان کی شکلیات

باب ششم: شہر اور باشندے (نسلیں ۔ اقوام) 178
ابتدائی ثقافتوں کے باشندے ۔ فلاحین 178

باشندوں کے نام ۔ زبانیں ۔ نسلیں
نقل مکانی
باشندے اور روح
فارس کے لوگ
انسانوں کی اشکال
انسان اور اقوام
کلاسیکی عرب اور مغربی اقوام

باب ہفتم: عرب ثقافت کے مسائل 207
(ب) نیم تاریخی اشکال (روایات) یا تاریخی قلب ماہیت 207

نیم تاریخی واقعات

ا یکٹیشم
روس
عرب فتوحات
عرب تاریخی جدول، ہمعصری
یہودی، کلدانی، فارسی، قبل ثقافت
ملحدین اور عیسائی مسلک کے گرجے

باب ہشتم: عرب ثقافت کے مسائل 246
(ج) مجوسی روح 246

عالمی عمق کی ثنویت
زمانی احساس (تقویم، تاریخ عالم، مہلت)

اجماع
بنیادی کلام ۔ قرآن
خفیہ قانون (تورہ) تفسیر
مجوسی مذاہب کا گروہ
عیسائیت کے اختلافات
تکوین بطور استدام (مشن)

باب نہم: عرب ثقافت کے مسائل 274
(د) نیشا غورث، محمد ﷺ، کرام ویل 274

مذہب کی روح
اساطیر اور مسلک
اخلاق اور قیام
تاریخ مذہب کی شکلیات
قبل از ثقافت ۔ صاف دل روسی
مصری ۔ قدیم دور
کلاسیکی
چینی
روسی (مریم اور شیطان ۔ اصطباغ ۔ اور دستور)
اصلاح
سائنس
معقولیت
ثانوی مذہبیت
روسی اور چینی شہنشاہتیں

باب دہم: ریاست 335
(ا) جاگیر، شرفا اور پجاریوں کے مسائل 335

مرد اور عورت
سرمایہ اور جاگیر
کسان اور معاشرہ

جاگیر، ذات، پیشہ
شرفا اور پجاری بطور علامت
زمان اور مکان
تربیت اور اخلاق ۔ رواج پر مبنی اخلاق، اور فلسفہ اخلاق
جائیداد، اختیارات اور مال غنیمت
پجاری اور عالم متجر
معاشیات اور سائنس
زر اور فلسفہ
جاگیرداروں کی تاریخ ۔ قدیم دور
تیسری ریاست ۔ شہر، آزادی اور بورژوا

باب یازدہم: ریاست 369
(ب) ریاست اور تاریخ 369

حرکت اور شئے متحرکہ ۔ تکوین اور اس کی صورت
حق اور قوت
جاگیردار اور ریاست
جاگیردارانہ ریاست
جاگیرداری سے جاگیردارانہ ریاست تک
شہری ریاستیں اور خاندان
ریاست حاکم کل
خودمختار اور مطلق العنان
والیشٹین
سیاست کابینہ
ایک مطلق العنان کے بعد دوسرا مسق العنان حاکم
بورژوائی انقلاب زر
دستور
نپولین ازم سے زاریت تک (دستوری عہد)
عظیم جنگیں
روسی عہد
خلافت سے سلطنت تک

مصر
کسان
زار ازم (زاریت)

باب دوازدہم: ریاست 443
(ج) فلسفہ سیاسیات 443

زندگی ہی سیاست ہے
سیاسی جبلت
روایت کی تشکیل
قیاس (سفارتی) نبض
جاگیر اور پارٹی (معاشرہ)
بورژوا اور ابتدائی معاشرہ (آزادی)
پارٹی کی وساطت سے جاگیر سے لے کر تائید عوام تک
دانش مند اور زر (جمہوریت)
صحافت
جمہوریت بذریعہ زر کی خودکشی

باب سیزدہم: معاشی حیات کی عالمی ہیئت 471
(ا) زر

قومی معاشیات
زندگی کے معاشی اور سیاسی تصورات
پیداواری اور حاصلی معاشیات (زراعت اور تجارت)
سیاست اور تجارت (اختیار اور ناجائز استعمال)
ابتدائی معیشت اور ارفع ثقافتوں کا اسلوب معاشیات
جاگیر اور معاشی طبقہ
غیر شہری زمین۔ اشیا کی پیداوار کے نظریات و فکر
شہر۔ زر کے متعلق فکر
عالمی معاشیات۔ اشیا اور زر کی منتقلی
زر کے متعلق کلاسیکی نظریات، سکے

غلام بطور سرمایہ
نظام زر میں فاؤستی فکر۔ حصص کی قیمت۔ دہرے اندراج کا کھاتہ
مغرب میں سکوں کا نظام
زر اور محنت
سرمایہ داری
معاشی تنظیم
فکر زر کی توسیع۔ دائیو تلیلی۔ روسی معاشی فکر

باب چہار دہم: معاشی حیات کی عالمی ہیئت 498
(ب) مشین 498

تکنیکی روح
قدیم تکنیک اور اعلیٰ ثقافتوں کا اسلوب
کلاسیکی تکنیک
فطرت کی تسخیر کا عزم، موجد
ایجادات نو کا نشہ
انسان مشینوں کا غلام
سرمایہ کار، محنت، مشین کار
زر اور صنعت کے مابین کشمکش
زر اور سیاست کی آخری جنگ
خون کا کارخانہ

پیش لفظ

نیشنل بک فاؤنڈیشن کی طرف سے پاکستان میں فروغِ مطالعہ وکتب بینی کے لیے جو اقدامات کیے جا رہے ہیں، منتخب، مقبول، بنیادی، ضروری اور سستی کتابوں کی اشاعت اس کا ایک حصہ ہے۔ شعروادب اور علوم وفنون کی دنیاؤں سے عمدہ انتخاب کر کے کتابوں کی اشاعت کو عام آدمی کی قوتِ خرید اور رسائی تک لے کر جانا اِس ادارے کا بنیادی فریضہ ہے۔

اس ضمن میں کتابوں کی اشاعت کے لیے بہت سے سلسلے جاری کیے گئے۔ مقبولِ عام بنیادی اور عظیم علمی کتابوں کا یہ سلسلہ بھی اسی کی کڑی ہے۔

کافی عرصہ قبل ادارۂ فروغِ قومی زبان (مقتدرہ قومی زبان) اسلام آباد نے عظیم کتب کی اشاعت کا ایک منصوبہ بنایا تھا جس میں سے پچاس کے قریب اہم کتابیں شائع ہوئیں۔ بڑے عرصے سے ان میں سے بعض مطلوب کتابیں دستیاب نہیں تھیں۔ اب نیشنل بک فاؤنڈیشن اور ادارۂ فروغِ قومی زبان کے ''قومی تاریخ وادبی ورثہ ڈویژن'' کے ماتحت آنے کے بعد وزیراعظم پاکستان کے مشیر جناب عرفان صدیقی کی تحریک پر نئی منصوبہ بندی کے تحت ادارۂ فروغِ قومی زبان کے ساتھ ایک معاہدے کے بعد ان کتابوں کو فروغِ مطالعہ کے ضمن میں نیشنل بک فاؤنڈیشن کی طرف سے شائع کیا جا رہا ہے۔ کتابت کی عکسی نقل اور سائز کو برقرار رکھا گیا ہے، البتہ پیش کش ذرا انداز بدل کر کی جا رہی ہے۔

تاریخی تجزیے پر مبنی پہلی بار مغربی معاشرے کو علمی سطح پر تنقید کا نشانہ بنانے والی یہ کتاب بہت جلد مقبولِ عام ٹھہری اور اسے تہذیبی اور ثقافتی تاریخ کے مطالعے میں اہمیت دی جانے لگی۔ اُردو ترجمہ گجرات کے معروف ادیب، محقق اور مترجم ڈاکٹر مظفر حسن ملک نے کیا اور اس کے مطالب کو بیان کرنے میں کامیاب ہوئے۔

مئی 1998ء کے ایڈیشن میں شائع شدہ جناب افتخار عارف کا دیباچہ اور ڈاکٹر عطش دُرّانی کی تقدیم کو بھی شاملِ اشاعت ہی رکھا گیا ہے۔ کتاب پیپر بیک میں شائع کی جا رہی ہے تاکہ یہ قارئین کے ذوقِ مطالعہ اور بک شیلف کا حصہ بننے کے لیے کم سے کم قیمت میں دستیاب ہو سکے۔

ڈاکٹر انعام الحق جاوید
(پرائڈ آف پرفارمینس)
مینیجنگ ڈائریکٹر

دیباچہ

تاریخ شاہد ہے کہ تہذیب و تمدن انسانی کے ارتقاء میں دیگر عناصر کے ساتھ ساتھ انسانی دانش و بینش کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ دانش انسانی نے فہم و ادراک کی حدود مقرر کی ہیں، علوم و فنون کو نئے زاویے عطا کیے ہیں اور فضیلت کے ان عظیم الشان کارناموں کو چند ایسی کتابوں کی صورت میں یادگار بھی چھوڑا ہے جو ان علمی فتوحات کے سبب خود بھی بڑی کتابوں میں شمار ہوتی ہیں۔ ان گراں مایہ آثار نے اپنے زمانے میں بھی اور اپنے بعد آنے والے زمانوں میں بھی ذہن انسانی کے ارتقاء میں جو کردار ادا کیا ہے صاحبان علم اس سے بخوبی واقف ہیں۔ ہر چند کہ یہ کتابیں مختلف اقوام کا سرمایہ اور ورثہ ہیں اور مختلف زبانوں میں معرض وجود میں آئی تھیں لیکن اپنی اہمیت اور اثر و نفوذ کے سبب تراجم کے ذریعے دنیا کی دوسری تہذیبوں اور زبانوں میں بھی منتقل ہوئیں اور یوں حیات جاوداں کی منزلوں سے بہرہ ور ہو گئیں۔ اب یہ عالمی سطح پر علم و دانش کا اجتماعی سرمایہ ہیں۔

اردو زبان کے فروغ کے لیے تراجم کی ضرورت اور اہمیت کا احساس اس زبان کے علمی دنیا میں داخل ہونے کے ساتھ ہی کر لیا گیا تھا۔ فروغ اردو کے اداروں نے تراجم کو ہمیشہ اولین صف میں رکھا ہے چنانچہ اردو نثر کی تاریخ میں جتنا حصہ اہم طبع زاد تحریروں کا ہے کم و بیش اتنا ہی سرمایہ

تراجم کا بھی ہے۔ تراجم کے بغیر شاید اردو زبان علمی موضوعات کی ان وسعتوں اور بلندیوں سے ہمکنار نہ ہو سکتی جن پر وہ آج نظر آتی ہے۔ اردو تراجم کی تاریخ میں بعض کارنامے تو تخلیقی ادب کے ہم پایہ نظر آتے ہیں اور یہ مقام حاصل کرنا کسی بھی زبان کے لیے بڑے اعزاز اور عظمت کی بات ہے۔

اسی دیرینہ روایت کے تسلسل میں قیام پاکستان کے جشن طلائی کے موقع پر مقتدرہ قومی زبان نے پچاس ایسی کتابوں کے اردو تراجم شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے جن کا شمار مختلف علوم کے حوالے سے دنیا کی عظیم کتابوں میں ہوتا ہے۔ زیر نظر کتاب "زوالِ مغرب (جلد دوم)" اسی سلسلے کی ایک تصنیف ہے جس کے مصنف معروف مؤرخ اور مفکر اوسوالڈ سپینگلر ہیں۔ اس اہم کتاب کا ترجمہ ممتاز محقق و ماہر تعلیم ڈاکٹر مظفر حسن ملک نے کیا ہے۔

افتخار عارف

اوسوالڈ سپینگلر اور زوالِ مغرب

پہلی عالمی جنگ کے تباہ کن اثرات نے اقوام مغرب کو جس حالت سے دوچار کر دیا، جرمنی کے ایک دہقانی مفکر نے چند سال قبل ہی اس کی پیش گوئی کر دی تھی۔ یہ تاریخ کا ایک اہم فلسفی اوسوالڈ سپینگلر تھا۔ ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۳۶ء میں وفات پائی۔ اس نے اس عالمگیر جنگ کے نتائج اپنی آنکھوں سے بھی دیکھے۔

سپینگلر نے میونخ، برلن اور ہیلے کی جامعات میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ۱۹۰۴ء میں اس نے "ہیراکلائطوس" جیسے یونانی مفکر پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا۔ ۱۹۱۱ء تک وہ ایک گرامر سکول میں پڑھاتا رہا۔ بعدازاں اپنی افتادِ طبع کے پیشِ نظر اس نے پورا وقت اپنے فکری اور تصنیفی کاموں کے لیے مختص کر دیا۔

سپینگلر نے اپنی شہرہ آفاق کتاب زوال مغرب (Der Untergang des Abendlandes) پہلی عالمی جنگ سے پہلے ہی مکمل کر لی تھی مگر یہ دو جلدوں میں ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۲ء کے درمیان شائع ہوئی۔ اس کا انگریزی ترجمہ "The Decline of the West" ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۸ء کے درمیان شائع ہوا جب پہلی عالمی جنگ ختم ہو رہی تھی۔ اس کتاب نے شائع ہوتے ہی مقبولیت حاصل کرنا شروع کر دی۔ اس وقت لوگ جنگ کے اثرات بھی دیکھ رہے تھے کچھ اس باعث بھی یہ کتاب اذہان پر اثر ڈالنے لگی۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ آج یہ اکثر زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔

زوالِ مغرب میں سپینگلر نے مصریوں کی تہذیب کے زوال سے لے کر دورِ جدید تک کا جائزہ لیا ہے اور ان کے زوال کے اسباب بیان کیے ہیں۔ اگرچہ وہ اپنی یورپی تہذیب کو منفرد اور ممتاز قرار دیتا ہے لیکن اس کے انجام سے بھی لرزاں نظر آتا ہے۔ استدلال و براہین کی بجائے وہ اپنے تجزیات کی بنیاد امثال واعیان پر رکھتا ہے۔ اس کے لیے تاریخ سے پیکر تراشی کرتا ہوا وہ فکر و فلسفہ کے میدان میں جا نکلتا ہے۔

یورپی تہذیب کو سپینگلر یونان اور روما کی باقیات قرار دیتا ہے یا پھر اس کے نزدیک اس

تہذیب کو ہم اپالو کی تہذیب کہہ سکتے ہیں۔ وہ اسے مکان پر حاوی تہذیب سمجھتا ہے، اسے ممتاز لیکن تباہ کن ہتھیاروں کی تہذیب کہتا ہے اور اس کی بنیاد صنعتی قوت کو قرار دیتا ہے۔

اپنے استدلال میں سپینگلر اگرچہ گوئٹے سے متاثر ہے اور معاصر تہذیب کو "فاؤسٹ کی تہذیب" کا نام دیتا ہے لیکن وہ اپنے فکر کو نطشے سے بھی مستعار لیتا ہے۔ اپنے استدلال کی بنیاد وہ حیاتیاتی اور کائناتی مظاہر پر رکھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ تہذیب ہزار برس کی گردش ضرور مکمل کرے گی۔ اس کا دور عروج نشاۃ ثانیہ میں تھا اور اس کا عہد اب خزاں کا دور ہے جو اپنے موسم سرما کے انجام کو بس پہنچنے ہی والی ہے۔

اقبال کے حوالے سے گوئٹے اور نطشے کے اثرات کا جہاں جائزہ لیا جاتا ہے وہاں سپینگلر اور اس کی "زوالِ مغرب" بھی زیرِ بحث آتی ہے۔ اردو میں اس کتاب کے جزوی ترجمے اور فکری خلاصے تو شائع ہوتے رہے ہیں مگر دونوں جلدوں کا مبسوط ترجمہ پہلی بار سامنے آ رہا ہے، جسے بشریات کے ماہر ڈاکٹر مظفر حسن ملک نے دقتِ نظر کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ایسے موضوعات پر قلم اٹھانے کے لیے اسالیب اور طرزِ بیان کے حوالے سے بھی یہ ترجمہ خاصا مددگار ثابت ہوگا۔ عظیم کتب کے سلسلے میں اہلِ علم کی آرا کے حوالے سے یہ کتاب سرفہرست ہے۔

ڈاکٹر عطش درانی
(تمغۂ امتیاز، ستارۂ امتیاز)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گزارش

اسوالڈ سپینگلر کی کتاب "زوال مغرب" کی دوسری جلد کا ترجمہ بھی نذر قارئین ہے۔ مزاج کے لحاظ سے یہ جلد بھی پہلی جلد سے کسی طرح مختلف نہیں۔ بلکہ تسلسل اور خیالات کی روانی کی لہریں یکساں رفتار سے افتاں و خیزاں بہتی چلی جاتی ہیں۔ کوئی شخص مصنف کے وسیع علم و فکر اور مطالعہ کی گہرائی سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس پر تعصب کا الزام بھی عائد نہیں کر سکتا۔ وہ نطشے کی فکر کا مقلد ہے۔ جس میں جمہوریت کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کا سب سے بڑا ہدف "یونانی فکر" ہے جسے وہ یونانی (اور قدیم روم کی بھی) کلاسیکی فکر کا نام دیتا ہے۔ وہ کلاسیکی فکر کے اس پہلو کو ہدف تنقید بناتا ہے' جس میں اہل یونان ماضی کو اس لیے فراموش کر دینا چاہتے ہیں کہ جو ہونا تھا' وہ ہو چکا' اب اس کے متعلق سوچنا بیکار ہے اور مستقبل کی انھیں اس لیے کوئی فکر نہیں کہ وہ اپنے آپ کو خود سنبھال لے گا' گویا وہ ایسے اسلوب حیات کی تبلیغ کرتے ہیں' جسے ہم "حال مست" کہتے ہیں۔ جو ماضی کی فکر نہ کرے وہ قوم اپنی تاریخ سے سبق حاصل کرنے سے محروم ہو جاتی ہے جو اپنے مستقبل کی فکر سے بے نیاز ہو وہ منصوبہ بندی کرنے سے بھی قاصر رہے گی۔ "بے سرد پا" کے محاورے سے یہی مراد ہے۔ لیکن علمائے اسلام نے سپینگلر سے بہت پہلے فلسفہ یونان پر اس حوالے سے خاطر خواہ تنقید کی ہے۔ ہسپانیہ میں مسلمانوں کا ایک طویل اور قابل قدر مدرسہ فکر قائم رہا ہے۔ مغربی مفکرین اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ مغرب کی تحریک احیائے علوم مسلم مفکرین سے زیر اثر وجود میں آئی۔ لیکن مصنف کو یہ زعم ہے کہ یونانیت پر تنقید خود اس کی اپنی ذہنی اختراع ہے۔ چنانچہ حضرت علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبہ پنجم (اسلامی ثقافت کی روح) میں اس مسئلے کو اپنا موضوع بحث بنایا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

"سپینگلر نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "زوال مغرب" میں پھیلایا۔ اس تصنیف کے ان دو ابواب جن

میں اس نے عربی ثقافت سے بحث کی ہے' ایشیا کی تہذیب و تمدن کی تاریخ میں ایک بڑا قابل قدر اضافہ تصور کرنا چاہیے' لیکن افسوس یہ ہے کہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے سپنگلر نے ان دونوں ابواب میں یہ سمجھنے کی مطلق کوشش نہیں کی کہ بحیثیت ایک مذہبی تحریک اسلام کی ماہیت کیا ہے' نہ یہ کہ وہ کیا سرگرمیاں تھیں' جن کا اس کی بدولت تہذیب و ثقافت کی دنیا میں آغاز ہوا۔ سپنگلر کا دعویٰ ہے کہ کوئی بھی تہذیب ہو' اسے اپنی جگہ پر ایک جسم نامی تسلیم کرنا پڑے گا' اس لیے کہ زمانا" دیکھا جائے تو کسی تہذیب کا اس تہذیب سے جو اس سے متقدم ہے یا متاخر کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ سپنگلر کے نزدیک ہر تہذیب کا اپنا ایک نقطہ نظر ہوتا ہے اور وہ جس شے کو دیکھتی ہے اسی نقطہ نظر کے ماتحت' جسے دوسری تہذیبوں کے افراد سمجھ ہی نہیں سکتے' یہ دعویٰ ہے جس کی حمایت میں سپنگلر کا اضطراب اس حد تک بڑھ گیا ہے' کہ وہ ایک واقعے کے بعد دوسرا اور ایک تعبیر کے بعد دوسری تعبیر پیش کرتا ہے اور اس طرح واقعات اور تعبیرات کا ایک طومار کھڑا کر دیتا ہے' تاکہ کسی نہ کسی طرح یہ ثابت ہو جائے کہ مغربی تہذیب کی مخالفت یونانیت روح اس کی اپنی ذہانت اور فطانت کا نتیجہ ہے' نہ کہ ان اثرات کا جو بہت ممکن ہے کہ اس نے اسلامی تہذیب سے قبول کیے ہوں' کیونکہ یہ تہذیب کیا باعتبار روح اور کیا باعتبار نوعیت خالصا" مجوسی ہے۔ تہذیب حاضر کے بارے میں تو ہمیں سپنگلر کے نقطہ نظر سے پورا پورا اتفاق ہے' لیکن جیسا کہ ہم ان خطبات میں کہہ چکے ہیں' عصر حاضر کی روش اگر یونانیت کے خلاف ہے' تو اس کی ابتدا دراصل اس بغاوت سے ہوئی' جو عالم اسلام نے فکر یونان کے خلاف کی۔" (خطبہ پنجم' ترجمہ نذیر نیازی مطبوعہ بزم اقبال ۱۹ ـ ۲۱۸)

علامہ فرماتے ہیں کہ اگر وہ مندرجہ بالا حقیقت کو تسلیم کر لیتا' تو اس کا یہ دعویٰ باطل ہو جاتا کہ "تہذیب اور یونانیت کے مابین اس کی اپنی دریافت ہے۔"

مصنف نے مسائل عرب کے بارے میں جو دو تین ابواب لکھے ہیں' اس سے قارئین کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ یہ ابواب اسلام کے متعلق ہیں۔ ان میں اسلام کا ذکر جہاں کہیں بھی آیا ہے محض ضمنا" ہے۔ عرب سے اس کی مراد (بجا طور پر) پورا جزیرہ نمائے عرب ہے جس میں متعدد ممالک اور متعدد مذاہب موجود ہیں۔ یہاں تک بھی درست ہے کہ یہودیت' عیسائیت اور اسلام ایک سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں' جن میں ایک تاریخی تدریج بھی موجود ہے' لیکن ان کو بحیثیت مجموعی مجوسی مذاہب قرار دینا درست نہیں۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مجوسیت اور اس کے بانی پر ایک مختصر سی تصریح لکھ دی جائے۔

"مجوس" ایک ایرانی الاصل لفظ ہے جو یونانی میں بھی اسی تلفظ سے رائج ہے۔ فارسی قدیم میں اس کی صورت مگش کی تھی اور جدید فارسی میں اس کے لیے "مغ" مروج ہے۔

قرآن حکیم میں مجوس کا لفظ صرف ایک بار (۲۲ ـ الحج ـ ۱۷) میں دیگر مذاہب کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ ان کے اہل کتاب ہونے یا نہ ہونے پر اتفاق رائے نہیں۔ بعض مورخین اور علمائے کرام نے انھیں

مشرک کہا ہے۔ احادیث میں انھیں اہل کتاب تو تسلیم نہیں کیا گیا مگر یہ ضرور کہا گیا ہے کہ ان کے ساتھ اہل کتاب کا سا سلوک کیا جائے۔ ان سے ہر دور میں جزیہ وصول کیا گیا ہے۔

مورخین کی روایت یہ ہے کہ زرتشت نے شاہ گشتاسب کے تیسرے سال جلوس میں نبوت کا دعویٰ کیا۔ وہی مورخ (طبری) یہ بھی کہتا ہے کہ زرتشت فلسطینی باشندہ تھا۔ بعض انبیائے بنی اسرائیل نے اسے گشتاسب کے دربار میں روانہ کیا اور وہ اس کا مرید ہو گیا۔ اس کی اپنی زبان عبرانی تھی' مگر بادشاہ مذکور نے اس کے مکشوفات کا فارسی میں ترجمہ کرا دیا۔

یہ بھی تاریخوں سے ثابت ہے کہ آرمینیا کے مجوس کے ساتھ (اور ایران میں بھی) اہل کتاب کا سا سلوک روا رکھا گیا۔ البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھیں ذمی قبول کر لیا گیا۔

ابتدا میں مجوسیت کی صورت کیا تھی' شاید اس کی صحیح تصویر کشی اب ممکن ہو' لیکن مسلمانوں نے انھیں جس حالت میں پایا' ان میں توحید کی بجائے ثنویت کا غلبہ تھا۔ "جس میں نور و ظلمت" "خیر و شر" "اہرمن و یزداں" کی مسلسل آویزش کا تصور غالب تھا۔ ظاہر ہے توحید و ثنویت باہم متضاد عقائد ہیں اسلام تو وقدر خیرہ وشرہ من اللہ کا قائل ہے۔ شیطان کو اس میں الوہیت کا مرتبہ حاصل نہیں۔ وہ محض ایک بدی کی قوت ہے جو انسان کی بعض نفسی خواہشات سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ اس کی حیثیت خدا کے مدمقابل ہونے کی نہیں۔

ایک اور یگانگت یا مشابہت جو یہود' نصاریٰ' زرتشتیوں اور مسلمانوں کے عقائد میں یکساں ہے وہ کسی مصلح موعود کا انتظار ہے جس کے ہاتھوں شر کو شکست ہو گی۔ یہ نزول مسیح ہو' یا ظہور مہدی' مگر یہ عقیدہ ضرور موجود ہے۔ اب محض اس عقیدے کی بدولت یہ تصور کر لینا کہ ان چاروں مذاہب میں مماثلت ہے' مناسب نہیں۔

سپنگلر یہ بھی کہتا ہے کہ ان چاروں مذاہب پر کسی قدیم کلدانی مذہب کے اثرات ہیں۔ بعض روایات کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت کلدانیہ کے ضلع میں ہوئی تھی۔ اگر اس حوالے سے بات کی جائے تو قطعا" قابل اعتراض نہ ہو گا۔ یہودی' عیسائی اور مسلمان تینوں حضرت ابراہیمؑ کو خدا کے اولوالعزم نبی کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں' بلکہ اسلام کے نزدیک تو ملت ابراہیمی مسلمانوں کی شناخت ہے۔ البتہ اگر اس کے علاوہ کوئی اور مذہب مراد ہو جو دین ابراہیمی سے قبل یا اس کا ہمعصر ہو گزرا ہو' تو یہ صرف مصنف کی اپنی اختراع ہے۔

بعض مفکرین کا خیال ہے کہ جسے سپنگلر مجوسیت کہتا ہے' اسے عجمیت سمجھ کر قبول کر لینے میں کوئی

حرج نہیں' اسلام اپنے عقائد یا قرآن کریم میں کسی تحریف کا قائل نہیں۔ عجمیت اگر اسلامی روح کے خلاف ہو تو وہ مسلمانوں کے نزدیک قطعاً" قابل قبول نہیں۔ عجمیت ہو یا مجوسیت' اسلام نے اس کی آمیزش کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی۔

اس سے اگلا (نواں) باب " نیشا غورث' (حضرت) محمد ﷺ اور کرام ویل کے زیر عنوان لکھا گیا ہے۔ نام تاریخی ترتیب سے دیے گئے ہیں' اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا' مگر تینوں حضرات کی شخصیتیں بالکل الگ الگ ہیں۔ نیشا غورث' ایک فلسفی' ریاضی دان اور موسیقار ہونے کے علاوہ سیاح بھی تھا۔ روایت ہے کہ اس نے مصر اور ہندوستان کی سیاحت کی تاکہ راگ ودیا سیکھے۔ ریاضی میں وہ کمال حاصل کیا کہ آج اس کے مسلمات داخل نصاب ہیں۔ کرام ویل ایک برطانوی سیاستدان اور جابر وزیراعظم تھا' جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان دونوں حضرات کی کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ آپ نبی تھے' مرسل تھے' ایک مذہب کے بانی اور مامور من اللہ تھے۔ ان کا ذکر اس تثلیث میں کیسے شامل ہو گیا؟

مصنف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے خلاف کچھ نہیں کہا۔ بلکہ ان کا ذکر مبارک بھی ضمناً" ہی کیا ہے۔ لیکن اس پر نطشے کی "قوت" کا بھوت اس بری طرح سے سوار ہے کہ وہ جس کو پسند بھی کرے اس کے جلال ہی کے حوالے سے بات کرے گا۔ ان تینوں شخصیات میں اسے یہی قدر مشترک نظر آئی کہ انھوں نے اپنے نظریات کی تائید میں حسب ضرورت قوت کو بھی استعمال کیا۔ حالانکہ اسلام میں قوت کا استعمال صرف دفاعی حد تک ہی کیا جاتا ہے۔ اسلام نے ہمیشہ دلیل ہی کا سہارا لیا ہے۔ یہ مصنف کا اپنا نقطہ نظر ہے کہ اسے انسانی اوصاف میں صرف قوت ہی ارفع و اعلیٰ معلوم ہوتی ہے۔

مصنف کے نزدیک جمہوریت ایک بہت بڑی بیماری ہے' وہ زوال مغرب کا سب سے بڑا سبب جمہوریت ہی کو سمجھتا ہے۔ یہاں پر سپینگلر اور حضرت علامہ اقبال میں زبردست اتحاد فکر موجود ہے۔ حضرت علامہ نے اپنی بعض تحریروں میں جمہوریت کو ایک ناگزیر وحدت بھی تسلیم کیا ہے اور کہا ہے کہ عوام کی رائے کو معلوم کرنے کا کوئی نہ کوئی ذریعہ تو ہونا چاہیے (مثلاً آپ کا مضمون خلافت) مگر سپینگلر کے ہاں جمہوریت ایک شجر ممنوعہ ہے۔ وہ چند سری حکومت کا قائل ہے۔ اگر مصنف زندہ ہوتا تو شاید اپنے خیالات میں ترمیم کر چکا ہوتا۔ بہرحال "ریاست" کے موضوع پر مصنف نے جس قدر بھی لکھا ہے قابل قدر' معلومات افزا اور فکر انگیز ہے۔

مصنف کے تبحر علمی کی داد نہ دینا زیادتی ہو گی۔ اس کتاب کا مطالعہ ہر شخص (معمولی طالب علم سے لے کر منتہی عالم و فاضل تک) کے لیے مفید ہو گا۔

ڈاکٹر مظفر حسن ملک

جلد اول: ہیئت اور حقیقت (انگریزی ترجمہ)

پہلی دفعہ ۲۳ اپریل ۱۹۲۶ء کو شائع ہوئی۔ اس کے بعد ۱۴ دفعہ اس کی مکرر طباعت ہوئی۔ اس کی جرمن اشاعت ۱۹۱۸ء میں ہوئی اور جرمنی کے قانون کے مطابق اس کے حقوق اشاعت محفوظ کر لیے گئے۔

جلد دوم۔ تاریخ عالم کا تناظر (انگریزی ترجمہ)

پہلی دفعہ ۱۹۲۸ء میں طبع ہوئی۔
اس کے بعد سات ایڈیشن شائع ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں جرمن قانون کے تحت حقوق محفوظ کر لیے گئے۔

دونوں جلدیں یکجا:

(انگریزی ترجمہ) پہلی اشاعت ۱۵ نومبر ۱۹۳۲ء
مکرر اشاعت تین دفعہ
پانچویں اشاعت ۱۹۵۴ء

جلد دوم

تاریخ عالم کا تناظر

انگریزی مترجم کی تصریح

اس جلد کے مطالب کی توضیح کے لیے بھی میں نے وہی طریق اختیار کیا ہے' جو جلد اول میں کیا گیا تھا' یعنی ابتدائی حوالہ جات تشریح' انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ہی سے دیئے گئے۔ کیونکہ مذکورہ دستاویز اپنی نوعیت کے اعتبار سے سب سے اہم اور نئی اور پرانی دونوں دنیاؤں میں کثیر الاشاعت اور مقبول ترین ہے۔ کبھی کبھی حسب ضرورت بعض مخصوص انسائیکلو پیڈیا کے حوالے بھی دیے گئے ہیں۔ جلد اول کے مقابلے میں جلد ہذا کے خصوصی کردار کی بنا پر اور بالخصوص اس میں مجوسی تاریخ پر زیادہ توجہ دینے کی وجہ سے جسے آج تک تدریسی عمل سے الگ رکھا گیا ہے' ایسے مخصوص حوالہ جات کی کثرت ہے جو اس مخصوص شعبہ تاریخ سے متعلق ہے اور یہ عمل مفید بھی ثابت ہوا ہے۔ مترجم کی تصریحات کو تنقید کا مقام حاصل نہیں۔ نہ اس کا ادعا کیا گیا ہے' مگر کہیں کہیں جا بجا بعض حوالہ جات کا اضافہ کر دیا گیا ہے' جس کا مقصد یا تو اضافی مثال پیش کرنا ہے' یا کسی متوقع تنقید کا سدباب کرنا ہے۔ ماہرین دونوں صورتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیں گے' مگر یقین ہے کہ وہ اس عمل کو باعث افادہ سمجھیں گے۔

پہلی جلد میں دوسری جلد کے صفحات کے حوالہ جات جرمن اشاعت کے مطابق درج کیے گئے تھے۔ لہٰذا اس جلد میں انگریزی اور جرمن صفحات کی تقابلی جدول کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

سی۔ ایف۔ اے

لندن' جولائی ۱۹۲۵ء

باب اوّل

ابتدا اور مناظرِ فطرت

(ا)

کائنات اور کائناتِ صغیر

ا

ہنگامِ غروب آفتاب پھولوں کے یکے بعد دیگرے بند ہونے کا نظارہ کریں۔ ایک عجیب و غریب کیفیت احساس ہے' جو آپ پر طاری ہو رہی ہے۔ یہ اس خوف کا معمہ ہے' جو بے بصر' خواب آلود حیات ارضی کی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ یہ گونگا جنگل' خاموش وادیاں' یہ جھاڑیاں' شاخیں' بذاتہ حرکت پذیر نہیں ہو سکتیں' یہ ہوا ہے جو انھیں متحرک رکھتی ہے۔ صرف یہ حقیر پشہ آزاد ہے اور جیسے جی چاہے' حرکت کرتا ہے۔

اپنی ذات کے بل ایک پودے کی کوئی حیثیت نہیں' یہ اس منظر فطرت کا ایک جزو ہے' جس میں کہ یہ اپنی جڑوں پر قائم ہے۔ یہ شفق' سخت سردی' ہر پھول کا بند ہونا' یہ کسی علت و معلول کے نظام کا حصہ نہیں۔ یہ نہ تو کسی خطرے کی علامت ہیں اور نہ خطرے کے ردعمل کا اظہار۔ یہ فطرت کا سیدھا اور سادہ عمل ہیں جو ہر پودے میں اور آپ کے قرب و جوار میں جاری ہے۔ کسی فرد کو یہ قدرت حاصل نہیں' کہ وہ اپنی مرضی کا منظر تلاش کرے' اس کا ارادہ کرے' یا اس کے لیے انتخاب کرے۔

اس کے برعکس ایک حیوان ایسا انتخاب کر سکتا ہے۔ اسے دیگر عالمی مخلوق کے مقابلے میں آزادی کی نعمت سے سرفراز کیا گیا ہے۔ یہ ننھی مخلوق جو ہر وقت ہوا میں اڑتی رہتی ہے' وہ تنہا پرندہ جو مغرب تک فضا میں محو پرواز ہے۔ لومڑ جو سب کی آنکھ بچا کر اپنے گھروندے کی طرف مراجعت پذیر ہے۔ ہر ایک نے ایک وسیع کائنات کے اندر اپنی اپنی دنیا بسا رکھی ہے۔ ایک ننھا جاندار جو ایک قطرہ آب میں زندہ ہے' اتنا چھوٹا ہے کہ انسانی آنکھ اسے دیکھ نہیں سکتی۔ اگرچہ اس کا عرصہ حیات ایک لمحے سے زیادہ نہیں' مگر اس نے بھی مذکورہ قطرہ آب کے کسی کونے میں اپنا گھر بنا رکھا ہے اور اس وسیع کائنات میں اس نے بھی اپنی دنیا بسا رکھی ہے' جس میں وہ ہر طرح سے آزاد ہے مگر اس کے مقابلے میں اس شاہ بلوط کے عظیم درخت کو جس کے کسی ایک پتے پر یہ مخلوق آباد ہے' یہ آزادی نصیب نہیں۔ ر

آزادی اور پابندی کا فرق ہی سب سے زیادہ اور عمیق تجزیاتی عمل ہے' جس کے نتیجے میں ہم حیوانی اور نباتی زندگی میں امتیاز کر سکتے ہیں۔ ایک شجر یا پودا اپنی ذات میں خود کفتی ہے مگر حیوان میں ایک نوع کی ثنویت کا وجود ہے۔ ایک نباتیاتی وحدت صرف نباتات ہے' جبکہ ایک حیوان نباتات بھی ہے اور اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ ایک ریوڑ جب کوئی خطرہ محسوس کرتا ہے' تو باہم اکٹھا ہو جاتا ہے اور خطرے کے خوف سے لرزاں ہو جاتا ہے۔ ایک بچہ روتے ہوئے ماں سے چمٹ جاتا ہے' مگر ایک بالغ اور باشعور انسان کو خدا یاد آ جاتا ہے اور وہ اس کی قوت کی پناہ کا طالب ہوتا ہے۔ یہ سارا عمل اپنی اصل کی جانب رجوع کا عمل ہے۔ وہی مقام جہاں سے کہ نباتاتی حیثیت سے آزادی' انفرادیت اور تنہائی حاصل کی گئی تھی۔

پھولدار پودوں کے بیج سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو پتیوں کا غلاف جو چھوٹے پودے کی حفاظت کرتا ہے' سورج کی روشنی کی طرف گھوم جاتا ہے اور یہ عمل اس کے دائرہ حیات اور تکرار پیدایش کے اعضا کے ساتھ مسلسل جاری رہتا ہے۔ علاوہ ازیں ایک تیسرا عنصر جس میں مستقبل کی جڑ اور اس امر کی علامت موجود ہوتی ہے کہ متعلقہ پودا ایک دفعہ پھر بہرصورت اس منظر فطرت کا حصہ بننے والا ہے۔ اس کے برخلاف ارفع حیوانات میں' ہم بیضے کی زرخیزی کے عمل کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس کی ابتدائی حیات کے چند گھنٹوں میں بیرونی غلاف کے اندر پوشیدہ خانوں میں تکرار حیات کا عمل جاری رہتا ہے۔ گویا کہ حیوانی جسم کے اندر نباتاتی عناصر کام کر رہے ہوں جو خود جسم مادر اور بیرونی دنیا سے پردہ اخفا میں ہوتے ہیں۔ یہ بیرونی غلاف ہی حیوانی حیات کی مخصوص علامت ہے۔ اور اسی سے ہم حیات کی دو اقسام میں تمیز کرتے ہیں جو اس عالم میں وجود میں آئی ہیں۔ نباتات فی نفسہ کائناتی ہے' جبکہ حیوان وسیع کائنات کے مقابلے میں خود بھی ایک کائنات صغیر ہے۔ جب اور اس وقت تک جب تک کہ یہ اکائی اپنے آپ کو دوسروں سے علیحدہ کر لے اور اپنی انفرادی حیثیت کا دوسروں کے مقابلے میں تعین کر لے اس وقت اس کی حیثیت کائنات صغیر کی ہوتی ہے۔ سیارگان اپنے اپنے عظیم دوائر کے ساتھ پابند ہیں۔ مگر یہ چھوٹے چھوٹے پروانے اور جگنو اپنی اپنی دنیا میں شعوری طور پر آزاد گھومتے پھرتے ہیں۔ جسے ان کا ماحول کہا جا سکتا ہے۔ کائنات صغیر کی اسی انفرادیت کی بنا پر' جس کا شعور ہمیں حس بصارت سے ہوتا ہے' ہماری آنکھوں کو جسم کے معانی سے شناسا کرتی ہے' لیکن مشاہدے

کے باوجود ہم کسی داخلی جھجک کے پیش نظر جسم کی صفت سے محروم رکھتے ہیں۔

ہر وہ شے جسے کائنات صغیر ہونے کا رتبہ حاصل ہے۔ اس میں موقت ہونے کی صفت بھی ضروری ہے' اس میں تال کا توازن بھی لازمی ہے۔ یہی کائنات صغیر کا طریق کار ہے' کہ اس میں تلیست بھی ہو اور ہیجان بھی۔

ہم ہیجانی فکر میں ہیجانی مستعدی کا ذکر کرتے ہیں' مگر تمام شعوری کیفیات اپنی روح کے لحاظ سے ہیجانی ہی ہوتی ہیں' حس اور شے' میں اور آپ' علت اور معلول' شے اور صفت' یہ تمام کے تمام غیر مخلوط عناصر کے مابین ہیجان ہی کو ظاہر کرتے ہیں اور جب اس شے کا اظہار ہوتا ہے' جسے ہم اصطلاحی طور پر "جمود" کہتے ہیں' فوری تکان' گویا نیند کی حالت' جو حیات کی کائنات صغریٰ پر طاری ہوتی ہے۔ ایک انسان تمام ہیجان سے نجات حاصل کر کے سو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اس میں اور نباتات میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

اس کے برخلاف کائناتی چال میں وہ ہر شے موجود رہتی ہے جس کی تشخیص' سمت' زمان' توازن' انجام' آرزو' کی اصطلاحات سے کی جا سکتی ہے۔ گویا گھڑ دوڑ میں سموں کی آواز' یا افواج کی مارچ میں بوٹوں کی کھڑاک' اور عاشق و معشوق کے وصل کی سرگوشیاں' کسی معاشرتی مجلس کی پرشکوہ کارروائی یا کسی منصف اعلیٰ کا انسانی مسائل میں فیصلہ' جسے میں نے اس سے قبل تعمیری اور قیاسی دانش مندی کا نام دیا تھا۔

کائناتی چال کی یہ دوری حرکت' کائنات صغریٰ کی آزادانہ حرکت کے قطع نظر' وقتاً" فوقتاً" بیدار انفرادی ہیجان میں سکون کا موجب ہوتی ہے' اور اسے کائنات سے متحد کر دیتی ہے۔ اگر ہم نے کبھی فضا کی بلندیوں میں کسی پرندے کو اڑتے دیکھا ہو' وہ ہمیشہ ایک ہی انداز میں بلند ہوتا ہے' گھومتا ہے' سبک خرامی کا مظاہرہ کرتا ہے' معینہ فاصلے پر اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیتا ہے' ہم نے اس کو اشجار کی طرح پر یقین دیکھا ہے اور ہم نے اسے اس حرکت کے احساس میں یکساں پایا اور ایک دوسرے کے احساس میں اتحاد کا عنصر دیکھا۔ آدمیوں اور حیوانوں میں رقص جنگ اور رقص محبت کے یہی معانی ہیں۔ اسی جذبے کے تحت ایک فوجی دستہ گولیوں کی بوچھاڑ میں آگے بڑھتا ہے اور متحد رہتا ہے۔ اس دوران ان کی سوچ' عمل' جذبہ رحم' بغیر دیکھے نے عجیب انداز میں متحد رہتا ہے' یہاں تک کہ اس دستے کے افراد ایک بار پھر الگ الگ ہو جاتے ہیں اور ایسے حالات میں کائناتی دیوار مٹ جاتی ہے۔ یہ زور آزمائی کے ذریعے ڈراتی ہے' دھکا دیتی ہے اور کھینچتی ہے' یہ بھاگ جاتی ہے' اچانک مڑ کر جھولتی ہے۔ اعضا باہم پیوست ہو جاتے ہیں' اور پاؤں تیزی سے چلتے ہیں اور ہر منہ سے چیخ نکل آتی ہے اور بالآخر قضا و قدر سب پر غالب آ جاتی ہے اور ان چھوٹی چھوٹی دنیاؤں سے اچانک مکمل اور کامل دنیا کا اظہار ہوتا ہے۔

کائناتی چال کے شعور کو ہم احساس کا نام دیتے ہیں یعنی عالم صغریٰ کا ہیجان "احساس۔" جمعیت کے

ابہام نے واضح اور متنوع پہلوئے حیات اور مخصوص حیوانی حیات میں فرق کا امتیاز مشکل بنا دیا ہے۔ اگر ہم کسی نسل، جنسی حیات، یا احساس حیات کی اصطلاحات استعمال کریں تو ان مختلف کیفیات کے مابین گہرے رابطے کا پتہ چلے گا۔ اول الذکر ہمیشہ موقتی ہو گا، جس میں تال کا عنصر ستاروں کی دوری گردش کے مطابق موجود نظر آئے گا۔ چاند میں نسوانیت کے مظاہر معلوم ہوں گے، جنھیں رات، موسم بہار اور گرمی میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ثانی الذکر ہمیں ہیجان، نور کے اقطاب، اور منور اشیا، معرفت اور اشیائے مدرکہ سے ہو گا، جو اس عمل کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوئی ہیں یعنی زخم اور وہ آلہ جو اس کا باعث ہوا ہے۔ ان میں سے ہر شے کا کسی نہ کسی جنس سے تعلق ہے جس نے ارتقای عمل کے تحت مخصوص اعضا اور شکل و صورت حاصل کر لی ہے اور اس طرح اس کے مخصوص پہلوؤں کا واضح مشاہدہ ممکن ہو گیا ہے۔ ہمارے جسم میں دو اہم کائناتی نظام موجود ہیں، دوران خون اور جنسی اعضاء۔ علاوہ ازیں دو عناصر فارق : عالم صغریٰ کا تحرک اور اعصاب، ہمیں یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ تمام جسم اپنی ابتدا میں دوری اور لمسی عضو تھا۔

خون ہمارے لیے علامت حیات ہے۔ یہ بغیر کسی وقفے سے ولادت سے موت تک گردش کرتا رہتا ہے۔ یہ ماں کے جسم سے نومولود کے جسم میں منتقل ہوتا ہے، اور بیداری یا خواب ہر حالت میں محو گردش رہتا ہے۔ یہ خون مورثان اعلیٰ کی طرف سے نسلاً" بعد نسل منتقل ہوا ہے اور یہ تسلسل مختلف نسلوں کو ایک رابطے، سلسلے، انجام، تال اور زمان کے ذریعے منسلک رکھتا ہے۔ آغاز میں تو یہ تقسیم در تقسیم اور ہر نئی تقسیم کے ادوار کے طریق کار سے باہم مربوط رکھتا تھا اور ہر نئی نسل کا وجود ایک دور یا عہد کی علامت ہوتی تھی، لیکن امتداد زمانہ سے ان لوگوں نے اپنی آبادی اور شرح پیدائش کو محسوس کیا اور یہ سوچا کہ وہ ایک مخصوص حلقے سے باہر نکل کر بھی اپنے آپ کو قائم رکھ سکتے ہیں، کس طرح ان علیحدہ ہونے والے اجسام میں بھی ایک ہی نبض چلتی رہی مگر بعد میں ان کے افتراقات کو پاٹنے، ایک دوسرے سے منسلک کرنے، افتراقات سے روکنے، اور کبھی کبھی ایک دوسرے کو تباہ کرنے کا عمل جاری ہوا۔ یہ زندگی کے رازوں کا سنجیدہ خزانہ ہے۔ اس المیے کو تمام مذاہب اور تمام منظومات افشا کرنے کے درپے ہیں۔ گوئٹے نے اپنی دو نظموں Seilge Sennsucht اور Wahlver Wandtthaftn میں ایک بچے کے قتل کا واقعہ بیان کیا ہے، جو قانونی مناکحت کے بغیر تولد ہوا یعنی ایک کائناتی گناہ کا نتیجہ تھا۔

ان کائناتی عناصر میں کائنات صغریٰ بعض اضافے کرتی رہتی ہے (اس حد تک کہ جس قدر کائنات نے اسے آزادی حرکت عطا کر رکھی ہے)۔ عضو "حس" جو محض حس لامسہ ہی ہے، ایک اضافہ قرار دیا جاتا ہے۔ اب جبکہ ہم اپنے ارتقا کی معراج پر ہیں، تو ہم لفظ "لمس" کو بالعموم چھونے کے معانی میں استعمال کرتے ہیں مگر مرادی معانی میں "چھونا" صرف لمس تک محدود نہیں، بلکہ اس سے مراد ہر وہ رابطہ ہوتا ہے، جس میں آنکھ، کان، اور ناک وغیرہ شامل ہیں۔ کیونکہ یہ کسی زندہ مخلوق کے اظہار کا ایک سادہ ترین اظہار ہے، جو وہ اپنے اردگرد کے ماحول کے ردعمل کے بیان کے لیے کرتا ہے، یا رابطہ استوار کرنے کے تجربے کا اظہار کرتا ہے، لیکن جب یہ رابطہ کسی مخصوص مقام یا تجربے کے لیے ہوتا ہے تو اس میں تمام حواس سرگرم

عمل ہوتے ہیں، خواہ وہ اپنی ابتدائی حالت سے کسی قدر دور اور لطیف ہی کیوں نہ ہوں، مگر ان کی حیثیت اثباتی حواس ہی کی ہو گی، ان کے علاوہ کوئی اور ذریعہ ادراک موجود نہیں۔ ہر قسم کا تجسس مخصوص اور اجنبی کے مابین امتیاز کرنے کا اہل ہے اور اجنبی کی شناخت کی وضاحت کے لیے شکاری کتے کی قوت شامہ اور بارہ سنگھے کی قوت سامعہ اور شہباز کی قوت باصرہ کی مثال دی جا سکتی ہے۔ رنگ، چمک، کیفیت رنگ اور سرتی، خوشبوئیں، تمام، تحس کی قابل ادراک کیفیات ہیں جو اشیا میں افتراق، فاصلے، توسیع کا اظہار کرتی ہیں۔

خون کے کائناتی دورے کی طرح حواس کی امتیازی فعالیت بھی ابتدا میں ایک وحدت تھی۔ فعال حس ہمیشہ باشعور بھی ہوتی ہے۔ ان سادہ حواس میں طلب اور دریافت ایک ہی شے ہے جسے ہم بالکل مناسب انداز میں "لمس" کہتے ہیں۔ یہ صورت حال بعد میں وجود میں آتی ہے جبکہ ترقی یافتہ حواس سے بہت زیادہ طلب کیا جاتا ہے۔ یہ تجسس اور اس کا ادراک ایک وقت میں یکسانیت کھو دیتے ہیں، اور ثانی الذکر زیادہ سے زیادہ علیحدگی اختیار کرتا جاتا ہے اور بالاخر واضح طور پر علیحدہ ہو جاتا ہے۔ بیرونی میان میں تشویش میں مبتلا عضو، حسی عضو سے علیحدگی اختیار کر لیتا ہے (جیسا کہ عضو جنس، دوران خون سے علیحدہ ہو جاتا ہے)۔ مگر ہمارے بعض الفاظ کا استعمال مثلاً "حساس" "حس پذیر" ، "بصیرت" "دخل اندازی" اور "بھڑک" قطع نظر منطقی اصطلاحات کے، سب کے سب الفاظ عالم بصارت ہی سے حاصل کردہ ہیں۔ اس سے بخوبی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارا تمام کا تمام ادراک، حواس ہی کی عطا ہے اور جہاں تک انسان کا تعلق ہے حواس اور ادراک دونوں باہم مل کر کام کرتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ایک کتا اپنے دھیان میں خاموش پڑا ہے، پھر اچانک ہیجان کا شکار ہو جاتا ہے، وہ کچھ سنتا ہے، سونگھتا ہے، یعنی اسے جس شے کا احساس ہوا ہے، اسے سمجھنے کے لیے بھی کوشاں ہے۔ وہ اسے منعکس کرنے کی اہلیت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جس میں ادراک تنہا اپنے طور پر سرگرم عمل ہوتا ہے، اور الجھے ہوئے تحسس پر کام کرتا ہے۔ قدیم زبان بڑی وضاحت سے اس درجہ بندی کا بیان کر سکتی تھی اور اس کے ذخیرہ الفاظ میں ہر کیفیت کی علامت کے طور پر الفاظ کا ذخیرہ موجود تھا۔ مثلاً سننا، ہمہ تن گوش ہونا (سننا، حکم کا سننا بھی)، سونگھنا، خوشبو سے لطف اندوز ہونا، سانس اندر کھینچنا، ناک بھوں چڑھانا، دیکھنا، جاسوسی کرنا، مشاہدہ کرنا وغیرہ۔ ان تمام صورتوں میں علت عمل، تحسس عمل سے زیادہ اہم ہے۔

بالآخر تمام کیفیات میں ایک ارفع مفہوم پیدا ہو جاتا ہے، سب میں بلا تخصیص، جو ہمیشہ کے لیے ہمارے عزم ادراک سے ماورئی ہوتا ہے اور اپنے لیے کسی جسمانی عضو کو بیدار کر لیتا ہے۔ آنکھیں وجود میں آ جاتی ہیں اور آنکھوں کے ساتھ ان کا قطب مخالف یعنی نور۔ نور کے متعلق تجریدی فکر، بصیرت کی طرف رہنمائی کر سکتا ہے (اور فی الواقع کی بھی ہے) جس سے ہم لہروں اور گھن گرج کے متعلق تصورات قائم کرتے ہیں۔ مگر اس عمل میں اہمیت واقعیت کو حاصل ہے، کیونکہ اس تجربے کے بعد حیات کی حقیقت کا عرفان بصارت ہی سے کیا جاتا ہے۔ یہی وہ بے بہا نعمت ہے جو انسان کا حقیقی مقام متعین کرتی ہے۔ آنکھوں

کی اس روشن دنیا سے رنگوں اور چمک دمک کی دنیا اور دن رات کا فرق ظاہر ہوتا ہے اور لامتناہی روشن مکان میں اشیا اور حرکات کا تصور ابھرتا ہے اور ہم دور فاصلوں پر ستاروں کی چمک کا مشاہدہ کرتے ہیں جو افلاک پر محوِ گردش معلوم ہوتے ہیں اور شفق کی وہ روشنی جو افلاک پر پھیلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

اس عالم نور میں صرف روشنی ہی نہیں' جو سائنس نے ذہنی تصورات کی بصارت اور بصیرت سے نشان زد کی ہے (یونانی نظریہ) بلکہ یہ قوت باصرہ ہی ہے' جس کی بدولت کرہ ارض پر بسنے والے انسانی گروہ اجرام فلکی کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اسی روشنی کی بدولت جنوب میں مصر اور میکسیکو میں آنے والے طوفانوں کا اندازہ کر لیا جاتا تھا اور شمالی باشندے اپنی تمام زندگی کی منصوبہ بندی کا تعین کر لیتے ہیں۔ یہ آنکھ ہی تو ہے جس کی بدولت فن تعمیر کا جادو جگایا جاتا اور تعمیر میں ایسے عناصر استعمال کیے جاتے ہیں جو انعکاس نور کی بہار پیدا کرتے ہیں۔ مذہب' فن اور فکر سب اس نور ہی کے لیے پیدا ہوئے ہیں اور تمام صرف ایک نقطے پر پہنچ کر ختم ہو جاتے ہیں کہ یہ سب مضمون بصارت کے لیے ہے یا بصیرت کے لیے۔

اس کے ساتھ ہی واضح طور پر ایک اور امتیاز وجود میں آتا ہے' جو بالعموم "شعور" کے مبہم لفظ کے ساتھ مزید ابہام کا شکار ہو جاتا ہے۔ میں بغرض امتیاز "تکوین" یا "مقام تکوین" کی اصطلاحات کو "تکوین بیدار" یا "شعور بیدار" کی اصطلاحات پر ترجیح دیتا ہوں تکوین میں تال اور سمت دونوں ہوتے ہیں جبکہ شعور بیدار میں کشاکش (تناؤ) اور امتداد دونوں پائے جاتے ہیں۔ تکوین میں قضا و قدر کی حکومت ہے' جبکہ شعور بیدار علت و معلول میں الجھا ہوا ہے۔ اس لیے بنیادی سوال صرف ایک ہے: کب؟ اور کہاں سے؟ اور دوسری صورت میں کہاں؟ اور کیسے؟

نباتات میں بھی زندگی موجود ہے مگر شعور بیدار نہیں۔ حالت خواب میں تمام مخلوق نباتات کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اس حالت میں ماحول کے ساتھ کشاکش (تطبیت) کا خاتمہ ہو جاتا ہے' مگر دل کی حرکت جاری رہتی ہے۔ نباتات صرف کب اور کہاں سے آشنا ہے۔ موسم سرما کی سرزمین سے جب پہلی ہری کونپلیں نکلتی ہیں' جب غنچے فربہی اختیار کرتے ہیں تو بہار کا عمل۔ خوشبو' رنگ' شان و شوکت اور پختگی۔ وجود میں آ جاتا ہے۔ یہ ایک انجام کی آرزو ہے۔ ایک مسلسل آرزو جس کی منزل "کب" ہے۔

اس کے برخلاف مقام (کہاں) کا نباتات کی زندگی میں کوئی مفہوم نہیں۔ یہ وہ سوال ہے جو زندہ انسان کو ہر روز درپیش ہوتا ہے' کیونکہ اسے اس دنیا میں اپنے مقام کا تعین کرنا ضروری ہوتا ہے اور یہ صرف تکوین کی نبض کی رفتار ہے' جو نسلوں تک قائم رہتی ہے' جبکہ شعور بیدار ہر عالم صغریٰ میں آغاز نو کا مرتکب ہوتا ہے۔ نسل کشی اور ولادت میں یہی فرق ہے۔ اول الذکر میں میقات کا بندھن موجود ہے جبکہ ثانی الذکر میں آغاز نو درپیش ہے۔ اس لیے نباتات کی پرورش اور افزائش کی جاتی ہے' اس کی ولادت نہیں ہوتی۔ وہ ایک خاص مقام پر موجود ہے مگر نہ ان میں شعور بیدار موجود ہے نہ کوئی اس کی سالگرہ کا مسئلہ

ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے ماحول میں وسعت پیدا ہوتی رہتی ہے یعنی وہ زیادہ جگہ گھیرنے لگتا ہے۔

۲

اس مقام پر ہمارا انسان سے آمنا سامنا ہو جاتا ہے۔ انسان کے شعور بیدار میں' آنکھوں کی نئی حکومت میں کوئی خلل نہیں پڑتا۔ رات کی آواز میں' ہوا کی سرسراہٹ' جانوروں کے ہانپنے کی آواز' پھولوں کے رنگ عالم نور میں کہاں اور کب کے سوالات اٹھاتے ہیں۔ جہاں خوشبو' جس کے متعلق انسان کا قریب ترین دوست اپنے شامہ اور بصری تاثرات کو یکجا کر کے اظہار کرتا ہے' ہم اس تصور سے قطعاً" نا آشنا ہیں۔ ہم تتلی کی دنیا کے متعلق کچھ نہیں جانتے جس کی بلوری آنکھیں کسی مرکب تصویر کی تشکیل نہیں کرتیں اور پھر وہ حیوان اگرچہ حواس سے قطعی محروم تو نہیں لیکن بے بصر ہیں۔ ہمارے پاس فضا سے متعلق جو کچھ بھی تصورات ہیں وہ مرہون بصارت ہیں اگرچہ کہیں کہیں دوسرے حواس کا عمل بھی بروئے کار آیا ہے (مثلاً آواز' خوشبوئیں' گرمی اور سردی) اور اس کی حیثیت منور اشیا کی صفات تک ہی محدود رہی ہے۔ ہم آگ کو دیکھتے ہیں کہ وہ ہمیں حرارت پہنچاتی ہے' گلاب کی نشاندہی بصارت ہی سے ہوتی ہے اگرچہ وہ ہمیں خوشبو فراہم کرتا ہے اور سارنگی کے کسی سر کو ہم اس لیے سارنگی کا سر کہتے ہیں کہ ہم نے سارنگی کو دیکھا ہوا ہے اور ستاروں کے متعلق تو ہمارا شعور محض قوت باصرہ تک ہی محدود ہے۔ وہ ہمارے سروں پر چمکتے ہیں اور اس طرح ہمیں ان کے راستوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ مگر حواس کی ان دنیاؤں میں ابتدائی انسان اور بعض حیوانات کا تحسس ہم سے بہت مختلف ہے۔ ان تحسسات میں بعض کو ہم بالواسطہ قدیم سائنسی مفروضات کے ذریعے حل کر چکے ہیں' مگر ابھی تک بعض ایسے مسائل موجود ہیں جو ہماری رسائی سے بالاتر ہیں۔

حواسی ادراک کی یہ مفلسی ایک لامحدود عمق کی مظہر ہے۔ اس کے بعد انسانی شعور بیدار' جسم اور ماحول کے مابین کشاکش تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ ایک خود مکتفی عالم نور کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جسم ایک ایسے مکان میں منتقل ہو جاتا ہے' جسے دیکھا جا سکتا ہے' عمق کا تجربہ مرکز نور سے فاصلے کا مرئی تصور ہے۔ وہ نقطہ جسے ہم "خودی" کہتے ہیں' وہ تصور نور ہی ہے۔ اس تصور کے بعد خودی کی حیات عالم امکان میں سورج تلے اپنا وجود حاصل کرتی ہے اور اس میں سے بھی خوف کا ایک نیا احساس ابھرتا ہے' جو ہر ماسوئی کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ غیر مرئی کا خوف' آواز کے احساس کا خوف' شک کی صورت میں یا مشاہدہ اثرات کی بنا پر بغیر دیکھے خوف۔ حیوانات بعض دیگر صورتوں میں خوفزدہ ہوتے ہیں' مگر انسان ایسے خوف کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ خاموشی اور جمود کا خوف جو ابتدائی انسان اور بچوں کو خوفزدہ کرتا ہے (جس سے نجات حاصل کرنے کے لیے وہ بلند آواز سے بولتے اور شور مچاتے ہیں!) مگر ترقی یافتہ انسان اس سے متاثر نہیں ہوتا۔ غیر مرئی اشیا کا خوف ہی مذہب کی نصف بنیاد ہے۔ دیوتاؤں کا قیاس کیا جاتا ہے' تصور قائم کیا جاتا ہے اور انھیں حقیقی فرض کر لیا جاتا ہے اور ایک غیر مرئی' تجریدی خدا کا تصور انسانی فکر کا کمال ہے۔ جہاں تک روشنی کا وجود ہے' وہاں سے آگے مزید وسعت کی گنجائش بھی رہتی ہے اور اسی عالم نور اور

اس کی قوتوں کے اثرات سے آزادی ہی نجات کا مفہوم ہے۔

موسیقی کی ناقابل بیان اثر انگیزی کی قوت اسی میں پوشیدہ ہے۔ صرف موسیقی ہی ایسا جادو ہے جو روشنی کا محتاج نہیں اور اس کے باوجود ہزاروں سال سے انسان کا ساتھی رہا ہے اور ہمیں اس دنیا سے باہر لے جاتا ہے اور روشنی کی محیط احاطہ بندیوں سے باہر لے جا کر یہ احساس دلاتا ہے کہ روح کی کلی معرفت تک رسائی کے قریب ہیں۔ اس التباس کی بنا پر کہ ہمارا شعور مدرکہ ایک ہی حس کے زیر بار ہے۔ ہمارا بصارت پر انحصار اس قدر بڑھ جاتا ہے' کہ وہ قوت سماعت کے اثرات بھی قبول کرنے لگتا ہے۔

لہٰذا انسانی فکر بصری فکر ہے یا تمام تصورات بصارت سے حاصل کیے گئے ہیں اور ہماری فکر کا تمام تانا بانا عالم بصری کے تخیلات کا مرہون منت ہے۔ ہم ذرا اختصار سے کام لیں اور اس کے نتیجے میں گہرائی میں جائیں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ ہمارا تمام حسی ادراک بصارت کے حوالے ہی سے منظم کیا گیا ہے اور یہ کہ تمام حیوانات کو اپنے حسی اظہار کے لیے صرف ایک وسیلہ دستیاب ہے یعنی نطق اور اسی سے دو افراد کے مابین ایک پل کا کام لیا جاتا ہے۔ اس میں بصارت اور بصیرت کا عمل بھی شامل ہے۔ اظہار کے دیگر طریق جن کے نام و نشان موجود ہیں مگر مدت سے زبان ہی کے دائرہ کار میں شامل کیے جا چکے ہیں' وہ نقالی' حرکات اور زور دے کر آواز میں نشیب و فراز پیدا کرتا ہے۔ انسانی گفتگو اور عام حیوانی اظہار میں فرق الفاظ اور الفاظ کی بندش کا ہے' جس میں داخلی تصورات مضمر ہوتے ہیں' جو بصارت کی حکومت کے تحت مرتب کیے گئے ہیں' ہر لفظ کے معانی میں روشنی کا پہلو نمایاں ہوتا ہے' ایسے الفاظ میں مثلاً : دھن' ذوق' خنک یا مکمل طور پر کسی تجریدی صفت میں بھی بصارت کا دخل خارج نہیں ہوتا۔

ارفع حیوانات میں بھی باہمی ادراک کی حواس کے رابطے کے ذریعے تفہیم کے باہمی عمل میں خالص تحس اور مدرکہ تحس میں فرق موجود رہتا ہے۔ اگر ہم تحسی تاثرات اور تحسی فیصلوں کا اس طرح جائزہ لیں (ذائقہ کے متعلق فیصلہ' خوشبو کے متعلق فیصلہ' یا سماعت کے متعلق فیصلہ) تو ہمیں معلوم ہو گا کہ اکثر چیونٹیاں اور شہد کی مکھیاں' شکاری پرندوں کا تو معاملہ ہی الگ ہے' گھوڑوں اور کتوں میں بھی مرکز ثقل شعوری کیفیت کی طرف مائل رہتا ہے۔ مگر ان سب پر زبان کے اثرات ہی ہیں جو شعور بیدار میں تحس اور ادراک میں امتیاز قائم کرتے ہیں۔ یہ تناؤ حیوانات کے متعلق تو سوچی بھی نہیں جا سکتی' بلکہ انسانوں میں بھی اس کا وقوع شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ زبان کے ارتقا نے ایک بنیادی اہمیت کو متعین کیا' وہ حواس کے اظہار کا ادراک ہے۔

زیادہ سے زیادہ مواقعات پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مواد میں سے اہم تاثرات کو ادراک قبول کر لیتا ہے اور بعض ایسے نکات کا انتخاب کر لیتا ہے' جو اس سے قبل کبھی زیر غور ہی نہیں آئے۔
بالآخر ایسے تاثرات کو دنیائے معانی سے خارج کر دیا جاتا ہے اور ان کی جگہ ایسے طریق اظہار کو رواج دیا

جاتا ہے' جو آشنا صوتیات الفاظ پر مشتمل ہوں یعنی ایک مرئی شے کے نام کو اس کے تصور سے بدل دیا جاتا ہے۔ اگرچہ ہم ان اشیا کے اسما کو متعین کرنے کی منزل سے بہت دور ہوتے ہیں۔ ہم ایک لفظ دو ملتے جلتے مفاہیم کے لیے استعمال نہیں کرتے تاکہ جو کچھ ہم کہنا چاہیں وہ دوسرے بآسانی سمجھ سکیں' مگر باہمی تفہیم اس کے باوجود ممکن رہتی ہے' کیونکہ متکلم اور مخاطب میں الفاظ و معانی کا تصور یکساں ہوتا ہے' جو مشترک زبان کی بدولت وجود میں آتا ہے جو تمام تصورات کے لیے متعین الفاظ و معانی کا احاطہ کرتا ہے۔ یہی الفاظ کے حوالے سے ادراک کا اصول ہے' جو ترقی کر کے تجریدی صورت اختیار کر لیتا ہے' مگر یہ صورت کسی ثقافت کے ابتدائی ادوار میں نہیں ہوتی' ان ادوار میں اشیا کو ان کے اصل اسما کے حوالے ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ حیوانات بھی عمل تجرید سے واقف نہیں۔ یہ شعور بیدار ہی ہے جو نباتات اور حیوانات اور انسان میں امتیاز قائم کرتا ہے۔

ادراک کو تحس سے علیحدہ کر لیں تو اسے "فکر" کہا جاتا ہے۔ فکر نے انسانی شعور بیدار میں ایک مستقل انتشار پیدا کر دیا ہے۔ زمانہ قدیم ہی سے اس نے ادنیٰ اور اعلیٰ ادراک کے معیار کی تقسیم قائم کر رکھی ہے۔ اس نے مختلف بصری مدارج : غیر حقیقی التباس کا امتیاز قائم کر رکھا ہے' (اس طرح ایک عالم تخیل قائم کر رکھا ہے) جس میں کہ تصورات اپنے کمزور مگر قائم الوان نور زندہ اور سرگرم عمل رہتے ہیں اور اس کے بعد انسان جہاں تک کہ وہ سوچ سکتا ہے' یہی عالم اس کی حقیقی دنیا ہے۔ ایک خود مکتفی جہان جس میں اسے کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی' ابتدا میں تو انسانی خودی بیدار تھی' (جہاں تک کہ وہ دیکھ اور محسوس کر سکتی تھی وہ اپنے آپ کو اس جہان رنگ و نور کا مرکز سمجھتی تھی) اس کے بعد وہ روح کی صورت اختیار کر لیتی ہے' جسے عرفان ذات حاصل ہے اور اسے نہ صرف اپنے جہان کا ادراک حاصل ہو جاتا ہے بلکہ وہ حیات کے دیگر اجزائے ترکیبی سے بھی آشنا ہو جاتی ہے۔ یہ نہ صرف انسان کی استادگی قامت سے ظاہر ہے' بلکہ اس کے سر کی تشکیل بھی اس کی تائید کرتی ہے' جس میں کہ اس کی آنکھیں' ابرو' کھوپڑی' اس کے عمل اظہار میں ممد ہوتے ہیں۔

اس عمل کی بدولت فکر نے آزاد ہو کر اپنا میدان عمل تلاش کر لیا۔ وہ فکر جس کی بنیاد اپنے ماحول میں نظر آنے والی اشیا سے متعلق تھی اور اس کے مقصد اور حوالہ کے عملی مقصد تک محدود تھی' اس نے نظریاتی' فہم و فراست اور لطافت پر مبنی فکر کی تجریدی صورت اختیار کر لی' جس سے اشیا کا وجودی پہلو خارج ہو گیا۔ جس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا' کہ نور خود ایک تجریدی کیفیت ہے' اور عمق ایک تجربہ ہے جس کا شعور الفاظ کے مطالب کے حوالے سے ہوتا ہے' اور انسان بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت کے واسطے سے بھی شعور و ادراک حاصل کرتا ہے۔ ایک تصور کے بعد دوسرا تصور وجود میں آتا ہے اور اسی عمل کے تحت ماہر تعمیرات فلک بوس عمارات تعمیر کرتا ہے اور ان کی وجہ سے ان کے خالق کی داخلی بصیرت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

انسانی شعور بیدار کے اندر انسانی فکر کا ارتقا ایسی کیفیت پیدا کرتا ہے جو تکوین (حیات) اور شعوری

تکوین (شعور بیدار) ایک تازہ کشمکش کا موجب بنتی ہے۔ حیوانی حیات صغریٰ جس میں حیات اور شعور ایک بدیہی اتحاد زندگی کی صورت میں نظر آتے ہیں' شعور کو صرف خادم وجود ہی کی صورت میں جانتی ہے۔ ایک حیوان محض زندگی گزارتا ہے مگر زندگی کے متعلق تفکر سے عاری ہے۔ چونکہ اس کی ذات پر قوت باصرہ کی غیر مشروط حکومت ہے' اس لیے اس کے نزدیک زندگی کا وجود صرف مرئی حقائق تک محدود ہے لیکن جب اسے تکلم کا بہرہ حاصل ہو جائے تو فورا" ہی فکر کا تصور بھی وجود میں آ جاتا ہے ۔ اور اس نئے تصور کی بدولت وہ زندگی کی حقیقی کیفیت سے آشنائی حاصل کر لیتا ہے۔ حیات کا عمل مستقیم نہیں ہوتا بلکہ اس میں فکر اور عمل دونوں عناصر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ یہ کیفیت حیوانات میں تو پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ ہر انسان بھی اس سے بہرہ ور نہیں ہوتا' مگر یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا عرفان ہر انسان کے لیے ناگزیر ہے۔ ترقی یافتہ انسانیت کی تمام تاریخ اور ماحول اسی سے تشکیل پاتے ہیں' اور ثقافت جس قدر عروج حاصل کرتی ہے' اس میں فکر و عمل کا یہ تضاد غالب رہتا ہے اور اس کی شعوری تکوین میں ان لمحات کی اہمیت قائم رہتی ہے۔

کائنات میں لاتعداد تکوینی عناصر' قضا و قدر' خون' جنس ازل ہی سے موجود ہیں اور قائم رہتے ہیں۔ زندگی انھیں سے عبارت ہے۔ ان کے علاوہ جو کچھ ہے وہ زندگی کی خدمت بجا لانے کے لیے ہے۔ مگر دیگر عناصر خدمت کی بجائے حکمرانی کا عزم رکھتے ہیں اور انھیں یقین ہے کہ وہ حاکم ہیں۔ کیونکہ انسانی روح کا سب سے بڑا تقاضا یہی ہے کہ وہ جسم یعنی "فطرت" کی تسخیر کرے مگر سوال یہ ہے کہ کیا صرف یہ اعتقاد ہی زندگی کی خدمت نہیں؟ ہماری فکر اس کے متعلق غور کیوں کرتی ہے؟ غالبا" اس لیے کہ کائناتی عزم اس کا متقاضی ہے' اس لیے اس کا ایسا ہونا ناگزیر ہے؟ فکر اپنی قوت سے اس وقت محروم ہو جاتی ہے جبکہ جسم کے متعلق وہ اپنا تصور قائم کر لیتی ہے۔ جب اس کا جسم کے متعلق جذبہ رحم غالب آ جاتا ہے' اور وہ خون کی آواز کو دبا کر خاموش کر دیتی ہے مگر فی الحقیقت خون ہی حکومت کرتا ہے اور وہی فکر کی فعالیت کو سرگرم عمل یا خاموش کر دیتا ہے' اس موقع پر بھی تکلم اور حیات میں امتیاز موجود ہے۔ تکوین شعور کے بغیر ہو سکتی ہے اور زندگی ادراک کے بغیر ممکن ہے مگر اس کے برعکس نہیں ہو سکتا۔ بالآخر حکمرانی فکر ہی کا مقدر ہے ان تمام عناصر و عوامل کے باوجود حکمرانی فکر ہی کا مقدر ہے۔

۳

یہ صرف الفاظ کا الٹ پھیر ہے کہ ہم یہ کہیں کہ فکر انسان کی تخلیق ہے یا ارفع بنی نوع انسان فکر کا پیدا کردہ ہے۔ مگر فکر کا زندگی کی فعالیتوں میں مقام بہت بلند ہے اور اس سے عدم واقفیت یا عدم توجہ کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ اس کے علاوہ دیگر حقائق بھی جائزے کے عمل پر قادر ہیں' تو اس کے نتیجے میں فکر اپنی فوقیت کے مقام سے محروم ہو جاتی ہے۔ فی الحقیقت فکر کے تمام اساتذہ نے----- اور ہر ثقافت میں یہی لوگ اظہار رائے کے مجاز ہیں----- اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ فکر کا خنک استدلال ہی حتمی نتائج کا ذریعہ ہے اور انھوں نے اسے بھی بنیادی اہمیت دی ہے کہ اس راستے پر چل کر وہ اسی مقام

تک پہنچتے ہیں' جسے وہ حقیقت کا نام دیتے ہیں اور جو ان کا متعینہ مقصد ہے اور یہ کوئی تخیلاتی تصویر نہیں جو رازہائے سربستہ کو افشا کرنے کے قابل سمجھی جائے۔

اگرچہ انسان ایک صاحب فکر حیوان ہے مگر یہ امر حقیقت سے بعید ہے کہ اس کی تکوین میں بھی فکر شامل ہے۔ یہی فرق ہے جسے پیدائشی نکتہ سنج سمجھنے سے قاصر ہے۔ فکر کا مقصد دریافت حقیقت ہے اور حقیقت اور صداقت کو ثابت کرنا پڑتا ہے۔ یعنی ان کو زندہ اور روشن عالم محسوس سے نکال کر تصورات کی دنیا میں لانا پڑتا ہے اور نظام میں ان کو مستقل مقام عطا کیا جاتا ہے اور اس طرح وہ فکر کا حصہ بن جاتی ہیں۔ صداقت ازلی اور حتمی ہوتی ہے اور ان کا دنیا کے ادنیٰ معمولات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مگر ایک حیوان کے لیے صداقت کی کوئی حقیقت نہیں۔ وہ صرف واقعات سے آشنا ہے۔ عملی اور نظری ادراک میں یہی فرق ہے۔ واقعات اور حقائق میں وہی فرق ہے' جو زمان و مکان میں ہے یا قضا و قدر اور سلسلہ علت و معلول میں ہے۔ ایک واقعہ شعور بیدار کو من حیث الکل مخاطب کرتا ہے تاکہ تکوین کی خدمت کر سکے' نہ کہ شعور بیدار کے لیے جس کے متعلق اس کا تصور ہے کہ وہ اسے تکوین سے علیحدہ کرتا ہے۔ حقیقی حیات یعنی تاریخ صرف واقعات سے آشنا ہے۔ اس کا دائرہ کار انھیں تک محدود ہے۔ ایک فعال انسان جو عمل پیرا ہوتا ہے' عزم کا اظہار کرتا ہے' اور جنگ آزما ہوتا ہے' وہ واقعات کی قوت کے ساتھ زور آزمائی کرتا ہے اور محض صداقت کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے۔ حقیقی مدبر صرف سیاسی واقعات کا علم رکھتا ہے مگر سیاسی حقائق سے بے خبر رہتا ہے' افلاطون کا مشہور مسئلہ ہر شخص کے واقعات تک محدود تھا۔

یہ نطشے کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے سائنس کو صداقت اور علم کے مسائل کی قدر و قیمت سے روشناس کرایا۔ اسے اگرچہ گھٹیا اور گستاخانہ عمل سمجھا گیا اور علما و فضلا کے نزدیک تو یہ عمل دخل در معقولات کے زمرے میں آتا تھا۔ ڈیسکارٹیز ہر شے پر شک کرنے کا قائل تھا مگر اسے اپنے عمل تشکیک پر کبھی شک نہیں ہوا۔

مسائل پیدا کرنا ایک الگ عمل ہے' مگر ان کا حل تلاش کرنے پر اعتقاد ایک دوسرا عمل ہے۔ ایک پودا بھی زندہ ہے اور اسے اپنی زندگی کا علم بھی ہے' مگر انسان اپنی زندگی پر حیران ہے اور اس کے متعلق سوال اٹھاتا ہے' مگر انسان خود بھی اپنے سوالات کا جواب دینے سے قاصر ہے' اور اس معاملے میں ارسطو اور ایک وحشی میں کوئی فرق نہیں۔

مگر جب یہ صورت حال ہو تو ان رازہائے سربستہ کا افشا ہونا ضروری ہے' اور ان سوالات کا جواب ناگزیر ہے۔ یہ اس خوف کا نتیجہ نہیں' جو ہمیں ایک بچے کی آنکھوں میں بھی دکھائی دیتا ہے کہ انسانی شعور

بیدار کا خوفناک جہیز اس امر پر مجبور کرتا ہے کہ اسے سمجھا جائے اور اسے تجسس سے آزاد کر کے اور تصورات پر غم زدہ ہونے سے بچا لیا جائے اور ہر اس حل پر غور کیا جائے جو انسان کو اس مشکل سے نجات دلا سکے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ علم کی دولت ہمیں ان سوالات کے خوفناک خواب سے نجات دلا سکتی ہے؟

لرزہ خیز تحیر بنی نوع انسان کا شریفانہ وصف ہے۔ وہ شخص بھی اس عنایت سے محروم رہا ہے جو ان سربستہ رازوں سے آشنا ہونا چاہتا ہے اور اس امر کے لیے وہ ہر قسم کی کوشش، عمل جراحی، اور تحیر آمیز رکاوٹوں کو توڑنے پر عمل پیرا ہے اور اس کی بنیاد پر علم کا انعام حاصل کرنا چاہتا ہے۔ عزم لی النظام سے مراد کسی ذی حیات کا قتل ہے تاکہ وہ اپنے قائم کردہ نظام کا نفاذ اور قیام مضبوط بنا جا سکے اور منطق کا سلسلہ مستحکم کیا جا سکے۔ عقل کی فتح کا دارومدار ہمیشہ اصولوں پر سختی سے عمل پر رہا ہے۔

اور یہ امتیاز جو عقل محض اور ادراک میں قائم کیا جاتا ہے، فی الحقیقت انسان کے نباتاتی پہلو کے خیاب اور بھڑکیلے پن کا فرق ہے۔ کیونکہ اس صورت میں صرف قوت سامعہ اور باصرہ ہی کا استعمال ہوتا ہے اور ادراک، حیوانی پہلو تک محدود رہتا ہے جو تکلم کے واسطے سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس معاملے میں عقل (استدلال) کا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ تصورات کو حیات میں شامل کرے اور ایسا فہم تخلیق کرے جو صداقت کو دریافت کر سکے۔ تصور اپنے خالق کی زندہ ذات کا حصہ ہوتا ہے، اور ہمدردانہ غور و فکر ہی سے اس تک رسائی ہو سکتی ہے۔ ادراک ایک تنقیدی عمل ہے، جبکہ استدلال (عقل محض) لازماً" ایک تخلیقی فعالیت ہے۔ ثانی الذکر اپنی فعالیت کا مقصد پا لیتا ہے جبکہ اول الذکر اپنے عمل کا آغاز اس نقطے ہی سے کرتا ہے۔ فی الحقیقت تنقید کا ادراک عام حواس ہی کی مدد سے زیر عمل لایا جاتا ہے اور اسے ترقی دی جاتی ہے۔ ایک بچہ تجسس کے فیصلے ہی کی مدد سے ادراک حاصل کرتا ہے اور مختلف معاملات میں امتیاز قائم کرتا ہے۔ بعد ازاں اس تعلق کو ترک کر کے تجریدی تصورات قائم کر لیتا ہے اور ان کو زیر عمل لاتا ہے۔ تنقید کو تحسی فعالیت کے ایسے بدل کی ضرورت ہوتی ہے جو قبل ازیں اس کے تجربے میں آ چکا ہو اور یہ قبل ازیں موجود کے تخیل کے علاوہ کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں کیا جاسکتا اور تنقید کی عملی بنیاد اسی پر ہے اور صرف اسی پر یہ بنیاد قائم کی جا سکتی ہے۔ تفکر کو کسی عدم یا لا موجود بنیاد پر تعمیر نہیں کیا جاسکتا۔

بہت قدیم دور میں جبکہ ابتدائی انسان نے تجریدی فکر کا آغاز کیا اور اپنے لیے مذہب کی رو سے عالمی صورت تشکیل کی یہی وہ مقصد تھا جس پر کہ ادراک کی منزل پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی۔ سائنس کی بنیاد مذہب ہی پر استوار ہوئی، اور مذہبی مسلمات کی روشنی ہی میں اس کی نشوونما ہوئی اور انھیں تجریدی تصورات کی صلاحیتوں پر سائنس کے اصول قائم ہوئے، جو کم تجریدی تھے وہ غلط سمجھے گئے۔ تمام سائنسی مسائل کا بیان، اصولوں کا ذخیرہ اور طریقہ ہائے کار مذہبی مزاج کے مطابق ہی طے کیے گئے۔ ہر نئی صداقت جسے ادراک قبول کرتا ہے، وہ کسی پہلے سے موجود اصول پر تنقیدی فیصلے کی صورت ہوتی ہے۔ قدیم اور جدید علمی اصولوں میں اختلاف ماسوائے اس کے کچھ نہیں کہ عالم ادراک میں بعض واقعات مقابلتاً" درست ہیں، یعنی کوئی فیصلہ

دوسرے فیصلوں کے مقابلے میں زیادہ قابل قبول ہے۔ تنقیدی علم کا انحصار اس حقیقت پر ہے کہ ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ ہماری آج کی سمجھ بوجھ ماضی کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہے، اور یہ اعتقاد ہماری زندگی کے تجربات کی بدولت پیدا ہوتا ہے۔

کیا تنقید بحیثیت تنقید عظیم مسائل کے حل کے لیے کافی ہے؟ یا کیا یہ نئے سوالات پیش کر سکتی ہے؟ علم کے ابتدائی مدارج میں صورت کو قبول کرتے ہیں، مگر جوں جوں ہمارے علم میں اضافہ ہوتا ہے، تو ثانی الذکر پر ہمارے یقین میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جب تک ہماری امید قائم ہے، ہم راز ہائے سربستہ کو مسائل ہی سمجھتے ہیں، جن کا حل ممکن ہے۔

پس دانش مند بنی نوع انسان کے لیے دو مسائل ہیں: ایک تکوین بیدار اور دوسرا تکوین، یا مکان اور زمان، یا یہ دنیا بطور فطرت، اور دنیا بطور تاریخ یا نبض اور ہیجان۔ شعور بیدار نہ صرف اپنی ذات کا عرفان چاہتا ہے، مگر اس کے علاوہ بھی کچھ اور جو اس کے مشابہ ہو۔ گو داخلی طور پر کوئی یہ اقرار کرے کہ علم کے تمام امکانات پیچھے رہ گئے ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ سعی بلیغ جاری رکھے، مگر ہر شخص اپنی تحقیق جاری رکھتا ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس نے علمی مسائل کا حل تلاش کر لیا ہے، اور میدان علم میں اپنے مشاہدات جاری رکھتا ہے۔

۴

شعور بیدار تجسس اور تفہیم سے مرکب ہے اور ان کی مشترکہ روح کائنات سے مسلسل تسویہ کی شکل ہے۔ اس حد تک شعور بیدار اور یقین آپس میں مشابہ ہیں کہ خواہ ہم اسے زندگی کی روح کہیں یا انسانی فکر کا بلند پایہ کرشمہ۔ احساس کو اس معاملے میں اپنی ذات سے بمقابلہ شعور بیدار علمی مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ وقوف سے ہماری مراد کیا ہے؟ یا علم کے وقوف سے ہماری مراد کیا ہے؟ اور ان اصطلاحات کے ابتدائی معانی کیا تھے؟ اور بعد میں ان کا استعمال کن معانی میں مروج ہوا؟ بیداری اور نیند باری باری سے دن اور رات کی طرح ستاروں کی چال کی طرح رواں دواں ہے۔ اس طرح وقوف اور خواب ایک دوسرے کے بعد واقع ہوتے ہیں۔ ان دونوں کے مابین کیا فرق ہے؟

بہرحال، شعور بیدار کا تعلق خواہ تجسس سے ہو یا ادراک سے، وہ وجود اختلاف کا ہم معنی ہے۔ جیسا کہ وقوف اور اشیائے مدرکہ یا شے اور صفت یا شے اور واقعہ، ان میں روح اختلاف کا مقام کہاں ہے؟ اور اس سے دوسرا مسئلہ پیدا ہوتا ہے یعنی مسئلہ علت و معلول۔ جب ہم علت اور معلول کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں زیر نظر خواہ دو عناصر ہوں، یا کیفیت ہو یا نتائج ہوں، یا دو ذہنی عناصر ہوں، تو ہم ان کے مابین ایک قوت اور صف کا رشتہ قائم کر لیتے ہیں۔ جب ان میں سے ایک موجود ہو، تو دوسرا بھی موجود ہو گا۔ غور

کریں کہ اس رشتے میں زبان کا کوئی وجود نہیں۔ ہمارا تعلق واقعات کے انجام سے نہیں' بلکہ صداقت علت سے ہے۔ اس میں "کب" کا کوئی مسئلہ نہیں۔ بلکہ قانون کے مطابق مقررہ انحصار ہے۔ بلاشک و شبہ یہ ادراک کا بہترین طریق کار ہے اور فعالیت کی سب سے زیادہ ثمر آور راہ ہے۔ بنی نوع انسان کو اس طریق کار سے کثیر تعداد میں دریافتوں کی مسرتیں حاصل ہوئی ہیں۔ چنانچہ وہ انھیں افتراقات سے وہ روز مرہ کے حقائق اور ضروریات زندگی کے حصول کے لیے سفر کا آغاز کرتا ہے' جو اسے بروقت سوجھ جاتی ہے۔ انسان نے اس اصول کی بنیاد پر علت اولیٰ اور تامہ کی مدد سے ترقی کی بے شمار منازل طے کیں' اور فطرت کی تشکیل میں حتمی علت وہ ہے جسے خدا کہا جاتا ہے' اور کائنات کے معانی اسی کی ذات سے وابستہ ہیں۔ انسان ہر شے کو مجتمع کرتا ہے' ترتیب دیتا ہے اور اپنی تنظیم کا مشاہدہ کرتا ہے' اور قانون قدرت کے نظام پر عقیدہ رکھتا ہے اور اس طرح عالم غیب سے ظہور پذیر ہونے والی ابتلاؤں سے پناہ کا طالب ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد وہ اس ناگہانی خوف سے نجات حاصل کر لیتا ہے' مگر کیا اس عقیدے میں بھی سلسلہ علت و معلول کی کوئی گنجائش ہے؟ کیا ادراک میں یا مدرکہ میں یا دونوں کے اتحاد میں اس کا کوئی وجود ہے؟

عالم کشاکش بذاتہ جامد اور مردہ ہے۔ یہ ایک ازلی حقیقت ہے ہر قسم کی زمانی قیود سے ماورئی ایک ایسی شے جسے کیفیت ہی کہہ سکتے ہیں۔ کسی حیوان پر ان خیالات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ مگر صاحب فکر انسان ان خیالات سے عاجز آ جاتا ہے۔ اس کے لیے سکون' حرمت' میقات اور تبدیلی' تکوین اور وجود(۱۳) تمام اختلافات اس پر کسی نہ کسی حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں۔ جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے تمام فہم و ادراک سے بالاتر ہوتا ہے اور اس لیے (تفہیم کے نقطہ نظر سے) مہمل دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ حقائق ہیں جنھوں دنیاوی عقل و فہم سے تقطیر نہیں کیا جاسکتا' اور انسان کے تیار کردہ حقائق کے معیاروں پر پرکھا نہیں جا سکتا۔ ایک طرف تو کائنات کو لا زمانی کہا جاتا ہے' مگر اس کے باوجود زمانی عنصر اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ پس یہ سارا معاملہ عالم شعور سے ماورئی رہتا ہے۔ اور ایک بہت بڑے مسئلے سے منسلک رہتا ہے' جسے مسئلہ حرکت کہا جاتا ہے۔ اور اس مقام پر آزاد اور تجریدی فکر ساتھ دینے سے قاصر رہتی ہے۔ اور ہم عالم صغریٰ کو عالم کبریٰ سے منسلک کرنے کا نقطہ پیدا کر لیتے ہیں' بلکہ اسی طرح جس طرح کہ انسانی جسم ایک غلاف میں ملفوف ہے۔ زندگی بغیر فکر کے ممکن ہے مگر فکر زندگی کا صرف ایک پہلو ہے۔ زندگی فکر کو اپنے مفاد میں استعمال کرتی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ فکر کے مقاصد کتنے ہی ارفع و اعلیٰ ہوں اور مسائل تفکر کتنے ہی تجریدی ہوں' وہ زندگی ہی کے مفاد میں عمل کرتے ہیں' فکر کے لیے مسائل کے حل درست ہوں یا غیر درست' زندگی کے لیے یا تو وہ باعث افادہ ہوں گے یا ان کی کوئی قدر و قیمت نہ ہو گی۔ اگر مسئلہ حرکت عزم لی العل کا سلسلہ منقطع ہو جائے تو اس کی وجہ محض یہ ہو گی کہ اس معاملے میں زندگی کا مقصد پورا ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود اور اس کی وجہ سے مسئلہ حرکت تمام فکر کا مرکز ثقل ہی رہتا ہے۔ تمام اساطیر اور طبیعی علوم مسئلہ حرکت کے انسانی استعجاب کی بدولت وجود میں آئے ہیں۔

مسئلہ حرکت براہ راست اور فوری طور پر حیات کے رازہائے سربستہ سے بحث کرتا ہے جو اگرچہ

شعور بیدار کے لیے اجنبی ہیں مگر پھر بھی اس پر شدید دباؤ ڈالتے ہیں۔ اسے بطور مسئلہ تسلیم کر لینے کے بعد ہم غیر مدرک کو بطور مدرک تسخیر کر لینے کا عزم کرتے ہیں۔ اور کب' کہاں' قضاء و قدر' خون' وغیرہ کو ہمارا وجدانی طریق کار گہری فکر کا موضوع بنا لیتا ہے' اور ہم قوت باصرہ سے مدد لینے کے لیے اسے روشنی میں لے آتے ہیں' تاکہ ہم صحیح معنوں میں اس پر گرفت حاصل کر سکیں اور اپنے آپ کو مطمئن کر سکیں کہ ہم نے کسی مادی شے پر قبضہ کر لیا ہے۔

کیونکہ یہی فیصلہ کن حقیقت ہے کہ جس کے متعلق مبصر نا آشنا ہے۔ اس کی تمام کاوش زندگی کی طرف مرکوز نہیں' بلکہ وہ صرف زندگی کا مشاہدہ کرنے کا آرزو مند ہے۔ وہ موت کے حقائق سے آشنائی نہیں چاہتا بلکہ وہ موت کو دیکھنا چاہتا ہے۔ ہم کائنات کو اس کی ظاہری صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں' جیسا کہ وہ ہمیں عالم صغریٰ میں نظر آتی ہے' جبکہ وہ عالم کبریٰ یا کائنات کبیر کا صرف ایک جزو ہے۔ جس طرح کہ ایک جسم کی زندگی جو ولادت اور موت کے مابین محدود ہوتی ہے۔ ولادت---- اور موت۔ اور جسم اور روح کی اس علیحدگی کے لزوم کے ساتھ ہمارے تجربے کی اس اہلیت کی نشاندہی ہوتی ہے جو کہ ہماری داخلیت میں بطور اجنبی نفس کے موجود ہے۔

ہم نہ صرف زندہ ہیں بلکہ عمل حیات سے آشنا بھی ہیں' مگر حیوان صرف زندگی سے نا آشنا ہے' مگر وہ مدت سے آشنا ہے۔ اگر ہم صرف نباتات کی نوع کی مخلوق ہوتے' ہمیں مدت کا کوئی شعور نہ ہوتا' کیونکہ ایسی صورت میں مرجانا یا موت کو محسوس کرنا ایک ہی عمل ہوتا۔ مگر حیوانات اگرچہ موت کی چیخیں سنتے ہیں اور مردوں کے تعفن کو سونگھتے ہیں اور مردہ لاشوں کو دیکھتے ہیں اور موت کا مشاہدہ کرنے کے باوجود اسے سمجھ نہیں سکتے۔ صرف اس وقت جبکہ شعور وجود میں آ جائے' اور زبان بغیر بصری مشاہدے کے اسے بیان کر سکے تو انسان کے لیے موت اس عالم بصارت کا ایک بہت بڑا معمہ بن کر سامنے آتی ہے۔

صرف اسی وقت' زندگی ایک ولادت اور موت کے مابین کا ایک مختصر دورانیہ نظر آتی ہے' اور یہ صرف موت ہی ہے جس کے حوالے سے ہمیں نسلوں کے پیچیدہ رازوں کی طرف توجہ کرنا پڑتی ہے۔ اور صرف اسی بناء پر حیوانی خوف کا نفوذ انسان میں موت کے خوف کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے اور مرد اور عورت میں محبت اور ماں اور بچے کی محبت' شجرہ ہائے نسب' خاندان' قبائل' اقوام اور بالآخر تاریخ عالم لامتناہی سنجیدہ واقعات' اور قضاء و قدر کے مسائل وجود پاتے ہیں۔ اس عالم نور و بصارت کا ہر شخص موت کو کسی جرم کی سزا سمجھتا ہے۔ اور حیات بعد الموت جو اس عالم بصارت کے بعد متوقع ہے' موت کے خوف سے نجات تصور کرتا ہے۔ موت کے متعلق تمام علم اس عالمی تصور سے ابھرتا ہے جو ہم بطور انسان قائم کرتے ہیں' حیوانات اس شعور سے بے بہرہ ہیں۔

۵

کچھ لوگ پیدائشی طور پر تقدیر کے دھنی اور کچھ اسباب کے محتاج ہوتے ہیں۔ خالص زندہ انسانوں کو دنیا الگ سے شناخت کرتی ہے۔ کسان اور جنگ جو' مدبر اور عام آدمی' دنیا دار انسان اور تاجر' ہر وہ شخص جو ترقی کرنا چاہتا ہے' حکومت کرنا چاہتا ہے' لڑنا چاہتا ہے' حوصلہ دکھاتا ہے۔ منتظم اور کاروباری' مہم جو یا بہادر یا جواری' وہ شخص جو اپنی دماغی قوت سے یا خون میں خرابی کی بنا پر ذہین و فطین ہو۔ راہب' عالم متبحر' تصور پرست یا تصور ساز' وجود کے حوالے سے وجود بیدار' نبض اور ہیجان' محرکات اور تصورات' اعضائے دوری' یا اعضائے لمس' الغرض ایسا کوئی اہم انسان نہیں گزرا جس کی زندگی کا کوئی نہ کوئی پہلو غیر معمولی اور نمایاں اوصاف کا حامل نہ ہوا ہو۔ تمام محرکات اور خواہشات' عوام اور حالات پر نگاہ' اپنی قسمت پر یقین' جو ہر صاحب عمل انسان کا وطیرہ ہے۔ یہ اپنے نقطہ نظر کی صحت پر یقین سے کسی حد تک مختلف ہے۔ آواز میں وہ جوش جو لحات فیصلہ میں سب پر غالب آ جائے اور اپنی ذات پر اعتماد جو ہر مقصد اور ذرائع حصول کی صحت کو ثابت کر سکے۔ یہ خوبیاں ناقد اور خیالی لوگوں میں نہیں پائی جاتیں۔ عالم ساز انسانوں کے پاؤں کی چاپ بھی عام انسانوں سے مختلف ہوتی ہے۔ میدان عمل کے شاہسوار فکر کی دنیا میں غلطاں انسانوں سے اس لحاظ سے بھی مختلف ہوتے ہیں کہ ان کی کائنات صغریٰ بھی زمین سے مستقل رشتہ استوار نہیں کرتی۔

قضا وَ قدر نے ہر شخص کی تقدیر کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ نازک مزاج اور حقائق سے گریز پا' فعال اور فکری متکبر' مگر فعال نوعیت کا انسان ایک کامل انسان ہوتا ہے' جبکہ غور و فکر میں مستغرق انسان کا صرف ایک عضو برسر کار ہوتا ہے (اور یہ فعل جسم کے خلاف بھی ہو سکتا ہے) اور باقی جسم اس کے ساتھ شامل نہیں ہوتا اور وہ حالت انتہائی خطرناک ہوتی ہے' جبکہ صرف ایک عضو تمام فعالیتوں اور اپنی دنیا پر حکمرانی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اخلاقی سیاسی اور معاشری اصلاحات کے منصوبے تیار کیے جاتے ہیں' جو سب کو لاجواب کر کے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ حالات کی صورت کیا ہو؟ اور منصوبہ بندی کیسے کی جائے؟ ایسے نظریات مرتب کیے جاتے ہیں جو مفروضات کا جائزہ لیتے ہیں کہ ہر شخص کے پاس تصورات کا ایک خزانہ موجود ہے مگر عمل میں مصنفین کی طرح عاجز ہے (یا اس کے خیال میں یہ صورت ہے)۔ ایسے نظریات' جب میدان میں مذہب کے اسلحہ سے لیس ہو کر اترتے ہیں یا مشہور ناموں کے وقار کی حفاظت کا فریضہ ادا کرتے ہیں' تو یہ زندگی میں ذرہ بھر تغیر بھی پیدا نہیں کر سکے۔ یقیناً" یہ صورت حال کسی ثقافت کے آخری دنوں کی تباہی کا منظر پیش کرتی ہے۔ بہت زیادہ پڑھائی اور بہت زیادہ لکھائی اس کے نتیجے میں وہ دانما" زندگی میں فکر اور زندگی کے اختلاف کو فراموش کر کے فکر متعلقہ زندگی اور فکر برائے فکر کے اختلاف میں الجھ جائیں۔ تمام عالمی مصلحین' مذہبی رہنما اور فلسفی اس معاملے پر متفق ہیں کہ زندگی استغراق فکر کے لیے موزوں ترین شے ہے۔ مگر زندگی اپنی راہ پر گامزن رہتی ہے اور اس امر کی ذرہ بھر بھی پرواہ نہیں کرتی' کہ اس کے متعلق کیا کہا جا رہا ہے اور جب کوئی معاشرہ اپنی زندگی قانون کے تحت گزارنے میں کامیاب رہتا ہے' جو بھی اسے حاصل ہوتا ہے وہ عمدہ ترین ہے۔ اور مستقبل کی تاریخ عالم اس کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرے گی لیکن

یہ ضروری ہے کہ باقاعدہ اور اہم موضوع کے لیے کچھ جگہ بچ جائے۔

کیونکہ آخر کار ایک فعال انسان ہی مرد قضا وَ قدر ہی حقیقی دنیا میں قائم رہتا ہے۔ فوجی' سیاسی اور معاشی فیصلوں میں تصورات کا کوئی مقام نہیں' یہ صرف فعالیت ہی سے متعلق ہیں۔ ایک عقل مندانہ اخذ نتائج کی بجائے ایک عقل مندانہ ضرب ہی ان معاملات میں کارگر ثابت ہوتی ہے۔ یہاں نفرت کا بھی ایک مفہوم ہے' جسے عالمی مدبر' اور سپاہی ہمیشہ سے بروئے کار لاتے رہے ہیں اور قلم کشوں اور کتابی کیڑوں کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے رہے ہیں اور سوچیں کہ کیا تاریخ عالم ان ذہین فطین لوگوں کے لیے ہے؟ یا سائنس دانوں اور ادیبوں کے لیے ہے؟ ہمیں غیر مبہم طور پر صاف صاف کہہ دینا چاہیے کہ وہ ادراک جو کشاکش سے عاری ہو' زندگی کا صرف ایک پہلو ہے' مگر فیصلہ کن پہلو نہیں۔ مغربی یورپ کی فکری تاریخ میں نپولین کا نام نہیں مگر حقائق زندگی میں ارشمیدس کی سائنسی دریافتیں اس سپاہی سے کم موثر ہیں جس نے اسے سیراکیوز کے محاصرے کے دوران قتل کر دیا تھا۔

نظریاتی لوگ یہ یقین کر کے بہت بڑی غلطی کرتے ہیں کہ ان کا مقام معاشرے میں سب سے ارفع ہے' سب سے بعد نہیں۔ وہ اپنے ادا کردہ کردار کو قطعی طور پر غلط سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایتھنز کے سیاسی سوفسطائی یا فرانس کے والٹیئر اور روسو' اس غلط فہمی کا شکار تھے۔ اکثر ایک مدبر اس سے واقف نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ مگر اس کے باوجود بھی وہ اپنی کامیابی کی راہ پر گامزن رہتا ہے اور کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف ایک سیاسی فلسفی ہمیشہ یہ جانتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے مگر پھر بھی اکثر اس کی تمام فعالیت کاغذات تک ہی محدود رہتی ہے۔ اس لیے وہ اکثر ناکام رہتا ہے اور تاریخ میں اس کی اہمیت اسی حساب سے کم ہوتی ہے' غیر یقینی حالات میں ایسی مداخلت اکثر ہوتی رہتی ہے' مثلاً ایتھنز میں تحریک روشن خیالی یا فرانس یا جرمنی میں انقلابات ایسے حالات کا نتیجہ ہیں' جبکہ تصور پرست انسان نظام کی اصلاح کی بجائے اپنی قوم و ملک کی تاریخ سازی میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے مقام کے تعین میں غلطی کھا جاتے ہیں۔ وہ اپنے اصولوں اور منصوبوں کے ساتھ تاریخ کا حصہ نہیں بلکہ اس کا تعلق تاریخ ادب سے ہے۔ حقیقی تاریخ اس کے متعلق نظریاتی اختلافات میں نہیں الجھتی بلکہ اسے اور اس کی فکر کو ان کے حال پر چھوڑ دیتی ہے--- افلاطون ہو یا روسو--- چھوٹے مفکرین کا تو ذکر ہی کیا۔ صرف تجریدی سیاسی تشکیلات تیار کر سکے مگر اسکندر اعظم' سی پی او' سیزر اور نپولین کی اپنے منصوبوں کے ساتھ اور جنگوں اور نو آبادیوں کے ساتھ کوئی اہمیت نہ تھی۔ ایک مفکر اگر پسند کرے تو کسی قوم کے انجام کے متعلق بحث کر سکتا ہے۔

عالم صغریٰ کے تمام اختلافات کے باوجود ہم ہمیشہ اجتماعی تحریکات کے گروہوں سے سامنا کرنے پر مجبور رہے ہیں۔ ان کا تعلق اعلیٰ طبقات سے رہا ہے خواہ وہ سست رفتاری سے وجود میں آئے ہوں یا لمحاتی طور پر وجود میں آ گئے ہوں۔ ان میں افراد کے تمام جذبات اور احساسات موجود ہوتے ہیں۔ یہ لوگ داخلی اعتبار سے ایک معمہ ہوتے ہیں اور عقل و استدلال کے ذریعے ان کے باطن تک رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ اگرچہ

دقیقہ شناس مبصر ان کے ردعمل کی بنیاد پر ان کا بخوبی مطالعہ کر سکتا ہے اور نتائج اخذ کر سکتا ہے۔ اس صورت میں بھی ہم حقیقی حیوانی وحدتوں کا مشاہدہ کر سکتے ہیں' ان کے متعلق ادراک ممکن ہے' یہ اتحاد تکوین اور قضا و قدر کے اثرات کے تحت وجود میں آتے ہیں' جس طرح فضا میں محو پرواز ایک عقاب طوفانوں سے زور آزمائی کرتا ہے۔--- یہ لوگ خالص انسانی ہم آہنگی کی بناء پر جس کی بنیاد باہمی تفہیم اور ہم خیالی پر ہوتی ہے اور ان کے مقاصد اور معلومات میں یگانگت پائی جاتی ہے۔ کائناتی نبض کا اتحاد بغیر خواہش کے بھی قائم ہو جاتا ہے' مگر مقاصد میں ہم آہنگی کا حصول بغیر عزم کے نہیں ہوتا۔ ذہنی معاملات میں آپ اپنی مرضی سے شامل ہو سکتے ہیں یا علیحدہ ہو سکتے ہیں۔ یہ آپ کی صوابدید پر منحصر ہے۔ کسی شخص کا شعور بیدار اس کے فیصلے میں شامل ہوتا ہے' مگر کائناتی اتحاد جس کے لیے فرد مذکور نے ذمہ داری قبول کر رکھی ہوتی ہے اس میں اور جس کے لیے اس کی تکوین کامل متقاضی ہوتی ہے' شامل نہیں ہوتا۔ ایسے اتحاد میں شامل گروہ جوش و خروش کا طوفان ہونے کے باوجود دہشت زدگی کا بھی شکار ہو سکتے ہیں۔ یہ لوگ ایلیئوس یا لورڈیز کی طرح ہنگامہ آراء اور سرمست ہوتے ہیں' یا سپارٹن اور تھرموپائلائی جرات آزما' یا جنگ ویسوویس میں رومیوں کی طرح ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے ہیں ۔ وہ بین باجوں کے ساتھ مارچ کرنے اور رقص کرنے کے اعلیٰ نسلی انسانوں اور حیوانوں' چمکدار' رنگین' آرائشی لباسوں اور وردیوں کو پسند کرتے ہیں۔

تحریکات سے متاثر یہ اجتماع مرنے کے لیے ہی وجود میں آتے ہیں۔ ذہنی اتحاد محض ریاضی کی رقوم کی مانند ہوتے ہیں۔ ان میں جمع تفریق کا عمل جاری رہتا ہے' یہاں تک کہ (جیسا کہ اکثر ہوتا ہے) محض کوئی اتفاقی امر یا خیال اتنا دور رس اثر پیدا کر دیتا ہے کہ وہ افراد کے خون کو گرما دیتا ہے اور اچانک سب کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ کسی بھی سیاسی موڑ پر الفاظ' قسمت کا روپ اختیار کر لیتے ہیں اور رائے جذبات پر حاوی ہو جاتی ہے۔ ایک حادثاتی گروپ کسی گلی میں اجتماع کی شکل اختیار کر لیتا ہے' جس میں ایک شعور' ایک ہی کشمکش اور ایک ہی زبان پیدا ہو جاتی ہے یہاں تک کہ ہنگامی تاثرات کا جوش ختم ہو جاتا ہے اور وہ دوبارہ اپنے اپنے گھروں کی راہ لیتے ہیں۔ ۱۷۸۹ء کے پیرس میں ایسا ہر روز ہوتا۔ صرف "اے اجتماع آزادی" کے نعرے کی گونج کی ضرورت زیادہ ہوتی

اجتماعات کی نفسیات الگ ہے اور عوامی شخص کے لیے اس کا علم ہونا ناگزیر ہے۔ اجتماع کا ہر فرد ہی فی نفسہ ایک گروہ اور جماعت ہوتا ہے۔ خواہ وہ صلیبی جنگوں کا سپاہی اور بہادر ہو یا رومی مجلس کا رکن یا لوئیس چہار دہم کے عہد کے یعقوبی کلب کا ممبر یا پروشیائی "العدل" سے متعلق۔ اس کا تعلق کسی بڑے شہری گروہ سے ہو یا دیہاتی معاشرے سے' بدو ہو یا حضرت محمدؐ پر ایمان رکھنے والا یا کسی اور جدید مذہب کا پیروکار' فرانسیسی انقلاب پسند ہو یا جرمن جنگ آزادی کا سپاہی یہ سب مل کر' جیسا کہ ہمارے علم میں ہے۔ اعلیٰ ثقافت تشکیل کرتے ہیں جو کسی بڑے روحانی انقلاب کا پیش خیمہ ہوتا ہے اور ہزارہا سال کے عمل کے تحت یہ لوگ ایک شناخت کو قبول کرتے ہیں۔ قوم' جماعت' قبیلے' نسل بہرصورت ایک وحدت میں ڈھل جاتے ہیں۔

تاریخ کے تمام عظیم واقعات' کائناتی نظام کی تکوین کے تحت ہی عوام' اجتماعات' افواج اور جماعتوں کے ہاتھوں انجام پاتے ہیں' جبکہ اہل فکر کی تاریخ' متفرق اتحادات' دائروں' مدارس' مدارج تعلیم' رجحانات اور نظریات کی حد تک ہی محدود رہتی ہے۔ یہاں پر قضا و قدر کا سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسے اجتماعات کو ایک اہم اور فیصلہ کن لمحے میں مناسب رہنما میسر آگیا؟ جو بہت زیادہ متاثر کن تھا اور لوگ آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے چل پڑے؟ کیا حادثاتی طور پر میسر آ جانے والے رہنما کا تعلق فی الواقع اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک درجے سے تھا؟ جیسا کہ پومپائی کا روبس پرائرے تھا اور اسے پیروکاروں کی لہریں نصیب ہو گئیں۔ ایک مدبر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ عوام کی روح پر گہری نظر رکھتا ہو اور ان کی قوت اور میقات کو زمان اور مدوجزر کی قوت میں تحلیل کر سکتا ہو اور ان کے مقصد کی سمت بندی کا تعین کر سکتا ہو اور اس کے باوجود بھی یہ امر حادثاتی ہے کہ کیا وہ اپنے پیروکاروں کے اجتماع کی رہنمائی کرتا ہے یا ان کی خواہشات کی لہر میں بہ جاتا ہے۔

باب دوم

ابتدا اور فطری مناظر

(ب)

اعلیٰ ثقافتوں کا طبقہ

ا

اس امر سے قطع نظر کہ انسان بغرض حیات یا بغرض فکر اس دنیا میں پیدا ہوا' جب تک کہ وہ فعال ہے یا مشغول فکر ہے' بیدار ہے اور اس لیے وہ نقطہ ماسکہ بھی ہے۔ اس لیے اس کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ زمانہ حال میں یہ دنیا اسی کے لیے قائم ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ یہ امر کتنا تکلیف دہ ہے کہ کسی کام کی بجا آوری کے عین درمیان' مثلاً طبیعیات کے کسی تجربے کے دوران اسے بند کر دیا جائے تاکہ روز مرہ کے کسی اور واقعے کی طرف توجہ کی جا سکے۔ میں نے اس سے قبل بھی یہ بیان کیا ہے کہ متعدد تناظرات جو انسان کے شعور بیدار میں باری باری نمودار ہوتے ہیں۔ دو واضح طبقات میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ عالم قضا و قدر یا نبض کی دھڑکن اور دوسرا عالم ہیجان کشمکش اور سلسلہ علت و معلول سے متعلق۔ میں ان دونوں صورتوں کو دنیائے تاریخ اور دنیائے فطرت کے ناموں سے موسوم کرتا ہوں۔ پہلی صورت میں حیات تنقیدی شعور سے کام لیتی ہے۔ اس کی آنکھیں اس کے حکم کے تحت کام کرتی ہیں اور نبض کی دھڑکن داخلی تخیل کے لہروں کی مسلسل صورت اختیار کر لیتی ہے اور صدمے سے دو چار روحانی تجربہ نئے دور کی بلند چوٹی نظر آتا ہے۔ دوسری صورت میں فکر حکمران ہوتی ہے اور اس کی علتی تنقید زندگی کو کٹھن راہ کا سفر بنا دیتی ہے۔ زندگی کے سیدھے سادے واقعات' تجریدی صداقت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور کشمکش طریق کار کی شکل میں منتقل

ہو جاتی ہے۔

یہ کس طرح ممکن ہے؟ ہر تصویر بصارت کے ذریعے اخذ کردہ ہے مگر ایک میں ناظر اپنے آپ کو ایسے واقعات کے حوالے کر دیتا ہے' جن کا تکرار کبھی نہیں ہو گا' اور دوسری میں وہ صداقت کی تلاش میں مشغول ہے جن پر کسی ایسے نظام کی بنیاد قائم کی جائے' جو ہمیشہ کے لیے قابل قبول ہو۔ تاریخی تصویر جس میں علم کی حیثیت محض اضافی ہوتی ہے۔ کائنات عالم صغیر کو استعمال کرتی ہے۔ تصور میں ہم اسے یادداشت کہتے ہیں اور حافظے کا نام بھی دیتے ہیں۔ اس میں ہمارے سامنے دھلے دھلائے واقعات موجود رہتے ہیں۔ یہ فریضہ داخلی روشنی انجام دیتی ہے اور یہ واقعات ہماری نبض حیات کے ساتھ بہہ کر آتے ہیں۔ مگر تسلسل کا عنصر ہمیں تاریخ کو اس وقت تک بتاتا رہتا ہے جب تک کہ وہ تاریخ فکر کی شکل نہ اختیار کر لے۔ مگر یہ کبھی بھی شعور بیدار کی شرائط سے آزاد نہیں ہوتی۔ فطرت (یا سائنس کی ہیئت میں) میں یہ ہمیشہ موجود رہتی ہے اور ہمیشہ موضوعی صورت میں جو التباسی حیثیت میں ہمیشہ اجنبی ہوتی ہے۔ مگر تاریخی ہیئت میں تو یہ ہمیشہ ہی موضوعی رہتی ہے' یعنی اعداد کی محتاج' جن میں ہمیشہ غلطی کا احتمال رہتا ہے۔

ہم فطرت کے میدان میں کام کر رہے ہیں۔ (سائنس) ہمارا تناظر تسویہ ذات ہے' جو کسی حد تک غیر ذاتی بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی شخص اپنی ذات کو فراموش بھی کر سکتا ہے' مگر بالعموم ہر شخص' قوم' خاندان' یا جماعت تاریخ کو اپنے حوالے ہی سے دیکھتی ہے۔ فطرت کا نشاں ایک توسیعی استدام ہے' جس میں ہر شے شامل ہے۔ مگر تاریخ وہ ہے جو ظلمات ماضی سے باہر آتی ہے اور اپنے آپ کو ناظر کے سامنے پیش کرتی ہے اور اسے اپنے ساتھ بہا کر مستقبل میں لے جاتی ہے۔ وہ زمانہ حال کی طرح ہمیشہ مرکزی نقطہ رہتا ہے اور اس کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ واقعات کو کوئی ترتیب دے سکے اگر وہ اپنی سمت کو نظر انداز کر دے۔ یہ عنصر حیات کے لیے بنیادی اہمیت کا حامل ہے مگر فکر کے لیے نہیں۔ ہر وقت' ہر ملک میں' ہر زندہ طبقہ اپنے اپنے تاریخی افق کا مالک ہے اور یہ حقیقت تاریخی مفکر کا فریضہ ہے کہ وہ تاریخی تصویر میں حقیقت کا رنگ بھر کر اپنے عہد کی ضروریات کو پورا کرے۔

لہٰذا فطرت اور تاریخ بھی خالص اور آلودہ تنقید کی طرح قابل امتیاز ہیں' تنقید سے مراد پیش آمدہ تجربات کے مخالف رویہ ہے۔ طبیعی سائنس تنقید کے علاوہ اور کچھ نہیں مگر تاریخ میں تنقید اس کے علاوہ اور کچھ کرنے سے قاصر ہے کہ وہ مورخ کے لیے ایک ایسا میدان تیار کرے جس میں کہ وہ اپنی چشم بینا سے کھل کر جائزہ لے سکے۔ تاریخ فی نفسہ ایک اچٹتی نگاہ ہے' جس سمت بھی دیکھنا چاہے' ایک نظر دیکھ لے۔ وہ شخص جسے بصارت کا یہ ملکہ حاصل ہے وہ ہر واقعے اور صورت حال کو تاریخی تناظر میں سمجھ سکتا ہے۔ فطرت ایک نظام ہے اور نظام کا ادراک ممکن ہے۔

تاریخ کے ساتھ تسویہ ذات کا طریق کار ہر شخص کے لیے' اپنے بچپن کے ابتدائی تاثرات کے ساتھ

ہی شروع ہو جاتا ہے۔ بچوں کی نگاہ بہت تیز ہوتی ہے۔ قریبی ماحول کے حقائق خاندانی زندگی' اپنا گھر' گلی' محلہ' بہت جلد ان کی دانست کی کلی گرفت میں آ جاتے ہیں۔ بچوں کو یہ انکشافات' شہر اور آبادی کے الفاظ کی تفہیم سے بہت پہلے ہو جاتے ہیں' جبکہ الفاظ عوام' ملک اور ریاست' بچوں کے لیے مادی معانی پیش کرنے سے ابھی دور ہوتے ہیں۔ بالکل اسی انداز میں ابتدائی انسان بھی تاریخ کے متعلق اتنا ہی جانتے تھے' جتنا کہ ان کے تناظر میں باسانی آ سکتا تھا۔ یعنی زندگی جو کچھ انھیں پیش کر سکتی تھی اور سب سے بڑھ کر ان کی اپنی زندگی یعنی پیدائش اور موت کا ڈرامہ' بیماری اور بڑھاپا۔ شدید جنگوں کی تاریخ' شدید محبت کی داستانیں' جن کا ان کو ذاتی تجربہ ہوتا یا دوسروں پر گزرتی دیکھتے رشتہ داروں کا انجام' قبیلے اور گاؤں کے واقعات' اعمال اور محرکات' داستانیں اور قدیم دشمنیاں اور فسادات' فتوحات اور بدلے۔ یہی ان کی تاریخ تھی جب زندگی کے افق میں وسعت پیدا ہوئی زندگی کی بجائے مناظر کی طرف توجہ ہوئی اور زندگی کو آتے جاتے دیکھا اور گاؤں اور قبیلے سے منظر نامہ آگے بڑھا اور مختلف نسلوں اور ممالک سے آشنائی ہوئی۔ سالوں سے واقعات صدیوں پر محیط ہوئے مگر وہ تاریخ جس کا آپ کو فی الواقع ذاتی تجربہ ہوتا ہے کبھی بھی باپ دادا کی نسل سے آگے نہیں بڑھتی۔ قدیم جرمن ہوں یا زمانہ حال کے حبشی' یہ تجربہ سب کے لیے یکساں ہے۔ خواہ وہ پیری کلیز ہوں یا ویلنشی۔ زندگی کے افق کا یہیں خاتمہ ہو جاتا ہے اور ایک نئے میدان کا اضافہ ہوتا ہے جس میں سنی سنائی کی بنیاد پر تصویر مرتب کی جاتی ہے اور تاریخی روایات جنم لیتی ہیں۔ ایک ایسی سطح جس پر براہ راست ہمدردیاں واقعات کی تصویر بناتی ہیں' یہ عمل نمایاں بھی ہے اور عرصہ دراز سے مروج بھی۔ اس نوع کی تصاویر مختلف ثقافتوں میں مختلف مقدار میں پائی جاتی ہیں۔ ہمارے مغربی لوگوں کے لیے تاریخ کا آغاز اسی ثانوی ذریعے سے ہوتا ہے کیونکہ دوام کے پہلو کے زیر اثر زندگی بسر کرتے ہیں جبکہ رومیوں اور یونانیوں کے لیے تاریخ کا اسی مقام پر اختتام ہو جاتا تھا۔ تھوسی ڈائڈ کے لیے پرشیا کی جنگوں کے واقعات اور سیزر کے لیے پیوتی جنگیں' اس زمانے تک زندگی کی حرارت سے محروم ہو چکی تھیں۔

اس ہموار سطح کے بعد دوبارہ تاریخی وحدت کی تصاویر ابھرتی نظر آتی ہیں۔ نباتات اور حیوانات کی دنیا کے انجام کی تصاویر۔ مناظر فطرت' اجرام فلکی۔ جو اس دور تک طبعی سائنس اور اساطیری روایات دونوں میں شامل تھیں اور دنیا کے آغاز و انجام دونوں کا بیان کرتی تھیں۔

فطرت (سائنس) کی تصویر بچوں اور ابتدائی انسان کے لیے روز مرہ کے معمول کے انداز میں سامنے آتی۔ وہ دونوں کو مجبور کرتی کہ فطرت کے وسیع اور خوفناک تصورات سے قطع نظر کر کے اپنے قریبی ماحول کے حالات و واقعات کی طرف توجہ دیں۔ ایک چھوٹے حیوان کی طرح بچہ بھی زندگی کے حقائق کے کھیل ہی سے سیکھتا ہے۔ کھلونے کا معائنہ کرتے ہوئے' گڑیا کی تراش خراش کر کے اور آئینے کو الٹ کر دیکھتے ہوئے کہ اس کے عقب میں کیا ہے؟ اور شے کی حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اس پر فتح پا لینے کا مظاہرہ کرنا ہی اس کے پسندیدہ مشاغل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج تک طبعی علوم کا کوئی تحقیقی منصوبہ اس سے آگے نہیں بڑھا۔ قدیم انسان' اپنے ان اہم تجربات کو اپنے ہتھیاروں' اوزاروں' اور لباس اور خوراک کے خام مال اور

مکانات کی بہتری کے لیے استعمال کرتا ہے اور مردہ اشیا سے اپنی زندہ ضروریات کی فراہمی کے لیے استفادہ کرتا ہے۔ وہ یہ عمل ان حیوانات پر بھی آزماتا ہے جو اچانک حرکت سے محروم ہو جاتے ہیں اور اس کے لیے کسی کام کے نہیں رہتے۔ وہ ان پر نگاہ رکھتا ہے کہ کہیں وہ اٹھ کر اس کا تعاقب نہ کریں اور ضرورت کے مطابق ان کا تعاقب بھی جاری رکھتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر وہ انھیں زور بازو کی جگہ میکانکی طور پر قابو میں لانے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح وہ گوشت اور ہڈیاں جمع کرتا ہے' جو یقینی طور پر اس کے لیے کارآمد ہیں' بعینہ وہ جس طرح کسی واقعے کا شعور رکھتا ہے' آغاز میں تو وہ اسے کسی دیوتائی قوت کا مظہر سمجھتا تھا' مگر شعور کے بعد وہ اسے علت و معلول کا کرشمہ قرار دیتا ہے۔ کسی ثقافت کا بالغ نظر انسان ہر روز اور ہر لمحے اسی انداز اور اصول پر کام کرتا ہے۔ یہاں پر بھی افق فطرت کے آگے' ایک اور ثانوی میدان نظر آتا ہے۔ جو تاثرات پر مبنی ہے۔ جو بارش' برق' طوفان' گرما' سرما' چاند کی حرکات' ستاروں کے راستوں سے بنا ہے۔ مگر یہی وہ مقام ہے جہاں مذہبیت جو خوف اور جلال انسان کو' ارفع و اعلیٰ معیار کی طرف رہنمائی کرتا ہے' جس طرح تاریخی تصویر میں اسے زندگی کے حتمی حقائق کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔ اسی طرح مذہبی وجدان میں بھی وہ فطرت کے حتمی حقائق کو قائم کرتا ہے۔ وہ شے جو علم و ادراک کی قابل حصول سرحدوں سے ماورئی ہے' اسے وہ خدا کا نام دیتا ہے' اور علاوہ ازیں جو کچھ بھی سرحد ادراک کے اندر اور قابل فہم ہے' وہ عمل اور تخلیق اور قدرت خداوندی کا مظہر ہے' اسے سلسلہ علت و معلول سے منسلک کیا جاتا ہے۔

اس لیے سائنسی نقطہ نظر سے قائم عناصر میں دوہرا رجحان پایا جاتا ہے جو ان کی فطرت میں شامل ہے اور قدیم زمانوں سے لے کر آج تک ناقابل تغیر رہا ہے۔ ان میں سے ایک رجحان مکمل تیکنیکی علم کے نظام سے منسلک ہے' جو معاشی اور جنگجویانہ مقاصد کی انجام دہی کے لیے مخصوص ہے۔ بہت سے حیوانات نے مکمل طور پر تشکیل کر رکھا ہے۔ جو ان کی طرف سے قدیم انسان کے لیے رہنمائی کا کام دیتا ہے اور اسی کی بنا پر فاؤسٹی ثقافت میں مشینی عمل کا آغاز ہوا۔ دوسرا رجحان خالصتا" انسانی فکر اور طبیعی بصیرت سے رونما ہوا۔ جو زبان کی بدولت حاصل کیا گیا۔ اس کے مقاصد بھی سعی بسیار کے بعد پوری طرح حاصل کر لیے گئے اور نظریاتی علوم کا حصول ممکن ہوا۔ ثقافت کے ابتدائی مدارج میں ہم انھیں مذہبی علوم کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور بعد میں سائنسی علوم کہنے لگتے ہیں۔ آگ ایک جنگ جو کے لیے آتشیں اسلحہ ہے مگر صنعت کار کے لیے اس کا اوزار ہے۔ ایک پجاری کے لیے الوہیت کی علامت اور سائنس دان کے لیے ایک مسئلہ ہے۔ مگر ان تمام پہلوؤں میں یکساں طور پر' اسے فطری سائنس ہی میں شامل سمجھا جاتا ہے یہی شعور بیدار کا تقاضا ہے۔ ہم عالم تاریخ میں آگ کو یہ رتبہ عطا نہیں کرتے مگر کار تھیج کی آتش زدگی' اور جان ہوس' اور گیار ڈانوں کے گرد شعلوں میں ایندھن کے گٹھے آگ کو بھی تاریخ کا حصہ بنا دیتے ہیں۔

۲

میں اس بیان کا دوبارہ تکرار کرتا ہوں کہ ہر زندہ شے دوسری زندہ شے کے تجربات اور انجام کو اپنے

حوالے سے محسوس کرتی ہے۔ کبوتروں کی ایک اڑان کو ایک دہقان جس کے کھیتوں پر وہ حملہ آور ہوتے ہیں، اس فطرت پسند سے مختلف محسوس کرے گا جو ایک گلی میں رہتا ہے، اسی طرح وہ شہباز جو فضا میں محو پرواز ہے، اس کا ردعمل مختلف ہو گا۔ ایک کسان اپنے فرزند میں اپنی وراثت کے مستقبل کی جھلک دیکھتا ہے، مگر اس کا ہمسایہ اسے مستقبل کا دہقان ہی سمجھتا ہے۔ ایک افسر اپنے ایک سپاہی میں جو کچھ دیکھتا ہے اور ایک غیر ملکی ایک مقامی باشندے میں جو کچھ محسوس کرتا ہے وہ ان کے اپنے نقطہ نگاہ ہی کے مطابق ہوتا ہے۔ نپولین بطور لیفٹیننٹ اور بطور شہنشاہ اشیا کی ماہیت کو مختلف انداز سے دیکھتا ہے۔ کسی شخص کو ایک نئی صورت حالات میں ڈال دیں، کسی انقلابی کو وزیر بنا دیں، یا کسی سپاہی کو جرنیل بنا دیں فوری طور پر ان کے لیے تاریخ اور تاریخ کے کلیدی اشخاص ان کی دانست میں اپنی سابقہ حیثیت سے مختلف صورت اختیار کر لیں گے۔ ٹیلی رانڈ اپنے عہد کے لوگوں کے متعلق ایک مخصوص تصور رکھتا تھا کیونکہ وہ ان لوگوں میں سے ہی تھا لیکن اگر وہ اچانک کراسوس سیزر، کائی لین یا سسرو کا ساتھی ہو جاتا، تو ان کے نظریات اور خیالات اس کے لیے یا تو بے معنی ہوتے یا غلط ہوتے اس میں کوئی تاریخ نہیں۔ ہر خاندان کی تاریخ اس کے ہر فرد کے لیے علیحدہ معانی کی حامل ہوتی ہے اور اسی طرح ملک کی تاریخ ہر فریق کے لیے مختلف ہوتی ہے اور اسی طرح ہر قوم اپنے ہر عہد کے دوران اپنی تاریخ کو مختلف سمجھتی ہے۔ ایک جرمن کا جنگ عظیم کے متعلق نقطہ نظر ایک انگریز سے مختلف ہو گا۔ ایک کارکن اور مالک کے معاشیات کے متعلق نظریات مختلف ہوں گے۔ ایک مغربی مورخ چینی یا عرب مورخین کے مقابلے میں علیحدہ عالمی تاریخ پیش کرے گا۔ کسی عہد کی تاریخ کو صرف اسی صورت میں معروضی طور پہ بیان کیا جا سکتا ہے جب وہ بہت ہی بعید زمانے سے متعلق ہو اور مورخ کو کسی فریق یا واقعے سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہمارا مورخ پیلو پونیشی جنگوں کا یا ایکٹیئم کے واقعات کو بھی غیر جانبدارانہ بیان نہیں کر سکتا کیونکہ وہ عہد جدید یعنی عہد حاضر کے تاثرات سے ماورئی نہیں ہو سکتا۔

اس میں کوئی تضاد نہیں بلکہ یہ امر واقعہ ہے کہ اکثر لوگوں کا علم خواہ وہ کتنا ہی گہرا ہو، ان مبصرین کی عصبیت سے بری نہیں، جن کے رنگ دار شیشے ان کا ماخذ ہیں۔ یہ علم درحقیقت اس نوعیت کا ہے، جس سے ہم پرہیز کرتے ہیں۔ وہ ایسی تعمیات سے مملو ہے، جو حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرتی ہیں اور تاریخ میں عجیب و غریب رنگ بھرتی ہیں۔ اس کی بدترین مثال تاریخ کا مادی تصور ہے، جسے ہم قیاسی بنجر زمین کا نام دیتے ہیں۔ مگر دونوں اس بنا پر اور اس کے باوجود یہ ہر شخص کی مجبوری ہے کیونکہ اس کا تعلق کسی جماعت، عہد، قوم یا ثقافت سے ہے کہ وہ ایک مخصوص تاریخی تصویر سے آگاہ ہو، جو اس کے تصورات سے ہم آہنگ ہو، اور اسی انداز میں وہ مخصوص تعبیرات ہیں جو کسی خاص دور یا جماعت یا ثقافت کی عکاسی کرتی ہیں۔ ہر ثقافت کے متعلق اعلیٰ ترین تعمیم اس کی ابتدائی صورت سے متعلق ہے کیونکہ یہ اس کے اپنے تصور علامتی دنیا ہے، جو اس کی تاریخ بیان کرتی ہے، اور ہر فرد کی ذاتی ہم آہنگی یا کسی ایسے گروہ سے متعلق جو بطور فرد گزارہ کرتا ہو، اور ایک ہی تصور کے حوالے سے زندگی بسر کرتا ہو۔ جب کبھی بھی ہم کسی دوسرے کے تصورات کے حوالے سے بات کریں خواہ وہ خلوص سے ہو، سطحی ہو ابتدائی ہو یا کوئی معمولی سی فضول

بات ہو، تو ہم یا تو غلطی پر ہوتے ہیں یا کسی متروک حوالے سے بات کرتے ہیں۔ ہم خلاف مرضی کسی ایسی تصویر کے حوالے سے تبصرہ کرتے ہیں، جو موجودہ حالات میں ہماری اپنی اقدار کے مطابق اور ہمارے اپنے عہد کے تسلسل کے تحت فعالیت اور شخصیت سے متعلق ہو۔

ظاہر ہے کہ ان حالات میں فاؤستی ثقافت کے ہر انسان کے پاس اس کی اپنی تاریخی تصویر ہو گی اور اسی طرح بے شمار تصویریں جو اس کے آغاز شباب کے بعد کے زمانے سے متعلق ہوں جو ایام، ہفتوں اور سالوں کے تجربات کے تحت مسلسل بنتی بگڑتی اور تبدیل ہوتی رہتی ہوں گی اور پھر مختلف جماعتوں اور مختلف زمانوں کے باشندوں کے تاریخی تصور کتنے مختلف ہوتے ہیں۔ آٹو اعظم کی دنیا، گریگوری ہفتم کا عہد، وینس کے ڈوج کا زمانہ، اور غریب زائرین کی دنیا یہ سب کچھ کتنا الگ الگ ہے۔ لورنیزو ڈی میڈی سی، ویلنس ٹن، کرام ویل، ماراٹ اور بسمارک سب اپنی اپنی الگ دنیا بسائے ہوئے تھے۔ رومی عہد کا کوئی جاگیردار، باروق کا کوئی عالم، تمیں سالہ یا ہفت سالہ جنگ کا کوئی افسر، اور جنگ آزادی کا کوئی بہادر، سب کتنے مختلف لوگ تھے۔ صرف ہم اپنے زمانے ہی کی بات کریں ایک فریزی کسان جس کی زندگی صرف اپنے دیہات تک محدود ہے اور اپنے قبیلے ہی سے منسلک ہے اور ہمبرگ کا ایک عظیم تاجر اور طبیعیات کا استاد! سب کا مزاج ایک جیسا کیسے ہو گا۔ پھر بھی یہ تمام اپنی اپنی عمر، درجے اور وقت کے باوجود کوئی نہ کوئی بنیاد ضرور موجود ہے جو ان کو یکجا رکھتی ہے، وہ ان کی ثقافت کی ہم آہنگی اور دوسری ثقافتوں سے اختلاف ہے۔

مگر علاوہ ازیں ایک اور نوعیت کا اختلاف بھی موجود ہے۔ جو کلاسیکی اور ہندوستانی تاریخی صورت کو چینی اور عربی اور سب سے بڑھ کر مغربی ثقافت سے علیحدہ کرتا ہے اور وہ اول الذکر دو ثقافتوں کا تنگ افق ہے جس قدر بھی یونانیوں کو قدیم مصری تاریخ کا علم ہو گا (اور حقیقت ہے کہ ضرور ہو گا)۔ انھوں نے اس کے تجزیاتی مطالعے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی اور اکثریت کے لیے تو یہ محض واقعات کے میدان تک محدود تھا جو ان کے سامنے بڑے بوڑھے بیان کرتے رہتے تھے۔ جنھوں نے کسی نہ کسی واقعے میں شمولیت اختیار کی تھی اور ابھی تک زندہ تھے۔ اور اعلیٰ صاحب دانش افراد کے لیے بھی یہ واقعات ٹروجن کی جنگ پر پہنچ کر ختم ہو جاتے تھے۔ یہ ایک ایسی سرحد تھی، اور وہ یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے کہ اس سے قبل بھی کسی تاریخی حیات کا وجود تھا۔

عربی ثقافت، اس کے برخلاف، قدیم زمانے ہی سے تاریخ کے متعلق بہت پرجوش تھی ہم دیکھتے ہیں کہ یہودیوں میں اور فارس والوں میں سائرس کے دور ہی سے عہد تخلیق اور زمانہ حال میں ربط و تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے اور اس کے لیے حقیقی زمانی تسلسل قائم کیا جاتا رہا ہے۔ فارس والے حقیقتاً" ماضی کے ساتھ مستقبل کو بھی مربوط کرتے رہے ہیں اور اس طرح انھوں نے فیصلہ آخری کے تاریخ کو مقدم کر لیا اور حضرت مسیح کی دوبارہ آمد کو اپنے عقیدے میں شامل کر چکے تھے۔ انسانی تاریخ کی درست اور کم از کم مدت فارس والوں نے بارہ ہزار سال مقرر کر لی مگر یہودیوں نے اوائل پیدائش سے لے کر آج تک

صرف چھ ہزار سال تسلیم کیے۔ یہ حتمی طور پر مجوسی تاریخی فکر کا اظہار ہے جو یہودی اور فارسی تصورات میں امتیاز قائم کرتا ہے حالانکہ بابلی ثقافت سے ہی بہت سی یہودی روایات حاصل کی گئی ہیں۔

اس کے علاوہ بھی ایک فرق ہے جس کا تعلق ابتدائی محسوسات سے ہے۔ چینی اور مصری ثقافتوں کی فکر میں اس کی وجہ سے تاریخی افق میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور تاریخی تسلسل اور خاندانوں کے ادوار کے حوالے سے ترتیب واقعات قائم رہتی ہے۔ یہ ادوار بعض اوقات ہزار سال کی مدت پر حاوی ہوتے ہیں اور بعد ازاں گوشہ گمنامی میں غائب ہو جاتے ہیں۔

فاؤستی تاریخ عالم عیسائی تقویم کے آغاز سے قبل عہد کی بھی دستیاب ہے۔ عیسائی تقویم کا آغاز اچانک ہوا' اور مجوسی محصولات کے ساتھ تیزی سے پھیل گیا۔ عیسائی کلیسا نے انھیں قبول کر لیا تھا جس سے اس کے تصورات میں گہرائی اور وسعت پیدا ہوئی۔ جس سے فلورس کے جوچم نے فائدہ اٹھاتے ہوئے رومیوں کے عظیم تصور تثلیث کو ایک نئی تعبیر دی ' جو باپ' بیٹے اور روح القدس کے تین پہلوؤں پر مبنی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ متوازی طور پر ایک وسیع جغرافیائی افق بھی وجود میں آگیا جو رومیوں کے عہد میں بھی (وا ئکنگ اور صلیبوں کی وجہ سے) آئس لینڈ سے لے کر ایشیا کے دور دراز کونوں تک پھیل گیا۔ اور ۱۵۰۰ء کے بعد باروق نے وہ کارنامے انجام دیے جو ان کے ہمعصروں میں کوئی اور سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ انسانی تاریخ میں پہلی دفعہ پورے کرہ ارض کو ایک میدان سمجھا گیا۔ قطب نما اور دوربین کا یہ معجزہ رونما ہوا کہ اس عہد کے علما و فضلا نے زمین کی شکل و صورت کو ایک کرے کے طور پر تسلیم کر لیا اور یہ اقرار کر لیا کہ وہ ایک کرے پر مقیم ہیں جو خلا میں واقع ہے اور زمین کا افق اس سے آگے ختم ہو جاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تقویم کو قبل مسیح اور بعد از مسیح دو حصوں میں تقسیم کر لیا گیا اور آج تک اس تصور کو ترک نہیں کیا گیا۔ یہی تقویم تمام کرہ ارض میں رائج ہے' اور تمام عظیم ثقافتیں اس کے زیر اثر ہیں اور قدیم رومی تقسیم تاریخ بطور قدیم' وسطانی اور جدید مدت سے بے مقصد ہو کر رہ گئی ہے اور ختم ہو رہی ہے۔

دوسری تمام ثقافتوں میں عالمی تاریخ اور انسانی تاریخ ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ کائنات کا آغاز انسان کے آغاز کے ساتھ منسلک ہے۔ یہ فاؤستی تہذیب کا کرشمہ ہے کہ اس نے عہد باروق میں اس تصور کی تردید کی اور انسانی اور کائناتی تاریخ کو علیحدہ علیحدہ کیا۔ اس کاوش کے بعد انسانی تاریخ کو وسعت نصیب ہوئی اور اسے تاریخ کائنات کا ایک حصہ قرار دیا گیا۔ اس کا دورانیہ یعنی آغاز کا ابھی تک تعین نہیں ہو سکا اور ابھی تک انسانی تاریخ' تاریخ کائنات کا ایک حصہ ہی ہے۔ اور جہاں تک کرہ ارض کا تعلق ہے' ابھی تک تو اس کا مکمل جائزہ بھی نہیں لیا گیا' بلکہ اس کے آباد حصے ہی کو دنیا قرار دیا جاتا ہے اور اسے لاکھوں نظام ہائے شمسی میں سے ایک کا سیارہ سمجھا جاتا ہے۔

تاریخی دنیا میں وسعت کے نتیجے میں' دوسری ثقافتوں کے مقابلے میں اس ثقافت میں یہ امتیاز ضروری ہے کہ عوام میں ہم آہنگی' اور خواص میں حد سے بڑھی ہوئی ذاتی ہم آہنگی خواہ وہ لحاتی ہی کیوں نہ ہو' ایک لازمی صفت ہے کیونکہ اس عمل کے لیے صرف اعلیٰ دماغ ہی اہلیت کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ تھمسٹو کلز اور ایتھینی آقاؤں کے مابین تاریخ سے متعلق فرق اگرچہ بہت معمولی تھا' مگر ہنری ششم اور اس کے دور کے چوپائے کے مابین فرق بہت زیادہ تھا۔ لیکن جوں جوں فاؤستی ثقافت نے عروج حاصل کیا' ذاتی نمائش کی قوت اس قدر نشیب و فراز کا شکار ہوئی' کہ پختہ کار ماہرین کی تعداد کم سے کم ہوتی گئی۔ فی الحقیقت امکانات کا ایک مینار تشکیل ہوا جس میں افراد کی' ان کی اہلیت کے لحاظ سے درجہ بندی کی گئی۔ ہر فرد اپنی تشکیل کے لحاظ سے اس مقام پر کھڑا کیا گیا جہاں وہ اپنی اہلیت کے کمالات کا مظاہرہ کر سکے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ مغربی انسان میں امکانات کی باہمی تفہیم کے متعلق تاریخی تحدید قائم ہے: یعنی وہ تاریخی مسائل کو سمجھنے سے پوری طرح قاصر ہے۔ یہ تحدید دوسری ثقافتوں میں موجود نہیں۔ کم از کم اس کے اثرات اتنے خطرناک نہیں' جتنے ہماری ثقافت میں ہیں۔ کیا آج کے دور کا ایک صنعتی مزدور کسی کسان کے مسائل کو سمجھ سکتا ہے؟ اور کیا ایک سفارت کار کسی صناع کے مسائل سے آشنا ہے؟ اور تاریخی---- جغرافیائی افق جو دونوں کے لیے فیصلہ کن شمار ہوتے ہیں' کیا دونوں کے ماہرین اس سے بخوبی آشنا ہیں' کیا ایک دوسرے کے افق کے متعلق پیدا شدہ سوالات کا جواب دینے کا اہل ہیں؟ اس کمزوری کے نتیجے میں وہ باہم دگر جس ابلاغ کا دعویٰ کرتے ہیں وہ محض سطحی آراء کا اظہار ہیں۔ پس یقینی طور پر یہ ہر مبصر کا فرض ہے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے' کوئی اسے سمجھتا بھی ہے یا نہیں؟ اور اس کے متعلق مناسب ردعمل کا اظہار کر رہا ہے یا نہیں؟ (جس طرح بچوں سے گفتگو میں ہم لوگ خصوصی انداز اختیار کرتے ہیں) مگر تبصرے کا فن ماضی کے مبصرین کے مفہوم کے مطابق (مثلاً ہنری' لائن یا دانتے) متعلقہ کردار میں اپنی روح داخل کرنے کے مترادف تھا۔ اب یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اپنی اور دوسرے کی ذات کے شعور زندہ میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ اٹھارھویں صدی کے آخر تک یہ تصور بھی ناممکن تھا کہ کوئی مورخ لاعلمی کی اس کیفیت کے باوجود تاریخ نویسی کا ارادہ بھی کرے گا۔ ۱۸۰۰ء کے بعد ہی لوگوں کا تاریخ نویسی کے متعلق رجحان بڑھا' اور جو کچھ تخلیق ہوا' اسے دیکھ کر کوئی شخص بھی اطمینان کا اظہار نہیں کر سکتا۔

انسانی تاریخ کو وسیع کائناتی تاریخ سے علیحدگی کے فاؤستی رجحان کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ باروق کے عہد کے اختتام کے ساتھ ہی تاریخ عالم کے متعدد افق نمودار ہوئے جو ایک دوسرے کے عقب میں واقع تھے۔ اور ہر ایک کا اپنا اپنا میدان عمل تھا۔ ان کی تلاش میں انفرادی سائنسی علوم جو کم و بیش علم التاریخ کے ساتھ کسی نہ کسی طرح متعلق ہیں' وجود میں آ گئے ہیں۔ فلکیات' ارضیات' حیاتیات' بشریات' کسی نہ کسی طرح اجرام فلکی کی گردش' قشر ارض اور انسانی حیات کا بیان کرتے رہتے ہیں۔ ان تمام کے مجموعی عمل کے تحت انسانی تاریخ وجود میں آتی ہے جسے ہم آج بھی اعلیٰ ثقافتوں کی تاریخ کہتے ہیں۔ مگر اس میں متعدد ثقافتی عناصر کی تاریخ شامل ہے' اور مغرب کی اعلیٰ ترقی یافتہ تاریخی صورت' جو خالص تاریخ اور سوانحات کی صورت میں ہے۔

ان میں سے ہر صورت حالات ایک مخصوص ذاتی توجہ کی طالب ہوتی ہے اور جونہی ذاتی توجہ تیز اور تنگ مقامات پر مرکوز ہوتی ہے اور وسیع تر میدان اپنی حیات سے محروم ہو جاتے ہیں تو تکوین اور وجود کی حیثیت معلومہ حقائق میں سمٹ جاتی ہے۔ اگر ہم ٹیوٹو برجر والڈ کی جنگ کی تفتیش کر رہے ہوں' تو ہم اپنے کام کا آغاز اس جھاڑی شمالی جرمنی کے میدانوں میں اگنے سے کرنا ہو گا۔ اس کے برخلاف اگر ہم جرمنی کی دنیائے اشجار کا معائنہ کر رہے ہیں' تو ہمیں کام کا آغاز متعلقہ زمین کی طبقاتی ساخت کے عمل کا آغاز کرنا ہو گا۔ اگرچہ یہ صرف بنیادی حقیقت ہے۔ واقعات کے آگے بڑھنے پر یہ بنیادی عمل بھی ختم ہو جائے گا لیکن ہمارے سامنے اگر مسئلہ کھریا مٹی کا ہے تو ہمیں علم ہے کہ کرہ ارض نظام شمسی کا ایک حصہ ہے تو اس حیثیت میں یہ کوئی مسئلہ نہیں بلکہ ایک امر معلوم ہے یا دوسرے الفاظ میں یہ بیان اس طرح ہو گا کہ اجرام فلکی میں ارض بھی شامل ہے اور اسی تناظر میں زمین پر حیات کا وجود ہے' اور اسی حیات میں ایک صورت انسان کی بھی ہے' اور انسانی تاریخ میں ثقافت بھی نامیاتی صورت میں موجود ہے' اور ہر معاملے میں مزید ایک اعلیٰ اور ارفع میدان عمل کی صورت موجود ہے۔

گوئٹے کے سٹاربرگ والے ابتدائی ایام سے لے کر اس کے قیام ویمر تک اس میں عالمی تاریخ کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کی خواہش بہت زیادہ تھی جیسا کہ اس کے مشہور خاکوں "سیزر' محمد' سقراط' آوارہ یہود اور نادر کامرانیوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی تصنیف ٹوسو میں ہمیں جس دکھ کا احساس ہوتا ہے' حتمی انقطاع تعلق کے جذبات سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہ اس کی ذہنی ہم آہنگی کا پتہ دیتی ہے' جس کے تحت اس نے سیاسی ملازمت سے اپنا تعلق منقطع کر لیا۔ اس کے بعد اپنے آپ کو سختی سے تاریخی میدان سے وابستہ کر لیا۔ حیوانات کی تاریخ اور ارضی تاریخ (زندہ فطرت۔ گوئٹے کی ایک تصنیف)۔ اس نے ایک طرف تو تاریخ لکھی اور دوسری طرف سوانح عمریاں۔

یہ تمام صورتیں جن کا وجود ایک ہی شخص میں تشکیل پایا' یکساں ساخت کا حامل ہے۔ تاریخ اشجار اور تاریخ حیوانات بھی یا قرش ارض بھی' اور اجرام فلکی بھی ایسی تصانیف ہیں جو اس کے داخلی رجحانات کا خارجی مظہر ہیں۔ حقیقت کا ایک آئینہ اس کی خودی کی تکوین کا رجحان۔ دنیائے حیوانات اور نقطہ آغاز کا طالب علم ایک انسان ہے جو ایک زمانے میں کسی قوم کے رکن کی حیثیت سے زندہ ہے اور اس کا اپنا معاشرتی مقام ہے اور یہ ممکن نہیں کہ اس کے معروضی تصورات کو اس سے علیحدہ کیا جائے اور اسے کہا جائے کہ انقلاب فرانس یا جنگ عالم گیر کا ایک تجریدی غیر جانبدارانہ محاکمہ کرے۔ کانٹ' لیپ لیس' کوویئر' لائل اور ڈارون کے مشہور نظریات میں بھی سیاسی اور معاشی رنگ موجود ہے اور ان کی عوام کے لیے قوت اور تاثر یہ ظاہر کرتے ہیں' اور ان تمام تاریخی موضوعات میں کیفیت اظہار ایک ہی ماخذ سے برآمد ہوئی ہے اور جو آج کامرانی نصیب ہوئی ہے وہ فاؤستی تاریخی فکر کی حتمی اہلیت کا نتیجہ ہے----- ان تمام تاریخی واقعات کے مابین نامیاتی انسلاک' تاریخ عالم کی ایک مبسوط علمی دستاویز جس میں ایک واحد شخص سے لے

کر کائنات کی قضا و قدر کے تسلسل کو بلا کسی انقطاع کے بیان کیا گیا ہے۔ انیسویں صدی میں مشینی انداز کی تصنیفات (غیر تاریخی) نے مسئلے کو گھمبیر بنا دیا۔ اب بیسویں صدی کے ذمے یہ فرض عاید ہے کہ وہ اسے درست حالت میں لائے۔

۳

وہ تصویر جو ہمارے پاس قشرارض کے متعلق موجود ہے۔ وہ ابھی تک ان تصورات کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ جو انگریز مہذب فکر کے پیدا کردہ ہیں۔ روشن خیالی کے عہد سے لے کر انگریزی زندگی کی عادات' لائل کا بلغمی مزاج نظریہ جو پرت ہائے زمین سے بحث کرتا ہے اور ڈارون کا نظریہ یہ حقیقت نوعی فی الحقیقت انگلستان کے ماحول ہی کی پیداوار ہے۔ تباہ کن اور پر آشوب تبدیلی ہیئت کی بجائے' جیسا کہ وان بچ اور کوویئر نے تسلیم کیا۔ انھوں نے طویل غور و فکر اور مخصوص طریق کار کے تحت' سائنسی معیار کے مطابق اپنے نظریات پیش کیے۔

انگریزی سلسلہ علت و معلول نہ صرف یہ کہ سطحی ہے بلکہ محدود بھی۔ یہ اول تو تمام روابط علت و معلول کو قرش ارض یعنی زمین کی بیرونی سطح تک محدود کر دیتا ہے' اور پھر اس تمام ارضی ماحول کے روابط کو منقطع کر دیتا ہے' جو کائناتی عوامل اور نظام شمسی سے ممکن ہیں۔ پھر یہ اصول موضوعہ کرتا ہے کہ کرہ ارض کا بیرونی قشریا سطح' فطری ماحول کا ایک ایسا خطہ ہے جو پوری طرح سے حاجز اور منفصل ہے اور ثانیاً" اس نے یہ مفروضہ قائم کیا کہ وہ تمام روابط جو موجودہ حالات میں انسانی ادراک کو دستیاب نہیں' مثلاً ایسے مشینی ذرائع سے بہتر بنائے گئے حواسی معاونات یا اوزار یا جدید نظریات سے ترتیب دیے گئے اصول' سرے سے موجود ہی نہیں۔

بیسویں صدی کا یہ فرض منصبی ہو گا کہ انیسویں صدی کے مقابلے میں وہ ان سطحی سلسلہ ہائے علت و معلول سے نجات حاصل کرے۔ جن کے ڈانڈے بوجہ رجعت قہقری' باروق عہد کی فکر سے جا ملتے ہیں اور ان کی جگہ خالص عالمانہ مسلمات پیش کرے۔ ہم ہر ایسی فکر کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں' جو از روئے علت موجبانہ وضاحت کرے۔ ہم ہر شے کو خود اپنی وضاحت کی اجازت دیتے ہیں' اور قضا و قدر کو ناگزیر سمجھتے ہوئے واضح اظہار کی ایسی صورت قبول کر لیتے ہیں جس پر ہم کبھی بھی غور و فکر نہ کر سکیں۔ جس کی آخری حد فطرت کے متعلق ایسے عناصر کی دریافت ہے' جو بظاہر کسی علت' یا مقصد کے بغیر موجود ہیں۔ انیسویں صدی میں ارتقا کا مطلب ایسی ترقی تھا جو موزونی حیات میں کسی مقصد کے حصول کے لیے اضافہ کرے۔ لیبنیز کی تصنیف پروٹو گا (۱۶۹۱ء) ایک ایسا کارنامہ تھا' جس میں اہم فکر کا سراغ ملتا ہے۔ اس کا مطالعہ ان تجربات پر مبنی تھا' جو اسے ہرز کی چاندی کی کانوں میں حاصل ہوا۔ اس نے دنیا کی ابتدائی حالت کی تصویر پیش کی ہے۔ یہ وہی فکر ہے جو تمام کی تمام گوئٹے کے ہاں بھی پائی جاتی ہے اور خود گوئٹے کا اس سے یہ مقصود

تھا کہ پوشیدہ مضمرات کے تصورات میں اضافہ کیا جائے۔ یہ دونوں تصورات یعنی گوئٹے کی تکمیل ہیئت اور ڈارون کا فلسفہ ارتقا باہم اسی قدر متضاد ہیں جتنا کہ نظریات قضا و قدر اور سلسلہ علت و معلول (اس میں اس قدر مزید اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ جرمن اور انگریزی تاریخ میں بھی اسی قدر فرق ہے۔)

اس سے زیادہ ڈارون کے نظریات کی تردید کسی نے نہیں کی جتنا کہ قدیم حیاتیات (Palaeontology) کی وجہ سے ہوئی۔ سب سے سادہ امکان یہ ہے کہ متحجرات کے ذخائر بطور نمونہ جات نشاندہی کے لیے استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے ہر نمونہ ایک علیحدہ قسم کی سطح ارتقا پیش کر سکتا ہے اور یہ بھی عبوری نوعیت کا ہو گا۔ ان میں سے کسی کی نہ تو منطقی تعریف ہو سکتی ہے اور نہ ہی نوع کا تعین ہو سکتا ہے۔ اس کی بجائے ہمیں ایسے مکمل اور مستقل نمونے دستیاب ہو گئے ہیں' جن میں نہ تو امتداد زمانہ سے کوئی تغیر رونما ہوا ہے نہ وہ ضائع ہوئے ہیں لیکن ان کی وجہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نظریہ موزونیت کی وجہ سے پیدا شدہ تغیرات کا ان میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اچانک اور فوری طور پر وہ اپنی موجودہ شکل و صورت میں ڈھل گئے مگر اس کے بعد انھوں نے موزوں تطبیق و تصرف کے لیے کوئی کوشش نہیں کی۔ بلکہ کم ہوتے گئے اور بالاخر ختم ہو گئے اور ان کی جگہ بالکل مختلف انواع وجود میں آ گئیں۔ ہیئت کے لحاظ سے اضافے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بہت سی انواع اپنے ماحول میں زندہ ہیں اور ابھی تک قائم ہیں اور ان کی حیثیت عبوری کبھی نہیں ہوئی اور وہ دور حاضر کے گروہوں میں پائے جاتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مچھلیوں میں شارک کی بعض اقسام اپنی سادہ نوعیت کے لحاظ سے تاریخ میں سب سے پہلے رونما ہوئیں اور پھر غائب ہو گئیں جبکہ ہڈی دار مچھلیاں آہستہ آہستہ تکمیلی مراحل طے کر کے اپنی تعداد میں اضافہ کرتی رہیں اسی اصول کا اطلاق نباتات میں کترف اور سرس کی بعض انواع پر بھی ہوتا ہے۔ جو پھول دار اقسام نباتات میں ابھی تک پوری طرح ترقی یافتہ صورت میں قائم ہیں۔ مگر افادیت کے اسباب یا دیگر مرئی اسباب کے مفروضات ماحول کی حقیقت پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔

یہ قضا و قدر ہی کا کرشمہ ہے کہ دنیا میں حیات نے وجود حاصل کیا اور حیوانات اور نباتات میں بعض نمایاں امتیازات قائم کیے۔ ہر ایک کی اپنی نوع ہے' اپنی نسل ہے اپنی جنس ہے اور اسی وجود کے ساتھ مخصوص توانائی کی صورت تفویض ہوئی ہے اور ہر شے تکمیل ذات کی بنا پر اپنے آپ کو ایک خالص صورت میں برقرار رکھتی ہے' یا اس کے برخلاف ست' غیر مصفی یا گریز پائی کی بدولت مختلف اقسام میں تقسیم ہو جاتی ہے اور بالاخر اس کا حتمی وقت آ جاتا ہے۔ (ماسوائے ایسے حادثات کے کہ ان کا دورانیہ حیات مختصر ہو جائے یا کوئی اور رکاوٹ پیدا ہو۔) ان کی مدت حیات میں آہستہ روی آ جاتی ہے اور بالاخر صفحہ ہستی سے غائب ہو جاتے ہیں۔

جہاں تک بنی نوع انسان کا تعلق ہے۔ سیلابات اور دریا برد ہونے کے زمانے کی دریافت سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ انسان کی آغاز ہی سے یہی ہیئت تھی' جو اب ہے اور اس امر کا کوئی سراغ نہیں ملتا

کہ موزونیت کی بنا پر اس میں کوئی تغیر آیا ہے اور انسان کے دور سومین کی نشاندہی میں مسلسل ناکامی یہ ظاہر کرتی ہے کہ انسانی ہیئت کبھی دوسری مخلوقات کی ہیئت کی طرح اچانک ہی اپنے تغیرات کے ساتھ ہی وجود میں آئی اور اس میں کب' کیسے اور کیوں' ہمیشہ راز ہائے سربستہ ہی رہیں گے اور اگر انگریزوں کے مفہوم کے مطابق ارتقا کا کبھی کوئی وجود ثابت ہونا ممکن ہوتا تو اس کے نتیجے میں نہ تو کوئی زمین کے پرت ہوتے' نہ حیوانات اور نباتات کی اقسام' بلکہ صرف ایک طبقات الارضی کیت کا وجود ہوتا اور حیات کی صرف ایک ہی قسم ہوتی جو جہد للبقا کے نتیجے میں باقی رہ سکتی۔ مگر جو کچھ بھی ابھی تک کرہ ارض پر محفوظ ہے وہ ہمیں یہ تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ باتکرار اور اچانک ایسی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں جو کائناتی نوع کی ہیں اور کسی طرح بھی قشر الارض تک محدود نہیں۔ ان کی تفہیم انسانی ادراک سے بالاتر ہے' ان میں سے بیشتر کا سراغ لگانا انسانی ادراک کے بس کا روگ نہیں۔ اسی طرح ہمارا مشاہدہ ہے کہ اعلیٰ ثقافتوں کی تاریخ میں شدید تبدیلیاں بڑی تیزی سے رونما ہوتی رہتی ہیں اور ان کے لیے کسی سبب' اثرات مقصد کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ رومی اور مصری اہرام اسی طرح اچانک وجود میں آ گئے جس طرح کہ چینی شہنشاہی کاشائی ہوانگتی خاندان یا روم کا آگسٹس' یونانیوں کا فروغ یا بدھ مت کا عروج اور اسلام کی شان و شوکت۔ انفرادی زندگی کے واقعات میں بھی یہی صورت حالات ہوتی ہے بشرطیکہ اس کی کوئی اہمیت ہو' جسے اس امر کا ادراک نہ ہو' اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ بنی نوع انسان بالخصوص اطفال کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ ہر تخلیق' جو فعال ہو اور فکر کے جذبے سے سرشار ہو' وہ اپنے زمانے کے ساتھ چلنے کے لیے کوشش کرتی ہے اور یہی دور یا زمانہ نظام شمسی' کائنات اور اجرام فلکی پر محیط ہے۔ زمین پر زندگی کی ابتدا یا آزادانہ نقل و حرکت سے متصف جاندار بھی اسی زمان کا حصہ ہیں اور اس لحاظ سے وہ ایسے راز ہیں' جن کو ان کی موجودہ حالت ہی میں قبول کرنا ہوگا۔

۴

ہم انسان کے متعلق جس قدر جانتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس کی تکوین کو دو واضح ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور ہمارے خیال کے مطابق صرف ایک پہلو تک محدود ہے' جسے آپ ستاروں کی گردش کے حوالے سے برفانی دور کا آغاز کہتے ہیں اور جس کے متعلق ہم (تاریخ عالم کی رو سے) زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک کائناتی تبدیلی وجود میں آئی۔ اور دوسرے الفاظ میں ہم اسے دریائے نیل اور دریائے فرات کی ثقافتوں کا آغاز بھی کہہ سکتے ہیں' اور اس کے ساتھ ہی بنی نوع انسان کی حیات کے معانی ہی بدل جاتے ہیں۔ ہم بڑی تیزی سے دور ثالث اور دریا برد سیلابی قرش ارض کی تمیز سے آشنا ہوتے ہیں' اور ہمیں اس دور میں انسان اپنی مکمل حالت میں نظر آتا ہے' جسے رواجات' اساطیر' مزاح' آرائش' اور ہنر مندی سے پوری واقفیت حاصل ہے۔ وہ ایک ایسے جسم کا مالک ہے جس میں آج تک کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

ہم پہلے دور کو ابتدائی ثقافت سمجھتے ہیں۔ یہی وہ صورت تھی' جس میں کہ ثقافت دوسرے دور کو بھی

گزار گئی (اگرچہ اسے ثانوی یا موخر دور بھی کہہ سکتے ہیں) اور شمال مغربی افریقہ میں آج کے دور میں بھی اس کے آثار محفوظ بلکہ زندہ ہیں۔ "لیو فروبینیاس" یہ ایک عظیم کارنامہ ہے کہ اس نے اس دور کو واضح طور پر شناخت کیا' اور تمام دنیا میں ایک ابتدائی حیات کے وجود کا تصور پیش کیا (اس نے اپنے مطالعے کو بعض قدیم قبائل تک محدود نہ رکھا) اور اپنے آپ کو ترقی یافتہ ثقافتوں سے بچائے رکھا' اس کے برخلاف نسلیاتی نفسیات کے ماہرین پانچوں براعظموں میں سے بعض ایسے گروہوں کا انتخاب کر لیں' جن کا فی الحقیقت ایک دوسرے سے کسی قسم کا بھی کوئی تعلق نہ ہو گا اور کچھ بھی مشترک نہ ہو گا' بلکہ ایک منفی حقیقت یہ ہو گی کہ یہ سب کسی نہ کسی ترقی یافتہ ثقافت کے درمیان رہائش پذیر ہوں گے اور ان کے زیر اثر زندگی بسر کر رہے ہوں گے' مگر ان ثقافتوں کی داخلی زندگی میں ان کا کچھ بھی عمل دخل نہ ہو گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ قبائل کا ایک مجموعہ کچھ آباد' کچھ اندرونی حصوں سے متعلق اور کچھ آمادہ بزوال جن کا ذریعہ اظہار مختلف' جن کو بغیر کسی منصوبہ بندی کے یکجا کر لیا گیا ہو۔

ابتدائی دور کی ثقافت ٹکڑوں میں منقسم نہ تھی بلکہ ایک مضبوط اور مکمل' طاقت ور اور کارگر۔ یہ ثقافت صرف ہر چیز میں اتنی مختلف ہے کہ ہم لوگ جو ارفع ثقافتوں سے متعلق ہیں اور ہمیں روحانی امکانات حاصل ہیں۔ ہم یہ سوال کر سکتے ہیں کہ کیا وہ لوگ بھی جنھوں نے دور اول کو دور ثانی تک پہنچا دیا وہ اس امر کی ایک عمدہ شہادت ہیں کہ کیا ان کا دور موجودہ شرائط حیات اور تکوین شعور' قدیم دور کے حالات کے مطابق بہتر ہیں۔

اب ہزاروں سال سے انسان کا شعور بیدار اس دور کے عوام اور قبائل کے تعلقات باہمی کے متعلق گہرا تاثر رکھتا ہے اور اس میل جول کو روز مرہ کی ایک حقیقت سمجھتا ہے' مگر جب ہم قدیم ابتدائی دور کے متعلق غور کریں تو ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس زمانے میں انسان چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور وہ زمین کے نشیب و فراز کی وسعتوں میں گم تھے اور اس دور کے اصل حکمران جانوروں کے بڑے بڑے گلے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس کا کوئی انسانی ڈھانچہ شاذ و نادر ہی ملتا ہے۔ اس عہد کا آرگیسی انسان کے دور میں کل انسانی آبادی ایک درجن گروہوں پر مشتمل ہو گی اور ان میں چند سو نفوس شامل ہوں گے جو تمام فرانس کے رقبے میں سرگرداں ہوں گے اور اگر ان گروہوں کی آپس میں کہیں ملاقات ہو جاتی ہو گی اور انھیں پتہ چلتا ہو گا کہ ان کے اور ہم جنس بھی اس دنیا میں موجود ہیں تو وہ کتنے خوش ہوتے ہوں گے۔ کیا ہم اس کا کم از کم اندازہ بھی کر سکتے ہیں کہ ایسی دنیا میں رہنے کا کیا مزہ ہو گا جبکہ یہ انسان سے کم و بیش خالی ہو گی؟ اور انسان کے شعور میں کیا تبدیلیاں پیدا ہوئی ہوں گی جب اسے معلوم ہوا ہو گا کہ ان جنگلات میں حیوانوں کے علاوہ انسانی گروہوں سے بھی ملاقات ہو سکتی ہے اور وہ ویسے ہیں اس جیسا کہ وہ خود ہے۔ غالباً" اس کے بعد ان کی ملاقاتوں میں اضافہ ہونے لگا ہو گا اور اس طرح انسانوں کی تعداد بھی بڑھنے لگی ہو گی۔

یہ مرحلہ بھی غالباً" اچانک ہی طے ہو گیا ہو گا اور ہم جنس مخلوق سے ملنے کا تجربہ عادت کی شکل اختیار کر گیا ہو گا۔ اب حیرانی دور ہونے لگی' اور ملاقاتیں پرلطف ہونے لگیں۔ یہ تجربات کی نئی دنیا تھی' جس کے نتیجے میں نادانستہ طور پر اور غالباً" غیر ارادی بھی' نئے رشتے استوار ہونے لگے۔ تاریخ انسان کے حوالے سے یہ واقعہ سب سے زیادہ ثمربار اور تمام واقعات کے مقابلے میں اہم ترین تھا۔ پہلے تو وہ ناجنس حیوانات کے مقابلے میں اپنی ذات کی شناخت کرتا تھا' اب ایک قبیلے کی دوسرے سے واقفیت اور تعلقات کی استواری نے قبیلوں میں اتحاد کے عمل کا آغاز کر دیا۔ یقیناً" اس سے قدیم فکری شعور کی جگہ اتحاد فکر و عمل نے لے لی' کیونکہ نئی صورت حالات نے جذباتی افہام و تفہیم کی طرح ڈالی اور بول چال کی زبان کی بنیاد قائم ہونے لگی (اور اس کے نتیجے میں تجریدی فکر کا بھی آغاز ہو گیا) اور ان میں سے بعض خوش قسمت (اگرچہ ہم ان کی تشکیل کے متعلق کوئی تصور قائم نہیں کر سکتے) انسان ایسے بھی تھے جنھوں نے ہند آریائی یورپی اور سامی زبانوں کی طرح ڈالی۔

لٰہذا اس عوامی قدیمی ثقافت نے مختلف قبائل میں باہمی تعلقات کا آغاز کیا۔ پھر اچانک ہی (۳۰۰۰ ق م) مصر اور بابل کی ثقافتیں وجود میں آ گئیں۔ غالباً" اس سے بھی ایک ہزار سال قبل یہ قطعات ارض کسی شے کی پرورش کر رہے تھے' جس نے ان ثقافتوں کو جنم دیا' جو اپنی نوعیت اور عزم دونوں لحاظ سے ان قدیم ثقافتوں سے مختلف تھی۔ اس کے تمام طریقہ ہائے اظہار میں داخلی اتحاد پایا جاتا تھا۔ یہی حال اس کی زندگی کی سمت بندی کا تھا۔ میرا خیال ہے کہ دور میں اگر تمام کرہ ارض پر نہ بھی ہو' پھر بھی انسان میں کسی نہ کسی لحاظ سے تبدیلی رونما ہو رہی تھی اور اگر یہ خیال درست ہو تو پھر کوئی بھی قابل ذکر قدیم ثقافت جو ابھی تک قائم ہو اور متواتر زوال کا شکار ہو' کیونکہ وہ مختلف ارفع ثقافتوں کے گھیرے میں ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنی قدیم ثقافتی کیفیت سے قطعاً" مختلف ہو گی۔ مگر کسی بھی قسم کی ابتدائی ثقافت کے حوالے سے (جسے میں قبل از ثقافت کا نام دیتا ہوں' اسے ہر ثقافت کے آغاز میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے) یہ بالکل نئی اور مختلف صورت ہے۔

حیات کی تمام قدیم صورتوں میں "یہ" کائنات اتنی قوت کے ساتھ مصروف عمل ہے کہ عالم صغریٰ کے تمام اظہار' خواہ وہ اساطیر' رواجات یا طریقہ کار میں ہوں' یا محض آرائشی ہوں' صرف لمحاتی دباؤ کو ہی قبول کرتے ہیں۔ ہمارے پاس ایسے قابل اعتماد معیار موجود نہیں جو مدت' رفتار' اور ان بیانات کے طریق تعبیر کی وضاحت کر سکیں۔ ہم زبان کی مرصع صورت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اسے اسلوب نہیں کہنا چاہیے۔
جو کسی وسیع خطے میں پھیل رہی ہو' تبدیلی پیدا کر رہی ہو' اور بالآخر ختم ہو رہی ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ اور غالباً" کسی دوسرے میدان وسعت میں ہمیں فیشن کی کیفیات' اسلحے کے استعمال' قبائلی تنظیم' مذہبی اعمال' ہر ایک علاقے میں ایک نمایاں مختلف انداز میں' جس میں کہ مخصوص عہد کی اپنی خصوصیات کے ساتھ مروج ہیں' ان کا آغاز و انجام بھی اپنا اپنا ہے' جس پر مقامی اثرات اور رواجات واضح دکھائی دیتے ہیں۔ جب کسی قبل از تاریخ طبقات میں ہم معلومہ نوعیت کے ظروف کی شناخت کر لیتے ہیں تو محض ان کی مدد سے ہم اس

آبادی کے رواجات اور مذہب کے متعلق کوئی محفوظ رائے قائم نہیں کرسکتے' جن کی کہ مذکورہ ظروف ملکیت تھے اور اگر اتفاق سے متعلقہ مقام پر کسی زمانے میں کوئی شادی کی تقریب ہوئی ہو یا کسی خاص قسم کی تفتیش گری کا مظاہرہ ہوا ہو تو اس سے تو کوئی بھی مشترکہ تصور یا بنیادی نکتہ پیدا نہیں ہوتا' جس کی مدد سے کسی خاص دور کی نشاندہی کی جاسکے۔ مثال کے طور پر کسی مقام سے یا دور یا کسی تناظر کے حوالے سے نقاشی کے نمونے مل جائیں تو محض ان کی مدد سے کوئی قابل یقین مسلمات قائم نہیں کیے جا سکتے۔ محض زیورات کی دریافت سے اس عہد کی طبقاتی تنظیم کا کوئی سراغ لگانا ممکن نہیں' یا آپ ان کے روحانی مسلک یا زرعی نظام کا تصور قائم نہیں کر سکتے۔ ان پہلوؤں کی ترقی سے مراد متعلقہ قدیم ثقافت کے صرف کسی ایک انفرادی پہلو کی نشاندہی ہوتی ہے اور اس سے متعلقہ ثقافت کی پوری تصویر سامنے نہیں آتی جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ یہ تصور تباہ کن ہے۔ کیونکہ قدیم ثقافت نہ تو فی نفسہ کوئی نامیاتی شے ہے اور نہ متعدد نامیاتی اشیا کا مجموعہ ہے۔

مگر ایک ارفع ثقافت کے سلسلے میں "یہ" وجود کسی مضبوط اور اور غیر معروف رجحان کی نشاندہی کرتا ہے۔ ابتدائی ثقافتوں میں قبائل اور جماعتیں جلد جلد ظہور میں آتی ہیں۔ یقینی طور پر انفرادی طور پر اشخاص کے حوالے سے بات نہیں ہوتی۔ اس صورت میں ان کی ثقافت بھی اسی طرح عجلت سے تغیرپذیر ہوتی ہے۔ ہر قدیم شے ایک مجموعی حیثیت کی حامل ہے وہ قدیم گروہوں کے مجموعی اظہار کا ایک وسیلہ ہے۔ اس کے برخلاف ایک ارفع ثقافت ایک واحد مگر بہت بڑے مجموعہ آبادی کے شعور بیدار کی ترجمان ہے' جس کا اظہار رواجات' اساطیر' تکنیک' اور فن کے وسیلے سے ہوتا ہے۔ ان کے متعدد وسائل اظہار میں ظروف بھی ایک وسیلے کے طور پر شامل ہیں اور تاریخ کے کسی ایک پہلو کا اظہار کرتے ہیں۔ قدیم ترین تقریر جو ہمارے علم میں آئی ہے' اس کا تعلق ابتدائی ثقافت سے ہے اور اس میں بعض غیر قانونی نتائج کی نشاندہی کی گئی ہے' ظاہر ہے کہ کوئی ایسی تقریر' شادی یا محض آرائشی مواقعات پر نہیں کی جاتی' مگر رسم الخط کی تاریخ' مختلف ارفع ثقافتوں میں تاریخ اظہار ہی کا حصہ رہی ہے' یعنی مصری' چینی' بابلی اور میکسیکی ہر ایک کا قبل از ثقافت بھی رسم الخط موجود تھا' مگر ہندوستانی اور کلاسیکی ثقافتوں میں اس کا سراغ نہیں ملتا' مگر انھوں نے (اگرچہ بڑی تاخیر سے) ایک ہمسایہ تہذیب یعنی عربوں سے رسم الخط حاصل کر لیا۔ بہت ہی کم ایسے مذاہب ہوں گے' یا ایسی نسلیں ہوں گی' جنھوں نے آغاز ہی سے اپنا رسم الخط ایجاد نہ کر لیا ہو۔ یہ وہ حقائق ہیں جن کا متعلقہ ثقافتوں سے بہت قریبی تعلق ہے اور داخلی لحاظ سے ان کی بہت بڑی اہمیت ہے۔

ان دو ادوار کے متعلق ہمارا علم محدود ہے' اور اس قدر تو ہرگز نہیں کہ ان سے نتائج اخذ کیے جا سکیں اور ان کی مدد سے ان کا تاریخی تعین کیا جاسکے یعنی کب؟ اور کیسے؟ کے جوابات حاصل کیے جا سکیں۔ اس حقیقت کے قطع نظر کہ بہر صورت وہ کائناتی روابط جو تاریخ انسان کو بطور علیحدہ نسل زیر انصرام لاتے ہیں ہماری دسترس سے باہر ہیں۔

میری فکر اور مشاہدہ طبیعی حالات کے مشاہدے کی تعبیر تک محدود ہے۔ ایسے مواقعات پر جن میں "منصف انسانیت" کا تجربہ متعلقہ ماحول اور "فعال انسان" کا تجربہ متعلقہ حقائق غیر موثر ثابت ہو جائے تو داخلی بصیرت بھی محدود ہو جاتی ہے۔ ان دو ادوار کا وجود تاریخی تجربے کی ایک حقیقت ہے۔ ابتدائی ثقافتوں کے متعلق ہمارا تجربہ صرف ان کے آثار کی چھان بین تک محدود ہے جو خود مکتفی اور اختتام پذیر معاملہ ہے مگر اس کے باوجود ہمارے ان آثار سے گہرے روابط کے ردعمل کے باعث ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مگر دوسرا دور ہمارے لیے ایک مختلف نوعیت کے تجربے کو پیش کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا حادثہ تھا' جس کا مفہوم اس زمانے میں واضح نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک اعلیٰ پائے کی ثقافت کا اچانک ظہور ہوا جس کی بدولت تاریخ انسان میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا۔ امکانی طور پر سطح زمین پر ہی کوئی ایسی تبدیلی رونما ہوئی ہو جس کی بدولت ایک نئی ماحولی کیفیت حیات وجود میں آگئی ہو' مگر یہ حقیقت ہمارے سامنے ہے کہ آٹھ ایسی ثقافتیں' جو یکساں نوعیت کی تھیں' جن کی ترقی یکساں ہوئی' اور یکساں مدت تک قائم رہیں' بیک وقت وجود میں آگئیں لہٰذا ہمارے لیے ان کا تقابلی جائزہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس سے خود ہمارے علم میں اس قدر اضافہ ہو گا کہ ہم اپنی معلومات کو ماضی میں دور تک لے جا سکیں گے' اور مستقبل میں بھی آگے تک احتمالات کا تعین کر سکیں گے۔ البتہ یہ امر ہمیشہ ذہن نشین رہنا چاہیے کہ قضا و قدر کے تحت مختلف انجام' اچانک یا بنیادی طور پر کسی عالمی ہیئت میں تبدیلی کا باعث نہیں ہو سکتا۔ پس اس عمل کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے ہمارا اختیار نامیاتی تکوین کے عام تجربات تک ہی محدود ہے۔ کیونکہ ہم تاریخی طیر خاطف یا مستقبل کے صنوبری احتمالات کے متعلق ہم کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتے کہ کب اور کیسے کوئی جدید نوع وجود میں آجائے' پس ثقافتی تاریخ میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ کب اور کیسے ایک نئی ثقافت ظہور میں آجائے گی۔ مگر جس لمحے رحم گیتی میں ایک جدید وجود کا احساس ہونے لگے' یا کوئی بیج زمین میں داخل ہو جائے تو ہمیں ایک نئی ہیئت کے جادہ حیات کا اندازہ ہونے لگتا ہے' تو اس کے بعد اس کی افزائش کے سارے عمل سے ہم آگاہ ہیں اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس کی تکمیل پر بیرونی دباؤ اثر انداز ہو سکتے ہیں مگر ان سے اس کا جادہ عمل کبھی تبدیل نہیں ہوتا۔

اس تجربے سے یہ رہنمائی حاصل ہوتی ہے کہ جس تہذیب نے دور حاضر میں تمام سرزمین پر اپنا قبضہ جما رکھا ہے' یہ تیسرا دور نہیں' بلکہ صرف ایک مرحلہ ہے----- ایک لازمی مرحلہ----- جسے مغربی ثقافت کا ایک جزو سمجھنا چاہیے جو اپنے مشابہ مراحل سے طاقت ور وسعت پذیری کی بدولت شناخت کیا جا سکتا ہے۔ یہاں تجربہ ختم ہو جاتا ہے اور اس امر کے تمام اندازے کہ بنی نوع انسان کے مستقبل کی کیا صورت ہو گی (یا اس لحاظ سے کوئی نئی شکل و صورت ہو گی بھی یا نہیں) اور تاش کے پتوں کی بڑی بڑی عمارتیں' جن کی بنیادیں انتہائی کمزور ہیں "ان کا وجود ضروری ہے یا یہ قائم رہیں گی" یہ سب کچھ غیر اہم ہے' بلکہ بالکل فضول ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس بنیاد پر ایک واحد قدر کا وجود بھی ضائع نہیں کیا جا سکتا۔

ارفع ثقافتوں کا کوئی طبقہ نامیاتی وحدتوں کا گروہ نہیں ہوتا تاکہ ان کی تعداد' محل وقوع یا زمانی دور کا تعین کیا جا سکے۔ یہ انسانی بصارت کے لیے ہے کہ ان حادثات کی بغیر نمایاں اور واضح علامات تفہیم کے شناخت کر لے۔ انفرادی ثقافتوں کی ترتیب' اس کے برخلاف اتنی واضح اور نمایاں ہوتی ہے' کہ تاریخ شناسی کا چینی یا مجوسی فن اور مغربی دنیا کا شعور ان ثقافتوں کی بخوبی نشاندہی کر سکتا ہے اور اس بنیاد پر ان ثقافتوں کے لیے اسما کا ایسا مجموعہ تیار کر سکتا ہے' کہ اس سے بہتر ممکن نہ ہو۔

لہٰذا تاریخی فکر پر یہ دہرا فرض عائد ہوتا ہے کہ ایک طرف تو وہ ثقافتوں کے انفرادی طریق حیات کا موازنہ کرے اور دوسری طرف ان روایتی بے قاعدہ تعلقات کا جائزہ لے جو یہ ثقافتیں آپس میں قائم کرتی ہیں اور اپنے مطالب کی وضاحت کرتی ہیں۔ پہلے فریضے کا لزوم بالکل واضح ہے اگرچہ ابھی تک اسے نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ دوسرے پر کچھ کام ہوا ہے مگر اس کا معیار سطحی رہا ہے اور وہ غیر مستعد ہاتھوں میں انجام پایا ہے۔ اس میں سلسلہ علت و معلول کو غیر ضروری طور پر استعمال کیا گیا ہے اور تمام حادثات کو تاریخ عالم کے غیر ضروری مفروضوں کے ساتھ ملحق کر کے ان کی نفسیاتی کیفیت کے مشکل مرحلے کو جو بے حد فکر انگیز ہے' ناممکن الفہم بنا دیا ہے' بلکہ ان میں سے کسی بھی ثقافت کی داخلی حیات کو دریافت کرنا بھی مشکل بنا دیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ پہلا مسئلہ اسی صورت میں حل ہو سکتا ہے جبکہ دوسرا اس سے قبل حل کیا جا چکا ہو۔ ان کے مابین روابط زمانی اور مکانی لحاظ سے بھی عجیب و غریب ہیں۔ صلیبی جنگوں نے ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا کہ قدیم اور پختہ ثقافتیں ایک دوسرے کے مدمقابل آ گئی تھیں' یعنی ایک مائی سینی دور میں بیج بونے اور سنہرے خزاں کا موسم یک جا ہو گیا تھا۔

یہ امکان تھا کہ کسی دور واقع مقام سے تہذیب کی کوئی ندی ان متحارب گروہوں پر سے گزر جائے' جیسا کہ مشرق سے ہندوستانی تہذیب عربوں میں سرایت کر گئی یا سست رو اور گلا گھونٹ دینے والی کلاسیکی ثقافت اپنی طفلانہ حالت میں سرحدیں پار کر گئی' مگر ان کی نوعیت اور قوت میں بھی فرق ہے۔ مغربی ثقافت تعلقات میں افزائش چاہتی ہے' جبکہ مصری اسے نظر انداز کرنا چاہتی ہے۔ اول الذکر اس معاملے میں متعدد بار ہار گئی جب کہ کلاسیکی بغیر کسی تکلیف کے جو چاہتی ہے حاصل کر لیتی ہے' مگر تمام رجحان ثقافت کی روحانیت ہی میں موجود ہیں---- اور کسی وقت ان سے متعلقہ ثقافت کے متعلق ان کے مقابلے میں بھی زیادہ اطلاعات دستیاب ہوتی ہے' کیونکہ اظہار اکثر اوقات جتنا بتاتا ہے' اس سے زیادہ مخفی رکھتا ہے۔

۵

اگر ان ثقافتوں کے طبقہ پر ایک نظر ڈالیں تو اس کے فرائض منصبی کا یکے بعد دیگرے پتہ چلتا ہے۔ انیسویں صدی' جس میں کہ تاریخی تحقیق طبعی علوم کے تحت عمل میں لائی جاتی تھی اور تاریخی فکر بارورق کے تصورات کے تحت انجام پاتی تھی' ہمیں ایسے بلند مقام پر لے آئی ہے' جہاں سے کہ تمام دنیا ہمیں اپنے

قدموں کے نیچے نظر آتی ہے۔ کیا ہم اس جدید دنیا پر کبھی قابو حاصل کر سکیں گے؟

آج بھی ان عظیم طریقہ ہائے زندگی کے لیے یکساں سلوک بہت مشکل ہے۔ کیونکہ بعید مسائل کا آج تک بھی جائزہ نہیں لیا گیا۔ ایک بار ہم پھر کہتے ہیں کہ یہ مغرب کے مغرورانہ ذہن کا وطیرہ ہے۔ وہ صرف ان امور کی طرف متوجہ ہوتا ہے' جو کسی قدیم دور سے ازمنہ وسطیٰ کی وساطت سے اس تک رسائی حاصل کرے اور وہ امور جو اپنی راہ چل رہے ہوں' اس سے کم سے کم توجہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس لیے چینی اور ہندوستانی دنیا سے متعلق امور کی بعض انواع کو اب چھیڑا جا رہا ہے جن میں فنون' مذہب اور فلسفہ شامل ہیں۔ مگر سیاسی تاریخ کی طرف اگر توجہ کی بھی گئی ہے تو وہ بھی محض لفاظی کی حد تک۔ یہ کبھی کسی کے خیال میں نہیں آیا کہ چینی تاریخ کے سنگین دستوری مسائل کا بھی جائزہ لیا جائے۔ لی ونگ کا ہونس ٹافن خاندان (۸۴۲)' شہزادگان کی مجلس اول (۶۵۹ء)' روی ریاست تسین لین بگ کی شہنشاہیت کے خلاف اصولی جنگ' سو تسنگ کے عہد (۳۰۰ - ۵۰۰) میں جمعیت الاقوام کا تصور۔ چین کے آگسٹس ہوانگ تی کا خروج۔ کسی پر بھی معمولی غور بھی نہیں کیا گیا اور تمام کا تمام وقت آگسٹس کے اصولوں کی نذر کر دیا جاتا ہے۔ دوبارہ ہندوستان کا ذکر کیا جاتا ہے' جبکہ خود ہندوستانی اپنی تاریخ کو فراموش کر چکے ہیں۔ بہرحال ہمارے پاس کلاسیکی نویں اور آٹھویں صدی کے مقابلے میں بدھ کے متعلق زیادہ مواد موجود ہے اور اس کے باوجود ہم آج بھی اس فکر پر عمل کرتے ہیں کہ ہندوستانی اپنی زندگی کو بدھ کی تعلیمات کے زیر اثر بسر کرتے رہے ہیں۔ جس طرح کہ ا-تھمنی (ہمیں کلاسیکی زعما ہی تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں) اپنی زندگی دریائے الی سوس کے کنارے بیٹھ کر فلسفیانہ انداز میں بسر کر لیا کرتے تھے۔ مگر مصری سیاسین بھی اپنی طرف زیادہ توجہ منعطف نہیں کرا سکے۔ مصری متاخر مورخین نے بھی' ہا کسوس عہد' کے تحت اس بحران پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جس طرح کہ چینیوں نے "دعوے دار ریاستوں کے عہد" کے زیر عنوان ایک عہد کو پردہ اخفا میں ڈال دیا۔ ان معاملات کی تحقیق بھی کبھی نہیں کی گئی۔ جہاں تک عرب دنیا کا تعلق ہے اس کی سرحدیں بھی کلاسیکی زبانوں کے دور تک پہنچ کر ختم ہو گئیں اور اس سے آگے نہیں بڑھیں۔ جس محنت اور تندہی سے ہم نے دائیو قلیٹس دستور پر کام کیا ہے اور ایشیائے کوچک کی ریاستوں کی انتظامی صورت حال پر مواد جمع کیا ہے اس کی وجہ محض یہ ہے کہ یونانی زبان میں مرقوم تھا۔ مگر ساسانی ریاستیں' جو ہر لحاظ سے دائیو قلیٹس کے لیے نمونہ کا کام دیتی رہی ہیں' ان کا ذکر شاذ و نادر ہی کیا جاتا ہے اور وہ بھی اس موقع پر جب روم ان سے جنگ آزما ہوا۔ اس کے اپنے انتظامی نظام اور عدالتی تاریخ کی صورت کیا تھی؟ اور مصری معاشیات کے متعلق ہم نے کتنا تحقیقی مواد جمع کیا ہے؟ اور ہندوستان اور چین پر کیے جانے والے کام کا موازنہ یونانی اور رومی قانون کے متعلق سرانجام دیے گئے کام سے کیا جائے۔

ایک طویل عرصہ حضانت کے بعد جس کے آثار مصر کے کئی علاقوں میں ابھی تک پائے جاتے ہیں' کوئی ۳۰۰۰ ق م کے قریب دو انتہائی قدیم ثقافتیں چھوٹے چھوٹے خطوں میں وجود میں آئیں۔ ان میں سے ایک زیریں نیل اور دوسری زیریں فرات کے کناروں پر واقع تھیں۔ اس سلسلے میں قدیم اور متاخر مدتوں

کا تعین عرصہ دراز سے قدیم اور وسطانی حکومتوں اور سمیر اور عکاد کے حوالے سے کر دیا گیا ہے۔ مصری جاگیر داری دور کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک نسلی شرفا کا طبقہ وجود میں آگیا اور قدیم شہنشاہیت کا (چوتھے خاندان کے بعد) اختتام ہو گیا۔ یہ واقعات چین اور مغرب کے ادوار خوش حالی سے اس قدر مشابہ ہیں کہ آئی وانگ (۹۰۹ ـ ۹۳۴) سے لے کر اور مغرب میں شہنشاہ ہنری چہارم (۱۱۰۶ ـ ۱۰۵۶) کے ادوار کا تقابلی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ بابلی باروق کے آغاز میں ہمارا تعارف عظیم فاتح سارگان سے ہوتا ہے (۲۵۰۰ ق م) جس نے بحیرہ روم کے ساحل کی آبادیوں کو باہر نکال دیا اور قبرض پر قبضہ کر لیا اور اپنے آپ جو جسٹینین اول اور چارلس پنجم کی طرح، کرہ ارض کے چاروں حصوں کا حکمران قرار دے لیا اور کچھ مدت بعد (۱۸۰۰ ق م) دریائے نیل پر، اور اس سے قبل سمیر عکاد کے دور میں ہمیں تہذیب کا آغاز نظر آتا ہے، جس میں ایشیائیوں نے بے پناہ قوت کا مظاہرہ کیا۔ بابلی تہذیب کی کامرانیاں (جیسا کہ کتابوں میں ذکر ہے) نظام پیمائش، علم الاعداد اور شمار پر محیط ہیں۔ ان لوگوں نے شمال کی طرف سفر کیا اور بحیرہ زرد تک پہنچ گئے۔ بابل سے برآمد کردہ ایک اوزار پر اس ملک کا تجارتی نشان کندہ ہے، جو ابھی تک جرمنی میں محفوظ ہے اور بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، ممکن ہے کہ قدیم جرمنی میں زیورات کی صنعت کا آغاز اسی دور میں ہوا ہو۔ مگر اس دور میں بابلی سلطنت بھی مختلف اقوام کے قبضے میں منتقل ہوتی رہی جن کا سائیت، اشوری، کلدانی، میڈ، اہالیان فارس اور مقدونیائی شامل ہیں۔ یہ سب چھوٹے چھوٹے قبائل تھے۔

دنیا میں رومی سلطنت کے نمونے پر قائم کی جانے والی حکومت کی یہ پہلی مثال ہے، جو بابل میں قائم ہوئی اور جلد ہی اسی نمونے پر ایک حکومت مصر میں بھی قائم ہو گئی۔ (اس سے یہ مراد نہیں کہ رومی حکومت کو تقدم زمانی حاصل ہے بلکہ صرف یہ کہ ایک ایسی حکومت قائم ہوئی جسے بعد میں رومیوں نے خصوصی رواج دیا) کا سیتیوں کے تحت یہ حکومت قائم ہوئی جسے بعد میں پراطوریوں اور اشوریوں نے پامال کر دیا۔ ایسے ہی جیسا کہ بعد میں رومی عسکری شہنشاہوں نے روم میں کیا (کموووس کے بعد)، مگر قدیم دستوری طریق کو قائم رکھا۔ فارس کا سائرس اور آسٹرو گوتھ تھیوڈوری اپنے آپ کو سلطنت کا منتظم کہتے تھے اور دست شمشیر زن ہونے کا دعوئ کرتے تھے، جبکہ میدا اور لومبارڈ اپنے آپ کو اردگرد کے غیر علاقوں کا بھی آقا قرار دیتے تھے۔ افریقی سیپ ٹی می اس سروس کے لشکری الارا کے وسی گوتھ سے کسی طرح بھی مختلف نہ تھے اور جنگ ایڈریا نوپل کے بعد رومیوں اور بربریوں میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا۔

۱۵۰۰ ق م کے بعد تین نئی ثقافتیں وجود میں آ گئیں جن میں پہلی ہندوستان میں واقع تھی، جس کا محل وقوع پنجاب کے بالائی علاقوں میں تھا۔ پھر اس کے سو سال بعد ہوانگ ہو کے وسط میں اور پھر ۱۱۰۰ ق م میں کلاسیکی تہذیب بحیرہ ایجین کے ساحل پر نمودار ہوئی۔ چینی مورخین تین بڑے خاندانوں کا ذکر کرتے ہیں۔ شانگ اور چاؤ بالکل اسی طرح جس طرح کہ نپولین نے اپنے آپ کو چوتھے خاندان کا بانی قرار دیا جو میروو نجین کا رو لنجین اور کیپرٹین کے بعد وجود میں آیا۔ فی الحقیقت تیسرا خاندان ثقافت کے وجود کے ساتھ ساتھ قائم رہا۔ جب ۴۴۱ء چاؤ خاندان کے برائے نام بادشاہ، مشرقی شہزادوں کے وظیفہ یاب قرار پائے اور

جب ۱۷۹۳ء میں لوئیس کیپر کو قتل کر دیا گیا، تو ہر معاملے میں ثقافت، تہذیبی مرحلے میں داخل ہو گئی۔ متاخر چانگ کے دور کے کچھ کانسی کے ظروف اور سکے محفوظ ہیں، جو فنی لحاظ سے مائی سینی دور کے فن پاروں سے قریبی مشابہت کے حامل ہیں، جن کا تعلق قدیم کلاسیکی ظروف کے کارولنگی رومانی فن سے ہے۔ ویدوں کے زمانے میں، ہومر کے دور میں، اور چین کے عہد خوش حالی میں نائزن اور برجن کی جھلک ملتی ہے۔ ان کے شرفا اور جاگیر دار حکمران، رومی جاگیرداروں کا عکس ہیں اور عظیم محافظین کا دور (ینگ چو ۶۹۱ـ۶۸۵ء) کراموپل، ویلنس ٹین، رچی لیو اور یونانی دنیا کے اول ٹائرانس سے مشابہ ہے۔

چین کے مورخین ۲۳۰ ـ ۴۸۰ ق م کے عرصے کو دعویدار ریاستوں کے دور سے منسوب کرتے ہیں۔ اس کا عروج ایک طویل غیر مختتم جنگ سے ہوا جو انتہائی خوفناک، تباہ کن معاشرتی بغاوت کی صورت اختیار کر گئی اور اس کے نتیجے میں چین میں ایک رومی ریاست تسین کے نام سے قائم ہو گئی، اسی دور کی آخری صدی (۱۵۸۰ ـ ۱۷۸۰ ق م) مصر میں ہا کسوس کے زمانے سے موسوم ہے۔ کلاسیکیوں کو اس کا تجربہ گراکچی (۱۳۳ ق م) سے ایکٹینم (۳۱ ق م) تک ہوا اور یہی انجام یورپی اور امریکی ثقافتوں کو انیسویں اور بیسویں صدی میں درپیش ہے۔

اس مدت کے دوران مرکز ثقل تبدیل ہو جاتا ہے، یعنی ایتھنز سے لاشیئم۔ اسی طرح ہوانگ ہو سے (جو ہونان فو کے مقام پر تھا) ینگ تسے (آج کل اسے ہوپئی کا صوبہ کہتے ہیں) سائی کیانگ چینی عالموں کے نزدیک اتنا ہی فضول تھا، جتنا کہ سکندر اعظم کے جغرافیہ دانوں کے لیے ایلب تھا اور ہندوستان کے وجود کا اس عہد تک انھیں کوئی علم نہ تھا۔

جیسا کہ کرہ ارض کی دوسری طرف جولین کلاڈئین کے گھر کا اصول وجود میں آیا اور اسی طرح چین میں وانگ چینگ کا مضبوط جسم پیدا ہوا، جس نے ایک فیصلہ کن جدوجہد کی رہنمائی کی اور پوری شان و شوکت سے ۲۲۱ ق م میں طائی کا خطاب حاصل کر لیا۔ اس کے لفظی معانی وہی ہیں جو آگسٹس کے ہیں۔ اسی طرح سیزر اور ہوانگ طائی ہم معنی ہیں۔ اس نے پاکس سرویکا کے نام سے ایک اصلاحی تحریک چلائی، جیسا کہ ہم یورپ میں اصلاحات روم اور ان کے تمام یورپ میں اثرات سے آشنا ہیں۔ اسی دور میں چین میں عظیم دیوار کی تعمیر کا آغاز ہوا، جس میں چونا استعمال کیا گیا۔ یہی مشہور دیوار چین تھی، جس کی بدولت ۲۱۴ ق م میں چینیوں نے منگولیا کے ایک حصے پر قبضہ کر لیا۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے ینگ تسے کے جنوب میں مقیم وحشی قبائل کو کچل دیا۔ اس کے لیے اسے متعدد مہمیں چلانی اور سڑکیں بنانی پڑیں۔ بعد میں اس نے متعدد قلعے، ستون اور شاہراہیں تعمیر کر کے اپنی اس فتح پر مہر ثبت کر دی، مگر رومیوں نے بھی اسی طرح کا ایک خاندانی ڈرامہ رچایا۔ ایک تیستینن ڈرامہ جس میں لوئی طائی (جو وزیر محافظ خانہ اور بادشاہ کا سوتیلا باپ تھا) اورلی سزو جو اپنے عہد کا عظیم مدبر تھا (آج کا اگرپا جس نے کہ چینی رسم الخط کو مجتمع کیا) اپنا کردار ادا کیا اور نیرون کی ابتلا کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد دوہون نام کے خاندانوں نے عروج پایا (مغرب میں ۲۰۶ ق م تا

۲۳ ـ مشرق میں ۲۵ تا ۲۲۰ء) جن کے تحت ان کی سلطنت کی سرحدوں میں متواتر وسعت پیدا ہوئی' جبکہ دارالحکومت میں خواجہ سرا' وزراء اور جرنیل حکومتوں کو بناتے اور بگاڑتے رہے اور اپنی مرضی کے حکمران تخت نشین کرتے رہے۔ کبھی کبھی شاذ و نادر ایسے مواقع بھی آئے کہ وی طائی (۸۶ ـ ۱۴۰) کے دور میں اور منگ طائی (۶۷ ـ ۵۸) چین میں کنفیوشس اور ہندوستان میں بدھ اور کلاسیکی رواقی بحیرہ خزر کے علاقے میں اس قدر پھیلے کہ ممکن تھا کہ وہ ایک دوسرے کو چھو لیں۔

یہ عجیب و غریب حادثہ رونما ہوا کہ ہون قبائل نے چینی دیوار پر متواتر حملے کیے مگر ہر دفعہ ناکام رہے۔ مگر اس کے نتیجے میں چینیوں کو یہ احساس ہوا کہ انھیں ایک مضبوط شہنشاہ کی ضرورت ہے تاکہ وہ ان حملوں کو روک سکے۔ ہون قبائل کے خلاف فیصلہ کن جنگ ۱۱۹ ـ ۱۲۱ ق م کے دوران ہوئی۔ اس کا میر لشکر چینی تراجن ووطائی تھا اور یہ بھی اسی کا کارنامہ تھا کہ اس نے جنوبی چین کو سلطنت میں شامل کر لیا' اور اس طرح اسے ہندوستان میں جانے کا راستہ بھی معلوم ہو گیا اور اس نے تاریم تک ایک جنگی نوعیت کی شاہراہ تعمیر کر لی' اور اس طرح ہون قبائل نے مغرب کا رخ اختیار کر لیا اور کچھ مدت بعد وہ جرمن قبائل پر ٹڈی دل کی صورت میں ٹوٹ پڑے اور رومی سلطنت کے کچے قلعوں کو روندنے لگے۔ رومی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور تین میں سے صرف دو حکومتیں باقی رہ گئیں' جو ابھی تک قائم ہیں۔ گویا مختلف حکومتوں کا پسندیدہ خرابہ ہوں۔ آج سرخ بالوں والے وحشی کا دور ہے جو مغرب کا باشندہ ہے اور دنیا کی مہذب ترین برہمن آنکھ کے سامنے اور چینی عالمین کے روبرو' وہ کردار ادا کر رہے ہیں جو ماضی میں چنگیزیوں اور مانچو نے ادا کیا تھا۔ یہ نہ تو ان سے بہتر ہے اور نہ کسی طرح سے کم' بلکہ بالکل انھیں کے ہم پلہ ہے اور ممکن ہے کہ کچھ مدت بعد کوئی ایسا کردار بھی سامنے آ جائے' جو ان سے بھی بڑھ جائے۔ مگر رومیوں کے دور نو آبادیات میں مغربی ثقافت زیر زمین پختگی کی منازل طے کر رہی تھیں جبکہ مشرق میں عرب ثقافت اس سے قبل ہی پھول دے رہی تھی۔

عرب ثقافت ایک دریافت ہے۔ متاخر عرب مورخین کو اس کے اتحاد پر شک تھا مگر مغربی تاریخی تحقیق اسے ہمیشہ نظر انداز کرتی رہی۔ فی الحقیقت کوئی بھی ایسا نام نہیں' جس کی تحقیق کو تسلی بخش قرار دیا جائے۔ دنیا کی مروج زبانوں کی رعایت سے اس کے تخم ریز اور بہار کے موسموں کو آرامی اور بعد میں عربی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ مگر فی الحقیقت اس کے لیے کوئی موثر نام موجود نہیں۔ اس میدان میں مختلف ثقافتیں ایک دوسرے کے قریب تر تھیں اور مختلف تہذیبیں ایک دوسری پر منطبق ہوتی رہتی تھیں اور متاثر کرتی رہتی تھیں۔ عربوں کا قبل از تاریخ دور فارس اور اہل یہود کے عقب میں چلتا ہے اور مکمل طور پر قدیم بابل کے خطے ہی میں واقع ہے' مگر ان کی ثقافتی بہار کلاسیکی تہذیب کے زیر اثر تھی' جو اپنی پوری قوت سے مغرب کی طرف سے حملہ آور ہوئی اور بلوغت کی منزل طے کر گئی۔ یہی دور تھا جب ہندوستانی اور مصری تہذیبوں نے بھی اپنا وجود منوا لیا اور اس کے نتیجے میں عرب روح' زیادہ تر کلاسیکی بھیس میں مغرب کی ثقافت پر بہت زیادہ اثر انداز ہوئی۔ عرب ثقافت نے ہسپانیہ میں جہاں ابھی تک کلاسیکی تہذیب کے آثار موجود تھے اپنا رنگ

خوب جمایا۔ یہ عمل جنوبی ہسپانیہ اور سسلی میں مقابلتاً" زیادہ جوش و خروش سے ہوا اور اس طرح ایک نمونے کی حیثیت اختیار کر لی جس پر رومیوں نے اپنی تعلیم کی بنیاد استوار کی اس ثقافت کا مخصوص میدان خاصا وسیع ہے۔ اور متعدد حصص میں منقسم ہے۔ اگر کوئی شخص پالمیر پر کھڑا ہو جائے یا کٹیفی سن کو مرکز بنائے اور پھر اپنے چاروں طرف نظر دوڑائے۔ شمال میں اوسراسین ایڈیسیا' عرب بہار کا فلورنس نظر آئے گا۔ مغرب میں شام اور فلسطین عہد نامہ جدید کا گھر اور یہودی مشنا' اور سکندریہ اس کی بیرونی چوکی ہو گی۔ مشرق میں مازدائم' ایک طاقت ور تجدید حیات کا عمل ہوا یہ عہد حضرت عیسیٰ کی ولادت پر منطبق ہوتا ہے' جو یہود کے ہاں ہوئی' جس کے متعلق اوستا میں سرسری سا تذکرہ ہے کہ یہ واقعہ ظہور میں آیا۔ یہی وہ علاقہ تھا' جس میں تالمود اور مانی کا مذہب بھی وجود میں آئے۔ اس سے انتہائی جنوب کی طرف اسلام کے مستقبل کا صدر مقام تھا' جسے جانبازی کی روایات نے ساسانیوں کی طرح کے ایک مرکزی مقام کی حیثیت عطا کی۔ آج بھی اس خطے میں ایسے قلعے' کھنڈرات اور مضبوط پناہ گاہیں دکھائی دیتی ہیں' جن پر کوئی تحقیق نہیں کی گئی۔ جب کبھی ان علاقوں میں جنگیں لڑی گئیں تو وہ اکسوم کی عیسائی ریاستوں اور حمیری یہودیوں کے مابین لڑی گئیں جو بحیرہ احمر کے دونوں کناروں پر جنگ آزما رہے' جبکہ رومی اور فارس کی حکمت عملی ان میں ہیزم کشی کرتی رہی۔ نہایت شمال میں بازنطینی ریاست تھی۔ یہ ایک عجیب و غریب آبادی کا مرکب تھا' جس میں پژمردہ' مہذب' کلاسیکی' شبابی' جانباز جن کے اوصاف بازنطینی فوجی نظام کی تاریخ میں ظاہر ہوتے تھے۔ اسی دنیا میں بالآخر مگر کافی تاخیر سے اسلام کا ظہور ہوا' جس نے شعور اتحاد' اور بدیہی فاتحانہ کردار اور ترقی' عیسائیوں' یہودیوں اور فارسیوں کے ساتھ بے تاب یکساں وابستگی' اسلام ہی سے عرب تہذیب کا خمیر اٹھا۔ یہ تہذیب اپنے کمال پر تھی جب مغربی وحشی کچھ عرصے کے لیے یروشلم میں اچانک داخل ہو گئے۔ ہمیں اپنے آپ سے سوال کرنا چاہیے کہ یہ نامعقول دخل اندازی اس عہد کے مہذب ترین عربوں کو کیسی محسوس ہوئی ہو گی۔ غالباً" ایسے ہی جیسا کہ اشتمالیت۔ عرب دنیا کے آئین حکمرانی میں فرنگستان سے تعلقات ہمیشہ نچلی سطح ہی پر رہے۔ ہماری تیس سالہ جنگ دوران جو دنیا کی نظر میں مغرب کا ایک ڈرامہ تھا جب ایک انگریز سفارت کا نے یہ کوشش کی کہ ہینس برگ کے خاندان کو عثمانیوں کے حوالے کر دیا جائے' وہ مدبر جو مراکو سے لے کر ہندوستان تک کے معاملات کا سربراہ تھا' بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نظر میں معمولی معمولی حکومتوں اور ریاستوں کی کوئی اہمیت نہ تھی اور اس وقت بھی جب نپولین نے اپنی افواج مصر میں اتار دیں' اس وقت بھی بہت کم ایسے لوگ تھے' جنھیں مستقبل کے امکانات کا کچھ اندازہ تھا۔

اسی دوران میکسیکو میں ایک نئی ثقافت کا آغاز ہوا۔ یہ واقعہ دوسری دنیا سے اس قدر الگ تھلگ تھا کہ کسی نے اس کے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہا۔ البتہ اس امر پر سب حیران ہوئے کہ اس ثقافت کی کلاسیکی ثقافت کے ساتھ مشابہت کی کیا وجوہات تھیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آثار قدیمہ کا کوئی ماہر اگر ٹیوکالی کا مشاہدہ کرے تو وہ ڈورک کے مندروں سے مشابہت کی بنا پر حیران ہو جائے گا۔ اسے یہ بالکل کلاسیکی روایت نظر آئے گی۔ تیکنک میں بھی عزم لی القوت کی کمزوری' یہی وہ بیماری تھی جس نے ایتھنز کے باشندوں کو کمزور رکھا اور اس طرح ان کی تباہی کو دعوت دی۔

جیسا کہ اکثر ہوتا ہے۔ تخریب کاری اور تشدد کے نتیجے میں کسی ثقافت کی تباہی کی یہ ایک مثال ہے۔ یہ ثقافت قحط' دباؤ یا موسمی تغیرات بلکہ انھیں قتل کیا گیا۔ انتہائی بے رحمی سے انھیں سورج مکھی کے پھول کی طرح مسل دیا گیا۔ گویا پھول کا سر مروڑ دیا گیا ہو۔ یہ تمام حکومتیں' جن میں ایک عالمی طاقت اور متعدد وفاق شامل تھے' جن کے پاس ہنی بال کے رومیوں اور یونانیوں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ قوت تھی اور جنھوں نے ایک جامع حکمت عملی اور منصوبے کے تحت' اور محتاط مالی نظام کی تشکیل کر رکھا تھا اور جن کی مقننہ انتہائی ترقی یافتہ تھی' جن کے انتظامی تصورات اور مالی روایات کی وہ نوعیت تھی' جس کے متعلق چارلس پنجم کے وزرا کبھی سوچ بھی نہ سکتے تھے' جن کی ادبی دولت متعدد زبانوں میں تھی' ذہنی طور پر انتہائی چالاک اور اخلاقی طور پر نرم خو معاشرہ' جو ایسے بڑے بڑے شہروں میں رہتے تھے' جن کی مغربی دنیا ایک مثال بھی پیش نہ کر سکتی تھی' ایک تباہ کن جنگ میں نہ صرف تمام درہم برہم کر دیا گیا' مگر مٹھی بھر لٹیروں کے گروہ نے اسے تہس نہس کر دیا اور چند سالوں میں اس کا نام و نشان مٹا دیا اور اس طرح اس آبادی کے نہ صرف آثار کو مٹا دیا بلکہ ان کی یاد کو بھی فراموش کر دیا گیا۔ ٹینوک ٹیٹی لان کا عظیم الشان شہروں کا زمین پر ایک پتھر بھی باقی نہ رہا۔ عظیم مایان شہروں کا یاقوتن کے جنگلات میں معصوم جھنڈ جلد ہی سبزے تلے دب گیا اور اب تو ہم ان میں سے کسی قصبے کا پرانا نام بھی نہیں جانتے۔ ان کی ادبی باقیات میں تین کتب باقی رہ گئیں مگر انھیں کوئی پڑھ نہیں سکتا۔

اس ساری تباہی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ مغربی ثقافت کو اس جرم کے ارتکاب سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا اور نہ ہی اس کی کوئی ضرورت تھی۔ یہ مہم جو افراد کا ایک ذاتی معاملہ تھا اور اس دور میں جرمنی ' فرانس یا انگلستان میں کسی شخص کو اس کا کوئی علم نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ (اس کی کوئی اور مثال موجود نہیں) کہ تاریخ انسان کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ ان آبادیوں کی کیا اہمیت ہے اور نہ ان کو اس امر کا احساس ہے کہ مختلف ثقافتوں کے وجود سے عالم امکان کو کیا فوائد حاصل ہیں۔ ان کے نزدیک مختلف ثقافتوں کے باہمی روابط غیر اہم اور حادثاتی ہیں۔ اس واقعے میں یہ حادثے کا پہلو اتنا ظالمانہ اور بے ہودہ تھا کہ اسے کسی جنگلیوں کے مبالغہ آمیز ڈرامے میں بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اس ڈرامے کی تکمیل کے لیے چند توپوں اور دستی بندوقوں کا ہونا کافی تھا۔

کرہ ارض کی عمومی تاریخ کا علم اس دور میں تقریباً" ناممکن ہو گیا ہے۔ جیسا کہ صلیبی جنگوں اور تحریک اصلاح کلیسا کا اب کوئی نام و نشان باقی نہیں۔ صرف زمانہ حال ہی میں تحقیق نے خاکہ کشی کا اہتمام کیا ہے یا کم از کم آئندہ تحقیق کے لیے بنیاد قائم کر دی ہے اور ان اعداد و شمار کی بنیاد پر تقابلی صوریات کی مدد سے ہم دوسری ثقافتوں کے متعلق علم میں گہرائی پیدا کر سکیں گے۔ زمانے کے لحاظ سے یہ ثقافت عربوں کے مقابلے میں دو سو سال تاخیر سے شروع ہوئی اور مغربی تہذیب کے مقابلے میں سات سو سال بعد وجود میں آئی۔ اس سے پہلے قبل از ثقافت کا دور بھی تھا جو چین اور مصر کی طرح رسم الخط اور تقویم بھی ایجاد کر چکے تھے۔ مگر زمانہ حال میں ہم ان کے متعلق قطعاً" بے خبر ہیں۔ انھیں وقت کا شعور حضرت عیسیٰ کی ولادت

سے بہت پہلے ہو مگر اب یہ ناممکن ہے کہ میکسیکی انسان کی تاریخ کے متعلق کچھ کہا جا سکے۔

قدیم یونانی مایا ریاستوں کا موسم بہار ان ستونوں پر درج تاریخوں سے معلوم کیا جا سکتا ہے جو کوپان کے قدیم شہروں (جنوبی) ٹکال میں واقع ہیں اور کچھ بعد کی مدت سے چیچان اِ ترا (شمال)' نارنجو اور سنبال میں موجود ہیں۔ (تقریباً" ۴۵۰ - ۱۶۰)

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مغرب اس دور میں تھا جسے مایا سات سو سال قبل عبور کر چکے تھے۔ یہ تقریباً" اتنی مدت ہے کہ فریڈرک اعظم اس قدر قابل ہوتا کہ وہ مایا پان لیگ کی سیاست کو سمجھ سکتا۔ جبکہ از تک ۲۵۰۰ء میں مستقبل کے لیے جھوٹوں کے پلندے اکٹھے کر رہے تھے۔ مگر وہ امور جن کی بدولت فاؤستی انسان کو امتیاز حاصل ہوا اور اس دور میں بھی کوئی اور ثقافت اس کے مدمقابل نہ تھی' وہ فاصلے پر قابو پانے کی ناقابل شکست خواہش تھی۔ یہ اس کی آخری جدوجہد تھی۔ میکسیکو اور پیرو کی تباہی کے مناظر جن کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی' یقینی طور پر کار تصیح اور پرسی پولس میں بھی آئنی عوتی اسلوب کی مقبولیت کا آغاز ہو رہا تھا' اور اس علاقے میں بھی ہندوستانی گندھارا فن کے ذوق آشنا لوگ وجود میں آ گئے تھے۔ مستقبل میں تحقیق کے نتائج ممکن ہے کہ بعض چینی معماروں کی جرمن جنگلات میں موجودگی ثابت کر دے۔ مسجد کا اسلوب تعمیر ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے لے کر شمالی روس اور مغربی افریقہ تک اور ہسپانیہ تک مقبول رہا مگر مغرب کی توسیع پسند قوت کے سامنے اس مقبولیت کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس روح کی حقیقی تاریخ کے بیان کی فی الحال کوئی ضرورت نہیں۔ اسے صرف اس کی مادر وطن ہی میں تکمیل تک پہنچایا گیا۔ مگر نتائج کے لحاظ سے اس کی سرحدوں کا کوئی تعین نہیں۔ وہ مقام جہاں تک طنوج لیلان پہنچ گئے تھے' وہاں پر ہسپانوی معماروں نے ایک ایسا گرجا تعمیر کیا جس میں نقاشی اور صنعت گری کے نمونے نظر آتے ہیں۔ اسی دور میں پرتگالی ہندوستان میں پہنچ گئے اور ہسپانیہ اوراطالیہ کے معمار پولینڈ اور وسطی روس تک اپنے کمالات دکھانے لگے۔ انگریزی رکاکو اور بالخصوص سلطنت شمالی امریکا کی ریاستوں میں زراعت کے لیے پہنچ گئے اور وہاں ایسے گھر اور فرنیچر تیار کیے' جن کے متعلق جرمن والوں کو کماحقہ واقفیت نہیں۔ کیناڈا اور راس کے علاقوں میں کلاسیکت اپنا بھرپور مظاہرہ کر رہی تھی اور دور حاضر تک وہاں کسی قسم کی کوئی تحدید نہ تھی۔ ہیئت کے معاملے میں یہ آزادی ہر جگہ موجود تھی' اور اس طاقت ور تازہ دم تہذیب کے باقی دنیا سے تعلقات سابقہ نہج پر چلے جا رہے ہیں۔ کیا اس سے ہر معاملے پر پردہ ڈالا جا سکتا ہے؟ کیا سب یکساں ہیں؟ اب جبکہ مغربی یورپ اور امریکہ کے اسلوب حیات میں فرق کی تہ روز بروز موٹی ہوتی جا رہی ہے' کیا اس کے تحت مقامی قدیم صورت کا خاتمہ ہو جائے گا؟

۶

تاریخ انسان کی اس تاریخ کی رو سے' جو قدیم تصورات "قدیم' وسطانی اور جدید" کی جگہ لینے کے

لیے پیش کی گئی ہے' مگر وہ تصور ابھی تک بہترین اذہان میں بھی پوری طرح جاگزین ہے۔ اس کی بنا پر ایک نیا جواب دینا ممکن ہو گا (اور میں سوچتا ہوں کہ ہماری تہذیب کے لیے ایک حتمی جواب) اس سوال کا جواب کہ تاریخ کیا ہے؟

رینک (Ranke) اپنی کتاب "تاریخ عالم" کی تمہید میں کہتا ہے' تاریخ کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب آثار قدیمہ قابل فہم نہ رہیں اور قابل اعتماد تحریری مواد دستیاب ہو۔ یہ جواب اس شخص کے لیے ہے جسے اعداد و شمار کو جمع کر کے مرتب کرنے کا شوق ہو۔ یہ واضح ہے کہ بعض معاملات خلط ملط ہو جاتے ہیں کہ فلاں کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا اور ایک مخصوص وقت میں جبکہ ہر شے واضح تھی۔ تو ایک مخصوص طالب علم نے کیا محسوس کیا۔ مرڈونی اس کو پلاٹیا میں شکست ہوئی' اگر اس واقعے کو دو ہزار سال بعد تاریخ کی کتب سے خارج کر دیا جائے تو کیا اس کی تاریخی حیثیت برقرار نہیں رہے گی۔ حقیقت تو حقیقت ہی ہے' کیا اس کا تاریخ کی کتب میں اندراج ضروری ہے؟ ایڈورڈ میر

رینک کے بعد ایک اور معتبر ماہر تاریخ کہتا ہے' "تاریخی وہ امر ہے جو موثر ہو----- کسی خاص معاملے کو صرف تاریخی طریق کار ہی سے لامحدود تاریخی مواد سے منتخب کیا جاتا ہے اور اسے تاریخی واقعہ قرار دیا جاتا ہے۔" یہ رائے سرتا سر ہیگل کے خیالات کے مطابق ہے۔ اول اس کا نقطہ آغاز حقیقت ہے' اور حادثاتی علم یا حقیقت کے متعلق عدم ادراک نہیں۔ اگر کسی ایسی تاریخ کی تشکیل مطلوب ہو' جس کا نقطہ آغاز ہی یہ لزوم عائد کر دے' کہ صرف مصدقہ حقائق ہی اس میں شامل کیے جائیں' جن کی تدریج و ترتیب درجہ اول کی ہو' اس کے باوجود کہ ہم ایسا نہیں کر سکتے (اور کبھی بھی نہیں کر سکیں گے) کیونکہ سائنسی کسوٹی پر ان کا پورا اترنا ناممکن ہے۔ ہمیں تو نامعلوم واقعات کی تلاش اور ان کے جامع استعمال کے متعلق ادراک حاصل کرنا چاہیے۔ ثانیا" بعض صداقتیں دماغ میں موجود ہوتی ہیں' ایسے حقائق جو صرف زندگی سے متعلق ہوں۔ تاریخی لحاظ سے ان کی جانچ پڑتال----- میری اصطلاح میں قیاس و تعبیر----- کا فیصلہ صرف خون ہی کر سکتا ہے' جو انسان کو جانچنے کے لیے ماضی اور مستقبل کی وسعت سے سرفراز کر دیا گیا ہے۔ داخلی ارتعاش کے لیے بعض افراد کے لیے حالات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ کسی واقعے کے لیے' جس کا ہونا ناگزیر تھا' وہ ضرور وقوع پذیر ہو گا۔ اب اس کے لیے اعداد و شمار اور تفصیلات کی ضرورت نہیں۔ ہر سچے مورخ کے لیے سائنس اور تجربے کی کیفیت ایک اضافی اور زیریں امر ہے۔ یہ شعور بیدار کو مخاطب کرتا ہے اور اس کے لیے جو ذرائع استعمال میں لاتا ہے' ان میں تفہیم' محنت طلب تکرار ثبوت' جسے روشن لمحات میں فوری طور پر' قبل ازیں بھی تکوین کے روبرو پیش کیا جا چکا ہو۔

محض اس وجہ سے کہ ہماری داخلی فاؤستی تکوین کی قوت ہمارے لیے اس قدر منصوبہ بندی کر چکی ہے کہ ہماری داخلی تجرباتی زندگی کا ایک دائرہ وجود میں آ چکا ہے' جو کسی اور ثقافت کے باشندوں کو نصیب نہیں ہوا اور محض اس لیے کہ دنیا کے دور دراز علاقوں میں ہونے والے واقعات ہمارے لیے بہت زیادہ

اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اور ہمارے لیے ایسے روابط کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں کہ کسی اور ہمعصر ہمسائے کو بھی ان کا تصور نہیں ہوتا۔ ان واقعات کا بہت سا حصہ اب تاریخ کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ (زندگی ہمارے جادہ حیات کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔) صدیوں قبل ان امور کو تاریخ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ تے سی ٹس کو غالبا" اس کا علم تھا کہ طبریوس گر یچس کے انقلاب کے تفصیلی واقعات کیا تھے۔ مگر اس کے لیے ان واقعات یا تفصیلات کی کوئی اہمیت نہ تھی جبکہ ہمارے لیے یہ معانی و مطالب سے بھرپور ہے۔ ایک بدعتی عیسائی فرقے کی تاریخ اور ان کا حضرت محمد ﷺ سے رشتہ اور معاشرتی ماحول کی یکسانیت مسلمانوں کے لیے کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں' لیکن ہمارے لیے اس کی اس لیے اہمیت ہے کہ اس میں انگریز کٹر عیسائیت کی جھلک کسی اور ماحول میں نظر آتی ہے۔ تہذیب کے متعلق عالمی نظریہ جس نے تمام کرہ ارض کو ایک اسٹیج بنا دیا ہے تو آخرکار اس میں بھی کوئی غیر تاریخی عنصر نظر نہیں آئے گا۔ انیسویں صدی میں تاریخ کی مقبول تقسیم بطور قدیم وسطانی اور جدید محض تاریخی انتخاب تک محدود تھی' جس میں تعلقات اہم کردار ادا کرتے تھے۔ لیکن وہ اثرات جو قدیم چینی اور میکسیکی بھی ہم پر وہ اثرات ڈال رہے ہیں' جو بہت لطیف اور غور و فکر کے محتاج ہیں' ان میں فی نفسہ زندگی کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ ہم ایک مختلف جادہ حیات سے بھی اپنی ذات کا عرفان کر سکتے ہیں کہ ہم کیا ہیں' ہمیں کیا ہونا چاہیے اور مستقبل میں ہم کیا ہوں گے؟ ہمارے مستقبل کے لیے یہ ایک عظیم درس گاہ ہے۔ ہم جو ایک تاریخ کے مالک ہیں' اور نئی تاریخ بنا رہے ہیں' ہم انسان کی تاریخی سرحدوں پر استادہ ہیں تاکہ دنیا کو یہ بتا سکیں کہ تاریخ کیا ہے؟

سوڈان کے دو حبشی قبائل کے مابین جنگ یا چیروسکی اور ہیٹسی کا مجادلہ جو سیزر کے عہد میں پیش آیا' بنیادی طور پر ایک ہی نوعیت کے ہیں۔ چیونٹیوں کے قبائل کے مابین مناقشہ فطرت حیات کا ایک تماشا ہے۔ مگر جب چیروسکی رومیوں کو شکست دے دیں جیسا کہ تانویں سال میں ہوا یا ازتکی' تیازکلان کو ہرا دیں تو یہ ایک تاریخ کا باب بن جاتا ہے۔ اس صورت میں مدت کا تعین اہم صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ہر دس سال کا عرصہ یا ایک سال بھی' بہت اہم ہے۔ کیونکہ یہاں آپ کو زندگی کے طویل سفر کا معاملہ درپیش ہے' جس میں کہ ہر درجہ ایک نئے دور کا آغاز ثابت ہوتا ہے۔ یہاں ایک مقصد کا معاملہ ہے' جس پر ہر واقعہ اثر انداز ہوتا ہے۔ ایک تکوین جو پہلے سے طے شدہ انجام کی طرف رواں دواں ہے۔ ایک رفتار' ایک نامیاتی عرصہ۔ یہ سیمی قبائل کی نشیب و فراز کا معاملہ نہیں' یا گال اور کریز کا' جس میں ہر تفصیل اتنی ہی غیر ضروری ہے جتنی کہ اودیلاؤ کی بستی یا غزالوں کا میدان یا چیونٹیوں کی مختلف نسلیں۔ قدیم انسان کی تاریخ کا مفہوم محض حیاتیاتی ہے اور قبل از تاریخ کا مطالعہ اور تحقیق اسی مفہوم کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ انسان کی آگ سے بڑھتی ہوئی بے تکلفی' سنگی اوزار' اور میکانی قواعد جو اسلحہ کو موثر بناتے ہیں۔ صرف بعض اقسام کے کردار کی نشاندہی کرتے ہیں اور آخری امکانات کی نوعیت کی ترقی کا باعث ہوتے ہیں۔ وہ مقاصد تاریخی لحاظ سے اتنے اہم نہیں ہوتے جن کی غرض سے ایک قبیلہ دوسرے کے خلاف اسلحہ استعمال کرتا ہے مگر پتھر کا زمانہ اور باروق کا عہد دو مختلف زمانوں کی نشاندہی کرتے ہیں' اور ان کی ثقافت کے الگ الگ وجود کو ثابت کرتے ہیں۔ یعنی دو نامیاتی وجود جن کا تعلق دو مختلف اسالیب حیات سے تھا۔ میں یہاں ان دو مفروضوں کے

خلاف احتجاج کروں گا جو مدت سے ہماری تاریخی فکر پر حاوی ہیں یہ تو کہا جاتا ہے کہ بنی نوع انسان کا بنیادی مقصد ایک ہی ہے' مگر اس کے ساتھ ہی کسی بنیادی مقصد کے وجود ہی سے انکار کر دیا جاتا ہے۔ حیات کا ایک مقصد ہے اور وہی مقصد اس کے تصورات میں سرایت ہے۔ مگر ہر فرد ایک طرف تو ولادت کے لحاظ سے کسی اعلیٰ ثقافت سے تعلق رکھتا ہے اور دوسری طرف بنی نوع انسان کی کسی جماعت یا نوعیت سے بھی اس کا تعلق ہے۔ اس کے علاوہ اس کی کوئی تیسری حیثیت نہیں ہوتی۔ اس کا انجام یا حیاتیات کے حوالے سے ہو گا یا عالمی تاریخ کے میدان میں۔ تاریخی انسان کو جیسا کہ میں سمجھتا ہوں' اور اس لفظ کو جس صورت میں تمام تاریخ دانوں نے استعمال کیا ہے' انسان بنیادی طور پر ایک مخصوص ثقافت سے متعلق جو اسے اپنے ساتھ لے کر مخصوص طے شدہ مقصد کی طرف رواں دواں ہے' اس سے قبل' اس کے باہر اور اس کے بعد انسان کی کوئی تاریخ باقی نہیں رہتی اور متعلقہ آبادی کے انجام کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ جس طرح کہ کرہ ارض کے انجام کی اس حالت میں کوئی اہمیت نہیں ہو گی جب میدان توجہ ارضیات کی بجائے فلکیات ہو۔

اس پس منظر میں یہ فیصلہ کن اہمیت کی حقیقت سامنے آتی ہے جسے اس سے قبل اسے تسلیم نہیں کیا گیا کہ ثقافت کے وجود کے انسان کی کوئی تاریخ نہیں ہوتی۔ وہ انسان نہ صرف تاریخ سے محروم ہوتا ہے جو ثقافت کے بغیر ہے' بلکہ جب ثقافت تاریخ میں تبدیل ہو جائے اور تہذیب اپنے وجود کی پوری طرح سے تکمیل کر لے' اور دوسری طرف ثقافت کا اختتام ہو جائے اور اس کے وجود کے تمام نمایاں امکانات تو تاریخ کا وجود بھی ختم ہو جائے گا۔ سیتی اول کے بعد مصری ثقافت کا بھی ۱۳۰۰ء میں یہی حشر ہوا۔ چینی' ہندوستانی' عربی بھی مذہب کی تمام دانائیوں کے باوجود اور فلسفیانہ رعنائیوں کے ہوتے ہوئے بھی بالخصوص وہ سیاسی ملبوس جس میں یہ پنہاں تھے' یہ اسی نشیب و فراز کا شکار ہو گئے جو انسان کی ابتدائی حیات میں نمایاں تھا۔ اس امر کے قطع نظر کہ بابل میں بیٹھے ہوئے آقا کسائیوں کی طرح جنگ جو تھے' یا فارس والوں کی طرح نرم خو تھے' اور کتنے عرصے تک اور کتنی کامیابی سے انھوں نے اپنا تخت قائم رکھا' بابلیوں کے نقطہ نظر سے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ ان حالات کی تبدیلی سے آبادی کے آرام و آسائش پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فطری طور پر دونوں صورتوں میں آبادی متاثر نہ ہوتی کیونکہ اس کی روح ہی مردہ ہو چکی تھی' اور ایسے واقعات نے اس کا احساس ہی ختم کر دیا تھا اس لیے ان کے لیے کوئی تبدیلی بھی گہرے معانی کی حامل نہ تھی ایک نیا خاندان خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی مصر کی آبادی کے لیے غیر اہم تھا۔ اسی طرح چین میں کوئی نیا فاتح یا جدید انقلاب یا رومیوں کی سلطنت کے علاقے میں جرمنوں کی کوئی نئی نسل' تاریخ کے وسیع میدان میں صرف اسی قدر حیثیت کے مالک تھے' جس طرح جھاڑ جھنکار یا پرندوں کی ایک نئی ٹولی جو نقل مکانی کر رہی ہو۔

تاریخ میں اور حقیقی تاریخ میں جو بلند پایہ بنی نوع انسان میں بھی وجہ جنگ دائمی غلبے کی حیوانی جدوجہد ہے' جو ہمیشہ قائم رہے گی اور ایسی حالت میں جبکہ سوار اور سواری دونوں اس امر سے بے خبر ہوں' کہ ان کے اعمال کی علامتی قوت کیا ہے۔ اس کا مقصد کیا اور نتائج کیا ہوں گے۔ کسی شے کی حقیقت جو بنیادی طور پر روحانی ہو' اس کے تصور کو زندہ تاریخی صورت میں تبدیل کرتا ہے۔ یہ اصول فن کی دنیا میں اسلوب کے

رجحان کے لیے جدوجہد پر بھی منطبق ہوتا ہے (خواہ وہ رومی ہو یا نشاۃ ثانیہ سے متعلق) فلسفے پر بھی (خواہ وہ رواقی ہو یا لذت کوش) اور سیاسی تصورات پر بھی (عدیدیہ ہو یا جابرانہ) اور معاشی نظاموں سے متعلق بھی (سرمایہ داری ہو یا اشتمالیت) مگر ان سے متعلق بعد از تاریخ کسی شے کا کوئی وجود نہیں ہوتا' باقی جو کچھ بچتا ہے وہ صرف اقتدار کی جدوجہد ہے۔ جیسا کہ حیوانات کے مابین باہمی جنگ جاری رہتی ہے' جبکہ ماضی میں اقتدار' خواہ اس میں کسی نوعیت کا جوش و خروش موجود نہ ہو' کسی نہ کسی تصور کے لیے ہوتا تھا' مگر کسی تہذیب کے آخری ایام میں خواہ تصورات کے کتنے التماسات بھی موجود ہوں' اصل تصور تو وہی حیوانی وحشیانہ کشمکش ہے۔

بدھ سے قبل اور بعد کے ہندوستانی فلسفے میں امتیاز یہ ہے کہ اول الذکر ہندوستانی فکر کے حصول اور اس کے مقاصد کی روح کی تکمیل کی کامیابی کی جدوجہد کے لیے ایک عظیم تحریک تھی جبکہ ثانی الذکر ناتراشیدہ ہیرے کے سوداگر کی طرح فکر کے نامکمل ذخیرے کے مختلف انداز بے نقاب کر رہی تھی۔ اس میں مسائل کے جو حل تجویز کیے گئے ہیں' وہ دائمی ہیں' اگرچہ ان کے اظہار کے اسلوب وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ یہی اصول چینی نقاشی پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ مشہور شاہی خاندانوں سے قبل اور بعد کی نقاشی کے اسلوب بدل جاتے ہیں۔ اس تبدیلی کا ہمیں علم ہو یا نہ ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور جدید سلطنت کے آغاز سے قبل اور زوال کے بعد مصری فن تعمیر کی صورت بھی یہی ہے۔ طریق کار میں بھی یہی فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ مغرب نے بھاپ کا انجن اور بجلی ایجاد کی۔ اب چینی بھی ان اشیا کو اسی انداز میں استعمال کرتے ہیں اور ان ایجادات پر ان کے مذہبی رہنماؤں نے اسی ردعمل کا اظہار کیا' جو مغرب میں ہوا تھا۔ کانسی اور ہل چار ہزار سال قبل انسان کے استعمال میں آئے' آگ اس سے قبل استعمال میں لائی جا چکی تھی۔ دونوں روحانی نظام ان ایجادات کے متعلق کلی طور پر اختلاف کا شکار ہیں۔ مگر دونوں اپنی اپنی داخلی تاریخ میں ان ایجادات کو نئے دور کا آغاز قرار دیتے ہیں۔ کسی نئی دریافت سے قبل اور بعد صدیوں کا عرصہ بیت جاتا ہے تب جا کر جدید دریافتوں اور ایجادوں کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ بعض اوقات کسی ثقافت میں کسی نئی دریافت یا ایجاد کے آثار' ایک دہائی یا ایک ہی برس میں تبدیلیاں پیدا کر دیتے ہیں۔ کیونکہ دورانیہ کے اوقات بھی آہستہ آہستہ حیاتیاتی ترتیب کی طرف مراجعت کر رہے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ بعض حالتوں میں خودبخود ایسی شرائط عائد ہو جاتی ہیں جنھیں متعلقہ آبادی ایک بدیہی امر سمجھتی ہے اور محسوس نہیں کرتی۔ غیر تغیر پذیر دھوم دھام یا طمطراق کے کردار کا مظاہرہ صرف حقیقی ثقافت کی آبادیوں میں ہی ہوتا ہے۔ یعنی مصر میں ہیرو ڈوٹس' اور چین میں مارکو پولو کے مغربی جانشین تھے جنھوں نے ان تبدیلیوں کو حیرت اور ترقی کی حیثیت سے محسوس کیا۔ اس عدم تبدل کا تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔

کیا کلاسیکی تاریخ کا ا یکٹیئم اور پاکس روما نال کے خاتمے کے ساتھ ہی اختتام نہیں ہوا؟ اب اس نوعیت کے مزید عظیم فیصلے نہیں ہوں گے جو کسی ثقافت کے داخلی معانی پر مرکوز ہوں۔ ایک نامعقول حیاتیات کے غلبے کا آغاز ہو چکا ہے اور یہ کائنات کی طرف غفلت اور عدم توجہ کا مسئلہ ہے۔ اگرچہ افراد کے ذاتی

اعمال پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا کہ کوئی عظیم سانحہ یا واقعہ کوئی بھی رخ اختیار کر لے۔ تمام بڑے سیاسی مسائل حل کر لیے جاتے ہیں۔ ہر تہذیب جلد یا بدیر اپنے حالات کے مطابق ان کا حل تلاش کر لیتی ہے۔ جس کے نتیجے میں ان مسائل کا کوئی وجود باقی نہیں رہتا اور ان کے متعلق کبھی بھی کسی کی طرف سے دریافت نہیں کیا جاتا' کہ ان کی نوعیت کیا تھی؟ اور ان کا انجام کیا ہوا؟ تھوڑی سی مدت گزر جائے تو انسان کے لیے یہ سمجھنا ناممکن ہو جاتا ہے کہ ماضی میں مصائب کا سبب کیا تھا۔ جو کچھ خود کسی شخص کو ذاتی طور پر تجربے میں نہ آئے' اسے وہ دوسروں کے حوالے سے سمجھ نہیں سکتا۔ جب مصری متاخرین ہا کسوس کے دور کا ذکر کریں' یا متاخر چینی دعویدار ریاستوں کے دور کا ذکر کریں۔ تو وہ ان واقعات کو بھی اپنے موجودہ حالات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں' جن میں جدید مسائل کی نوعیت مختلف ہے' یا ویسے مسائل کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔ وہ ان مسائل میں صرف جنگ اقتدار کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ انھیں ان جان پر کھیل جانے والی جنگوں کا کوئی تجربہ نہیں' جو داخلی اور خارجی دونوں صورتوں میں بعض اوقات ایک ہی جماعت' قوم یا قبیلے کے مابین چھڑ جاتی تھیں' کیونکہ وجہ نزاع کوئی تصور ہوتا۔ موجودہ حالات میں ہم ان واقعات ہی کو سمجھ سکتے ہیں' جو ہمارے سامنے رونما ہوتے ہیں۔ خوفناک ہیجان میں تبدیلی' اور اس کا اخراج' جس کی وجہ طبریوس گر یچس اور کلاڈیس کا قتل تھا۔ ۱۷۰۰ء میں ہم ایسا نہ کر سکتے اور ۲۲۰۰ء میں ہم دوبارہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ چین کو بھی ایسے ہی حالات درپیش ہیں۔ کوئی نپولین کے نمونے کا شخص' جس میں متاخر مصری کوئی خوبی تلاش نہ کر سکے وہ بھی ہا کسوس بادشاہوں سے مختلف نہ تھا۔ اگر جرمن درمیان میں نہ آ جاتے تو رومی مورخین ایک ہزار سال بعد گر یچی' ماری اس سلا' اور سسرو کو ایک ہی خاندان کے افراد تسلیم کر لیتے اور سمجھ لیتے کہ انھیں سیزر نے معزول کیا تھا۔

طبری اس گر یکچو اور نیرو کی موت کا موازنہ کریں۔ جب روم میں گالبا کی بغاوت کی خبر موصول ہوئی' یا سلا کی ماریان کی جماعت پر فتح کی خبر پہنچی اور اس کے ساتھ ہی اس ناٹجر پر سیپ ٹی می اس سرورس کی خبر بھی موصول ہوئی۔ اگر آخر الذکر معاملات میں نتیجہ اس کے برعکس ہوتا' تو کیا غیر جانبدارانہ طریق کار اس دور کے متعلق قائم رہتا یا تبدیل ہو جاتا؟ موم سن اور ایڈورڈ میرنے جو ان معاملات میں محتاط امتیاز قائم کیا ہے اور پومپئی کی ریاست اور آگسٹس اور سیزر کی شہنشاہیت کے بیان میں غیر جانبداری کا تصور بالکل ختم ہو گیا ہے۔ اس سطح پر نقطہ زیر غور صرف تسلسل سے متعلق ہے۔ اگرچہ پچاس سال کے طویل عرصے نے تصورات میں اختلاف کی نشاندہی کر دی ہے' جب وِنڈیکس اور گاما ۶۸ء میں جمہوریت کے دوبارہ قیام کے لیے آمادہ ہو گئے تو وہ محض ایک تصور پر جوا کھیل رہے تھے' جبکہ اس عہد میں تصورات کی علامتی قوت کا وجود ختم ہو چکا تھا۔ سیزر کے خطاب کے لیے جدوجہد میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ممکن تھا کہ یہ عمل صدیوں تک جاری رہتا اور یہ ابتدائی ہونے کی وجہ سے دائمی صورت اختیار کر لیتا۔

ان آبادیوں میں روح کا وجود ختم ہو چکا تھا' اس لیے ان کے پاس کوئی ایسی تاریخ بھی نہ تھی' جو ان سے مخصوص ہو۔ زیادہ سے زیادہ وہ کسی اجنبی ثقافت کی تاریخ میں کوئی اہمیت حاصل کر لیتے۔ یہ رشتہ جس

قدر بھی گہرے معانی پیدا کر سکتا' وہ کسی اجنبی حیات کے عزم ہی سے حاصل کیا جاتا۔ کوئی موثر تاریخی واقعہ جو کسی قدیم تہذیب کی سرزمین پر وجود حاصل نہ کر سکے اور اپنے وجود کو کسی اور طریق واقعات سے حاصل کرے' اور اس کی اپنی سرزمین کے باشندوں کے ادا کردہ حصے سے کوئی استفادہ نہ کرے' لہٰذا ہمیں مزید ایک بار عالمی تاریخ کے تناظر کو دو مختلف پہلوؤں کے تحت جانچنا پڑے گا۔ "عظیم ثقافتوں کا جادہ حیات" اور "ان کے مابین روابط" یعنی متعلقہ عظیم ثقافتوں کے باہمی مراسم زیر غور لانے ہوں گے۔

باب سوم

ابتدا اور فطری مناظر

ج ۔ ثقافتوں کے مابین روابط

(ا)

اگرچہ منطقی طور پر خود ثقافتوں کو ان کے مابین تعلقات سے قبل زیر بحث لانا چاہیے، مگر جدید تاریخی فکر بالعموم اس ترتیب کو الٹ دیتی ہے۔ اسے جادہ ہائے حیات کا علم جس قدر کم ہو گا، جو سب مل کر عالمی واقعات کے ظاہری اتحاد کو تشکیل کرتے ہیں، اسی قدر جوش و خروش سے یہ حیات کو روابط کے جالے میں تلاش کرے گا اور اس طریق عمل کے نتیجے میں اس کا ادراک مزید کم ہو گا۔ اس مواد کی تحقیق و تفتیش، استرداد، انتخاب، ان کی قدر و قیمت مقرر کرنا، غلطیوں کی نشاندہی کرنا، اسرار سربستہ کو کھولنا اور مناسب مواد کو قبول کرنا، یہ عمل نہ صرف ان ثقافتوں تک محدود رہتا ہے، فی الحقیقت جن کی سرحدیں آپس میں ملتی ہیں، بلکہ وہ بھی ایک دوسری سے علیحدہ دور فاصلوں پر واقع ہوں، ایک دوسری سے جنگ آزما ہوں۔ مگر ان کا تعلق زندہ ثقافتوں سے ہو یا وہ تباہ شدہ ثقافتیں جن کے کھنڈرات اور آثار ابھی تک قائم ہوں، اور سطح زمین پر مشاہدہ کیے جا سکتے ہوں، مگر مورخین کے وہ تصورات جو وہ "تاثرات" "تسلسل" اور "مستقل اثرات" کی اصطلاحات اور عنوانات کے تحت قائم کرتے ہیں انتہائی محدود معانی کے حامل ہیں۔

یہ تصورات خالصتاً" انیسویں صدی کی پیداوار ہیں، جو کہ وہ معلوم کرنا چاہتے ہیں وہ ماسوائے سلسلہ علت و معلول اور کچھ نہیں۔ ہر شے ایک دوسرے کے عقب میں چلتی ہے مگر کوئی بھی منفرد نہیں۔ چونکہ ہر ثقافت میں کسی نہ کسی قدیم ثقافت کے کچھ عناصر موجود ہوتے ہیں جن کا سطحی اظہار ہوتا رہتا ہے۔ ان عناصر

کو تسلسل کا نام دے لیا جاتا ہے۔ جب ان اثرات کو باہم مربوط کیا جاتا ہے تو مورخ کو اس پر اطمینان ہو جاتا ہے کہ اس نے ایک تسلی بخش کارنامہ انجام دے لیا ہے۔

اس کی تہ میں وہ تصور پنہاں ہے جو عظیم رومیوں کو عرصہ دراز قبل اس عمل پر آمادہ کرتا رہا، کہ کسی انسانی گروہ کی تاریخ میں سے کوئی واحد نمایاں خصوصیت منتخب کر لی جائے۔ انھوں نے دیکھا کہ کرہ ارض پر افراد اور اقوام کس طرح تغیر و تبدل کا شکار رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے تصورات قائم رہے ہیں۔ اس کے باوجود طاقت ور تاثریت ہیئت نے آج تک اپنے آپ کو محفوظ رکھا ہے۔ آغاز میں تو یہ ایک منصوبہ معلوم ہوتا تھا کہ خدا ایک منصوبے کی طرح بنی نوع انسان کو بطور اوزار استعمال کر رہا ہے اور یہ تصور آج بھی قابل قبول ہے، اگرچہ اب یہ پرانا ہو چکا ہے۔ جب تک کہ قدیم، وسطائی اور جدید کے ادوار کی تقسیم کا جادو قائم رہے گا یہ منصوبہ بھی زندہ رہے گا اور ہمارے دماغوں پر اپنے اثرات جاری رکھے گا اور ہم حقیقت میں مسلسل تبدیلیوں کے شعور سے مستقل طور پر محروم رہیں گے۔ مگر اس دوران ہمارے نقطہ نظر میں بھی وسعت اور ٹھہراؤ پیدا ہو چکا ہے۔ ہمارا علم اس گوشوارے (قدیم، وسطائی اور جدید) کے حدود سے مدتوں پہلے آگے نکل چکا ہے اور جو ابھی تک اسی سے چمٹے ہوئے ہیں، وہ اپنی توانائی کا بے مقصد خرچ کر رہے ہیں۔ مصنوعات اثر انداز نہیں ہوتیں، بلکہ صانع تاثر پیدا کرتا ہے۔ تکوین اور تکوین بیدار کو گڈ مڈ کر دیا گیا ہے۔ شعور بیدار اگر سادہ بھی ہو مگر ناقد ہو تو وہ ہر طرف دیکھتا اور محسوس کرتا ہے کہ نظریاتی وحدتیں حرکت سے متاثر ہوتی ہیں۔ یہ تصور خالصتاً" متحرک اور فاؤسٹی ہے کیونکہ کسی اور ثقافت میں بنی نوع انسان نے تاریخ کو اس نہج پر محسوس نہیں کیا۔ یونانی اپنی مادی عالمی تفہیم کے مطابق اس سادہ اظہار کی اتھنی ڈرامے یا مصری فن کبھی نشاندہی نہ کر سکتے۔

آغاز میں صرف اسی قدر ہوتا ہے کہ کسی نظام اظہار کو کوئی نام دے دیا جاتا ہے جس میں ہمارے ذہن میں بعض مخصوص روابط کی ترکیب وجود میں آ جاتی ہے۔ مگر یہ تادیر قائم نہیں رہتی اور جلد ہی کسی تکوین کے جعلی نام سے موسوم ہو جاتی ہے اور اس واسطے سے تاثر قبول کر لیتی ہے۔ آج کل جب ہم یونانی فلسفے کا ذکر کرتے ہیں، یا بدھ مت یا متکلمین کی پیروی کی بات کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں ایسی شے ہوتی ہے جس کا زندہ وجود قائم ہے۔ قوت کی ایک ایسی وحدت جو وجود میں آ چکی ہے اور اس وقت تک نشوونما پاتی رہے گی، جب تک کہ انسان کو اپنے بس میں کر لے۔ ان کے شعور بیدار پر قبضہ کر لے۔ بلکہ ان کی تکوین کو بھی زیر نگیں کر لے اور بالآخر انھیں اپنے ساتھ متفق کر لے۔ اس عمل سے اس کی اپنی حیات کی سمت میں طوالت آ جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اساطیری ہے اور اہمیت کے لحاظ سے، یہ صرف مغربی ثقافت کے لوگ ہیں، جو اس صورت حال سے متفق ہیں اور یوں یہ ساری تصویر ہی مغربی انداز اختیار کر لیتی ہے، جس کی اساطیر میں متعدد قسم کی دیویاں----- مثلاً برقی قوت اور منفی توانائی شامل ہیں۔

درحقیقت یہ نظام صرف انسانی شعور بیدار ہی میں وجود پاتے ہیں۔ مذہب، سائنس، فن، ادب، شعور

بیدار ہی کی فعالیتیں ہیں۔ ایمان' تفکر' تخلیق اور غیر مرئی کے متعلق جتنی بھی مرئی فعالیتیں درکار ہیں۔ مثلاً قربانی' عبادت اور طبیعی تجربات' پیکر تراشی' کسی تجربے کا ابلاغی الفاظ میں بیان' یہ تمام فعالیتیں شعور بیدار کے علاوہ مزید کچھ بھی نہیں۔ باقی لوگ صرف مرئی اشیا ہی کا مشاہدہ کرتے ہیں' جبکہ وہ اس تجربے کی کوئی نشاندہی نہیں کرتے جن میں سے کہ ان اشیا کا صانع گزرا تھا۔ ہم ایک ہیئت کو دیکھتے ہیں' مگر ہم یہ نہیں جانتے کہ یہی ہیئت کسی دوسرے کی روح پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ ہم کسی معاملہ پر یقین کر سکتے ہیں' اور اسے اپنی روح کے شعور میں شامل کر سکتے ہیں۔ کوئی مذہب اپنے آپ کو کتنا بھی یقینی اور نمایاں انداز میں اظہار کرے' مگر الفاظ پھر بھی الفاظ ہی ہیں۔ سامع ان میں اپنا مفہوم شامل کر لیتا ہے۔ ایک فنکار کے سر یا رنگ کتنے بھی متاثر کن ہوں' ناظران کو اپنی دانست کے مطابق سنتا ہے یا مشاہدہ کرتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو یہ سارا عمل اس کے لیے بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ (اس سلسلے میں بعض مورخین کا جدید اور ترقی یافتہ شعور' جس کے تحت وہ دوسروں کی شخصیت' کردار اور حیثیت کو اپنے اوپر طاری کر کے انھیں سمجھنے کا ملکہ حاصل کرتے ہیں' اس بحث میں شامل نہیں کرنا چاہیے)۔ جرمن قوم کو جس مبلغ بونی فیس نے عیسائیت میں داخل کیا' اس نے اپنے آپ کو مبلغین کی روح میں تبدیل نہیں کیا تھا یہ تو موسم بہار کی ایک لہر تھی' جو سارے شمالی یورپ کے عالم شباب میں رس بس گئی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر شخص کو تبدیلی مذہب نے ایک زبان عطا کر دی' جس کے ذریعے وہ اپنے مذہبی ذوق کا اظہار کرنے لگا۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ ایک بچے کی اس وقت آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں' جب ہم اسے اس کے نام اور فوری مقصد سے اسے آگاہ کرتے ہیں۔

یہ عاد صغریٰ کی وحدتیں نہیں جو حرکت کرتی ہیں' بلکہ یہ کائناتی وجود ہیں' جو اپنے میں سے بعض مناسب وحدتوں کا انتخاب کر لیتے ہیں۔ اگر اس کے برعکس ہوتا تو کیا یہی نظام بطور تکوین اس فریضے کو بجا لا سکتے (کیونکہ ان اثرات کی صورت نامیاتی فعالیت کی ہے) تو ایسی صورت میں تاریخ کی تصویر موجودہ صورت سے بالکل مختلف ہوتی۔ ذرا اس امر پر غور کریں کہ ہر زندہ ثقافت کا ایک بلوغت پذیر انسان کس قدر متعدد امکانی اثرات میں سے گزرتا ہے۔ ان تمام میں سے صرف محدودے چند افراد اس حیثیت میں قبول کیے جاتے ہیں جبکہ اکثریت کو مسترد کر دیا جاتا ہے۔ کیا انتخاب کی بنیاد کام ہے یا متعلقہ فرد؟

وہ مورخ جس نے سلسلہ علت و معلول کو قائم کرنے کا ارادہ کر لیا ہو' وہ نہ صرف حال کے معاملات پر اثر انداز ہو گا بلکہ ان پر بھی جو یوم حساب کی دوسری طرف ہیں----- وہ جن کا کوئی وجود ہی نہیں----- اس کے دائرہ کار میں نہیں آتے۔ اثباتی اثرات کی نفسیات کے تحت منفی اثرات بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا پہلو ہے جس پر ابھی تک کوئی تحقیق نہیں ہوئی۔ اگر اس عمل میں کوئی فائدہ ہو' تو اسے ضرور بجا لانا چاہیے' تاوقتیکہ اس تمام مسئلے کا جواب غیر متعین رکھنے کا ارادہ ہو۔ کیونکہ اگر ہم اسے نظر انداز کر دیں گے تو ہم ایک ایسی عالمی تاریخ کو قبول کر لیں گے' جو ملتبس تصورات پیش کرے گی اور اسے بطور مسلسل طریق کار کے طور پر تسلیم کر لیں گے' جس میں کہ ہر شے کا باقاعدہ شمار ہوتا ہے۔ کسی

آبادی کے افراد کو دو مختلف ثقافتوں سے سابقہ پڑ سکتا ہے اور کسی ثقافت کے افراد کا واسطہ کسی دوسری ثقافت کے مردوں سے بھی پڑ سکتا ہے جو بطور آثار قدیمہ اسے دستیاب ہوں۔ ان دونوں معاملات میں نمائندگی تو بنی نوع انسان ہی کی ہے۔ "ا" کا ایک اختتام شدہ عمل "ب" کی اپنی ذات کی روشنی ہی میں حل کیا جا سکتا ہے اور نتیجتاً" مذکورہ عمل "ب" کا داخلی سرمایہ قرار پائے گا' اسی کا عمل سمجھا جائے گا اور اس طرح اسی کی زندگی کا حصہ ہو گا۔ بدھ مت کی ہندوستان سے چین میں کوئی آبادی منتقل نہیں ہوئی' بلکہ چینیوں نے بدھ مت کے بعض اصولوں کو روحانی رجحان کے تحت قبول کر لیا' جس کی وجہ سے مذہبی اظہار کا ایک نیا رواج وجود میں آیا جو چینیوں کے لیے قابل قبول تھا اور صرف بدھ مت کے پیروکار چینیوں کو ہی پسند آیا۔ ایسے معاملات میں اہمیت ابتدائی ہیئت کو حاصل نہیں' بلکہ صرف ہیئت کو' خواہ اس کی صورت بدل گئی ہو' اس میں فعال اور نازک احساس اور مشاہد کی کیفیت ادراک اور امکانی تخلیقیت کا ہونا لازمی ہے۔ مطالب منتقل نہیں ہوتے۔ دو مختلف انواع کے انسان مزاج کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ ہر ایک اپنی روحانی یگانگت قائم رکھتا ہے اور دونوں میں ناقابل عبور خلیج حائل رہتی ہے۔ اگرچہ اس دور میں ہندوستانی اور چینی دونوں بدھ مت کے پیروکار تھے' مگر روحانی طور پر دونوں اقوام میں ابتدائی فاصلے قائم تھے۔ اگرچہ دونوں یکساں الفاظ' یکساں رواجات اور یکساں علامات استعمال کرتے تھے۔ مگر دونوں کی روحیں مختلف تھیں' جو اپنے اپنے راستے پر چلتی تھیں۔

تمام ثقافتوں کی تحقیق کرتے ہوئے بالاخر یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ثقافتوں میں قدیم ثقافتوں کے ساتھ ایک تسلسل کا عمل موجود ہے اور فی الحقیقت جدید ثقافتوں نے قدیم ثقافتوں کے ساتھ محدود پیمانے پر (بالکل محدود) بعض روابط قائم رکھے ہیں' مگر ضروری نہیں کہ ان کے مطالب و معانی بھی قدیم ہوں۔ ہر ثقافت اپنے لیے نئے معانی تلاش یا وضع کر لیتی ہے۔ پھر سائنس اور فلسفے میں مستقل فتوحات سے کیا مراد ہے؟ ہمیں بار بار بتایا جاتا ہے کہ یونانی فلسفہ ابھی تک کسی حد تک زندہ ہے۔ مگر یہ صرف ایک زبانی کلامی بات ہے اور اس کا حقیقی مقصد کوئی نہیں۔ کیونکہ پہلے مجوسی اور بعد میں فاؤستی بنی نوع انسان' جن میں ہر ایک گہری دانائی اور ذاتی جبلتوں کے تحت اس فلسفے کا استرداد کرتا رہا ہے یا بغیر غور و فکر اسے نظر انداز کرتا رہا ہے' یا اس کے اصول و قواعد کی نئی تشریحات اور تعبیرات کرتا رہا ہے۔ سادہ لوحی پر مبنی خوش اعتقادی اور ناشائستہ جوش و خروش کی بنا پر انسان دھوکا کھا جاتا ہے۔ یونانی فلسفیانہ تصورات کی فہرست بہت طویل ہے اور اسے مزید طوالت دی جا سکتی ہے۔ اگر اس فنا پذیر کل کا کوئی جزو بھی باقی بچ جائے تو وہ اس مفروضہ حیات کی دلیل ہو گا۔ ہمارا رواج محض یہ ہے کہ کسی حادثاتی امر کو نظر انداز کر دیا جائے۔ "غلطیاں" اور ان کے متعلق ایسے تصورات جو دیمو قراطس کے جوہر نظریہ کے تصورات اور افلاطونی تصورات کی مادیت اور ارسطو کے کائنات کے متعلق باون بے معنی تصورات' گویا ہم مردوں کو ان سے بہتر جانتے ہیں' جتنا کہ وہ اپنی حیات کے متعلق اپنی زندگی میں جانتے تھے۔ یہ اشیا درست بھی ہیں اور لازمی بھی مگر ہمارے لیے نہیں۔ یونانی فلسفے کی جس قدر مجموعی مقدار ہمارے ہاتھ میں ہے یعنی حقیقی طور پر' محض سطحی دعویٰ نہیں حقیقت میں وہ صفر ہے۔ ہمیں دیمو قراطس اور افلاطون کے متعلق دیانتدارانہ رائے کا اظہار کرنا چاہیے۔ افلاطون

اس وقت تک ہمارے ساتھ مخلص ہے جب تک کہ ہم نے اس کا اچھی طرح سے جائزہ نہیں لیا اور ہم نے اس کے طریق کار' تصورات' عزم اور یونانی سائنس کے ذرائع میں سے کس قدر استعمال کیا ہے؟ احیائے علوم تحریک کے داعی کہتے ہیں کہ وہ مکمل طور پر کلاسیکی فن کے زیر اثر تھا' مگر ڈورک کے مندروں کی ہیئت کے متعلق کیا خیال ہے؟ آئی عونی ستونوں کی کیا صورت ہے؟ ان ستونوں کا فن تعمیر سے تعلق رنگوں کا انتخاب' پس منظر کی تشکیل' نقاشی کا تناظر' اشکال کی یکجائی میں اصول' ظروف کی نقاشی' پچی کاری' کاشی کاری' بت گری کے تشکیلی عناصر' حبابیہ کا توازن؟ ان میں سے کسی شے کا بھی افلاطون پر اثر موجود نہیں۔ آخر کیوں؟

کیونکہ انسان جس شے کا عزم کرتا ہے (یہاں تحریک احیائے علوم کے فن کار سے مراد ہے) عزم اظہار اس کے لیے بنیادی امر ہے۔ مردہ صورتوں کا ذخیرہ جو اس کے سامنے موجود تھا' ان میں سے بھی اس نے حسب خواہش صرف محدودے چند ہی کا مشاہدہ کیا اور ؟ اس نظر سے دیکھا' جو اس کی خواہش کے مطابق تھی۔ یعنی جو اس کے اپنے ارادے اور مرضی کے مطا[illegible] تھی' نہ کہ اس نظر سے جو ان کے خالق کی مرضی اور منشا کے مطابق تھی۔ مگر کوئی بھی زندہ فن کسی بھی دور میں سنجیدگی سے ایسا نہیں کرتا۔ قدیم یونانیوں پر مصری اثرات کا یکے بعد دیگرے مشاہدہ کریں اور آخر میں آپ کو معلوم ہو گا کہ اس نوعیت کا کوئی عنصر بھی موجود نہیں۔ مگر یونانی ایسا چاہتے تھے کہ وہ کوئی اس نوعیت کے عناصر تلاش کر لیں۔ انھوں نے فن کے قدیم ذخیرے سے بعض مثالیں ڈھونڈ نکالیں تاکہ وہ اپنی خواہش کی تکمیل کر لیں۔ کلاسیکی سرزمین کی ہر طرف مصری' کر-تسی بابلی شاہی' حتی' پارسی اور فینیشی یا تو کام کر رہے تھے' یا کر چکے تھے اور ان لوگوں کی تعمیرات' آرائشی کام' فنی مصنوعات' مسالک' حکومت کے طریق' رسم الخط اور طبیعی علوم کا یونانیوں کو اچھی طرح سے علم تھا۔ مگر اس تمام ذخیرے میں اس فن کی مقدار کتنی تھی جو یونانیوں نے اپنا بنا کر پیش کیا؟ ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ ماسوائے روابط کے باقی کچھ بھی یونانیوں نے قبول نہ کیا۔ مگر اس کی مقدار کیا تھی جو یونانیوں نے قبول نہ کیا؟ ایسی کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کا اندازہ نہ کر سکیں۔ مثلاً اہرام مصر' مصری حواشی یا خط تصویری' یا خط میخی' اور وہ باز نطینی ذخیرہ اور مور کا فن۔ کیا اسے اس لیے رومی فن سمجھا گیا کہ یہ ہسپانیہ اور سسلی کے راستے منتقل ہوا تھا؟ انتخاب کا یہی طریق کار تھا۔ اس حکمت کی تعریف کرنا ناممکن ہے۔ (غیر شعوری طور پر نہیں) ان کے انتخاب کا یہی طریق کار تھا' اور انھوں نے جو منتخب کیا وہ یہی کچھ تھا ہر وہ رابطہ جو انھوں نے قبول کیا وہ صرف استثنا کی ذیل ہی میں آتا ہے اور اسے غلط فہمی بھی کہا جا سکتا ہے اور تکوین کی داخلی کیفیت کو اس سے بہتر کہیں نہیں مشاہدہ کیا جا سکتا جو غلط فہمیوں کے اس فنی پٹارے میں محفوظ ہے۔ انتہائی جوش و خروش سے ہم اس پر اصول اجنبیت کا اطلاق کرتے ہیں اور بنیادی طور پر ہم نے صداقت کا حلیہ ہی بدل دیا ہے۔ مغرب کی طرف سے افلاطون کے حق میں کی گئی تعریفوں ہی کو دیکھیں برنارڈ آف چارٹرس سے لے کر مرسیلس فسی نس اور گوئٹے اور شیلنگ تک اور سب سے زیادہ اسے ایک اجنبی مذہب کے حوالے سے اور یقینی امر تو یہ ہے کہ اس کے مذہب نے ایک نئی روح کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ فی الحقیقت کسی شخص کو تینوں ارسطوؤں کی تاریخ لکھنی چاہیے تھی---- یونانی' عرب اور

رومی---- تینوں میں کوئی ایک تصور بھی مشترک نہیں یا یہ ہے کہ تاریخ کو مجوسی اور عیسائی تصورات سے فاؤستی تصورات میں منتقل کر دیا جائے۔ ہمیں وعظ کے دوران بتایا جاتا ہے اور کتابوں میں بھی لکھا ہے کہ مذہب کا آغاز قدیم کلیسا سے ہوا اور بغیر کسی بنیادی تبدیلی کے مغرب تک پہنچ گیا۔ فی الحقیقت مجوسی عقائد نے ثنویت کے عقیدے کو گہرائی سے نکال کر روئے عام پر روشناس کرایا۔ یہ اس کے اپنے مذہبی شعور کی ترجمانی تھی ہم نے اسے عیسائی مذہب کا نام دے لیا۔ اس تجربے کا جتنا حصہ بھی قابل ابلاغ تھا' الفاظ' طریق کار' رواج وہ سب کلاسیکی دور کے آخری عہد میں تسلیم کر لیا گیا تھا اور اسے مذکورہ مذہب کے اظہار کے طور پر قبولیت مل گئی۔ پھر یہ ایک سے دوسرے شخص تک منتقل ہوتا رہا اور یہاں تک کہ قبل از ثقافت مغربی دور میں جرمنی تک پہنچ گیا۔ الفاظ تو وہی رہے مگر مفہوم بدلتا گیا۔ لوگ مذہبی الفاظ کی اصل صورت کی تبدیلی کی کبھی جرات نہیں کرتے اور اس کا عام سبب یہ ہے کہ وہ ان کے معانی ہی سے آشنا نہیں ہوتے۔ اگر اس پر شک کیا جائے تو شک کرنے والے کو "تصور مرحمت" کا مطالعہ کرنا چاہیے جس کے مطابق آگسٹائن کے تصورات ثنویت کی وضاحت کی گئی ہے۔ وہ انسان کے اندر موجود عنصر کی نشاندہی کرتی ہے اور کالون کی متحرک توضیح کے مطابق ہے اور انسان کے موجود عزم' کی تشریح کرتی ہے اور مجوسی تصور کو تو ہم بالکل نہیں سمجھ سکتے۔ ایک روح جس کا تصور روح القدس سے اخذ ہے' اور جسے اجماع امت کے تحت تسلیم کیا گیا ہے اور متفق الیہ سمجھا جاتا ہے مگر اسے ازلی صداقت کی حیثیت حاصل ہے۔ اسی روایت کے تحت قدیم کلیسا کی مجلس کو ہیئت مقتدرہ کے اختیارات تفویض ہوئے اور ایک سائنسی طریق کار کی حیثیت سے عالم اسلام میں اجماع بطور قانون ابھی تک جاری ہے۔ مگر چونکہ مغربی انسان اس تصور کو سمجھ نہیں سکتا تھا لہٰذا اس کے نزدیک متاخر مجالس کلیسا کی حیثیت پارلیمنٹ سے زیادہ نہ تھی اور اس سے غرض پاپائیت کے اختیارات کی تجدید تھی۔ یہ تصور کہ مجلس سے کیا مراد ہے پندرھویں صدی تک زیر غور رہا اور کانسٹس اور باسل' ساوونارولا اور لوتھر کے متعلق سوچیں جو اس میں مشغول رہے۔ بالآخر اس تصور کو بے مقصد اور بے معنی قرار دیا گیا اور یہ ختم ہو گیا۔ اس سے قبل کہ پوپ کو معصوم قرار دیا جاتا قدیم عربوں میں روز حشر کا تصور موجود تھا' یعنی موجودہ گوشت پوست کے ساتھ حیات ثانی۔ یہ تصور انسانی روح کی پاکیزگی کو تسلیم کرتا۔ کلاسیکی باشندے روح کو جسم کے معانی قرار دیتے ہیں جن کی تخلیق بیک وقت ہوئی تھی۔ یونانی فکر نے اس مسئلے کا ذکر شاذ و نادر ہی کیا ہے۔ اتنے اہم مسئلے پر خاموشی کے لیے ان دو اسباب میں سے کوئی ایک ہو سکتا ہے۔ یہ تصور ہی سرے سے موجود نہ تھا یا اسے اتنا بدیہی سمجھا جاتا تھا کہ اسے کوئی شعوری مسئلہ ہی نہ سمجھا جاتا تھا۔ عربوں کے لیے اس کی حقیقت ثانی الذکر کے مطابق تھی اور اس کے ساتھ ساتھ یہ تصور بھی تھا کہ اس کی روح ایک امر ربی ہے' جس نے اس کے جسم میں ٹھکانا بنا رکھا ہے۔ لہٰذا منطقی طور پر کسی ایسی شے کا وجود ضروری ہے جس میں انسانی روح بروز حشر شامل ہو کر حیات ثانیہ حاصل کر سکے۔ لہٰذا لاش ہی کے دوبارہ جی اٹھنے کا تصور پیدا ہوا۔ یہ تصور اور اس کے حقیقی معانی تک رسائی اہل مغرب کے قطعاً" قابل فہم نہیں۔ الہامی کتب کے الفاظ پر تو شبہ نہیں کیا گیا مگر غیر شعوری طور پر اس کے معانی تبدیل کر لیے گئے۔ کیتھولک مسلک کے بعض اعلیٰ دماغوں نے پہلے ہی لوتھر میں تلاش کر لیے تھے اور آج کل بالعموم یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ روح غیر فانی ہے اور بطور مرکزی قوت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ اگر پال یا آگسٹائن ہمارے تصور

عیسائیت سے آگاہ ہو سکتے تو وہ ہمارے تمام عقائد کی تردید کر دیتے۔ ہماری تمام کتب اور ہمارے تمام تصورات بالکل غلط اور الحاد قرار دیتے۔

ایک ایسے انتہائی مضبوط نظام کی مثال موجود ہے جو اپنی تمام ہیئت کے ساتھ دو ہزار سال بغیر کسی تغیر و تبدل کے گزار چکا ہے اور تین مختلف ثقافتوں میں، تین مختلف معانی کا ارتقا دیکھ چکا ہے۔ اس لیے ہمیں رومی قانون کو قبول کر لینا چاہیے۔

۲

کلاسیکی عالم میں قانون کی کیفیت یہ تھی کہ شہریوں کا تیار کردہ، شہریوں کے لیے قانون اور یہ تصور پہلے سے قائم ہے کہ یہ شہری مملکت سے متعلق ہے۔ یہ بنیادی عوامی زندگی تھی جس نے اس کی رہنمائی کی۔ اور بدیہی طور پر۔ ان انسانی تصورات کے عین مطابق جو وقتاً فوقتاً اس میں اضافہ کرتے رہے اور جن کی مسائی سے ریاست کا وجود قائم ہوا ۔ کلاسیکی تصور عالم کی اس رسمی حقیقت کی اساس پر تمام کلاسیکی قانون کی تشکیل قائم ہوئی۔

لہٰذا شخصیت کا تصور بنیادی طور پر کلاسیکی ہے اور اس کے درست معانی اور گرفت صرف کلاسیکی ثقافت کے تناظر ہی میں سمجھ میں آتی ہے۔ ہر فرد ایک ایسا مجسم ہے جو شہری باشندوں میں سے ایک ہے اور شہر کا قانون اسی کے حوالے سے تیار کیا گیا ہے۔ جب یہ نچلی سطح تک پہنچتا ہے تو یہ قانون اشیا قرار پاتا ہے۔ ایک امر اضافی کے طور پر غلام، مجسم تو تھا مگر اس کی شخصیت، نہ تھی اور بالائی سطح پر دیوتاؤں کا قانون تھا اور اضافی طور پر وہ ہیرو بھی جو انسان ہونے کے باوجود دیوتائی مقام حاصل کر لیتا اسے کسی مسلک میں قانونی حق مل جاتا جیسا کہ لائی سینڈر اور اسکندر کو بعض یونانی شہروں میں اور ڈاٹوس جیوس اور اس کے ورثاء کو روم میں یہ رعایت حاصل تھی۔ کلاسیکی نظام عدل میں یہ رجحان روز بروز ارتقا پذیر ہوتا رہا اور اس سے یہ اصول پیدا ہوا، جس کی رو سے بطور سزا حقوق شہریت سے محروم کیا جا سکتا تھا۔ اس تصور سے مغربی ثقافت نا آشنا ہے (اس لفظ کے ہمارے مفہوم کے مطابق)۔ کسی شخص کو جزوی اور بالآخر تمام حقوق شہریت سے محروم کرنا ظلم ہے مگر کلاسیکی متعلقہ شخص بطور سزا شخصیت سے محروم ہوتا اگرچہ جسمانی طور پر وہ زندہ ہوتا تھا۔ یہ "معاملہ" یا "شے" کلاسیکی تصور کے مطابق صرف "شخص" کے مقابلے میں "کوئی شے" یا "شخصیت" کے حوالے ہی سے سمجھ میں آتا ہے۔

کلاسیکی مذہب تمام کا تمام ریاستی مذہب تھا۔ قانون کے ماخذ حقیقی قانون اور مذہبی قانون میں کوئی تمیز قائم نہیں کی گئی جس طرح کہ شخصی قانون شہری حقوق، اور اشیا اور دیوتاؤں اور اشخاص کے مابین معاملات کو باقاعدہ متعین کر دیا گیا تھا۔ یہ حقیقت فیصلہ اہمیت کی حامل تھی کیونکہ کلاسیکی نظام عدل، جو ہمیشہ عوامی

تجربات پر مبنی رہا۔ مزید برآں اس میں ارباب عدل کے عدالتی تجربے کا کوئی دخل نہ تھا مگر عوام کے روز مرہ کے تجربات ہی اس کی بنیاد تھے۔ بالعموم عوام ہی سیاسی اور معاشی زندگی میں اہمیت کے حامل تھے۔ روم میں سیاست کار بننے کے لیے قانون دان ہونا ضروری تھا۔ ہر منتظم کے پاس ایک مالی مہتمم بھی ہوتا جب کبھی کوئی منصف کسی معاملے میں فیصلہ دیتا، تو اس کے ذاتی تجربات میں قانون کے علاوہ بھی خاصی وسعت ہوئی، ایک پیشہ ور منصفین کی جماعت (قطع نظر نظریاتی علم کے) میں ایسے افراد بھی شامل ہوتے، جن کا بنیادی پیشہ قانون کے علاوہ کوئی اور ہوتا۔ قانون پیشہ افراد کا کلاسیکی دور میں کوئی وجود نہ تھا۔ نظام عدل کا تمام تصور اسی حقیقت پر مبنی تھا۔ رومی مزاجاً" نہ تو نظام پرست تھے، نہ تاریخ دان تھے، نہ نظریات کے قائل تھے، بلکہ انتہائی عملی لوگ تھے۔ نظام عدل (فقہ) انفرادی معاملات کی تجرباتی سائنس ہے اور شریفانہ طریق عمل تھا اور کسی بھی صورت میں تجریدی تشکیل نہ تھی.

اگر یونانی اور رومی قانون کو محض مقدار کے لحاظ سے جانچا جائے تو اس سے درست تصور پیدا نہیں ہو گا۔ رومی قانون اپنے ارتقا کے لحاظ سے انفرادی قانون ہے اور سینکڑوں میں سے ایک ہے۔ مگر یونانی قانون بطور ایک وحدت کے کبھی وجود میں نہیں آیا۔ اگرچہ یونانی زبان بولنے والے شہروں میں ایک ہی قسم کا قانون مروج تھا، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم رہی کہ ہر شہر کا اپنا قانون تھا اور وہ ایک دوسرے کے قوانین قبول نہ کرتے تھے۔ ان کے ہاں ڈورک قسم کا کوئی عمومی تصور نہ تھا۔ اور یونانی مقننہ کا معاملہ تو کبھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ ایسے تصورات یونانی فکر کے لیے اجنبی تھے۔ دیوانی قانون صرف شہری حدود کے اندر لاگو تھا اور ان کے باہر کے لوگ اس کے دائرہ کار میں نہیں آتے تھے اگر ساچس سپگل نے بھی ہمارے اس گہرے احساس کے تصور کی شہادت دی ہے کہ فی الحقیقت کسی ملک میں ایک وقت میں صرف ایک قانون نافذ ہو سکتا ہے۔ دور شہنشاہی میں بھی کافی عرصے تک رومی شہریوں کے لیے حقوق شہریت اور "دیگر افراد" کے حقوق شہریت کے قانون میں امتیاز قائم رکھا گیا۔ دیگر افراد سے مراد وہ لوگ تھے جو رومی فتوحات کی وجہ سے رومی اقتدار کا حصہ بن چکے تھے۔ (یہاں پر یہ اضافہ دور ازکار نہ ہو گا، کہ یہ صورت اس سے بالکل الگ تھی، جیسے ہم قانون اقوام کہتے ہیں)۔ اور اس کی وجہ محض یہ تھی کہ روم نے ایک شہری وحدت کی حیثیت سے وہ سب کچھ حاصل کر لیا تھا جو اسکندریہ نے مختلف حالات کے تحت حاصل کیا تھا۔ شاہی دور میں رومی قانون بہت زیادہ اہمیت حاصل کر گیا کیونکہ یہ اپنی داخلیت کی بدولت بہت اعلیٰ اور برتر تھا۔ اس کا پہلا سبب روم کی سیاسی کامیابی تھی اور اس کے بعد روم کی قانونی معاملات میں عملی تجربے کی اجارہ داری تھی اور انھوں نے یونانیوں کی قیمت پر اپنا نظام عدل (فقہ) کی ترتیب دے لیا تھا۔ اگر ہم اس عمل کو روح کی مماثلت قرار دیں یا اس نام سے موسوم کریں تو اتنی بڑی تعداد میں قانونی نظاموں کو کیا کہیں گے؟ اور یہ سب کچھ ایسے دور میں ہوا جبکہ روم ابھی ایک تیسرے درجے کی قوت تھی اور جب رومی قانون نے اپنی برتری قائم کر لی تو یہ صرف اس حقیقت کا ایک پہلو تھا کہ رومی ذہانت نے یونانیت پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد قانون سازی کا عمل یونان سے روم میں منتقل ہو گیا۔ یعنی متعدد شہری ریاستوں کے مجموعے سے جو سب کی سب اپنی اہمیت سے بخوبی آشنا تھیں، ایک شہری ریاست کی طرف جو بالآخر صرف اپنی برتری اور عمل

استحصال کو جاری رکھنے میں مصروف ہو گئی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ یونان نے اپنی فقہ کبھی یونانی زبان میں تحریر نہیں کی۔ جب کلاسیکی دنیا ایسے مقام پر پہنچ گئی، جس میں کہ وہ اس سائنس کو مرتب کرنے میں پختہ کار ہو چکی تھی۔ (سب سے آخر میں) تو اس وقت صرف ایک ہی قانون ساز شہر باقی رہ گیا تھا جس کی بڑی اہمیت تھی۔

اس مسئلے پر ناکافی توجہ دی گئی ہے کہ یونانی اور رومی قانون ہمعصر نہیں بلکہ ایک دوسرے کے جانشین ہیں۔ رومی قانون کی عمر کم ہے اور اس میں اپنے بڑے بھائی کا سارا تجربہ بھی شامل ہے۔ رومی قانون کی تشکیل بعد میں ہوئی اور چونکہ اس کے پیش نظر نمونہ موجود تھا، اس لیے اسے جلدی سے تیار کر لیا گیا۔ اس امر کے بیان کی اہمیت اپنی جگہ موجود ہے کہ رواقی فلسفے کا موسم بہار جس نے عدالتی تصورات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ یونانیوں کے دور کے بعد اور رومن قانون لی تشکیل سے قبل وجود میں آیا۔

۳

یہ فقہ جس ذہن نے مرتب کی وہ انسان کی قطعی غیر تاریخی جنس تھی۔ اس لیے کلاسیکی قانون صرف روز مرہ بلکہ لمحاتی ضروریات کے مطابق ہے۔ انھوں نے ہمیشہ مخصوص ضروریات کے تحت خصوصی قانون سازی کی اور جب کسی مقدمے کا فیصلہ ہو گیا، تو متعلقہ قانون بھی ختم کر دیا گیا۔ کسی قانون کو آئندہ کے لیے توسیع دینے کا مطلب ان کے کلاسیکی مزاج حال کی نفی ہوتی۔

رومی منصف نے اپنے عہدے کے پہلے سال میں ایک منشور جاری کیا کہ وہ اس کے تحت قواعد کو سال بھر کے لیے مرتب کر کے ان پر عمل کروں گا۔ مگر اگلے سال کے دوران اس کے جانشین ان قواعد پر عمل کے لیے پابند نہ تھا۔ نیز ایک سال کی مدت کے تعین سے بھی ہرگز یہ مقصود نہ تھا کہ متعلقہ قواعد کا نفاذ سال بھر جاری رہے گا بلکہ اس کے برخلاف (بالخصوص لیکس ایبوٹا) صدر منصف تمام ماتحت عدالتوں کے لیے قواعد تشکیل دیتا جن کے تحت ہر مقدمے کا فیصلہ کیا جاتا۔ اور ان قواعد کے لیے کوئی میعاد کا تعین نہ ہوتا۔

بظاہر یکساں، مگر معانی میں فی الحقیقت بہت مختلف یہ امر ہے کہ اس فاصلے میں کوئی شک باقی نہ رہے، جو کلاسیکی اور مغربی قوانین میں ہے۔ اس کے پیچھے فی الحقیقت جرمن تصورات ہیں جن کی بنیاد انگریزی عدالتی طریق کار پر ہے اور اس کی روح منصف کی وہ تخلیقی قوت ہے، جس کے تحت وہ کسی قانون کا اعلان کرتا ہے۔ اس کا فریضہ کسی ایسے قانون کا اطلاق ہے، جس کا جواز موجود ہو۔ وہ موجود قوانین میں باقاعدگی پیدا کر سکتا ہے اور اپنے قواعد کے تحت ایسے حالات کے پیش نظر قوانین میں باقاعدگی پیدا کر سکتا ہے جو دوران سماعت اس کے علم میں آئے ہوں (کلاسیکی منصف اعلیٰ کے اختیارات قانون سازی کے ساتھ موجود عدالتی

عمل کی کوئی شے مشترک نہیں)۔ اگر وہ بعض واقعات کی بنا پر دوران مقدمہ یہ محسوس کرے کہ موجودہ متعلقہ قوانین میں کوئی نقص یا کمی رہ گئی ہے تو وہ اسے پورا کرنے کے لیے خلا کو پورا کر سکتا ہے اور مقدمہ کی کارروائی کے عین وسط میں وہ نیا قانون تشکیل دے سکتا ہے (بشرطیکہ مابعد مقننہ اسے قبول کر لے)۔ یہی وہ عوامل ہیں جو اسے کلی طور پر غیر کلاسیکی حیثیت دے دیتا ہے۔ قدیم اصول قانون قواعد کی بتدریج تشکیل کی بنیاد یہ تھی کہ عوامی زندگی ایک مخصوص دور میں ہمیشہ متجانس طریق حیات پر عمل پیرا رہتی اور ہر دفعہ معاملات درپیش کی نوعیت ایک ہی ہوتی۔ قوانین کا مستقبل کے لیے نفاذ ارادی طور پر نہ کیا جاتا، بلکہ کم و بیش ان کی ہر بار نئی تشکیل کی جاتی اور ان کی حیثیت عبوری اور تجرباتی ہی رہتی۔ ان فیصلوں کا مجموعہ ایک نظام تو نہ ہوتا مگر ایک ایسا مجموعہ ضرور ہوتا جس پر قانون کی بنیاد رکھی جاتی جیسا کہ ہم زمانہ مابعد میں منصف اعلیٰ کے احکام کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ہر نیا منصف اعلیٰ اپنے پیش رو کے احکامات کا بیشتر حصہ تسلیم کر لیتا۔

تجربہ قدیم قانون سازوں کے لیے ہمارے اسی اصطلاح کے معانی سے مختلف معانی کا حامل ہوتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قانون کی مجموعی حیثیت کوئی جامع نقطہ نظر تو سامنے نہ آتا۔ مگر ہر انفرادی معاملے میں ان مضمرات کا دھیان ضرور رکھا جاتا اور اپنے عملی تجربے اور مہارت سے ان کا نفاذ کیا جاتا۔ مگر وہ مبنی بر تجربہ علم جو بعض عدالتی کیفیات میں بار بار وجود میں آتی ہیں، ان کے لیے اس سے کماحقہ، استفادہ کر لیا جاتا تاکہ ہر موقع پر نئی قانون سازی کی تکلیف نہ کرنی پڑے۔

یہ حقیقی کلاسیکی ہیئت جو قانونی مواد جو ملحقات یا زوائد کی نوعیت کا ہو وہ خودبخود انفرادی نوعیت اختیار کر لیتا ہے۔ کیونکہ ایسی صورت صرف خوش حالی کے ایام یا رومی منصفان اعلیٰ کی بدولت وجود میں آتی ہے۔ سولون کی تمام مبینہ قانون سازی کارونڈا اور بارہ میزوں کی کارروائی صرف ایسے احکام کی مجموعی تدوین ہے جن سے کسی حد تک استفادہ کیا جا سکتا تھا۔ گور-ٹن کا قانون جو کم و بیش مذکورہ بارہ کا ہمعصر تھا اسے کسی اور مجموعے کا ضمیمہ سمجھنا چاہیے۔ ایسی کارروائی میں یہ احتمال رہتا ہے کہ غیر ماہرانہ مواد بھی شامل ہو جائے (ارسٹو فینیز نے قانون سازوں کو پرندے کہا تھا)۔ ان میں کوئی نظام نہیں ہوتا اور وہ کسی طویل مدتی قانون سازی کو انجام دیں گے اس کی توقع تو بہت ہی کم ہے۔

مغرب میں یہ صورت حالات بالکل برعکس ہے۔ عام رجحان یہ کہ تمام کارآمد قوانین کو ضوابط میں مستقل طور پر مرتب کر دیا جائے اور مستقبل کے متوقع مسائل کا بھی حل پیش کر دیا جائے۔ تمام مغربی قانون پر مستقبل کی مہر ثبت ہو گی مگر تمام کلاسیکی قانون صرف زمانہ حال ہی سے متعلق ہو گا۔

۴

مگر اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس دعویٰ کو اس بنا پر مسترد کیا جا سکتا ہے کہ یہ حقیقی کلاسیکی

قانون تخلیقات پیشہ ور قانون دانوں نے مستقل استعمال کے لیے مدون کی تھیں۔ یہ بلاشبہ درست ہے مگر ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہم قدیم کلاسیکی قانون (۷۰۰ - ۱۱۰۰ ق م) سے قطعاً" ناآشنا ہیں اور یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ دیہاتی علاقے کا رواجی قانون اور نوزائیدہ قصبات کا قانون تو کبھی لکھا ہی نہیں گیا جیسا کہ رومی دور میں یچ سین ہیگل کے ہاتھوں ہوا یا قدیم عربوں اور شامیوں نے قانونی کتب تیار کیں۔ قدیم ترین طبقہ بندی جو ہم کر سکتے ہیں اس کے مطابق قدیم ترین مجموعہ قانون کی تحریر کا آغاز ۷۰۰ ق م سے ہوا۔ اسے اساطیری یا نیم اساطیری شخصیات کا کارنامہ بتایا گیا' مثلاً لائی کرگس' زیلیوکس' چرونڈا اور ڈراکون۔ اور بعض رومی بادشاہ مگر نسب نامے ہمیں یہی بتاتے ہیں۔ مگر ان کے اصل مصنف ان کی تدوین کا اصل طریق کار اور ان کے اصل مندرجات کے متعلق یونانی فارسی جنگوں کے دور کے یونانی بھی لاعلم تھے۔

ایک دوسرا طبقہ جو جسٹینین کے ضابطہ رومن قانون کا جرمنی میں استقبال سے وابستہ ہے۔ اس کے متعلق سولون (۶۰۰ ق م) اور پک ٹاکس (۵۵۰ ق م) کے نام لیے جاتے ہیں۔ کچھ دوسرے نام بھی ان کے ساتھ شامل ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب قانون نے اپنی تشکیل مکمل کر لی تھی اور شہری حلقوں میں اس کی سرپرستی کا بھی آغاز ہو چکا تھا۔ ان کو سیاسی تشکیل کہا جاتا ہے (سیاسی پیشکش)۔ مگر اس کے برعکس قدیم کو " تھیسمائی" اور "ریٹرائی" کہا جاتا تھا۔ لہٰذا فی الحقیقت ہمیں متاخر کلاسیکی قانون کی تاریخ ہی معلوم ہے۔ اس دور میں اچانک ضابطہ بندی کا خیال کیوں پیدا ہوا؟ محض ان کے ناموں پر ایک سرسری سی نظر ڈالنے سے بھی یہ معلوم ہو گا کہ اس عمل میں تجربات کے نتائج جمع کرنے کا مقصد پیش نظر نہ تھا مگر ایسے فیصلوں کا مجموعہ تیار کرنا تھا' جو سیاسی قوت کے مسئلے سے متعلق ہوں۔

یہ فرض کر لینا بہت بڑی غلطی ہوگی کہ ایک ایسا قانون جو ہر نوع کے معاملات کو زیر غور لاتا ہے۔ مگر سیاسی اور معاشی مسائل سے گریز کرتا ہے وہ زندہ رہ سکتا ہے۔ ایسے حالات کی تصویر کشی کی جا سکتی ہے اور ہمیشہ کی بھی جاتی رہی ہے۔ یہ عمل وہ لوگ سرانجام دیتے رہے ہیں جو یہ فرض کر لیتے رہے ہیں کہ سیاسی امکانات کا تصور ہی سیاسی فعالیت ہے۔ مگر اس حقیقت کو کوئی بھی جھٹلا نہیں سکتا کہ ایسے قوانین کی جو تجرید سے پیدا ہوئے ہوں' اس کا حقیقی تاریخ میں کوئی وجود نہیں ہوتا۔ قانون میں ہمیشہ اس کے منصف کا عالمی تصور تجریدی صورت ہی میں پیش کیا جاتا ہے اور معاشیات کی ہر عالمی تصور کا رجحان مفکرین پر نہیں ہوتا بلکہ ان افراد پر ہوتا ہے جن کے ہاتھوں میں اختیارات ہوتے ہیں اور قانون سازی کر سکتے ہیں۔ ہر قانون ایک جماعت بناتی ہے مگر وہ اسے عوام کے نام سے نافذ کرتی ہے۔ اناطولی فرانس نے ایک دفعہ کہا تھا۔ "ہمارا قانون مساوات کے دلفریب نعروں کے درمیان امیر کو بھی غریب کے مقابلے میں کم شدت سے نہیں' روٹی چرانے سے بھی منع کرتا ہے اور گلیوں میں بھیک مانگنے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔" یہ انصاف بلاشک و شبہ یک طرفہ ہے۔ مگر اسی طرح فریق ثانی بھی اپنے عوام کے نظریات کے مطابق اقتدار کے حصول کی کوشش کرے گا۔ یہ تمام قانونی ضابطے یکساں سیاسی اقدامات ہیں اور سیاسی جماعتوں کے قوانین سے زیادہ ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ سولون کے معاملے میں ایک جمہوری دستور نجی قوانین سے منسلک ہو کر جو اسی شان کے

تحت تشکیل ہوئے اور ڈراکون اور ڈیلی میر سے منسوب کیے گئے وہ حقیقت میں چند سری قوانین ہیں' جنھیں نجی قوانین کے پردے میں تحفظ فراہم کر دیا گیا ہے۔ یہ کام مغربی مورخین کے لیے چھوڑ دیا گیا' جو اپنے دیرپا قوانین کے عادی تھے' کہ ان روابط کی اہمیت کو کم کریں۔ کلاسیکی انسان کو اس کا ادراک یا فکر ہی نہ تھی کہ ان معاملات کی فی الحقیقت نوعیت کیا تھی۔ ڈسم ویر کی تخلیق' روم میں خالص طبقہ امرا کا آخری ضابطہ تھا۔ نے سے لس اس کے حوالے سے کہتا ہے کہ اس کے ساتھ ہی درست قانون کا اختتام ہو گیا۔ کیونکہ ڈسم ویر کا زوال اس دوسرے مقننین کے عروج کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ یہ معدلات اتنی جلدی وجود میں آئے' کہ بارہ میزوں کے احکامات اور فیصلوں سے متعلق دستور پر ہر کوئی اعتراض کرنے لگا اور عوامی قانون کی تضحیک کی نوبت آ گئی۔ اس لیے اسے اپنے استحکام کے لیے رومی مدد کی ضرورت پیش آئی' بالکل اسی طرح جس طرح کہ ڈریکون کی تخلیقات کے لیے سولون نے ایک قانون کی مدد سے کیا۔ حالانکہ ایتھنز کی چند سری حکومت کے لیے یہ قابل تقلید قانون تھا۔ اس کے بعد ڈراکون اور سولون چند سری اور عوامی حکومتوں کے مابین نعروں کی حیثیت اختیار کر گئے۔ روم میں ان ناموں سے مراد مجلس قانون ساز اور معدلات تھی۔ سپارٹا والوں کا دستور "لائی کرگس" کے نام سے موسوم تھا۔ وہ نہ صرف ڈراکون اور بارہ میزوں کا حامی تھا' اور انھیں قابل تقلید سمجھتا تھا' بلکہ فی الواقع ان کی پیروی کرتا تھا۔ ہم اس میں ان رومی واقعات کے اس قریبی تعلق کا مشاہدہ کر سکتے ہیں جو اس کے ساتھ بالکل متوازی چلتے ہیں۔ ہم سپارٹا کے دو مختلف بادشاہوں کے اس رجحان کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جس کے تحت وہ ٹران کوئنی کے ظالمانہ نظام کو گرآچی معدلاتی نظام میں تبدیل کرنے کے لیے مساعی کرتے ہیں۔ آخری ٹران کوئنی کا زوال یا ڈیکم ویر کا ادارہ ان معدلات کے خلاف انقلاب یا بغاوت سمجھنی چاہیے۔ اور یہ کلیموتی اس کے زوال کے متوازی ہے (۴۸۸ ق م) اور باؤسنی اس کے زوال سے بھی (۴۷۰ ق م) سے بھی کچھ زیادہ مدت دور نہیں۔ اور راجس سوم کے انقلاب اور کلی او مینز سوم (تقریباً" ۲۴۰ ق م) اور سی فلیمی نی اس کی سیاسی فعالیت کا بھی اس سے صرف چند سال بعد آغاز ہوا۔ مگر سپارٹا کے بادشاہوں کو کبھی بھی مستقل کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا اور عناصر مجلس ایفور کی صورت میں نمائندگی پر فائز رہے۔

اس جدوجہد کے دور میں روم نے ایک ریاستی شہر کی صورت اختیار کر لی جو بالکل کلاسیکی نوعیت کی تھی۔ شہری ذہانت نے جبلی اکثریت پر قبضہ پا لیا۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں ہم عوامی قانون اور قانون مستقلہ کو پہلو بہ پہلو نافذ دیکھتے ہیں (ثانی الذکر جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے منصف اعلیٰ کا تشکیل کردہ ہوتا تھا)۔ اس کے ساتھ ہی بارہ میزی تصور مقابلے سے باہر ہو گیا اور منصف اعلیٰ کا قانون میدان جیت گیا۔

اس پر کچھ زیادہ وقت نہ گزرا کہ منصف اعلیٰ نے مقننہ اور عدلیہ دونوں میں مرکزی حیثیت حاصل کر لی۔ موجودہ دور میں آپ اس کا موازنہ شہری اختیارات کی توسیع سے کر سکتے ہیں۔ منصف اعلیٰ کا دائرہ اختیار اور دیوانی اختیارات متعلقہ عوامی قانون آہستہ آہستہ اپنی اہمیت کھونے لگے۔ مگر خود منصف اعلیٰ عوامی قانون کے تحت جو اس کے لیے غیروں کا قانون تھا' آگے بڑھتا گیا اور بالکل پیش منظر میں آ گیا اور جب بالآخر کلاسیکی

دنیا کی تمام آبادی' ماسوائے ان محدودے چند افراد کے جن کو رومی شہریت حاصل تھی' اس کے دائرہ اختیار میں آگیا' تو روم عملی طور پر شاہی قانون کے تحت آ گئی۔ باقی تمام شہر' جن میں الپائن کے قبائلی اور بدو بھی شامل تھے' انتظامی لحاظ سے خود مختار ہی رہے۔ ان کے مقامی قوانین میں تبدیلی کی بجائے اضافہ کر دیا گیا اور اس طرح روم کا ایک غیر ملکی قانون وجود میں آگیا۔

اس سے کلاسیکی قانون سازی کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اس لیے جب میڈریان نے (۱۳۰ء) اپنا حتمی قانون روشناس کرایا' جس کی وجہ سے قانون کو حتمی شکل حاصل ہو گئی اور منصف اعلیٰ کے ہر سال کے اعلانات ختم کر دیے گئے اور آئندہ کے لیے مزید ترمیمات سے منع کر دیا گیا۔ اس کے باوجود اس کے فرائض منصبی میں یہ شامل رہا کہ وہ ہر سال "قانون سال" کی اشاعت کرے۔ اگرچہ اس قانون کو کوئی خاص جواز حاصل نہ ہوتا۔ بہرحال یہ انتظامیہ کے قواعد کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ مگر اسے سلطنت کا قانون نہ سمجھا جاتا۔ اس لیے وہ مجبور تھا کہ صرف وہی متن شائع کرے جو قبول کیا جا چکا تھا۔ گویا یہ مردہ تہذیب کے ساتھ آخری گستاخی تھی۔ اس کے بعد اس کی حیثیت محض روائتی رہ گئی۔

یونانیوں کے عہد کے ساتھ نظام عدل کا رواج ہوا۔ قانون کی سائنس' قانون کی منظم اور جامع تفہیم' تاکہ لوگ اسے نافذ کر سکیں۔ چونکہ قانونی فکر معاشی اور سیاسی معاملات کو اپنے اندر شامل رکھتی ہے بالکل اسی طرح جس طرح ریاضی اپنے علم کی تیکنیکی ضروریات کا خیال رکھتی ہے۔ روم بہت جلد کلاسیکی نظام عدل کا گہوارہ بن گیا بلکہ اسی طرح جس طرح کہ میکسیکی دنیا میں فاتح ازتک نے اپنی رعایا کے استعمال کے لیے قانون سازی کی۔ کلاسیکی فقہ ہی رومیوں کا نظام عدل تھا اور اس کے علاوہ ان کے پاس مزید کچھ نہ تھا۔ اسی لمحے جبکہ ارشمیدس کے قوانین ریاضی ختم ہو جاتے ہیں' قانون کی تعلیم کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اوب انصاف کا مطالعہ آئی لس کے سہ گونہ مبادیات کے مطالعے سے آغاز کیا جاتا ہے جس میں بارہ میزوں کے فیصلوں کی شرح شامل ہے (۱۹۸ ق م)۔ پہلا منظم نجی قانون سکائے ورلاتے ۱۰۰ ق م کے قریب لکھا۔ کلاسیکی قانون کی تکمیل ۲۰۰ سال میں ہوئی۔ اگرچہ آج کل ہم اس دور میں اسے شمار کرتے ہیں جو فی الحقیقت عرب قانون کا دور تھا اور ان دو قوانین کے نظاموں میں جو وقتی فاصلہ ہے وہی خلا دونوں ثقافتوں کی فکر کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ رومی صرف معاملات اور ان کی صف بندی کے متعلق غور کرتے ہیں' وہ بنیادی معاملات' مثلاً عدالتی غلطی کا تجزیہ نہیں کرتے' وہ معاہدات کا احتیاط سے امتیاز کرتے ہیں۔ مگر ان کو معاہدہ بطور تصور کا کوئی شعور نہیں نہ وہ ان کی عدم جواز اور کمزوریوں کے تصورات سے آگاہ ہیں۔ لی فل کہتا ہے کہ ہر شے کی پڑتال کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ رومیوں کو امکانی طور پر سائنسی طریق کار کا نمونہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس فکر کے آخری دور سب نیاتی' اور پروکلیانی کے مدرسہ ہائے فکر ہیں (تقریباً" ۱۶۰ء)۔ ان کا تعلق سائنس سے ہے جیسا کہ ایتھنز میں فلسفے کے مدرسہ ہائے فکر تھے۔ غالباً" یہ مجالس اور معدلات اختلافات کے

خاتمے کا زمانہ تھا۔ سیزر کے تصورات قانون پر بحث کی جا چکی تھی' سی نی آتی کے پیروکاروں اور جانشینوں میں صرف دو اشخاص تھے جن کو سب سے بہتر سمجھا جاتا تھا اور وہ وہی تھے جنھوں نے سیزر کو قتل کیا تھا۔ ان میں سے ایک پروکلیاتی کو ٹراجن نے اپنے جانشین کے طور پر منتخب کر لیا تھا۔ اگرچہ اس معاملے کا ہر لحاظ سے فیصلہ ہو چکا تھا اور یہ ختم ہو چکا تھا۔ مگر عملی طور پر عوام کی بے چینی دستوری قوانین کے متعلق تھی۔ لہٰذا ان حالات میں منصف اعلیٰ کا حکم ہی نافذ کیا گیا۔

کلاسیکی نظام عدل کا آخری کارنامہ جس حد تک ہمارے علم میں ہے' گائس کا ادارہ تھا (تقریباً" ۱۶۱ء)۔

کلاسیکی قانون صرف جسمیات کا قانون ہے۔ یعنی صرف ان مادی اشیا پر حاوی ہے جن کے بطور اشخاص یا اشیا مرئی اور مادی اجسام ہوں اور اقلیدسی ریاضی کی طرح عوامی زندگی میں ان کی شرح کا تعین کیا جا سکے۔ ان کے ہاں ریاضی اور قانون میں رشتہ بہت گہرا ہے۔ دونوں میں منشا بادی النظر مواد کا جائزہ ہے۔ اس سے حسی اور حادثاتی امور علیحدہ علیحدہ ہو جاتے ہیں اور عقلی لحاظ سے بنیادی اصول کی تلاش' جو اشیا کی خالص حالت ہے کیفیت کی خالص صورت جس سے علت و معلول کا درست اور خالص رشتہ استوار ہوتا ہے۔ کلاسیکی حیات اپنے آپ کو شعور بیدار کی تنقید کے سامنے پیش کرتی ہے جبکہ کلاسیکی انسان اقلیدسی کردار کا گہرا مطالعہ کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں قانونی ذہن میں جو تصور ابھرتا ہے۔ وہ اجسام کی کیفیت اور اجسام اور اجسام کے مابین رابطے کے عمل اور ردعمل کا ہے۔ دیمو قراطس کے جوہری نظریے کی طرح' جسے عدالتی جمود کہا جا سکتا ہے۔

۵

عرب قانون کی پہلی تخلیق غیر مادی اشخاص کا تصور تھا۔ یہ ایک ایسا عنصر ہے جو کلاسیکی قانون سے بالکل غائب ہے مگر اچانک ہی کلاسیکی معدلات میں اس کا اظہار ہونے لگا (یہ تمام کے تمام آرمینیائی تھے)۔ اس کی پوری قدر و قیمت کے ساتھ اس کی وضاحت نہیں کی جا سکتی اور اس کی علامتی اہمیت نئی جدید عالمی احساس کی نشاندہی بھی ممکن نہیں' تاوقتیکہ ہم اس پورے میدان کے حدود کا جائزہ نہ لے لیں' جسے عربی قانون احاطہ کرتا ہے۔

یہ نیا خطہ شام اور شمالی عراق' جنوبی عرب اور بازنطینی علاقوں پر مشتمل ہے۔ ان تمام علاقوں میں ایک نئے قانون کا آغاز ہو رہا تھا۔ یہ زبانی اور تحریری صورتوں میں ابتدائی نوعیت کا رواجی قانون تھا جس سے ہمارا سابقہ قبائلی سرداری کے نظام کے تحت پڑ چکا ہے۔ کلاسیکی عالم میں ہم نے جس ہر شہر کے انفرادی قانون کا مشاہدہ کیا تھا' وہ عجیب و غریب انداز میں یہاں اس نے نسلی قبائل کی صورت اختیار کر لی۔ اسے سراپا مجوسی جادو کہا جا سکتا ہے۔ ہمیشہ واحد روحانی قوت' ایک ہی روح' ایک انفرادی علم' اور جامع کلی اور

اجتماعی صداقت ہر فرد میں سرایت کر چکی ہے۔ ہر شخص کا عزم و عمل اور ایک ہی مذہب ہے' جو اسے ایک وحدت میں پرو دیتا ہے۔ اس معدلت سے مسلک اس لحاظ سے ایک اجتماعی وجود ہے جو منشا' فیصلے اور ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت کی علامت ہے۔ عیسائیت میں یروشلم کے قدیم معاشرے میں ہم مشاہدہ کر چکے ہیں اور ان حالات میں ہم تین افراد کی حقیقی' تثلیثی الوہیت کا نظارہ کرتے ہیں۔

کانسٹنٹائن سے قبل بلکہ کلاسیکی متاخر دور میں بھی شاہی فرامین (دستوری فیصلے) رومی شہری قانون کے باوجود قائم تھے اور ان فرامین کو سن قربلی کلیسیا کے پیروکار حقیقی قانون تصور کرتے تھے اور اس کے تحت مختلف مسالک کو ایک ہی مذہب میں پرو دیا گیا تھا۔ خاص روم میں بھی آبادی کا بہت بڑا حصہ قانون کو شہری ریاست کے قانون ہی کی حیثیت دیتا تھا۔ مگر مشرق سے روابط میں جتنا اضافہ ہوتا گیا یہ رجحان اتنا ہی کم سے کمتر ہوتا چلا گیا اور بادشاہی مسلک نے ملک کے متحدہ قانونی نظام کو مزید متاثر کیا جو کہ سارے کا سارا مذہبی قانون تھا۔ اس قانون کے حوالے سے یہودی اور عیسائی ملحد قرار پاتے تھے کہ وہ اس قانون کی بجائے اپنے اپنے قوانین تسلیم کرتے تھے۔ جب ۲۱۲ء میں آرمینیائی کارا کالا انطونی آنا دستور کے تحت رومی باشندوں کو شہریت عطا کی مگر ڈیڈی تیسی حلقے کو نظر انداز کر دیا تو قانون کی نوعیت خالص کلاسیکی ہو گئی اس قانون کی نوعیت خالص کلاسیکی تھی اور بلاشک ایسے لوگ کثرت سے موجود تھے جو اسے کلاسیکی مزاج کے مطابق سمجھتے تھے یعنی دوسرے شہروں کے افراد کو بھی رومی شہروں میں شامل قرار دیتا مگر بادشاہ کا ذاتی تصور اس سے مختلف تھا۔ وہ ہر شخص کو اپنے مذہب کے پیروکاروں میں شمار کرتا تھا اور مذہبی سربراہ ہونے کے ناطے اپنے آپ کو مطلق العنان حکمران قرار دیتا۔ اس تصور کے تحت دستور میں بڑی بڑی تبدیلیاں وجود میں آئیں۔ عیسائیت میں عظیم خلافت کا تصور پیدا ہوا جو ان کے "تطبیقی قواعد کے صریحا" خلاف تھا۔ اسی بنیاد پر عیسائی قوم کی بنیاد استوار ہوئی اور زاہد و عابد اور منکر و کافر کے اسمائے صفت اپنی اپنی جگہ بدل گئے۔ کیونکہ کانسٹنٹائن کے بعد رومن قانون' راسخ العقیدہ عیسائی قانون میں تبدیل ہو گیا۔ اس کے اس ایشیائی انداز کو ایشیائیوں کے علاوہ جرمنوں نے بھی قبول کر لیا۔ گویا پرانی صورت میں ایک نئے قانون نے اپنے آپ کو ڈھال لیا۔ قدیم عائلی قوانین کے مطابق ایک رومی برغر ایک کپوئی برغر سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر ان دونوں شہروں پر ایک ہی عائلی قانون نافذ نہ ہوتا۔ اب سوال صرف یہ باقی رہ گیا ہے کہ کیا کوئی عیسائی یا یہودی قطع نظر اس کے کہ وہ رومی ہو یا شامی یا مور' کسی کافر سے قانونی طور پر شادی کرنے کا مجاز ہے' مجوسی عقیدے کے مطابق مختلف عقائد کے لوگوں کے مابین مناکحت کی اجازت نہیں۔ آئرلینڈ کے لوگوں میں اس میں ذرہ بھر بھی مشکل نہ تھی۔ قسطنطنیہ میں ایک حبشن سے شادی کی جا سکتی تھی بشرطیکہ دونوں عیسائی ہوں۔ مگر ایک مسیحی عیسائی ایک نسطوری لڑکی سے کس طرح شادی کرتا اگرچہ وہ شام کے کسی گاؤں میں ہمسائیگی میں رہتے ہوں؟ نسلی طور پر ان میں کوئی تمیز نہ تھی' مگر قانونا" وہ دو مختلف---- اقوام سے تعلق رکھتے تھے۔

قومیت کا عرب تصور جدید بھی ہے اور ایک فیصلہ کن حقیقت بھی۔ شمسی ثقافت میں وطن اور پردیس

کی سرحدیں ہر دو قصبات کے مابین قائم تھیں اور مجوسی رواج کے مطابق ہر دو نسلوں کے مابین یہ سرحدیں موجود ہوتیں۔ ایک غیر نسل کا آدمی رومیوں کے نزدیک دشمن سمجھا جاتا تھا اور عیسائیوں کے نزدیک ہر کافر دشمن ہوتا اور یہودیوں کے لیے ہرمز کے پیروکار۔ سیزر کے عہد میں گال اور یونانیوں کو رومی شہریت سے کیا فائدہ حاصل ہوتا؟ حصول حقوق کے اصطباغ کی ضرورت تھی۔ بڑی ثقافتوں میں ادخال اور شمولیت کی یہی ایک ترکیب باقی رہ گئی تھی۔

ساسانی دور کے اہل فارس' اپنے آپ کو ہامنشیوں کے پیش رو کہنے سے گریز کرتے تھے جیسا کہ ہامنشی عہد میں ان کے آباؤ اجداد دعویٰ کرتے تھے۔ حالانکہ ان کی ابتداء اور زبان دونوں اس حقیقت کے شاہد تھے مگر اب وہ ایک گروہ کی حیثیت سے اپنے آپ کو مزدک کا پیروکار کہتے تھے اور اس مسلک کے منکروں کو دوسرا گروہ سمجھتے تھے۔ حالانکہ ثانی الذکر بھی خالص فارسی الاصل تھے (فی الحقیقت نسطوری عیسائی بھی ان کے ہم قوم تھے)۔ اسی طرح یہودی' بعد میں مندائی اور منیشی بھی اور اس کے بعد دوبارہ یک مسیحی اور نسطوری عیسائی بھی' الغرض ہر عقیدے کے لوگ اپنے آپ کو ایک قوم سمجھنے لگے۔ وہ اپنے آپ کو قانونی اور معدلت دونوں لحاظ سے علیحدہ قوم کہتے۔

لہٰذا قدیم عربی قوانین کے بعض مجموعے وجود میں آ گئے جن کا عقائد کی بنیادوں پر امتیاز قائم کیا گیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ کلاسیکی دور میں قانون میں امتیاز کی نسبت قصبات سے کی جاتی تھی۔ ساسانی حکومت کے دور میں زرتشتی قانون موزوں قرار پایا اور ساسانی مدارس میں اس کی تعلیم کا اجرا ہوا۔ یہودی جو مقابلتا" آبادی کے لحاظ سے بہت بڑا مذہب تھا اور آرمینیا سے لے کر سبا تک پھیلا ہوا تھا۔ یہود نے تالمود کے نام سے اپنا مجموعہ قانون مرتب کر لیا۔ وہ یہودیوں کی مجلس معدلات سے قبل کے چند سالوں میں مکمل کر لیا گیا تھا۔ ان کلیساؤں میں سے ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ دائرہ کار تھا جو اسی دور کی جغرافیائی مروج سرحدوں سے ماورئی تھا---- جیسا کہ آج کل مشرقی ممالک کی صورت ہے---- اور منصف جو حاکم ارضی کی نمائندگی کرتا ہے وہ صرف ان مقدمات کا فیصلہ کرتا ہے جو مختلف مذاہب کے فریقوں کے مابین ہوں۔ سلطنت کے اندر یہودیوں کا اپنے معاملات میں اختیار کبھی بھی زیر بحث نہیں آیا مگر نسطوری اور یک مسیحی فرقوں کے عیسائیوں نے اپنی علیحدگی کے بعد جلد ہی اپنے لیے الگ قوانین بنانے کا منفی مطالبہ پیش کر دیا۔ یعنی غیر راسخ اقوام کو بتدریج واپس بلا لیا جائے۔ ایسے عیسائیوں پر جو اپنے آپ کو بادشاہ کا ہم مسلک ہونے کا اقرار کریں ان پر بھی رومن شاہی قانون نافذ کر دیا جائے۔ اس طرح رومی۔ شامی قانون کی کتاب کی جو متعدد زبانوں میں محفوظ ہے اہمیت میں اضافہ ہو گیا۔ غالبا" اس کا تعلق قبل از دستور عہد سے تھا اور اسے انٹی اوک کے خاندان کے سربراہ نے لکھا تھا۔ بلاشک و شبہ یہ پہلا قدیم عربی قانون ہے جو کلاسیکی انداز میں لکھا گیا اور جیسا کہ اس کے متعدد ترجموں سے ثابت ہوتا ہے اس کی ترویج کا باعث راسخ العقیدہ شاہی کلیسیا کی مخالفت میں پنہاں ہے۔ بنیادی طور پر یہ یک مسیحائی عقیدے کے ماننے والے عیسائیوں کا قانون تھا اور اسلام کے ظہور تک یہ رائج رہا اور اس کا دائرہ نفاذ سابقہ مروج قانون سے بھی زائد تھا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا منقش پردہ تھا' جس پر لاطینی زبان میں لکھے گئے قانون کی قدر و قیمت حقیقی صورت اختیار کر لیتی؟ مورخین قانون اپنی تمام یک طرفہ مہارت کے ساتھ صرف مسئلے کے اسی حصے پر غور کرتے رہے ہیں اور اس لیے انھوں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ یہ بھی کوئی مسئلہ ہے۔ ان کے پاس قانون کے متن موجود تھے' ایک ایسا قانون جو غیر مشروط طور پر روم سے یہاں تک پہنچا تھا اور وہ اپنا فریضہ اس حد تک محدود سمجھتے تھے کہ وہ ان متون کی تاریخ کے متعلق تحقیق کر لیں۔ انھوں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ اہل مشرق کے لیے اس کی حقیقی اہمیت کیا ہے۔ فی الحقیقت ہمارے پاس جو قانونی روایت موجود تھی' وہ مقابلتاً" جدید ہے اور جو ہم پر نافذ کر دی گئی اس کی عمر صدیوں پرانی ہے۔ اسے ایک ادب کی حیثیت دے دی گئی اور سیاسی ارتقا کے تسلسل کی حیثیت سے اسے قبول کر لیا گیا۔ اگر سیزر یا سکندر زندہ ہوتے تو اس تسلسل کی صورت مختلف ہوتی یا اینٹونی نے ایکٹیم فتح کر لیا ہوتا۔ ہمیں اس مسئلے کا جائزہ اسی انداز میں لینا چاہیے جیسا کہ قدیم عربوں نے کیسی فن کے نقطہ نظر کے مطابق لیا تھا اور رومی نقطہ نظر کے مطابق اسے قبول کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ دور دراز مغرب میں قانون بہت مدت قبل اپنی معراج حاصل کر چکا تھا' کیا یہاں پر اس کی حیثیت علم وادب سے زائد نہ تھی؟ اس نے کون سا حصہ ادا کیا؟ اگر قانون کے مطالعے' قانون سازی اور اس خطے میں قانونی عمل اس سرزمین کے حالات کے مطابق تھا اور فی الحقیقت ہمیں مزید یہ دریافت کرنا چاہیے کہ رومی قانون کا کتنا حصہ' یا اسی صورت میں کلاسیکی قانون ہمارے قانونی ادب میں کس حد تک شامل ہے؟

لاطینی زبان میں لکھے گئے قانون کی یہ تاریخ ۱۶۰ص کے بعد مشرق یعنی عربوں کی ملکیت ہے اور اس کا متوازی مواد یہودیوں' عیسائیوں اور اہل فارس کے ہاں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ کلاسیکی ارباب عدل (۲۲۰ ـ ۱۶۰) پاپی نین' اسپیان' اور پال آرامی تھے اور اسپیان بڑے فخر سے اپنے آپ کو طائر کا وینیتی کہتا تھا۔ گویا وہ بھی اسی آبادی کے باشندے تھے جس کا کہ طنائم تھا جس نے ۲۰۰ء کے بعد مشنا کی تکمیل کی' اور عیسائی شمیوں کی اکثریت (ٹیر لین (۲۲۳ ـ ۱۶۰ء) ان کا ہمعصر عہد نامہ جدید کا متن ہے جو عیسائیوں نے مرتب کیا عبرانیوں کے لیے عہد نامہ قدیم یہودیوں کا مرتب کردہ ہے اور اسی دور میں فارسی علما نے اوستا مرتب کی۔ یہ عربوں کی بہار کا بہترین علم کلام ہے۔ اس قانونی ذخیرے کے متبحر خلاصے اور تشریحات کی مقدار اسی قدر ہے' جس قدر کہ تورات کے مشنا (اور بہت عرصے بعد قرآنی تفاسیر و احادیث)۔ یہ تمام کا تمام تو نیچی ادب ہے۔ روائتی اور مقتدر ذرائع کی مدد سے ایک جدید رواجی قانون وجود میں لایا گیا۔ علتی طریق کار ہر جگہ ایک ہی ہے۔ بابلی یہودیوں کے پاس ایک خاصہ تی یافتہ دیوانی قانون موجود تھا جو سودہ اور پمپی ڈ-تھا میں پڑھایا جاتا تھا۔ ہر جگہ طلبائے قانون کی ایک جماعت تیار ہو جاتی جس میں ہوشیار عیسائی' اور یہودیوں کے ربی اور بعد ازاں علمائے کرام (فارس میں ملا) اور مسلمان قوم بھی شامل ہو جاتی۔ ان لوگوں کو فتویٰ جاری کرنے کا اختیار مل جاتا۔ اگر کسی عالم کو ریاست تسلیم کر لیتی تو اسے مفتی کہا جاتا (یہ باز نطینیوں کے دور سے چلا آتا تھا)۔ ہر جگہ میں حالات برابر ہی ہوتے' اور تدریس کی صورت یکساں رہتی۔

تقریباً" ۱۰۰ء کے قریب عذر خواہ اپنے تیقیتی اجداد کی طرف لوٹ آئے' طنائم سے امورائم کی طرف۔ وہ عدالتی نظام کے عظیم موجد تھے' اور دستور کے مفسر اور جامعین تھے۔ ۲۰۰ء کے بعد مرتب کردہ دستور ہی رومن قانون کا واحد ماخذ ہیں۔ یہ بھی ہلاکہ کی حیثیت کے حامل ہیں' یعنی ان کے علاوہ دیگر تمام قانونی مجموعے تلف کر دیے گئے۔ یہ خود مصنفین کے ہاتھ کے نوشتہ ہیں' اور اس لیے جمرا کے عین مطابق ہیں۔ جو مشنا کے خاکے کی حیثیت سے جلدی میں تحریر ہوئے تھے۔ یہ تمام جدید رجحانات قانونی ضابطوں اور تالمود میں بیک وقت شامل کر لیے گئے۔

عدالتی قانون اور دستوری قانون کے مابین فرق جو عرب۔ لاطینی استعمال میں پایا جاتا ہے۔ جیسٹینین کی تخلیقات میں وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے۔ تمام تلمیسات کا تعلق عدالتی قانون سے متعلق ہے۔ لازمی طور پر ان کے متون اصولیات پر مبنی ہیں۔ دستور اور اختراعات کا تعلق عہد نامہ جدید سے مذہبی رہنماؤں کی روایات میں سے کسی نہ کسی سے ہے۔

جہاں تک ہزارہا دساتیر کے مشرقی کردار سے تعلق ہے اب اس معاملے میں کسی کو کوئی شک نہیں کہ یہ سب عرب قانون کی تشریحات ہیں جنھیں متون میں پوشیدہ قوت ارتقا نے زندہ جاوید کر دیا۔ یہ اپنے مصنفین کے علم و فضل کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

عیسائی باز نطینی بادشاہوں کے متعدد احکام کیٹس فون کے شاہان فارس اور یہودی حکمرانوں کے فیصلے (وہ یہودی سردار جو شاہان فارس کے ماتحت تھے) جنھوں نے اپنا صدر مقام بابل کو بنا لیا تھا اور آخر میں خلفائے اسلام کے فیصلے جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے کسی طرح کم نہیں۔

جلد ہی یہ عادت بن گئی کہ قدیم شہری قوانین کے تحت فیصلے نہ کیے جائیں' بلکہ معاملات کی نوعیت کے پیش نظر تورات اور انجیل کے متون سے ضرورت کے مطابق حوالے دیے جائیں۔ اس سے کیا نشاندہی ہوتی ہے؟ ہمارے روم پسندوں کے لیے یہ ایک زوال کا نشان ہے۔ مگر اسے اگر عرب نقطہ نظر سے دیکھا جائے' تو یہ اس کے برعکس ہے۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ بالاخر عرب دنیا نے ایک اجنبی اور عائد کردہ قانون کو بالاخر اپنا بنا لیا اور اپنی ضروریات اور احساسات کے مطابق نئے قالب میں ڈھال لیا۔ اس واقعے سے عرب دنیا اور کلاسیکی روایات کے مابین عالمی احساس سے متعلق اختلاف کی نشاندہی ہوتی ہے۔

٦

جبکہ کلاسیکی قانون شہری ریاستوں نے اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر تشکیل کیا تھا۔ عربی قانون کا نزول

خدا کی طرف سے ہوا۔ خدا نے اس کا اظہار بعض منتخب اصحاب فکر و دانش کی وساطت سے کیا۔ عدالتی قانون اور دستور کے مابین رومی امتیاز بے معنی ہو کر رہ گیا (کیونکہ رومی قانون اور طریق عمل میں دستور بھی انسانی اعمال اور ردعمل کا نتیجہ ہے)۔ قانون خواہ وہ کسی بھی نوعیت کا ہو' روحانی ہو یا غیر مذہبی۔ جیسٹینین کے الفاظ میں (جو اس نے اپنی رہنمائے قانون (Digest) کی تمہید میں بطور آغاز لکھے ہیں) انسانی عمل اور ردعمل پر مبنی ہوتا ہے۔ کلاسیکی قانون کا استناد اس کی کامیابی پر مبنی ہے اور عربی قانون کا استناد ان راویان حدیث پر ہے جو ہر حدیث کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔(۳۴) جہاں تک انسانی احساس کا تعلق ہے یہ امر خاصی اہمیت کا حامل ہے کہ پیش نظر قانون اس کے کسی ساتھی کا تخلیق کردہ ہے یا عالم بالا سے نازل ہوا ہے۔ پہلی صورت میں تو ہر انسان کا یہ حق ہے کہ وہ اس قانون کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کر سکے کہ یہ درست ہے یا موجودہ حالات کے مطابق اس میں قوت کا فقدان ہو چکا ہے' مگر دوسری صورت میں تو خلوص دل سے اسے تسلیم کرنا ہو گا (اسلام کا مطلب ہے : اقرار ' تسلیم)۔ مشرق میں کوئی نہیں پوچھتا کہ قانون کا عملی مقصد کیا ہے۔ قاضی اور عوام کا تعلق منصف اعلیٰ (Practor) اور عوام کے رشتے سے بالکل مختلف ہے۔ ثانی الذکر اپنے فیصلے کی بنیاد اپنی تربیت یافتہ بصیرت اور آزمائے گئے تجربے پر رکھتا ہے جو اسے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہنے کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ مگر ثانی الذکر اس بصیرت پر عمل پیرا ہے جو اس کے اندر موثر ہے اور جبلی طور پر موجود ہے اور اس کے کلام سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں تحریری قانون ہی سے استفادہ کیا جاتا ہے' پرائٹر کا اپنے فرامین سے اور قاضی کا ماہر فقہا کے متون سے جو دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ طویل تجربے کا لب لباب یہ ہے کہ منصف اعلیٰ اپنے طویل تجربے سے استفادہ کرتا ہے' جبکہ قاضی کے پاس متن ایک قسم کی غیبی آواز ہے' جسے قاضی صرف باطنی طور پر ہی زیر بحث لا سکتا ہے کہ متعلقہ متن کا اصل مفہوم کیا تھا یا اس کی تشکیل کن حالات میں ہوئی۔ وہ نہ صرف الفاظ سے بحث کرتا ہے بلکہ حروف سے بھی۔۔۔۔۔ مگر ان کے روز مرہ استعمال میں معانی کی تلاش نہیں کرتا اور کسی ایسے جادوئی رابطے کی تلاش کرتا ہے جو ان کا مقدمہ زیر سماعت سے تعلق ثابت کر دے۔ ہم اس روحانی تعلق سے جو حروف سے قائم ہوتا ہے عہد عرفان سے شناسا ہیں۔ یہودیت' عیسائیت اور فارسی مکشوفات اور صوفیانہ ادب میں' نو فیثا غورثی فلسفے' قبالہ کے دور سے ہی واقف ہیں۔ اس میں ذرہ بھر بھی شک نہیں کہ آرمینیائی دنیا میں تمام معاملات خفیہ میں لاطینی اصطلاحات ہی ان کے اپنے اصل معانی میں استعمال ہوتی تھیں۔ یہ اعتقاد کہ ان اصطلاحات کے باطنی معانی بھی ہیں۔ خدائی روح پر ایمان کے ساتھ پیدا ہوا۔ مختلف (مذکورہ بالا) تحلیلی اظہار اس حقیقت کا نتیجہ ہے کہ عرب دنیا کے تمام مذاہب کے پاس حروف تہجی کا اپنا اپنا نظام تھا' جس میں یہ مقدس کتب تحریر کی جاتی تھیں۔ ہر قوم نے اپنا یہ نظام اپنے ساتھ قائم رکھا بلکہ اسے قومی نشان سمجھا۔ زبانیں تو بدل گئیں مگر حروف تہجی اپنی جگہ قائم رہے۔

مگر (اسلامی) قانون میں بھی فی نفسہ اس کی صداقت کے تعین کے لیے اتفاق رائے (اجماع) کا ہونا ضروری ہے۔ سلامی قانون کی سائنس نے یہ نظریہ منطقی نتائج کے تحت قائم کیا۔ ہم صداقت کی تلاش کرتے ہیں۔ ہر شخص اپنی ذات کی تسکین چاہتا ہے اور اس کے لیے غور و فکر کرتا ہے۔ مگر عرب علما عموی

اطمینان کے قائل ہیں جو سب کے لیے ہو۔ اس امر میں غلطی کا احتمال نہیں رہتا جبکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت بھی اس میں شامل ہو۔ اگر اتفاق رائے (اجماع) ہو جائے تو صداقت پر مہر لگ جاتی ہے۔ قدیم عیسائیوں ' یہودیوں اور اہل فارس کے لیے اجماع ہی کلیدی حیثیت کا حامل تھا۔ اجماع کا تصور ویلن ٹائن سوم (۴۲۶) کے لیے بھی کلیدی حیثیت کا حامل تھا۔ اکثر عالمی مورخین' ویلن ٹائن کا مذاق اڑاتے رہے ہیں لیکن وہ اس اصول کی روحانی بنیاد کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ یہ قانون متون کی تعداد کو محدود کر دیتا ہے' اور بالآخر ان کی تعداد کم کر کے پانچ کر دی گئی اور اس طرح اصول قانون وجود میں آیا۔ بالکل اسی مفہوم میں عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید میں قائم کیا گیا ہے۔ متون کی تلخیصات تیار کی گئیں جن کو قانونی مجموعے یا مستند کلیسائی قانون کا نام دیا گیا۔ اگرچہ اختلاف رائے موجود تھا مگر ویلن ٹائن کے قانون نے یہ بنیاد فراہم کر دی کہ کثرت رائے سب کو تسلیم کرنی ہو گی اور اگر متون کے مندرجات دونوں طرف برابر ہوں تو پوپ کے رائے پر فیصلہ ہو گا۔ شہری طریق کار کو عدالتوں نے کھل کر استعمال کیا اور جیسٹینین کی رہنمائے قانون اسی نقطہ نظر کی پیداوار ہے قانون کلیسا کا ایک متن فی نفسہ صداقت پر مبنی اور ترمیم و تنسیخ سے ماورئی ہے۔ مگر روح کی حقیقی ضروریات بدلتی رہتی ہیں۔ اس لیے اس میں اصلاح کا ایک خفیہ طریق کار بھی وضع کر لیا گیا۔ عدم ترمیم کا فسانہ بظاہر تو قائم رہا مگر فی الحقیقت دنیائے عرب کے تمام مذاہب کی تحریروں میں اسے پوری آزادی سے استعمال کیا گیا۔ اس میں عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید بھی شامل ہیں۔ (مصنف کی مراد تاویل ہے)۔

مارک انٹونی کے بعد عرب دنیا میں جسٹینین انتہائی تباہ کن شخصیت ہے۔ اپنے ہمعصر چارلس پنجم کی طرح' اس نے ہر اس کو تباہ و برباد کر دیا جس کی اس نے خواہش کی۔ جس طرح کہ مغرب میں ایک فاؤستی خواب تمام سیاسی رومانی تحریکوں میں جاری و ساری ہے کہ کسی طرح مقدس رومی سلطنت کو بحال کیا جائے اور جس کے باعث نپولین اور اس کے بعد کے عہد میں فہم و فراست پر سیاہ بادل امڈ آئے اور ۱۸۴۸ء میں پاگل شہزادگان بھی اس میں شامل ہو گئے۔۔۔۔۔ جسٹینین کو ذان کھانے کا جنون سوار تھا کہ وہ جلد از جلد اپنی کھوئی ہوئی سلطنت حاصل کر لے۔ وہ حقیقی دنیا' یعنی مشرق کی بجائے ہر وقت روم پر نگاہ لگائے رکھتا تھا' جو اس سے خاصے فاصلے پر واقع ہے۔ اس سے قبل بھی جب اسے تخت حاصل ہوا وہ پاپائے روم سے صلاح مشورے میں مصروف رہتا' جو خود بھی ابھی تک عیسائی سرداروں کا محتاج تھا اور اسے عیسائیت کا مذہبی سربراہ بھی تسلیم نہ کیا جاتا تھا۔ یہ پوپ ہی کی رائے پر ہوا کہ چالسے ڈون میں دوہرے علامتی اقتدار کو وجود ملا۔ ایک ایسا اقدام جس کی وجہ سے یک فطری ممالک کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابتدائی تعمیری اور فیصلہ کن دو صدیوں میں عیسائیت کو مغرب کے کلاسیکی علاقوں میں بہت فروغ حاصل ہوا جہاں پر کہ اعلیٰ طبقے کے ذہین افراد الگ تھلگ رہے۔ اس کے بعد قدیم عیسائی روح یک فطری اور نسطوری مسالک کی صورت میں تازہ ہو گئی۔ مگر جسٹینین نے اسے واپس اس کے منہ پر دے مارا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرق میں تحریک اصلاح کلیسا کی تحریک جاری ہو گئی۔ کچھ مدت بعد یہ ظاہر ہوا کہ اصلاح کی بنیاد عیسائیت نہیں بلکہ ایک جدید مذہب اسلام ہے اور عین اس وقت جب کہ مشرق کا رواجی قانون ضابطہ سازی کے لیے بالکل تیار

تھا اس نے لاطینی زبان میں ایک ضابطہ تیار کر لیا' جو زبان کی وجہ سے مشرق میں' اور سیاسی حالات کے پیش نظر مغرب میں' محض ایک ادبی تخلیق کے طور پر ہی قابل قبول سمجھا گیا۔

یہ تخلیق فی نفسہ' ڈراکوں اور سولون کے ضوابط کی طرح بہت آخری ایام میں منصہ شہود پر آیا اور مغرب میں اس کے مقاصد بھی سیاسی نوعیت کے تھے۔ چنانچہ رومی سلطنت کے دوبارہ قیام کا افسانہ بالکل بے معنی ثابت ہو۔ بیلی ساری اور فارسی لاطینی ضوابط وسی گوتھ نے یکجا کر دیے (تقریباً" ۵۰۰ء)۔ برگنڈی اور اوسٹرو گوتھ والوں نے رومیوں کو شکست دے دی اور اسی طرح باز نطینیوں میں بھی حقیقی رومی ضوابط کے حصول کی مخالفانہ کوشش کی۔ مشرق میں یہودیوں نے اپنا ضابطہ تالمود کے نام سے پہلے ہی مرتب کر لیا تھا۔ جبکہ محض اسی خیال سے کہ شاہی قانون کو تسلیم کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی' ایک علیحدہ ضابطہ بادشاہی کے حامیوں یعنی عیسائیوں کے لیے بھی ضروری تھا۔

کیونکہ نفس جائیداد کے نشیب و فراز اور تیکنیکی اغلاط کے ساتھ' اگرچہ ہر لحاظ سے مکمل ہے' پھر بھی عربی' یا باالفاظ دیگر ایک مذہبی دستاویز ہے' اگرچہ اس کی تخلیق عیسائیت کے مطابق ہوئی ہے مگر اس میں متعدد ملحقات ہیں۔ فی الحقیقت وہ تمام دستور جو کلیسائی قانون سے متعلق ہیں جو تھیوڈوری ضابطے میں بھی ختم کر دی گئی ہیں' اب بطور تمہید آغاز میں کر دی گئیں اور کئی ناولوں میں بھی بطور حرف آغاز شامل کر لی گئیں۔ پھر بھی یہ کتاب حرف آغاز نہیں بلکہ اختتامیہ ہے۔ لاطینی جو اپنی قدر و قیمت کھو چکی تھی' اب غائب ہو گئی اور قانون میں اس کا استعمال ختم ہو گیا (بلکہ ناول بھی یونانی میں لکھے جانے لگے اور اس کے بعد جو تخلیق بھی لاطینی میں ہوئی' غلط رہی۔ مگر تاریخ قانون کی کتب میں وہی راستہ اختیار کیا گیا جو شامی اور رومی قانونی کتب میں اختیار کیا گیا تھا اور آٹھویں صدی میں جو انداز اختیار کیا گیا' وہ وہی تھا' جو اٹھارھویں صدی تک جاری رہا۔ بادشاہ لیو اور فارس کے اسقف اعظم جیسو باشٹ کا قانون اسی اسلوب میں لکھے گئے۔(۴۰) یہی وہ دور تھا جبکہ عظیم مسلمان فقیہہ امام ابو حنیفہ نے اپنی عظمت کا لوہا منوایا۔

تھا اس نے لاطینی زبان میں ایک ضابطہ تیار کر لیا' جو زبان کی وجہ سے مشرق میں' اور سیاسی حالات کے پیش نظر مغرب میں' محض ایک ادبی تخلیق کے طور پر ہی قابل قبول سمجھا گیا۔

یہ تخلیق فی نفسہ' ڈراکوں اور سولون کے ضوابط کی طرح بہت آخری ایام میں منصہ شہود پر آیا اور مغرب میں اس کے مقاصد بھی سیاسی نوعیت کے تھے۔ چنانچہ رومی سلطنت کے دوبارہ قیام کا افسانہ بالکل بے معنی ثابت ہو۔ بیلی ساری اور فارسی لاطینی ضوابط وسی گوتھ نے یکجا کر دیے (تقریباً" ۵۰۰ء)۔ برگنڈی اور اوسٹرو گوتھ والوں نے رومیوں کو شکست دے دی اور اسی طرح باز نطینیوں میں بھی حقیقی رومی ضوابط کے حصول کی مخالفانہ کوشش کی۔ مشرق میں یہودیوں نے اپنا ضابطہ تالمود کے نام سے پہلے ہی مرتب کر لیا تھا۔ جبکہ محض اسی خیال سے کہ شاہی قانون کو تسلیم کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی' ایک علیحدہ ضابطہ بادشاہی کے حامیوں یعنی عیسائیوں کے لیے بھی ضروری تھا۔

کیونکہ نفس جائیداد کے نشیب و فراز اور تیکنیکی اغلاط کے ساتھ' اگرچہ ہر لحاظ سے مکمل ہے' پھر بھی عربی' یا باالفاظ دیگر ایک مذہبی دستاویز ہے' اگرچہ اس کی تخلیق عیسائیت کے مطابق ہوئی ہے مگر اس میں متعدد ملحقات ہیں۔ فی الحقیقت وہ تمام دستور جو کلیسائی قانون سے متعلق ہیں جو تھیوڈوری ضابطے میں بھی ختم کر دی گئی ہیں' اب بطور تمہید آغاز میں کر دی گئیں اور کئی ناولوں میں بھی بطور حرف آغاز شامل کر لی گئیں۔ پھر بھی یہ کتاب حرف آغاز نہیں بلکہ اختتامیہ ہے۔ لاطینی جو اپنی قدر و قیمت کھو چکی تھی' اب غائب ہو گئی اور قانون میں اس کا استعمال ختم ہو گیا (بلکہ ناول بھی یونانی میں لکھے جانے لگے اور اس کے بعد جو تخلیق بھی لاطینی میں ہوئی' غلط رہی۔ مگر تاریخ قانون کی کتب میں وہی راستہ اختیار کیا گیا جو شامی اور رومی قانونی کتب میں اختیار کیا گیا تھا اور آٹھویں صدی میں جو انداز اختیار کیا گیا' وہ وہی تھا' جو اٹھارھویں صدی تک جاری رہا۔ بادشاہ لیو اور فارس کے اسقف اعظم جیسو باشٹ کا قانون اسی اسلوب میں لکھے گئے۔ یہی وہ دور تھا جبکہ عظیم مسلمان فقیہہ امام ابو حنیفہ نے اپنی عظمت کا لوہا منوایا۔

۷

جیسٹینن کی تخلیقات کی مکمل آزادی ہی سے مغربی قانون کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ دور مکمل غفلت کا دور تھا۔ اس لیے اس کی کوئی اہمیت بھی نہ تھی۔ فی الحقیقت اس دور کے عظیم کارنامے "رہنمائے قانون" کا بھی صرف ایک نسخہ باقی ہے جو ایک حادثے (بدقسمتی سے بھی) تقریباً" ۱۰۵۰ء میں دستیاب ہو گیا۔

قبل از ثقافت دور میں (۵۰۰ء) متعدد جرمن قبائل کے متعدد مجموعہ ہائے قوانین کی تشکیل ہوئی' وسی گوتھک' آسٹرو گوتھک' برگنڈ ئین' فرا نکش اور لمبارڈ۔ یہ اس یہودی قانونی ادب کے ہمعصر تھے' جو عربی زبان میں لکھا گیا۔ کتب مشکوک یا شعائر محرقہ (۶۲۱ء جو کم و بیش رومن کیتھولک فرقے کے شعائر محرقہ

۲۶ - ۱۲ کے مطابق ہیں) اور تاریخ زیادہ (۴۵۰ء جو دوم' سوم اور چہارم خمسہ موسیٰ کی صورت میں موجود ہیں)۔ دونوں کا تعلق بنیادی اہمیت کی اقدار سے ہے کیونکہ ان میں قدیم حیات کے دور میں خاندان اور جائیداد منقولہ کی تفصیلات درج ہیں اور ان دونوں ہی نے اگرچہ عامیانہ انداز میں مگر نہایت ہوشیاری سے کسی قدیم قانون سے استفادہ کیا ہے۔ یہودیوں نے (اور بلاشبہ اہل فارس اور دیگران نے بھی) جو کام اہل بابل پر کیا ہے۔ اور جرمنوں نے رومی شہروں کے حوالے سے تحقیق کی ہے جس کے متعلق چند آثار دستیاب ہیں۔

رومی عروج کے دور میں سیاسی زندگی' جس میں کسان' جاگیردار' اور سادہ شہری قوانین مروج تھے جلد ہی تین مختلف شعبوں میں اپنا اظہار کرنے لگی جو آج تک نمایاں چلے آتے ہیں۔ ان میں قانون بھی شامل ہے مگر مغرب میں ابھی تک ایسی کوئی تاریخ قانون وجود میں نہیں آئی جس میں اس قانونی ترقی کی اہمیت پر گہری نظر ڈالی گئی ہو۔

اس ضمن میں سب سے اہم' ان سیاسی قضایا کے باوجود' جن میں اس کی شمولیت کا بھی ذکر موجود ہے' نارمنی قانون تھا۔ اسے فرا نکش سے مستعار لیا گیا تھا۔ ۱۰۶۶ میں انگلستان کی فتح کے بعد' اس کی اصل سیکسن وطن سے باہر نکال دیا گیا' اور اسی روز سے "انگلستان میں بڑے لوگوں کا قانون ہر شخص کا قانون قرار پایا۔" خالص جرمن انداز فکر کے مطابق یہ واقعہ تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے' کہ یہ جاگیردارانہ روایت عام اداروں میں منتقل ہو گئی اور آج کناڈا' ہندوستان' آسٹریلیا' جنوبی افریقہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکا میں بھی قانون پر اس کا اثر پایا جاتا ہے۔ مغربی یورپ میں اختیارات کی تفویض کے علاوہ اس کی تدریجی قدر بھی موجود ہے۔ دیگر صورتوں کے علاوہ اس کی ترقی نظریاتی قانون دانوں کے ہاتھ میں نہیں رہی۔ آکسفورڈ میں قانون کی تعلیم میں اس کی اجازت نہ تھی' کہ عملی کام کو ہاتھ لگایا جائے' اور مرٹن میں ۱۲۳۶ء میں اعلیٰ خاندانوں کے لوگ اسے نفرت سے مسترد کر دیتے۔ عدالتوں نے بھی تخلیقی روایات کے ذریعے قدیم قانونی مواد کو تشکیل کرنا شروع کر دیا اور یہ عملی فیصلے ہی تھے (رودادیں) جن کی بنا پر قانونی کتب تیار ہونے لگیں۔ جیسا کہ بریکٹن کی کتاب جو عام ہے۔ اس وقت سے لے کر آج کے دن تک قانون موضوعہ نے عدالتی فیصلوں کی وجہ سے زندگی اور ترقی حاصل کی اور عمومی قانون جو ہمیشہ مقننہ کے رحم و کرم پر ہوتا ہے اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا ہے۔ خواہ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو' کیونکہ عوامی نمائندگان کی مجلس قانون ساز کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ہر سال ایک بڑا قانون وضع کرنے کی کوشش کرے۔

جنوب میں رومی - جرمن ' مذکورہ ضوابط غالب رہے۔ جنوبی فرانس میں وسی گوتھک (جسے فرا نکش ڈرویٹ کونٹیو میر شالی کے مقابلے میں ڈرویٹ اکرٹ کہا جاتا تھا) اور اطالیہ میں لیمبارٹ (جو کہ ان سب میں سب سے زیادہ اہم تھا' اور تقریباً" سب کا سب جرمن تخلیق تھا تحریک احیائے علوم تک قائم رہا)۔ جرمن قانون کے لیے پاویہ کو مرکز تدریس کا درجہ حاصل ہو گیا جس میں ۱۰۷۰ء میں "پوزیشیو" کے نام سے ایک

مبسوط قانونی کتاب تالیف ہوئی' جسے اس دور میں بجا سہ قانون کی سائنس میں بہت بڑا کارنامہ قرار دیا گیا۔ اور اس کے فوراً" بعد ایک اور ضابطہ لومبارڈا کے نام سے وجود میں آیا۔ تمام جنوب کی قانونی ترقی کا تسلسل اس وقت ٹوٹ گیا جب نپولین کا ضابطہ دیوانی اس کی جگہ لے گیا۔ مگر یہ تصنیف تمام لاطینی ممالک میں بلکہ ان سے بھی آگے مزید کام کے لیے بنیاد کی حیثیت اختیار کر گیا اور انگریزی کے بعد یہ اہم ترین زبان بن گئی۔

جرمنی میں ۱۲۳۰ تا ۱۲۷۴ء رومی قبائلی قوانین کے حق میں ایک زبردست تحریک چلی لیکن اس کا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ متعدد معمولی نوعیت کے علاقائی معاشرتی حقوق کے مطالبات زور پکڑ گئے یہاں تک کہ اس کے خلاف برہمی کی فضا پیدا ہو گئی۔ کیونکہ جائز مطالبات کے ساتھ غیر حقیقی سیاسی' رومانیت کا خواب اور جوش و خروش ظاہر ہونے لگا اس وجہ سے شہنشاہ میکسی میلین ان کے ساتھ اور قانون فریق ثانی کے ساتھ ہدف بن گیا۔ سلطنت روما کی مجالس قانون ساز کو ۱۴۹۱ء میں اطالیہ کے نمونے پر قائم کیا گیا۔ اب نہ صرف جرمن سرزمین پر مقدس رومی سلطنت کا مسئلہ تھا' بلکہ جرمن قانون عمومی اور رومی قانون کا تنازعہ بھی پیدا ہو گیا۔ قدیم جرمن طریق کار کو اطالوی طریق کار سے بدل دیا گیا۔ اب جج صاحبان کے لیے کوہ ایلپس کے دوسری طرف جا کر قانون پڑھنا ناگزیر ہو گیا۔ اور اب وہ اپنے تجربے کے لیے اپنے محیط زندگی کی بجائے لسانیات کی منطق کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئے۔ اس ملک میں بعد ازاں ایسے لوگ وجود میں آ گئے جنھوں دینی حقائق کے مقابلے میں غیر حقیقی قانونی محراب کا دفاع کرنا پڑا۔

ان بڑے بڑے ناموں کی گھن گرج کے تحت وہ کیا شے تھی' جو مٹھی بھر اطالوی دانش وروں کی وساطت سے دستیاب ہوئی؟ تقریباً" ۱۱۰۰ء کے لگ بھگ بولوگنا کی یونیورسٹی نے جو کہ ایک جرمن ادارہ تھا" مجموعہ قوانین کا ایک عجیب و غریب مسودہ تیار کیا جس کا مقصد مختلف الانواع کلیسائی قوانین کو یکجا کرنا تھا۔ اس نے لومبارڈ کے طریق کار کو جدید اسلوب میں پیش کیا۔ اس کی صداقت کو ارسطو اور بائبل کے برابر تسلیم کیا گیا۔ صداقت!----- مگر لاطینی ادراک اور لاطینی زندگی کی ترجمانی میں بندھی ہوئی۔ کوئی شخص متن کی روح تک دور دور تک بھی رسائی حاصل نہ کر سکا کیونکہ ان متون میں جو اصول بیان کیے گئے تھے وہ شہری ریاستوں کے قانون کے اصول تھے' جو حد سے زیادہ مہذب تھیں' شارحین کے مدارس فکر' کلیسیا کے عمومی قانون کی طرح مقاصد کی تفہیم کی ضرورت پر عمل پیرا تھے۔ گویا کہ تنہا وہی تھے' جن کے پاس حقیقی اور اصلی عالمی صداقتوں کا ذخیرہ تھا۔ اشیا کی صورت میں نہیں' بلکہ عالمی تصورات کے وہی مالک تھے۔ پس ان کا دعویٰ تھا کہ قانون رواج اور عمل کے لحاظ سے قابل نفرت ہے۔ اس کا علم لومبارڈا کی بجائے ان کے وضع کردہ تجریدی تصورات کے تحت ہی ہو سکتا ہے۔ ان کا اس کتاب کے متعلق ذوق و شوق محض منطقی حد تک تھا۔ ان کے ذہن میں یہ بات کبھی نہیں آئی کہ اُنھیں اپنا سم حقیقی زندگی میں بھی استعمال کرنا چاہیے۔ یہ صرف ۱۳۰۰ء کے بعد ہوا کہ ان کا لومبارڈو کے خلاف تیار کردہ مواد اور قانونی تلخیصات ایسے شہروں تک پہنچے جہاں احیائے علوم کی تحریک کے اثرات تھے۔ روم کے دور آخر کے ایک قانون دان بردطولوس نے یہ

ہمت کی کہ جرمن قانون کی تمام مبادیات کو عملی ارادے کے ساتھ مرتب کیا اور اس میں حقیقت پسندانہ تصورات کو اجاگر کیا۔ اس میں ڈریکون کے ضابطے کے طرح تھیوڈوزی اس سے لے کر جسٹینین تک کے شاہی فرامین شامل کر دیے اور اس طرح اس حقیقت پسند ثقافت کا آغاز ہوا' جو دلیز پر محو انتظار تھی۔ یہی برطولوس کی کوشش تھی جو ہسپانیہ اور جرمنی میں رومی قانون کے نام سے اثر انداز ہوئی۔ صرف فرانس میں عہد باروق کے ارباب عدل کو جاسی اس اور ڈونے لوکس کے بعد کلیسیائی قانون کو ترک کر کے دوبارہ علم کلام اور باز نطینی متن کی طرف مراجعت کر گئے۔

لیکن اس نعرہ بازی نے ارزی اس کی کامیابی کے علاوہ تجرید کی کامیابی کا بھی مشاہدہ کیا۔ ایک ایسا امر جو فیصلہ کن مزید کامرانیوں کا ذریعہ ثابت ہوا۔ مشہور فیصلہ کن فرمان جسے گراٹیان نے ۱۱۴۰ء کے قریب لکھا اس کی وجہ سے مغرب میں قانون روحانیت وجود میں آیا کیونکہ اس نے قدیم مجوسی اور رومن کیتھولک قانون میں اصطباغ کا تصور پیش کیا۔ جو قدیم عربوں میں مروج تھا۔ اس رواج کو نظام میں شامل کر کے اس نے جدید کیتھولک مجوسی عیسائیت کو عدالتی اظہار کے مطابق وجود عطا کیا۔ اس سے قدیم قربان گاہ اور اصطباغ اعلیٰ اور مذہبی رہنماؤں کی تقدیس وجود میں آئی اور ۱۲۳۴ء کے استرا چھال کے ساتھ قانون کلیسا کے تحت معدلہ کی تکمیل ہو گئی جو کچھ سلطنت حاصل کرنے میں ناکام رہی---- یعنی ایک ابتدائی نوعیت کے قبائلی قانون کی فراخی یعنی "جرمن قانون معدلت" اسے پوپ کے ادارے نے حاصل کر لیا۔ یہ قانون مکمل طور پر نجی حیثیت سے وجود میں آیا۔ اس میں رومی کلیسیائی اور غیرمذہبی قانونی مواد کو جرمن طریق کار کے مطابق استعمال کیا گیا۔ یہی وہ قانون ہے جو آج کل برطولوس کے بعد رومن کہلایا اور جسے جسٹینین کے متون کو استعمال کیا گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نظام عدل میں بھی وہ شدید اختلافات موجود ہیں' جو فاؤستی معاشرے میں زندگی کے ہر پہلو کی خصوصیت ہیں جن کی بنا پر پاپائیت اور سلطنت میں ایک بہت بڑا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ انتظامیہ اور عدلیہ کا تنازعہ جو عرب دنیا میں ناممکن سمجھا جاتا ہے مغربی دنیا میں ناگزیر ہے۔ تسخیر لامتناہیت کے یہ دو مختلف طریقہ ہائے اظہار ہیں جنھوں متنازعہ بنا لیا گیا ہے مگر دنیاوی قانون سازی کے عمل کی جڑیں رواج میں ہیں اور ان کا ہدف مستقبل کی نسلیں سمجھی جاتی ہیں۔ جبکہ روحانی قانون کا آغاز عمل اساطیری یقین سے ہوتا ہے جو وقت کی پابندیوں سے ماوریٰ ہے اور دوامی قانون کی حیثیت کا حامل ہے۔ دو برابر کے جوڑوں کے مابین یہ جنگ کبھی ختم نہیں ہوئی اور یہ آج بھی ہمارے عائلی قوانین میں جاری ہے اور شادیاں گرجا گھروں اور عدالتوں دونوں مقامات پر ہو رہی ہیں۔

باروق عہد کے ظہور تک' زندگی نے شہری نظام حیات اور زر کی معاشرت کو قبول کر لیا تھا اور ایک ایسے قانون کی طلب وجود میں آ گئی تھی' جو سولون کی طرز پر کلاسیکی شہری ریاستوں کی نوعیت کا ہو۔ اب ایسے قانون کی روک تھام کی وجوہات بالکل واضح تھیں۔ مگر یہ روم کی بدقسمت روایت تھی' کہ ایسے قانون کی تخلیق کو محض پڑھے لکھے طبقے کا مفاد ہی سمجھا جاتا تھا اور کوئی شخص اس مفاد کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔

شہری عقلیت پسندی' جیسا کہ رواقیوں اور صوفیسطائیوں کے ساتھ ہوا تھا' قانون فطرت کی طرف مائل ہو گئی۔ اس کی بنیاد "اولڈن ڈراپ" اور "بوڈی نس" نے رکھی جسے بعد میں ہیگل نے تباہ کر دیا۔ انگلستان میں کوک اعظم نے بڑی کامیابی سے جرمنی کے خود مدافعتی عملی قانون کا دفاع کیا اور ٹیوڈر بادشاہوں کے ان اقدامات کو غیر موثر بنا دیا جو وہ ماہرین کی آراء پر مشتمل (ڈائجسٹ) کو رائج کرنے کے لیے کر رہے تھے۔ مگر براعظم کے اندر رومی نوعیت کے قوانین کی تشکیل رائج کر دی گئی جس میں جرمن ضوابط بھی شامل تھے اور فرانس میں بھی قدیم قوانین کو رائج کر دیا گیا' جن پر نپولین کے ضوابط کی بنیاد رکھی گئی اور اس کے بعد قانون انگلستان پر بلیک سٹون کی تشریحات (۱۷۶۵ء) کی صورت بعینہ وہی ہے' جو جرمن ضوابط کی تھی اور یہ اس وقت وجود میں آئیں' جبکہ فاؤستی ثقافت' تہذیب کی دہلیز تک پہنچ چکی تھی۔

۸

اب جبکہ میں اپنا مقصد حاصل کر چکا ہوں اور اپنے اردگرد نگاہ دوڑاتا ہوں میرے سامنے تین قانونی تواریخ ہیں' جو محض الفاظ اور ترکیبی لحاظ سے باہم مربوط ہیں۔ ہر ایک نے اپنا مواد دوسروں سے حاصل کیا ہے' مگر یہ ظاہر نہیں کیا کہ اجنبی مواد کی نوعیت کیا ہے۔ ان میں سے دو تواریخ مکمل ہیں اور تیسری وہ ہے جس میں کہ خود ہم کھڑے ہیں۔ بلکہ ایک فیصلہ کن مقام پر کھڑے ہیں۔ جہاں سے کہ ہمارے عظیم الشان سفر کا آغاز ہوتا ہے' یعنی روم اور اسلام۔ ان دونوں میں سے ہر ایک اپنے اپنے وقت میں کامیابی سے ہم کنار ہوا جس کا ہم نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔

اب تک ہمارے لیے رومی قانون کی کیا اہمیت رہی ہے؟ اس نے کیا خرابی کی ہے؟ اور مستقبل میں ہمارے لیے اس کی کیا اہمیت ہے؟

ہماری قانونی تاریخ ایک بنیادی مقصد کے تحت چلتی ہے جو زندگی اور کتاب کے مناقشے پر مبنی ہے۔ مغرب کی کتاب الہامی نہیں یا یہ کوئی مجوسی متن ہے' جس میں باطنی معانی بھی ہیں بلکہ یہ ایک محفوظ تاریخ ہے۔ یہ ماضی منجمد شکل ہے جسے مستقبل بننے کی آرزو ہے۔ یہ آرزو ہماری معرفت پوری ہو گی۔ ہم اس کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے مطالب ہمارے ساتھ زندہ ہیں۔ فاؤستی انسان کلاسیکیوں کی طرح اپنا ہدف آغاز زندگی ہی سے خود کفتی تکمیل حیات نہیں رکھا' بلکہ وہ ایسی حیات کا آرزومند ہے جس کی جڑیں ماضی بعید میں دور تک ہوں اور جو مستقبل میں اس کے بعد دیر تک قائم ہے۔ رومی انسان کے لیے جیسا کہ وہ اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوا کہ وہ اپنا رابطہ تکوین یا تاریخ سے استوار کرے' بلکہ وہ ان کے ساتھ رابطے کے لیے کس سمت کی طرف دیکھے۔ اسے ماضی کی ضرورت تھی تاکہ وہ حال میں معانی اور گہرائی کا مشاہدہ کر سکے۔ روحانی طور پر جو ماضی اس کے سامنے آیا۔ وہ اسرائیل کا ماضی تھا اور دنیاوی لحاظ

سے یہ اس کی اپنی قدیم تاریخ تھی، جس کے آثار اسے اپنے اردگرد نظر آتے رہے۔ جن امور کا احترام کیا گیا وہ اس لیے کہ وہ عظیم تھے۔ بلکہ اس لیے کہ ان کا تعلق ماضی سے تھا اور وہ بھی ماضی بعید سے۔ اگر ان لوگوں نے مصر کو دیکھا ہوتا، تو روم کی طرف وہ توجہ بھی نہ کرتے اور ہماری زبان ثقافت کا ارتقا مختلف انداز میں ہوتا۔

چونکہ یہ قارئین کی کتابی ثقافت تھی اس لیے کلاسیکی متون زندگی ہر میدان میں حاصل کیے گئے، جیسا کہ جرمنی میں رومی قانون کو خوش آمدید کہا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا مزید ارتقا نیم دلانہ سست رفتاری کا شکار ہو گیا اور اظہار ذات کی تمنا ختم ہو گئی۔ ارسطو، اقلیدس اور مجموعہ قوانین، کا اس ثقافت میں مطلب یہ نکلا (مجوسی مشرق میں یہ مختلف تھا) کہ ہماری اپنی فکر کے لیے ایک تیار شدہ وسیلہ دستیاب ہو سکے اور اس میں کسی قسم کی تاخیر نہ ہو۔ یعنی تاریخی طور پر تیار کردہ اور تصورات کا غلام انسان تیار ہو سکے۔ یقیناً" اجنبی انداز فکر اس کے تخیل میں جگہ نہ بنا سکتا بلکہ وہ اس کے اپنے احساس حیات کے لیے ایک رکاوٹ اور طبعی زور کلام کے لیے سد راہ ثابت ہوا۔

جہاں تک قانونی فکر کا تعلق ہے، یہ کسی مادی شے سے منسلک ہوتی ہے۔ اس کے سامنے کسی شے کا ہونا ضروری ہے جس کی بنا پر تجریدی تصورات وجود پائیں۔ کوئی شے موجود ہو گی تو اس کا تجریدی تصور ہو گا اور یہ مغربی اصول قانون کی بدقسمتی ہے کہ بجائے اس کے کہ مضبوط معاشرتی اور معاشی حیات سے استفادہ کرنے کے، اس نے قبل از وقت تجریدی لاطینی تحریروں سے استفادہ کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ مغربی عدالتی ماہر، لسانیات کا ماہر بن گیا اور اسے زندگی کے عملی تجربے کی بجائے خالص عالمانہ تجربہ حاصل ہوا، یعنی خالص منطقی تحلیل و ترکیب کا ذوق، جس کے تحت قانونی تصورات کی بنیاد قائم ہوئی، اس کا سرمایہ حیات قرار پایا۔

اس عمل کی وجہ سے ہم حقائق زندگی سے بالکل منقطع ہو کر رہ گئے ہیں کیونکہ نجی قانون ہی اپنے دور کے معاشرتی اور معاشی حقائق کی نمائندگی کرتا ہے۔ نہ تو نپولین کا ضابطہ اور نہ پروشیا کا مجموعہ قوانین اور نہ گروٹی اس اور موم سین، حقیقی طور پر اس حقیقت سے آشنا تھے۔ نہ تو قانونی پیشے کی تربیت کے دوران اور نہ ہی اس کے ادب میں ہمیں اس حقیقی، قابل جواز قانون سے کوئی تعلق نظر آتا ہے اور اس کے نتیجے میں ہمارے پاس جو نجی قانون موجود ہے وہ مرحوم کلاسیکی معاشیات سے متعلق ہے اور اس میں وہ تمام شدید تلخی موجود ہے، جو سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت پر مبنی ہے۔ میرے خیال میں اشتمالیت کا نام عالمانہ نظام عدل کی پیداوار ہے اور ان اثرات کے تحت پڑھا لکھا طبقہ اسے تمام اہم ترین تصورات بطور شخص، شے، اور جائیداد اور کلاسیکی حیات کے ذوق و شوق کے مربوط کر لیتا ہے۔ کتاب، ادراک اور حقائق زندگی کے مابین حائل ہو جاتی ہے۔ کتاب کا قاری معاملات زندگی کو پڑھی ہوئی کتاب کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ اور اس طرح وہ آج کے دن تک تمام واقعات کو کلاسیکی پیمانے پر ناپتا ہے۔ وہ شخص جو محض فعال ہے مگر اسے متعلقہ کام کی تربیت حاصل نہیں وہ اپنے ذہن میں سمجھتا ہے کہ اس کا نقطہ نظر صحیح طور پر سمجھا نہیں گیا۔ اسے متعلقہ عہد

کی زندگی اور اس کے متعلق قانون کے نقطہ نگاہ میں رد نظر آتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ جو لوگ اس صورت حال سے ناجائز فائدہ اٹھا گئے ہیں وہی اس کے نقطہ نظر کے خلاف تحریک کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

دوبارہ یہ سوال اٹھایا جائے کہ مغربی قانون کس کی طرف سے اور کس کے لیے تخلیق کیا گیا ہے؟ رومی منصف اعلیٰ تو ایک جاگیردار تھا یا فوجی افسر تھا۔ وہ ایک ایسا شخص جسے انتظامیہ کا تجربہ حاصل تھا اور مالی معاملات میں بھی ماہر تھا اور محض اسی تجربے کی بنا پر اسے قانون سازی اور قانون نافذ کرنے کے فرائض تفویض کیے گئے تھے۔ پیریگرن نامی منصف اعلیٰ نے جو اجنبیوں کے لیے قانون تجارت تشکیل کیا وہ اس مشاورت کا نتیجہ تھا جو تاجروں سے کلاسیکی شہروں کے تجارتی قانون کی روشنی میں ہوئی، اس کے لیے نہ کوئی منصوبہ بندی کی گئی اور نہ کسی مخصوص رجحان کا دباؤ تھا۔ صرف وہ معاملات جو موقع پر زیر غور آئے صرف انھیں پر بحث ہوئی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

مگر فاؤستی معاشرہ عزم دورانیہ کے لیے کتاب کا مطالبہ کرتا ہے۔ ایک ایسی کتاب جس کا جواز ہو، اور جو مستقل ہو ۔ ایک ایسا نظام جو ہر آئندہ معاملے میں امکانی حد تک مددگار ثابت ہو۔ یہ ایک ایسی کتاب ہو جو علم کا شاہکار ہونے کے ساتھ ساتھ قانون پیشہ حضرات اور فاضل جج صاحبان کے لیے قابل رہنمائی ہو اور ان لوگوں کے لیے جو مختلف شعبہ ہائے تدریس قانون کے سربراہ ہیں، قدیم جرمن قانونی خاندان، اور فرانسیسی شرفا، الغرض سب کے لیے پسندیدہ ہو۔ انگریز جج صاحبان جن کی تعداد بمشکل ایک سو ہو گی۔ نگران کا درجہ سرکاری عہدہ داروں میں سے بیشتر پر فوقیت کا حامل ہے۔

عالموں کی جماعت دنیا داروں میں اجنبی ہوتی ہے اور یہ اس تجربے کو حقارت سے دیکھتے ہیں جو فکر کی پیداوار نہ ہو۔ بلاشبہ کیفیت علم (جیسا کہ ایک عالم اسے قبول کرتا ہے) اور رواج کی رفتار میں جس کا تعلق عملی دنیا سے ہے، اختلاف کا ہونا ناگزیر ہے، ار نرسی اس کا ایک مسودہ اتنا کامیاب ہوا کہ صدیوں تک ماہر قانون دانوں کی رہنمائی کرتا رہا۔ انگلستان میں بھی جہاں یورپی معانی میں قانون کے تدریسی شعبہ جات نہیں ہیں۔ یہ قانون پیشہ افراد ہی تھے جنھوں نے مستقبل کی ترقی کی رہنمائی کی اور یہ کہ کسی ملک میں قانون ترقی کر رہا ہے اس کا اندازہ عوامی زندگی کی ترقی کو دیکھ کر ہوتا ہے۔

اب تک ہم نے جس شے کو عدل کی سائنس کہا ہے وہ یا تو فی الحقیقت قانونی زبان کی لسانیاتی تشریح ہے یا قانونی تصورات کا عالمانہ شعور ہے۔ اب تو یہ سائنس ہی کا فریضہ ہے کہ وہ زندگی سے ازلی اور ابدی معانی کا جواز فراہم کرے اور اصول وضع کرے۔ آج کا جرمن اصول قانون (بقول سوہم زیادہ تر سلواکیوں کے ازمنہ وسطیٰ کی روایات کی نمائندگی کرتا ہے، ابھی تک ہم نے اپنی زندگی کی بنیادی اقدار پر صدق دل سے غور کرنے کا آغاز نہیں کیا اور قانونی نظریات کو زندگی کے حقائق سے وابستہ نہیں کیا۔ ہم ابھی تک یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ اقدار کیا ہیں۔

یہاں پر یہ فرض منصبی عائد ہوتا ہے کہ مستقبل کی جرمن فکر اسے سرانجام دے۔ زمانہ حال کی عملی زندگی سے اسے انتہائی سنجیدہ اصول زندگی کو معراج عطا کرنا ہوگی تاکہ وہ بنیادی قانونی تصورات کو معراج بخشے۔ اگر ہمارے عظیم فنون ماضی میں رہ گئے ہیں' تو عظیم اصول قانون ابھی باقی ہے۔

انیسویں صدی میں جو کام ہوا ہے خواہ وہ کتنا بھی تخلیقی سمجھا گیا ہو وہ محض ابتدائی تھا۔ اس نے ہمیں جسٹینین کی کتاب سے آزاد کر دیا ہے۔ رومی قانون کے تصورات' ماہرین کے نزدیک اب کسی شمار میں نہیں آتے۔ ان کی حیثیت محض آثار قدیمہ کی ہے۔ یہ ایک اور نوعیت کا اصول قانون ہے' جس کی اب ہمیں خاکہ سازی سے نجات کے لیے ضرورت ہے۔ لسانیاتی مہارت کو معاشرتی اور معاشی علوم کے لیے جگہ خالی کرنی چاہیے۔

جرمن دیوانی اور فوجداری قانون پر نظرڈالنے سے صورت حالات واضح ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ قوانین خفیفہ کا ایک ضمیمہ منسلک ہے۔ یہ ناممکن تھا کہ اسے اصل قانون میں شامل کیا جا سکتا۔ تصوراتی اور اس لیے ترکیبی طور پر اس مواد کو جسے کلاسیکی ترتیب سے سمجھا نہ جا سکا' اسے علیحدہ کر دیا گیا تاکہ سمجھ میں آسکے۔

یہ عجیب بات ہے کہ ۱۹۰۰ء میں برقی قوت کی چوری کو اس لیے عبوری قانون کے تحت زیر سماعت لایا گیا کیونکہ یہ طے نہ ہو سکا کہ کیا زیر بحث شے مادی ہے یا غیرمادی۔ یہ کیوں نہ ہو سکا کہ ایسے معاملات کو قانون ایجادات میں شامل کر لیا جاتا؟ حق اختراع کا قانون اسی مسئلے میں کار آمد کیوں نہ ہو سکا؟ یہ بھی تو ایک دماغی کاوش ہے' یہ قابل ابلاغ ہے اور اس سے چھپائی کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ اشیا کے قانون کے برعکس کسی فنی شاہکار کی تصویر بنا لینا کیوں اصل کی چوری سے علیحدہ تصور کیا گیا ہے؟ کسی تجارتی تصور کو چرا لینا یا بے ایمانی سے استعمال کرنا کیوں قابل سزا نہیں ہے؟ جبکہ وہ کاغذ کا پرزہ جس پر یہ تصور مرقوم ہے' چوری کر لینا قابل سزا ہے۔ کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم آج تک اشیا کے متعلق کلاسیکی تصورات کے غلام ہیں۔ اگرچہ ہمارا اسلوب حیات مختلف ہے۔ ہمارا جبلی تجربہ عملی تصورات کے تحت ہے مثلاً قوت عمل' قوت ایجاد' مہم جوئی' خواہ وہ ذہنی ہو یا جسمانی' فنی یا تنظیمی' توانائی' قوت عمل' یا مہارت ۔ طبیعیات میں (جس میں نظریاتی طور پر ترقی یافتہ فکر کا وجود پایا جاتا ہے مگر یہ ہماری زندگی کی موجودہ کیفیت کے مطابق ہے) جسم کے متعلق ہمارے قدیم تصورات کا وجود اصولاً" ختم ہو گیا ہے۔ جیسا کہ برقی قوت کی مثال دی جا چکی ہے۔ ہمارا قانون تصوراتی طور پر مجبور کیوں ہے؟ اور وہ موجودہ معاشی تصورات کے مطابق کیوں نہیں کیونکہ انسان بھی جسمانی کیت کے حوالے ہی سے پہچانے جاتے ہیں۔

اگر مغربی اصول قانون نے قدیم الفاظ کا سہارا لیا پھر بھی قدیم معانی کے متعدد سطحی عناصر ابھی تک

قائم ہیں۔ متن کا تکرار صرف الفاظ کے قانونی استعمال کی وضاحت کرتا ہے مگر اس زندگی کی نشاندہی نہیں کرتا جو ان کے اندر مضمر ہے۔ کوئی عمل ایسا نہیں جس سے کہ قدیم مابعد الطبیعیاتی خاموشی کو بیدار کر سکے تاکہ قدیم تصورات عدل بروے کار آئیں۔ جدید قوانین دنیا میں اس آخری اور سنجیدہ عنصر کو واضح کرتے ہیں۔ کیونکہ---- صرف اس لیے کہ----- یہ امر بدیہی ہے۔ ان تمام میں سے ایک لزوم کو خاموشی سے قبل از وقت فرض کر لیا جاتا ہے جب اس کا نفاذ کیا جائے تو یہ نہ صرف قاعدہ و قانون ثابت ہوتا ہے بلکہ بنیادی طورپر اس کے تحت ایک ناقابل اظہار عنصر جسے لوگ داخلی طور پر سمجھتے ہیں اور اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ ہر قانون بڑی حد تک اور بلامبالغہ رواجی قانون ہی ہے۔ ان الفاظ کے معانی بذریعہ قانون و منی متعین کیے جانے ضروری ہیں اور ان کی وضاحت صرف حقیقی زندگی ہی میں ہوتی ہے۔

بہرحال اگر کسی فاضل قانون دان کی زبان غیر ملکی اور اجنبی ہے اور وہ اجنبی منصوبے کے تحت ہی مقامی اور خصوصی قوانین کو باہم پیوست کرنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ تصورات بے معنی رہتے ہیں اور زندگی ان کی طرف خاموشی سے دیکھتی رہتی ہے اور اس طرح قانون اوزار کی بجائے بوجھ بن جاتا ہے۔ مگر حقیقت اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ مگر یہ سفر تاریخ قانون کی ہمراہی میں نہیں بلکہ علیحدہ ہوتا ہے۔

پس' اس کے نتیجے میں قانونی مواد جس کی ہماری تہذیب کو ضرورت ہوتی ہے صرف بیرونی ضروریات ہی کو پورا کرتا ہے یا کسی بھی ضرورت کو پورا نہیں کرتا' اس کے ساتھ کلاسیکی کتب کا ہمارا اصول قانون طے کرتی ہیں جس کے نتیجے میں ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ ابھی تک اپنی حقیقی صورت سے محروم ہے' لہٰذا ہمیں دستیاب ہی نہیں۔

کیا افراد اور اشیا دور حاضر کے قانون کے مطابق' سرے سے ہی اپنا کوئی قانونی تصور رکھتی ہیں؟ نہیں! وہ محض عام امتیاز ہی کی حامل ہیں۔ حیاتیاتی امتیاز بلکہ صرف یہ کہنا چاہیے کہ انسان اور باقی اشیا میں گونہ امتیاز موجود ہے مگر جہاں تک قدیم مابعد الطبیعیات کا تعلق ہے تمام تکوین کی ذات کا تصور لابدی تھا۔ انسان اور دیوتا میں امتیاز' شہری روح' ہیرو' غلام' کائنات جس میں اشیا اور ہیئت دونوں موجود ہیں۔ اٹراکسیاء کا تصور حیات یہ تمام بدیہی صورتیں مسلمہ تھیں اور اب یہ تمام صورتیں فنا ہو چکی ہیں۔ ہمارے تصور میں صفت کا لفظ' کلاسیکی جامد تعینات کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ لہٰذا ہمارے اسلوب حیات کے مطابق اس کا کسی متحرک شے پر استعمال غلط قرار پاتا ہے۔ ہم ایسے تعینات کو شرمندہ الفاظ اساتذہ اخلاقیات' ارباب عدل' فلسفیوں اور سیاسی اور ناقابل فہم مباحثوں کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں آج کی تمام معاشی تاریخ صرف اسی ایک مابعد الطبیعیاتی تصور تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

تو اس کے نتیجے میں اس امر پر زور دینا چاہیے کہ----- اور پوری قوت کے ساتھ----- کہ کلاسیکی قانون صرف اجسام کا قانون تھا جبکہ ہمارا قانون فعالیتوں کا قانون ہے۔ رومیوں نے سکونیاتی عدل کی

ترویج کی، ہمارا فرض منصبی یہ ہے کہ ہم عدالتی تحرک کو وجود میں لائیں۔ ہمارے نزدیک اشخاص، اجسام نہیں بلکہ قوت اور عزم کی وحدتیں ہیں اور اشیا بھی اجسام نہیں بلکہ مقاصد، ذرائع ہیں جو ان وحدتوں کی تخلیق ہیں۔ اجسام کے مابین کلاسیکی تعلق محض ذہنی تھا مگر قوتوں کے مابین تعلق کو عمل کہا جاتا ہے۔ رومیوں کے نزدیک غلام بھی شے تھا، جو نئی اشیا کو تخلیق کرتا تھا۔ سسرو کی طرح کا ایک صاحب قلم کبھی بھی ذہنی جائیداد کا تصور نہ کر سکتا تھا۔ عملی تصور کے مطابق جائیداد کا تو ذکر ہی کیا ہے یا ذہنی امکانات بھی صرف نظر کر دیں لیکن ہمارے نزدیک اس کے برخلاف منتظم یا موجد، یا کسی پیدائشی قوت کا محرک جو دوسری منتظمہ قوتوں پر اثر انداز ہوتا ہے خواہ وہ بذریعہ ہدایات ہی ہوں یا ان کی فعالیت کا موجب ہوں یہ دونوں معاشی حیات سے متعلق ہیں یہ صرف اشیا کا مالک ہونے کی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ توانائی کی منتقلی اور بہم رسانی کی وجہ سے بھی ان کا تعلق انسان کی معاشی حیات سے ہے۔

مستقبل ہم سے یہ تقاضا کرے گا کہ ہم اپنی تمام قانونی فکر اپنے نظام طبیعیات و ریاضی کے ہمراہ بیرونی ممالک کو برآمد کریں۔ ہماری تمام معاشی، معاشرتی اور تیکنیکی حیات اس امر کی منتظر ہے کہ اسے دنیا بھر میں سمجھا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہمیں ایک یا دو صدیاں اس کی فکر کی گہرائی اور سنجیدہ منصوبہ بندی میں صرف کرنا ہوں گی۔ اس کے لیے نظام عدل کی گہری تربیت ناگزیر ہے اور ہم سے مطالبہ کرتی ہے کہ :

۱۔ زمانہ حال کی معاشی زندگی کا وسیع اور عملی تجربہ فوری طور پر حاصل کیا جائے۔

۲۔ مغربی قانون کی تاریخ کا درست علم، جس کے ساتھ جرمن، انگریزی اور رومن صورت حال کا تقابلی مطالعہ بھی شامل ہو۔

۳۔ کلاسیکی نظام قانون کا علم، جو موجودہ اصولوں اور جواز کے نمونے کے لیے تو نہ ہو، مگر اس امر کی مثال کے طور پر پیش کیا جائے کہ کس طرح چند آدمی مل کر اپنے دور کی عملی زندگی کی بنیاد پر قانون کی نشوونما کو خالص رکھتے ہیں اور مضبوط بناتے ہیں۔

رومی قانون اب ہمارے دائمی جواز کے قابل اصولوں کے منبع کی حیثیت کھو چکا ہے مگر رومی زندگی اور رومی قانونی تصورات کے مابین تعلق ہمیں جدید اقدار فراہم کرتا ہے۔ ہم اس سے یہ سبق حاصل کر سکتے ہیں کہ ہم اپنے قانون کی تعمیر و تشکیل کو تجربے کی بنیادوں پر کس طرح استوار کر سکتے ہیں۔

باب چہارم

شہر اور باشندے

(نسلیں اور اقوام)

(ا)

روح مدنیت

ا

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل کے دوسرے ہزار سالہ دور کے وسط میں بحیرہ آز کے کناروں پر دو دنیائیں ایک دوسری کے خلاف صف آرا تھیں۔ ان میں سے ایک تو اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والے امیدوں اور توقعات کے سہارے اینڈتے ہوئے اور ماضی کی کلفتوں اور کامرانیوں میں مدہوش مائی سینائی تھے۔ دوسری طرف خوش مزاج، خوش پوش، مطمئن، صاف ستھرے، قدیم ثقافت کے خزائن سے مالا مال، خوش وضع، اپنے تمام مسائل کو ماضی کے حوالے کر کے اپنا بوجھ اتار چکے تھے کریٹ کے منعون تھے۔

ہم ان غیر معمولی واقعات کے مظاہر کو جو ہمارا مرکز تحقیق ہیں درست سمجھ نہیں سکتے، تاوقتیکہ کہ ہم

وجہ مخاصمت کی تہ تک نہ پہنچ جائیں' جو انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ رکھتی ہے اس عہد کے لوگوں نے بھی اسے سنجیدگی سے محسوس کیا ہو گا' مگر وہ اسے سمجھ نہ سکے۔ مجھے تو سارا معاملہ اپنی آنکھوں کے سامنے صاف صاف نظر آتا ہے کہ وہ تذلیل جو محض ناقابل حصول زندہ دلی کی خاطر' طائرین اور مائی سین کے باشندوں کی کنوسوس میں ہوئی' وہی اس ساری کشمکش کا محرک ہے۔

کنوسوس کا تعلق اعلیٰ خاندان سے تھا۔ معمولی جاگیرداروں اور ان کے چیلوں کے ہاتھوں وہ اپنی تذلیل برداشت نہ کر سکتے تھے۔ علاوہ ازیں ان توانا' وحشی جنگلوں میں پیدا ہونے والے غرور و نخوت نے وہی حالات پیدا کر دیے جو کسی وقت بزرگ رومی شرفا کو جرمن اجڈ سپاہیوں کے ہاتھوں پیش آئے۔

ہمیں ان حالات کا علم کیسے ہوا؟ دنیا میں ایسے متعدد مواقع ہوئے ہیں جبکہ دو مختلف ثقافتوں کے باشندوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ ہم ایسی ایک سے زائد ثقافتوں سے آشنا ہیں جن کے باشندوں کے حوالے سے انسانی نفسیات کے بعض اہم پہلو افشا ہوئے۔

ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ کنوسوس اورمائی سینیوں کے مابین بھی یہی صورت حال پیدا ہوئی' جو باز نطینی دربار اور جرمن سرداروں کے مابین پیش آئی تھی۔ ان حالات میں آٹو دوم نے اپنی شادی رچا کر فریق ثانی کے جذبات کو مزید برافروختہ کر دیا۔ ایک طرف تو کسی حد تک ترقی یافتہ مگر کمزور اور زرد رو تہذیب تھی اور دوسری طرف وہ اکھڑ جرمن سپاہی تھے' جنھیں شیفیلڈ انسانی بستیوں کی کہانی کے کردار کہتا ہے ۔ شارلیمن میں ایک قدیم انسانی روحانیت کے مرکب کے آثار موجود تھے۔ یہ روحانی اقدار بیداری کی سرحد پر تھیں' مگر اس نے اپنے اوپر سابقہ عقلیت پسندی کو عائد کر لیا۔ اس کے بعض اوصاف حکمرانی پر ہم اسے خلیفہ فرنگستان کہنے پر مجبور ہیں' حالانکہ وہ صرف جرمن قبائل کا ایک سردار تھا۔ اس کی حالت آزی محلات کے گرجے کی تھی جو نہ مسجد تھا اور نہ گرجا۔ مغرب کی قدیم ثقافت اب جرمنی کے زیر سایہ تھی' جو آہستہ آہستہ زیر زمین آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کی وجہ سے جو چکا چوند پیدا ہوئی' جسے ہم کارولنگی نشاۃ ثانیہ کا نام دیتے ہیں' درحقیقت بغداد سے پھوٹی ہوئی ایک کرن تھی۔ اسے کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا' کیونکہ چارلس اعظم کا دور تو ایک سطحی فکر کی داستان ہے اور اپنی اسی حالت میں ختم ہو گئی۔ حادثات کا انجام یہی ہوتا ہے کہ ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہتا۔

۹۰۰ تک کے ایک طویل انحطاط کے بعد ایک حقیقی جدید آغاز ظہور میں آیا۔ ایک ایسا محرک جو قضاوقدر کی قوت کے راز افشا کرتا تھا اور طویل المیعاد کامرانیوں کی نوید سناتا تھا۔ مگر ۸۰۰ میں عرب تہذیب کا سورج جو مشرقی شہروں پر سے گزر کر مغربی دیہات پر زوافشانی کر رہا تھا' یہاں تک کہ یونانی دھوپ بھی دور دراز سندھ تک پھیل گئی ۔

تیرین اور مائی سین کی پہاڑیوں پر جو شے نظر آتی ہے وہ جرمنی کے قدیم دیہات کی وضع کی ہے۔ کریٹ کے محل' جو شاہی قلعے تو نہیں' مگر پجاریوں اور پجارنوں کی بڑی بڑی عمارتیں ہیں۔ ان میں تمام شہری سہولتیں موجود ہیں' بلکہ آخری دور کے رومیوں کا جملہ سامان عیش و طرب مہیا ہے۔ ان پہاڑیوں کے دامن میں پیدل سپاہیوں اور تیر اندازوں کے جھونپڑے تھے' مگر کریٹ (گورنیا حاجیہ۔ اور تری ادہ) کے محلات کی کھدائی سے معلوم ہوا ہے کہ ان کی ضروریات زندگی اعلیٰ مہذب باشندوں کی سی تھیں اور عمارتیں عالی شان تھیں جن میں ایسا فرنیچر موجود تھا جو بلند پایہ ذوق کی نشاندہی کرتا ہے۔ دیواروں کی آرایش اور روشنیوں کا اہتمام' آبی گزر گاہیں' سیڑھیاں' اور اسی نوعیت کے لاتعداد تکلفات کے آثار موجود ہیں ۔ کوئی مکان زندگی کا بھرپور نقشہ پیش کرتا ہے بلکہ زندگی کی علامت نظر آتا ہے ۔ دوسری میں افادیت کا اعلیٰ ذوق نمایاں ہے۔ ان کا مادی ظروف کی نقاشی اور دیواری برجستہ کاری اور تقدیس استر کاری کا موازنہ کریں۔ ان میں ہر ایک حقیقی مائی سینی ہے۔ یہ تمام کے تمام صنعتی فن کی پیداوار ہیں۔ جنھیں ہوشیاری سے بنایا گیا ہے مگر فنی خوبی سے عاری ہیں۔ انھیں بہترین فنی نمونہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان میں نہ تو کوئی وزن ہے نہ توازن۔ البتہ ان میں وہ زور دار رجحان موجود ہے جس کے لیے مائی سینی پختہ کاری حاصل کرنے کے قریب تھے' یعنی ہندی اسلوب۔ اگر بات ایک لفظ میں ہی ختم کرنا مقصود ہو تو آپ اسے اسلوب کی بجائے ان کا ذوق کہیں گے ۔ مائی سینیا میں ایسی قدیم نسل آباد تھی' جو اپنے قیام کے لیے زرخیز اور دفاع کے نقطہ نظر سے موزوں زمین کا انتخاب کرتی تھی' جبکہ منعون کی آبادی تجارت کے نقطہ نظر سے جگہ کا انتخاب کرتی۔ فلاکونی کا محل وقوع یہ ظاہر کرے گا کہ اسے برآمدی تجارت کے لیے آباد کیا گیا تھا۔ یہاں سے برکانی شیشہ برآمد کیا جاتا۔ مائی سینائی محلات مستقبل کی نوید ہیں اور منعونی اختتام کی خبر دیتے ہیں۔ مگر ۸۰۰ ق م میں مغرب کی بھی یہی حالت تھی۔ فریسنکن اور دی گوتھن کھیت اور جاگیرداروں کی ڈیوڑھیاں' لوئر سے لے کر ایبرو تک پھیلی ہوئی تھیں جبکہ ان کے جنوب میں مور کے قلعے' کوٹھیاں اور قرطبہ اور غرناطہ کی مسجدیں تھیں۔

یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا کہ منعون کی عیش و عشرت کا دو عظیم مصری انقلاب پر منطبق ہوتا ہے۔ بالخصوص ہا ئکسوس کا عہد (۱۵۸۰-۱۷۸۰ ق م) ۔ مصری مناع ان دنوں پر امن جزیروں میں بھاگ گئے ہوں گے اور بعض ان میں سے براعظم کے محفوظ مقامات تک چلے گئے ہوں گے جس طرح کہ بعد کے زمانے میں باز نطینی علما اٹلی میں بھاگ گئے۔ کیونکہ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ منعون ثقافت واقعتاً مصری ثقافت ہی کا ایک حصہ ہے اور ہم یہ محسوس کر سکیں گے کہ وہ مصنوعات جن کا اوپر ذکر ہوا ہے وہ مصری فن کا حصہ نہ تھے' جو کچھ مغربی دہانے میں تیار کیا گیا غالباً" رطوبت کی وجہ سے تباہ ہو گیا۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ مصری ثقافت کس حد تک جنوب کی خشک سرزمین پر پھلی پھولی' مگر یہ عرصے سے بطور ایک یقینی امر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اس ارتقا کا مرکز ثقل کہیں اور تھا۔

منعون اور نوزائیدہ مائی سینی فن کے مابین حد بندی کا تعین اب ممکن نہیں۔ مصری' کریٹ دنیا میں ہم جہاں تک مشاہدہ کر سکتے ہیں' کہ جدید دور میں یہ ایک روش چل نکلی ہے' کہ تمام اجنبی اور قدیم اشیا (یا اس کے برعکس) کو براعظم کے جنگ جو بادشاہ کریٹ سے خرید کر یا چوری کر کے جس طرح سے بھی اور جہاں

سے ملیں اپنے محفوظ مقامات پر لے گئے۔ کبھی نقل مکانی کا اسلوب بھی بیان کیا گیا اور یہ مقبول بھی ہوا اور یہ بھی کہا گیا کہ قدیم جرمن زبان کی ہیئت مشرقی ہے۔ یہ لوگ اپنے محلات اور مقبرے تعمیر کرنے اور ان کی آرائش کے لیے اسی علاقے سے غلام یا مزدور بلا لیا کرتے تھے۔ مائی سینیا کا سب سے بڑا خزانہ (مدفن) یا قبر اسی وجہ سے ریونا میں واقع تھیوڈے رچ کی قبر سے ملتی جلتی ہے۔

اس سلسلے میں خود باز نطین کی سرزمین بھی عجیب و غریب صورت حال پیش کرتی ہے۔ یہاں پر زمین کی ہر تہ کو احتیاط سے علیحدہ علیحدہ کرنا ہو گا۔ ۳۲۶ میں قسطنطنیہ کی پرانے کھنڈرات پر تعمیر نو ہوئی۔ کسی زمانے میں سپٹیموس سروی روس نے اس عظیم الشان شہر کو تباہ کر دیا جو آخری کلاسیکی دور میں درجہ اول کے دارالحکومت کی صورت میں تعمیر کیا گیا تھا جس میں بعد میں مغرب کی طرف سے حشی اور مشرق کی طرف سے مجوسی دندناتے پھر رہے تھے اور اس کے بہت عرصہ بعد ۱۰۹۶ میں یہ متاخر مجوسیوں کا دارالحکومت قرار پایا۔

اس کے آخری دور خزاں میں دوبارہ گاڈفرے اور بوئی لون جیسے صلیبی جنگ جوؤں کے دم سے بہار آئی۔ مشہور شہزادی اپنا کوم نینا' ان کا ذکر نفرت اور حقارت سے کرتی ہے۔ کلاسیکی مغرب کے انتہائی مشرق میں رومیوں کو حیرت و استعجاب میں ڈال رکھا تھا۔ اس کے ہزار سال بعد جبکہ انتہائی شمالی عرب نے روسیوں کو حیرت و استعجاب میں ڈال دیا۔ ۱۵۵۴ میں ماسکو میں حیرت ناک وسیلی بلازتی نے جو روسی قبل از ثقافت دور کا رہنما تھا' تمام نئے اسالیب کے درمیان کھڑا ہو گیا' جیسا کہ اس سے دو ہزار سال قبل حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک ایسا ہیکل تعمیر کیا جو بابل کے قدیم عیسائی شہروں کے درمیان میں استادہ تھا۔

(۲)

از منہ ماضی کا انسان گھومنے پھرنے والا جانور تھا' جس کا شعور بیدار زندگی میں تمام جہان صغیر کو دیکھ لینا چاہتا تھا' اسے کسی گھر یا مقام کی کوئی پابندی نہ تھی۔ اپنے حواس کے متعلق آرزومند اور متمنی اور انسان مخالف فطری عناصر کے خلاف جدوجہد کے لیے ہمیشہ مستعد تھا۔ سب سے پہلا انقلاب زراعت کے شعبہ میں آیا کیونکہ اس عمل میں مصنوعی عمل شامل ہے۔ اس عمل میں شکاریوں اور گڈریوں کا کوئی دخل نہیں۔ وہ شخص جو ہل چلاتا ہے یا زمین کھودتا ہے وہ لوٹ مار نہیں کرتا' بلکہ فطرت کی صورت تبدیل کرتا ہے۔ کاشت کا مطلب یہ نہیں کہ زمین سے کچھ حاصل کیا گیا ہے بلکہ اس کا مطلب کچھ پیدا کرنا ہے' بلکہ اس عمل میں انسان خود پودا بن جاتا ہے یعنی کسان اپنی جڑیں زمین میں گاڑتا ہے جسے وہ کھود کر فصل کاشت کرتا ہے اور انسان کی روح' دیہات میں ایک نئی روح حاصل کرتی ہے اور ایک نئی زمین جو غیر محدود حیثیت کی حامل ہے اور اس کے ساتھ ایک نیا احساس وجود میں آتا ہے۔ فطرت کی انسان مخالف قوتیں دوستی اختیار کر لیتی ہیں' بلکہ دھرتی ماتا بن جاتی ہیں۔ بیج کے بونے اور فصل برداشت کرنے اور بچے کی ولادت اور موت کے عمل میں عجیب مشابہت ہے۔ تحت الثریٰ کے دیوی دیوتاؤں کے مسلک اور ایک ثمربار قطعہ زمین میں' جو انسان کے

ساتھ ہی پھل پیدا کرتا ہے' ایک عجیب مشابہت ہے اور احساس زندگی بھی دونوں میں یکساں ہی تکمیل پذیر ہوتا ہے۔ ہمیں ہر جگہ کھیتی کے مکان کی فضا ملتی ہے' جس سے کمروں کے نقشے اور کھیت کی بیرونی سرحدوں کا وجود اس میں رہنے والوں کی خوں فشانی کی داستان بیان کرتے ہیں۔ کسان کا گھر ایک مکمل سکون کی علامت ہے۔ یہ خود ہی پودا ہے جو اپنی جڑیں اپنی زمین کے اندر تک دور لے جاتا ہے - یہی اس کی جائیداد ہے' مگر اس لفظ کے ساتھ بے شمار خوف وابستہ ہیں۔ چولہے' دروازے' اور دالان دھرتی کی دیوی اور دیوتا' مردہ آباؤاجداد کی ارواح اور گھریلو دیوتا' ہر وقت ان گھروں میں نقصان رسانی کے لیے مکینوں کے ساتھ ہی مقیم ہیں۔

ہر ثقافت کے آغاز سے قبل حالات کی یہی صورت ہوتی ہے یہ مادرارض ہی سے نمودار ہوتی ہے اور انسان اور زمین کے مابین گہرے تعلقات استوار کرتی ہے۔ ایک کسان کے لیے اپنے جھونپڑے کی جو نسبت ہے' وہی قصبے اور ثقافت کے انسان کی ہے کیونکہ ہر انفرادی گھر میں مہربان ارواح ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہر قصبے کا ایک سرپرست روحانی بزرگ بھی ہوتا ہے' قصبہ بھی وحدت میں کثرت کا ایک نمونہ ہے۔ جس طرح کسانوں کی صحرانوردی کو خالص عالم صغیر کی آوارہ گردی سے ممتاز کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اعلیٰ قسم کی کسانی ہیئت کو بھی ارضی مناظر کی ہیئت سے منسلک کیا جاتا ہے۔ نہ تو ادب و فن' ارضی منظر یا مذہب اس کی نشوونما میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں' مگر جب کسی تہذیب میں بڑے بڑے شہر آباد ہو جاتے ہیں' تو پھر انسان اپنی ان جڑوں سے منقطع ہو جاتا ہے۔ انسان ایک مہذب اور صاحب دانش آوارہ گرد حیوان ہے علاوہ ازیں عالم صغریٰ' بے خانماں' ذہنی طور پر اتنا ہی آزاد ہے' جتنا کہ ماضی میں شکاری اور چرواہے وغیرہ حسی طور پر آزاد تھے۔ جیسا کوئی انسان ثقافت سے قبل ہوتا ہے' ویسا ہی وہ ثقافت کے بعد بھی ہوتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے' جب تک کہ نقل مکانی معراج پر نہ پہنچی' جرمنوں کی آرزو یہی تھی کہ تاکتخدا لیکن اس کے باوجود ماتا کا شرف رکھنے والی زمین کے لیے تلاش جاری رکھی جائے تاکہ اس میں مستقبل کی ثقافت کا رواج ہو۔ دور حاضر میں جبکہ ثقافت قریب الاختتام ہے تو یہ بے بنیاد ذہانت تمام روئے زمین پر فکر کے تمام امکانات کی تلاش میں اسی طرح سرگرداں ہے۔ مگر ان تمام حدود کے مابین کہیں نہ کہیں انسان وہ چھوٹی سی جگہ تلاش کر لیتا ہے' جہاں پر وہ مر سکے۔

یہ ایک فیصلہ کن حقیقت ہے مگر ابھی تک اس کی طرف پوری توجہ نہیں دی گئی کہ تمام بڑی بڑی ثقافتیں شہری ثقافتیں ہوئی ہیں۔ دوسرے دور کا برتر انسان شہروں ہی سے متعلق رہا ہے۔ تاریخ عالم کا حقیقی معیار یہی ہے۔ تاریخ عالم شہری انسان کی تاریخ ہے۔ عوام' ریاستیں' سیاست' مذہب' تمام فنون' اور تمام سائنس' انسانی تناظر کے ایک پہلو سے متعلق ہیں جو شہری آبادی سے مخصوص ہے۔ ہر ثقافت کے مفکرین شہروں ہی میں رہتے ہیں (اگرچہ جسمانی طور پر وہ دیہات میں بھی مقیم ہوں) لیکن اس کے باوجود وہ اس سے آشنا نہیں کہ یہ عجیب و غریب شے جسے قصبہ کہتے ہیں کیا شے ہے؟ اس احساس کے لیے ہمیں اپنے آپ کو غیر مشروط طور پر ایسی جگہ پر لے جانا ہو گا جہاں پر کوئی قدیم زمانے کا انسان پہلی دفعہ خشتی اور چوبی مکانات

کو دیکھ کر حیران و پریشان کھڑا ہو۔ وہ ایسے فطری مناظر کو دیکھ کر ضروری تعجب کا اظہار کرے گا' جہاں گلیاں پختہ اور چوک سنگی ہوں۔ گویا ایک حیوان ناطق انسانوں کے گروہ میں شامل ہو کر سکونت اختیار کرے گا۔

مگر حقیقی معجزہ شہری روح کی ولادت ہے۔ ایک مجموعہ ارواح جو تمام کا تمام جدید نوعیت کا ہے۔ جس کی آخری اساس ہم سے ہمیشہ اوجھل رہے گی۔ گویا وہ اچانک ہی ثقافت کی عمومی روحانیت سے شگوفے کی طرح پھوٹ نکلے گا۔ کھیتوں اور جھونپڑوں کے سادہ گروہ سے' جن میں سے ہر ایک کی اپنی تاریخ ہے' ایک مجموعیت کا وجود ظاہر ہوتا ہے اور یہ سب کا سب گروہ مجموعی طور پر زندہ رہتا ہے' سانس لیتا ہے' نشوونما پاتا ہے پھر اپنا ظاہری چہرہ حاصل کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اپنی داخلی ہیئت اور تاریخ حاصل کرتا ہے۔ اس کے بعد ہر انفرادی گھر' مندر' گرجا اور محل' اور فی نفسہ شہر کی ہیئت' معروضی وحدت کی ہیئت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس طرح آبادی کی لسانی ہیئت' تاریخ اسلوب' وجود میں آتے ہیں' جو اس کے سارے جادہ حیات ثقافت کے ہمسفر رہتے ہیں۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جو شے شہر کو دیہات سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کا رقبہ نہیں بلکہ یہ ایک مخصوص روح کی موجودگی ہے' جیسا کہ مغربی افریقہ میں۔ مگر بعد کے زمانے کی شرائط کے مطابق چین' ہندوستان اور صنعتی یورپ اور امریکہ کو بھی اس میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں بعض ایسی بڑی بڑی آبادیاں نظر آتی ہیں' جنھیں شہر نہیں کہا جا سکتا' وہ قدرتی مناظر کا مرکز ہیں' وہ داخلی لحاظ سے اپنے اندر ایک دنیا بسائے ہوئے نہیں ہیں' وہ روح سے خالی ہیں۔ ہر قدیم آبادی بطور کسان زندگی بسر کرتی ہے اور وہ فرزندان ارض کہلاتے ہیں۔ شہری بننا ان کی زندگی کا مقصد ہی نہیں کیونکہ خارجیت ہمیشہ دیہات سے ابھرتی ہے شہروں سے نہیں۔ مگر دیہاتوں کی دلچسپی کی چیز صرف منڈی ہے جہاں وہ ایک دوسرے سے مل بھی لیتے ہیں۔ گاؤں کا رہنے والا صناع ہو یا تاجر وہ اپنے آپ کو کسان ہی سمجھتا ہے۔ ہمیں ماضی میں جا کر درست طور پر سمجھنا ہو گا کہ قدیم مصری' چینی یا جرمن دیہات کیسے ہوتے ہیں۔ ایک بڑے اور وسیع خطہ زمین میں ایک چھوٹا سا نشان' شہر بن کر ظاہر ہوتا ہے یہ خارجی طور پر تو دوسروں سے امتیاز نہیں کیا جا سکتا مگر روحانی طور پر اسے آپ دیہاتی علاقے سے علیحدہ محسوس کر سکتے ہیں اور اس کے ماحول کا تجربہ کر سکتے ہیں۔ یہ آپ کو علیحدہ اور دوسروں کا زبردست نظر آئے گا۔ اس کے بعد دو مختلف نوعیت کی حیات کا تجربہ ہو گا ایک تو وہ جو مذکورہ نقطے کے اندر ہے اور دوسری وہ جو اس کے باہر ہے اور کسان جانتا ہے کہ شہری آدمی فی الحقیقت کیا ہے؟' دیہاتی لوہار اور شہری لوہار' سردار اور حاکم شہر' دونوں کی دنیائیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ دیہاتی اور شہری باشندے مزاج کے لحاظ سے مختلف ہیں وہ خود فرق محسوس کرتے ہیں۔ آج کے دور میں بریڈن برگ کا کسان سسلی کے کسان کے ایک برلن کے باشندے کی نسبت زیادہ قریب ہے۔ اسی لمحہ سے جب اپنے ماحول کی ہم آہنگی کے مطابق ایک شہر وجود پاتا ہے اور یہی شہری ہم آہنگی ہے جو ہر ثقافت کی تہ میں کار فرما ہوتی ہے اور اسی سے ثقافت کا شعور بیدار وجود پاتا ہے۔

ہر ثقافت کی بہار کا دور ہی فی الحقیقت شہری زندگی اور تہذیب کو جنم دیتا ہے۔ قبل از ثقافت دور کا انسان ان تکلفات کی دنیا میں انتہائی بے آرامی محسوس کرتا ہے' کیونکہ ان تکلفات کی بدولت وہ اپنی داخلیت سے اپنا رشتہ استوار نہیں کر سکتے۔ جرمن قوم کے افراد متعدد بار دریائے ڈینیوب اور رائن کے کناروں پر (مثلاً سٹراس برگ کے مقام پر) رومی شہروں کے نزدیک آباد ہونے کے لیے تیار ہوئے۔ مگر یہ مقام غیر آباد ہی رہ گئے۔ کریٹ میں فاتحین نے پرانے جلے ہوئے شہروں' دیہات' کورنیا اور کنوسوس کے کھنڈرات پر نئے شہر بسانے کی متعدد بار کوشش کی' مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ مغربی قبل از ثقافت کے دور کی ترتیب' بینے ڈکٹائن اور بالخصوص یہ متکبر اور پیش اندیش اس خالی زمین پر شاہانہ انداز میں مقیم ہو گئے یہ فرانسکن اور ڈومینیکن تھے۔ جنھوں نے روم میں پہلے شہروں کی تعمیر کا آغاز کیا' ان میں ایک نئی روح بیدار ہو چکی تھی' مگر اس کے باوجود ایک نازک مالیخولیائی کیفیت ان کے طرز تعمیر میں پائی جاتی تھی۔ فرانسکن فن میں تو اس کا وجود مجموعی طور پر موجود ہے۔ ایک صوفیانہ خوف جو ہر فرد صاف چمکدار اور شعوری کیفیات میں محسوس کرتا تھا' جو ابھی تک تعمیمی طور پر تسلیم کیا جا چکا تھا۔ ابھی تک انسان اپنی کسان ہونے کی جبلت کو فراموش نہیں کر سکا تھا۔ سب سے پہلے جنھوں نے شہری ماحول کو قبول کیا اور وہ اس ماحول میں قیام کے لیے راضی ہوئے وہ یسوعی تھے۔ یہ وہ علامت ہے جو دیہاتی علاقوں میں ابھی تک پائی جاتی ہے اور اکثریت ابھی تک شہری زندگی کو قبول نہیں کرتی۔ جب کوئی حکمران ہر موسم بہار میں ایک محل سے دوسرے میں منتقل ہو جائے تو یہ اس امر کی علامت ہے کہ وہ کسی ایک جگہ پر مقیم نہیں ہونا چاہتا۔ قدیم مصری حکومت کا گنجان آباد انتظامی علاقہ دیوار ابیض (میمفس) کے قریب تھا' مگر فراعنہ مصر اپنی رہائش گاہیں متواتر تبدیل کرتے رہتے تھے' یہی حال سومیری بابل اور کارولنگی حکمرانوں کا تھا ۔ چاؤ خاندان کے قدیم حکمران اپنا دربار' لویانگ' میں لگاتے تھے' (جس کا جدید نام ہوتان فو ہے) تقریباً ۱۱۶۰ کے بعد انھوں نے یہ طرز عمل اختیار کیا تھا مگر یہ ۷۷۰ تک' جو ہماری سولھویں صدی کے متوازی ہے' نہ ہوا کہ اس مقام کو بطور مستقل شاہی رہائش کی حیثیت دی گئی

ارضی حدود کو نباتات کے حوالے سے اس سے قبل کبھی بھی تسلیم نہیں کیا گیا۔ ان قدیم چھوٹے چھوٹے قصبات کی تعمیر میں تاریخ میں پہلی بار اسے پوری قوت سے مروج کیا گیا حالانکہ یہ قصبات چند گاہوں' ایک منڈی' یا قلعہ' یا عبادت گاہ پر مشتمل ہوتے تھے۔ یہاں صرف ایک بات نمایاں معلوم ہوتی ہے کہ یہ صرف اعلیٰ اسلوب ہی ہے جو کسی شے کی عظمت کی علامت ہے۔ ڈورک ستون' مصری اہرام' رومی گرجے' زمین میں سے بلند ہوئے۔ ان میں نیک نیتی عظمت اور فضاوقدر کا تصور نمایاں ہے۔ مگر شعور بیدار کی کمی ہے۔ آئی عونی ستون' جو وسطانی حکومت کے تعمیر کردہ ہیں نیز بارونق کی تعمیرات' اپنی ذات کی خاموش اہمیت کی ترجمان ہیں اور آزادانہ اور متعین سطح زمین پر استادہ ہیں' وہ اپنے آپ کو ارضی قوت سے ممتاز محسوس کرتی ہیں' وہ اپنے زیر قدم پکے فروش کے باوجود اپنے آپ کو ارضی کیفیت سے علحدہ سمجھتی ہیں۔ تکوین زیادہ سے زیادہ ست رفتار اور مردہ دل جبکہ تحس اور عقل زیادہ سے زیادہ طاقت ور نظر آتے ہیں۔ انسان ذی شعور ہو جاتا ہے اور خانہ بدوشوں کی طرح آزاد پھرتا ہے' وہ ان کا مماثل تو ہو سکتا ہے مگر ان کے مقابلے میں تنگ نظر اور عمر رسیدہ نظر آتا ہے۔ ذہانت' زندہ دلی' شگفتگی خصوصی طور پر شہری شعور بیدار کی

علامت ہیں۔ تمام فنون مذہبی مگر سائنس بتدریج عقلی رجحانات کا شکار ہو جاتی ہے' جو متعلقہ ارضی تعلقات سے اجنبی اور کاشتکاروں کی سمجھ سے ماورا ہوتی جاتی ہے اور جب تہذیب کا غلبہ ہوتا ہے تو یہ زندگی کا ایک نازک موڑ ہوتا ہے۔ تکوین کی فراموش شدہ اساس' حجری کیت میں خشک ہو جاتی ہے۔ یہی شہری زندگی کا ماحصل ہے اور آزاد عقلیت ---- کیا بدقسمت لفظ ہے ---- ایک شعلے کی طرح نظر آتی ہے فضا میں شاندار انداز میں پرواز کرتی ہے' اور قابل رحم حالت میں فنا ہو جاتی ہے۔

(۳)

شہر کی تازہ روح ایک نئی زبان بولتی ہے' جو جلد ہی متعلقہ ثقافت کی زبان قرار پاتی ہے۔ کھلی زمین اپنی دیہاتی آبادی کے ساتھ زخمی ہو جاتی ہے' کیونکہ اب وہ لسانی ادراک سے محروم ہو چکی ہے۔ اسے شہری بولی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ مبہوت اور گونگی ہو کر رہ جاتی ہے۔ تمام حقیقی تاریخی اسلوب صرف شہروں میں اپنا کھیل کھیلتا ہے۔ یہ تمام تجربہ زندگی اور شہری اقدار صرف شہری آبادی کا بلا شرکت غیرے حصہ ہے' جو اپنے دلائل کو منطقی انداز میں اور نمایاں ہیئت میں پیش کرتا ہے۔ انتہائی قدیم دور کا رومی' ابھی تک اپنی ارضی نشوونما میں تھا۔ وہ ابھی تک اپنے کھیتوں میں اپنی ضروریات کے مطابق ہی گھر تعمیر کر رہا تھا۔ مگر احیائے علوم کا اسلوب صرف شہری احیا ہی کے ساتھ مخصوص تھا۔ باروقی باشندے صرف باروقی شہروں تک محدود تھے۔ ابھی کورنتھی ستونوں یا روکوکو ستونوں کا کوئی ذکر نہ تھا۔ ان میں سے شاید کچھ فطری مناظر میں دخل اندازی کر رہے ہوں۔ مگر زمین ابھی تک معمولی مقدار میں بھی تخلیقی کام کے لیے مستعد نہ تھی۔ وہ صرف گونگی نفرت کا ہی اظہار کر سکتی تھی۔ کسان اور اس کا گھر ہر انداز اور ضروریات کے ساتھ رومی ہی تھا اور وہ آج تک اپنے اس انداز پر قائم ہے۔ کلاسیکی یونانی دیہات نے اپنا مذہبی اسلوب قائم رکھا اور مصری دیہات میں قدیم شہنشاہی دور کی روایات قائم رہیں۔

شہری چہرے پر سب سے بڑھ کر اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ اس کی اپنی تاریخ ہے۔ اس کے چہرے کے اظہار کا یہ عمل تقریباً ثقافت کی ذات ہی کی تاریخ ہے۔ پہلے تو ہم نے دیکھا کہ روم اور دوسری ثقافتوں میں چھوٹے چھوٹے شہر آباد ہوئے ہیں۔ قدیم ثقافتیں جو اپنے آپ کو فطری مناظر میں گم کر لیتی ہیں' ان میں ہمیں ابھی بھی اصل کسان بستیاں نظر آتی ہیں جو کسی پناہ گاہ یا مضبوط دفاعی حصار کے زیر سایہ آباد ہیں اور ان میں کوئی ایسا داخلی تغیر پیدا نہیں ہوا کہ یہ کہا جا سکے کہ ان کے گھروں کے ارد گرد ان کے کھیتوں اور وادیوں کی بجائے ہمسائے آباد ہیں۔ قدیم ثقافتوں کے لوگ بتدریج شہری بنتے گئے اور یہ عمل صرف کسی ایک ملک چین' ہندوستان' شمیوں یا فاؤستی شہری ہیئت تک محدود نہیں' بلکہ علاوہ ازیں آرمینائی' شامی' آئی خونی اور ایٹریانی' جرمن' فرانسیسی اور انگریزی قصبوں کی قیافہ شناسی سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ فیڈیا' ریم برنڈٹ اور لوتھر کے شراتی نوعیت کے تھے۔ یہ صرف غرناطہ اور وینس اور نور نبرگ اپنے تصورات کا شعبدہ بازی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جتنا بھی کسی ثقافت نے مذہب' فن اور علم میں تخلیق کیا ہے' وہ تمام کا تمام ان شہروں

ہی میں تخلیق کیا گیا ہے جبکہ صلیبی جنگیں لڑنے والوں کی حوصلہ افزائی کا موجب وہی قلعوں کے سردار اور دیہاتی معابد کے پجاری ہی تھے۔ تحریک اصلاح کلیسا شہروں ہی سے اٹھی اور تنگ گلیوں اور ڈھلوان اور سیدھے گھروں میں پھیل گئی۔ عظیم رزمیہ نظمیں جو خون اور نسل کے نغمے چھیڑتی ہیں' دیہات اور دیہاتی زندگی ہی کی تخلیق ہیں۔ مگر ڈرامہ جس میں حیات بیدار اپنا جائزہ لیتی ہے' اس کا تعلق شہری شاعری سے ہے اور ناول جو زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہوتا ہے وہ عالمی تصور کا نغمہ سنج ہے' حقیقی عوامی شاعری کے علاوہ تمام کی تمام غنائیہ شاعری شہروں کی پیداوار ہے۔ کسانوں کے ازلی فن کے قطع نظر تصویر کشی اور فن تعمیر کا تعلق صرف شہروں سے ہے۔ اس کے ساتھ ہی تاریخ تیز رفتاری سے جلد ہی ختم ہو جاتی ہے اور یہ شہری سنگی چہرے جو ان کی دنیائے نور میں اپنا جلوہ دکھا رہے ہیں' ان کا تعلق بھی شہری آبادی ہی سے ہے اور یہ تو تمام کے تمام شہری باشندے ذہانت اور روشنی سے مالا مال ہیں۔ وہ زبان جو شہری آبادی استعمال کرتی ہے دیہات سے کئی حوالوں سے مختلف ہے۔ دیہاتی زبان اپنے فطری مناظر کی طرح ناتراشیدہ ہی رہتی ہے۔ بڑے شہروں کے سیاہ خاکے' چھت' چمنیاں' مینار اور گنبد فضا میں کتنا خوب صورت تاثر پیدا کرتے ہیں۔ نزبرگ' فلورنس' دمشق' یا ماسکو' پیکنگ بنارس یا روم کے نظاروں سے دنیائے فن کی زبان کا سبق ملتا ہے۔ ہم کلاسیکی شہروں کے متعلق کیا جانتے ہیں ابھی دیکھ کر ہمیں ان خطوط کا پتہ نہیں چلتا جو مشرقی نصف النہار میں انھوں نے پیدا کیے؟ صبح کے بادلوں میں' ستاروں بھری راتوں میں' کیا سماں ہوتا ہو گا؟ گلیوں کے راستے' سیدھے یا ٹیڑھے میڑھے' وسیع یا تنگ' مکانات کم اونچے یا بلند' روشن یا اندھیرے' تمام مغربی شہروں میں' ان کے پیش نظر ان کے چہرے کر کے اور تمام مشرقی شہروں میں ان کی پشت کر کے ان کی سیاہ دیواریں اور جنگلے گلیوں کی سمت گھما دیں۔ کونوں اور چوکوں کا مزاج بند کوچے' اور مناظر' چشمے اور پہاڑیاں' گرجے اور مندر' یا مسجدیں بیضوی اکھاڑے اور ریلوے اسٹیشن' بازار اور ٹاؤن ہال! صاف ستھرے صحن' گلشن سے آراستہ محلات' یا ان کی منزلیں' چھوٹے چھوٹے گھروں کے محلے' کوڑے کے ڈھیر' اور نامزدگیاں' صاف ستھرے محلے اور گندی اور تاریک آبادیاں' کلاسیکی روم کا صبورا' اور پیرس کا فابرگ سینٹ جرمانیکا' قدیم بیضائی اور جدید نیئس' چھوٹے چھوٹے شہر مثلاً برجس' اور روتھن برگ اور بابل کی طرز پر تعمیر کردہ گھروں کے سمندر' ٹینوچ ٹٹلان' روم اور لندن ان سب کی تاریخ ہے اور خود بھی یہ تاریخ ہیں۔ ایک عظیم سیاسی واقعہ' اور ٹاؤن ہال کے چہرے پر مختلف شکن' نپولین نے بوربن کو پیرس دیا اور بسمارک نے چھوٹے سے برلن کو وضع قطع عطا کی۔ مگر دیہات اپنی قدیم حالت پر بغیر کسی اثر کے استادہ ہیں' انھیں ان تمام تبدیلیوں پر شک ہے اور وہ برافروختہ ہیں۔

قدیم دور میں صرف فطری مناظر ہی انسانوں کی آنکھ پر حاوی تھے اس نے اس فارم کو ہیئت عطا کی اور اب وہ فطرت کے ساتھ سر ملا کر رقص کرتا ہے۔ احساسات اور اشجار مل کر جھولتے ہیں۔ وادیاں اور جھاڑیوں کے جھنڈ اپنی صورت خود تراشتی ہیں۔ اپنا راستہ بلکہ لباس بھی خود تراشتی ہیں۔ دیہات اپنی کوہی چھتوں کے ساتھ شام کے دھوئیں' کنوئیں' باڑیں' جانور' جو ہر طرح اور مکمل طور پر مناظر فطرت کا حصہ بن چکے ہیں' دیہاتی قصبات دیہات ہی کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ دور متاخر کے شہر تھے' جنھوں نے زمین مخالف رویہ اختیار کیا' فطرت سے اختلاف کیا اور اپنے ابعادی خاکوں میں فطرت کو بالکل نظرانداز کر دیا۔ یہ شہر

اپنے آپ کو فطرت سے بلند و بالا اور علیحدہ شے سمجھتے ہیں۔ یہ بلند و بالا پا کھے' یہ بارونق گنبدیاں' مرغولے' کلس ان کا نہ تو فطرت سے تعلق ہے اور نہ ہی ان کے تعمیر کرنے والوں کی کوئی ایسی خواہش تھی اور اس کے بعد عظیم شہری ریاستوں کا ذکر آتا ہے یا وہ شہر جو بجائے خود ایک جہاں ہیں' جو اپنی ذات کے علاوہ کسی اور شے سے متعلق نہیں اور اپنے آپ کو ایک علیحدہ ملک تصور کرتے ہیں۔ وہ قصبہ جو کبھی کسی محدود رقبے میں آباد تھا' آج بھی اسی حیثیت میں قائم رہنا چاہتا ہے۔ متعدد جامعات کے ساتھ کھلے میدان ' اشجار' اور ہموار زمین پر کٹی ہوئی گھاس پارک کہلاتی ہے۔ پہاڑوں کی چوٹیاں سیاحوں کے لیے دلچسپ منظر پیش کرتی ہیں اور داخلی نقش و نگار فطرت کی نقل پیش کرتے ہیں' چشموں کی بجائے فوارے' پھولوں کی کیاریاں' حوض اور تراشی ہوئی باڑیں' وادیوں' تالابوں اور جھاڑیوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ دیہات میں گھاس پھوس کی چھت پہاڑی کا منظر پیش کرتی ہے اور گلی بھی کھیتوں کے مابین پگڈنڈی کا نظارہ دکھاتی ہے۔ مگر وہاں جو تصویر ابھرتی ہے اس میں گہرائی ہے۔ اونچے سنگی مکانوں کی قطاروں کے درمیان ایک طویل گلی' گرد آلود اور ہنگامہ خیز شور برپا کرتی ہے کیونکہ یہاں انسان آباد ہیں۔ کیونکہ ان کی طرح کی مخلوق پہلے کبھی فطرت کے تصور میں نہیں آئی تھی' لباس بلکہ چہرے بھی فطرت کے پس منظر کے مطابق تراشے جاتے ہیں۔ دن بھر گلیوں میں عجیب و غریب ذرائع نقل و حمل سرگرداں رہتے ہیں اور مختلف آوازیں سنائی دیتی ہیں اور رات کو ایک نئی روشنی جگمگاتی ہے جو چاند کو بھی شرمندہ کرتی ہے اور کھمبا گلی کے کنارے بغیر کچھ سمجھے یا سمجھائے کھڑا رہتا ہے۔ اس نے برقی توانائی کے وہ تار سنبھال رکھے ہیں' جو اس شہری آبادی کی روٹی کا سامان کرتے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے اور یہ امر بے حد اہم بھی ہے کہ ہم اس وقت تک معاشی اور سیاسی تاریخ کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے جب تک کہ ہم اس کا ادراک نہ کر لیں کہ شہر کے دیہی حلقوں سے حتمی انقطاع اپنے مستقبل کا راستہ متعین کرتا ہے اور یہیں سے تاریخی روایات کا آغاز ہوتا ہے۔ عالمی تاریخ فی الحقیقت شہری تاریخ ہی ہے۔

ایک طرف معاملہ ہمارے پیش نظر کلاسیکی دنیا کا ہے' جس میں کہ شہری دنیا کے ساتھ اقلیدسی تصورات منسلک کر لیے تھے جس کی رو سے وہ توسیع کو کم از کم سطح پر رکھنا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں بڑھتے ہوئے دباؤ کے پیش نظر ہر شہر کو ایک ریاست کا درجہ دے لیتے تھے۔ اس خاص واقعے کے قطع نظر ہمیں ہر ثقافت میں یہ نظر آتا ہے (اور جلد ہی) ہر شہر اپنے آپ کو دارالحکومت کی حیثیت دے لے گا۔ ایسے شہر جن کے نام اس کی نشاندہی کرتے ہیں' جن کی روح' جن کے طریق کار اور مقاصد' اور حکمت عملی کے فیصلے اور معاشیات متعلقہ ملک کو اپنے زیر نگیں رکھتی ہیں۔ زمین اپنے باسیوں کے ہمراہ بذاتہ روح' وسیلہ اور مقصد کی حیثیت کی حامل ہے۔ زمین تو یہ نہیں سمجھتی کہ کیا ہو رہا ہے' اور نہ ہی کوئی اس سے یہ سوال کرتا ہے۔ مگر اپنی ثقافت کے آخری ایام میں' بڑی بڑی جماعتیں' انقلابات' سیزری مزاج' جمہوریتیں' پارلیمنٹیں' دارالحکومتوں کے مزاج کی آئینہ دار ہوتی ہیں' اور اپنی توقعات کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے لوگ موت قبول کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ ان سے کہا جاتا ہے۔ کلاسیکی مباحث کا ذریعہ' پریس مغرب میں لازماً"

دارالحکومت کا حکمران انجن ہوتا ہے۔ کوئی دیہاتی باشندہ جو فی الواقع سیاست کے معانی کو ان ادوار کے حوالے سے سمجھتا ہے اور شہر میں منتقل ہو' نہ تو صرف جسمانی طور پر' بلکہ اپنی روح کے ساتھ شہری قیام کو قبول کرتا ہے ۔ عوامی رائے اور جذبات سے مراد دیہاتی کسان ہی کی رائے ہے ...... جہاں تک کہ اس کے وجود کے متعلق کہا جا سکتا ہے ...... جسے شہر کے رسل و رسائل اور نشرواشاعت کے ادارے مشتہر کرتے ہیں' مصر فی الحقیقت شیباہی ہے اور آربس کا علاقہ ہی روم ہے۔ اسلام کی علامت بغداد ہے اور فرانس سے مراد پیرس ہے۔ بڑے بڑے خطوں کا تاریخ کا فیصلہ بعض مرکزی شہروں میں ہی ہو جاتا ہے۔ مصری حکمران' ہومر کے عہد کے یونانی' اور رومی اضلاع اور آزاد شہر ہی قدیم دور کے تاریخ ساز تھے۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ حکمت عملی چند مخصوص شہروں میں مجتمع ہو جاتی ہے اور اس کے علاوہ ہر شے کے پاس صرف اس کے وجود کے قیام کا سایہ ہی رہ جاتا ہے۔ کلاسیکی عالم بھی شہر ریاستوں کے رجحان کا شکار تھا مگر اس کے باوجود انتقال آبادی کا عمل روکا نہ جا سکا۔ پیلوپونیشی جنگ کے دور قدیم میں بھی' صرف سپارٹا اور ایتھنز کے باشندے ہی حکمت عملی تیار کرتے تھے۔ بحیرہ آز کے قریب کے باقی شہر کسی نہ کسی بڑے مذکورہ شہر کے حامی اور زیر دست ہی تھے۔ ان کی اپنی حکمت عملی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بالآخر یہ شہر روم ہی کے چوک تھے' جہاں پر کلاسیکی تاریخ کا نظارہ دیکھا جا سکتا تھا۔ سیزر ممکن ہے کہ گال میں اپنی جدوجہد کا آغاز کرے اور اس کے قاتل مقدونیہ سے اپنی کوشش کا آغاز کریں' انٹونی مصر سے' مگر میدان جنگ میں جو کچھ بھی ہوا اس کا کچھ نہ کچھ تعلق روم سے ضرور تھا' اس کے بغیر واقعات کی وضاحت ممکن نہ ہوتی۔

(۴)

تمام سرکاری تاریخ کا آغاز ابتدائی جماعتوں سے ہوتا ہے۔ شرفا اور پجاری' اپنے آپ کو یکجا جمع کرتے ہیں پھر اپنا مرتبہ بلند کرتے ہیں اور اس طرح اپنے آپ کو کسانوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ بڑے اور چھوٹے شرفا کے طبقات جو بادشاہ اور غلاموں کے طبقے کے مابین' امرا اور روحانی قوتوں کے مابین' کام کرتے ہیں۔ قدیم سیاسی عمل کی یہی نوعیت تھی۔ ہومر کے ہم وطن ہوں یا چینی یاردی' شہروں کی تعمیر سے قبل یہی صورت تھی' لیکن شہروں کے وجود میں آنے کے بعد تاریخ نے اپنا اسلوب بدل لیا۔ مگر یہ سب انھیں طبقات کی بدولت تھا۔ یہ لوگ اپنے طبقے کا بہت زیادہ احساس رکھتے تھے' اس لیے تاریخ صرف انھیں طبقات کے گرد گھومتی ہے۔ کسانوں کی کوئی تاریخ نہیں' دیہات کو تاریخ عالم سے باہر رکھا گیا ہے اور ثروجن سے میتھراداتی جنگ تک' سیکسن بادشاہوں سے لے کر ۱۹۱۴ء کی جنگ تک جتنا بھی ارتقا ہوا ہے۔ انھیں فطری مناظر کے قریب سے گزرتا رہا ہے' کبھی کبھی ویران ضرور کیا گیا ہے مگر ان کی داخلی زندگی ان سے متاثر نہیں ہوئی۔

کسان ایک ازلی ابدی انسان ہے۔ وہ ہر اس ثقافت سے آزاد ہے جو شہروں میں جنم لیتا اور پھلتا پھولتا ہے۔ وہ قبل از ثقافت زندگی بسر کرتا ہے اور اس کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔ ایک بے زبان مخلوق جو

نسلاً" بعد نسل پیداوار میں مصروف رہتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایسے پیشوں تک محدود رکھتا ہے جن کا تعلق زمین سے ہو' اس کا رجحان بھی ایسے ہی پیشوں کی طرف ہے۔ وہ صوفیانہ روح کا حامل ہے۔ ایک خشک مگر سمجھدار' اور عقل مند جو صرف عملی معاملات سے اپنا تعلق قائم رکھتا ہے۔ وہ اس تاریخ عالم کو خون مہیا کرتا ہے' جو صرف شہروں ہی سے متعلق ہوتی ہے۔

شہری ثقافت جس قسم کی حکومت کی طرح ڈالتی ہے' معاشی رواجات' عقیدے کے متعلق تصورات' اوزار' علم' فن' وہ ان سب کو بددلی اور بے یقینی سے قبول کرلیتا ہے۔ ممکن ہے انجام کار وہ انھیں قبول بھی کر لے مگر وہ کبھی ان میں ترمیم نہیں کرتا۔ مغربی یورپ کے دہقان سے اپنے تمام عقائد کلاسیکی تہذیب کے لیے' جو لیٹرن سے ٹرینٹ تک پھیل گئے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ وہ آلات کشاورزی اور فرانسیسی انقلاب سے متفق رہا۔ مگر وہ خود اپنی اسی حالت پر قائم رہا' جو شارلیمن کے دور میں تھی۔ موجودہ دور کا دہقانی تقدس عیسائیت سے قدیم تر ہے۔ اس کے دیوتا بڑے بڑے مذاہب کے خداؤں سے زیادہ قدیم ہیں۔ اس پر سے اگر بڑے شہروں کا دباؤ ہٹا لیا جائے تو وہ واپس اپنی فطری حالت میں چلا جائے گا اور اسے احساس بھی نہ ہو گا کہ اس نے کچھ کھو دیا ہے۔ اس کی اصل اخلاقیات اس کی حقیقی مابعد الطبیعیات جو کہ ابھی تک کسی شہری عالم کی سمجھ میں نہیں آئی' اس قابل ہے کہ اسے مطالعہ کیا جائے' جو آج تک روحانی اور مذہبی تاریخ کی مذہبی حدود سے باہر رہی ہے۔

شہر گہوارہ دانش ہیں۔ ریاستی شہر آزاد عقل کے مالک ہیں۔ یہ جاگیردارانہ قوتوں کے خلاف مدافعت میں اور اپنے خون اور روایات کے تحفظ کے لیے قصباتی آبادی کو اپنی علیحدہ حیثیت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ پرانے تخت الٹ دیتی ہے اور ان کے حقوق کو محدود کر دیتی ہے' یہ سارا عمل عقل' استدلال اور عوام کے نام پر کیا جاتا ہے' جنھیں اس وقت تک صرف شہری افراد سمجھا جاتا ہے۔ شہری آبادی ہی مذہبی اصلاحات کا پرچار کرتی ہے اور خوش حالی کے دور میں قدیم مذہبی رہنماؤں اور پجاریوں کے مذاہب کے ساتھ ساتھ اپنا علیحدہ مذہب تشکیل کرتی ہے جو عوام کی صف بندی اور آزاد سائنسی نظریات پر مبنی ہوتا ہے۔ شہر کو زمین کی قدرو قیمت کا احساس ہوتا ہے۔ زمین کو کسانوں کی زندگی اور فکر سے بھی علیحدہ نہیں کیا جا سکتا' کیونکہ تجریدی زر کا تصور اشیا کی موجودگی کا محتاج ہے۔ اشیا کے تبادلے کا قدیم نام "بارٹر" یا مبادلہ اشیا ہے۔ ایسی صورت میں بھی جبکہ تبادلہ اشیا میں قیمتی دھات بھی شامل ہو۔ مگر ایسی صورت میں بھی نظام زر کا تصور پیدا نہیں ہوتا۔ یعنی اشیا کی تجریدی قیمت اس میں شامل نہیں ہوتی' کیونکہ کسی دھات کے واسطے سے یا کسی اور تجریدی معیار سے اشیا کی قیمت کے تعین کے لیے اشیا کے ناپ تول کا کوئی پیمانہ متعین کرنا ضروری ہے۔ کاروانوں کی مہم جوئی اور جہاز رانوں کے سفر مختلف آبادیوں کے مابین دور خوشحالی میں جاری رہتے ہیں اور تبادلہ اشیا بھی کرتے ہیں' مگر جب وقت کے ساتھ ساتھ یہ سفر اور مہم جوئی شہروں کے مابین ہونے لگتی ہے تو "زر" کا بھی سوال پیدا ہو جاتا ہے۔ صلیبی جنگوں کے بعد اور ہانسا اور وینیشیا والوں کے مناقشات سے قبل اور بحری مہم جوؤں کے مابین ' مائی سینی عہد میں بھی اور بعد میں آبادکاری کے زمانے میں اور یونانیوں کے لیے

ساحل سمندر پر واقع ہونے کی وجہ سے بھی یہ ضرورت شدت سے محسوس ہوئی۔ لہٰذا شہر سے صرف ذہانت ہی مراد نہیں' بلکہ نظام زر بھی ہے۔

پھر ایک ایسے دور کا آغاز ہوا جبکہ شہری ترقی قوت کے ایسے مقام پر پہنچ گئی کہ اسے دیہات اور ان کی دلیرانہ مہم جوئی کے خلاف اپنی مدافعت کی ضرورت نہیں رہی' بلکہ اس کے برخلاف ایک ایسی جابرانہ کیفیت وجود میں آ گئی' جس کے خلاف دیہاتی سرزمین ایک ایسی یاس انگیز مدافعتی جنگ پر مجبور ہو گئی' جس کے متعدد پہلو تھے۔ روحانی طور پر قوم پرستی کے خلاف' سیاست میں جمہوریت کے برخلاف' معاشیات میں زر کے خلاف ---- اس دور میں شہری آبادیاں جنھیں قابل ذکر کہا جا سکے' تعداد میں کم رہ گئی تھیں۔ ایسی صورت میں دیہاتی اور شہری زندگی میں امتیاز کی خلیج گہری ہو گئی۔ فی الحقیقت یہ روحانی امتیاز تھا' یعنی بڑے شہروں اور چھوٹے شہروں کے مابین آپ چھوٹے شہروں کو قصبات کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ آخرالذکر اپنی اہمیت کے لحاظ سے اپنے آپ کو دیہاتی قصبے کہنے لگے' حالانکہ وہ حقیقی طور پر دیہات نہیں تھے۔ یہ نہیں کہ قصباتی اور دیہاتی آبادیوں میں فرق کچھ کم ہو گیا تھا۔ مگر یہ فرق اس سے بہت کم تھا جو بڑے شہروں کی آبادیوں اور دیہات میں تھا۔ دیہات کی مکارانہ چالاکی اور بڑے شہروں کی دور اندیشانہ عقل دو نواع کے شعور بیدار ہیں' جن کے مابین باہمی سمجھوتہ بالعموم ممکن نہیں ہوتا۔ یہاں پر پھر یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ اہم امر باشندوں کی تعداد نہیں بلکہ ان کی روح یا مزاج ہے بلکہ بدیہی امر یہ ہے کہ تمام بڑے بڑے شہروں میں ایسے کونے موجود رہے' جن میں پرانے دیہاتی اپنی ڈگر پر قائم موجود رہے اور انھوں نے اپنی زندگی کا قدیم اسلوب قائم رکھا گویا وہ ابھی تک اپنی زمینوں پر رہ رہے تھے اور اس طرح ایک گلی کے دونوں اطراف میں رہنے والوں کے تعلقات اسی نوعیت کے رہے جیسا کہ وہ دو مختلف دیہات میں رہ رہے ہوں۔ فی الحقیقت ایک ایسی معاشرت کا ایک نیا مینار تعمیر ہو رہا تھا جس میں تعداد کی کمی اور تصورات کی بیشی' نیم دیہاتی عناصر سے آگے بڑھ کر اقلیتی سطح کی طرف لے جاتی ہے' جس میں سب سے اوپر حقیقی شہری مملکت کے باشندے جاگزیں ہوتے ہیں' وہ ہر اس مقام پر مطمئن ہوتے ہیں جہاں پر ان کا اصول موضوعہ قائم رہے۔

اس صورت میں "زر" کا تصور اپنی مکمل تجرید کے ساتھ سامنے آ جاتا ہے۔ اب یہ محض معاشی لین دین اور کاروبار کا ذریعہ نہیں رہا۔ اب اس کے تصور کا ارتقا اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ وہ تبادلہ اشیا محض اسی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اب قیمتوں کا تعین اشیا کے مقابلہ میں اشیا سے نہیں ہوتا' بلکہ اشیا بمقابلہ زر ہوتا ہے۔ مگر اس کا زمین اور زمیندار سے تعلق مکمل طور پر تو ختم نہیں ہوا' اور نہ ہی مکمل طور پر بڑے شہروں کی معاشی فکر تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ جنھیں "زرساز" کہا جاتا ہے۔ صرف اتنا فرق پڑا ہے کہ بعض حالتوں میں اسے نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ زر اب ایک قوت بن چکی ہے۔ ایک ایسی قوت' جو صرف ذہنی ہے اور اس دھات پر بھروسہ کرتی ہے جو اس میں استعمال ہوتی ہے۔ ایک ایسی قوت جس کی حقیقت کسی معاشرت کے بالائی طبقے کے شعور بیدار میں اپنا مظاہرہ کرتی ہے۔ ایک ایسی قوت جو اپنے متعلقین کو بالکل اسی طرح اس پر اعتماد کا مطالبہ کرتی ہے' جیسا کہ کسان اپنی زمین پر کرتا تھا۔ یہاں بھی ایک لمحہ فکریہ ہے

جیسا کہ ریاضی اور معدلت میں لحات فکر پیدا ہوتے ہیں۔

مگر زمین حقیقی اور فطری وجود کی حامل ہے' جبکہ زر تجریدی اور مصنوعی شے ہے۔ محض ایک زمرہ' جیسا کہ 'تیل کا عہد روشن خیالی میں ایک تصور تھا۔ لہٰذا ہر ابتدائی' قبل از شہریت' معیشت کائناتی قوتوں کی پابند اور محتاج ہوتی ہے زمین' آب و ہوا' انسان کی نسل وغیرہ مگر زر' جولین دین کی خالص اور حقیقی قوت کی حامل ہے' اور شعور بیدار کے لیے قابل قبول ہے' اب حقیقی امکانات اور منطقی حساب کتاب کی محتاج نہیں۔ جیسا کہ حقائق سی صورت میں بھی ہمیں نئے نئے ہندسی یا غیر ہندسی تصورات کی تشکیل سے منع نہیں کرتے لہٰذا ترقی یافتہ شہروں' ریاستوں میں افراط زر کا کوئی خوف نہیں ہوتا' یا زر مبادلہ کے متعلق فکر کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس میں خالص سونے کے ذخائر کی ضرورت نہیں ہوتی' یا اشیا کے حقیقی جمع شدہ ذخائر ضروری نہیں ہوتے۔ ایسا کوئی معیار قائم نہیں کیا جا سکتا جس میں جنگ پرشیا کی قیمت کا پومپئی سے حاصل ہونے والے مال غنیمت سے موازنہ کیا جا سکے۔ انسان کے لیے زر نے معاشی جانور کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یہ شعور بیدار کی فعالیت کی ایک صورت ہے۔ اس کی تکوین میں کوئی اساس نہیں۔ یہ ہر تہذیب کے آغاز میں قوت کا ایک جن ہے جو ہمیشہ سے زر کی آمریت کی علامت رہے گا۔ البتہ مختلف ثقافتوں میں اس کی صورت مختلف ہو گی۔ مگر یہ بھی ایک وجہ ہے جس کے لیے لازما" ایسے اتحاد کی ضرورت پیش آتی ہے جو بالآخر اس جن کی قوت اور استبداد سے نجات دلا سکے جیسا کہ دائیو قلیطی دور میں' اختتام پذیر تہذیب کے ذہن ہی سے اس کا تصور غائب ہو گیا تھا اور اس کی جگہ ابتدائی ارضی قدر اپنے مقام پر واپس آ گئی۔

بالآخر یہ عفریتی علامت اور ذہانت کا مکمل مظہر اور وہ مرکزی نقطہ جس پر پہنچ کر عالمی تاریخ کا اختتام ہو جاتا ہے خود بھی اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔ ہر تہذیب میں ایک ایسا دور آتا ہے' جہاں تمام مادر وطن ثقافت کے نام پر بدنام زمانہ صوبائیت کا شکار ہو جاتی ہے۔ اب صوبے ہی سب کچھ رہ گئے ہیں۔ زمین' قصبہ اور شہر کے سوا باقی کسی شے کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی۔ شرفا' بورژوا' آزاد اور غلام یونانی' غیر مہذب' عیسائی کافر کے نام کا امتیاز باقی نہیں رہا۔ تمام معاشرہ شہری اور صوبائی دو حصوں میں منقسم ہو گیا ہے۔ یہ تصور تمام عادات زندگی اور تمام نظریات زندگی پر غالب آ گیا ہے۔

تمام دنیا میں قدیم ترین شہر سلطنت جدید میں واقع بابل اور شیبا تھے۔ منعون کی دنیا کریٹ' اپنی تمام شان و شوکت کے ساتھ' مصر کا ایک صوبہ تھا۔ کلاسیکی عہد کی اولین مثال اسکندریہ تھا' جس نے صرف ایک جنبش سے یونان کو ایک صوبے میں تبدیل کر دیا اور روم' دوبارہ آباد شدہ کار بلکہ باز نطینی بھی مغلوب نہ کر سکے۔ ہندوستان میں بڑے بڑے شہر اجین' قنوج اور سب سے بڑھ کر پاٹلی پتر' چین اور جاوا تک مشہور تھے اور ہر شخص بغداد کی پریوں کی داستانوں سے آشنا ہے اور مغرب میں غرناطہ بھی مرکز علم و فضل تھا۔ میکسیکو میں اکس سال جس کی بنیاد ۹۵۰ء میں رکھی گئی) مایا حکومت کا اولین عالمی شہر تھا۔ مگر ٹولٹی کے عروج کے ساتھ تیز کوکو اور ٹینوچ طلان صوبائی حیثیت میں گر گئے۔

یہ کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ سب سے پہلے روم کے حکمرانوں نے سقلیہ کو صوبے کا نام دیا تھا جو ایک طرح سے دستوری خطاب تھا۔ سقلیہ پر قبضہ تاریخ کی پہلی مثال ہے کہ ایک مشہور آباد سرزمین کو محض شے مقبوضہ کی حیثیت میں گرا دیا گیا۔ سیراکیوز جو کلاسیکی دنیا کا پہلا عظیم شہر تھا اور اس وقت بھی اپنی معراج پر تھا' جبکہ روم خود ابھی تک ایک غیر اہم دیہاتی قصبہ تھا۔ اب روم کے مقابلے میں سقلیہ ایک صوبائی شہر کی حیثیت اختیار کر گیا یہی صورت ہربرگ' میڈرڈ اور پوپ کے شہر روم کو پیش آئی جو کہ سترھویں صدی میں یورپ کے سب سے بڑے شہر تھے۔ مگر اٹھارھویں صدی میں ان کی حیثیت صوبائی شہروں کی ہو گئی جبکہ یہ شہر لندن اور پیرس جیسے عالمی شہروں کے ہم پلہ تھے اور نیویارک کو ۶۵-۱۸۶۱ کی جنگ آزادی نے عالمی شہر کی حیثیت عطا کر دی۔ غالبا" یہ واقعہ انیسویں صدی کا دوررس اہمیت کا واقعہ ثابت ہو گا۔

(۵)

پتھر کا مجسمہ "عالمی شہر" ہر عظیم ثقافت کے اختتامی دور میں کھڑا ہوتا ہے۔ ثقافت کے باشندے' جنھیں مادر ارض نے روحانیت کا رنگ بخشا تھا' خود ہی اپنی تخلیق یعنی شہر کے پنجے میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور الٹا اس کی انتظامی مشینری کا ایک پرزہ یا تخلیق قرار پاتے ہیں اور بالآخر اس کا خود ہی شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ حجری تو وہ شہر مطلق ہے' اس کا تصور جو اس کی عظمت حسن کا مظہر دکھائی دیتا ہے' چشم انسان کے عالم کا نور ہے' اس میں حقیقی وجود کے فنا کی تمام علامات موجود ہیں۔ رومی عمارتوں کی پتھر میں رچی بسی روح' ہزار سالہ اسلوبی ارتقا کے بعد اب اس حجری صحرا کے بھوت کی شکل میں بے روح ہو چکی ہے۔

یہ آخری شہر صرف ذہانت انسان کا مظہر ہیں۔ ان کے گھروں کی صورت وہ نہیں رہی' جو آئی عونی اور باروق کے ادوار میں تھی .... یہ قدیم دہقان کے گھروں سے ماخوذ نہیں۔ یعنی ان کا اس دور سے کوئی تعلق نہیں' جبکہ ثقافت نے تاریخ کے موسم بہار میں اپنا مقام متعین کیا تھا۔ عام بات تو یہ ہے کہ یہ اب وہ مکانات نہیں رہے' جن میں کبھی "وستا' جینوس' لاریس اور پی نیٹز۔" اپنے قدیم رکھے تھے' بلکہ محض رہائشی سہولتیں ہیں' جن کو ایک مروجہ دستور کے تحت تشکیل کیا گیا ہے۔ ان میں کسی کے خون کی آمیزش نہیں' بلکہ صرف ضروریات کا خیال رکھا گیا ہے۔ ان میں احساس کی بجائے تجارتی مہم جوئی کا غلبہ ہے۔ جب تک کہ گھر کے چولہے کا تقدس قائم ہو' اور اسے خاندان کے حقیقی مرکز کا مقام حاصل رہے' تو زمین کے ساتھ اس کے قدیم تعلقات ختم نہیں ہوتے۔ لیکن جب وہ بھی دوسری اشیا کے ساتھ تغافل کا شکار ہو جائے اور گھر کا سمندر آرائش اور بستروں سے بھر جائے تو انسان صرف پناہ گاہ سے دوسری پناہ گاہ اور شکاری کی طرح ایک جنگل سے دوسرے جنگل میں سرگرداں ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کی حالت دوبارہ وہی ہو جاتی ہے' جو قبل از تاریخ کے دور میں تھی' گویا ایک پکا خانہ بدوش وجود میں آ گیا ہو۔ یہ شہر بجائے خود ایک عالم ہے۔ ایک دنیا ہے محض انسانی رہائش گاہ ہی اس کے معانی ہیں۔ یہ گھر محض اس پتھر کا ڈھیر ہیں' جن سے کہ یہ

تیار کیا گیا تھا۔

اب قدیم طرز کے روی شہر' گرجوں کے مراکز' ٹاؤن ہال' دورخی گلیاں قدیم دیواریں' مینار' دروازے' بارونق ترقی کے دور کے شرفا کے مرغولہ دار مکانات' محلات' عبادت گاہیں' یہ سب کچھ' ہر سمت میں بغیر کسی منصوبہ بندی کے پھیلا ہوا ہے' ان کی کثرت اور بے مقصد بیرک نما گھروں اور عمارتوں نے آس پاس کے دیہات کی تمام زرعی اراضی کو نگل لیا ہے اور گھروں کو گرا گرا کر بار بار تعمیر کرنے سے قدیم شرفا کے گھروں کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔ اب کسی قدیم مینار پر چڑھ کر نیچے دیکھیں تو گھروں کا ایک سمندر نظر آئے گا' جس سے نامیاتی ترقی کی بجائے غیر نامیاتی آغاز کا مشاہدہ ہو گا اور ایک قسم کا غیر محدود ڈھیر نظر آئے گا۔ اسے آپ مصنوعی' مبنی برریاضی' قطعی طور پر پس منظر سے غیر متعلق تخلیق جو صرف ذہنی اطمینان کے لیے شہری تعمیر میں شامل کر لی گئی ہے' تمام تہذیبوں میں یکساں طور پر یہ شہر شطرنج کی بساط بننا چاہتے ہیں' جو فقدان روح کی علامت ہے۔ ہیروڈوٹس کے چاروں طرف ایک باقاعدہ مستطیل موجود ہے جس کا مشاہدہ بابل' کورٹیز' اور ٹنٹنو کیٹیٹلان میں کیا جا سکتا ہے۔ کلاسیکی دنیا میں تجریدی شہروں کے ایک سلسلے کا آغاز ثورائی سے ہوا جس کی منصوبہ بندی ہپوداموس نے' جو ملیطس کا رہنے والا تھا' ۴۴۱ میں کی۔ پرین نے بساط شطرنج کا منصوبہ بنایا مگر وہ محل وقوع کے نشیب و فراز سے قطعاً" بے خبر رہا' اس کے بعد رہوڈس اور اسکندریہ کا نام آتا ہے' جو عہد سلطنت میں متعدد صوبائی شہروں کے لیے بطور نمونہ کام دیتے رہے۔ اسلامی ماہرین تعمیرات نے بغداد کے شہر کی منصوبہ بندی ۷۶۲ ء میں کی اور سامرا کا عظیم شہر اس سے ایک صدی بعد تعمیر کیا گیا۔ یہ دونوں شہر بھی منصوبہ بندی کے تحت تعمیر کیے گئے ۔ مغربی یورپ اور امریکہ کے شہروں میں واشنگٹن کی بنیاد ۱۷۹۱ء میں رکھی گئی اور یہ اس نوعیت کا پہلا بڑا منصوبہ تھا ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ چین میں ہان کے دور کے عالمی شہر اور ہندوستان میں خاندان موریہ کے آباد کردہ شہر اس ہندسی نمونے کے مخالف تھے' اور آج بھی مغربی تہذیب کے آباد کردہ بڑے بڑے عظیم شہر ترقی کی اس منزل تک نہیں پہنچ سکے۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ۲۰۰۰ ء کے بہت بعد تک ایسے شہر جو ایک یا دو کروڑ کی آبادی کے لیے بسائے جائیں گے وہ دیہات کا بہت سا علاقہ اپنے اندر جذب کر لیں گے اور ایسی بلند و بالا عمارتیں تعمیر کی جائیں گی' جن کے سامنے آج کی تعمیرات بونی معلوم ہوں گی۔ ذرائع آمدورفت اور نقل و حمل اتنے بڑھ جائیں گے کہ آج دیوانگی معلوم ہوتے ہیں ۔

آج بھی جبکہ تکوین اپنی آخری صورت اختیار کر رہی ہے' کلاسیکی انسان کے تصورات مادیت کی پابندیوں سے باہر نہیں نکل سکے۔ اگر ہمارے بڑے شہر ہمارے لامتناہیت کے رجحان کی تائید کرتے ہیں۔ ہمارے مضافاتی اور قصباتی شہر دیہات کی زمینوں پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ ہمارا شاہرات کا وسیع نظام اور تعمیرات سے بھرپور علاقوں کے درمیان ایک منضبط نظام حمل و نقل آمدورفت' جو کہیں راستوں کے زیر زمیں اور کہیں بالائے سر وسیع اور کھلی سڑکوں کی صورت میں رواں دواں ہیں' حقیقی کلاسیکی شہر توسیع کی کوشش نہیں کرتے تھے' بلکہ گنجان آبادی کے لیے کوشاں رہتے۔ گلیاں تنگ اور الجھی ہوئیں' جن پر تیز آمد و رفت

ناممکن ہو جاتی (حالانکہ رومی سڑکوں پر یہ نظام انتہائی ترقی یافتہ تھا)۔ کلاسیکی باشندے مضافات میں رہنے کے لیے تیار نہ ہوتے اور مضافاتی زندگی کو ناپسند کرتے اور اسے قابل رہائش بنانے کی کوشش ہی نہ کرتے اور شہر کو گنجان اور مدوار کرتے جاتے۔ گنجان آبادیاں جو قدیم کلاسیکیت کا خاصہ ہے آہستہ آہستہ دیہاتی آبادیوں کو بھی شہروں میں لے آیا اس سے شہروں کی وہ کیفیت بنی جو بالآخر ان کی بدصورتی کا باعث بنی۔ ہر شخص شہر کے وسط میں رہنا چاہتا تھا۔ اس مرکزی علاقے میں جہاں آبادی پہلے ہی سے گنجان تھی کیونکہ اس کے بغیر اسے خالص شہری باشندہ کون کہتا۔ یہ تمام شہر ایسے ہی ہیں جن کے اندرونی حصے گنجان آباد ہیں۔ اب مضافاتی شہروں کی بجائے وسطی گنجان آباد شہروں میں آبادی کا رجحان پیدا ہوا اور بالائی منزلیں بننے لگیں۔ ۷۴ء میں روم اپنی بہت بڑی آبادی کے باوجود صرف ساڑھے انیس کلومیٹر کے رقبے پر آباد تھا (۱۲ میل) ' اس کا نتیجہ نکلا کہ یہ شہر باہر کی طرف پھیلنے کی بجائے اوپر کی طرف بلند ہونے لگے۔ مشہور انسولا فیلکولہ کا محلّہ اس کے باوجود بلندی اختیار کرنے لگا' جبکہ اس کی کوئی بھی گلی پانچ میٹر (۱۰ سے ۱۷ فٹ) سے زیادہ چوڑی نہ تھی۔ اس کے مکانات اتنے بلند ہو گئے کہ یہ بلندی یورپی شہروں میں کبھی نہیں دیکھی گئی تھی ۔ اور ان کی مثال امریکہ کے صرف چند شہروں ہی میں ملتی ہے' دارالحکومت کے قریب کی چھتیں سیڈال کی پہاڑی کے برابر ہو گئی ہیں۔ مگر عظیم الشان شہروں کی آبادی میں مفلسین کی بہت بڑی تعداد پائی جاتی ہے' جن کی عادات انتہائی ناپسندیدہ نوعیت کی ہوتی ہیں۔ کھپریل کے بالا خانے اور نوابوں کی حویلیاں' ان کے حجرے' اور عقب صحن کوٹھریاں ایک نئی قسم کے ناپختہ انسانوں کی نسل پیدا کر رہی ہیں' بغداد اور بابل میں جیسا کہ ٹینک ٹیلان میں اور آج لندن اور برلن میں دیکھنے میں آ رہا ہے۔ دیادروس ایک معزول مصری بادشاہ کے متعلق بتاتا ہے کہ اسے معزولی کے بعد روم میں اسی قسم کے ایک بالا خانے میں رہنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

مگر یہ کیفیت کسی مجبوری کی بنا پر نہیں' نہ ہی یہ کسی بظاہر حماقت کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس جنوں بھوتوں کی دنیا کی کشش ہر شخص کو اس مصیبت میں مبتلا کرتی ہے۔ قضاوقدر کا یہ پہیہ اپنے انجام تک پہنچ کر رہتا ہے۔ اس شہر کی پیدائش ہی فنا کا پیش خیمہ ہے۔ آغاز اور انجام' ایک کسان کی جھونپڑی یا علیحدہ علیحدہ بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھر اور محلے ایک دوسرے سے اس طرح پیوستہ ہیں' جیسا کہ روح اور ذہانت' جیسا کہ خون اور ہڈیاں۔ مگر زمان ایک تجریدی جملہ نہیں مگر ایک حقیقت ہے جو گزر جائے تو کبھی واپس نہیں آتی۔ یہ صرف آگے بڑھتا ہے کبھی مڑ کر نہیں آتا۔ بڑا زمانہ گزرا کہ دیہاتی قصبات ہوا کرتے تھے' جنھیں فطرت اپنے اعلیٰ خون سے پالا کرتی۔ اب عظیم شہروں کا دور ہے جنھوں نے دیہات کو چوس کر خشک کر دیا ہے۔ یہ شہر بہت زیادہ لالچ اور پے درپے نئی انسانی ندیوں کو طلب کر کے کھا جاتے ہیں' یہاں تک کہ یہ خود ہی ختم ہو کر ویرانوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ جب کسی کو تاریخی عجوبے کا یہ حسن گرفتار کر لیتا ہے' پھر یہ اپنے شکار کو کبھی جانے نہیں دیتا۔ قدیم دور میں لوگ اپنا وطن چھوڑ کر خانہ بدوشی اختیار کر لیتے تھے' مگر یہ ذہین خانہ بدوش مزید کیا کرے گا؟ ایک شہر کے مکینوں کے لیے گھر کی یاد بہت شدید ہوتی ہے' وہ باقی تمام دکھ برداشت کر سکتے ہیں مگر گھر سے باہر نہیں جا سکتے۔ وہ لوگ جو بڑے بڑے شہروں کی

رہائش کے عادی ہوتے ہیں ان کے لیے قریب ترین گاؤں بھی غریب الدیاری کا منظر پیش کرتا ہے۔ وہ دیہات میں واپس جانے کی بجائے شہر کے پیدل راستوں پر مرجانے کو ترجیح دے گا۔ ہر قسم کی قرابت اس نمود و نمایش' تکان اور شوروغل سے اسے نجات نہیں دلا سکتی بالاخر شہری زندگی کا جنون متعدد افراد کی جان لے لیتا ہے۔ ان کے لیے پہاڑوں اور سمندروں کی کوئی اہمیت باقی نہیں۔ دیہات ان کی ذات میں ایسے گم ہو چکے ہیں کہ وہ انھیں بیرونی دنیا میں کبھی تلاش نہیں کر سکتے۔

وہ کون سے عوامل ہیں جن کے اثر کے تحت انسان بڑے شہروں میں رہنا پسند کرتا ہے' حالانکہ شہری زندگی ہر لحاظ سے مصنوعی بنیادوں پر استوار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زمانہ حال کے انسان میں لا متناہیت کی دھڑکن روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے جبکہ شعور بیدار کا ہیجان لحہ بہ لحہ زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عالم صغریٰ میں' کہ حیات کا حیوانی پہلو نباتاتی پہلو پر غالب آتا جا رہا ہے' یعنی تکوین سے وجود کی طرف سفر جاری ہے' جبکہ اس کے خلاف ممکن نہیں۔ دھڑکن اور ہیجان خون اور ذہانت قضاوقدر اور علت و معلول کا باہم رشتہ وہی ہے جو بہار میں دیہات اور شہروں میں پتھروں کی دیواروں کا ہے یعنی اول الذکر صورت میں مختلف اشیا بھی باہم مل کر چلتی ہیں اور ان کا وجود ایک دوسری پر منحصر ہے۔ ہیجان کائناتی دھڑکن کے بغیر عدم کی طرف روانی کی عبوری منزل ہے۔ تہذیب کے تمام باقی ماندہ افراد کے لیے ان کا دماغ صرف ہیجان ہی کا اظہار کرتا ہے۔ ذہانت صرف ہیجانی کیفیات کی شدت کے تحت ہی ادراک سے مستفید ہو سکتی ہے اور ہر ثقافت میں ایسے افراد کی رائے کو حتمی سمجھا جاتا ہے' ان کا دہقانی دماغ سے موازنہ کرنا چاہیے۔ جب ایسا کیا جائے گا تو اس کے نتیجے میں بڑے شہروں کی گلیوں کے رہائشی افراد برآمد ہوں گے اور دیہات کی دانائی سے آگے نکل کر عقل کی کمزوری کے سوا کچھ نہ پایا جا سکا۔ ان کی جبلت میں ماسوائے دل کی حیوانی دھڑکن کے اور کچھ نہ نکلا ---- اگرچہ شہر کی روح بین الاقوامیت کا پرچار کرتی ہے ---- مگر اپنے فن تعمیر میں پرانی لامتناہی بنیادوں کو ترک کے صرف مرغولوں کے اس سے اور کچھ بھی پیش نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قضاوقدر کا احساس بتدریج کم ہوتا گیا اور علت و معلول کی ضروریات کے پیش نظر ہر شے میں بلا روک ٹوک اضافہ ہوتا گیا۔ ذہانت' غیر شعوری طور پر زندگی گزارنے کی بجائے ذہنی مشق رہ جاتی ہے اگرچہ یہ بجائے خود ایک کمال ہے' مگر غذائیت میں کمی کی وجہ سے صالح خون سے محروم ہے۔ ذہانت کا چہرہ تمام نسلوں میں یکساں ہوتا ہے جو کچھ بھی کمی ان میں سے کسی میں رہ جاتی ہے وہ نسل ہے۔ جب لزوم اور بدیہی تکوین کے متعلق احساس کمزور ہو جاتا ہے تو وضاحت کی عادت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ شعور بیدار میں خوف کی جس قدر زیادتی ہوتی ہے اس قدر علت و معلول کے نظریات کے مطابق اسے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے لہٰذا ایسے علم کے اظہار اور پرچار کی ضرورت پیش آتی ہے' جو سائنسی نظریات کا بدل ہو اور مذہب کا سہارا لے کر علت و معلول کے اثرات کا اساطیری پہلو غالب آ جاتا ہے۔ لہٰذا تجریدی زر کی بھی وہی صورت ہے' جو معاشی زندگی میں علت و معلول کی ہے۔ تبادلہ اشیا ایک قدیم اور غیر مہذب رسم ہے جو محض ارتعاش ہے ہیجان نہیں۔

ہیجان جب ذہنی صورت اختیار کر لیتا ہے تو وہ کسی تفریح سے آشنا نہیں رہتا جو کہ عالمی شہروں کے ساتھ مخصوص ہے مثلاً آرام یا سکون۔ حقیقی کھیل' ورزش سے لطف اندوزی اور مخموریت جو کائناتی دھڑکن کا نتیجہ ہیں اور اپنے مزاج کے لحاظ سے قابل فہم ہیں۔ مگر سخت دماغی محنت کے بعد' اس کے برعکس ---- شعوری اور عملی خود فراموشی ---- یا پھر دماغی محنت کے بعد کسی حد تک جسمانی مشقت' کوئی کھیل ' یا جسمانی ارتعاش' یا حسی اور روحانی مصروفیت' تاکہ منطقی قلابازیوں کے بعد ذہنی سکون میسر آ سکے۔ ہنگامہ خیز دن گزارنے کے بعد تصوف کے اشغال بھی لطف و سرور کا ذریعہ ہیں۔ دور تہذیب کے تمام عالمی شہروں میں یہ عمل یکساں چلتا ہے۔ سینما' اظہار و بیان کی مجالس' تجلی باری تعالیٰ' مکہ بازی کے مقابلے ' رقص ' پوکر' اور ریس' یہ سب کچھ روم میں موجود تھا۔ اگر آپ مزید تحقیق کریں تو ہندوستان' چین' اور عرب دنیا کے عالمی شہروں میں ان اشغال کے سراغ مل سکیں' صرف ایک مثال کافی ہے یعنی کاماسوترا کا مطالعہ کریں۔ یہ ذرا حیران کن بات ہے کہ بدھ مذہب نے بھی مردوں کے ذوق کے متعلق سامان مہیا کرنے کی گنجایش پیدا کی۔ قدیم کنسوس کے محلات میں سانڈوں کی جنگ کے مناظر موجود ہیں۔ انھیں مختلف تحقیقی نظر سے مشاہدہ کرنا چاہیے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کسی مسلک کے تصور کا نتیجہ ہیں۔ مگر ان سب میں ایک انداز مشترک ہے جیسا کہ روم میں بھی تھا کہ مروجہ آئی سیس کے مسلک کے عبادت خانوں کے قریب کرتب گاہیں بھی پائی جاتی تھیں۔

اور جب تکوین کی جڑیں اچھی طرح سے کھو دی جا چکی ہوں' اور تکوین بیدار اچھی طرح سے آزمائی جا چکی ہو' تو اچانک تاریخ کی چمکدار روشنی میں ایک اور تناظر سامنے آتا ہے' جو مدتوں سے زیر زمین عمل پیرا تھا' اب منصۂ ظہور پر آ جاتا ہے۔ وہ ڈرامہ ہے' جو تہذیب کے بانجھ پن کی علامت ہے۔ یہ عمل علت و معلول کے تحت کوئی واضح نشاندہی کا حامل نہیں ہوتا' جسے فوری طور پر سمجھ لیا جائے (جدید تحقیقی سائنس نے اسے بخوبی سمجھنے کی کوشش کی ہے)۔ اسے محض موت کی طرف ایک مابعدالطبیعیاتی اقدام سمجھنا چاہیے۔ عالمی شہر کا آخری باشندہ مزید زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ وہ ایک فرد کی حیثیت سے زندگی سے چمٹ سکتا ہے مگر نوع کے لحاظ سے' ایک مجموعی معاشرے کے لحاظ سے ہرگز نہیں' کیونکہ اجتماعی حیات کی علامت یہ ہے کہ موت کا خوف ختم کر دیا جائے۔ وہ شدید اور ناقابل وضاحت خوف جو کسانوں کے سروں پر سوار تھا کہ خاندان کا نام اور شہرت داغدار ہو گی' اب ختم ہو چکا ہے اور اب اس کے کوئی معانی نہیں۔ خونی رشتوں کا استدام' بظاہر دنیا میں خون کا فریضہ نہیں رہا اور کسی کا کسی خاندان کا آخری فرد ہونا' خاندان کی بربادی کا مظہر نہیں سمجھا جاتا۔ بچوں کی پیدائش اس لیے نہیں رکی کہ اب ان کی ولادت ناممکن ہو گئی ہے بلکہ اس لیے کہ اب ذہانت جو اپنی بلندیوں تک پہنچ چکی ہے ان کا وجود مزید ضروری نہیں سمجھتی۔ قاری سے یہ درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسان کی روح سے ہمنوا کر کے دیکھے۔ وہ اپنے قطعہ زمین پر قدیم زمانے سے قابض ہے ! اس سے اس قدر تعلق قائم کر رکھا ہے کہ وہ اس کے خون کا حصہ بن چکا ہے۔ وہ بھی اس کے ساتھ اسی قسم کی جڑیں پکڑ چکا ہے کہ وہ بھی اس کے آباواجداد کا وارث ہے اور مستقبل کے ورثا کا بزرگ کہلائے گا۔ اس کا گھر' اس کی جائیداد' ذرائع' متعلقہ شخص کے ساتھ عارضی تعلقات کی حامل نہیں' جو مختصر

دورانیہ کے لیے ہوں بلکہ دائمی اور داخلی طور پر خون اور زمین کے رشتے کا مظہر ہیں۔ یہ تسویہ کے اسی سری اعتقاد کا نتیجہ ہے کہ ادوار کا ایک چکر چلتا رہتا ہے۔ نسل کشی' ولادت اور موت ---- اس میں سے حیرت کا عنصر خارج کر دیں' جو رواج اور مذہب کو باہم یکجا کر کے زمین سے منسلک کر دیتا ہے۔ آخری انسانوں کے لیے یہ سب قصہ ماضی ہے اور ختم ہو چکا ہے ۔ قدیم خاندان ذہانت اور بانجھ پن ساتھی ہیں' بوڑھے لوگ اور فرسودہ ثقافتیں ان سب کو محض اس لیے قصہ پارینہ نہیں سمجھتے کہ ہر عالم مغربی میں ان پر شدید دباؤ ڈالا جا چکا ہے' بلکہ اس لیے بھی کہ پابہ زنجیر حیوانی عنصر نے نباتاتی عنصر کو کھا لیا ہے اور اس لیے بھی کہ شعور بیدار کی زبہ سے تکوین کو سلہ علت و معلول کے تحت پرکھا جاتا ہے اور یہ کہ ذہین آدمی' انتہائی نمایاں اور امتیازی طور پر اسے فطری اکیکت یا قوت حیات کا نام دیتا ہے۔ وہ نہ صرف اسے سلسلہ علت و معلول کے طور پر جانتا ہے بلکہ اسی کے تحت اس کی قدر و قیمت کا تعین کرتا ہے اور اسے اپنی ان ضروریات میں شامل کر لیتا ہے جو اس کی قوت فیصلہ متعین کرتی ہے۔ نئی نسلوں یعنی بچوں کے لیے ان کے حق میں یا خلاف ایک اہم موڑ آ چکا ہے۔ کیونکہ فطرت اس حمایت و مخالفت کی ذہنی قلا بازیوں سے بے خبر ہے۔ جہاں پر بھی اور جیسے بھی زندگی کو حقیقی حیثیت حاصل ہے' ایک داخلی منطق نامیاتی حیثیت میں برسرکار رہتی ہے۔ ایک "ضمیر واحد" ایک کوشش' جو تکوین بیدار سے کلی طور پر آزاد ہے جس میں کوئی علتی رابطہ موجود ہو' مگر فی الحقیقت شخص مذکور بھی اس سے آشنا نہیں۔ ابتدائی انسان کا وسیع و عریض علاقوں میں پھیل جانا ایک فطری امر تھا' جس کے متعلق کسی سوچ بچار کی نوبت نہ آئی ہو گی' اور اس پر کبھی افادیت یا ضرر کے حوالے سے بھی کبھی غور نہیں کیا گیا۔ زندگی کے مسائل کے بارے میں استدلال کی ضرورت پیش آئے تو خود زندگی بھی سوالات کا موضوع بن جاتی ہے۔ یہی وہ موقع ہے جب بچوں کی ولادت پر پابندی کی نوبت آتی ہے۔ کلاسیکی دنیا میں پوبی اس نے اس عمل کو یونان کی تباہی سے تعبیر کیا' لیکن اس کے باوجود یہ عمل بڑے شہروں میں آج تک جاری ہے' اور روم کے آخری دور میں تو یہ عمل تشویش ناک حد تک پہنچ گیا۔ شروع میں تو متعلقہ عہد کی معاشی مصیبتوں کا بیان کیا جاتا ہے' لیکن جلد ہی یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ وضاحت کی کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی' اور ایسے مواقعات پر بھی بدھ ہندوستان میں بابل کی طرح اور روم میں بھی بالکل ہمارے شہروں کی طرح' مرد ایسی عورتوں کو تلاش کرتے ہیں جو کسان اور قدیم عورتوں کی طرح بچوں کی ماں بن سکیں' بلکہ صرف اس کی زندگی کا ساتھی ہوں۔ یہ مسئلہ انسانی ذہنیت کا ہے۔ ابسن طرز کی شادی اعلیٰ روحانی تعلق کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔ جس میں کہ دونوں فریق آزاد رہتے ہیں' آزاد اپنی ذہانت کی طرح اور نباتات کی طرح آزاد' جس میں کوئی ایسا خونی تقاضا موجود نہیں کہ باہمی تعلق مستقل ہو یا دائمی ہو' جیسا کہ شاہ نے کہا تھا کہ " جب تک کہ عورت' اپنی نسوانیت' اپنے خاوند سے متعلق فرائض' بچوں کے لیے فرائض' معاشرتی فرائض' قانونی فرائض' یعنی ہر قسم کے فرائض' ماسوائے اپنی ذات کے فرائض' کو مسترد نہ کر دے وہ اپنے آپ کو مسترد نہیں کر سکتی"۔ ابتدائی نوعیت کی یا کسان عورت صرف ماں ہے اور وہ تمام پیشہ ورانہ صلاحیتیں' جن کے لیے وہ بچپن سے آرزو کرتی ہے' سب اسی ایک لفظ میں شامل ہیں۔ لیکن اب ابسن عورت سامنے آ گئی ہے' ایک ساتھی' ڈرامے کی ہیروئن' بلکہ تمام مغربی ادب کی ہیروئن' ڈرامے سے لے کر ناول تک۔ وہ بچوں کی بجائے تضاد روح کا شکار ہے۔ شادی تو تعلقات باہم کے قائم رکھنے کا فن ہے جو الہام

و تفہیم پر مبنی ہے۔ سب صورتوں میں انجام کار صرف ایک ہے خواہ یہ امریکی خاتون کے بچوں کا مسئلہ ہو' جو کہ ہر موسم میں ایک نیا شگوفہ چھوڑتی ہے' یا پیرس میں رہنے والی خاتون کا ہو' جسے ہمیشہ یہ خوف کھاتا رہتا ہے کہ اس کا عاشق اسے چھوڑ کر چلا جائے گا یا ابسن کی ہیروئن کا' جو صرف اپنی ذات سے دلچسپی رکھتی ہے۔ یہ تمام کی تمام عورتیں صرف اپنی ذات کی غلام ہیں اور سب کی سب بے ثمر ہیں۔ یہ تمام حقائق اسکندریہ روم' یا تقریباً تمام مہذب معاشروں میں پائے جاتے ہیں اور بالخصوص اس معاشرے میں بہت نمایاں ہیں جہاں بدھ پروان چڑھا۔ یونانیت میں' اور انیسویں صدی میں جیسا کہ لاؤ تزو کے عہد میں ہوا' اور چرواکا کے نظریات و عقائد سب میں بچوں کے بغیر ذہانت کی اخلاقیات موجود ہیں' اور ان میں وہ ادب بھی موجود ہے جو نورا اور نانا کے داخلی ہیجان کا نتیجہ ہے۔ بھرا ہوا تیروان جو ورتھر کے ایام تک اعزاز کی علامت تھا' اب صوبائی حیثیت اختیار کر گیا۔ زیادہ بچوں کا باپ بڑے شہروں میں ایک کارٹون معلوم ہوتا ہے۔ ابسن کو بھی یہ حقیقت معلوم تھی اور اس نے اپنی کتاب "محبت کا طربیہ" میں اس کا ذکر کیا ہے۔

اس سطح پر تہذیب ایک نئے دور میں داخل ہوتی ہے' جو کئی صدیوں پر محیط ہوتا ہے' اور آبادی کو کم کرتا رہتا ہے۔ ثقافتی انسان کا بنایا تمام مینار غائب ہو جاتا ہے۔ یہ اوپر سے گرنا شروع ہوتا ہے' پہلے عالمی شہر' پھر ان کے صوبائی نمونے' اور بالآخر پورا ملک ہی اس کا شکار ہو جاتا ہے' جس کا بہترین خون قصبات میں منتقل ہو چکا ہوتا ہے۔ محض انھیں کچھ وقفے کے لیے ناجائز سہارا دینے کے لیے۔ بالآخر صرف ابتدائی نوعیت کے انسان ہی زندہ رہ جاتے ہیں' مگر اس دوران اس کے مضبوط ترین عناصر ختم ہو چکے ہوتے ہیں یہ بقیہ آبادی محض نسل قائم رکھنے کی ایک کوشش ہے۔

اگر ان حقائق کی روشنی میں دیکھیں تو صرف یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ سلسلہ علت و معلول کا تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ کلاسیکی دور کا مشہور زوال ہے جو جرمن انتقال آبادی سے بہت پہلے حاصل کیا جا چکا تھا۔ غرور و نخوت کو مکمل امن میسر آ گیا۔ یہ پرکشش اور ترقی یافتہ تھا اور بہت اچھی طرح سے منظم تھا اور اسے ایسے معقول بادشاہوں کا سلسلہ نصیب ہوا' نروا سے لے کر مارکوس آرلی اس تک قائم رہا۔ یہ بادشاہ سیزر کے اصولوں پر چلتے رہے۔ بادشاہوں کے ایسے سلسلے کی کسی اور تہذیب میں نظیر نہیں ملتی' پھر بھی اس ملک کی آبادی تیزی سے اور تھوک کے حساب سے کم ہو گئی۔ مایوسی کے عالم میں شادیاں اور بچے اور آگسٹس کا قانون یاد آئے اور اس کے ساتھ ہی متبنیٰ بنانے کے قانون کی یاد آئی' جس نے رومیوں کو واروس کے لشکروں سے بھی زیادہ نقصان پہنچایا۔ بڑے پیمانے پر بربری نسل کے فوجیوں کے بچوں کو مسلسل متبنیٰ بنایا گیا تاکہ دیہات کی کم ہوتی ہوئی آبادی کی جگہ لے سکیں۔ غریب والدین کے بچوں کو نروا اور ٹراجن بادشاہوں نے خیرات میں بڑے پیمانے پر خوراک تقسیم کی لیکن کوئی بھی تدبیر آبادی کی کمی کو سنبھالنے میں کارگر نہ ہوئی۔ پہلے اٹلی پھر شمالی افریقہ اور گال اور بالآخر ہسپانیہ جو قدیم سیزروں کے دور ہی سے سلطنت کا گنجان آباد خطہ تھا بالکل خالی اور سنسان ہو گئے۔ پلائنی کا مشہور مقولہ جسے آج قومی معاشیات کے سلسلے میں بالتواتر بیان کیا جاتا ہے یعنی "زرعی پیداوار ہی کسی ملک کا بہترین سرمایہ ہے" گویا سرمایہ زوال کے بہاؤ کو

تبدیل کر سکتا ہے۔ بڑے بڑے شہر کبھی بھی زوال کا شکار نہ ہوتے اگر کسانوں کا طبقہ شہروں اور قصبوں میں منتقل نہ ہو جاتا۔ یہ زوال اگر کھلم کھلا نہ بھی ہو' پھر بھی کسی قوم کو داخلی لحاظ سے ناکام بنا دیتا ہے اور وہ قوم اپنی زرعی زمین پر توجہ نہ دینے کی وجہ سے اس سے محروم ہوتی جاتی ہے' کیونکہ زمین بنجر ہو جاتی ہے بالآخر ۱۹۳ء میں پرٹی نیکس کے فرمان کی وجہ سے صحیح حقیقت سامنے آگئی' جس میں اس نوعیت کی کھلی اجازت دے دی گئی تھی کہ جو شخص بھی چاہے غیر مزروعہ اراضی کو' خواہ وہ اٹلی میں واقع ہو یا صوبہ جات میں' کاشت کر سکتا ہے اور اگر وہ اسے زراعت کے تحت لے آئے' تو وہ اسے اپنی جائز اور قانونی ملکیت بنا سکتا ہے۔ تاریخ کا طالب علم باقی تمام تہذیبوں میں بھی اس صورت حال کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ مصر کے انیسویں خاندان کے بعد وہاں بھی آبادی کے ختم ہونے کا عمل اسی پس منظر کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے امینوفس چہارم کے عہد میں تل عمرانہ کی گلیوں کی چوڑائی پچاس گز ہو گئی۔ قدیم زمانے میں آبادی کی گنجانی کے پیش نظر اس چوڑائی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بحری قزاقوں کے حملوں کی مدافعت بھی شاذ ہی کی گئی۔ ان کی لوٹ مار اور قبضے کے احتمالات بھی ویسے ہی تھے' جیسے چوتھی عیسوی صدی میں جرمنوں کے رومی دنیا کے خلاف تھے اور سب سے بڑھ کر ۹۴۵ ق م میں لیبیا کے لوگوں نے اپنے رہنما کے تحت آگے بڑھ کر نیل کے دہانے کے بہت سے حصے پر قبضہ کر لیا۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ ۴۷۶ء میں اوڈاسر نے عمل کیا تھا۔

اشوک کے بعد بدھ مت میں بھی یہی رجحان دیکھا گیا   اگر ہسپانوی فتح کے بعد مایا کی آبادی بالکل ہی ختم ہو گئی اور ان کے شہر جنگلات میں تبدیل ہو گئے ---- تو اس سے صرف فاتحین کا ظلم و ستم ہی ثابت نہیں ہوتا---- اگر اس خطے میں ایک طاقتور اور نوجوان ثقافت کا وجود ہوتا جو اپنی تجدید کے قابل ہوتی تو یہ حادثہ ہوتا ---- مگر بلا شبہ اس تہذیب کا زوال مدتوں پہلے شروع ہو چکا تھا' اور اگر ہم اپنی تہذیب کی طرف توجہ دیں' تو ہمیں معلوم ہو گا کہ فرانس کے شرفا کے قدیم خاندان انقلاب فرانس کے دوران زیادہ تر برباد نہ ہوئے تھے۔ بلکہ ۱۸۱۵ء کے بعد ان میں سے بیشتر موت کا شکار ہوئے اور ان کا بانجھ پن بورژوا کی صورت اختیار کر گیا اور ۱۸۷۰ء تک کسان بھی اس سے متاثر ہوئے' جنھوں نے بار دیگر قریبا" قریبا" انقلاب پیدا کر دیا۔ انگلستان میں اور اس سے بھی بڑھ کر ریاست ہائے متحدہ میں بالخصوص مشرقی ریاستوں میں ---- یہ وہی ریاستیں ہیں جہاں سرمایہ کی حالت آغاز ہی سے سب سے بہتر ہے ---- نسلی خودکشی کا عمل' جس کا روز ویلٹ نے انسداد کرنے کی کوشش کی' بڑی مدت سے بڑے پیمانے پر جاری ہے۔

اس کے نتیجے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان تہذیبوں میں ہر مقام پر صوبائی شہر اپنی ابتدائی حالت میں ہیں اور بڑے بڑے شہر اپنے ارتقا کی آخری منازل پر ہیں' خالی ہو رہے ہیں' اور اپنے پتھروں کے ڈھیر میں فلاحین کی چھوٹی سی آبادی کو لے کر آباد ہیں' جو ان شہروں میں پناہ تلاش کرتی ہے' جس طرح کے ابتدائی دور کا انسان غاروں میں پناہ تلاش کرتا تھا   ۔ سمارا دسویں صدی میں خالی کر دیا گیا۔ اشوک کی راجدھانی پاٹلی پترا ۶۳۵ء میں جب ہیون سانگ ایک چینی سیاح ہندوستان میں آیا' تو بالکل خالی تھا' اور اس کے تمام مکانات گر چکے تھے اور مایا کے متعدد شہر بھی کورٹیز کے دور میں اسی حالت میں ہوں گے۔ کلاسیکی مصنفین کی

طویل فہرست میں پولی بس کے بعد   ہم پڑھتے ہیں کہ متعدد قدیم شہر تباہ ہو چکے تھے' یا ان کی آبادی اتنی کم ہو چکی تھی کہ گلیاں خالی ہو گئی تھیں۔ چوکوں اور کھیل کے میدانوں میں مویشی باندھے جاتے تھے اور تھیٹر میں فصل کاشت کی جا رہی تھی   ۔ کہیں کہیں بت اور حرم کے آثار تھے۔ پانچویں صدی میں روم کی آبادی صرف ایک گاؤں کے برابر تھی مگر اس کے شاہی محلات ابھی بھی قابل رہائش تھے۔

پس یہ شہری تاریخ کا آخری نتیجہ ہے کہ اس کا آغاز قدیم تبادلہ اشیا کے مرکز کے طور پر ہوتا ہے۔ پھر یہ ثقافتی شہر بنتا ہے اور اس کے بعد عالمی شہر کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ پہلے تو اپنے خالقوں کے خون اور روح کو چوس لیتا ہے جس سے اس کے ارتقا کی ضروریات پوری ہوتی ہیں اور پھر اس کی نشوونما کا آخری پھول تہذیب کی روح کی نظر ہو جاتا ہے۔ پھر بربادی کے دہانے پر پہنچ کر اپنی آخری تباہی کو اپنے ہاتھوں سے مکمل کر لیتا ہے۔

(۶)

اگر پہلا دور شہر کی دیہات میں سے تشکیل کے وصف کا حامل ہے اور مابعد کا دور شہر اور دیہات کے مابین جنگ کا دور ہے تو پھر تہذیبی دور کی صفت یہ ہے کہ دیہات پر شہر کو فتح حاصل ہو گئی۔ اگر اس کے نتیجے میں شہر اپنے آپ کو زمین کے پنجے سے آزاد کرا لیتا ہے' مگر اس کا حتمی نتیجہ خود اس کی اپنی تباہی پر منتج ہوتا ہے۔ کائنات میں جڑوں کے بغیر مردہ حالت میں' ناقابل تنسیخ حد تک پتھر اور ذہانت سے عمل ارتکاب' کے بعد یہ ایک ایسی زبان کو رواج دے لیتا ہے جو اس کی روح کی ہر صفت کا اظہار کرتی ہے ---- اس زبان کا عمل تکوین یا نشوونما سے کوئی تعلق نہیں ہوتا' بلکہ وجودیت اور تکمیل سے جو یقینی طور پر تغیر تو لا سکتی ہے مگر ارتقا سے محروم ہوتی ہے۔ قضاوقدر کی بجائے' علت و معلول' اب وہ زندگی کی سمت نہیں بلکہ توسیع کی طرف حکمرانی کرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر ثقافت کی رواجی زبان' اس کے ارتقا کی تاریخ کے ساتھ ساتھ اپنے اصل مقام سے پیوست رہتی ہے۔ تہذیبی صورتیں ہر جگہ موجود ہوتی ہیں اور اس قابل رہتی ہیں کہ کچھ کر سکیں۔ لہٰذا جونہی وہ ظاہر ہوتی ہیں لا محدود ارتقا اور توسیع کا مظہر ہوتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ شمالی روس میں رہائشی مکانات رومی طرز تعمیر کے مطابق تیار کیے گئے' جبکہ جنوبی امریکہ میں باروق فن تعمیر سے کام لیا گیا۔ مگر یہ رومی طرز تعمیر کا اپنی حدود سے معمولی سا مظاہرہ بھی مغربی یورپ میں ممکن نہ ہوتا۔ بالکل ویسے ہی جیسے اتھنی یا برطانوی ڈرامہ یا فن زباندانی' یا لوتھر کا مذہب یا مکالمی نغمہ نگاری کا ہنر' دوسری ثقافتوں میں مروج کرنے کی کوشش کی جاتی یا ان کے اپنے رسوم و رواجات میں شامل ہی کیا جاتا' مگر اسکندریہ کی اور رومی ثقافت کا مزاج ایسا ہے کہ جو دنیا کے ہر شہری انسان کے لیے بلا امتیاز قابل قبول ہے رومانویت کا آغاز اس مقام سے ہوتا ہے جہاں پر رومی وسیع بصارت کا اختتام ہوتا ہے۔ جسے عالمی ادب کہا جاتا ہے' عالمی شہروں کا ادب جس کے مقابلے میں صوبائی ادب کو اپنی سرزمین سے پیوست سمجھا جاتا ہے مگر اس کی مقدار بہت کم ہوتی ہے اس لیے اسے اپنے آپ کو زندہ رکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے اور اس کے لیے جدوجہد کرنا

پڑتی ہے۔ وینس کی ریاست' یا فریڈرک اعظم' برطانوی پارلیمنٹ' (ایک موثر حقیقت کی حیثیت سے) دوسری جگہ پیدا نہیں کیے جا سکتے۔ مگر جدید دستور کسی بھی افریقی یا ایشیائی ملک میں متعارف کرایا جا سکتا ہے اور اسی طرح شہری ریاستیں نمودیا یا قدیم انگلستان میں قائم کی جا سکتی ہیں۔ مصر میں جو طرز تحریر مروج ہوا وہ خط تصویری نہ تھا' مگر حروف ہجی پر مبنی تھا' (خط حرفی تھا) یقیناً یہ اس تہذیب کی تیکنیکی دریافت تھی لہٰذا حقیقت میں یہ ان کی ثقافتی زبان نہیں' جیسا کہ یونانی جو سوفا کلیز نے استعمال کی یا وہ جرمن زبان جو لوتھر نے تحریر کی۔ مگر عالمی زبانیں جیسا کہ یونانی' کو لیتی' اور عربی' بابلی یا انگریزی' کسی بھی عالمی شہر میں کام دے سکتی ہیں اور اس قابل ہیں کہ ان کو کوئی بھی اپنا لے یا ہر کوئی اپنی زبان بنا لے۔ لہٰذا ہر تہذیب میں جدید شہر یکسانیت کو اپنانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ہم جہاں چاہیں جائیں' ہمیں برلن' لندن' اور نیویارک ہر جگہ ملیں گے' جیسا کہ رومی سیاح جہاں بھی جائے گا اسے رومی فن تعمیر ملے گا۔ اس کی نباتات' مجسمات' مندر' پالیرا' ٹرائز یا ٹم گاڈ اور پھر یونانی شہر جو ایک وقت سندھ سے لے کر آرال تک آباد تھے۔ مگر جس شے کو شہرت نصیب ہوئی وہ اسلوب نہ تھا' بلکہ ذوق تھا' صحیح رواج نہیں بلکہ رہن سہن (اطواریت)' قومی لباس نہیں مگر فیشن۔ اس عمل سے دوردراز کے لوگوں کے لیے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ کسی تہذیب کی مستقل کامرانیوں سے کچھ حاصل کر سکیں' بلکہ انھیں مناسب تبدیلیوں کے ساتھ مزید علاقوں میں فروغ دے سکیں۔ تہذیب کی روشنی کے ایسے علاقے' جنوبی چین اور بالخصوص جاپان ہیں (جو ۲۲۰ء میں ہاں دور میں متحد کر دیئے گئے تھے)۔ جاوا فی الحقیقت برہمن تہذیب ہے اور کارتھیج نے اپنی ہیئت بابل سے حاصل کی۔

یہ تمام شعور بیدار کی صورتیں ہیں۔ دست درازی کے باعث انھیں کم یا محدود کر دیا گیا ہے مگر یہ کائناتی قوتوں کی دست درازی نہیں بلکہ محض ذہنی توسیع کا نتیجہ ہے' مگر محض اسی وجہ سے یہ اس قدر طاقتور آخری اور مرتعش شعاعیں پیدا کر سکتی ہیں' جو تمام کرہ ارض پر پھیل سکتی ہیں۔ آپ چینی تہذیب کے بعض حصے سکنڈے نیویا کے جنگلات میں مشاہدہ کر سکتے ہیں' بابل کے اوزان جنوبی سمندروں میں' کلاسیکی سکے جنوبی افریقہ میں اور ہندوستانی اور مصری اثرات غالباً سرزمین میں انکاس میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

جبکہ توسیع کا یہ عمل تمام حدود سے متجاوز ہو رہا تھا' تہذیب کی داخلی ہیئت کا ارتقا اپنی استقراری حالت کو قائم رکھنے کی بھرپور کوشش میں مصروف تھا۔ تین مختلف مراحل کا امتیاز ضروری ہے ---- ثقافت سے نجات' تہذیب کی پیدائش' اور آخری جدوجہد ---- ہمارے لیے ابھی تک یہ صورت پیدا نہیں ہوئی۔ جیسا کہ میں دیکھ رہا ہوں' یہ جرمنی کے مقدر میں ہے کہ یورپ کا آخری ملک ثابت ہو تاکہ عظیم تخت پر بیٹھے۔ اس سطح پر زندگی کے تمام سوالات ---- شمسی' مجوسی یا فاؤستی زندگی ---- اپنی آخری حد تک سوچے جا چکے ہیں اور انھیں علم یا لاعلمی کے خانوں میں تقسیم کر لیا گیا ہے۔ اب مختلف نظریات پر جنگ نہیں ہوتی۔ آخری تصور ---- جو فی نفسہ تہذیب سے متعلق ہے' اس نے اپنا خاکہ تیار کر لیا ہے۔ تکنیک اور معاشیات ہی دو مسائل رہ گئے ہیں' جن پر بحث اور حل باقی ہیں۔ مگر یہ وسیع فرض منصبی صرف آغاز ہے' اصول موضوعہ کا افشا ابھی باقی ہے اور اسے تمام حیات ارضی پر نافذ کرنا مطلوب ہے۔ صرف اس وقت

کے بعد جب یہ فرض ادا کیا جا چکے اور تہذیب کا صحیح معنوں میں قیام عمل میں آ جائے' نہ صرف شکل و صورت کے لحاظ سے بلکہ پوری طرح سے چھا جائے اور اپنے وجود کو سختی سے قائم رکھ سکے۔ ہر ثقافت میں اسلوب خود نفاذی کے عمل میں ایک چال کی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ مگر تہذیبی اسلوب (اگر ہم اس لفظ کو استعمال ہی کریں) اظہار تکمیل کا ذریعہ ہے۔ یہ اس حصول کا باعث ہوتا ہے ---- بالخصوص مصر اور چین میں ---- اور شاندار تکمیل پر منتج ہوتا ہے پھر اس تکمیل کو زندگی کے ایسے تمام مظاہر پر نافذ کرتا ہے جو داخلی طور پر ناقابل تغیر ہوتے ہیں' اپنی تقریبات' چال ڈھال میں عمدہ اور سوچے سمجھے انداز میں انھیں اپنے فنون میں استعمال کرتا ہے اور تاریخ میں ایک عمدہ معیار کی خواہش موجود رہتی ہے' اور اس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں' مگر اس میں بھی آسان اور سطحی قبولیت کی گنجائش موجود رہتی ہے' جس کی بنا پر ایک معیاری زبان اظہار کے باوجود شکوک اور سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ چینی اور جاپانی تصویر کشی میں (جیسا کہ ہم جانتے ہیں) اور ہندوستانی فن تعمیر میں اس نوعیت کی تاریخ موجود ہے' جیسا کہ رومی فن تعمیر کے حقیقی اسلوب کی تاریخ اور نیم فنی اسلوب سے بالکل مختلف ہے۔ اسی طرح صلیبی جنگوں کے بہادر چینی سورماؤں سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ مکمل وجود کی بجائے تکوینی سطح پر ہیں۔ اول الذکر تاریخ کا حصہ ہیں جبکہ ثانی الذکر مدتوں پہلے تاریخ کو مکمل کر چکے ہیں۔ مدتوں قبل' میں کہتا ہوں کہ اس تہذیب کی تاریخ ابھی سامنے آ رہی ہے' جیسا کہ عظیم شہروں کی تاریخ' جس کا چہرہ ہر آن بدلتا رہتا ہے' مگر اصل ہیئت کبھی نہیں بدلتی۔ ان شہروں میں روح کا فقدان ہوتا ہے۔ یہ ایسی سرزمین ہے جو متحجر ہو چکی ہے۔

وہ کون سی شے ہے جو یہاں فنا ہو جاتی ہے؟ اور وہ کیا ہے جو باقی رہتی ہے ؟ یہ تو ایک حادثہ تھا کہ جرمن عوام نے ہون کے دباؤ کے تحت رومی زمین پر قبضہ کر لیا اور اس طرح کلاسیکی باشندوں کو چینی سرحدی ریاستوں پر مزید قابض رہنے سے روک دیا۔ بحری قزاقوں کی نقل و حرکت (جو اپنی تمام تفصیلات میں بھی جرمن حملہ آوروں کے اقدام سے بالکل ملتی جلتی تھی) جب انھوں نے ۱۴۰۰ ق م میں مصری تہذیب کے خطے پر حملہ کر دیا تو بمشکل جزیرہ کریٹن تک ہی پہنچنے میں کامیاب ہو سکے۔ پھر ان کا لیبیا اور قرنیقیا کے ساحلوں پر حملہ بھی بری طرح ناکام ہوا۔ حالانکہ وا ئکنگ کا بحری بیڑہ بھی ان کے ساتھ شامل تھا۔ بالکل ویسی ہی صورت پیدا ہوئی تھی جس طرح کہ ہون کے لشکروں کا چینیوں کے خلاف حملہ ناکامی سے ہمکنار ہوا تھا۔ کلاسیکی تہذیب کا اختتام بھی اسی سلسلے کی اہم ترین مثال ہے' جو ایک ایسے زمانے میں شکست و ریخت کا شکار ہوئی' جبکہ وہ ترقی کے پورے عروج پر تھی۔ جرمنوں نے اس خطے پر حملہ تو کر دیا مگر وہ صرف ان کی تہذیبی اقدار کی بالائی سطح کو ہی تباہ کر سکے' یعنی صرف معاشرتی اقدار کے نظام کو تہ و بالا کر دیا اور اپنی قبل از ثقافتی بود و باش کو ان پر مسلط کر دیا' مگر وہ محکوم قوم کی ازلی اور ابدی حیات کی برکتوں تک کبھی رسائی نہ حاصل کر سکے۔ یہ تمام معاملات پوشیدہ ہی رہے' کیونکہ ان پر روایتی زبان کی چادر چڑھا دی گئی تھی جیسا کہ تاریخی حقائق کے ساتھ اکثر پیش آتا ہے اور آج تک جنوبی فرانس' جنوبی اٹلی' اور شمالی ہسپانیہ کے علاقے اسی مادی تاثر کو برداشت کر رہے ہیں۔ ان ممالک میں کیتھولک مسلک پر ایک گہرے کلاسیکی رنگ کی تہ چڑھا دی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ ان ممالک کے کیتھولک کلیسا پر مغربی یورپ کے کلیسا کی ایک تہ جما دی گئی ہے۔

(بلکہ قبل از کلاسیک کی روایات بھی) جو کلاسیکی مسالک میں غلط ملط کر دی گئی ہیں۔ بالعموم اب اس میدان میں وہ دیوی دیوتا (رشی، منی، سینٹ) شامل کر لیے گئے ہیں کہ ان کے نام تو کیتھولک ہیں، مگر وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے کلاسیکی ہیں۔

یہاں پر ایک اور عنصر کی تصویر نمایاں ہوتی ہے، ایک ایسا عنصر جس کی اپنی اہمیت ہے۔ ہم نسلی مسئلے سے دو چار ہوتے ہیں۔

باب پنجم

شہر اور باشندے (نسلیں اور اقوام)

(ب)

عوام الناس، نسلیں اور زبانیں

(ا)

تمام انیسویں صدی کے دوران، تاریخ کی سائنسی ہیئت کو ایک ایسے تصور کے تحت غیر موثر بنا دیا گیا، جو یا تو رومانیت سے حاصل کیا گیا تھا یا اسے اس سے تقویت پہنچی تھی ---- یعنی عوام الناس کا تصور اور اس لفظ کے مفہوم کا اخلاقی جوش و خروش۔ اگر کسی مقام پر قدیم زمانے کے کسی نئے مذہب، کسی نئے زیور یا نئی تعمیر یا کسی نئے رسم الخط کا سراغ ملتا تو اس کے متعلق جو سوال اٹھتا کہ اس کی ان معاملات کے حوالے سے تنقید کی جائے ---- اس انسانی نسل کا نام کیا تھا جس نے یہ مظہر پیدا کیا؟ مسئلے کی یہ وضاحت جدید دور کی مغربی روح اور مزاج کے ساتھ مخصوص ہے۔ لیکن یہ ہر لحاظ سے اس قدر غلط ہے کہ اس سے معاملات کے وقوع کی جو تصویر بنتی ہے وہ کسی لحاظ سے بھی درست نہیں ہوتی۔ "عوام الناس" ہی قطعی اور بنیادی حقیقت ہیں اور اسی صورت میں بنی نوع انسان پوری طرح سے موثر ہیں، ان کا اصل گھر، اصل مقام قیام،

عوام الناس کی نقل مکانی ---- یہ تمام اس مرتعش تصور کا انعکاس ہے جو ۱۷۸۹ء کے نیشن میں پیش کیا گیا۔ نیزووک ۱۸۱۳ء میں بھی شائع ہوا۔ ان کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ انگلستان اور تنگ نظر عیسائیت کے اعتقادات کا نتیجہ ہیں۔ مگر تمام شدت شوق جو اس تصور میں موجود ہے۔ اس کی وجہ سے یہ تصور تنقید سے محفوظ ہو گیا ہے۔ پرجوش محققین نے بھی متعدد متضاد اشیا پر پردہ ڈال دیا ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ "عوام الناس" ایک متعین وحدت کی ہیئت اختیار کر چکے ہیں اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ تمام کی تمام تاریخ انھیں کے گرد گھومتی ہے۔ ہمارے لیے آج تاریخ عالم کا مطلب ہے ---- غالباً" اس کا بدیہی مطلب واضح نہیں کیا جا سکتا یا یہ کہ یونانی اور چینی تاریخ ہی کو تاریخ عالم کا مقام دے دیا جائے ---- اس کے علاوہ ہر شے، ثقافت ادوار، دانائی، مذاہب عوام الناس ہی کی تخلیق ہے گویا ریاست عوام الناس ہی کی ہیئت کا نام ہے۔

اس باب کا مقصد یہ ہے کہ اس تصور کو ختم کر دیا جائے کرہ زمین پر برفانی دور کے زمانے سے انسان آباد ہیں، عوام الناس نہیں۔ پہلی مثال یہ ہے کہ قضاوقدر کا تعین جسمانی وراثت کی حقیقت (توارث) کی بنیاد پر کیا جاتا ہے، یعنی ان عناصر کی بنیاد پر جو والدین سے اولاد میں منتقل ہوتے ہیں۔ یعنی خون سے خون پیدا ہوتا ہے اور مختلف گروپوں میں منقسم ہوتا ہے اور اس عمل میں ارضی جڑوں کا رجحان موجود رہتا ہے۔ خانہ بدوش قبائل بھی اپنی نقل و حرکت مخصوص علاقوں تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ اس سے حیات کے نباتاتی پہلو کی نشاندہی ہوتی ہے جس کی رو سے تکوین ہی میں میقات کا کردار متعین کر دیا جاتا ہے۔ ان کو میں، نسل، قبیلے، ہم نسلی گروہ، قبائلی گروہ اور خاندان کے نام دیتا ہوں جو صرف نسلی ولادت ہی کا نتیجہ ہیں۔ خواہ وہ ایک تنگ یا وسیع خطہ ارض پر آباد ہوں۔

مگر بنی نوع انسان عالم صغریٰ میں حیوانی پہلوئے حیات سے بھی متصف ہے، جو اس کے شعور بیدار، باہمی تعلق اور استدلال کی صفات سے ظاہر ہوتا ہے اور وہ ہیئت جس کے مطابق ایک انسان دوسرے انسان کے شعور بیدار سے مربوط ہوتا ہے میں اسے زبان کا نام دیتا ہوں۔ اگرچہ اس کا آغاز محض غیر شعوری ذریعہ اظہار سے ہوتا ہے، جسے بطور تحسس قبول کیا جاتا ہے۔ مگر بتدریج یہ ایک شعوری تکنیک کے ابلاغ کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ اس کا انحصار اس عام ادراک پر ہے جس کی رو سے علامات (اصوات) کو معانی پہنائے جاتے ہیں

تحریر کی رو سے ہر نسل ایک عظیم جسم ہے اور ہر زبان جو ایک شعور بیدار کی استعدادی قوت ہے جو متعدد افراد کو متحد کرتی ہے۔ ہم ان دونوں (نسل اور زبان) کے متعلق کوئی بھی حتمی دریافت نہ کر سکیں گے جب تک کہ ہم ان کا جائزہ بیک وقت نہ لیں اور بار بار ان کا باہم مقابلہ نہ کریں۔

علاوہ ازیں ہم انسان کی اعلیٰ تاریخ کو اس وقت تک سمجھنے سے قاصر رہیں گے، اگر ہم یہ حقیقت

فراموش کر دیں کہ انسان جو ایک نسل کا فرد ہے اور اس کی اپنی ایک زبان ہے اور ایک طرف تو وہ دموی اکائی ہے اور دوسری طرف ادراکی وحدت کا ایک رکن ہے۔ دونوں صورتوں میں یعنی اپنی تکوین محض کے لحاظ سے اور اپنی تکوین شعور کے لحاظ سے اس کی قضاوقدر مختلف ہے۔ لہٰذا اس کی نسلی لحاظ سے حقیقت ترقی اور میقات مختلف ہے اور لسانی لحاظ سے حقیقت ترقی اور میقات مختلف اور ایک دوسری سے بالکل آزاد ہیں۔ نسل ایک کائناتی، نفسی اور میقاتی لحاظ سے کسی قدر مبہم ہے اور اس کی فطرت کا داخلی حصہ اہم کائناتی روابط سے مشروط ہے۔

اس کے برخلاف زبان کا تعلق علتی صورتوں سے ہے اور انھیں ذرائع کے اختلاف اور تعدد پر کام کرتی ہے۔ ہم نسلی جبلت کی بات کرتے ہیں اور لسانی روح کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔ مگر ان دونوں کی دنیائیں قطعاً" الگ الگ ہیں۔ کیونکہ نسل میں "زمان" اور "آرزو" کے گہرے معانی پوشیدہ ہیں، جبکہ زبان میں مکان اور خوف کا مطلب مخفی ہے۔ مگر یہ سب کچھ آج تک ہم سے پوشیدہ رہا ہے کیونکہ "عوام الناس" کے پردے تلے چھپے رہے ہیں۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ "تکوین" اور "رابطہ" شعور بیدار کی لہریں ہیں۔ اول الذکر کی طبیعی شکل موجود ہے جبکہ ثانی الذکر کی بنیاد محض ایک نظام پر ہے۔ نسل کو جب ہم اپنے اردگرد کی دنیا کی شکل میں دیکھتے ہیں، تو یہ جسمانی کرداروں کا مجموعہ نظر آتا ہے۔ مگر صرف اسی حد تک جہاں تک کہ یہ کسی باشعور کردار میں موجود ہوں۔ اس مقام پر ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر جسم بچپن سے لے کر پیرانہ سالی تک ترقی کی منزلیں طے کرتا رہتا ہے اور استقرار حمل کے وقت جو اس کی ہیئت طے کر دی جاتی ہے اس کی تکمیل کرتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ جسم (اس کی ہیئت کے ماسوائے) ہروقت تجدید کے عمل سے بھی گزرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں جسم میں فی الحقیقت اس کی اصل کا ماسوائے وجود کے کچھ بھی اپنی اصل حالت میں باقی نہیں رہتا اور اس میں اس کا صرف وہ حصہ ہم جانتے ہیں جو وہ وقتاً" فوقتاً" ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اور شعور بیدار میں ہم اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ انسان اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ سے نسل کے لحاظ سے بعض محدود اوصاف کا پابند ہے جنھیں دیکھا جا سکتا ہے گویا نسلی اوصاف کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے مگر بعض امور مشاہدے سے ماورا ہیں جن پر نہ غور کیا جا سکتا ہے اور نہ انھیں آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے، مثلاً" وہ بو جو صرف حیوانات کے ساتھ مخصوص ہے اور سب سے بڑھ کر انسان گفتار کے انداز۔ اس کے برخلاف دوسرے اعلیٰ حیوانات میں نسلی اثرات کا مشاہدہ صرف نظر سے نہیں کیا جا سکتا۔ بو بہت تیز ہوتی ہے، مزید برآں حیوانات میں تحسس کا ایک ایسا ملکہ ہوتا ہے جسے انسان سمجھ نہیں سکتا۔ نباتات کی بھی مختلف نسلیں ہوتی ہیں۔ ہر مالی ان سے آشنا ہے۔ میرے نزدیک یہ انتہائی دلگداز کیفیت ہے کہ ہم تو جب محسوس کرتے ہیں کہ موسم بہار کے پھولوں کو کھاد کی ضرورت ہے یا وہ جب یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان ثمرباری کی خواہش ہے، تو اس کی تکمیل کر دی جاتی ہے مگر نہ وہ اپنی چمک دمک ایک دوسرے کو دکھا سکتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں۔ مگر حیوانات سے وہ ضرور مکالمہ کر سکتے ہوں گے کیونکہ یہ ملکہ صرف حیوانات ہی کو حاصل ہے کہ رنگ و بو کا مشاہدہ کر سکیں۔

زبان میرے نزدیک عالم شعور کی ایک آزادانہ فعالیت ہے۔ کیونکہ یہ ایک حیوان ناطق سے دوسرے تک ادراک کے لیے کچھ سامان مہیا کرتی ہے۔ نباتات تکوین بیدار سے محروم ہیں۔ چونکہ وہ حرکت بھی نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ان کی کوئی زبان بھی نہیں۔ حیوانات کے وجود کا شعور بیدار کی قوت صرف گفتار میں مخفی ہے۔ خواہ انفرادی حرکات اس کا بیان کر سکیں یا نہ کر سکیں' خواہ شعوری یا غیر شعوری عمل کسی مختلف سمت کی طرف مخاطب ہونے کا خواہش مند ہو۔ ایک مور جب اپنی دم پھیلاتا ہے تو بلاشک محو گفتار ہوتا ہے۔ مگر جب بلی کسی سوت کے گچھے سے کھیلتی ہے جو غیر شعوری طور پر ہم سے بھی محو کلام ہوتی ہے۔ اگرچہ ہم صرف اس کی حرکات سے لطف اندوز ہوتے ہیں ہر انسان جانوروں کی حرکات سے آشنا ہے خواہ وہ شعوری ہوں یا غیر شعوری اور حیوانات کو اس کا علم ہو یا نہ ہو کہ ان کا مشاہدہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن ہر حیوان اپنی حرکات کے واسطے سے ضرورت کے مطابق فوراً محو تکلم ہو جاتا ہے۔

اس بحث کے نتیجے میں ہم کلامی کی دو انواع تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ زبان جو دنیا کے لیے ذریعہ اظہار ہے! ایک داخلی ضرورت ہے اور ایک ایسی فطری آرزو جو تمام ذی حیات میں اپنی نمود و نمائش کے لیے موجود ہے تاکہ وہ سب کے سامنے اپنے وجود کا اظہار کر سکے اور وہ زبان جو صرف بعض معین وجود ہی کے ادراک و فہم کے لیے ہو۔ گویا زبان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ زبان بطور ذریعہ اظہار اور زبان ذریعہ ابلاغ۔ اول الذکر صرف شعور بیدار سے وجود میں آتی ہے۔ اور دوسری کا شعور بیدار سے ایک رابطہ ہے۔ ادراک سے مراد یہ ہے کہ آپ نے کسی مبہمی اشارے کے رد عمل کا اظہار کر دیا اور اس کو اپنے احساس کی اہمیت سے منسلک کر لیا۔ ایک دوسرے کا ادراک' باہم مکالمہ' مخاطب سے ہم کلامی سے مراد یہ ہے کہ مخاطب اور متکلم کے تصور معانی میں یکسانیت موجود ہے۔ اظہار کی زبان کا دوسرے لوگوں کے مابین ایک متکلم کے وجود کا ثبوت ہے مگر ابلاغ کی زبان سے مراد مخاطب کی ذات کے وجود کا اثبات ہے "میں" سے مراد متکلم ہے۔ جبکہ "تم" سے مراد مخاطب کی ذات کے وجود کا ثبوت ہے "تم یا مخاطب" کے لیے ضروری ہے کہ وہ متکلم کی زبان کا ادراک کر سکے۔ کیونکہ قدیم انسان' ایک درخت' ایک پتھر یا بادل بھی مخاطب ہو سکتا ہے۔ ہر دیوتا "مخاطب" ہو سکتا ہے۔ پریوں کی کہانیوں میں کوئی ایسا قصہ نہیں ہوتا جو انسان سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں جب ہم شاعرانہ جوش و خروش دیکھیں تو ہمیں ایسے تکلیف وہ لمحات میں صرف اپنی طرف دیکھنا چاہیے کہ زمانہ حال میں بھی کسی بھی شے کو مخاطب کیا جا سکتا ہے۔ متکلم کے وجود (میں) کے دوسری شے جو سامنے آتی ہے وہ مخاطب (تو) ہی ہے متکلم کا وجود یعنی میں' اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ اپنی ذات سے باہر دوسرے وجود کے اور اپنی ذات کے مابین پل موجود ہے۔

یہ تقریباً ناممکن ہے کہ مذہب اور اظہار کی زبانوں اور خالص اظہار کی زبان کے مابین حد بندی کی جا سکے اور یہ بھی سچ ہے (اور فی الحقیقت بالخصوص) کہ اعلیٰ ثقافتوں کا ارتقا دوسروں کے مقابلے میں علیحدہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو کوئی شخص اس وقت تک کلام نہیں کرتا جب تک کہ اسے کسی شے کے متعلق

ابلاغ کی ضرورت محسوس نہ ہو' اور دوسری طرف ہم اس ڈرامے سے واقف ہیں' جس میں کہ شاعر کچھ کہنا چاہتا ہے' جو وہ بطور نصیحت و تاکید بھی اتنا ہی بہتر یا اسی کے برابر کہہ سکتا ہو اور ایسی نقاشی جس کے مندرجات کی غرض تعلیم' نصیحت یا اصلاح ہو یونانی قدامت پسند کلیسا میں جو تصاویر' مذہبی صداقت کے ثبوت کے طور پر دکھائی گئی ہیں' وہ ایسے خوف ناک مناظر پیش کرتی ہیں' جن کے متعلق انجیل نے کبھی ایسا کرنے کا حکم نہیں دیا۔ ہوگرتھ کا بدل عبادت وذکر یا خدا سے براہ راست کلام جو رواجی مسلک کے تحت تبدیل کیا جا سکتا ہے' وہ انسان کے ساتھ براہ راست کلام ہی کی صورت ہے۔ فن کے مقصد کے لیے نظریاتی اختلاف کا انحصار اس مسئلے پر ہے کہ فنی زبان کسی بھی حالت میں ابلاغ کی زبان نہ ہو اور پجاری کے پیشے کا تناظر لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے پر مبنی ہے اور اس مفروضے پر کہ اس زبان کو صرف پجاری ہی سمجھتا ہے' جس کے ذریعے خدا سے ہم کلام ہوا جا سکتا ہے۔

تکوین کی تمام لہریں تاریخی اور تکوین بیدار کے تمام سلسلے مذہبی مہر کے نشانات کے حامل ہوتے ہیں جو کچھ بھی ہر خالص مذہب میں جبلی سمجھتے ہیں یا زبان میں فنی ہیئت قرار دیتے ہیں اور بالخصوص ہر رسم الخط کی تاریخ میں (کیونکہ تحریر آنکھوں کے لیے زبانی کلام ہی ہے) وہ انسانی واضح بیان کی غرض سے بھی بلا شبہ حقیقت پر مبنی ہے۔ بلا شبہ جب الفاظ کا آغاز ہوا ہو گا (جس کے متعلق اب ہم کچھ بھی نہیں جانتے) یقین سے کہا جاتا ہے ان کے ساتھ کسی نہ کسی مسلک کا رنگ بھی وابستہ ہو۔ مگر دوسری طرف نسل اور زندگی کے ہر شعبے کے مابین تلمیتی رابطہ موجود ہے۔ (مثلاً" حصول اقتدار کے لیے جدوجہد) تاریخ (بطور قضاوقدر) یا آج کی زبان میں سیاست اسی خواہش کا نتیجہ ہے۔ یہ غالباً بہت زیادہ عجیب و غریب دکھائی دے گا کہ اس کی تائید میں یہ دلیل پیش کریں کہ بعض نباتات دوسرے درختوں سے چمٹ کر (مثلاً" بیلیں) ان کے اوپر چڑھ جاتی ہیں اور ٹہنیوں کے اوپر پہنچ کر تازہ ہوا حاصل کرتی ہیں اور ان درختوں سے اپنے لیے غذا بھی حاصل کرتی ہیں یا چکارک اور چکور کے نغموں میں ہم کسی مذہبی علامت کا کھوج لگائیں مگر یہ یقینی امر ہے کہ ان اشیا کے حوالے سے' تکوین کلام اور تکوین بیدار' نبض اور ہیجان' سب مل کر ایک ایسے سلسلے کو جنم دیتے ہیں جس میں کوئی انقطاع یا خلا محسوس نہیں ہوتا اور وہ جدید تہذیب کی ہر سیاسی یا مذہبی ہیئت تک براہ راست رسائی حاصل کر لیتا ہے۔

اور اس طرح ہم ان دو عجیب و غریب الفاظ کی کلید حاصل کر لیتے ہیں جو ماہرین نسلیات نے دنیا کے دو مختلف حصوں میں قدرے محدود اطلاق کے لیے دریافت کیے اور اب وہ تنقیدی حلقوں میں بہت اہمیت حاصل کر چکے ہیں۔ وہ الفاظ ہیں TOTEM (قبائلی نشان) اور TABOO (امتناع)۔ یہ الفاظ معمہ اور ناقابل تعین معانی کی صورت اختیار کر گئے۔ جس قدر یہ احساس بڑھتا گیا کہ ان الفاظ کی بدولت ہم زندگی کی ایک حقیقی بنیاد تک رسائی حاصل کر رہے ہیں جو محض ابتدائی انسان کی صورت میں نہیں اور اب اس تحقیق کے نتیجے کے طور پر ان ہر دو الفاظ کے معانی ہمارے سامنے ہیں۔ ان دو الفاظ کی مدد سے ہم تکوین اور تکوین بیدار کے حتمی معانی دریافت کر سکتے ہیں' جو قضاوقدر اور علت و معلول ""نسل اور زبان"۔ "زمان و مکان"۔

"آرزو اور خوف" "نبض اور ہیجان"۔ "سیاست اور مذہب" کے ہیں۔ انسانی حیات کا ٹوٹمی پہلو نباتاتی نوعیت کا ہے اور اس میں جملہ تکوین شامل ہے۔ جبکہ امتناعی پہلو حیوانی ہے اور تکوین کی کائنات میں آزادانہ نقل وحرکت کا قائل ہے ہمارے ٹوٹمی اعضا گردش خون اور نسل کشی سے متعلق ہیں اور ہمارے امتناعی اعضا کا تعلق حواس اور اعصاب سے ہے۔ ہر وہ شے جس کا تعلق ٹوٹم سے ہے' اس کی شکل و صورت ہوتی ہے اور ہر وہ شے جس کا تعلق امتناع سے ہے اس کا اپنا نظام ہوتا ہے۔ ٹوٹمیت میں تکوین کا مشترک احساس موجود رہتا ہے جو کہ ایک ہی دریائے حیات سے برآمد ہوتا ہے۔ اسے نہ تو حاصل کیا جا سکتا ہے نہ اس سے جان چھڑائی جا سکتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے بلکہ تمام حقائق کی واحد حقیقت اور ہر وہ شے جس کا تعلق امتناع سے ہے اس کے برخلاف اس کا تعلق سلسلہ تکوین بیدار سے ہے۔ اس کا ادراک کیا جا سکتا ہے اور اس حاصل کیا جا سکتا ہے اور محض اسی بنیاد پر اسے مسلکی معاشرے' فلسفی' مدارس فکر' فنون ' اجتماعات' جن میں سے ہر ایک کی اپنی مخفی زبان ہوتی ہے' خفیہ رکھتے ہیں ۔

مگر تکوین کے متعلق شعور بیدار کے بغیر بھی سوچا جا سکتا ہے مگر اس کے برعکس ممکن نہیں' مثلاً" ایسی نسلیں ہو سکتی ہیں جن کی کوئی زبان نہ ہو مگر زبان کا وجود نسل انسانی کے بغیر نا ممکن ہے۔ پس نسل کے لیے باقاعدہ ذریعہ اظہار کا ہونا لازمی ہے جسے وہ شعور بیدار کی مدد کے بغیر آزادانہ استعمال کر سکے اور اس کے ذریعے حیوانات اور نباتات کے حوالے سے اظہار و بیان کر سکے۔ یہ اصطلاح ---- اسے لسان اظہار سے خلط ملط نہ کیا جائے' جو اظہار کے فعال تغیر و تبدل پر مشتمل ہے ---- بغرض مشاہدہ نہیں' بلکہ وجود محض ہے۔ جس کی شکل و صورت بھی ہے یہ کسی درخت تک محدود نہیں ہر زندہ زبان میں بھی (اور زندہ کلمہ انتہائی اہم ہے)۔ ہم امتناع کے پہلو کو محسوس کر سکتے ہیں' جو قابل ادراک تو ہے مگر قابل تغیر نہیں۔ یہ نہیں کہ جائیداد منقولہ کی طرح یہ ایک نسل سے کسی اجنبی نسل کو خود بخود منتقل ہو جائے' زبان' نغمہ' توازن' لے' دباؤ' رنگ رنگ' رفتار' اظہار ہر شے میں موجود ہوتی ہے محاورۃ ہم اشارے کنائے کو بھی کلام میں شامل کر لیتے ہیں ۔ اس سلسلے میں یہ ضروری ہے کہ "لسان" اور "گفتار" میں فرق ملحوظ رکھا جائے۔ اول الذکر فی نفسہ علامات کا ایک مردہ ذخیرہ ہے اور ثانی الذکر وہ فعالیت ہے جو علامات کی مدد سے روبہ عمل رہتی ہے ۔ جب ہم سماعت سے محروم ہو جاتے ہیں اس کے بعد صرف اس کا تصور باقی رہ جاتا ہے یعنی اس کی ہڈیاں باقی رہ جاتی ہیں اور گوشت پوست غائب ہو جاتا ہے اور ہم اس کے تعارف سے محروم ہو جاتے ہیں۔ سومری' رومی' سنسکرت اور ایسی تمام دوسری زبانوں کی یہی کیفیت ہے' جنھیں ہم نے قدیم تحریری کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور ہم انھیں مردہ زبانیں کہنے میں حق بجانب ہیں۔ کیونکہ جن معاشرے میں وہ پیدا ہوئیں وہ معاشرے ہی ختم ہو چکے ہیں۔ ہم مصری زبان سے آشنا ہیں مگر مصریوں کی زبانوں کو نہیں جانتے آگستن لاطینی کو تقریباً اس کے حروف کی صوتی کیفیت کے حوالے سے جانتے ہیں اور الفاظ کے معانی سے بھی آشنا ہیں مگر ہم یہ نہیں جانتے کہ اس کی تقریری ہیئت کیسی تھی۔ سسرو کی تقریر کا کیا انداز تھا' اور ہسیاؤ اور سیفو اپنے اشعار کیسے سناتے تھے اور ایتھنز کی منڈیوں میں گفتگو کا حقیقی انداز کیا تھا؟ کیا جب رومی دور میں لاطینی نے حقیقی بول چال کی زبان کا درجہ حاصل کیا تو کیا اس عہد میں یہ ایک نئی زبان تھی؟ کیا لاطینی نے

اپنی تشکیل کے ابتدائی دور ہی میں توازن اور مخصوص آوازوں پر دسترس حاصل کر لی تھی؟ (مگر ہم اپنے تخیل میں قدیم لاطینی کے مطابق ان کی تصویر کشی کرنے سے قاصر ہیں۔ نہ تو ہم معانی الفاظ کے متعلق اور نہ ترکیب نحوی کے متعلق درست تصور رکھتے ہیں۔ مگر انسانیت پسندوں کی روم مخالف لاطینی جو سسرو کے متبعین کے لیے تھی۔ یہ لاطینی کے دوبارہ احیا کے سوا کچھ نہ تھی۔ نسلی عنصر میں تمام اہمیت زبان کو حاصل ہے۔ اس کا اندازہ نطشے اور موم سین کے زبان کے موازنے سے ہو سکتا ہے یا نپولین اور ڈائڈراٹ کی فرانسیسی کے موازنے سے۔ والیٹر اور لیسنگ کے محاورے اور لیسنگ اور ہولڈرلین کے گہرے مطالعے سے یہ فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔

یہ حقیقت تمام اظہاری زبانوں کے فنون سے بھی بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔ زبان کے امتناعی پہلو میں' مثلاً" ذخیرہ ضوابط' تقلیدی فوائد اور اسلوب جہاں تک کہ اس سے مسلمہ مصلحت کا تقاضا مقصود ہو (مثلاً ذخیرہ الفاظ' ترکیب نحوی' اور زبانی گفتگو) تو یہ زبان ہی کی ایک صورت ہے' جسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسے سیکھ کر دوسروں کو بھی منتقل کیا جا سکتا ہے' مثلاً" مصوری کے مدارس کی صورت میں۔ تعمیر مکانات اور بالعموم مختلف پیشوں کے شعبہ ہائے ہنر میں' جس میں ہر حقیقی فن اپنا ایک راستہ متعین کرتا ہے جو ہر دور میں محاورے کو درست رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے جو اپنے مخصوص وقت میں اپنے دور کا مروج محاورہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میدان میں بھی زندہ اور مردہ زبانیں پائی جاتی ہیں۔ کسی فن کی زندہ زبان وہی ہے جو مروج ہو' جسے اس فن سے متعلق تمام ماہرین' مادری زبان کی طرح استعمال کرتے ہوں جسے ہر شخص اس کی تشکیل کے ڈھانچے کے متعلق سوچے بغیر استعمال کر سکے۔ اس مفہوم کے مطابق سولھویں صدی میں لاطینی اور اٹھارھویں صدی میں روکوکو' دونوں مردہ زبانیں تھیں۔ ذرا اس غیر مشروط یقینی کیفیت کا مشاہدہ کریں جس کے تحت سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے ماہرین تعمیرات اور موسیقار اپنے فن کا اظہار بی تھوون کے تامل کے ساتھ کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی ذاتی کوشش سے اور بڑی تکلیف کے بعد شٹل اور شیڈو کے فن پر عبور حاصل کیا ۔ انھوں نے رافیل کے عہدِ سے قبل کے فن اور جدید روسی فن کا ستیاناس کیا اور آج کے فن کاروں کے آزمائشی فن کی راہ میں رکاوٹ پیدا کی۔

زبان کے فنی پہلو کے حوالے سے' جیسا کہ اب تک تخلیقات پیش کی گئی ہیں' ٹوٹم سے متعلق آواز یعنی نسل اپنا تاثر پیدا کرتی ہے اور فنکاروں کی اجتماعی آوازوں کے بجائے اس میں انفرادی آوازیں بھی شامل ہیں۔ جنوبی اٹلی اور سسلی میں ڈورک مندروں کی تعمیر اور شمالی جرمنی کا خشتی کام کسی خاص نسل کے فن کا مظہر ہے۔ اسی طرح جرمن موسیقاروں' ہنرچ سے لے کر شرٹز اور جان سیبشین باخ تک ہر فن کار کی آواز اس میں شامل ہے۔ ٹوٹمیت کے پہلو کا تعلق کائناتی چکر کے اثرات سے ہے' فنی تاریخ میں اس کی اہمیت پر کبھی شک و شبہ کا اظہار ہی نہیں کیا گیا۔ اسے یقین میں تبدیل کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور محبت اور بہار کے تخلیقی رشتے (جو تمام کے تمام انتظامی تیقن ہے جو منقلی ہی کا حصہ ہے جس سے ہیئت کی قوت اور تصور کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ صوری یا شعائر پرستی کی وضاحت عالمی خوف کی گہرائی یا نسلی نقص کی بنا پر کی جاتی ہے اور عظیم بے پیکر افزائش خون یا نظم و ضبط میں نقص کی بنا پر شناخت کیے جاتے ہیں۔ ہم

جانتے ہیں کہ فن کاروں کی تاریخ اور اسلوب کی تاریخ میں فرق ہے اور فن کی زبان بھی مختلف ہے جسے آپ ایک ملک سے دوسرے ملک میں لے جا سکتے ہیں مگر جہاں تک اس میں گفتگو کرنے کی مہارت کا تعلق ہے یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔

نسل کی جڑیں ہوتی ہیں۔ نسل اور فطری مناظر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک پودا جہاں اپنی جڑیں قائم کرتا ہے وہیں پر مرجاتا ہے تو یہ کوشش بے کار نہیں جائے گی۔ اگر ہم واپسی کا سفر کر کے کسی نسل کا اصل گھر تلاش کر لیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ ہر نسل اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے' اور اس کے جسم اور روح کے بعض اطوار ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ اگر اپنے گھر میں کوئی نسل موجود نہیں تو اس کا مطلب ہے کہ وہ ختم ہو چکی ہے۔ نسل نقل مکانی نہیں کرتی بعض افراد نقل مکانی کرتے ہیں اور ان کی نسلیں مختلف مقامات پر پیدا ہوتی رہتی ہیں مگر وہ زمین ان میں خفیہ اثر پیدا کرتی ہے جو صرف نباتات سے مخصوص ہے اور اس کے بعد ان کا ذریعہ اظہار بالکل بدل جاتا ہے پہلا ختم ہو جاتا ہے اور نیا پیدا ہو جاتا ہے۔ انگریز اور جرمن امریکہ میں منتقل نہیں ہوئے لیکن بعض افراد جو انگریز اور جرمن تھے وہ ضرور منتقل ہوئے۔ اب ان کی نسلیں وہاں مقیم ہیں اور وہ امریکن باشندے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ امریکی ہندیوں کی سرزمین ان پر اثر انداز ہوئی۔ نسلاً بعد نسل بتدریج وہ ان لوگوں کی طرح ہو جائیں گے جن کو کہ انھوں نے وہاں سے نکال باہر کیا۔ گولڈ اور بیکسٹر کی نسلیں زیادہ سفید ہو رہی ہیں' ہندی اور حبشی بھی جسمانی لحاظ سے سفید آبادی کے برابر ہو گئے ہیں اور بلوغت کا وقت بھی یکساں ہو گیا ہے۔ یہ اتنی تیزی سے ہوا ہے کہ آئرلینڈ سے نقل مکانی کرنے والے اگر چھوٹی عمر میں آئیں تو وہ بھی تیزی سے پروان چڑھتے ہیں۔ حالانکہ اپنے ملک میں ان کی شرح نمو کم ہوتی ہے۔ ارض امریکہ نے اپنا کام کر دکھایا اور امریکیوں کے برابر کر دیا۔ بوس نے یہ بتایا ہے کہ سسلی کے طویل سروں والے بچے جب امریکا میں پیدا ہوئے اور چھوٹے سروں والے جرمن یہودی بچے امریکی ماحول میں یکساں سروں کے ساتھ پروان چڑھے یہ کوئی خصوصی معاملات نہیں ہیں بلکہ ایک عام تناظر ہے۔ لہٰذا ہمیں نقل مکانی کرنے والی نسلوں کے باشندوں پر تحقیق کرتے ہوئے محتاط رہنا ہو گا۔ جن کی تاریخ کے متعلق ہمارا علم محدود ہے اور ہم سوائے متواتر تبدیلیوں کی زد میں آنے والے قبائل کے چند ناموں کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتے اور زبان کے چند آثار کے علاوہ ان کے متعلق ہم قطعاً" لا علم ہیں (مثلاً" وانائی ایٹروسکن' پیلاسگی ایچیئن اور ڈورٹین) جہاں تک ان لوگوں کی نسل کا تعلق ہے ہم کوئی فیصلہ بھی نہیں کر سکتے وہ لوگ جو شمالی یورپ میں گوتھ لیمبارڈ اور وینڈال کے نام سے قطار اندر قطار منتقل ہوتے رہے۔ مگر نشاۃ ثانیہ کے دور سے قبل ہی پرووِنکل کاسٹیلین' اور ٹسکن کی سرزمین پر اپنی جڑیں قائم کر چکے تھے۔

مگر زبان کے معاملے میں یہ صورت نہیں۔ کسی زبان کے وطن کے متعلق کہ یہ خطہ اس کی تشکیل کے حادثے کا باعث ہوا۔ مگر اس کی داخلی ہیئت کے ساتھ اس کا کوئی رابطہ نہیں۔ زبانیں کسی وسیلے کے ساتھ قبیلے سے قبیلے تک پھیلتی ہیں۔ مزید برآں وہ اپنی تکوین کی حامل ہیں اور ادل بدل کی جا سکتی ہے۔ فی

الحقیقت قدیم نسلوں کی تاریخ کے مطالعے کے بعد ہمیں ایسا نظریہ قائم کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے کہ زبانیں کس طرح ان کے ساتھ منتقل ہوتی ہیں۔میں اس امر کا تکرار کرتا ہوں کہ صرف کسی زبان کی ہیئت ہی قبول کی جاتی ہے بول چال کی زبان قبول نہیں کی جاتی(جیسا کہ ابتدائی انسان صرف آرائشی سامان ہی قبول کرتا ہے)۔

تاکہ وہ ان کو پورے یقین کے ساتھ اپنی زبان کے عناصر کی حیثیت سے استعمال کر سکے۔ قدیم ایام میں یہ حقیقت کہ بعض اقوام اپنے آپ کو دوسروں سے طاقت ور ظاہر کرتی تھیں یا یہ کہتی تھیں کہ ان کی زبان دوسروں کے مقابلے میں زیادہ فصیح و بلیغ ہے" اور اگر یہ احساس ثابت کر دیا جاتا تو دوسری اقوام کے لیے اتنا ہی کافی ہوتا اور وہ اپنی زبان ترک کر دیتے تھے اور (اس میں مذہبی جلال و احترام شامل ہوتا) دوسرے کی قبول کر لیتے۔ نارمن کی زبان کی تبدیلی کے واقعہ کا مشاہدہ کریں یہ لوگ نارمنڈی' انگلستان' سسلی اور قسطنطنیہ میں آباد ہیں اور ہر جگہ ان کی زبان مختلف ہے اور ہر وقت ایک زبان کو دوسری کے ساتھ تبدیل کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ مادری زبان کی تقدیس ---- یہ متاخر مغربی معاشرتی روح کی ایک صفت تھی' بار بار لسانی بنیادوں پر جنگوں کے ہونے کی یہی توضیح ہے ---- یہ صفت دوسری ثقافتوں میں مفقود ہے اور جہاں تک قدیم انسان کا تعلق ہے اس میں بھی یہ صفت غائب تھی۔ بدقسمتی سے ہمارے مورخین نہ صرف اس کا ادراک رکھتے ہیں بلکہ خاموشی سے اسے دوسروں پر بھی لاگو کر دیتے ہیں اور اسے اس میدان میں ایک مسلمے کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں۔ جہاں تک لسانی دریافت کا تعلق ہے ہمارے مورخین کے مذکورہ مفروضے کی بنا پر اس میں لا تعداد غلطیاں رونما ہوتی ہیں۔ ذرا ڈور-ئن نقل مکانی پر غور کریں' اس کے جوڑ کس طرح بٹھائے گئے ہیں اور متاخر یونانی بولیوں کی تقسیم کی بنیاد پر تمام دلائل قائم کیے گئے ہیں۔ لہٰذا بنی نوع انسان کے نسلی پہلو کے متعلق اس بنیاد پر کوئی فیصلہ کرنا ناممکن ہو گا' کہ صرف مقامات کے نام' شخصی نام' کھودی ہوئی تحریریں اور بولیاں ہی نسلی تقدیر کا فیصلہ کر لیں۔ ہم ان کی فوقیت' ترجیح یا قدامت کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ علاوہ ازیں عام لوگوں کے نام بلکہ مقامات کے نام بھی اپنی اپنی اور مختلف تضادقدر کے حامل ہیں۔

(۲)

نسل کے متعلق ہر اظہار میں خالص ترین گھر کا تصور ہے' اس لمحے سے جبکہ ایک انسان جب کسی ایک مقام پر مقیم ہو جاتا ہے تو وہ صرف ایک پناہ گاہ سے مطمئن نہیں ہوتا بلکہ اپنے لیے رہائش گاہ تعمیر کرتا ہے۔ مکان کی اصطلاح جب اپنا وجود حاصل کرتی ہے تو وہ اپنا ایک پکا نشان بھی چھوڑتی ہے۔ یعنی گھر کی تعمیر سے فرد ایک نسل کا حصہ بن جاتا ہے (یہ انسان کی عالمی ہیئت کا حیاتیاتی عنصر ہے)۔ جو انسانی نسلیں تاریخ عالم کا موضوع ہیں ان کی صورت تکوین کے منبع سے نکلتی ہوئی ندیوں کی طرح ہے اور ان کی روحانی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے' گھر کا حقیقی وجود' دنیا میں ہر جگہ' انسانی احساس اور نشوونما سے متعلق ہے۔ اس کا علم

سے کوئی تعلق نہیں' ٹائیلس کے گھونگوں' شہد کے چھتوں' پرندوں کے گھونسلوں کی طرح ایک پناہ گاہ ہے اور ابتدائی رواجات کی ہر صفت اور تکوینی نوعیت یعنی شادی بیاہ' عائلی زندگی' خاندان اور قبائلی نظام کا آغاز گھر سے ہی ہوتا ہے' گویا گھر انسانی حیات کی داخلی اور خارجی دونوں کے لیے ایک امر ناگزیر ہے۔

یہ وہ میدان ہے جس پر فنی تاریخ نے کبھی اپنا ہاتھ نہیں ڈالا۔ گھر کی تعمیر کو فن تعمیر کا ایک شعبہ قرار دینا غلطی تھا۔ یہ تو تکوین کے مبہم راستوں میں پیدا ہونے والی ایک ہیئت ہے یہ آنکھوں کے نظارے کے لیے نہیں کہ وہ روشنی میں اس کی شکل و صورت کا مشاہدہ کرے۔ گنوار کے جھونپڑے کی کسی ماہر نے کبھی منصوبہ بندی نہیں کی جیسا کہ گرجے کی عمارت کے لیے کی جاتی ہے۔

یہ بنیادی سرحد' فنی تحقیق سے نظر انداز ہو گئی۔ اگرچہ دیسائیو نے ایک مقام پر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ جرمنی میں تعمیر کردہ لکڑی کے چوبی گھروں کا بعد میں وجود میں آنے والے عظیم فن تعمیر سے کوئی تعلق نہیں جو کہ بالکل آزادانہ طور پر وجود میں آیا اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے طریق کار میں ہمیشہ ایک ابہام موجود رہا ہے۔ اس ابہام سے ماہرفن بخوبی واقف ہے' مگر وہ اسے سمجھ نہیں سکا' وہ اپنی سائنس میں تمام ابتدائی اور قبل از تاریخ ادوار کو جمع کر لیتا ہے۔ ہر قسم کا لباس' اسلحہ' ظروف' ملبوسات' تجہیز و تکفین کا سامان اور آثار' اور مکانات' وہ انھیں اپنا نظریہ قائم کرنے کے ذریعے نیز سامان آرائش کے طور پر استعمال کرتا ہے اور اس مقام سے آغاز کرتے ہوئے وہ مصوری' پیکر تراشی اور فن تعمیر کی منزلیں سر کرتا ہے (یعنی وہ ان کو خود کمتنی اور تفریقی فن سمجھتا ہے) اور وہ سمجھتا ہے کہ وہ مضبوط بنیادوں پر استادہ ہے۔ مگر وہ یہ نہیں جانتا کہ اس نے دو مختلف دنیاؤں کی سرحدوں کی خلاف ورزی کی ہے جس میں سے ایک روحانی اظہار ہے اور دوسرا بصری اظہار یعنی زبان' مکان کے متعلق قطعی طور پر نظر انداز کیا گیا بنیادی عنصر (رواجی) ظروف کی نوعیت' اسلحہ' ملبوسات' سامان ضروریات' ان سب کا تعلق ٹوٹمی پہلو سے ہے۔ ان اشیاء سے ذوق کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ معرکہ آرائی اور جنگ کے طریقوں کا پتہ چلتا ہے یا رہائش اور کام کاج پر روشنی پڑتی ہے۔ گھریلو نقاشی' ملبوسات کی تیاری' پارچات بطور آرائش' اسلحہ کی آرائش' اور اوزار اس کے برخلاف زندگی کے اقتائی پہلو سے تعلق رکھتے ہیں اور فی الحقیقت ابتدائی انسان کے لیے ان اشیا پر نقاشی کے نمونے جادوئی قوت کا کام بھی دیتے ہیں ۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ جرمن تلواروں کے پھل پر جو نقل مکانی کے دوران استعمال کی گئیں' مشرقی آرائش موجود تھی' اور مائی سینی قلعوں میں منعون کا فن نقاشی موجود تھا' یہ خون اور حواس' نسل اور گفتار' سیاست اور مذہب میں امتیاز کی صورتیں ہیں۔

ابھی تک ہمارے پاس مکان اور اس کی نسلوں کو کوئی تاریخ نہیں ہے۔ لہٰذا تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس سلسلے میں کچھ کام کریں' مگر اس کے لیے فنی تاریخ سے الگ دیگر ذرائع سے کام لینا ہو گا۔ ایک کسان کی رہائش کا جب تاریخ فن کی رفتار سے موازنہ کیا جائے تو اس میں کسان کی اپنی زندگی کی طرح دوام اور ابدیت کا سراغ ملتا ہے۔ اس کا مقام عام ثقافت کے دائرے سے باہر ہوتا ہے اور

اس لیے انسان کی اعلیٰ تاریخ سے بھی یہ باہر رہتا ہے' یہ تاریخ کی صدی یا خصوصی حدود کو تسلیم نہیں کرتا اس لیے اس پر کسی فن تعمیر کے تغیر و تبدل کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان سب کو وہ دیکھتا ہے مگر متاثر نہیں ہوتا۔ روم کے دور سلطنت میں بھی گول جھونپڑے موجود تھے روم کے دوسرے دور کے مستطیل گھر "پومپئی" بلکہ شاہی محلات کے اندر بھی موجود تھے۔ ہر قسم کی آرائش اور اسلوب مشرق سے لیے گئے تھے۔ مگر اس کے باوجود کسی رومی کو یہ خیال نہ تھا کہ اس نے اپنے گھر کا خاکہ شام سے لیا ہے۔ یونانیوں نے اپنے عظیم شہروں کا منصوبہ مائی سی نائی ٹی رین اور قدیم یونانی کسانوں کے گھروں سے" جن کا ذکر جالینوس نے کیا ہے " حاصل کیا۔ سیکسن اور فران کو مین کسانوں کے گھر اپنا قدیم مرکزی تصور جو دیہاتی زرعی گھروں کا تھا' اپنے قصبات اور آزاد شہروں میں بھی قائم رکھا۔ یہاں تک کہ اٹھارھویں صدی کی رومی طبقہ امرا کی عمارتیں تعمیر ہونے لگیں جبکہ رومی' نشاۃ ثانیہ' باروق ' اور عہد سلطنت کے اسلوب یکے بعد دیگرے اس پر اثر انداز ہوتے رہے اور تہ خانے سے بالا خانے تک اپنا رنگ جماتے رہے' مگر اس کے باوجود گھر کی اصل روح قائم رہی۔ اور فرنیچر کی شکل و صورت کا بھی یہی حال رہا اس میں فنی نفسیات کی خصوصیات کی نشاندہی کے لیے ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ بالخصوص شمالی علاقوں کی نشست گاہ کے فرنیچر کا ارتقا کلب کی بازوؤں والی کرسی قومی تاریخ کی ایک علامت ہے اور اس کا اسلوب کی تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔ دوسرے کرداروں میں سے ہر ایک ہمیں نسلی قسمت کے متعلق دھوکا دے سکتا ہے۔ اٹرسکن کو بحری باشندوں کا نام دیا جاتا ہے انھیں کرامیس سوم نے شکست دی۔ لیمنوس میں جو نقش پائے گئے ہیں وہ ابھی تک معمہ ہیں۔ ایٹروریا کی قبروں پر نقاشی ان لوگوں کے کسی جسمانی رابطے کا پتہ نہیں دیتی۔ اگرچہ پتھر کے زمانے کے خاتمے کے قریب ایک معنی خیز آرائشی اسلوب پیدا ہوا جو کارپیتی عہد تک جاری رہا۔ اس امر کا قوی امکان ہے کہ اس دور میں ایک نسل نے دوسری پر فوقیت حاصل کر لی۔ اگر مغربی یورپ میں ہمارے پاس صرف وہ ظروف ہی ہوتے جو نروجن اور چلوڈ وگ کے مابین گزری ہوئی کئی صدیوں سے متعلق ہیں' تو محض اس کی بنیاد پر ہمیں عظیم نقل مکانی کا کچھ بھی علم نہ ہوتا۔ مگر آزی علاقے میں ایک بیضوی گھر کی موجودگی اور رہوڈیشیا میں ایک اسی قسم کا اور قابل توجہ نمونہ اور بہت زیادہ موضوع بحث بننے والا ہم آہنگ سیکسن کا دیہاتی مکان جس کا موازنہ لیبیا کے قبائل کے ساتھ کیا جاتا ہے' یہ سب مل کر ایک نسلی تاریخ بیان کرتے ہیں۔ آرائش و تزئین کو جب اپنی زبان میں بیان کیا جائے تو اس میں وسعت پیدا ہوتی ہے' مگر مکان کا محل وقوع تو متعلقہ نسل کے ساتھ ہی متعین کیا جا سکتا ہے جب کوئی آرائش اوجھل ہو جائے تو اس سے صرف لسانی تبدیلی کا پتہ چلتا ہے مگر جب مکانوں کا کوئی اسلوب فنا ہو جائے تو اس کا مطلب ہے کہ کوئی نسل ہی ختم ہو گئی ہے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسی ثقافت کے متعلق بحث کرنے سے قبل اس کے نسلی پہلو کو بالکل نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اور خصوصی زبان کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ کسی ثقافت کے آغاز ہی سے دو اعلیٰ نظام کسانوں کے گاؤں میں قائم ہو جاتے ہیں ان میں سے ایک اظہار تکوین ہے اور دوسرا تکوین بیدار کی زبان اور یہ قلعوں اور معابد کی صورت میں ہوتی ہیں ۔ ان میں ٹوٹم اور اقتاع' آرزو اور خوف' خون اور

زہانت' کے امتیاز کے تحت ایک عظیم علامتی نظام پیدا ہو جاتا ہے۔ قدیم مصری' قدیم چینی' کلاسیکی جنوبی عرب کے لوگ اور مغربی قلعے' اپنی اپنی جگہ پر قائم ہیں اور اس امر کا پتہ دیتے ہیں کہ متعلقہ نسلیں تسلسل کے ساتھ اپنی اپنی جگہ پر موجود ہیں اور کسانوں کے جھونپڑوں کے بالکل قریب ہیں اور دونوں ہی حیات افزائش نسل موت کی نقلیں ہیں اور ان کا فنی تاریخ میں کوئی ذکر نہیں۔ جرمن دیہات کی تاریخ فی الحقیقت تمام کی تمام نسلی تاریخ ہے ان دونوں پر قدیم آرائش فی الحقیقت موجود ہے جو ان کے شہتیروں' دروازوں اور سیڑھیوں کو حسن عطا کرتی ہے مگر محققین کسی کو منتخب کر لیتے ہیں اور نظر انداز کر دیتے ہیں کیونکہ آرائش اور عمارت میں۔ جہاں تک گرجے کا تعلق ہے اس کی آرائش نہیں کی جاتی' وہ تو خود ہی ایک آرائش ہے۔ اس کی تاریخ رومی اسلوب تعمیر کے عین مطابق ہے اور ڈورک مندر کے متعلق بھی یہی بات درست ہے اور تمام قدیم ثقافتی عمارات کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ ان کی تطبیق اتنی مکمل ہے کہ مغرب میں یا کسی دوسری ثقافت میں' جس کے فنون سے ہم آشنا ہیں کہ کبھی کوئی شخص اس حقیقت پر حیران نہیں ہوا کہ (جو صرف خالص آرائش کی ایک اعلیٰ صورت ہے) تمام فن تعمیر مذہبی عمارات تک محدود ہے اور تمام تعمیراتی حسن جو گیلن ہاؤس گو سلر' اور وارک برگ میں موجود ہے وہ گرجے کے فن ہی سے اخذ کیا گیا ہے' یعنی تمام آرائش نہ کہ روح ایک قلعہ' ایک تلوار یا ایک صراحی آرائش کے بغیر بھی کار آمد رہتی ہے اور اس کا مقصد برقرار رہتا ہے مگر ایک گرجا گھر میں یا مصر کے اہرام کے معابد میں مزاج اور فن میں امتیاز ناقابل تصور ہے۔

اب ہم دو قسم کی عمارات کے مابین امتیاز کر سکتے ہیں ایک وہ جن کا اپنا اسلوب ہے اور دوسری وہ جس میں انسانوں کا اسلوب ہے جبکہ مقبروں گرجوں میں پتھر ہیئت کا مالک ہوتا ہے جس کا وہ انسانوں تک ابلاغ کرتا ہے جو اس کی خدمت کرتے ہیں۔ زرعی زمینوں میں کسانوں کے گھروں میں اور جاگیرداروں کے مضبوط قلعوں میں دیہاتیوں کی پوری قوت اور سردار کی زندگی عمارت کو اپنی مرضی اور ضروریات کے مطابق تعمیر کرتی ہے۔ اس صورت میں پتھر کی بجائے انسان کو اولیت حاصل ہے ان عمارات میں بھی آرائش پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ آرائش بنی نوع انسان کے لیے اہم ہے اور یہ سختی سے مقامی رواجات اور شائستگی کے مطابق ہوتی ہے ہم اسے زندہ کہہ سکتے ہیں اور جمود اور اسلوب سے پاک قرار دے سکتے ہیں۔ مگر جیسا کہ رومی اور ویدوں کے زمانے میں ہوا اس زندہ ہیئت کے متعلق قوت پجاریوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے ایسے پجاری جو سردار بھی ہوتے ہیں اس لیے رومانی اور رومی پاکیزہ زبان اس غیر مذہبی ادارے کی ہر شے پر قبضہ کر لیتی ہے۔ ملبوسات' اسلحہ' کمر کے اوزار وغیرہ' جن کی بنیادی سطح اسلوب پر ہے مگر تاریخ فن کو اس اجنبی دنیا سے ہٹ کر رہنا چاہیے' کیونکہ یہ صرف سطح ہی ہے۔

قدیم شہروں میں بھی یہی حالت تھی کوئی نئی شے پیدا نہیں ہوئی۔ نسلوں کے تیار کردہ مکانات میں' جو اب گلیوں کے کناروں پر موجود ہیں کہیں کہیں وہ عمارتیں بھی ملتی ہیں جن کا تعلق کسی مسلک سے ہے اور ان کا اپنا اسلوب بھی ہے اور ان اشیا کی بدولت وہ فنی تاریخ کی نشست گاہیں بھی ہیں اور وہ مخرج ہیں جہاں

سے ان کی شعائیں نکل کر مربع پیش گاہوں پر پڑتی ہیں اور گھروں کے کمروں کو بھی منور کرتی ہیں۔ اگرچہ قلعہ آگے چل کر شہری محل کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور طبقہ امرا کی رہائش میں تبدیل ہو جاتا ہے اور دالان اور دیوان خانہ بن جاتا ہے پھر مجلس خانے اور ٹاؤن ہال کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ان میں سے ہر صورت میں اسلوب موجود رہتا ہے مگر یہ ان کا اپنا نہیں ہوتا۔ یہ درست ہے حقیقی قصباتی سطح پر قدیم مذہب کی مابعد الطبیعیاتی تخلیق قوت ختم ہو چکی ہے۔ اب آرائش تو ترقی کر رہی ہے مگر عمارت بطور رہائش نہیں اور اس نقطے سے آگے فن تاریخ مختلف شعبہ ہائے فنون میں منقسم ہو جاتی ہے تصویر' بت' گھر' مخصوص موضوعات کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جن پر اسلوب کا نفاذ کیا جاتا ہے' اس سطح پر پہنچ کر گرجا بھی اسی نوعیت کا گھر بن جاتا ہے ایک رومی گرجا مجسم آرائش ہے۔ مگر باروقی گرجے کا دالان ایک عمارت ہے جس پر آرائش کا غلاف چڑھا دیا گیا ہے یہ طریق آئی عون اسلوب کے تحت شروع ہوا' اور سولھویں صدی میں اس نے کورنتھی اور روکو کو اسلوب میں تکمیل پائی۔ اس سطح پر آ کر تعمیر اور آرائش کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے علیحدہ علیحدہ کر دیا گیا یہاں تک کہ اٹھارھویں صدی کے گرجا گھروں اور خانقاہوں میں شاہکار بھی اس سے محفوظ نہ رہے اور ہمیں غلط راستے پر نہیں ڈال سکتے۔ ہم جانتے ہیں کہ ان کا تمام فن لامذہبیت پر مبنی ہے۔ سلطنت کے قیام کے ساتھ ہی اسلوب' ذوق میں بدل جاتا ہے اور اس کیفیت کے خاتمے کے ساتھ ہی فن تعمیر ایک پیشہ ورانہ فن میں تبدیل ہو گیا گویا صنعت کے میدان میں داخل ہو گیا یہ آرائشی زبان کے اظہار کا خاتمہ ہے اور اس کے ساتھ ہی تاریخ فن بھی ختم ہو گئی۔ مگر کسان کا گھر جس میں نسلی نوعیت کا اسلوب موجود ہے زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

(۳)

گھر کی عملی اہمیت کا احساس اس وقت ہوتا ہے' جب نسل کے تعین کا مسئلہ درپیش ہو اور اس کے مغز تک رسائی حاصل کرنے میں دقت محسوس ہو رہی ہو۔ میں اس کی داخلی روح کا حوالہ نہیں دے رہا ---- کیونکہ جہاں تک اس کا تعلق ہے' احساس ہمارے ساتھ بڑی وضاحت سے گفتگو کرتا ہے اور ہم یہ بخوبی جانتے ہیں کہ ہر شخص کا کسی نہ کسی نسل سے تعلق ہوتا ہے جب ہم کسی شخص کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اس کی نسلی حقیقت سے آگاہی ہوتی ہے مگر اس احساس کی نمایاں علامات کیا ہیں؟ اور سب سے بڑھ کر ہماری آنکھیں کس طرح کسی کی نسل کا امتیاز اور تعین کرتی ہیں؟ یہ وہ معاملہ ہے جس کا تعلق چہرہ شناسی سے ہے۔ بالکل اسی طرح یقینی طور پر' جیسا کہ زبانوں کے صنف بندی کا تعلق باقاعدہ نظام سے ہے۔ ہم یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ فرد مذکور کا کس قدر نقصان خستگی کی وجہ سے ہوا ہے اور کس قدر بداعمالی کی وجہ سے۔ بہت زیادہ قابل قبول معاملات میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ کسی قدیم انسان کے ڈھانچے میں کیا باقی رہ گیا ہے اور کس قدر ضائع ہو چکا ہے جو مذکورہ ڈھانچہ بتانے سے قاصر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قریب قریب سب کچھ ہی ختم ہو چکا ہے۔ قبل از تاریخ عہد کے انسان کے متعلق تحقیق' محققین کے بھولپن کی وجہ سے صرف جبڑے کی ایک ہڈی یا بازو کی کسی ہڈی تک محدود ہے۔ مگر شمالی فرانس کی جنگ کی اجتماعی قبروں کا مشاہدہ کریں ہم جانتے

ہیں کہ ان میں تمام نسلوں کے انسان' سفید' رنگ دار' کسان قصباتی' نوجوان' اور جوان سب یکجا پڑے ہیں۔ اگر مستقبل میں کوئی قابل اعتبار شہادت ان کی نوعیت کے متعلق نہ ملے' تو اسے بشریاتی تحقیق سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ دوسرے الفاظ میں کسی نسل کے متعلق بحث سے ڈرامے بغیر تحقیق ہی گزر جائیں گے اور قبروں میں مدفون یہ ڈھانچے کسی بھی واقعے کی نشاندہی سے محروم رہیں گے۔ زندہ انسان ہی ۰٫۹ حصہ بطور شہادت پیش کر سکتا ہے۔ نہ صرف جسم کے مختلف حصوں کی ترتیل' بلکہ ان کی حرکات کے متعلق بھی اس میں صرف چہرے کی ہڈیاں ہی کار آمد نہیں بلکہ اس کی وضع قطع اور چال ڈھال بھی اور اس غرض کے لیے نسلی اظہار کے لیے یہ اشیا کس قدر قابل وضاحت اور امکانات سے بھرپور ہیں' صرف ہم عصر ارباب مشاہدہ ہی معلوم کر سکتے ہیں ؟ ہم کس حد تک دیکھنے اور سننے سے قاصر رہتے ہیں؟ وہ کیا ہے ---- حیوانی انواع کے برخلاف ---- جن کے متعلق ہمارے پاس کوئی عضو حس نہیں؟

ڈارون کے عہد کی سائنس اس سوال کا جواب دیتی رہی ہے اور اسے اپنے جواب کی صحت کا بہت زیادہ یقین تھا۔ حالانکہ وہ کتنا سطحی تھا۔ کتنا تیز طرارا اس کے عقب میں کس قدر میکانکی تصور تھا' جس کے سہارے یہ روبہ عمل تھا' اولین طور پر' یہ مقصدی مجموعے' ایسے حد سے افزوں نمایاں کرداروں کا اجتماع جو دریافتوں کے تجزیہ میں دیکھے جاتے ہیں' یعنی ایسے کردار جو کسی لاش میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ کسی زندہ جسم کا مشاہدہ' تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے ہماری تحقیق کا موضوع وہ علامات ہیں' جن میں کم از کم بصیرت و ذہانت کا کم از کم وجود ہو' جسے شناخت کیا جا سکے اور ان کے متعلق مزید تفتیش صرف اسی صورت میں ممکن ہے' جب کہ انھیں شمار کیا جا سکے اور ان کی پیمائش کی جا سکے۔ اس کے لیے نبض نہیں بلکہ خردبین کی اہمیت ہے۔ جب بطور امتیاز زبان کا استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے نسلوں کی صنف بندی اس منہاج پر نہیں کی جاتی کہ ان کا انداز تکلم کیا ہے' بلکہ ان کی قواعد کی تشکیل کے لحاظ سے یہ عمل جراحی ظاہر ہے کہ دوسری نوعیت کا ہے آج تک کسی نے لسانی نسلیات پر کوئی کام نہیں کیا۔ حالانکہ یہی ایک سب سے اہم فرض منصبی ہے جسے تحقیق سرانجام دے سکتی ہے۔ حقیقت میں روزانہ کے تجربات کی بنا پر ہم یہ اچھی طرح سے سمجھتے ہیں کہ آج کل کے دور میں طرز کلام ایک بہت ہی نمایاں شناختی صفت ہے۔ اس کی مثالیں بے شمار ہیں اور ہم میں سے ہر شخص متعدد مثالوں سے آشنا ہے۔ اسکندریہ میں ایک یونانی زبان ہی مختلف انداز یا لب و لہجے میں بولی جاتی تھی ہر نسل کا اپنا لب ولہجہ تھا۔ آج بھی مختلف تحریروں کے متن سے اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ شمالی امریکہ میں اصل باشندے بھی ایسا ہی عمل کرتے ہیں۔ خواہ وہ انگریزی میں گفتگو کریں' یا جرمن میں یا اپنی زبان میں۔ مشرقی یورپ میں آباد یہودیوں میں بھی نسل وابستگی کی علامات پائی جاتی ہیں اور روسی یہودیوں کا بھی اپنا لب ولہجہ ہے اور تمام یہودیوں کے خون میں مشابہت موجود ہے ان پر نقل مکانی یا میزبان ملک کے اثرات نہیں پائے جاتے اور جب بھی وہ کوئی یورپ کی مادری زبان بولتے ہیں تو ان کے لہجے میں فرق قائم رہتا ہے۔ لب و لہجے' آواز کی تخلیق اور الفاظ کے مقام کا فرق بہت نمایاں ہوتا ہے۔

مگر سائنس اس امر کو محسوس کرنے میں قطعی ناکام ہو چکی ہے کہ نسلی اثرات جڑدار پودوں اور

متحرک انسانوں یا جانوروں پر یکساں نہیں ہوتے۔ کیونکہ ماحول کی تبدیلی کے ساتھ نئی صفات پیدا ہو جاتی ہیں اور حیوانی دنیا کے لیے یہ فیصلہ کن ہوتی ہیں اور اس حقیقت کو بھی ملحوظ خاطر نہیں رکھا گیا کہ ایک بڑی نسل کے اندر بعض ذیلی نسلیں وجود پا لیتی ہیں تو ایسے انسانوں میں قطعی مختلف الانواع اہم خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہاں توارث اور تطبیق کا اکثر ذکر کرتے ہیں۔ اس سے ایک سطحی نوعیت کے سلسلہ علت و معلول کا وجود پیدا ہوتا ہے اور یہ حقیقت پس منظر میں رہ جاتی ہے کہ خون اور خون پر پڑنے والے ارضی اثرات اپنا اپنا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ وہ راز جو نہ تو معائنہ کیے جا سکتے ہیں نہ ان کی پیمائش کی جا سکتی ہے مگر صرف ان کو زندہ حالت میں آنکھوں کے سامنے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ سائنس دان متعلقہ سطحی نوعیت کے نظریات پر خود بھی متفق نہیں۔ بلومن باخ انسانی نسلوں کو کھوپڑیوں کی شکل وصورت کے تحت صنف بند کرتا ہے۔ فریڈرک ملر (ایک خالص جرمن کی حیثیت سے) بالوں اور لسانی تشکیلات کی بنا پر ٹوپی نارڈ (بطور خالص فرانسیسی) جلد کی رنگت اور ناک کی صورت سے' اور ہکسلے (جو کہ ایک خالص انگریز ہے) ایسے اطوار کو بنیاد بناتا ہے جن کا تعلق کھیل کود اور تفریح سے ہے۔ یہ آخری اصول فی نفسہ بلا شبہ بڑا مناسب معلوم ہوتا ہے مگر کوئی بھی گھوڑوں کا ماہر منصف اسے بتا سکے گا کہ نسلی اطوار کو سائنس کی زبان میں واضح کیا جا سکتا۔ یہ نسلی تفصیلات بلا استثنا اسی قدر ناقابل اعتبار ہیں جیسا کہ پولیس کی نظریاتی اصول پر چلائے گئے حلیے کوئی مقصد پورا نہیں کرتے۔

بظاہر یہ معلوم ہو کہ انسانی جسم کا گنڈ پہلو بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ بو کے علاوہ (جو چینیوں کے نزدیک "مثال کے طور پر" نسل کی سب سے بڑی علامت ہے) اور آواز (گفتگو کی آواز' گانا اور ہنسی ان سے ہمیں سائنسی طریق کار کی نارسائی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے) اور آنکھوں کے سامنے تصورات کا اس قدر طومار پریشان کن حد تک تفصیلات سے بھرپور ہے یا داخلی بصیرت کو متاثر کرتا ہے کہ ان میں سے چند ایک پہلوؤں کو نگاہ میں رکھنا' سوچا بھی نہیں جا سکتا اور تصویر کے یہ تمام پہلو' یہ تمام صفات جو اسے شکل سے آشنا کرتی ہیں' ایک دوسری سے بالکل الگ ہیں اور ہر ایک کی اپنی اپنی علیحدہ تاریخ ہے اور ایسی مثالیں بھی ہیں جن میں ہڈیوں کی تشکیل (اور بالخصوص کھوپڑی کی صورت) بالکل بدل جاتی ہے۔ مگر جہاں تک ان پر گوشت پوست کا تعلق ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی یعنی چہرہ اپنی صورت برقرار رکھتا ہے۔ ایک ہی خاندان کے بہن بھائی ان تمام اثرات کا مظاہرہ کریں گے جن کا ذکر بلوم' باخ' ملر' اور ہکسلے نے کیا ہے۔ اس کے باوجود ان کی نسلی حقیقت ہر اس شخص پر ظاہر ہو جائے گی جو انھیں ایک نظر دیکھے۔ مگر زیادہ تر جسمانی ساخت میں یکسانیت جو اظہار زندگی کی بو قلمونی ---- میں صرف ایک ناقابل پیمائش فرق کا ذکر کرتا ہوں' جو کسانوں کے حقیقی نسلی گروہ فریسیوں' یا برسلن' اور حقیقی شہری باشندوں سے موازنہ کیا جائے۔ مگر خون کی توانائی کے علاوہ جن پر وہی کیفیات حیات ظاہر ہیں' (خاندان اور صفات) جو صدیوں سے ایک ہی صورت میں موجود ہیں ---- اور قوت الارض ---- جس کی شہادت انسان پر مہر کی صورت میں موجود ہے ---- وہ خفیہ کائناتی قوت ہمسر ماحول جو انسانی تعلقات کی قربت کو ظاہر کرتے ہیں' جسے حاملہ عورتوں کا

خوف کہا جاتا ہے گمر یہ صرف ایک مثال ہے اور نسلی پہلو کی وضاحت کے لیے کوئی مستقل بنیاد مہیا نہیں کرتا۔ یہ ایک عام مشاہدے کی بات ہے کہ بزرگ شادی شدہ لوگ ایک دوسرے کی مانند ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ سائنسی آلات سے پیمائش اس صورت کے بالکل برعکس ثبوت مہیا کرتی ہے۔ مگر زندہ نبض کی تشکیلی قوت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہی قوت فرد کو تکمیل ذات کے داخلی احساس سے روشناس کراتی ہے۔ نسلی حسن کا احساس ---- جو ایک شہری شعوری ذوق کی پختہ ذہن کے افراد کی صفات حسن سے بالکل مختلف ہے ---- قدیم انسان میں انتہائی قوی ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ کبھی بھی ان کے شعور میں پیدا نہیں ہوتا۔ مگر اسی تصور کے تحت نسلی تشکیل وجود میں آتی ہے۔ بلا شک و شبہ اسی احساس نے بہادر جنگ جو قبائل کو جو خانہ بدوش تھے ایک مخصوص قسم کے جسم کو بطور مقصد مہیا کیا۔ اس کے نتیجے میں کسی نسلی افراد کی شکل و شباہت' مثلاً" روی اوسترو گوتھ کی نسل کی ہیئت متعین کرتے میں کوئی دشواری نہ رہی۔ کسی بھی قدیم شریف قبیلے کے متعلق ایسا نظریہ غلط نہ ہو گا ---- اس قبیلے میں اس کے اتحاد کا ایک گہرا احساس موجود ہو گا۔ یہ جسمانی مقصد کے حصول میں مدد دیتا ہے۔ اتحاد نسلوں کو جنم دیتا ہے۔ فرانسیسی شرفا اور پروشیئن زمیندار حقیقتاً نسلی گروہ ہیں۔ مگر اس سے صرف یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یورپی یہودی بھی اس ضمن میں آتے ہیں۔ یہ ہزارہا سال سے علیحدہ یہودی علاقوں میں رہتے ہیں اور جب کبھی ان کی مخصوص تعداد جمع ہو جائے یہ ہمیشہ اپنا نسلی اتحاد قائم کر لیتے ہیں اور اپنی قضاوقدر کا تعین کر لیتے ہیں۔ نسلی تصور کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس کا آغاز ثقافت کے اولین دور سے ہوتا ہے۔ ویدوں کا عہد' ہومر کا زمانہ' ہوہن شافن کے سرداروں کا دور' یہی وہ زمانہ ہوتا ہے جبکہ کوئی قوم اقتدار کی طرف دوڑتی ہے وہ ایک مقصد کا تعین کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ ویسی ہی ہو جائے اور اس کے علاوہ نہیں وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے عمل کرتی ہے اس میں بیویوں کے انتخاب کا عمل شامل نہیں ہوتا) اور بالاخر اسے حاصل کر لیتی ہے۔ مزید برآں اس میں اعداد و شمار کا معاملہ بھی ہے جس نے اپنے استحقاق سے کم توجہ حاصل کی ہے۔ آج جس قدر افراد دنیا میں زندہ ہیں۔ ۱۰۰ میں بھی ان کے دس لاکھ مورثان اعلیٰ موجود تھے اور ۱۰۰۰ میں ان کی تعداد ایک کروڑ تک پہنچ چکی تھی۔ اس لحاظ سے صلیبی جنگوں کے دور کا ہر جرمن بلا استثنا ہر یورپی باشندے کا خونی رشتہ دار تھا اور آج کے دور میں تو یہ رشتہ داری سو گنا بلکہ ہزار گنا قریبی ہو گئی ہے۔ بیس نسلیں گزرنے کے بعد ہر ملک صرف ایک ہی خاندان پر مشتمل ہو گا اور اس کے علاوہ خون جو ہر نسل میں منتقل ہوتا رہتا ہے اور مختلف نسلوں کے مسلسل ایک دوسرے کے بازو تھام رہے ہیں اور شادیاں منسوخ ہو رہی ہیں اور رواجات سے بے پرواہی کی جا رہی ہے یا وہ ویسے ہی ختم ہو رہے ہیں۔ اس کے نتیجے میں متعدد ایسے افراد پیدا ہو رہے ہیں کہ ان کا کسی نسل سے بھی نہیں یا متعدد نسلوں سے تعلق ہے۔

ابتدائی طور پر اس کا اطلاق نباتاتی نسلی اوصاف پر ہوتا ہے وہ کیفیت قیاسی کی بنیاد پر---- متحرک انواع کی نقل مکانی اس ضمن میں نہیں آتی ---- یعنی ہر وہ شے جو زندہ اور مردہ انسانوں کے جسموں میں مختلف نہیں ہوتی اور ایسے اجسام میں جو جامد ہو چکے ہیں' اپنے آپ کو ظاہر نہیں کر سکتی بلا شبہ کوئی شے گل خطمی اور لومبارڈی یا پلر کی نشوونما میں متجانس ہے یا انسان میں بھی وہ خصوصیت موجود ہے ---- موٹا' پتلا'

جھکا ہوا' وغیرہ وغیرہ اور اسی طرح اونٹ کی کوہان اور چیتے کے جسم پر لکیریں یا زیبرا کی کھال نباتاتی نسلی خاصیت کی حامل ہیں۔ اس کے علاوہ فطرت کے بعض افعال اور حرکات جو کسی مخلوق پر یا اس کے ساتھ اثر انداز ہوتے ہیں ایک جنس غوش کا درخت' یا ایک نازک بدن بچہ دونوں ہوا کے زور پر جھولنے لگتے ہیں۔ ایک شاہ بلوط کا درخت' اپنی شاخوں کے تاج کے ساتھ" مسلسل دائرے میں خوف زدہ طوفان میں پھڑ پھڑاتے ہوئے پرندے ان تمام کا تعلق نسل کے نباتاتی پہلو سے ہے لیکن ان کی اس قطار میں اس صورت میں کیا حیثیت ہوتی ہے جب خون اور زمین منتقل کردہ انواع پر اپنا دعوئی کرتے ہیں خواہ انسان ہوں یا حیوان؟ اور اس حالت میں روح معاشرتی قانون اور گھر کے اثرات کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟

یہ کیفیت اس وقت بالکل مختلف ہو جاتی ہے جب ہم خالص حیوانی حیثیت سے ان اثرات کو قبول کرتے ہیں۔ نباتیاتی حیوانی صورت اور حیوانی تکوین بیدار میں فرق (پہلے اسے ذہن میں رکھیں جو اس سے قبل کہا گیا ہے) یہ ہے کہ ہمارا تعلق نہ صرف فی نفسہ محض تکوین بیدار اور زبان سے ہے بلکہ کائنات اور عالم صغریٰ کے مجموعی ہیولے سے ہے۔ تاکہ ایک متحرک جسم تشکیل دیا جا سکے یعنی عالم صغریٰ بمقابلہ عالم صغریٰ۔ جس کی آزادانہ حیات کی فعالیت اپنی ذات تک ایک مخصوص حیات کی حامل ہے جو شعور بیدار کے بعض اعضا کو استعمال کر کے دوبارہ اختتام حرکت کے ساتھ ہی فنا ہو جاتی ہے۔

اگر نباتات کی نسل کا اظہار ان کے مقام کی قیافہ شناسی سے ہوتا ہے' تو پھر حیوانات کی نسل کی قیافہ شناسی ان کی حرکت سے ہو گی' یعنی اس انداز حرکت سے بلکہ بذاتہ حرکت سے اور ان اعضا کی بنیاد پر جن سے حرکت پیدا کی جاتی ہے۔ اگر حیوانات سو جائیں تو حرکت تھم جاتی ہے اور اگر مر جائیں تو بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ بالعموم سائنس دانوں کے پاس تحقیق کے لیے یہی سرمایہ ہوتا ہے۔ اب ہمارے پاس ذوالفقرات کے ڈھانچے کے متعلق جاننے کے لیے کچھ بھی نہیں لہٰذا یہ ظاہر ہوا کہ ذوالفقرات کے معاملے میں دست و بازو' ہڈیوں کے مقابلے میں زیادہ اطلاعات مہیا کر سکتے ہیں پس یہ ثابت ہوا کہ ہڈیوں کی کیت پسلیوں اور کھوپڑیوں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ جبڑے کی ہڈی کی اس سلسلے میں زیادہ اہمیت ہے' کیونکہ اس کی ساخت سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ متعلقہ جانور کی غذا کیا تھی' جہاں تک نباتات کی غذا کا تعلق ہے اس کا زیادہ تر انحصار فطرت کے ذرائع پر ہے۔ لہٰذا یہ دوبارہ دہرایا جاتا ہے کہ ایک گھونگے کا ڈھانچہ جو اس کے جسم کا ملبوس بھی ہے پرندوں کے ڈھانچے کے مقابلے میں زیادہ اطلاعات فراہم کرتا ہے' جو ان کے جسم کے اندر ڈھکا ہوا ہے۔ بیرونی ملبوس کے اعضا کو نسلی اظہار کے سلسلے میں زیادہ سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ آنکھیں صرف رنگ اور صورت کے لحاظ ہی سے نہیں بلکہ دیکھنے اور اظہاری انداز کے لحاظ سے بھی اہم ہیں۔ منہ جو نہ صرف کلام کرتا ہے بلکہ تفہیم میں انداز اظہار میں ممد ہوتا ہے اور سر (کھوپڑی نہیں) جو گوشت اور چمڑے میں ملبوس ہو کر اپنی صورت کا اظہار کرتی ہے اور انسانی زندگی کے غیر نباتاتی پہلو کا نمائندہ ہے۔ اس امر پر غور کریں کہ کس طرح ہم ایک طرف تو گلاب اور دوسرے پھولوں کو پیدا کرتے ہیں اور دوسری طرف ہم گھوڑوں اور کتوں کو بھی پیدا کرتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ انسانی نسل کو بھی پیدا

کیا جائے۔ مگر یہ درست نہیں کیونکہ وہ حصے جن کو ہم دیکھ سکتے ہیں اور جن کی کوئی ریاضیاتی ہیئت بن سکتی ہے وہ سب صرف حرکت کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی سے کوئی تعبیر ممکن ہو سکتی ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک غیر متحرک انسان دوڑنے کے لیے تیار ہے تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہماری تجربہ کار آنکھ کسی ایسی حرکت کو دیکھ رہی ہے جو دوڑ سے قبل انسان سے ظاہر ہوتی ہے۔ ایک ارنے بھینسے' ایک ٹراؤٹ مچھلی' ایک سنہری عقاب کی حقیقی دوڑ کا مظاہرہ کسی بھی صورت میں دوبارہ پیدا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ مخلوق ایک واضح اور محکم سطح قائم کرنے کے بعد ہی جست لگاتی ہے ان کے اس عمل میں کس قدر شدید کشش ہوتی ہے؟ اس پر ایک تخلیقی فن کار یہ دعوے سے کہہ سکتا ہے کہ ان کی تصویر میں ان کے نسلی اوصاف کو صرف آنکھوں ہی سے نہیں بلکہ روح کی گہرائیوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اسے دیکھنا چاہیے اور دیکھنے کے بعد ہی محسوس ہوتا ہے کہ کس قدر قوت حیات سر اور آنکھوں میں مجتمع ہوتی ہے اور خون سے بھری ہوئی آنکھوں سے کس طرح کلام کرتی ہے اور سینگ کیا انداز اختیار کرتے ہیں اور شکاری پرندے کی چونچ اور ہیئت کے متعلق صرف ایک یا دو نقاط ہی بیان کیے جا سکتے ہیں کیونکہ سب کے سب الفاظ کے احاطے میں لانے ممکن نہیں اور فنی شاہکاروں ہی میں ان کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔

اس نمایاں نشان کے بعد جسے اوپر واضح کیا گیا ہے اور جس میں اعلیٰ ترین جانوروں کے حوالے سے ذکر ہوا ہے ہم نسل کے تصور کے بالکل قریب پہنچ گئے ہیں' جو ہمیں بنی نوع انسان کی مختلف اقسام میں اعلیٰ حیوانی اور نباتیاتی کی صنف بندی کرنے اور ان میں امتیاز قائم کرنے میں ممد ہو گا۔ یہ فرق روحانی ہیں اور اس لیے انھیں سائنس کے اصولوں کے تحت پرکھا نہیں جا سکتا۔ انسانی ڈھانچے یا کھوپڑی کی مدد سے نسلی تعین کی اہمیت ختم ہو چکی ہے۔ "ریٹ زی اوس" (وفات ۱۸۶۰ء) نے اس سے قبل ہی "بلومن باخ" کے اس نظریے کو رد کر دیا تھا کہ کھوپڑی اور نسل کا آپس میں گہرا تعلق ہے اور جے رینکے نے اپنے تصورات کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کیا ۔ "کھوپڑی کی تشکیل کے متعلق جو کچھ بنی نوع انسان کے معاملے میں بتایا جاتا ہے بالکل اسی طرح ہر قبیلے میں بھی اسی پیمانے پر ایسے اختلافات موجود ہوتے ہیں (Volksstamm) اور بعض ذرا بڑے معاشروں میں بھی ---- مختلف شکل و صورت اور پیمائش کی کھوپڑیوں کو جب یکجا کر کے معائنہ کیا گیا تو ثابت ہوا کہ بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی کھوپڑیوں کے علاوہ درمیانے حجم کی کھوپڑیاں بھی موجود تھیں اور وہی زیادہ تعداد میں تھیں۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ معقولیت کا تقاضا یہی ہے کہ بنیادی ہیئت کو تلاش کیا جائے مگر محقق کو یہ امر کبھی بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ یہی کھوپڑیاں تحقیق نتائج اخذ کرنے کے لیے موزوں ہیں اور تمام ضرورتیں اور پیمائشیں انھیں سے پوری کی جا سکتی ہیں۔ اس کے بعد جو نتائج اور حد بندیاں وہ مقرر کرتا ہے ان کی بنیاد محض اس کے ذاتی ذوق پر ہے کوئی اصول قائم کرنے کے لیے جن حقائق کو دریافت کرنا ہو گا وہ یہ ہیں کہ بنی نوع انسان کی کھوپڑیوں میں معمولی فرق برفانی دور ہی سے موجود ہے اور یہ کبھی بھی زیادہ نمایاں نہیں رہا اور ایسا فرق بلا امتیاز ہر خاندان میں پایا جاتا ہے۔ اس لیے سائنس کا ایک یقینی نتیجہ جو رینکے نے اخذ کیا' کہ جب کھوپڑیوں کو سلسلہ وار ترتیب دیا گیا تو ان کے جو اطوار دستیاب ہوئے ان کا تعلق نسل سے نہ تھا' بلکہ خطہ ارضی سے تھا۔

حقیقت میں انسانی سر کا نسلی اظہار اپنے آپ کو کسی بھی معلومہ کاسہ سر سے منسلک کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ فیصلہ کن عنصر ہڈیاں نہیں بلکہ گوشت پوست' منظر اور چہرہ مہرہ ہیں۔ رومانی دور ہی سے ہم ہندی' جرمن نسل کا ذکر کرتے رہے ہیں مگر کبھی کسی نے یہ نشاندہی نہیں کی کہ یہ کاسہ سر آریائی ہے اور سامی ہے؟ کیا ہم سیلٹک اور فرینکش کھوپڑیوں میں تمیز کر سکتے ہیں؟ یا بوئر اور کافر کھوپڑیوں میں تمیز کی جا سکتی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو اس کرہ ارض کی تاریخ پر بے شمار ایسے واقعات گزرے ہیں جو تاریخ عالم کی زد میں نہیں آ سکے اور ہڈیوں کے ماسوا باقی کسی کے متعلق کچھ علم نہیں ہے اور یہ نسلی تحقیق کے سلسلے میں کس قدر غیر ضروری ہیں' جو اعلیٰ انواع کے انسانوں کے متعلق اہم تجربات کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔ ایک انسانی گروہ کا بعض قابل ادراک حوالوں' جو نسلی فرق سے متعلق ہوں' مطالعہ کیجیے جبکہ آپ کے ذہن میں "نسل" کا تصور ہو تو انھیں ایکس رے کے سامنے رکھ دیں تو جو نتیجہ نکلے گا وہ محض مسخرہ پن ہو گا جونہی ان پر روشنی ڈالی جائے گی نسلی علامات فوری اور مکمل طور پر ختم ہو جائیں گی۔

یہ تجربہ بہت زیادہ دہرایا نہیں جا سکتا۔ مزید برآں اس کا جتنا حصہ بھی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اس کا تعلق خطہ ارضی کے اثرات سے ہے اور ادرار خون سے نہیں ایلیٹ سمتھ نے مصر میں اور وون لوشن نے کریٹ میں بہت سے تجربات کیے انھوں نے اس مقصد کے لیے اپنا مواد قبروں سے حاصل کیا جو پتھر کے زمانے سے لے کر دور حاضر تک تھا۔ بحری انسانوں سے لے کر جو ہزار سے دو ہزار سال ق م میں پائے جاتے تھے اور عرب ترک اس خطے میں لہر بہ لہر آباد رہے ہیں مگر ہڈیوں کی اوسط تشکیل میں کوئی فرق نہیں آیا(۱۴)۔ الپائن کے خطے میں آج کل جو لوگ آباد ہیں' وہ نسلی لحاظ سے بہت مختلف ہیں۔ ہم تھوڑی سی نظر ماضی میں ڈالیں تو ہمیں وہاں ایٹروسکن اور ہون نظر آ جائیں گے۔ ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کے پیچھے پیچھے چلتا ہے مگر کھوپڑی کی تشکیل ہر خطے میں بالعموم یکساں ہی رہتی ہے۔ جونہی ہم میدانی علاقوں کی طرف بڑھتے ہیں تو معمولی سا فرق بھی ختم ہو جاتا ہے اور سب یکساں معلوم ہونے لگتی ہیں۔ جہاں تک نسل کا تعلق ہے قدیم انسان کی نسلی آوارگی کے متعلق اب تک جو آثار ملے ہیں' یعنی نینڈرتھال اور آری گنیشین' ان سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا' صرف جبڑے کی ہڈیوں سے یہ سراغ ملتا ہے کہ وہ کس قسم کی خوراک کھاتے تھے۔ وہ صرف اس زمین کی ہیئت کا پتہ دیتے ہیں جہاں سے کہ وہ دستیاب ہوئے تھے۔

ایک بار پھر یہ کہنا ہو گا کہ یہ کوئی خفیہ ارضی قوت ہے جو ہر ذی حیات کو متاثر کرتی ہے۔ جونہی ہم زمین سے آزاد کوئی اصول وضع کرتے ہیں اور ڈاروِن کے اصولوں سے آزاد ہونا چاہتے ہیں ارضی قوت حائل ہو جاتی ہے۔ رومیوں نے جنوب سے انگور شمال میں پہنچایا' مگر وہاں پہنچ کر وہ نباتیاتی لحاظ سے قطعاً تبدیل نہیں ہوا مگر اس سلسلے میں نسل بعض اور ذرائع سے بھی معلوم کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ شمال اور جنوب میں ارضی خصوصیات مختلف ہیں۔ رائن اور موسلے کے انگوروں میں فرق ہو جاتا ہے اور یہ فرق ہر مقام اور ہر پہاڑی خطے میں بھی پایا جاتا ہے اور یہ اصول نباتات کی ہر اعلیٰ قسم میں بھی موجود ہے' مثلاً" چاول' چائے اور تمباکو میں بھی۔ خوشبو' جو اصل دیہاتی علاقوں کی فصلوں میں پیدا ہوتی ہے ایک واضح علامت ہے (یہ اس

لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس کی پیمائش ممکن نہیں) اس سے نسل کی صحیح عکاسی ہوتی ہے مگر انسان کی اعلیٰ نسلی خصوصیات کی نشاندہی اسی انداز سے ہوتی ہے جیسا کہ انگور کی صورت میں دیکھنے میں آئی۔ ان میں یکساں عنصر موجود ہوتا ہے جو صرف اعلیٰ ادراک ہی سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ایک ذرا سی خوشبو ہر صورت میں اثر کرتی ہے جو ہر ثقافت میں اٹروسکن اور نشاۃ ثانیہ کے مابین ٹسکنی' سومیریا اور پروشیا میں ۵۰۰ ق م میں اور اس کے بعد اسلام اور ایران میں انسلاک قائم رہا۔

ان روابط میں کوئی عنصر بھی ایسا نہیں جو سائنس کی دسترس میں ہو اور اس کی پیمائش یا وزن ممکن ہو' اس کا تعلق صرف احساس سے ہے۔ واضح تیقن جو پہلی نظر ہی میں قائم ہو جاتا ہے ---- مگر اس سے عالمانہ تجزیہ ممکن نہیں اور اس سے جو نتیجہ میں اخذ کرتا ہوں' وہ یہ ہے کہ نسل بھی زبان اور قضاوقدر کی طرح زندگی کے ہر پہلو میں فیصلہ کن حیثیت کی حامل ہے' جسے ہر کوئی واضح طور پر اور یقینی طور پر جانتا ہے تاوقتیکہ وہ اسے معقولات کے حوالے سے حل کرنے کی کوشش نہ کرے' یعنی بے روح جراحانہ عمل سے اور ایک ترتیب کے ساتھ تباہ نہ کر دے نسل' زبان اور قضاوقدر متحدہ امور ہیں۔ مگر جونہی سائنسی فکر ان کے قریب جاتی ہے تو لفظ زبان ایک بعد کی حیثیت سے اپنی اہمیت حاصل کر لیتا ہے اور لفظ "قضاوقدر" اپنا تعلق سلسلہ علت و معلول سے استوار کرتا ہے۔ جبکہ نسل اس سطح پر بھی جس کے متعلق سائنس کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہے عدم تعلق کی بنا پر ناقابل فہم ابتری اور متجانس اطوار کی حامل اور لاینحل ہی رہتی ہے (زمین' مدت' ثقافت اور تولید کی عنوانات کے تحت) کیونکہ نہ تو اس کے لیے کوئی قانون ہے اور نہ حد اختتام بلکہ بغیر کسی اصول کے ہی تمام متجانس عناصر ایک دوسرے میں مدغم ہوتے رہتے ہیں بعض کسی خاص گروہ میں سختی سے اور مستقل طور پر شامل ہو جاتے ہیں۔ دوسرے بادلوں کے سائے کی طرح کسی آبادی پر سے گزر جاتے ہیں اور بعض ایسے کردار کا مظاہرہ کرتے ہیں گویا وہ ارضی بھوت ہوں' جو ہر اس شخص پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے ہیں' جو ان کی راہ میں آ جائے۔ بعض ایک دوسرے کو باہر نکال دیتے ہیں' بعض ایک دوسرے کی طلب کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ نسلوں کی درست صنف بندی ---- جو ہر ماہر نسلیات کی آرزو ہے ---- ناممکن ہے۔ ایسی کوشش' آغاز ہی سے تباہی کا شکار ہو جاتی ہے کیونکہ وہ خود ہی نسلی مزاج کی تردید کر دیتی ہے اور اس سلسلے کا کوئی قاعدہ یا نظام وضع کیا جائے' غلط ثابت ہو گا۔ اور فی نفسہ موضوع کی نوعیت ہی کے متعلق غلط فہمی کا باعث ہو گا۔ نسل گفتار کے مقابلے میں کلی طور پر کسی نظم و ضبط کی پابند نہیں بالآخر ہر شخص ہر لمحہ زندگی میں خود ہی اپنی نسل ہے اور یہی انداز ہے جس کے ذریعے ٹوٹم تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے مگر صنف بندی یا چہرہ شناسی سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

(۴)

ہر وہ شخص جو زبان کے مزاج میں دخل دینا چاہتا ہے' اسے چاہیے کہ وہ لسانیات کے تمام اوزار ایک طرف رکھ دے اور یہ دیکھے کہ ایک شکاری' اپنے کتے کے ساتھ کس انداز میں کلام کرتا ہے۔ کتا اس

کی انگلی کے اشارے کو سمجھتا ہے وہ اسے سنتا ہے اور الفاظ کی آواز پر تن جاتا ہے مگر اپنا سر ہلاتا ہے۔ کیونکہ اس نوعیت کی انسانی زبان کو وہ نہیں سمجھتا۔ پھر وہ ایک یا دو فقرے دہراتا ہے تاکہ اس کا نقطہ نظر واضح ہو جائے وہ بے حس و حرکت کھڑا رہتا ہے' پھر بھونکتا ہے۔ گویا وہ اپنی زبان میں کوئی فقرہ ادا کر کے سوال کر رہا ہے کیا اس کے آقا کا مطلب یہی ہے اور پھر بھی کتے کی زبان میں وہ اپنی خوشنودی کا اظہار کرتا ہے کہ وہ درست کہتا تھا۔ بالکل اسی طرح دو آدمی جن میں ایک بھی لفظ مشترک نہیں ہوتا' ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں' جب کوئی دیہاتی آدمی کسی کسان کو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ اس کی طرف غور سے دیکھتا ہے اور غیر شعوری طور پر وہ اپنی نگاہ میں ایسی روح شامل کر لیتا ہے کہ وہ یقینی طور پر عام اظہار و تکلم سے کبھی بھی نہ سمجھ سکتی۔ آج کے دور کا اسلوب تقریر' بلا استثنا دیگر ذرائع تفہیم کے بغیر سمجھ میں نہیں آتی فی نفسہ کوئی بھی ذریعہ اظہار مکتفی بالذات نہیں رہا۔

اگر کتا کچھ چاہتا ہے تو وہ اپنی دم ہلاتا ہے۔ وہ اس معاملے میں بے صبری کا اظہار کرتا ہے کہ اس کا آقا اس کے مکمل' واضح اور صاف صاف کلام کو سمجھ نہیں سکا وہ مزید آوازیں نکالتا ہے۔ وہ بھونکتا ہے ---- اور پھر اپنا رویہ تبدیل کرتا ہے۔ پھر آوازیں نکالتا ہے اور اشارات کرتا ہے۔ یہ اس انسان کا زاویہ منفرجہ ہے جسے ابھی تک بولنا نہیں آیا۔

بالآخر ایک بڑی قابل دید صورت پیدا ہوتی ہے جبکہ کتا اپنے آقا کی تمام گفتگو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے تو وہ اپنے آقا کے بالکل مقابل ساقط کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال دیتا ہے۔ یہ امر عجیب پر اسرار ہونے کے باوجود وقوع پذیر ہوتا ہے' جو فوری رابطے کا باعث ثابت ہوتا ہے جو انسانی اور حیوانی انا کا رابطہ ہے۔ وہ نگاہ کتے کے شعور بیدار کی حدود سے پیدا ہوتی ہے اور بغیر کسی اشارے کنائے کے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ یہاں پر کتے کو انسان پر آزمائش کا موقع مہیا ہوتا ہے وہ اس کی آنکھوں میں براہ راست دیکھتا ہے اور کلام کے انداز اور منشا کو سمجھ لیتا ہے۔

اس نوعیت کی زبان' حقائق کے شعور کے بغیر ہم عادتاً" بھی استعمال کرتے ہیں۔ معصوم بچہ اس وقت بھی گفتگو کرتا ہے' جب اس نے ابھی تک لفظ بھی سیکھا نہیں ہوتا اور بالغ انسان بھی اس کے ساتھ کلام کرتا ہے اور اس سلسلے میں جو الفاظ وہ استعمال کرتا ہے' ان کے عام معانی کے متعلق اس نے کبھی نہیں سوچا۔ گویا وہ ایسی آوازیں پیدا کرتا ہے جو متعلقہ زبان کے الفاظ سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ ایسی زبانوں کی بھی مختلف بولیوں میں تقسیم ممکن ہے۔ انھیں بھی سیکھا جا سکتا ہے ان میں مہارت حاصل کی جا سکتی ہے اور انھیں غلط بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ ہمارے لیے اس قدر ناگزیر ہیں کہ ہم اشارے کنائے اور مہمل آوازوں کو ترک کر دیں تو عام مروجہ زبان ہمارا ساتھ نہ دے سکے۔ ہمارا رسم الخط بھی جو ہماری آنکھوں کے لیے صوتی زبان ہی ہے' ناقابل فہم ہو جائے' اگر ہم اسے اس مدد سے محروم کر دیں جو رموز اوقاف سے اسے حاصل ہے۔

ماہر لسانیات کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ صرف لفظی زبان ہی کو عام انسانی زبان سمجھتا ہے اور وہ بھی محض نظریاتی طور پر نہیں بلکہ عادتاً" اپنی تحقیقات کے دوران بھی اسے انھیں حدود کے اندر محدود کر لیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ گفتگو کے ایک انتہائی اہم انداز کو نظرانداز کردیتا ہے اور اس سے بے خبر رہتا ہے حالانکہ یہ انداز حیوانات اور انسان دونوں میں کثیر الاستعمال ہے۔ گفتگو کا میدان کلی حیثیت میں بہت وسیع ہے اور زبانی گفتگو اس کا صرف ایک حصہ ہے۔ (ایک ایسی عملی کی جو ابھی تک دور نہیں کی جا سکی) اور ایک ایسا حصہ جسے زبان کے طلبا نے ابھی تک محسوس نہیں کیا۔ جہاں تک "انسانی تکلم کے آغاز" کا تعلق ہے تو یہ جملہ ہی غلط فہمی کا باعث ہے ---- کیونکہ اس کی مراد ہی یہی ہے ---- کیونکہ اس نوعیت کا لسانی آغاز کبھی ہوا ہی نہیں۔ یہ تو ابتدائی ہے اور نہ ہی وحدانی' انسانی تاریخ کے بعض مدارج میں اس نے جو بہت زیادہ اہمیت اختیار کر لی ہے اس سے ہمیں اس کے وجود کی آزادانہ نقل و حرکت کے متعلق غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے اور زبان کی ابتدائی تخلیق کا مسئلہ صرف انسان تک ہی محدود نہیں رہنا چاہیے۔

مگر حیوانی زبان کے آغاز کا مسئلہ بھی غلطی سے مبرا نہیں۔ گفتار' حیوانی دنیا کے ساتھ اس قدر مربوط ہے (یہ صرف نباتاتی' ہونے کے تصور کی بھی تردید ہے) کہ یک خلیہ حیوان بھی جو ہر قسم کے احساس سے محروم ہیں' انھیں بے زبان سمجھا جا سکتا ہے۔ عالم صغریٰ سے عالم صغریٰ تک وہ بھی باہم ابلاغ کی قدرت رکھتے ہیں۔ حیوانی دنیا میں آغاز گفتار پر بحث اس لحاظ سے بے معنی امر ہے کیونکہ دنیا میں خردبینی مخلوق بھی ایک بڑی تعداد میں موجود ہے۔ دیگر امکانات پر غور و فکر محض تضیع اوقات ہے اگر ڈارون کی حقیقت الانواع کا نظریہ قبول کر لیا جائے یا وکٹوریہ کے عہد کا وہ اجدادی مسلمہ درست سمجھا جائے' پھر بھی یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے کہ مکڑیوں کے جھنڈ بھی اتنا شعور رکھتے ہیں کہ وہ بطور سمجھ دار مخلوق "اپنی جماعت" سے شناسا رہیں اور ضرورت کے وقت شعور بیدار کے تحت ایک دوسرے سے رابطہ کر لیں۔ وجود بیدار ایک توسیعی فعالیت ہے مزید برآں فعالیت بالارادہ ہے۔ عالم صغریٰ کی حرکت اور نباتات کی میکانکی حرکت میں یہی فرق ہے' جیسا کہ حیوان یا انسان میں۔ جب وہ نباتاتی سطح پر ہوتا ہے یعنی عالم خواب میں ہوتا ہے حیوانات کی فعالیت' متعلقہ خوراک' نسل کشی' دفاع' حملہ۔ جس کا ایک پہلو ہمیشہ حواس کی مدد سے عالم صغریٰ سے متعلق رہتا ہے خواہ وہ یک خلیائی مخلوق کی غیر منقسم حسیت ہی کیوں نہ ہو' یا انتہائی ترقی یافتہ آنکھوں کی بصارت ہو' جو کہ اس وقت زیر بحث ہے۔ ہر حالت میں تاثرات کو قبول کرنے کا عزم موجود ہے۔ اسے ہم سمت بندی کا نام دیتے ہیں اور اس کے ساتھ فوری طور پر کلام بطور فعالیت کا آغاز ہوتا ہے جو حیوانی شعور بیدار کی خاصیت ہے' اس وقت تک کسی بنیادی امر کا غلبہ نہیں ہوتا۔ اعلیٰ تہذیبوں کی بے حد عمدہ زبانیں بھی ان امکانات ہی کا مظہر ہیں جو تمام اس حقیقت میں مضمر تھیں جس کا مظاہرہ یک خلیائی جاندار بھی ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔

مگر اس حقیقت کی بنیاد خوف کے ابتدائی احساس میں مضمر ہے۔ شعور بیدار کائنات میں ایک سربلند

کرتا ہے' بعض مخصوص مقامات پر جگہ تلاش کرتا ہے اور ان پر قبضہ کر لیتا ہے۔ روز مرہ کی بیداری کا ایک تاثر تنہائی کا احساس ہے لہٰذا قدیم مہیجات پر لازم ہے کہ اس اجنبی دنیا میں سب یکجا ہو کر حالات کا سامنا کریں تاکہ ایک دوسرے کی قربت کا یقین ہو جائے اور شعوری رابطہ عمل میں آئے۔ مخاطب کا وجود خوف کے احساس سے آزاد کرتا ہے۔ بیگانی دنیا میں دوسروں کا وجود نامیاتی اور روحانی لحاظ سے قدیم حیوانی تاریخ کا ایک عظیم لمحہ ہے۔ اس کے بعد حیوانات کو اپنے وجود کا احساس پیدا ہو جاتا ہے اس مقصد کے لیے ان جرثوموں کا طویل اور محتاط مشاہدہ لازمی ہے جو پانی کے ایک قطرے کے اندر پائے جاتے ہیں۔ آپ کو خردبین کے نیچے ایک جہان نظر آئے گا' اور ہر ایک کی علیحدہ شخصیت اور وجود کا راز آشکارا ہو گا اور یہاں پر بھی من و تو کی دنیا کا مظاہرہ دیکھنے کو ملے گا۔ اگرچہ یہ دنیا سادہ ترین قابل تصور دنیا ہے۔ یہ ننھی مخلوق اپنے علاوہ دیگر مخلوق سے بھی آشنا ہے' نہ صرف انفرادی حیثیت سے بلکہ اجتماعی حیثیت سے بھی' نہ صرف ان میں شعور بیدار موجود ہے بلکہ شعور بیدار کی نسبت سے باہمی تعلقات بھی' نہ صرف وہ اس امر کا اظہار کرتے ہیں بلکہ ان میں تکلم کا عنصر بھی موجود ہے۔

اس موقعے پر کلام کے دو گروہوں کے امتیاز کو یاد کیا جائے۔ کلام کا اظہار ایک دوسرے وجود کو بطور گواہ تسلیم کرتا ہے اور اس کا ہدف ان اثرات کا مشاہدہ ہے جو فریق ثانی پر ہویدا ہوتے ہیں جبکہ ابلاغی کلام دوسرے کو ہمکلام سمجھتا ہے' اور اظہار کا جواب چاہتا ہے' ادراک کا مطلب ہے کہ دوسرے کے تاثرات کا احساس پیدا ہو' اور اس کے مقابلے میں اپنے احساس کی ترجمانی کی اہمیت ظاہر ہو اور یہی وہ بنیادی نقطہ ہے' جو انسانی تکالم کے اظہار یعنی فن کی عمدگی کا باعث بنتا ہے ۔ اسے سمجھنے کے لیے محو تکلم ہونے کے لیے ان میں بھی وہی احساس موجود ہے جو انسان میں ہے۔ کسی مخاطب کے سامنے تکلم کو محرک کہا جاتا ہے اس محرک کی ا کیفیت ہی طریق اظہار کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ دوسری طرف ایسے اظہار کی تخلیق جس کا مقصد دوسروں کا ادراک ہو' اسے علامت کہا جاتا ہے اور تمام طریقہ ہائے ابلاغ کی یہ ابتدائی اکائی ہے اور اس میں انسانوں کا بلند پایہ کلام بھی شامل ہے۔

انسانی شعور بیدار میں کلام کی ان دونوں دنیاؤں کی وسعت کے متعلق دور حاضر میں شاذ ہی کوئی تصور قائم کیا جا سکا ہے۔ اظہاریہ گفتگو جو کہ کلام کی قدیم ترین نوعیت ہے وہ امتناعات مذہب کے تحت قائم ہوئی۔ اس میں نہ صرف آرائشی یعنی مرصع زبان شامل ہے جو آغاز میں تصور فن کے ساتھ گہری تطبیق کی حامل ہوتی ہے اور وہ ظاہری اظہار کی صورت کو مشکل بنا دیتی ہے۔ بلکہ وہ اسے سنجیدہ اور تقریباتی رنگ بھی فراہم کرتی ہے جس کے قواعد و ضوابط کا جال تمام عمومی زندگی پر تنا جاتا ہے اور خاندان پر بھی اس کے اثرات پڑتے ہیں اور ملبوسات کی زبان جو آپ کے تن کے کپڑوں سے ظاہر ہے اور ان نشانات میں جو آپ نے اپنے جسموں پر کھدوا رکھے ہیں اور ذاتی سازوسامان سے ظاہر ہے ان سب کی یکساں اہمیت ہے۔ انیسویں صدی کے محققین' یہ ثابت کرنے میں ناکام رہے کہ لباس کا آغاز شرم کے جذبے یا محض ضروریات کی تسکین کی غرض سے ہوا۔ یہ صرف اظہاریہ زبان ہی کی بدولت ظاہر ہوتا ہے کہ اسے ایک عظیم سطح پر بلند پایہ تہذیبوں میں اپنایا گیا جن میں ہماری آج کی تہذیب بھی شامل ہے۔ ہمیں صرف اپنی عوامی زندگی میں

عادت اور اسلوب کے غالب اثرات کا جائزہ لینا ہو گا۔ اس سے معلوم ہو گا کہ ہر موقع کے لیے لباس کے کچھ قواعد موجود ہیں کہ اس تقریب پر یہ لباس ہو گا کہ اس تقریب پر وہ لباس ہو گا۔ شادی کا لباس' سوگ کا لباس' فوجی وردی' پجاری کا لباس' تمغے اور آرائش' ٹوپی' کلاہ دراز' چندیا مونڈ دینا' ججوں کے سر کا بالدار پٹکا یا قطار بنایا غازہ' انگوٹھیاں' بال ترشوانے کے اسلوب' حصہ جسم کی اہم نمائش واظہار اور اہم اخفا نمائندگان اور اراکین مجلس کے لباس' راہب اور راہبات' نیو' صلاح الدین اور مونٹے زوما کے درباریوں کے لباس' کسانوں کے لباس کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ پھولوں کی زبان' رنگوں اور قیمتی پتھروں کی آرائش ان سب کے لیے علیحدہ علیحدہ الفاظ ہیں' جہاں تک مذہبی امور کی زبان کا تعلق ہے اس کا تو ذکر ہی غیر ضروری ہے کیونکہ وہ تمام مذہب ہی کا حصہ ہے۔

ابلاغ کی زبانیں جن میں ہر قسم کا ادراکی تاثر اور احساس کی ترجمانی اور تفہیم کی جا سکتی ہے اور ہر شامل فرد اسے سمجھ سکتا ہے یہ بتدریج مکمل ہوئی ہیں۔

(جہاں تک اعلیٰ ثقافتوں کے باشندوں کا تعلق ہے) تین نمایاں اشارات کا نظر میں رکھنا ضروری ہے' تصویر' آواز' اور چہرہ مہو' جو یورپ کی لفظی اور تحریری کلام میں حروف تہجی' الفاظ' اعراب' میں تبدیل ہو گئے ہیں۔

اس ارتقا کے طویل دور میں بالآخر کلام اور تقریر علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ اس تمام کارروائی میں تاریخ زبان جسے لمحاتی پیدار تسلیم کرنے میں تامل ہوتا ہے' اور اس کا مقصد صرف شعور بیدار کی ترجمانی تھا۔ اس لیے ان کی حقیقی' محسوس' اور بالعزم اہمیت یکساں ہے لیکن یہ صورت اس وقت برقرار نہیں رہتی' جبکہ علامات کا کوئی نیا مجموعہ وجود میں آ جاتا ہے اور اس کے مطالب کے تغیر کی فعالیت ظاہر ہونے لگتی ہے۔ اب دونوں کا اتحاد ایک امر بدیہی نہیں رہتا بلکہ اس کا امکان ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اہمیت کا احساس ایک زندہ احساس ہوتا ہے اور ہر شے کی طرح زمان اور قضاوقدر اس کا وقوع اور عدم وقوع شاذ ہی ہوتا ہے۔ کوئی علامات بھی خواہ وہ کتنی بھی عام ہوں' بطور عادت استعمال ہو رہی ہوں ہمیشہ ایک ہی مطلب کے لیے استعمال نہیں ہوتیں۔ جامد نشان کا میدان ایک وجود کا غیر مشروط طور پر حامل نظام ہے جس کا تعلق توسیع خالص سے ہے۔ یہ کوئی نامیاتی وجود نہیں' بلکہ ایک نظام ہے جس کا اپنا سلسلہ علت و معلول اور اپنی منطق ہے۔ یہ متخالف اور ناقابل اتحاد تصورات کو باہم یکجا کر دیتا ہے' مثلاً زمان و مکان' ذہانت اور جذباتی کیفیات اور اس طرح دو مختلف وجودوں کے شعور بیدار کو متحد کر دیتا ہے۔

علامات اور محرکات کا یہ مقررہ ذخیرہ اپنے مصنوعی طور پر مقررہ معانی کے ساتھ ادراک اور مشق سے سیکھے جا سکتے ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہو کہ وہ بھی اس معاشرے میں اپنا مقام پیدا کرے جس کی کہ زبان مروج ہے مناسب لزومات زبان جنہیں بول چال سے خارج کر دیا گیا ہو ان کی تفصیل مہیا کرنا مدارس کی ذمہ

داری ہے۔ اگر اعلیٰ درجے کے حیوانات میں ان کی پوری طرح تکمیل ہو جائے اور یہ خود مکتفی مذہب میں' ہر فن میں' ہر معاشرے میں' تو اسے ہر معتقد' ہر فن کار اور ہر اس شخص کا پس منظر کہا جائے گا جس کی تربیت درست طور پر کی گئی ہو۔ یہی وہ مقام ہے جس سے ہر معاشرے کی سرحدوں کا آغاز ہوتا ہے کسی معاشرے کا رکن بننے کے لیے اس کی زبان کا جاننا ضروری ہے ---- یعنی اس کی شرائط ایمان' اس کی اخلاقیات' اور اس کے قوانین معاون موسیقی اور فراخ دلی اور وسیع المشربی سے بھی آشنائی ضروری ہے۔ برکت محض احساس اور نیک نیتی سے حاصل نہیں ہوتی۔ ثقافت کا مطلب آج تک کی ناقابل تصور تختی اور اس کی گہرائی' اور ہر نوع کی زبان پر عبور ہے۔ ہر وہ فرد جو کسی ثقافت سے متعلق ہے تو اس کے لیے ثقافت ان عناصر پر مشتمل ہے۔ اس کی ذاتی عادات و اطوار' مذہبی' اخلاقی' معاشرتی' اور فنی صلاحیتیں ---- اور اس قسم کی زندگی بسر کرنے کے لیے عمر بھر کی تربیت کام دیتی ہے اور اس کے نتیجے میں تمام عظیم فن' عبادت گاہوں کی پر اسراریت اور نظامات کی پیروی کے بعد ہی وہ مقام حاصل ہوتا ہے' جو خود متعلقہ فرد کی ذات بلکہ دیگر افراد معاشرہ کو بھی حیرت میں ڈال دیتا ہے اور وہ خود بھی ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں اسے دنیوی ضروریات سے کوئی سروکار نہیں رہتا۔ اس کے بعد ہر ثقافت میں یکساں طور، ایک نظام ہوتا ہے (ظاہر یا خفیہ) یعنی ایک نعرہ ---- فطرت کی طرف مراجعت ---- یہ پر اسراریت زبان اظہار تک پہنچ جاتی ہے معاشرتی چمک دمک خواہ وہ ظلم و ستم کا نتیجہ ہو یا تغزل کا باخ کی تخلیقات کا نتیجہ ہو یا ایکسی کیاس کی مصوری ۔ ہم نے ایتھنز کا فن تقریر بھی دیکھا ہے اور فرانسیسی مکالمہ نگاری بھی' دونوں تمام دیگر فنون کی طرح یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ایک سخت محتاط اور بالغ نظر روایت کی ضرورت ہے۔ جس کے لیے افراد کی ضروری تربیت کا ہونا لازمی شرط ہے۔

مابعدالطبیعیاتی لحاظ سے زبان کی یہ تقسیم کچھ زیادہ قابل تعریف نہیں' روز مرہ کی گفتگو جو مروجہ اور مسلمہ انداز میں کی جاتی ہے اور شعور بیدار کی تمام خواہشات بھی اس ہیئت میں ہوتے ہیں اس میں اب کوئی عبوری دور کی عملی کارروائی کی گنجائش باقی نہیں۔ بلکہ صرف اس کے وجود کو تسلیم کرنے کی ضرورت ہے اور متعلقہ لفظ کو اس کے مطالب اور روح کے مطابق سمجھنے کی ضرورت ہے ---- اس لیے اس کے نتیجے میں شعور بیدار میں احساس اور ادراک کے مابین امتیاز پہلے سے بھی زیادہ نمایاں ہو گیا۔ ایک ابتدائی زبان سمجھ میں آنے لگی تکلم کی مشق کے لیے پہلے معلومہ ذریعہ اظہار کو محسوس کرنا ہو گا اور دوسرے اس غایت کو سمجھنا ہو گا' جو متعلقہ وقت پر اس میں شامل کی گئی ہے۔ اس کے نتیجے میں تمام تربیت علم کے عناصر کی حیثیت سے دسترس میں آ جائیں گے۔ ہر عبادات گاہ بلا جھجک اس پر زور دیتی ہے کہ نجات کے لیے احساس کی بجائے علم کام آتا ہے تمام فنون کا انحصار ہیئت کے یقینی علم پر ہے جو متعلقہ فرد دریافت نہیں کرتا بلکہ سیکھتا ہے۔ تفہیم سے مراد علم کا بطور وجود ادراک ہے۔ اس کا کوئی تعلق خون' نسل' یا زمان سے نہیں۔ جامد کلام کے غلاف خون کا ادرار اور تاریخ کی تشکیل حقیقت مطلق کی نفی ہے جو قائم و دائم اور عالم گیر حیثیت سے برتر اور قوی ہے اور ہر مدرسہ فکر اور عبادت گاہ کا مقصود ہے۔

حتمی تجزیئے میں زبان نا مکمل ہی ثابت ہوتی ہے کیونکہ یہ کمی ہر صورت میں موجود رہتی ہے کہ تکلم کی مراد کیا تھی اور جو کچھ اس نے بیان کیا ہے اس کا مطلب کیا ہے۔ ہم یقینی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ جھوٹ کا وجود دنیا میں اسی بنیاد پر قائم ہوا کہ گفتار اور اظہار میں فرق آ گیا۔ علامات تو موجود ہیں مگر وہ مطالب کی نشاندہی نہیں کرتیں۔ ہم پہلے کسی شے کی حقیقت کو محسوس کرتے ہیں' پھر اسے بیان کرتے ہیں اور بالاخر اسے پرکھتے ہیں۔ یہ تجربہ قدیم دور ہی سے دہرایا جاتا رہا ہے کہ جب کوئی شخص کچھ کہنے کا ارادہ کرتا ہے تو الفاظ ساتھ نہیں دیتے' (ورسے جن: غلط اظہار) گویا اپنے نقطہ نظر کا درست اظہار نہیں ہوا اور وہ فی الحقیقت جو کہنا چاہتا تھا' اس کی بجائے کچھ اور کہہ گیا اور اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ متعلقہ فرد نے تو صحیح بیان کیا ہو مگر اسے غلط سمجھا گیا ہو بالاخر ہم فن کے حوالے سے بات کرتے ہیں جو حیوانوں میں بھی موجود ہے (مثلاً بلبوں میں) "ایسے الفاظ کا استعمال جن سے مطلب عیاں نہ ہو"۔

کوئی شخص ہر بات نہیں بتاتا کوئی آدمی کسی بات کو مختلف انداز میں کہتا ہے کوئی آدمی ہر بات کو مروجہ انداز میں نہیں کہتا' کوئی شخص کسی مختلف موضوع پر بات کرتا ہے۔ ایک شخص بڑے باقاعدہ انداز میں گفتگو کرتا ہے' مگر وہ ساری گفتگو بے مطلب ہوتی ہے۔ کوئی شخص محض اس لیے روانی سے گفتگو کرتا ہے کہ جو کچھ اس نے کہا ہے اس پر پردہ پڑا رہے یا کوئی شخص کسی دوسرے کی تقریر کی نقل کرتا ہے۔ سرخ پشت تلعان ننھے گویا پرندوں کی چہکار کی اس لیے نقل کرتی ہے کہ ان کو اپنی طرف ورغلا سکے۔ یہ شکاریوں کا مشہور داؤ ہے مگر اس میں مقاصد اور روایات موجود ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ قدیم نوادرات اور دستخطوں کی جعل سازی کی جاتی ہے اور یہ تمام صفات کسی ایسے رجحان اور وضع قطع کسی شخص کے انداز تحریر یا زبانی گفتگو کی صورت میں ہر مذہب کی زبان' ہر فن' اور ہر معاشرے میں وقتاً" فوقتاً" نظر آتی رہتی ہیں۔ ہمیں صرف ان الفاظ میں ظاہر کردہ تصورات کا جائزہ لینا چاہیے "منافق" "مسیحی" "انگریز" "رازدارانہ گفتگو" "صحیح العقیدہ" "کفر" اور دیکھیں کہ الفاظ سفارت کار' "یسوعی"' اور اداکار' کا دوسرا مفہوم کیا ہے' ایک شریفانہ معاشرے میں مخالفانہ رویے پر کس طرح نقاب چڑھائی جاتی ہے اور آج کی مصوری میں تو کچھ بھی دیانت دارانہ نہیں ہے۔ آنکھ کو ہر گیلری میں جھوٹ اور تخیل کے کرشمے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

اگر کوئی شخص زبان میں ہکلاتا ہے تو وہ سفارت کار نہیں ہو سکتا مگر زبان پر حقیقی گرفت ہونے کی صورت میں یہ خطرہ ہے کہ الفاظ کی وضع قطع اور معانی میں اختلاف کی وجہ سے معانی ہی نہ تبدیل ہو جائیں۔ یہاں پر اس فن اظہار کی صورت پیدا ہوتی ہے' جسے اسکندریہ اور روم کے فنکاروں نے رواج دیا۔ جن میں تھیوکریٹیک اور برنانو کے نام تغزل کے لیے اور ریجر موسیقی میں اور کرک گارڈ مذہبی ادب کے لیے مشہور ہیں۔

بالاخر گفتار اور صداقت ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں اور فی الحقیقت یہی وجہ ہے کہ زبان کی ترقی کے ساتھ ہی منصفین کی ضرورت بھی پیش آئی جن کا تعلق متعلقہ نسل ہی سے ہوتا ہے اور وہ جانتے ہیں کہ

اس شخص کو کس انداز میں سماعت کیا جائے جو محو کلام ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا جائے۔ متکلم کے انداز بیان کا تجزیہ کیا جائے یا اس سے فلسفیانہ انداز میں گفتگو کی جائے۔ عبادت کے بعد اس کے دل کی کیفیت کے متعلق استفسار کیا جائے اور نرم گفتگو سے اس کی معاشرتی اہمیت کا قریب سے اندازہ کیا جائے ---- اور یہ عمل بلاتاخیر' فوراً" اور ایسے بدیہی یقین سے کیا جائے' کائناتی اصولوں کے مطابق ہو ---- یہی امر ہے جو فرد اقتاعات کے پاس موجود نہیں اور جو صرف ایک ہی زبان کا بہرحال معتقد ہے۔ ایک پجاری اگر سفارت کار بھی ہو حقیقی پجاری نہیں ہو سکتا۔ کانٹ کی نوعیت کا اخلاقیات کا فلسفی انسانوں کا منصف نہیں بن سکتا۔

وہ شخص جو کذب بیانی کرتا ہے' خود اپنے الفاظ سے اپنی تذلیل کرتا ہے وہ شخص جو اس تذلیل سے بچنے کے لیے بہانہ سازی کرتا ہے وہ اپنے ہی کلام سے خود کو دھوکا دیتا ہے ۔ فی الحقیقت ایسی گفتار' الفاظ اور ان کی معانی میں اختلاف پیدا کر دیتی ہے اور ایک زیرک مشاہد تک رسائی حاصل کرنے سے محروم رہتی ہے۔ ایک پختہ کار ماہر' بین السطور مطالب کو سمجھ لیتا ہے اور جونہی کسی شخص کو چلتے دیکھتا ہے یا اس کی تحریر کو دیکھتا ہے وہ اس کے مزاج کا صحیح اندازہ کر لیتا ہے۔ اگر روحانی تعلق گہرا اور اتحاد فکر پر مبنی ہو تو شعور بیدار بہت جلد مطالب کلام کو اخذ کر لیتا ہے اور علامات کی غرض و غایت کو سمجھ لیتا ہے حقیقی گہری دوستی کی صورت میں کم از کم الفاظ بھی ابلاغ باہم کے لیے کافی ہوتے ہیں اور اگر باہم حقیقی اعتماد کی فضا ہو تو پھر کلام کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ باہمی تفہیم' خالص علامت' جس میں زبان کا بالکل استعمال نہیں ہوتا' اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب دو کسان بوڑھے میاں بیوی اپنی جھونپڑی کے باہر کھلی فضا میں بوقت مغرب بیٹھے ہوں تو وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہی جذبات و احساسات باہم سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں ایسی فضا میں الفاظ صرف فضا کو خراب کریں گے۔ جب باہمی ذہنی اتحاد کی یہ صورت قائم ہو جائے' تو یہ حیوانی عالم سے ماورا حیات متحرکہ کی ابتدائی تاریخ تک پہنچ جاتی ہے یہاں پر شعور بیدار سے بھی آزادی حاصل ہو جاتی ہے اور بعض ایسے لمحات بھی آتے ہیں کہ اس کیفیت کا تجربہ بہت جلد ہو جاتا ہے ۔

(۵)

وہ تمام نشانات جن کا مقرر کیا جانا ضروری ہے ان میں سے الفاظ سے زیادہ کسی سے بھی نتائج حاصل نہیں ہوئے۔ الفاظ کا تعلق بلا شک و شبہ صرف انسانی تاریخ سے ہے بہرحال تصور' بالخصوص روایتی تصور' جو کہ زبانی گفتگو کی اصل ہے' بالکل بے معنی اور بنجر ہے اور بغیر الفاظ' اس کی حیثیت صفر ہے۔ ایک درست آغاز صرف ثانی الذکر صورت میں قابل ادراک نہیں ہوتا کیونکہ وہ تصور ہی سے منسلک ہوتا ہے اور کائناتی روح کے مطابق ہوتا ہے جبکہ اول الذکر قبل از وقت ہی مفروضات قائم کر لیتا ہے جن میں سے بعض ابلاغ کے مقصد کے لیے انتہائی کامیاب ہوتے ہیں اور صرف ایک ہی عنصر پر مشتمل ہوتے ہیں ---- اگرچہ بالاخر وہی غالب عنصر ہوتا ہے اس سے آہستہ اور خاموش ارتقا وجود میں آتا ہے۔ تمام نظریات میں یہ بنیادی غلطی

موجود ہے (جو فطری لحاظ سے ایک دوسری کو منقطع کرتی ہے) جیسا کہ ووںڈٹ" اوجیس پر سن مغالطے کا شکار ہیں۔ وہ الفاظ کو بالکل ایک نئی اور خود کفتی شے سمجھتے ہیں' جو بدیہی طور پر انھیں ایک غلط نفسیات کی طرف دھکیل دیتی ہے۔ اگرچہ فی الحقیقت گفتگو کی زبان ایک ایسا مسئلہ ہے جو بعد میں پیدا ہوا مگر یہ کوئی نئی شاخ بھی نہیں مگر گزشتہ موسم بہار کا شاخ در شاخ پھوٹ نکلنا گویا ایک ہی تنے سے متعدد زبانیں پھوٹ رہی ہیں۔

فی الحقیقت کسی خالص تکلم الفاظ کا وجود نہیں پایا جاتا۔ ہر شخص جب کلام کرتا ہے تو مخصوص ذخیرہ الفاظ کے علاوہ تکلم کے متعدد انداز اختیار کرتا ہے۔ زور دینا' ہم وزن الفاظ استعمال کرنا' اور چہرے سے مناسب حرکات و سکنات کا ظہور' یہ سب انداز الفاظ کی تخلیق سے بھی قدیم تر ہیں۔ مزید برآں یہ کلام کے عمل کے ساتھ مربوط ہو چکی ہیں اس لیے یہ ضروری ہے کہ موجودہ زمانے کے الفاظ کو تاریخ کا موضوع نہ بنا لیا جائے کیونکہ زبان کے ہر لفظ کی اپنی تاریخ ہے اور ان میں سے ہر ایک کی اجتماعی تاریخ میں اپنی اپنی تضادوقدر ہے۔ ہر لفظ کے متعدد پہلو ہوتے ہیں اور ہر پہلو تاریخ سے متعلق نہیں ہوتا پھر ہمیں زبانی اور تحریری زبانوں کا فرق بھی ملحوظ رکھنا ہو گا۔ زبانی کلام سے تو حیوانات بھی آشنا ہیں' مگر ثانی الذکر کا تعلق حروف شناسی سے ہے ----

اگرچہ حروف مفرد ہی ہوتے ہیں مگر پھر بھی ان کی اپنی اہمیت ہے' کیونکہ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بالکل ہی مختلف ہوتا ہے جیسا کہ ہر جانور اپنی مخصوص آوازوں کی مدد سے ایک زبان تشکیل کرتا ہے اور مختلف مقاصد کے اظہار کے لیے استعمال کرتا ہے (غصے میں دھاڑنا) یہ بھی کسی مقصد کے ابلاغ کی علامت ہے (دوسروں کو متنبہ کرنے کے لیے ایک چیخ) دونوں آوازوں میں خاصا امتیاز موجود ہے اور یقینی طور پر انسان کے ایجاد کردہ قدیم زمانے کے الفاظ کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے ۔ لیکن اس زمانے میں کیا یہ اظہار کی زبان تھی یا ابلاغ کی؟ اور کیا الفاظ کی زبان اسی کے ساتھ شروع ہو گئی؟ کیا انسان اس وقت اپنی ابتدائی حالت میں تھا؟ اور آنکھوں اور دیگر اعضا کے اشاروں سے واقف نہ تھا؟ ہمارے پاس ان سوالات کا کوئی جواب نہیں کیونکہ ہمارا ایسا کوئی رابطہ نہیں جس کے واسطے سے ہم ان الفاظ کا جائزہ لے سکیں' جسے ہم آج کے دور میں ابتدائی زبان کہتے ہیں' اس کے متعلق بھی ہمارے اندازے بھولپن پر مبنی ہیں۔ (فی الحقیقت جس لسانی ذخیرے تک ہماری دسترس ہے وہ عہد متاخر ہی سے متعلق ہے) ہم ان حالات ہی سے بے خبر ہیں کہ الفاظ کی ابتدا جن میں ہوئی اور ان الفاظ سے بھی بے خبر ہیں جو ابتدا میں تشکیل پائے۔ الفاظ تو قدیم زمانے ہی سے انتہائی ترقی یافتہ اور بدیہی حیثیت میں وجود میں آ گئے تھے ---- یعنی فی الحقیقت ہر وہ شے جو ابتدا میں موجود نہ تھی (وجود میں آ گئی۔)

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ علامت یا نشان' جس نے انسان کو اشاروں اور چیخ چنگھاڑ سے آزاد کیا وہ الفاظ کی تشکیل تھی' جس نے انسان اور حیوان کے تکلم میں امتیاز پیدا کر دیا۔ یعنی کسی کیفیت کی الفاظ

میں تصویر کشی کی قدرت جسے ایک وجود کی صورت میں تسلیم کر لیا گیا اور نام' اسم وہی کی نقل کے بموجب اشیا میں حلول کر گئے۔ اس امر کا اندازہ کرنا بے معنی ہے کہ پہلے نام کس طرح وجود میں آئے۔ اس عہد کے انسان کے کلام کا کوئی بھی نمونہ اب ہماری دسترس میں نہیں۔ مگر جدید تحقیق کے برخلاف میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ اعضائے حلق میں تبدیلی کی بدولت یا تخلیق اصوات کی بدولت یا دیگر طبیعی عوامل کی وجہ سے طرز تکلم میں کوئی تبدیلی عمل میں نہیں آئی اگر کوئی تبدیلی رونما ہوئی تو وہ نسلی اختلاط کے باعث ممکن ہے۔ یہ بھی نہیں ہوا کہ اس باعث اظہار کی اہلیت میں کچھ اضافہ ہو جاتا مثلاً" الفاظ کی فقرات میں تشکیل کی قدرت میں جو عبوری دور تھا' اسے اہلیت اظہار میں اضافے کی مدت کہا جا سکتا ہے (ایچ۔پال) مگر اشیا اور مختلف قوتوں کے اسما سے ایک عظیم الشان روحانی تبدیلی وجود میں آئی نام کے ساتھ ہی دنیا کے متعلق نئے تصورات پیدا ہونے لگے اگر عمومی کلام کا آغاز' جذبہ خوف کا مرہون منت ہے تو اس صورت میں جب شعور بیدار اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے تو وہ دیگر مخلوق کو بھی اپنے اردگرد جمع کر لیتا ہے تاکہ وہ تمام مل کر اصل حقیقت کے متعلق اپنے اپنے اندازوں سے آگاہ کر سکیں۔ گویا انسانی کلام اور اظہار کے میدان میں صرف ایک لفظ یعنی نام ہی بہت بڑی جست ہے (اگر نام کا وجود نہ ہو تو مختلف لوگ جمع ہو کر خوف کی اصل وجہ کی کس طرح نشاندہی کریں گے؟) نام کی وجہ سے نشاندہی مکمل ہو کر نہ صرف خوف کا سدباب کیا جا سکتا ہے بلکہ اس کے منبع کو بھی پاٹ دیا جا سکتا ہے۔ دنیا صرف ایک وجود ہی نہیں بلکہ اس میں متعدد راز ہائے سربستہ بھی موجود ہیں جو محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ معمولی اظہار و ابلاغ سے بلند ہو کر اور عام مقاصد کے قطع نظر اگر مشاہدہ کریں تو معلوم ہو گا کہ انسان ہر معمے یا چیستاں کا ایک نام وضع کر لیتا ہے البتہ حیوانات اس قدرت سے محروم ہیں۔ انسان بھی اس وقت تک سنجیدگی کی کسی شے کے متعلق کوئی سوچ بچار نہیں کر سکتا' جب تک اسے کوئی نام نہ دے لے۔ ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ انسان نام کو خفیہ رکھتا ہے اور اس کا افشا خطرناک سمجھتا رہا ہے۔ نام سے قبل حیوانوں اور انسانوں میں کوئی فرق نہ تھا' مگر نام رکھنے کے بعد انسان نے مابعدالطبیعیاتی انداز سے اشرف المخلوقات کا رتبہ حاصل کر لیا۔ انسان میں' نام کا تعین' تاریخ کا ایک اہم موڑ ہے۔ ہمارے نظریات علم کلام اور فکر کو پہلو بہ پہلو سمجھنے کے عادی ہیں اور یہ بالکل درست بھی ہے۔ اگر ہم صرف زبان پر غور کریں تو یہ تصور آج بھی اتنا ہی درست ہے جتنا کہ آغاز میں تھا۔ مگر میرا اعتقاد ہے کہ ہم مزید گہرائی میں جا سکتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمام مذاہب کی بنیاد اسی علم الاسما پر ہے۔ مذہب کا صحیح مفہوم' حقیقی مذہب' نیم مذہبی تصورات میں سے صحیح مذہب کے وجود کا عرفان' یہ سب کچھ اسم ہی کی بدولت ہے۔ اس مفہوم کا مذہب سے مذہبی فکر ہے۔ یہ ایک جدید تصور ہے جس کی بنیاد تخلیقی ادراک پر ہے جو خود تحسس پر مبنی ہے۔ یہ ایک اہم محاورہ ہے کہ ہم کسی شے کے متعلق غور و فکر کر رہے ہیں یا اپنی رائے یا رد عمل کا اظہار کر رہے ہیں یہ صرف ادراک اسما اشیا ہی کا نتیجہ ہے کہ ہم ایک ملاء اعلیٰ کی تشکیل کرتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہماری تحسی حیات وجود پاتی ہے۔ اسے دو وجہ سے بلند قرار دیا جاتا ہے' ایک تو یہ کہ یہ ایک علامتی طریقہ اظہار ہے دوسرے یہ کہ انسانی سر کے مقام کی وجہ سے جو جسم کا بلند ترین مقام ہے' اور ہر انسان یہ جانتا ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں سے فکر اور تخیل اپنا وجود حاصل کرتے ہیں' تمام اندازے بھی اسی مقام سے تشکیل پا کر ظاہر ہوتے ہیں (اور بعض اوقات یہ عمل خاصا

تکلیف دہ بھی ہوتا ہے)۔ خوف کی' احساس کی دونوں صورتیں' یعنی خوف کا احتمال اور اس سے آزادی اسی مقام پر جنم لیتی ہیں۔ مذہبی فکر' تمام فلسفہ' تمام عالمانہ اور سائنسی افکار خواہ ان کا تعلق موخر عہد سے ہو' اسی مقام پر پیدا ہوتے ہیں۔

پہلے نام ہمارے خیال میں ایک علیحدہ اور انفرادی عنصر کی حیثیت کے حامل ہیں جو عام لفظی یا اشاراتی زبانوں کا ذخیرہ ہے' اس سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ ہم اس لسانی نظام پر کوئی حرف گیری نہیں کر سکتے' کیونکہ دیگر تمام وسائل اظہار اسی لفظی زبان کے ماتحت ہیں اور ان کی ترقی کا دارومدار اسی پر ہے - نام کے تعین ابلاغ اور روحانی اثرات سے آنکھ کی برتری کے متعلق یقین کر لیا گیا' یعنی اس کی دوسرے حواس پر فوقیت تسلیم کر لی گئی۔ انسان کی بیداری اور باخبری ایک روشن مقام مان لیا گیا اور اس کا گہرائی کا تجربہ منبع نور کا اشعاع ٹھہرا۔ جہاں تک انعکاس نور میں رکاوٹ کا مسئلہ ہے اس کی رو سے انسان خود ہی ایک مرکزی مقام کا حامل ہے' جو روشنی اور تاریکی کے مابین حائل ہے۔ یہی وہ بدل تھا' جو پہلے نام سے پیدا ہونے والی کیفیت کا منصرم تھا۔ پہلے دیوی دیوتاؤں کا تعلق ان اشیا ہی سے تھا' جن کو روشن مقامات پر محسوس کیا یا سنا جا سکتا تھا' اور ان کے اثرات کا مشاہدہ کیا جا سکتا تھا' مگر انھیں دیکھا نہیں جا سکتا تھا' مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ مجموعہ اسما' ان تمام دیگر اشیا کی طرح جو واقعات عالم کا رخ تبدیل کر سکتے ہیں' بہت تیزی سے اور قوت سے وجود میں آیا ہو گا۔ تمام عالم نور' جس میں کہ ہر شے میں مکانی محل وقوع اور مدت یعنی زبان کے اوصاف موجود ہوتے ہیں ---- جو علت و معلول ' اشیا اور ان کے اوصاف' معروضی اور انفعالی ---- اور بہت جلد انھیں اسما کی فہرست میں شامل کر لیا گیا اور اس طرح یادداشت کے سمندر میں لنگر انداز ہو گئیں' یہی وہ مقام ہے جہاں کسی شے کو ادراک و تفہیم کی غرض سے ذخیرہ کر لیا جاتا ہے اور اسے منطقی اصولوں پر پرکھا جاتا ہے اور پھر علت و معلول کے اصول کے تحت ثابت کیا جاتا ہے۔ الفاظ کی نوعیت کے تمام معاملات ضمائر اور حروف جار (جن کا وجود بہت بعد میں ظاہر ہوتا ہے) کے علتی اور مقامی نوعیت کے بھی' موسومہ وحدتوں سے متعلق معانی ہوتے ہیں۔ اسمائے صفت اور حروف بھی' متخالف حیثیتوں' جوڑے جوڑے پیدا ہوتے رہتے ہیں (جیسا کہ مغربی افریقہ کی آئیوبولی پرویسٹران کی تحقیقات)۔ ایک ہی لفظ کو دھیمے یا اونچے لہجے میں بولا جا سکتا ہے اور اس سے اس کی عظمت یا کمتری کا اظہار مقصود ہوتا ہے یا نزدیک اور دور' یا فعالی اور انفعالی کیفیت کا بیان کیا جا سکتا ہے۔ بعد ازاں اشاراتی زبان کی یہ علامات مکمل طور پر الفاظ کی زبان میں شامل ہو جاتی ہیں جیسا کہ ہم صاف صاف دیکھتے ہیں۔ یونانی اور مصری حروف علت میں اس نوعیت کی علامات موجود ہیں۔ یہ صرف کسی مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر سوچنے کا انداز ہے جس کی وجہ سے متناقض الفاظ کے جوڑے وجود میں آتے ہیں۔ اسی عمل کے نتیجے میں غیر نامیاتی منطق کی بنیاد پڑتی ہے' جو ہر سائنس پر مبنی صداقت کو اختلاف رائے کا شکار بنا دیتی ہے اور اسی کی بدولت جدید تصورات اور قدیم تصورات اور غلط اور صحیح کے منہاج وجود میں آئے۔

دوسرا انقلابی موڑ' زبان کی قواعد کا استعمال تھا۔ اب اسما کی جگہ فقرات نے لے لی۔ افعال کے

معینات کی جگہ' افعال کے متعلقات نے لے لی اور اس کی بدولت انعکاس کی کیفیت کا اظہار ممکن ہوا -- اس سے مراد الفاظ کے ادراک اشیا کے بعد کے روابط سے ہے۔ ایسی اشیا جن کے متعلق الفاظ پہلے سے موجود ہوں ---- جو انسانی شعور بیدار کی فیصلہ کن صفت ٹھہری۔ اس سوال کا جواب بہت مشکل ہے کہ آیا اشیا کے اسما سے قبل بھی فقرات کا وجود تھا یا نہیں' فقرات' کو الفاظ کی منظوری زمانہ حال کا معاملہ ہے اور جدید زبانوں میں ان کا وجود حالات کے تقاضوں کے مطابق وجود میں آیا' مگر اشیا کو نام دینے کے عمل سے بعد اس کی ایجاد ہوئی۔ فقرات بطور تصور رابطہ ذہنی تبدل کا مرہون منت ہیں جو کہ ان کے وجود کے ساتھ ہی عمل میں آتا ہے اور ہمیں یہ فرض کر لینا چاہیے کہ انتہائی ترقی یافتہ بے الفاظ کی زبانوں میں بھی مسلسل استعمال سے یکے بعد دیگرے صفات پیدا ہوتی رہی ہیں اور وہ بھی بتدریج لفظی زبانوں میں تبدیل ہو گئیں اور اس طرح انھوں نے بھی ایک مضبوط تشکیل پا لی اور دور حاضر کی زبانوں کی ہیئت اختیار کر لی لہٰذا ہر زبان کا داخلی ڈھانچہ اس کی پرانی تشکیل یا ساخت پر مبنی ہوتا ہے اور مزید ترقی کے لیے وہ صرف ان الفاظ پر ہی اکتفا نہیں کرتا جو اس کے ذخیرے میں موجود ہیں۔

بلکہ درحقیقت یہ عمل اس کے برعکس ہوتا ہے کیونکہ نحوی تشکیل کے ساتھ انفرادی اسما کا ابتدائی مجموعہ الفاظ کے ایسے نظام میں منتقل ہو گیا' جس کا کردار ان کی ذاتی حیثیت کی بجائے قواعد کی شرائط کے تحت متعین کیا گیا۔ اسما نئی شے کی حیثیت سے وجود میں آئے اور خود مکتفی صورت میں قائم رہے۔ مگر الفاظ کی انواع فقرات کے عناصر کی صورت میں وجود میں آئے۔ لہٰذا شعور بیدار کے اجزا کے طور پر عالم الفاظ میں بننے لگے اور اپنے لیے علامات کے متقاضی ہوئے' جن کی وہ اس وقت تک نمائندگی کرتے رہے جب تک کہ ان کی کوئی متعین ہیئت نہ قائم ہو سکی یعنی وہ فکر کی کارروائی میں بطور لفظ اپنی اہمیت کے حامل رہے۔

بعد ازاں صرف فقرہ ہی فیصلہ کن عنصر رہا۔ ہم اپنی گفتگو فقرات ہی میں کرتے ہیں۔ الفاظ میں نہیں۔ بہت سے لوگوں نے ان دونوں کے تعین کی کوشش کی ہے مگر اس میں کسی کو کامیابی نہیں ہوئی۔ ایف این فنک کے خیال کے مطابق الفاظ کی تشکیل دماغ کی تحلیلی اور فقرات کی تشکیل ترکیبی فعالیت ہے۔ پہلا عمل دوسرے سے قبل واقع ہوتا ہے۔ یہ ایک معلومہ حقیقت ہے کہ ایک ہی امر واقعہ کا تاثر مختلف افراد پر مختلف ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ الفاظ کا تعین مختلف نقطہ ہائے نظر کے تحت کیا جاتا ہے۔ مگر فقرے کی جو بالعموم تعریف کی جاتی ہے وہ یہ ہے "فقرہ خیال کا لفظی اظہار ہے" ایچ پال کے مطابق متکلم کے دماغ میں پیدا ہونے والے مختلف الانواع خیالات کے مربوط اظہار کا وسیلہ ہے۔ میرے خیال میں یہ دونوں تعریفیں فقرے کی نوعیت کے تعین کے لیے ناکافی ہیں۔ حقیقت صرف اسی قدر ہے کہ ہم مقابلتاً" بڑی وحدتوں کو "فقرہ" اور چھوٹی وحدتوں کو "لفظ" کہتے ہیں اور ان پر ہی قواعد کے قوانین کا نفاذ ہوتا ہے مگر جونہی ہم نظریاتی سے عملی استعمال میں داخل ہوتے ہیں تو زبان کسی قانون کی پابندی نہیں کرتی بلکہ نبض کے مطابق چلتی ہے۔ اس میں نسلی کردار شامل ہو جاتا ہے جس میں تقدم اس انداز کو حاصل ہوتا ہے جو ابلاغ کی غرض سے فقرہ سازی کے

لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ فقرات کی ترتیب و تشکیل ہر شخص کی یکساں نہیں ہوتی۔ ٹاسی ٹس اور نپولین کے فقرات یکساں نہیں ہوتے۔ اسی طرح سسرو اور نطشے کے فقرے ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ایک انگریز اپنے کلام کو جرمن اسلوب کلام سے علیحدہ اور الگ انداز میں مرتب کرے گا یعنی دونوں کی ترکیب نحوی الگ الگ ہو گی۔ تصورات اور فکر کی صورت میں نہیں بلکہ انداز فکر' زندگی کی نوعیت اور خون' قدیم' کلاسیکی چینی یا مغربی معاشروں میں تکلم کے انداز کا تعین کرتے ہیں' فقرات کی ہیئت اور لفظ اور فقرے کے میکانکی ربط کی ترتیب کو تشکیل دیے ہیں۔ قواعد اور نحو کے مابین حد بندی کا خط اس مقام پر کھینچا جائے گا جہاں پر کہ کلام کی میکانیت کا اختتام ہوتا ہے اور اس کی نامیاتی کیفیت کا آغاز ہوتا ہے ---- استعمالات' رواج اور اس انداز تکلم کی قیافہ شناسی جو متعلقہ شخص اپنے اظہار و ابلاغ کے متعلق اختیار کرتا ہے دوسری حد بندی اس میکانکی تشکیل پر مقرر کی جاتی ہے جہاں پر کہ لفظ کی میکانکی تشکیل صوتی اظہار کے نامیاتی عناصر میں داخل ہوتا ہے۔ ترک مکانی کر کے آنے والوں کے بچے بھی جب انگریزی حروف "TH" کا تلفظ ادا کرتے ہیں تو پہچانے جاتے ہیں۔ یہ ان کے ارضی اثرات کی روایت کی وجہ سے ہے۔ ان دو مختلف کیفیتوں کے مابین جو بچ جاتا ہے وہی زبان ہے' جسے صحیح معانی میں یہ مرتبہ حاصل ہے جس کا اپنا نظام ہوتا ہے' جو ایک تکنیکی اوزار ہے جسے ایجاد' اصلاح تبدیلی اور خستگی کے مراحل طے کرنے ہوتے ہیں' جو تلفظ اور اظہار کے اصولوں کی پابند ہے لیکن ان سب مراحل کے باوجود اس کا نسل سے تعلق قائم رہتا ہے۔ ہم اسے بن دیکھے پہچان لیتے ہیں جسے ہم جانتے ہوں۔ یہ شناخت اس کے تلفظ پر مبنی ہوتی ہے۔ مزید برآں اگر کوئی غیر ملکی ہماری زبان کس قدر بھی صحیح بولے اسے ہم شناخت کر لیں گے کہ یہ غیر ملکی ہے۔ بعض علاقوں کے باشندوں کی آواز میں کسی قدر تبدیلی آ جاتی ہے' مثلاً" کارولنگی دور کے قدیم جرمن اور آخری رومی دور کے درمیانی سطح مرتفع میں رہنے والے جرمن باشندوں پر علاقائی اثرات موجود ہیں' مگر یہ صرف تکلم کے دوران ظاہر ہوتے ہیں' مگر الفاظ تبدیل نہیں ہوتے اور فقرہ سازی کا عمل بھی تغیر پذیر نہیں ہوتا۔

میں نے اوپر کہا ہے کہ الفاظ ایک فقرے کے اندر مقابلتاً" سب سے چھوٹی وحدت ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ انسان کے علاوہ کوئی اور جنس بھی موجود ہے جو انسان کی طرح سوچنے کے کردار کا مظاہرہ کر سکے۔ یہ صفت صرف انسان ہی سے مخصوص ہے' کیونکہ حبشیوں کے بنتو قبیلے کا کوئی شخص کسی شے کو دیکھتا ہے' تو وہ اسے ادراک کی لاتعداد اشیا کی مدات میں کسی ایک کے ساتھ شناخت کی کوشش کرتا ہے۔ اسی نہج پر اسے ایک لفظ یا تو کسی شے کا مغز محسوس ہوتا ہے یا جڑ یا وہ متعدد حروف جار میں سے اسے کسی یک صوتی رکن کے مطابق سمجھتا ہے۔ اگر وہ کسی کھیت میں کسی عورت سے گفتگو کرے تو اس کے الفاظ کچھ اس طرح ہوں گے۔ "زندہ ایک بڑی' بوڑھی' عورت" اس میں سات "ارکان تہجی" شامل ہیں۔ مگر وہ انھیں صرف ایک ایسے مطلب کی ادائیگی کے لیے استعمال کرتا ہے' جس کے لیے ایک ہی لفظ کافی سمجھا جاتا ہے بعض ایسی زبانیں موجود ہیں' جس کے بعض واحد الفاظ ایک فقرے کے برابر طویل موجود ہیں۔

بتدریج اصواتی اور جسمانی معنی خیز حرکات کا تبدل' فقرے کی ساخت میں ایک فیصلہ کن عنصر ہے مگر

اس کی تکمیل کبھی نہیں ہوئی۔ دنیا میں ایسی کوئی زبان نہیں جس کا اظہار صرف الفاظ پر ہو۔ الفاظ کی ادائیگی کی فعالیت' جونہی زیادہ سے زیادہ درست ہوتی ہے' تو اس میں فکر انگیز الفاظ کا ذخیرہ پیدا ہو جاتا ہے' جن کی بدولت اہم احساسات بیدار ہوتے ہیں۔ ہماری لسانی تربیت نہ صرف ہمیں مختصرات کو سمجھنے اور سادہ خیالات اور ان کے سادہ ملحقات کو سمجھنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے بلکہ اشیائے فکر اور ان کے ملحقات بھی ہمارے فہم کی دسترس میں آ جاتے ہیں۔ الفاظ کے نام رکھ دیئے جاتے ہیں۔ ان کا ان کی معینہ صورت میں استعمال نہیں ہوتا اور سامع کو خود یہ احساس کرنا پڑتا ہے کہ بولنے والا کیا کہہ رہا ہے۔ اسی صورت حال کو گویائی یا تکلم کہا جاتا ہے۔ لہٰذا جدید کلام میں لہجہ اور انداز اس سے زیادہ حصہ ادا کرتے ہیں' جتنا کہ اب تک تسلیم کیا جاتا ہے۔ بعض حیوانات میں بھی مستقل اشارات موجود ہوتے ہیں مگر الفاظ نہیں۔

زبان کی تاریخ میں حتمی فیصلہ کن عنصر اس وقت شامل ہوا جب افعال کی ترجمانی الفاظ سے کی جانے لگی۔ بظاہر تو یہ ایک سادہ سی تجرید معلوم ہوتی ہے' کیونکہ اس میں جن الفاظ کا استعمال ہوتا ہے ان کی حیثیت مستقل ہوتی ہے اور ان کی رو سے اشیا کے مفہوم کو سامنے لایا جاتا ہے اور اس کا کسی روشن مکان میں تعین وقوع ہی ہو گا۔ نیز وہ فکر مابعد میں بھی متعلقہ تصور کو بیدار کر سکے گا جبکہ "افعال" اس نوعیت تبدیلی کا بیان کرتے ہیں جنھیں دیکھا نہیں جا سکتا مگر جنھیں لا مختتم دنیائے نور میں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ البتہ ہر انفرادی معاملے میں اس کے مخصوص اطوار کی تصریح لازمی ہو گی اور اس سے ہی اس کا تصور ابھرے گا۔ پتھر کا گرنا ابتدائی طور پر ایک تاثراتی وحدت ہے' مگر ہمیں حرکت اور شے متحرک کو علیحدہ علیحدہ کرنا ہو گا اور اس طرح ہم "گرنے" کے فعل کو اس کے دیگر تمام پہلوؤں سے الگ ممیز کر لیں گے۔ مثلاً" "ڈوبنا" "لڑکھڑانا" "اٹکنا" "پھسلنا"۔ ان افعال میں امتیاز کو ہم دیکھتے نہیں' بلکہ ہم جانتے ہیں۔ بھاگنے اور دوڑنے' اڑنے اور ہوا کے جھونکے کے ساتھ اڑ جانا' ان سب امتیازات کو تربیت یافتہ ادراک سے محسوس کیا جاتا ہے' ان کا دیکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ مگر افعال کے ترجمان الفاظ کی مدد سے ہم زندگی کا بھی انعکاس کر سکتے ہیں۔ زندگی کے تاثرات کو شعور بیدار میں منعکس کر کے تکوین کے محیط میں شامل کرنا ہی (اشاراتی زبان محض نقالی ہی کی ایک صورت تھی' اس لیے اس پر نہ تو بحث کی جا سکتی ہے اور نہ اسے تحقیق کا موضوع بنایا جا سکتا ہے ۔) زندگی ہے ---- واقعات میں یکسانیت ---- غیر شعوری طور پر ختم ہو جاتی ہے اور باقی جو بچتا ہے وہ علت و معلول کا موضوع بن جاتا ہے ۔ (ہوا کے جھونکے' برق کی چمک' کا شکار کامل) اور اسے وسیع تفصیلات سے بیان کیا جاتا ہے اور اشاراتی نظام میں اسے مناسب مقام دے دیا جاتا ہے۔ خود کو ٹھوس متعین مسند اور مسند الیہ' فاعلی اور انفعالی' موجود' اور تکمیلی صورتوں میں منتقل کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ عالم محسوس اور بے روح حقائق کا پورا پورا عرفان کیا جا سکے۔ مستقل اشیا میں ایک ذہنی شے (تصورات) کو مرئی اشیا کی نقل قرار دیا جا سکتا ہے۔ مگر جہاں تک "فعل" کا تعلق ہے اس میں نامیاتی کی بجائے غیر نامیاتی' اشیا داخل کر دی گئی ہیں۔ یہ حقیقت کہ ہم زندہ ہیں ---- جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس آن کسی شے کا ادراک کر رہے ہیں ---- یہی حقیقت کسی شے مدرکہ کی صفت بن جاتی ہے۔

الفاظ کی فکر کے مطابق اشیائے مدرکہ کو "ہیئت" تسلیم کر لیا جاتا ہے لہٰذا بالآخر فکر کو مختلف مدات میں تقسیم کر لیا جاتا ہے' اور درجہ بندی کر لی جاتی ہے' جس میں اس امر کا خیال رکھا جاتا ہے کہ کونسی شے کس زمرے میں فطری لحاظ سے مطابقت رکھتی ہے۔ لہٰذا "زمان" بطور بعد' قضاوقدر بطور علت اور حیات بطور کیمیائی یا طبیعی میکانیت ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اسی طور پر ریاضیاتی' عدالتی اور عقائد کی فکر کا آغاز ہوتا ہے۔

اس کے بعد ہی وہ افتراق وجود میں آتا ہے' جو انسانی ذات سے کبھی الگ نہیں ہوتا مگر انسان کی زندگی میں سب سے اہم صفت لفظی زبان ہے جو اس کے شعور بیدار میں مخفی ہے۔ یہ وہ ذریعہ ہے جو خودی اور ماسوئ کے مابین ذریعہ ابلاغ ہے۔ اس کے مکمل ہونے کی وجہ سے حیوانی ادراک کے فہم تحسس پر مبنی' الفاظ کے ذریعے غور و فکر' احساس کی نمائندگی کرتا ہے۔ فکر لطیف ---- بال کی کھال کھینچنا' جیسا کہ ایک محاورہ ہے ---- اس سے مراد اپنی ذات سے الفاظ کے ذریعے گفتگو ہے۔ اس انداز کی گفتگو بجز الفاظ ممکن نہیں اور یہی کسی زبان کی تکمیل کی علامت ہے اور بنی نوع انسان کا کمال اور من حیث الکل ایک اجتماعی عادت ہے۔ گفتگو کا ترک خواہ وہ بے لچک ہو یا زوال قوت کی وجہ سے ہو' انسان کے لیے اظہار صداقت ممکن نہیں رہتا۔ اشاروں کی زبان میں (بلااستعمال الفاظ) خود لفظی اظہار کے لیے برے اثرات مرتب کرتا ہے۔ تجریدی فکر میں متناہی ذخیرہ الفاظ استعمال ہوتا ہے اور اس کے ذریعے حیات کے تمام لامتناہی سلسلہ موضوعات پر احاطہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تصورات تکوین کے عمل کو ختم کر دیتے ہیں اور شعور بیدار کے بطلان کا باعث بنتے ہیں۔ مدت گزری جبکہ تاریخ لسان کا موسم بہار تھا' جبکہ ادراک ابھی تک جدوجہد میں مصروف تھا تاکہ وہ تحسس پر غلبہ پا لے۔ یہ میکانیت زندگی کو کوئی اہمیت نہ دیتی تھی مگر اب خود انسان عمل تکوین سے نکل کر باشعور وجود بن چکا ہے اور ہر فکر کی منزل یہ ہے کہ وہ حیات پر قابو پائے۔ ایک دفعہ مگر ہمیشہ کے لیے تعقل کا غلبہ تسلیم کر لیا جائے۔ اس نظریاتی طور پر مدرکہ کو جواز فراہم اور حقیقت کو ہذیان اور باطل قرار دینے کے بعد ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ عملی طور پر اس کا حصول خون کی آواز کو دبا کر خاموش کر دینے سے اور کائناتی اخلاقی اصولوں پر عمل کر کے ہی ہو سکتا ہے -

منطق اور اخلاقیات دونوں حقیقت مطلقہ کے نظام ہیں اور داخلی صداقتیں ہیں۔ یہ عقلیت کے مطابق ہیں مگر تاریخ کے لیے ان کی حیثیت (منطق اور اخلاقیات کی حیثیت) درست نہیں' البتہ فکر کے میدان میں داخلی بصیرت کو ظاہری بصارت پر غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ حقائق کی دنیا میں فلسفیانہ ابدی صداقتوں پر اعتقاد اولیں کھیل ہے جو صرف افراد کے دماغوں میں پرورش پاتا ہے۔ فکر کا کوئی سچا نظام موجود ہی نہیں' کیونکہ حقیقت کو محض اشارات سے بدلا نہیں جا سکتا۔ مخلص اور دیانتدار مفکرین ہمیشہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تمام وقوف اپنے آپ سے مشروط تقدم ہے اور الفاظ کے درست مطالب تک کبھی رسائی حاصل نہیں کر سکتا---- دوبارہ پھر تکنیک کے استثنا کا ذکر کیا جاتا ہے جس میں کہ تصورات محض ذریعہ ہیں' مگر فی نفسہ مقاصد نہیں ---- اور یہ نادان ہر حکیم کے وجدان سے مطابقت رکھتا ہے۔ تجریدی اصول صرف منائع بدائع

ہی میں قابل قبول ہوتے ہیں ۔ فرسودہ پامال مقولے جو روز مرہ مستعمل ہوتے ہیں' ان کے زیر' زندگی رواں دواں رہتی ہے کیونکہ یہ بالائی سطح پر ہی بہتے ہیں بالآخر نسل زبان کے مقابلے میں مضبوط ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر بڑے نام کے نیچے سرگرم عمل رہتی ہے ---- یہ شخصیتیں تسلیم کی جاتی ہیں ---- مگر نظام نہیں ---- جو کہ تغیرپذیر ہوتی ہیں ..... اور حیات کو متاثر کرتی ہیں۔

(٦)

اب تک جو بحث ہوئی ہے اس کے نتیجے میں تاریخ لسان' داخلی طور پر تین مدارج پیش کرتی ہے' اول ایک ترقی یافتہ مگر بغیر الفاظ کے اظہار کا وسیلہ ---- اشیا کے نام جو ادراک کی ایک جدید صورت کی حیثیت سے وجود میں آئے۔ کائنات بطور ایک راز بیدار ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی مذہبی فکر کا آغاز ہوا ۔ دوسری سطح پر ایک مکمل زبان کا بتدریج فروغ ہوا جو اقدار قواعد (صرف و نحو) کے تحت منضبط ہوئی اور فقرات کی ساخت کے لیے اسما کو الفاظ کی حیثیت ملی۔ بعد ازاں فقرات ہی افہام کا بہترین ذریعہ قرار پائے اور تحسس کے مقابلے میں کامیاب ہوئے اور تجریدی اظہار کا وسیلہ ثابت ہوئے۔ اہم لطیف احساسات کے بڑھتے ہوئے شعور نے فقرے کے اندر سیل رواں کو مہمیز دی اور تجریدی فکر وجود میں آگیا جو مستقل افعال وجودی اور افعال مطلق کی صورت میں "افعال زمان" اور "افعال مکان" کی صورت میں منقسم ہو گئے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں صرف و نحو نے عروج پایا (اگرچہ بے شمار شرائط کے تحت) یہ دور کوئی دو ہزار سال قائم رہا تاوقتیکہ بابل اور مصر کی تہذیبیں اپنی بہار دکھانے لگیں۔ اس کے بعد کا دور امالات اور زیروبم کا دور ہے اور قواعد کے اصول تحلیل و ترکیب کی نذر ہونے لگے۔ انسان کی عقل پسندی اور شعوربیدار کی کرشمہ سازی ایسے مقام پر پہنچ گئی کہ اب حسی سہاروں کے امالات کی ضرورت نہ رہی اور قدیم لفظی ہیئت کو ترک کیا جانے لگا اور محاورے اور روزمرہ کی بنیاد پر ابلاغ و اظہار کو سہل بنا دیا گیا۔ انسانی کلام کو یقین کی تائید حاصل ہو گئی (حروف' الفاظ کی ترتیب اور توازن اور روانی) الفاظ کے وسیلے سے اظہار نے شعور بیدار پر برتری حاصل کر لی اور آج وہ اس مقام پر ہے کہ لفظی میکا نکیت کے شعور سے آزادی حاصل کر لے' اور عقلیت نئے میکانیات کی طرف رجوع کرے' نفسی کیفیت بجائے احساس' روابط استوار کرے۔

تیسرے درجے میں لسانی تاریخ جو کہ اپنی صورت حیاتیاتی منصوبہ بندی سے حاصل کرتی ہے اور اس وجہ سے بنی نوع انسان کے ساتھ بطور تمثال موجود رہتی ہے۔ لہٰذا اعلیٰ ثقافتوں کی تاریخ ایک نئے کلام کی صورت میں دخل اندازی کرتی ہے۔ یہ گفتگو فاصلاتی ہوتی ہے' یعنی ---- تحریر ---- یہ ایک ایسی ایجاد ہے جس کا سرا داخلی قوتوں پر ہے اور یہ عمل خود زبان کی منازل پر گہرے اثرات مترتب کرتا ہے۔

مصری تحریری زبان ۳۰۰۰ ق م میں ہی قواعد کے بوجھ تلے سڑنے لگی تھی اور اسی طرح سومیری' علمی زبان کو بھی زنانہ زبان کا خطاب مل چکا تھا۔ چینی تحریری زبان جو چینی عوامی زبانوں کے مقابلے میں مدت

سے مختلف لسانی حیثیت اختیار کر چکی ہے ---- اس کے قدیم ترین متون بھی اتنے جامد ہو چکے ہیں کہ جدید تحقیق سے یہ ثابت ہوا ہے کہ اس میں تعریف کا کبھی وجود نہیں ہوا ۔ ہندوستان کا قدیم گرائمر کا نظام تو ہمیں جس حالت میں ملا وہ پہلے ہی خستگی کا شکار ہو چکا تھا۔ قدیم ویدوں کے دور میں (۱۵۰۰ ق م) اور کلاسیکی زبان اس کے ایک ہزار سال بعد صرف اجزا کی صورت میں قائم تھی۔ مگر انحطاط پذیر مرکزی یونانی زبان جو انفعالیت کا شکار تھی' اس عہد میں بالکل غائب ہو گئی۔ مغربی زبانیں' اگرچہ وہ بہت حد تک متفرقات میں شامل ہیں ---- جرمانوی انتہائی قدیم ترین اور رومانوی بہت زیادہ تہذیب یافتہ ذخائر ہیں ---- اسی سمت میں ترمیم پذیر ہیں۔ رومانوی زبانیں صرف ایک صورت اختیار کر چکی ہیں اور انگریزی اصلاح کلیسا کی تحریک کے بعد صفر ہو کر رہ گئی ہے۔ جرمن زبان نے بلاشبہ انیسویں صدی کے آغاز میں اضافی حیثیت سے نجات حاصل کی اور اب وہ انفعالی حالت سے نجات حاصل کرنے میں مصروف ہے۔ ٹے سی ٹس نے صرف موم سن نثر کے ایک مشکل ٹکڑے کو ترجمہ کرنے کے بعد کہا کہ کسی قدیم زبان میں "مراجعت" کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے حرفی لاحقات ہیں کس قدر سرمایہ دار ہے جس سے انسان کو احساس ہوتا ہے کہ علامات کا ہنر کس طرح مکر کی تکنیک میں منتقل ہو گیا ہے جو اب صرف علامات ہی کو استعمال کرتا ہے ---- اگرچہ یہ صورت مختصر ہے مگر معانی سے بھرپور ہے ---- جس طرح کہ کھیل میں ایک غیر جانبدار صرف آغاز کی ٹھوکر لگا دیتا ہے' بعد ازاں ہر شخص اپنے کام میں مصروف ہو جاتا ہے اور تمام شریک افراد سمجھنے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی یورپ کے باشندوں کے لیے چینیوں کے مقدس متون صحیح معانی میں ایک متروک کتاب ہیں' لیکن ایسے اصول کا تمام قدیم ثقافتوں کی زبان پر بھی اطلاق ہوتا ہے ---- یونانی' سنسکرت (آتما اور برہمن) ان ثقافتوں کی لفظی زبان کی اب صورت یہ ہے کہ ان ثقافتوں کے باشندے بھی انھیں سمجھ سکتے ہیں۔

جہاں تک تاریخ کے خارجی پہلو کا تعلق ہے اس کی افادیت صرف اسی قدر ہے کہ اس کا بہت سا حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ اس کا عروج قدیم دور میں گہرا دفن ہے۔ اس میں (جیسا کہ قبل ازیں بھی با تکرار کہا جا چکا ہے) وہ ہمارے تخیل کی پیداوار ہے جس کے مطابق ہم نے انسان کو چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم کر کے دنیا کے مختلف مقامات پر پھیلا دیا ہے۔

ایک روحانی تبدیلی اس وقت وجود میں آئی جب باہمی روابط بطور عادت مروج ہوئے (اور بعد میں فطرت ثانیہ بن گئے) مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ روابط گفتگو ہی کے باعث وجود میں آئے اور پھر باقاعدہ صورت اختیار کر گئے اور انسانوں سے بھرپور کرہ ارض پر تاثر یہ تھا کہ لفظی زبان کا رواج پہلے ہوا اور بعد میں زبانوں کی توسیع اور ان کے بولنے والے افراد کی تعداد میں بہت زیادہ اضافے کی بنا پر قواعد کا رواج ہوا۔

اس کے بعد کوئی نیا نظام قواعد وجود میں نہیں آیا' بلکہ موجود ذخیرے ہی میں سے بعض جدید مشتقات حاصل کیے گئے۔ یہ مشتقات جن قدیم زبانوں اور ذرائع سے حاصل کیے گئے ہم ان کے متعلق کچھ بھی

نہیں جانتے۔ ہم جہاں تک ماضی میں دیکھ سکتے ہیں' ہمیں صرف مکمل اور ترقی یافتہ لسانی نظام ہی نظر آتے ہیں' جنھیں ہر شخص استعمال کرتا تھا۔ بچوں کو پڑھایا جا سکتا تھا اور یہ نظام بالکل فطری نظر آتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ تصور بہت مشکل ہے کہ کوئی ایسا بھی دور تھا' جس میں کیفیت موجودہ دور سے بہت مختلف تھی یعنی کوئی ایسا لسانی نظام موجود تھا جسے سنتے ہی ہم کانپنے لگیں۔ وہ کیا معماتی زبان ہو گی جس کی بدولت قدیم دور میں حروف تہجی کی ایجاد ہوئی' اور ابھی تک باعث استعجاب و حیرت ہے پھر بھی ہمیں اس امکان کو تسلیم کرنا ہو گا کہ دنیا میں ضرور ایک ایسا دور ہو گزرا ہے جس میں الفاظ کی زبان کا کوئی وجود نہ تھا اور جب لفظی ذریعہ ابلاغ ایجاد ہوا' تو اسے معاشرے کے معزز طبقات کا استحقاق سمجھا گیا اور معاشرے کے بعض طبقات نے اسے ایسا راز بنا لیا جس کی وہ سختی سے حفاظت کرتے تھے۔ اس کی تائید میں ہزار ہا مثالیں موجود ہیں ۔ سفارت کار فرانسیسی زبان کے علم اور علمائے کرام اپنے انگریزی زبان کے علم کے ساتھ' بلکہ ہر جدید زبان کے دانش ور اپنی زباندانی پر نازاں تھے۔ ہم اجنبی کے متعلق گفتگو کر سکتے ہیں مگر یہی رائے مختلف قدیم زبانوں کے متعلق ان کی ابتدا میں دی جا سکتی تھی۔ تمام اسما ان اشیا سے وابستہ ہیں' جن کو وہ ظاہر کرتے ہیں اور ان کی تاریخ میں ان کے حصہ دار ہیں۔ یونانی زبان میں تمام دھاتوں کے نام غیر ملکی ہیں۔ بعض الفاظ سامی الاصل ہیں' ہندی ہند سے حتی متون میں موجود ہیں' جن کو بوغا کیسول کہا جاتا تھا اور جس سیاق و سباق میں ان کا بیان کیا گیا ہے وہ اس تکنیکی اظہار سے متعلق ہے' جو گھوڑوں کی نسل کشی سے متعلق ہے۔ لاطینی انتظامی اصطلاحات نے مشرقی یونان پر قبضہ کر لیا اور جرمن اصطلاحات روسی میں بڑی تعداد میں داخل ہو گئیں۔ عربی الفاظ نے یورپی ریاضی پر غلبہ حاصل کر لیا' کیمیا اور فلکیات کی اصطلاحات بھی عربی ہی سے لی گئیں۔

نارمنون نے جرمن زبان کو انگریزی سے بھر دیا اور فرانسیسی کے بھی بہت سے الفاظ داخل کر دیئے۔ جرمن بولنے والے ممالک میں بینک کاری کی تمام اصطلاحات اطالوی ہیں اور بالکل اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ تعداد میں زراعت' گلہ بانی' دھاتوں اور اسلحہ اور بالعموم تبادلہ اشیا کی تمام اصطلاحات دستکاری کی اشیا کے تبادلے اور بین القبائلی تجارت کے قوانین ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوئے ہوں گے کیونکہ جغرافیائی اسم بندی میں غالب فریق کے الفاظ ہی مغلوب اقوام میں منتقل ہوتے ہیں اسی لیے یونان میں متعدد مقامات کے نام جرمن اور سیلٹی ہیں۔ یہ کہنے میں کوئی مبالغہ آمیزی نہیں کہ متعدد خطوں میں ہند جرمانی زبانوں کے الفاظ موجود ہیں ۔ جب تک کوئی لفظ نیا نیا منتقل ہوتا ہے تو اسے اجنبی کہا جاتا ہے۔ بہت سے قدیم الفاظ بھی بعض لوگوں نے نجی طور پر ذخیرہ کر رکھے ہیں۔ لاطینی اور یونانی میں بعض الفاظ مشترک ہیں۔ کیا ٹیلیفون' گیس' آٹوموبائل' قدیم زبانوں کے الفاظ ہیں؟ اگر ہم بحث کی غرض سے یہ تسلیم کر لیں کہ تین چوتھائی آریائی الفاظ مصری اور بابلی زبانوں سے منتقل ہوئے اور یہ عمل تین ہزار سال قبل مسیح ہوا' مگر اس کے ایک ہزار سال بعد سنسکرت کی غیر مرقومہ زبان میں ان کا نشان تک نہیں ملتا بلکہ جرمنی زبان میں بھی ہزاروں لاطینی الفاظ مدتوں سے اپنی شناخت کھو چکے ہیں۔ اب ہنرائٹ (Henriette) کا لفظ لیں اس کا لاحقہ TE ائڈ سکی سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح کس قدر سامی اور آریائی الفاظ ہوں گے جن کو دور حاضر میں اجنبی نہیں

سمجھا جاتا۔ اب اس مشابہت کی کیا وضاحت ہے جو قدیم آسٹریلوی اور جدید زبانوں کے بعض الفاظ میں پائی جاتی ہے؟

ہند جرمانی نظام یقینی طور پر سب سے کم عمر ہے اور اس بہت زیادہ عقلیت پر مبنی ہے۔ ان سے حاسل کردہ زبانیں آج دنیا پر حکومت کر رہی ہیں۔ مگر کیا یہ آج سے دو ہزار سال قبل جو صرف و نحو وجود میں آئی اس وقت بھی یہ زبانیں موجود تھیں؟ جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ موجودہ دور میں واحد ابتدائی ہیئت آریاؤں' سامیوں' اور تمیطیوں میں ہونے کا امکان تھا۔ قدیم ترین ہندوستانی متن میں غالباً ۱۲۰۰ ق م کے عہد کی زبان محفوظ ہے اور قدیم ترین یونانی ۷۰۰ ق م تک کے عہد کی محفوظ ہے۔ مگر ہندوستان کے مذہبی رہنماؤں اور دیوتاؤں کے نام شام اور فلسطین کی زبانوں میں گھوڑوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مدت بعد یہی لوگ مہم جو اور طاقت ور حکمرانوں کی صورت میں مختلف مقامات پر منتقل ہوتے رہے۔ اس بات کا امکان ہے کہ ۱۶۰۰ ق م کے قریب یہ بری وا کنگ' یہ پہلے مہم جو' جو زندگی بھر گھوڑوں سے علیحدہ نہیں ہوئے' جو خوفناک تندوری لشکروں میں شامل تھے انھوں نے تقریباً" تمام شمالی میدانوں پر قبضہ کر لیا ہو اور اپنے ساتھ ہندوستان کی روایات' زبان اور مذہبی عقائد کو لے گئے ہوں' اور اس طرح ہندوستانی جاگیردارانہ نظام بھی منتقل کر لیا ہو۔ نسل کے متعلق جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے اس کی روشنی میں یہ واقعہ آریائی نسلوں کے متعلق وضاحت کرتا ہے' جن کی زبانیں بھی ان کے ہمراہ منتقل ہوئیں' لیکن ان کی اس نقل مکانی کی ضرورت کے متعلق کچھ روشنی نہیں پڑتی اسی طرح ملیسوں نے بھی مشرق میں اپنی ریاستیں قائم کیں اور بالکل اسی انداز میں جس طرح کہ مائیلانی اسمانے اڑھائی ہزار سال قبل یہی عمل کیا تھا۔

کیا یہ لسانی نظام جو ۳۰۰۰ ق م میں مروج تھا' محض ایک غیر اہم بولیوں کا مجموعہ تھا اور اسی لیے ضائع ہو گیا؟ رومانی زبانوں کا خاندان جو ۱۶۰۰ ء میں دنیا کے تمام سمندروں پر حکمران تھا' اس نظام کی ابتدا ۴۰۰ ق م میں جس زبان سے ہوئی اس کا دائرہ کار صرف ایک ہزار مربع میل سے کس قدر زائد تھا۔ یہ یقینی امر ہے کہ ۴۰۰۰ سال قبل ان زبانوں کا خاندان جن کے پاس قواعد' یا گرائمر موجود تھی بہت زیادہ تغیر پذیر تھا۔ سامی تمیطی آریائی گروہ (اگر کسی دور میں ان سب نے مل کر کسی وحدت کی صورت اختیار کی) اس عہد میں زیادہ اہمیت کا حامل نہ تھا۔ ہم قدیم لسانی خاندانوں کی تاریخ کے آثار ہر موڑ پر ہم لڑکھڑا جاتے ہیں۔ ایٹروسکی' باسق' سومیری' اور لائی غوری' اور ایشیائے کوچک کی قدیم زبانیں اور دیگران ——— اپنے اپنے عہد میں مضبوط لسانی نظام رکھتے ہوں گے۔ باغازکوئی کے آثار میں آٹھ نئی زبانوں کی شناخت کر لی گئی ہے جو آج سے ہزار سال قبل تمام کی تمام مروج تھیں۔ جدت کی رفتار کے ساتھ ایک ہزار قبل آریاؤں نے ان تمام کو ایک وحدت میں پرو دیا ہے اور اب ہم ان سے آشنائی کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔

(۷)

تحریر بالکل ایک نئی نوعیت کی زبان ہے جس میں انسان کے شعور بیدار کے ساتھ روابط میں مکمل تبدیلی کا عمل مضمر ہے گویا اس کی وجہ سے کسی زبان میں گفتگو کا عمل محض زمانہ حال تک محدود نہیں رہتا اور تحریر اسے طویل بلکہ لامتناہی عمر عطا کر دیتی ہے۔ خط تصویری مقابلتاً" زیادہ قدیم ہے۔ وہ کسی بھی لفظی صورت سے قدیم ہے۔ مگر ہمارے نزدیک تصویر حروف کی جگہ نہیں لے سکتی۔ یہ بعض مرئی اشیا کا عکس تو ہو سکتی ہے اور اسی طرح اسے لفظ کی ابتدائی علامت بھی کہا جا سکتا ہے جو کہ اشیا کی تجرید ہے۔ بہرحال یہ زبان کا پہلا نمونہ ہے جس کے ادراک کے لیے مناسب تربیت کی ضرورت ہے۔

رسم الخط ایک ترقی یافتہ قواعد کے بغیر نہیں چل سکتا۔ کیونکہ تحریر کی فعالیت لامتناہی لحاظ ہی سے بولنے اور سننے کے عمل سے زیادہ تجریدی ہے۔ پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کسی تحریر کے تصورات کی اہمیت کو پہچان کر اس کی متوازی لفظی آواز سے مطابقت پیدا کریں۔ مسودے میں اشیا کی علامات نہیں ہوتیں بلکہ علامات کی علامات ہوتی ہیں۔ گرائمر پر دسترس علامت شناسی میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

الفاظ ہر شخص کی دسترس میں ہوتے ہیں مگر تحریر صرف ارباب ثقافت ہی کا حصہ ہے۔ لفظی زبان کے برخلاف یہ نہ صرف جزوی طور پر بلکہ کلی طور پر تاریخ عالم کے سیاسی اور مذہبی قضاوقدر سے مشروط ہے ہر رسم الخط کسی مخصوص ثقافت میں وجود میں آتا ہے اور وہ متعلقہ ثقافت کی اہم ترین ثقافت شمار ہوتی ہے مگر ابھی تک رسوم الخطوط کی مکمل تاریخ نہیں لکھی گئی اور اس کی نفسیات کی انواع بینات اور ان میں ترمیمات پر کوئی کام نہیں ہوا۔ تحریر ایک بہت بڑا علامتی نظام ہے۔ اس سے نہ صرف فاصلاتی توسیع پیدا ہوتی ہے بلکہ سب سے بڑھ کر مدت اور مستقبل کے لیے اس کا استدام بھی یقینی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ بولنا اور سن لینا تو ایک مخصوص مقام اور حال مطلق تک محدود ہیں ۔ مگر تحریر ایسے افراد کو مخاطب کرتی ہے جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا۔ ممکن ہے کہ بوقت تحریر وہ پیدا بھی نہ ہوئے ہوں۔ لکھنے والے کی زبان اس کی موت کے صدیوں بعد بھی سنی جا سکتی ہے۔ یہ تاریخ جبلی صلاحیت کی اہم ترین عطا ہے لیکن صرف اسی سبب کی وجہ سے کسی شے کو تحریر سے زیادہ ثقافتی علامت نہیں سمجھا جاتا۔ اگر ہم کسی شے کے متعلق اتنا ہی کم جانتے ہوں' جتنا کہ ہند۔ جرمانی زبانوں کے متعلق کم جانتے ہیں ---- ہندوستانی اور کلاسیکی ---- تو وہ اپنے مزاج کے لحاظ سے اس قدر تاریخ ساز تھے کہ انھوں نے نہ تو اپنا رسم الخط ایجاد کیا۔ مگر انھوں نے اجنبی رسوم الخط کے ساتھ بھی پرخاش قائم رکھی' یہاں تک کہ ان کی تہذیبی زندگی کا انجام قریب آگیا' فی الواقع کلاسیکی دور کا تمام نثری ادب سماعی مقاصد کے لیے تخلیق کیا گیا۔ ایک شخص اسے اس انداز میں پڑھتا گویا کہ وہ باتیں کر رہا ہو جبکہ ہم لوگ تو گفتگو بھی اس انداز میں کرتے ہیں گویا کہ پڑھ رہے ہیں ۔ اس کا نتیجہ ایک مسلسل جھولے کی صورت میں تحریری ہیئت اور لفظی آواز میں نکلتا ہے اور ہم ابھی تک ایسا نثری اسلوب تخلیق نہیں کر سکے' جو ایتھنز کا مقابلہ کر سکے۔ عربی ثقافت میں اس کے بخلاف ہر مذہب نے اپنا

اپنا رسم الخط ایجاد کیا اور لفظی زبان میں متعدد تبدیلیوں کے باوجود' رسم الخط میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ مقدس کتب' تعلیمات' اور دیگر رسوم الخط بطور میعادی علامت کے باہم قائم رہے۔ حروف تہجی کا قدیم ترین نمونہ جنوبی عرب میں منائین اور سبائیوں کے ہاں ملتا ہے۔ ہر قوم کا اپنا اپنا مختلف رسم الخط ہے ---- جو غالباً" دسویں صدی قبل مسیح تک پہنچتا ہے۔ اسلام نے اپنا رسم الخط اپنے معتقدین کے ذریعے تمام دنیا میں پھیلا دیا' اس امر کے قطع نظر کہ مختلف خطوں میں واقع مسلمانوں کی اپنی زبان کیا تھی۔ سامی' منگولین' آریائی' اور نیگرو تمام زبانیں بولنے والے حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ تحریر کی عادت ہر جگہ تحریری اور زبانی انداز زبان میں فرق پیدا کر دیتی ہے۔ تحریر زبان علاماتی نظام سے متعلق ہے اور اپنے ساتھ قواعدی تشریط کا استدام لاتی ہے۔ یہ صرف کسی حد تک اور پس و پیش کے ساتھ عوامی استعمال کی زبان کی ترمیمات قبول کرتی ہے۔ یونانی زبان ایک نہیں بلکہ دو تھیں اور شاہی دور کے روم کی لاطینی زبان کے تحریری اور بول چال کے محاورے میں بہت زیادہ فرق تھا ۔ کوئی تہذیب جتنی پرانی ہوتی جاتی ہے اسی قدر اس میں یہ امتیاز بڑھتا جاتا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ یہ فاصلہ بہت بڑھ جاتا ہے' جیسا کہ چینی تحریری زبان اور کو ان ہوآ (جو شمالی چین میں پڑھے لکھے لوگوں کی زبان ہے) میں نظر آتا ہے۔ ثانی الذکر محض عوامی زبان نہیں بلکہ ایک علیحدہ اور اجنبی زبان کی صورت اختیار کر گئی ہے۔

اس سلسلے میں یہ مشاہدہ ضروری ہے کہ ہم کھل کر اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ تحریر کا ملکہ ہر شے سے بڑھ کر معاشرتی مقام کا نشان ہے اور بالخصوص دور قدیم میں یہ مذہبی رہنماؤں کا خصوصی فن تھا۔ کسان طبقے کی کوئی تاریخ نہیں' اس لیے وہ فن تحریر سے بھی محروم رہے ہیں' اور ان کا کوئی رسم الخط بھی نہیں۔ میرے خیال میں یہ حقیقت بہت اہم ہے اس امر کے قطع نظر' نسل کو تحریر سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ فن نقاشی کو جس قدر زیادہ اہمیت حاصل ہو گی۔ اس قدر زیادہ کاتب کو نسل (خاندانی وجاہت) کا خیال ہو گا۔ اس کا انداز اسی قدر زیادہ سپاہیانہ ہو گا اور وہ حروف کے بناؤ سنگھار پر اتنی ہی زیادہ توجہ دے گا اور وہ ہر وقت اسے اپنی خطوط کشی سے تبدیل کرنے پر آمادہ نظر آئے گا۔ صرف وہی لوگ جو امتناعات سے متعلق ہیں' غیر شعوری طور پر حروف کو بالتکرار لکھتے رہے ہیں۔ یہ عملی انسان کا امتیاز ہے جو تاریخ سازی کرتا ہے اور ایک عالم کے مابین' جو صرف اپنے علم کو کاغذ پر اتار کر لافانی بنا دیتا ہے' ہر ثقافت میں تحریر صرف پجاریوں کی ملکیت رہی ہے۔ شاعر اور علما بھی اسی زمرے میں شمار ہوتے ہیں۔ طبقہ شرفا تحریر کو دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے پاس ایسے افراد ہوتے ہیں جو اسے لکھ کر دے سکتے ہیں۔ ماضی بعید سے ایک ایسا طبقہ موجود رہا ہے جو اس مسئلے میں دانشورانہ نیابت کا کردار ادا کرتا رہا ہے۔ بے شمار صداقتیں اور حقیقتیں زبانی کلام کے ذریعے نہیں بلکہ تحریر کی بنا پر محفوظ رہی ہیں۔ قلعے اور عبادت گاہ میں مخالفت کا ایک روپ یہ بھی ہے جو حقیقت اور عمل کے مابین جاری رہتی ہے۔ آثار قدیمہ اور منادید حقائق کو محفوظ رکھتے ہیں' مگر مقدس تحریریں صداقتوں کی امین ہیں۔ قدیم دستاویزات اور تاریخی وثائق جو مطلب ادا کرتے ہیں' کتب خانے ان کی تائید کرتے ہیں۔ لہذا مسکی فن تعمیر کے علاوہ مزید بھی ایسے آثار ہیں جن کی آرائش تو نہیں کی جاتی مگر وہ فی نفسہ مجسم آرائش ہیں ---- کتاب ---- تمام ثقافتوں کے فنی عروج کی

تاریخ فن تحریر ہی کی مرہون منت ہے اور فن تحریر فی نفسہ بھی ایک یادگار ہے۔ اس میں ہی ہم رومی اسلوب کی روح کا نظارہ کر سکتے ہیں' یا مجوسی اسلوب کی اصل شکل و صورت کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ ایسی دوسری کوئی آرائش نہیں جو حروف کی داخلیت یا مسودے کے صفحات کی ہمسری کر سکے۔ عربی آثار کی تصویر قرآن شریف کے علاوہ کہیں اور دستیاب نہیں پھر مختصرات کا عظیم فن' فن تعمیر کی حاشیہ بندی' اور ملبوسات کا ہنر' یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے خط کوفی میں لکھا ہوا قرآنی صفحہ دیکھیں ایسا معلوم ہو گا کہ کوئی مزین پردہ سامنے لٹک رہا ہے۔ رومی دور کا تحریر کردہ بائبل کا نسخہ ایک ایک صفحہ ایک گرجا نظر آئے گا۔ جہاں تک کلاسیکی فن کا تعلق ہے یہ تو بہت اہم ہے کہ وہ شے جس نے اس کے حسن میں کبھی کوئی اضافہ نہیں کیا' وہ اس کا رسم الخط اور لپٹی ہوئی کتاب ہے (Book Roll) ---- یہ یونانیوں کا وہی مزاج ہے' جو ان کی ہر پائیدار سے نفرت پر مبنی ہے۔ ہر اس ہنر اور مہارت سے نفرت جس میں کوئی غیر معمولی ماہرانہ فن کا عنصر موجود ہو۔ نہ یونان میں اور نہ ہی ہندوستان میں ہمیں کوئی یادگار قسم کی تحریر دستیاب ہوئی' جیسا کہ مصر میں پائی جاتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کسی کو اس کا خیال ہی آیا: کہ افلاطون کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک صفحہ ایک یادگار تھا اور سوفاکلیز کی تحریروں کو ایکرو پولس میں محفوظ رکھنا چاہیے تھا۔

جوں جوں شہر' دیہات کو اپنی لپیٹ میں لیتے گئے اور شہری قوت کی بالادستی قائم ہوتی گئی تحریر جو کہ صرف شرفا کی ملکیت' ازلی صداقت اور شہرت کا حصہ تھی' ایک تجارتی کاروبار اور سائنسی گفتگو کا ایک حصہ بن کر رہ گئی۔ ہندوستانی اور کلاسیکی ثقافتوں نے منافقت کو ترک کر دیا اور اس طرح ہر وہ شے جس پر وہ درست طور پر حاوی نہ تھے' باہر سے درآمد کرنی شروع کر دی۔ یہ روز مرہ استعمال کی ضروریات کی مجبوری تھی کہ حروف تہجی نے اپنا مقام پیدا کر لیا۔ اس واقعے کی اہمیت کیا ہے؟ اسے دیکھنے کے لیے دیگر ہمعصر ثقافتوں سے موازنہ کرنا ہو گا۔ چین میں ۸۰۰ ق م میں صوتی حروف کو مروج کیا گیا اور پندرھویں صدی میں مغرب میں ایک کتاب طبع ہوئی۔ اس سے تحریر کی سخت آہستہ رو ترقی اور طویل مدت کا پتہ چلتا ہے جس کے گزرنے کے بعد تحریری مواد عوام تک پہنچ سکا۔ بالآخر تہذیب نے اپنا آخری قدم اٹھایا اور تحریری عمل کو عام استعمال میں دے دیا۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے' مصر میں عمل تحریر ۲۰۰۰ ق م میں مروج ہو گیا تھا اور یہ ایک مخصوص ماہرانہ فن کی ایجاد تھی' بالکل اسی طرح ۲۲۰ ق م میں چین کی آگسٹس میں لائی سائی نے فن تحریر متعارف کرایا اور بالآخر یورپی ممالک میں بھی ---- یہ حقیقت بہت ہی محدود حد تک تسلیم کی گئی ہے ---- ایک جدید قسم کی تحریر کا عمل وجود میں آ گیا ہے۔ مصری حروف تہجی کی ایجاد کو قطعاً حتمی صورت حاصل نہیں ہوتی جبکہ دور حاضر میں سٹینو گرافی (مختصر نویسی) ایجاد ہو چکی ہے۔ جس سے مراد صرف مختصر نویسی ہی نہیں بلکہ اس کی حروف تہجی کے فن تحریر سے بھی آگے بڑھ کر ایک جدید تجریدی' فن ابلاغ کو مروج کرنا ہے۔ یہ ناممکن نہیں ہے کہ آئندہ صدیوں کے دوران کوئی مختصر نویسی کی شکل کا رسم الخط حروف کو بالکل خارج کر دے۔

(۸)

کیا اس لحاظ سے زبانوں کی ثقافت کی تبدیلی ہیئت کا جائزہ لینا ہو گا؟ یقیناً" ایسا کرنا ہو گا' کیونکہ سائنس نے ابھی تک یہ ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ ایسا عمل ضروری ہے۔ ثقافتی زبانوں کا تعلق بنی نوع انسان کے اس حصے سے ہے' جس کی اپنی تاریخ ہے۔ ان کی قضاوقدر نہ صرف زمان کے حیاتیاتی مکان سے وابستہ ہے بلکہ حیات کے محدود ارتقا کے ساتھ ہم قدم ہو کر چلتی ہیں۔ ثقافتی زبانیں تاریخی زبانیں ہیں' جس کا بنیادی مطلب یہ ہے کہ ایسا کوئی تاریخی واقعہ نہیں اور ایسا کوئی سیاسی ادارہ نہیں جو اپنے عہد کی مروجہ زبان سے متاثر نہ ہوا ہو' اور اسی طرح تاریخی واقعات اور سیاسی ادارے بھی زبان کو متاثر کرتے ہیں۔ اور اس طرح زبان کی روحانی ہیئت بھی متاثر ہوتی ہے۔ رومی جنگوں کے اثرات سے فقرات کی ساخت بھی متاثر ہوئی اور قوم کی انتظامیہ کو انصرامی فکر کے رجحان کا احساس ہوا۔ جرمن نثر میں آج بھی تیس سالہ جنگ کے اثرات موجود ہیں۔ اس میں قدیم عیسائیت کے عقائد کی پابندی کی طرف توجہ کرنے کا احساس پایا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم یونانی عہد نامے کی بجائے انھیں کوئی نیا صحیفہ مل گیا ہو' جو قدیم شاہی صحائف سے ملتا جلتا ہے' مگر دوسری صورت میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ عالمی تاریخ کا انحصار ---- جس کے متعلق طلبائے تاریخ نے ابھی تک کم توجہ دی ہے ---- رسم الخط پر ہے' جو لازماً" ابلاغ کے تاریخی پس منظر کا امین ہے۔ ریاست (لفظ کے اعلیٰ مفہوم کے مطابق) اپنے ابلاغ و اظہار کے لیے تحریر کو لازمی قرار دے لیتی ہے۔ سیاست کا تعین تو قطعی لحاظ سے اس اہمیت کے پیش نظر ہوتا ہے کہ قوم کی فکر ہر معاملے میں آثار قدیمہ اور منشور کا سہارا لیتی ہے اور دستخطوں سے ضمانت حاصل کی جاتی ہے۔ عوامی نمائندگی اور قبول عوام کا بھی یہی ذریعہ ہے۔ قانون سازی کی جنگ جو تحریری قانون کی تائید اور تردید کے لیے جاری رہتی ہے۔ دستور قانون کی جگہ لے لیتا ہے۔ پیرابندی' تحریر میں زور پیدا کرتی ہے۔ تقریر کا تعلق صرف زمانہ حال سے ہے اور تحریر کو استدام حاصل ہے اور اس کے ساتھ عملی تجربہ اور نظریاتی فکر شامل ہوتی ہے۔ دور متاخر کی زیادہ تر داخلی تاریخ میں یہ اختلاف تلاش کیا جا سکتا ہے۔ مختلف فیہ واقعات ہمیشہ متاخرین کے خلاف رہتے ہیں جبکہ حقیقت ان کی طلب کرتی ہے۔ ---- یہ دنیا کی عالمی تاریخ میں فریقین کا اختلاف کسی نہ کسی صورت میں تمام ثقافتوں کے بحرانی دور میں موجود رہتا ہے۔ ایک فریق حقیقت پسند ہوتا ہے جبکہ دوسرا متون کا سہارا لیتا ہے۔ تمام بڑے بڑے انقلاب اپنے متعلق ادب بھی پیدا کرتے ہیں۔

مغربی ثقافت کی زبانوں کا گروہ دسویں صدی عیسوی میں ظہور میں آیا۔ جو زبانیں اس وقت مروج ہیں ---- جرمانوی اور رومانوی بولیوں کا (مونکی لاطینی بھی ان میں شامل ہے) ---- کا رسم الخط' ایک ہی روحانی اثر کے تحت پروان چڑھا' اس لیے یہ ناممکن ہے کہ جرمن' انگریزی' اطالوی اور ہسپانوی کی ترقی میں جو ۹۰۰ء تا ۱۹۰۰ء میں وقوع پذیر ہوئی' مشترکہ طریق موجود نہ ہو اور اسی طرح یونانیوں اور اطالویوں کی تاریخ (جس میں انڈوسکی بھی شامل ہے) ۱۱۰۰ء اور دور سلطنت کے مابین مدت میں یکساں ہو گی' مگر اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ خطہ جس میں نسلوں اور زبانوں کے خاندانوں کا مخصوص اتحاد قائم ہوا' وہ ثقافتی خطے کی حدود کے

لحاظ سے بھی ایک وحدت ہے۔ ۳۰۰ء کے بعد لاطینی اور یونانی میں کون سی ترمیمات مشترکہ طور پر وجود میں آئیں؟ ---- تلفظ اور محاورے میں' اشعار کے اوزان کے لحاظ سے' گرامر کے لحاظ سے یا اسلوب کے لحاظ سے ؟ ۱۰۰۰ء کے بعد جرمن اور اطالوی زبان میں جو کچھ موجود ہے کیا وہ اطالوی اور رومانوی میں موجود نہیں؟ یہ اور اسی نوعیت کے دیگر سوالات کی ابھی تک منظم اور باضابطہ تحقیق نہیں کی گئی۔

ہر ثقافت اپنی بیداری کے وقت کسانوں کی زبانوں سے جن کا شہروں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا' واسطہ پڑتا ہے۔ یہ واسطہ بالعموم پائیدار ہوتا ہے اور اہم تاریخی واقعات کی بدولت پیدا ہوتا ہے۔ جو گزشتہ تہذیبوں کے ادوار سے بطور غیر تحریری بولیوں کے دیہاتی آبادیوں میں مروج رہتی ہیں' ان میں آہستہ آہستہ غیر محسوس انداز سے تبدیلیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ یہی دونوں بولیاں جو باقی سب سے اہمیت کی حامل ہوتی ہیں اپنے آپ کو شعوری طور پر باہم متحد کر کے ثقافت کی بنیاد استوار کرتی ہیں فی الحقیقت اسی کا نام ثقافت ہے۔ شرفا اور پجاریوں کے حلقے میں زبانیں ثقافت کی زبانیں بن جاتی ہیں اور بالخصوص بولیاں قلعوں سے متعلق رہتی ہیں جبکہ زبانیں گرجوں میں راج کرتی ہیں اور اس طرح انقلاب کی دہلیز پر تہذیب کے نباتاتی عناصر حیوانی عناصر سے الگ ہو جاتے ہیں یعنی زندہ اور مردہ عناصر کی قسمت کا فیصلہ ہو جاتا ہے یا یوں کہیں کہ نامیاتی عناصر' میکانکی تفہیم سے الگ اپنی دنیا بسا لیتے ہیں۔ ٹوٹم کا پہلو اسے قبول کرتا ہے جبکہ امتنائی پہلو اس سے انکار کر دیتا ہے ۔ خون اور زبان دونوں اپنا اپنا رد عمل ظاہر کرتے ہیں۔ ہم ہر مقام پر ملتے ہیں' مگر بہت پہلے' مسلکی جامد زبان' جو اپنی ناقابل تغیر تقدیس کی ضمانت سے سرفراز ہوتی ہے' اگرچہ مدت سے اس نظام پر موت وارد ہو چکی ہے' یا زندگی کی حدود سے خارج ہو چکا ہے مگر وہ مصنوعی طور پر پابجولاں ہو کر اپنے شدت آمیز ذخیرہ الفاظ کے ساتھ زندہ ہے کیونکہ دائمی حقائق اس کی ضرورت ہے۔ قدیم ویدوں کی زبان اس لیے جامد ہو گئی کہ وہ مذہبی زبان قرار پائی اور اس کے ساتھ ہی سنسکرت نے بھی عالمانہ زبان کا درجہ کر لیا۔ ایام سلطنت کی مصری زبان پجاریوں کی زبان بن گئی۔ چنانچہ جدید سلطنت کے عہد میں مقدس اصول ناقابل فہم ہو گئے جیسا کہ جرمن زبان کے نغمات فریٹرز آرویلز' آگسٹن دور میں ناقابل فہم تھے ۔ عرب کے قبل از ثقافت دور میں بابلی' عبرانی' اور اوستا بیک وقت عام استعمال سے خارج ہو گئیں۔ (غالباً" دو سو سال قبل مسیح) غالباً" اس کی وجہ یہی ہے کہ یہودی ان زبانوں کو آرامی اور پہلوی زبانوں کے مقابلے میں بطور مذہبی زبانیں اپنی مقدس تحریروں میں استعمال کرتے تھے۔ یہی اہمیت رومی لاطینی کو گرجاؤں میں مل گئی۔ انسانیت نواز لاطینی باروق کی علمی زبان اور سلوانک روس میں اور بلاشک بابل میں سومیری زبانیں مروج ہو گئیں۔

اس کے برخلاف بول چال کی زبانوں کی تربیت گاہ قدیم قلعوں' محلات اور گشتی عدالتوں میں قائم ہو گئی۔ یہی وہ مقامات ہیں جن میں زندہ ثقافتی زبانیں پروان چڑھیں۔ گفتگو فن تقریر کے آداب کا مظہر ہے۔ عمدہ عبارت' بامحاورہ' الفاظ کے انتخاب میں ذوق کا خیال' اور ذریعہ اظہار میں شائستگی اس میں شامل ہیں۔ یہ تمام عناصر نسلی علامات ہیں۔ یہ خانقاہوں' حجروں یا عالمانہ بیٹھکوں میں نہیں سیکھی جاتیں مگر عام زندگی کے نرم و نازک مکالمات ان کی تربیت گاہ ہے۔ ایک شریفانہ معاشرے میں اور شرافت کی علامت کے طور پر ہو مرکی

زبان   نیز ملیسیوں کی قدیم فرانسیسی اور ہوہن ثافن جس کا تعلق جرمن کے وسطانی طبقات سے تھا' یہ زبانیں عام روز مرہ اور عوام کی دیہی بولیوں سے اخذ کی گئیں۔ جب ہم عظیم رزمیہ شعرا کی بات کرتے ہیں تو سکالڈ' اور ٹروبی ڈورز کو زبانوں کے خالق تسلیم کرتے ہیں' تو ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ان لوگوں کو دوسرے فنون کی طرح زباندانی کی بھی تربیت حاصل تھی' اور یہ لوگ شرفا کی محفلوں میں بیٹھ چکے تھے۔ وہ عظیم ادب جس میں ثقافت اپنا مقام حاصل کرتی ہے ہنر کی بجائے نسلی دین ہے۔

اس کے بخلاف کلیسا کی زبان تصورات اور نتائج پر مبنی ہوتی ہے' اور یہ الفاظ اور فقرات کی تکلمی اہلیت میں اصلاح اور ترتیب و تشکیل کی حد درجے تک کوشش کرتی ہے' اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ گرجے کی زبان عدالت کی زبان' دانش وروں کے محاورے' اور معاشرتی بول چال کی زبان علیحدہ علیحدہ شناخت حاصل کر لیتی ہیں۔ اس تقسیم سے مادری زبانوں کے مختلف خاندان بھی ہیں' ان اختلافات کے باوجود افلاطینس اور ٹامس ایکوی ناس ایک ہی زبان بولتے ہیں' اور وید اور مشنا بھی موجود ہیں۔ اس مقام سے ہی تمام مغربی علمی زبانوں کی ابتدا ہوتی ہے ---- جن میں جرمن' انگریزی اور فرانسیسی مشترکہ طور پر شامل ہیں اور لاطینی علوم اور اظہار و بیان کی ترجمان ہیں' جو ان کا مشترکہ منبع ہے' لہٰذا تکنیکی اظہار کا آغاز اور فقرات کی منطقی تشکیل بھی اسی سے ماخوذ ہیں۔ معاشرے کو سمجھنے کے اختلافات کی کیفیت اور سائنسی اظہار میں بار بار تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں' یہ عمل آخری دور تک جاری رہتا ہے۔ فرانسیسی تاریخ میں مرکز ثقل نسل سے متعلق تھا' یعنی روز مرہ کی بول چال سے۔ ورسائلز کی عدالت میں جو پیرس کے ایوانوں میں واقع تھی' آرتھری رومانی داستانوں کی زبان ہی مروج تھی' اور روز مرہ میں کلاسیکی فن گفتگو سے استفادہ کیا جاتا تھا' جس کی رہنمایانہ صلاحیتوں کو تمام یورپ تسلیم کرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آئی عونی۔ ایتھنی زبانیں بھی خالصوں کے ایوانوں میں تشکیل دی گئیں' اور مجالس فلسفہ میں ان کی وجہ سے بہت سی مشکلات پیدا ہوئیں کیونکہ زمانہ مابعد میں یہ تقریباً ناممکن ہو گیا کہ صغریٰ و کبریٰ کی منطق پر آسی بائنڈیز کی زبان میں بحث کی جا سکے۔ اس کے برخلاف جرمن نثر عہد باروق میں جو فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ مگر اس میں کوئی ایسا مرکزی نقطہ نہ تھا۔ جہاں سے اعلیٰ مقام کے حصول کے لیے جدوجہد کا آغاز ہو سکتا۔ چنانچہ آج تک یہ زبان فرانسیسی اور لاطینی کے مابین لٹکی ہوئی ہے ---- عدالتی اور عالمانہ ---- مصنف کے وجدان کے مطابق اپنا مافی الضمیر عمدگی اور صحت سے بیان کر سکتی ہے۔ ہمارے کلاسیکی مصنفین کا اپنے مطالعے اور لسانی مہارت کی وجہ سے' اور قلعوں اور خفیفہ امور کی عدالتوں کے عملے کو پڑھانے کے باعث ذاتی اسلوب پختہ ہو گیا ہے۔ مگر ایک مخصوص جرمن نثر' جو سب کے نزدیک معیاری ہو' یہ مصنفین تخلیق نہیں کر سکے۔

زبان کی ان دو اقسام کے علاوہ شہروں نے ایک تیسری بورژوائی زبان تخلیق کر لی جو صحیح معانی میں تحریری زبان ہے۔ معقول اور روز مرہ میں قابل استعمال جسے معیاری نثر کہا جا سکتا ہے جو اعلیٰ معاشروں کی کیفیت اظہار اور صاحب علم لوگوں کے اکتساب علم اور فکر کے نئے نئے انداز کے مابین نرمی سے جھولتی رہتی ہے اور معاشرے میں موجود تمام تصورات اپنا قبضہ بنائے رکھتی ہے۔ مگر اپنے داخلی مزاج کے مطابق یہ

سوداگرانہ ضروریات کے مطابق ہے۔ یہ اپنی حیثیت بلا تاریخ دہقانوں کے مقابلے میں قائم رکھتی ہے' اور لوتھر اور اس قسم کے دوسرے ہمعصر مفکرین کے تمام نفسیحانی سطحیت پر بھی احاطہ کرتی ہے۔ شہری طبقات کی حتمی فتح کے بعد یہ دارالحکومت کے اعلیٰ طبقات میں وسیلہ اظہار کا کام دیتی ہے۔ شہری آبادی جو محض کاروباری' ذہین اور عملی ہونے کی وجہ سے فرزند تہذیب کہلانے کی حقدار ہے' جو منطق اور شاعری کے بالکل خلاف ہے۔ اس کا مزاج بالکل میکانکی اور سرد ہے' اس میں معنی خیز حرکات کے لیے کچھ باقی نہیں رہتا۔ اس زبان جس کا نہ کوئی گھر ہے اور نہ کوئی بنیاد اسے ہر قلی اور تاجر سیکھ سکتا ہے ---- یونانی کار تھیج اور دریائے آمو کی وادی میں' چینی جاوا میں' انگریز شنگائی میں' گفتگو میں جو زبان استعمال کرتے ہیں اس میں نہ کوئی معانی ہیں نہ اہمیت۔ اگر ہم یہ سوال کریں' کہ ان زبانوں کا فی الواقع کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نہ تو نسل کے مزاج کو سمجھتے ہیں' نہ مذہب کے اثرات کو بلکہ صرف معاشی روح سے آشنا ہیں۔

باب ششم

شہر اور باشندے

(ج)

ابتدائی ثقافتوں کے باشندے، فلاحین

(نسل اور قوم)

(ا)

اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ہم عوام کے تصور کے متعلق ---- انتہائی احتیاط کے ساتھ ---- بحث کریں' اور انسانی انواع کے متعلق بدنظمی کو ترتیب دیں جس کا جدید دور کی تاریخی تحقیق نے پہلے سے بھی زیادہ ستیاناس کر دیا ہے۔ "عوام الناس" سے زیادہ کوئی ایسا لفظ نہیں' جسے مورخین نے آزادی اور انتہائی غیر تنقیدی انداز میں استعمال کیا ہو۔ پھر بھی کوئی اور ایسا لفظ نہیں جس پر تنقید نگاروں کی زیادہ سے زیادہ توجہ درکار ہو۔ بہت محتاط مورخین' اپنی تاریخی بنیاد کی تائید میں انتہائی تکلیف اٹھانے کے بعد بھی (آج

تک) وضاحت نہیں کر سکے' اور اس لیے عوام الناس کے نسلی گروہوں اور لسانی معاشرے کو ایک ہی زمرے میں شمار کرتے ہیں' اور برابر سمجھتے ہیں۔ اگر انھیں کسی گروہ انسانی کا نام معلوم ہو جائے تو وہ وہی نام ان کی زبان کو بھی دے دیتے ہیں۔ اگر انھیں کہیں تین کھدے ہوئے الفاظ مل جائیں' تو وہ سمجھتے ہیں کہ انھیں نسلی تعلق کی کلید مل گئی ہے۔ اگر چند مادے ایسے مل جائیں جو کہیں منطبق ہوتے ہوں تو وہ فوراً ہی ان کے پس منظر میں کسی قدیم نسل' ان کی آبادیوں' پر سے پردہ اٹھانے پر مستعد ہو جاتے ہیں' اور جدید قومیت کی روح نے "عوام الناس یا بنی نوع انسان کے حوالے سے" ان کی فکر کو مہمیز دے دی ہے۔

کیا عوام الناس سے مراد صرف یونانی' ڈورکی' یا سپارٹا کے رہنے والے ہیں؟ اگر رومی بھی عوام ہی تھے تو ہم لاطینیوں کو کیا کہیں گے؟ پھر اطالیہ میں جو ۴۰۰ ق م جو لوگ آباد تھے' ان کا تعلق کس اکائی سے تھا؟ اور ایٹروسکی (ایٹروئیائی) سے کون لوگ مراد تھے؟ کیا ان کی قومیت باروق اور تھریس کے رہنے والوں کی طرح نہ تھی؟ کیا وہ اپنی زبان کی تشکیل کے خود ذمہ دار نہ تھے؟ امریکی' سوئس' یہودی اور بوئر کے الفاظ کی تہ میں کیا تصور ہے؟ خون' کلام' اعتقاد' ریاست' خطہ ارض' ان سب میں وہ کون سے عناصر ہیں جو بنی نوع انسان کے مختلف گروہوں کا تعین کرتے ہیں؟ بالعموم خون کے رشتے اور زبان کے اثرات کی صرف عالمانہ انداز میں بحث کی جاتی ہے۔ عوام الناس' ان سے مکمل طور پر بے خبر رہتے ہیں۔ "ہندجرمانی" صرف ایک سائنسی اور خالص فلسفیانہ تصور ہے۔ سکندر اعظم کی یہ کوشش کہ یونانی اور فارسی کو باہم مخلوط کر دیا جائے ایک سعی ناکام ہی تھی' اور اس امر کا ہمیں حال ہی میں انکشاف ہوا ہے کہ جرمن اور انگریزی معاشرے کی حقیقی قوت کیا ہے! مگر نوع انسانی کا ایک ایسا رابطہ ہے جو شعوری بنیادوں پر قائم ہے۔ عام استعمال میں ہم بعض انسانی گروہوں کے بعض نام رکھ لیتے ہیں ---- اور اس احساس کے ساتھ ---- کہ قومیت متعدد قومیتوں میں سے ایک ہے' جس کے ساتھ متعلقہ فرد کا تعلق ہے' جو داخلی طور پر نزدیک ترین وحدت ہے اور اس طرح اس تصور کا آغاز ہوا جو کہ فی الحقیقت قطعی طور پر مخصوص معانی کا حامل ہے اور اس کی بنیاد' ذاتی تجربے اور مختلف الانواع انسانوں کی اجتماعیت پر قائم ہے۔ سیزر کے لیے اورونی' عوام تھے۔ "چینی" کی اصطلاح سے ایک قوم مراد ہے۔ اگر یہی بنیاد تسلیم کر لی جائے تو یونانی کوئی قومیت نہ تھے بلکہ صرف ا-تھنی ہی قومیت تھے' اور فی الحقیقت صرف چند مخصوص افراد ہی تھے' جیسا کہ آئی سوکراٹیز' جنھیں بنیادی طور پر یونانی ہونے کا احساس تھا' اور اس اصول کی بنیاد پر ایک بھائی سوئس ہو گا اور دوسرا پورے حقوق شہریت کے ساتھ جرمن کہلائے گا۔ یہ فلسفیانہ تصورات نہیں ہیں مگر تاریخی حقائق ہیں۔ عوام الناس' انسانوں کا وہ مجموعہ ہے' جو اپنے آپ کو ایک وحدت سمجھتا ہے۔ سپارٹا کے لوگ   اپنے آپ کو اسی مفہوم میں قومیت سمجھتے تھے۔ ڈورک بھی ۱۱۰۰ میں اس تصور کے حامل تھے مگر ۴۰۰ میں ان کا یہ تصور موجود نہ تھا۔ صلیبی کلرمانٹ کی حلف برداری کے بعد اپنے آپ کو ایک قومیت سمجھنے لگے۔ ۱۸۳۹   میں جب مورمن کو مسوری سے نکال دیا گیا اور مامرتی   جب ایک مضبوط پناہ گاہ کی تلاش میں تھے' اپنے آپ کو ایک قومیت کہنے لگے   کیا ہانکوس اور جیکوبی گروہوں کا تشکیلی اصول اس سے علیحدہ تھا؟ کیا افراد ہوں گے جو کسی جرنیل' سپہ سالار یا سردار کے ساتھ بھگوڑوں میں سے شامل ہوئے ہوں گے۔ ایسے لوگ ضرورت کے مطابق

اپنی قوم بدل لیتے ہیں' جیسا کہ عثمان علی نے ایشیائے کوچک میں اپنے آپ کو منگول (مغل) ظاہر کر کے کیا۔ زبان بھی بدل دی جاتی ہے جیسا کہ سسلی میں نارمن نے کیا۔ نام بھی بدل لیے جاتے ہیں جیسا کہ آڑیوں نے داناؤنی میں کیا۔ جب تک کہ کوئی مشترکہ مقصد موجود ہو' تو ایسی قومیتیں بھی موجود رہیں گی۔

ہمیں انسانی گروہوں کے ناموں ہی سے ان کی قضاوقدر کا امتیاز کرنا ہو گا۔ نام ہی صرف ایک ایسا ذریعہ ہے' جو ہمیں اطلاع فراہم کرتا ہے' مگر کیا ہم صرف نام ہی کی بدولت متعلقہ گروہ کی تاریخ سے پوری واقفیت حاصل کر سکتے ہیں؟ ان کا شجرہ نسب' زبان یا محض شناخت اور نشاندہی کا بھی پتہ چل سکتا ہے۔ یہاں پھر تاریخ کے محققین پر الزام عائد ہو گا۔ اس کا کوئی بھی نظریہ ہو' کیا وہ آج کے دور کے ذاتی ناموں سے کوئی نتیجہ اخذ کر سکے گا؟ کیا ہمارے پاس کوئی ایسا تصور ہے' جس کی مدد سے ہم اس میدان میں غیر تحقیق شدہ امکانات کا کھوج لگا سکیں؟ اور آغاز میں یہ دیکھیں کہ نام رکھنے کا فعل فی نفسہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ نام قدیم انسانی گروہ شعوری طور پر اپنی تقدیس اور شان و شوکت کا اظہار کرتا تھا۔ مگر مسلکی اور جنگی نام ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ علاوہ ازیں باقی ماندہ افراد کو ارضی ملکیت اور وراثت معاشرتی مقام فراہم کرتی تھی۔ قبائلی نام بھی باعث افتخار ہوتا تھا' جیسا کہ عثمان علی کے حوالے سے ہوا اور آخر میں علاوہ ازیں سرحدی علاقوں میں بہت سے اجنبی نام بھی سننے میں آ جاتے حالانکہ متعلقہ گروہ کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ بعد ازاں یہی نام نسلاً" بعد نسل منتقل ہونے لگتے ہیں اور یہ ثابت کرنا ناممکن ہو جاتا ہے کہ متعلقہ فرد کے نام کا اس کے نسلی گروہ سے کوئی تعلق نہیں۔ بلا تنک فرسکز' ایلیمانی اور سیکسن ناموں نے متعدد مقامی ناموں کو نیچے دبا دیا' کیونکہ ویرس کی جنگ میں وہ مغلوب ہو گئے تھے۔ اگر ہم اس سارے قصے سے آشنا نہ ہوتے' تو ہم مدتوں سے اس مفروضے پر تعین کر کے بیٹھے ہوتے کہ متعدد لوگوں کو اس جنگ میں گھربار چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا ہو گا۔ رومنوں' کیوراٹیز' سپارٹا والوں اور لاکس ڈاموتین کار تھیج والوں اور پونانیوں کے نام ساتھ ساتھ ہی مٹ گئے' اور پیلاسگی' آڑی اور دانائی نام اب ہم کبھی بھی نہیں سنیں گے۔ اگر ہم ان ناموں سے آشنا نہ ہوتے تو ہمارے عالموں نے انھیں علیحدہ اقوام کی صورت میں پیش کر دیا ہوتا' جن کی اپنی زبان اور نسل بھی ہوتی۔ اگر علاقائی مناسبتوں نے نسلی تقسیم کا عمل اختیار نہ کیا گیا ہوتا' تو ڈوری معاملات کو ڈورین نقل مکانی کا نتیجہ قرار دے دیا ہوتا۔ تاریخ میں یہ عمل کتنی بار ہوا ہے کہ انسانی گروہوں نے اپنے ناموں کا اطلاق علاقائی بنیادوں پر کیا ہو' یا اپنے ساتھ ایسے نام منتقل کر لیے ہوں؟ جدید پروشیا والوں کے ساتھ یہ معاملہ درپیش ہوا ہے بلکہ جدید پارسیوں' یہودیوں اور ترکوں کو بھی نقل مکانی کرنی پڑی ہے۔ مگر برگنڈی اور نارمنڈی کے معاملات اس کے برعکس ہیں۔ یونانیوں کی ہیلین کے نام سے نسبت ۶۵۰ کے قریب قائم ہوئی' اس لیے یہ عمل کسی نقل مکانی سے منسلک نہیں کیا جا سکتا۔ لورائن (لوتھرنجن) کو یہ نام ایک انتہائی غیر اہم شہزادے کی وجہ سے ملا اور یہ معاملہ صرف وراثت کا تھا۔ اس میں نقل مکانی کا عمل شامل نہ تھا۔ پیرس والے جرمن والوں کو ۱۸۱۴ء میں آلیمانڈ کہتے تھے۔ ۱۸۷۰ میں پروشیئن' اور ۱۹۱۴ء میں بوچ کہتے تھے ـــــ مگر دوسرے مقامات پر ان ناموں کا کوئی اثر نہ تھا۔ فی الحقیقت یہ واقعہ تاریخی حالات کے تحت واضح کیا جا سکتا ہے۔ اب یہ بتائیں کہ ماہرین لسانیات ان ناموں کی بنیاد پر کیا نتائج

اخذ کر سکتے ہیں۔

اس کا کوئی صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ ۳۰۰۰ ء میں مورخین ہمارے متعلق کیا نتائج اخذ کریں گے۔ اگر انھوں نے دور حاضر کے تحقیقی اصولوں کی بنا پر' ناموں' لسانی باقیات' اور اصل مقام کے تصورات اور نقل مکانی کے حوالے سے کام کیا۔ مثال کے طور پر ٹیوٹانی سرداروں نے ۱۳۰۰ کے قریب پروشیئن کافروں کو مار بھگایا۔ مگر ۱۸۷۰ء میں یہ باشندے گھومتے پھرتے پیرس کے دروازوں پر پہنچ گئے۔ وہ رومی جو گوتھ کے دباؤ کے تحت "تائبر" سے جنوبی ڈینیوب کی وادیوں میں نقل مکانی کر گئے' یا ان کا کوئی حصہ یا وہ سب پولینڈ میں آباد ہو گئے اور ان علاقوں میں لاطینی بولی گئی۔ شار لیمنیوں کو مغرب میں سیکسن نے شکست دی' اس لیے وہ اپنے ہمسایہ علاقے ڈریڈن میں منتقل ہو گئے اور ان کا اپنا علاقہ ہنوودی نسل کے لوگوں نے قبضے میں لے لیا' جن کا اصل مسکن ان کے ناموں کے لحاظ سے ٹیمز کی وادی تھی۔ وہ مورخ جو بنی نوع انسان کی تاریخ کی بجائے ناموں کے تاریخ لکھتا ہو یہ بھول جاتا ہے کہ ناموں کا بھی اپنا مقدر ہوتا ہے۔ اس طرح زبانوں کا بھی' جو نقل مکانی' تجدیدیت' فتوحات' شکستوں' اپنے بولنے والوں کے ہمراہ ہی چلتی ہیں۔ یہ غلطی ہند جرمانی زبانوں کے متعلق خصوصی طور پر سرزد ہوئی۔ اگر تاریخی ادوار میں فانز اور کلابر کے نام ایک جگہ سے دوسری جگہ گھومتے پھرتے رہے ہیں اور اگر عبرانی فلسطین سے وارسا میں منتقل نہیں ہوئی اور فارسی دریائے فرات سے ہندوستان میں نہیں پہنچی تو پھر کون سے نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں؟ اس طرح اٹروسکی تاریخ کے سلسلے میں نام اور مینہ لیمنوس کے کتبے کی دریافت سے کیا بصیرت حاصل ہوئی؟ اور کیا کسی زمانے میں فرانسیسی اور ہیٹی کے حبشی زبان کی مناسبت کے باعث ایک ہی قدیم نسل سے تعلق رکھتے تھے؟ بوڈاپسٹ اور قسطنطنیہ کے درمیان کے علاقہ میں آج دو منگولی' ایک سامی اور دو کلاسیکی اور تین سلواکی زبانیں مروج ہیں اور یہ مختلف زبانیں بولنے والے انسان خود کو ایک ہی قومیت تسلیم کرتے ہیں اگر ہم اس مقام پر ایک نقل مکانی کی داستان تراش لیں' تو ایک ہی نتیجے میں ہماری کارروائی کی غلطی ظاہر ہو جائے گی۔ ڈورک کے متعلق ہم جو کچھ جانتے ہیں وہ محض ان کی بولی کے متعلق ہے۔ یہی ہم جانتے ہیں اور صرف اسی قدر جانتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس گروہ کی بعض بولیاں بہت جلد وسعت اختیار کر گئیں' مگر یہ کسی انسانی نسل کے پھیلاؤ یا وجود کا بھی کوئی ثبوت نہیں

(۲)

اس طرح ہم نے جدید محققین کے مقبول تصور تک رسائی حاصل کر لی ہے اگر یہ تاریخ نگار کسی ایسے انسانی گروہ تک رسائی حاصل کرتا ہے جس نے کوئی کامیابی حاصل کر رکھی ہے' تو وہ اپنے ذمے یہ فرض عائد کر لیتا ہے کہ وہ ہی ان کی طرف سے سوالات کا جواب دے گا۔ یہ تصور کب پیدا ہوا؟ مختلف اقوام کے ذمے یہ فرض عائد کر دیا گیا ہے کہ وہ کہیں نہ کہیں سے برآمد ہوں' اور ان کا کوئی ابتدائی گھر ہو' یہ تصور کہ وہ ان کا وہ گھر اسی مقام پر ہو' جہاں پر ان کے آثار برآمد ہوئے ہیں' فی نفسہ ایک ذلت آمیز تصور ہے۔

قدیم انسان ایک مکان سے دوسرے مقام پر منتقل ہوتا رہتا تھا' مگر اس اصول پر تمام تاریخ نتائج کا اخذ بھی ایک مانیا (ذہنی بیماری) کی صورت اختیار کر چکا ہے' یہ تو کوئی نہیں سوچتا کہ قدیم چینیوں نے چین پر حملہ کیا تھا یا قدیم مصری' مصر پر حملہ آور ہوئے تھے۔ مورخین صرف اسی سوال پر اکتفا کرتے ہیں کہ کب اور کہاں یہ حملہ آور ہوئے تھے۔ ممکن ہے کہ کسی وقت یہ کوشش بھی کی جائے کہ سامیوں کا سکنڈے نیویا میں اور آریاؤں کا کنعان میں اصل گھر ثابت کیا جائے۔

یہ حقیقت کہ تمام قدیم انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے تھے ایک مسلمہ امر ہے۔ فی الواقع اسی اصول میں لیبیا کی آبادی کا حل پوشیدہ ہے۔ لیبیائی یا ان کے آباواجداد حامی زبانیں بولتے تھے' مگر ان کے لیے عام مصری روایات اور دیگر شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نیلی آنکھوں اور سنہری بالوں والی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ لہٰذا بلا شبہ وہ شمالی یورپ کے کسی صوبے کے باشندے تھے وسطی ایشیا میں کم از کم (۱۳۰۰ کے بعد) تین سطوحات ایسی ملی ہیں' جو نقل مکانی کو ظاہر کرتی ہیں' جو غالباً" مصر میں بحری قزاقوں کے حملوں سے متعلق ہیں' اور اس سے ملتے جلتے بعض واقعات میکسیکو کی ثقافت میں دکھائے گئے ہیں۔ مگر جہاں تک آبادیوں کے انتقال کا تعلق ہے' ہم ان کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ بہرحال ایسی کسی انتقال آبادی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جس کی جدید مورخین تصویر کشی کرتے ہیں ---- یعنی ایک ایسی نقل و حرکت جو سخت دباؤ کے تحت کی جائے اور طویل ارضی فاصلے طے کرنے کے بعد بالاخر کہیں مستقل ٹھکانہ بنا لیا جائے۔۱۰ ایسے نقل مکانی کے کوئی واقعات پیش نہیں آئے۔ یہ تمام داستانیں ہم نے خود تراش لی ہیں۔ آج کل کے لوگ بلاوجہ نقل مکانی نہیں کرتے۔ اس سے قبل کہ کسی قوم کے ذمے ایسا کوئی واقعہ لگایا جائے اس کی احتیاط سے تحقیق کر لینی چاہیے' کیونکہ ایسے افسانے ہمیشہ درست ثابت نہیں ہوتے' اس غرض کے لیے جو محرک ایجاد کیا گیا ہے وہ بھی انتہائی بے رنگ ہے اور اسی صدی کے لیے موزوں ہے جس میں کہ اسے گھڑا گیا---- یعنی مادی ضرورت ---- بھوک کے مٹانے کے لیے ایک علاقے سے دوسرے میں انتقال کی کوشش کی نوعیت اس سے مختلف ہوتی ہے۔ اشتہا ہی سب سے بڑا محرک رہا ہے' جس نے کسی نسل کے انسانوں کو ترک سکونت پر مجبور کیا ہو ---- حالانکہ اس حقیقت کو باآسانی سمجھا جا سکتا ہے' جب ایسے گروہ اچانک ہی کسی فوجی رکاوٹ سے دو چار ہوں۔ بلا شک و شبہ یہ سادہ اور مضبوط انسان کے لیے اس کے ابتدائی عالم صغریٰ میں آزادی سے گھومنے پھرنے کا حق حاصل ہے جو اس کی روح کی گہرائیوں سے بلند ہوا اور اس میں مہم جوئی' جرات اور مال غنیمت کی خواہش بیدار کر دی۔ ایسی بھڑکتی ہوئی آرزو کا ہمارے دور میں تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جو صرف کچھ کر گزرنے اور خون بہانے اور بطور ہیرو مرنے کے لیے کی جائے' بلکہ اکثر معاملات میں بلاشبہ' خانگی جدوجہد' کسی مضبوط قوت سے بدلے کا خوف ہی مقصد تھا' مگر اس میں بھی جرات آمیز مردانگی کا عمل شامل تھا۔ اس نوعیت کے محرکات چھوت کی بیماری کی طرح ہیں۔ اور اس گروہ کو جو گھر میں مقیم رہے' اسے بزدل گردانا جاتا ہے۔ کیا یہ بھوک اور اشتہا ہی کی وجہ سے صلیبیوں نے مہم جوئی شروع کر دی یا کورٹز اور پزارو کی مہم جوئی اس کا باعث بنی۔ ہمارے دور میں جنگیں وحشی یورپ' اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے انھیں اختیار کرتا ہے' جبکہ تاریخ میں ہم بہت کم تعداد میں لوگوں کو وسیع

خطوں پر حملہ کرتے ہوئے دیکھتے ہیں' مگر ہمیشہ خون کی آوازیں اور اعلیٰ مقدر کی آرزو ان کو کھینچ لاتی ہے۔

مزیدبراں ہمیں اس پر غور کرنا ہو گا کہ اس ملک کی حالت کیا ہوتی ہے جس پر کوئی چڑھ دوڑتا ہے کم و بیش یہ حالات تبدیل ہوتے رہتے ہیں مگر یہ حالات کی تبدیلی محض نقل مکانی کرنے والوں کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ زیادہ سے زیادہ مقیم آبادی کی وجہ سے ہوتی ہے جو کہ بالاخر تعداد کے لحاظ سے غلبہ حاصل کر لیتی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ ایسے ارضی خطے تو تقریباً" آبادی سے خالی تھے کمزور آبادی کے لیے یہ آسان تھا کہ خاموشی سے بھاگ جائے تاکہ قتل عام سے بچ جائے' اور قانون کے مطابق اسے ایسا کرنے کا جواز بھی تھا' مگر بعد کے زمانے میں جب آبادی گنجان ہو گئی' کمزور آبادی کے لیے علاقے خالی کرنا ناممکن ہو گیا' اس کے لیے دو ہی راستے رہ گئے یا تو اپنا دفاع کامیابی سے کرے یا کوئی دوسری جگہ پرانے علاقے کی بجائے تلاش کرے۔ اب تو فضا میں باہر نکلنے کی کوششیں جاری ہیں۔ اب کوئی قوم اپنے آس پاس کے ملکوں اور حکمرانوں سے تعلق قائم رکھے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی اور جب بے اعتباری کی فضا قائم ہوتی ہے تو بجز اسلحہ کوئی مددگار دکھائی نہیں دیتا۔ ایک ناگزیر ضرورت انسان کو جنگ کے لیے آمادہ کرتی ہے' لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور مخالفین کے خلاف اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ اسلحہ صرف انسانوں کے خلاف استعمال ہوتا ہے نہ کہ حیوانات کے خلاف اور بالاخر صرف نقل مکانی ہی کی صورت باقی رہ جاتی ہے جس سے جان بچائی جاتی ہے۔ جنگی جنون' آباد ممالک میں جھاڑو پھیر دیتے ہیں جن کے فاتح باشندے اپنی جگہ پر قائم رہتے ہیں اور مال غنیمت سے مستفید ہوتے ہیں اور اس کے بعد فاتحین اقلیت میں ہونے کے باوجود نئی صورت حالات پیدا کر دیتے ہیں۔ داخلی طور پر مضبوط اپنے آپ کو بالائی سطح پر پھیلا لیتے ہیں اور مقابلتاً" اکثریت کی آبادی کو زیر نگیں بنا لیتے ہیں۔ غلام قوم کی اپنی کوئی صورت باقی نہیں رہتی' ان کی زبان اور نسل کی تفصیلات بہت پیچیدہ ہو جاتی ہیں۔ بلوچ نے اس صورت حال کی مکمل تفاصیل فراہم کی ہیں ڈیلنبروک نے بھی اس موضوع پر کام کیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تمام ترک رہائش کرنے والی اقوام' قبرص کے فارسی' مامرتین' اور صلیبی آسٹروگوتھ' اور مصری علاقوں کے بحری باشندوں کے متعلق کتبات کے مطابق یہ لوگ اسی مفہوم سے متعلق ہیں یعنی ان علاقوں کی آبادی میں شامل ہو گئے جن پر انھوں نے قبضہ کر لیا تھا' اگرچہ تعداد میں کم تھے' یعنی صرف چند ہزار جنگ جو' مگر اپنے پختہ عزم اور ناقابل شکست ارادے کے تحت مقامی اکثریت سے مغلوب نہیں ہوئے بلکہ ہمیشہ غالب رہے۔ یہ زمین غیر آباد نہیں تھی' بلکہ پہلے سے آباد کی جا چکی تھی' جس پر وہ قابض ہو گئے۔ غالب اور مغلوب اقوام میں تعلق کی نوعیت معاشرتی رتبے کی صورت میں ظاہر ہوئی' جبکہ نقل مکانی ایک جدوجہد تھی تو مستقل قیام ایک سیاسی کارروائی ٹھہری۔ اس صورت حال میں بھی یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم رہی کہ تاریخی عمل میں ایک کامیاب جنگجو گروہ نے اپنی زبان' نام بھی مغلوب گروہ میں مروج کر دیے۔ اس صورت حال کو کسی نسل یا قوم کی نقل مکانی کہا جا سکتا ہے۔ یہاں پر ہم اپنا سوال پھر دہراتے ہیں کہ فی الواقع وہ کون سی اشیا لوگ اور عوامل ہیں' جو نقل مکانی کر سکتے ہیں۔

اس سوال کے چند جوابات یہ ہیں۔ کسی خطے یا اجتماع (ہیرو کا نام جو اس کے مقلدین اختیار کر لیتے ہیں) کا نام مقبول ہو کر پھیل جاتا ہے۔ ایک جگہ پر ختم ہو جاتا ہے اور دوسری جگہ' بالکل ہی مختلف نوعیت کی آبادی میں مقبولیت حاصل کر لیتا ہے' یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ متعلقہ انسانی گروہ کے ساتھ ہی منتقل ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ عمل اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ زبان فاتحین کی' یا مفتوحین کی' یا کوئی تیسری زبان جو باہمی افہام و تفہیم کے لیے قبول کر لی جاتی ہے اور سردار کا فوجی بینڈ جو تمام ممالک کو زیر نگیں کر لیتا ہے اور پکڑی گئی عورتوں کے ذریعے مقبولیت حاصل کرتا ہے یا کوئی حادثاتی متجانس گروہ جو مہم جوؤں پر مشتمل ہوتا ہے' یا کوئی قبیلہ عورتوں بچوں سمیت گرفتار ہو جاتا ہے' جیسا کہ ۱۲۰۰ میں فلسطائن کے لوگوں سے ہوا' جو اپنے بال بچوں سمیت اپنے ریوڑوں اور بیل گاڑیوں سمیت فینیقی ساحل کے ساتھ ساتھ مصر پہنچ گئے ۔ ان واقعات کی روشنی میں کیا ہم بعض نتائج اخذ کر سکتے ہیں اور ناموں' زبانوں' نسلوں اور قومیتوں کی شناخت کے اصول قائم کر سکتے ہیں؟ ایک ہی امکانی جواب ہے: بالکل نہیں۔

جہاں تک بحری باشندوں کا تعلق ہے وہ مصر پر بار بار حملے کرتے تھے' ان میں سے تیرھویں صدی میں دو نام سامنے آتے ہیں' ایک دانائی اور دوسرا آڑی ---- مگر ہومر نے انھیں اساطیری روایت کے طور پر متعارف کرایا ہے ---- ایک نام لکا---- جسے بعد ازاں لائسیاء کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اگرچہ یہ لوگ اس ملک کے باشندے تھے جو اپنے آپ کو ٹراما لائی کے نام سے متعارف کراتا تھا---- اور اس کے حوالے سے ٹروسکی' سرڈز اور سیکولی کے نام ---- سامنے آتے تھے' مگر کسی حوالے سے بھی ثابت نہ ہوا کہ یہ اٹروسکی زبان بولتے تھے۔ اور نہ یہ ثابت ہوا ہے کہ شکل و صورت میں وہ اٹلی کے باشندوں سے مشابہ تھے' یا ان میں مزید کوئی ایسی علامت تھی کہ انھیں اٹلی کے باشندوں کی نسل سے منسوب کیا جائے۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ لیمنوز سے جو کتبہ ملا ہے وہ ایٹروسکی زبان میں ہے جو قواعد کے لحاظ سے ہندجرمانک زبان ہے' تو اس کی بنیاد پر لسانیات کی تاریخ میں بہت سے مفید نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ مگر اس کی مدد سے نسلیات کی تاریخ میں کوئی فائدہ حاصل ہونے کی توقع نہیں۔ روم' اٹروسکی شہر تھا' کیا یہی حقیقت اس دعوے کے بطلان کے لیے کافی نہیں کہ اس پر رومی آبادی کا کوئی اثر نہ تھا؟ کیا محض رومیوں کو اس بنا پر ہند۔ جرمانوی تسلیم کر لیا کہ وہ لاطینی زبان بولتے تھے؟ ماہرین نسلیات ایک بحیرہ روم کے علاقے کی نسل اور ایک الپائنی نسل کو تسلیم کرتے ہیں اور ان علاقوں شمالی اور جنوبی سروں پر واقع جرمن اور بسیائی نسلوں میں مشابہت کی نشاندہی کرتے ہیں مگر ماہرین لسانیات یہ جانتے ہیں کہ باسکی اپنی زبان کی بنیاد پر ہند جرمانوی نسل سے قدیم ہیں ---- ایک ابرئین آبادی ---- یہ دونوں آرا باہم اختلافی ہیں' کیا مائی سینیائی کے معمار اور تائرین' یونانی تھے؟ ---- تو اس وجہ سے یہ سوال بھی پیدا ہو گا کہ کیا آسٹروگوتھ کا تعلق جرمن نسل سے تھا؟

میرے نزدیک قوم نفوس کا ایک گروہ ہے۔ تاریخ میں بڑے بڑے کارنامے عوام الناس نے انجام

نہیں دیے' بلکہ انھوں نے مل کر قوم کی تخلیق کی۔ ہر عمل عامل میں تبدیلی پیدا کر دیتا ہے' جبکہ متعلقہ واقعہ کسی گروہ نے اپنے مشہور نام کے حوالے سے انجام دیا ہو' یہ مفروضہ کہ پس منظر میں محض انسانی گروہوں کی بجائے ایک قوم کا وجود موجود ہے' یہ کوئی لازمی شرط نہیں بلکہ متعلقہ واقعہ کا ایک نتیجہ ہے یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ آسٹروگوتھ اور عثمان علی نے وہ حیثیت اختیار کر لی جو بعد میں ان کا طرہ امتیاز ثابت ہوئی۔ امریکیوں نے فلورنٹائن امیریگو کا نام یورپ سے اپنے ساتھ منتقل نہیں کیا تھا۔ مگر آج یہ نام ایک براعظم اور ایک قوم کو موسوم کرتا ہے۔ صحیح معانی میں ایسا نام جس کا مخصوص کردار ایک روحانی بغاوت کی وجہ سے ابھرا جو ۱۷۷۵ء میں منظر عام پر آئی اور پھر زیادہ زور شور سے ۶۵-۱۸۶۱ء میں اسے شہرت حاصل ہوئی۔

لفظ قوم کا یہی ایک مطلب ہے' نہ تو متحدہ نسل' نہ لسانی اتحاد فیصلہ کن عنصر ہے۔ جو عوامل ایک قوم کو دوسری پر امتیاز بخشتے ہیں وہ آبادی کی بنیاد پر وجود میں آتے ہیں اور ایک مدت بعد اتحاد باہمی کی بدولت ایک "ہم" کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ احساس جتنا گہرا ہو گا' عوام الناس میں اتنی ہی شدت کا حامل ہو گا۔ ایسی متعدد چند روزہ اور دائمی ناقابل فنا انواع اقوام ہیں جو اپنی زبان' نام' نسل اور وطن ترک کر سکتی ہیں' مگر جب تک ان کی روح قائم رہتی ہے تو وہ انسانی دولت کی کایا پلٹتے رہیں گے خواہ وہ کسی بھی نوعیت کا ہو۔ ہنی بال کے دور میں رومی سے مراد ایک قوم تھی مگر ٹروجن کے عہد میں اس کی حیثیت محض ایک آبادی کی تھی۔

بلاشک اکثر یہ درست ہوتا ہے کہ نسل اور قوم کو ایک ہی شے سمجھا جائے۔ مگر اس میں زمانہ حال ڈارون کا تصور شامل نہیں کرنا چاہیے' مگر یقینی طور پر یہ تسلیم نہیں کرنا چاہیے کہ کوئی انسانی گروہ محض طبیعی ابتدا یعنی نسلی بنیادوں پر قوم کی صورت اختیار کر گیا ہو' یا ایسے اتحاد کو دس نسلوں تک قائم رکھا جا سکتا ہے۔ یہ دعویٰ بھی ہمیشہ نہیں کیا جا سکتا کہ اس قوم یا نسل کا وجود محض سائنس کی رو سے قائم ہے ---- اور عوامی شعور کے مطابق نہیں ---- اور دنیا میں ایسی کوئی نسل نہیں جو محض خون کے خالص ہونے کی دعویدار ہو۔ نسل میں کوئی مادی جواز موجود نہیں۔ مگر کائناتی اور سمتی عوامل موجود ہیں۔ انجام کے احساس کا اتحاد موجود ہے۔ اس کی وجہ یہی تطبیق ہے (جو تمام کی تمام مابعدالطبیعیاتی ہے) جو اس نسلی نفرت کا باعث ہے جو جرمنوں اور فرانسیسیوں میں اور جرمنوں اور یہودیوں میں موجود ہے اور اسی جذبے کے تحت بعض اوقات شدید محبت بھی قائم ہو جاتی ہے ---- (جو نفرت سے اس حد تک مشابہ ہوتی ہے) ---- جیسا کہ خاوند اور بیوی میں محبت کے جذبات فروغ پاتے ہیں' وہ شخص جس کا کسی نسل سے تعلق نہیں وہ اپنی محبت کے خطرات سے بھی بے خبر ہے۔ اگر انسانوں کے انبوہ کثیر کا ایک حصہ جو اب ہند جرمانوی زبانیں بولتا ہے' "ہم نسل ہونے کی آرزو پیدا کرے" تو اس سے کیا صورت پیدا ہو گی؟ نہ تو اس سے کسی قدیم نسل کا ثبوت فراہم ہو گا' جو تصور کہ محققین کو بہت پسند ہے مگر اس سے مابعدالطبیعیاتی تصورات کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس تصور کا اظہار تمام قوم کے حوالے سے تو نہیں' صرف جنگجو عناصر اور بالخصوص حقیقی شرفا کے حوالے سے بیان کیا جائے ---- یعنی صرف ان لوگوں کے حوالے سے جو صرف حقائق کی دنیا میں زندگی بسر

کرتے ہوں' تاریخ تکوین کے اثرات کے تحت آرزو' عزم اور جرات آزمائی پر عامل ہوں قدیم ادوار زندگی کی یہی نہج تھی' (یہ بھی ایک اہم نقطہ ہے) کہ ایک صاحب کمال اجنبی بغیر کسی دقت کے حکمرانوں کے طبقے میں شامل ہو سکتا تھا اور ازواج نسلی خوبیوں کی بنا پر نہیں بلکہ ان کی شائستگی کی بنیاد پر منتخب کی جاتی تھیں گویا نسلی روایت ایک کمزور سہارا سمجھا جاتا تھا (یہ صورت آج بھی مشاہدہ کی جا سکتی ہے) اور پجاری اور عالم لوگ آج بھی اسی تصور کے قائل ہیں اگرچہ اس کا امکان ہے کہ قریبی رشتہ داروں کی صورت میں اس پر عمل نہ کیا جائے ۔ ایک مضبوط روح جسم کو ایک فنی شاہکار بنا دیتی ہے۔ رومیوں نے اٹلی کے پریشان حال متفرق لوگوں میں سے ایک داخلی لحاظ سے مضبوط نسل تیار کر لی جو نہ تو اٹروسکی تھی نہ لاطینی بلکہ محض کلاسیکی' مگر صرف سطحی طور پر انھیں رومی کہا جا سکتا تھا رومی متاخر عہد کے نامکمل پیکر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ رومیوں سے زیادہ اس دور میں کوئی اور قوم متحد نہ تھی۔

میں آپ کے سامنے ایک اور مثال پیش کروں گا' جو یہ ثابت کرے گی' کہ موجودہ محققین کے نظریات درباره قوم' زبان اور نسل کس قدر غلطیوں کا باعث ہوتے ہیں' جس کا حتمی نتیجہ یہ ہے کہ عرب ثقافت آج تک بطور ایک ہامیاتی وجود تسلیم نہیں کی گئی' اس کی وجہ فارسی زبان ہے۔ فارسی ایک آریائی زبان ہے' اس لیے اہل ایران ایک ہندجرمانی نسل ہے۔ اس لیے اہل فارس کی تاریخ اور مذہب کا ایران سے کوئی تعلق نہیں۔

آغاز میں یہ کہنا ہے کہ ایرانی زبان (فارسی) ہندی زبانوں کی ہم پلہ ہے۔ ان کا مورث اعلیٰ ایک ہے۔ کیا یہ بھی ایک ہندوستانی بولی ہی ہے ؟ سات صدیاں اس کی ترقی میں گزر گئیں' اس دور میں اس کا کوئی رسم الخط نہ تھا' اس لیے اس رفتار ترقی کو تیز ہی کہنا ہوگا۔ یہ دور ویدوں کے زمانے سے لے کر دارا کے بے ستون کتبات تک تسلیم کیا جاتا ہے یہ دوانی فاصلہ اس قدر زیادہ ہے جیسا کہ فرانسیسی اور سٹرابرگ اوتھ ۸۴۲ء میں تھا۔ اب تل العمران کے حروف اور بوغاز کیوئی کے آثار سے یہ معلوم ہوا ہے کہ پندرہ سو سال قبل مسیح ان علاقوں میں متعدد آریائی ناموں اور دیوی دیوتاؤں سے یہ لوگ آشنا تھے۔ یہ ویدوں کا مہم آزما دور ہے۔ فلسطین اور شام سے بھی ہمیں ایسے نام دستیاب ہوئے ہیں۔ بہرحال ایڈورڈ میرکا یہ کہنا ہے کہ یہ نام ایرانی نہیں بلکہ ہندوستانی ہیں' اور اعداد کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے جو اب دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں ایک بھی ایسا عدد نہیں جس کا تعلق فارسی زبان سے ہو اور جسے تاریخ کے مفہوم میں فارسی الاصل کہا جائے۔ جن لوگوں کے نام ہیں وہ ہندوستانی ہیرو تھے' جو ہتھیار بند ہو کر مغرب کی طرف روانہ ہو گئے اور سلطنت بابل کے علاقے میں اپنی موجودگی کے نشانات چھوڑ آئے۔

ایسے حالات ٦٠٠ ق م میں ایران میں پیش آئے۔ ایران کا ایک چھوٹا سا ضلع جس میں وحشی کسان آباد تھے اور آپس میں حد درجہ متحد تھے۔ ہیروڈوٹس کہتا ہے کہ اس ضلعے کے قبائل میں سے صرف تین فی الواقع ایرانی تھے اگر ان قدیم سرداروں کی زبان ان پہاڑی علاقوں میں زندہ رہتی اور وہ فارسی ہی ہوتی تو

یقیناً" ہم کہتے کہ زمین کے نام پر ان قبائل کا نام رکھا گیا۔ میڈ قبائل (شروانی) نے متعدد سیاسی کامیابیوں کے بعد یہ سیکھا کہ وہ اپنے آپ کو ایک وحدت سمجھیں۔ شاہی سارگان کے آثار قدیمہ میں اور اس کے بعد میں آباد ہونے والے (تقریباً" ۷۰۰ ق م) لوگوں کے آثار دستیاب ہوئے ہیں ان میں آریائی اور غیر آریائی شخصیات اور مقامات کے نام ساتھ ساتھ چلتے ہیں یہ تمام نام بڑے لوگوں کے ہیں۔ مگر تگلاتھ پلسر چہارم (۷۴۵-۲۷) انھیں سیاہ مو کہتا ہے یہ اس کے بعد کے زمانے میں ہی ہوا ہو گا کہ سائرس اور دارا کی ایرانی قوم وجود میں آئی' اور اس میں مختلف صوبوں کے اشخاص شامل ہوں گے'۔ مگر ان میں مضبوط داخلی اتحاد شامل ہو گا' لیکن جب صرف دو صدیوں بعد مقدونیہ نے ان کی عظمت کا خاتمہ کر دیا ----- تو کیا ہم یہ تسلیم کر لیں گے کہ اس دور میں ایرانیوں کا وجود ختم ہو چکا تھا ؟ (کیا اس وقت بھی کچھ لومباردی باشندے ۹۰۰ کے قریب اطالیہ میں موجود تھے؟) یہ امر یقینی ہے کہ ایرانی زبان کی وسیع توسیع بطور سرکاری زبان اور ایک عظیم فوجی نظام کے تحت چند ہزار ایرانی نفوس جو فوجی اور انتظامی امور سرانجام دیتے تھے' صدیوں قبل ایرانی قوم کی سلطنت کو ختم کر چکے ہوں گے' اور اس کی جگہ فارسی زبان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے والوں کی جماعت قائم کر سکے ہوں گے۔ ایسے لوگ جب کسی جگہ سیاسی غلبہ حاصل کر لیتے ہیں تو اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھنے لگتے ہیں۔ کچھ مقامی لوگ بھی اپنے آپ کو ایرانی حملہ آوروں کی نسل قرار دیتے ہوں گے۔ دنیا میں کوئی بھی ایسا ملک موجود نہیں جہاں ایرانیوں کا کسی زمانے میں براہ راست عمل دخل رہا ہو۔ دارائے اعظم اور سکندر اعظم کے مابین کی مدت کے واقعات جن کا ایک حصہ شمالی عراق میں وقوع پذیر ہوا (اس علاقے میں اس وقت آرامی زبان کا چلن تھا) اور کسی حد تک اس سے زیریں خطے میں یعنی قدیم شنیار میں فارسی کا عارضی اقتدار ہوا' جہاں پر کیخسرو نے چند عمارتوں کی تعمیر شروع کی' مگر یہ منصوبہ کبھی پایہ تکمیل کو نہ پہنچا۔ ہخامنشی دور کے بعد پارتھی برسر اقتدار آئے۔ یہ ابتدائی طور پر ایک منگول قبیلے سے تعلق رکھتے تھے مگر انھوں نے فارسی زبان کی کسی شاخ کو اپنی بولی کے طور پر قبول کر لیا تھا اور جب وہ ایرانیوں کے علاقوں کے درمیان رہنے لگے تو ان میں فارس کی قومیت کا احساس بھی پیدا ہو گیا۔

یہی وہ دور تھا جس میں ایرانی مذہب وجود میں آیا اور اس کا مسئلہ نسل اور زبان سے کسی طور بھی کم نہ تھا ۔ ماہرین نے ان تینوں کو اس آسانی سے یکجا کر دیا ہے گویا کہ یہ ایک امر بدیہی تھا اور اس لیے ہمیشہ اسے ہندوستان سے منسلک کر کے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر اس مذہب کے ارضی ڈاکوؤں کا ہندوستان سے کوئی تعلق نہ تھا البتہ یہ ویدوں کے مذہب سے مشابہ ضرور تھا' جیسا کہ بعض مذہبی شخصیتوں کے ناموں میں مشابہت موجود ہے۔ مترا ----- ورونا'۔ "اندرا ---- ناساتیہ"۔ جیسا کہ بوغار کیوئی متون سے ظاہر ہوتا ہے اور اس مذہب کی حدود میں جس نے بابلی سلطنت کے اندر اپنا سربلند کیے رکھا' زرتشت نے ادنیٰ طبقے کے انسانوں میں سے بطور مصلح اپنی آواز بلند کی۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ اس کا تعلق فارس سے نہ تھا' جو کچھ اس نے تشکیل کیا ہے (مجھے امید ہے کہ میں اسے بیان کر سکوں گا) وہ یہ تھا کہ ویدوں کے مذہب کو "ہرمزان" میں منتقل کر دیا۔ یہ ایک عالی فکر تھی۔ یہیں سے مجوسی مذاہب کی نازک سی ابتدا ہوتی ہے۔ شیاطین جو قدیم ہندی مذاہب کے اعتقاد کے مطابق دیوی - دیوتا تھے۔ انھوں نے سامی اور عرب

مذاہب میں "جن" کی شکل اختیار کرلی۔ یہوے اور بیلزے بوب دونوں ایک دوسرے سے متعلق ہیں' اور انھیں اہر مزد اور اہرمن کے نام اس کسانوں کے مذہب نے عطا کیے' جو بنیادی طور پر ایک "آرامی" مذہب تھا' اس لیے اخلاقی ثنویت کے عالمی احساس کے تحت قائم ہوا۔ ایڈورڈ میر نے ہندوستانی اور ایرانی عالمی تصورات کی بالکل درست تشریح کی ہے   مگر اس کے غلط صغریٰ و کبریٰ (منطقی دلائل) کی وجہ سے وہ اس کی ابتدا کی نشاندہی نہیں کر سکا۔ زرتشت' انبیائے بنی اسرائیل کا ہمسفر ساتھی ہے' جو بالکل ان ہی کی روش کے مطابق اور انہی کے عقائد کو عوام میں روشناس کرتا ہے (گویا کنعانی کتبات کی ترجمانی کر رہا ہے)۔ یہ امر بہت اہم ہے کہ جرم و سزا کے عقائد یہود اور زرتشتیوں میں مشترک ہیں اور یہ کہ اوستا کے متون' ابتدا میں آرامی زبان میں لکھے گئے تھے (یہ پارتھی دور تھا) اور مابعد کے دور میں ان کا پہلوی زبان میں ترجمہ ہوا

مگر پارتھیوں کے عہد میں أہل فارس اور یہودی' آپس میں اس حد تک خلط ملط ہو رہے تھے اور تصورات کو باہم تبدیل کر رہے تھے کہ اسے محض قبائلی اتحاد تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ فی الحقیقت ایک قدیم مشترکہ قومیت تشکیل پا رہی تھی   اگر کوئی یہودی مزدکی مذہب قبول کرلیتا' تو اسے فارسی تسلیم کرلیا جاتا' ایک ایرانی اگر عیسائیت قبول کرلیتا وہ 'نسطوری' قومیت کا فرد تسلیم کرلیا جاتا۔ شمالی عراق کی آبادی ---- جو فی الواقع عرب ثقافت کی جنم بھومی ہے ---- فی الحقیقت یہودیوں اور اہل فارس پر بحصہ رسدی مشتمل ہے۔ مگر ان لوگوں کو زبان یا نسل کا کوئی احساس یا مسئلہ درپیش نہیں۔ قبل مسیح عہد میں بھی وہ ایک دوسرے کو کافر قرار دیتے تھے اور مل کر رہتے تھے۔

یہ تصور "قوم فارس" ساسانی عہد کی پیداوار ہے اور اس کا تعلق اس حقیقت سے ہے کہ عبرانی اور پہلوی زبانیں بیک وقت مردہ ہو گئیں اور دونوں قومیتوں نے آرامی کو مادری زبان کے طور پر قبول کرلیا۔ اگر ہم آریائی اور سامی نسلوں کے حوالے سے بات کریں تو تل العمران کے دور میں اہل فارس آریائی تھے۔ مگر ان کی اپنی کوئی قوم نہ تھی اور دارا کے عہد میں ان کا تعلق کسی مخصوص نسل سے نہ تھا۔ ساسانی عہد میں یہ لوگ مذہب کے معتقد تھے مگر یہ لوگ سامی الاصل تھے۔ کوئی ایسی فارسی قومیت موجود نہ تھی' جسے آریائی نسل سے کہا جائے نہ ہی ان کی کوئی تاریخ تھی' جو تین مخصوص تاریخیں ملتی ہیں' جو محض لسانی بنیادوں پر یکجا کر دی جاتی ہیں' ان میں کوئی مشترک تاریخی میدان نہیں ملتا۔

(۳)

اس بحث سے ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ اقوام کے تغیرات کی بنیاد فراہم کر سکیں اس کی روح کا ہم نے براہ راست مشاہدہ کر لیا ہے۔ اب ہم نے اقوام کی تاریخ کا داخلی بہاؤ بھی مشاہدہ کر لیا ہے یہ نہ تو لسانیاتی ہیں' نہ سیاسی اور نہ حیاتیاتی ہیں' اور اس عمل کی وجہ سے ہمیں ثقافت کے دوران اور بعد از ثقافت

کے باشندوں کے مابین مزید امتیاز کا پتہ چلتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے' جس کا ہر دور میں کسی ثقافت کی حدود میں رہنے والے باشندے' عوام الناس کے مقابلے میں نمایاں کردار کے مالک ہوتے ہیں۔ ان کی پیش رو اقوام کو میں قدیم باشندے قرار دیتا ہوں۔ یہ بھگوڑوں اور متجانس باشندوں کا اتحاد ہے' جو بغیر کسی قاعدے قانون کے ختم ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ پھر کوئی نئی ثقافت وجود میں آ جائے (مثال کے طور پر ہومر کے عہد سے قبل' عیسائیت کے آغاز سے قبل اور جرمانی دور سے قبل)۔ یکے بعد دیگرے ادوار وجود میں آئے' جن کی معین نوعیت تھی' یہ لوگ انسانی اجتماع کے درجے سے بلند ہو کر گروہی صورت اختیار کر گئے مگر اس عمل سے انسانی خصائل میں کوئی تبدیلی وجود میں نہیں آئی۔ برتری کی ایسی کیفیت مختلف ادوار میں ثمبری اور ٹیطون سے لے کر مارکومانی اور گوتھ تک سے فرینک تک بلکہ لومبارڈ اور سیکسن تک جاری رہی۔ قدیم دور کے بنی نوع انسان کے نمونے یہودیوں' اہل فارس' میں سیلوکیہ دور میں اور بحری قزاق جو نوم اور مینس میں پائے جاتے ہیں   اور کسی ثقافت کے انتشار اور تباہی کے بعد جو کچھ ظہور میں آتا ہے ---- اس کی سب سے عمدہ مثال رومن عہد کے بعد کے مصری باشندے ہیں ---- جنھیں فلاحین کا نام دیا گیا ہے۔

دسویں صدی عیسوی میں اچانک فاؤستی روح بیدار ہوئی اور اس کی بنا پر متعدد صورتیں ظہور میں آئیں ان میں سے فن تعمیر اور آرائش کے پہلو بہ پہلو انسانوں کی ایک نمایاں جمعیت سامنے آئی' جسے 'قوم' کہا گیا۔ کارولنگی سلطنت کے زیر نگیں' سیکسن' سوابی' فرینک' وزی' گوتھ' لومبارڈز بہت جلد جرمن' فرانسیسی' ہسپانوی اور اطالوی اقوام کی حیثیت سے نمایاں ہو گئے۔ (ابھی تک' شعوری طور پر' یا جان بوجھ کر یا غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر) محققین تاریخ انھیں بطور وجود بطور قدیم ثقافتوں کے افراد تصور کرتے رہے ہیں اور ان کی ثقافت کو بھی ثانوی حیثیت دیتے رہے ہیں جو ان گروہوں کی اپنی ساختہ پرداختہ تھی۔ تاریخ کی تخلیقی وحدتیں' اسی کے مطابق صرف ہندوستانی' یونانی اور رومی اور جرمن وغیرہ تھیں۔ یونانی ثقافت یونانیوں کی تخلیق تھی۔ اس لیے یقیناً" وہ طویل عرصے سے اس علاقے میں آباد ہوں گے۔ اس کے علاوہ اس ثقافت کی تخلیق کے خالقین کا سوچا بھی نہیں جا سکتا۔

اس لیے میں اس دریافت کو تاریخی لحاظ سے بے حد اہمیت کا حامل سمجھتا ہوں۔ یہ پوری قوت سے تسلیم کر لیا گیا کہ عظیم ثقافتوں کا فی نفسہ اپنا وجود ہوتا ہے' ابتدائی اور خلقی ہوتا ہے۔ ان کی بنیادیں انتہائی گہری اور روحانی ہوتی ہیں۔ اور کسی ثقافت کے باشندے متعلقہ ثقافت کے اثرات کے تحت اپنے داخلی اور خارجی مظاہر میں یکساں ہوتے ہیں۔ وہ اس ثقافت کے خالق نہیں ہوتے بلکہ اس کی پیداوار ہوتے ہیں۔ یہ اشکال جس میں کہ بنی نوع انسان کو ڈھالا جاتا ہے' اس کا ایک اسلوب متعین ہوتا ہے' جسے تاریخی اسلوب کا نام دینا چاہیے۔ یہ انسانی فکر و فن دونوں کو متاثر کرتا ہے۔ ایتھنز کے باشندے بھی ڈورکی باشندوں کی طرح ایک ثقافتی علامت ہیں۔ اسی طرح انگریز بھی مروجہ طبیعیات کی طرح ایک علامت ہیں۔ اسی طرح شمسی' مجوسی اور فاؤستی ثقافتوں کے باشندے ہیں۔ عرب ثقافت کا آغاز حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کے ساتھ ہی ہوا اور عرب باشندے اس آخری ثقافت کے نمائندے ہیں' اس کے نتیجے میں ایک ایسے عرب معاشرے کی تشکیل

ہوئی جسے اسلام نے یہود اور پارسیوں کو ایک بندھن میں باندھ دیا' اور بعد ازاں وہ ایک ہی مذہب کے پیروکار ہو گئے۔ عالمی تاریخ عظیم ثقافتوں کی تاریخ ہے اور اقوام کا وجود ایک علامتی صورت ہے جس کے تحت بنی نوع انسان کی تاریخ قضاوقدر دہرائی جاتی ہے۔

میکسیکی یا چینی' ہندی یا مصری تمام تہذیبوں میں ---- خواہ ہمارے سائنس دان تسلیم کریں یا نہ کریں ---- ایک ہی نوع کے انسان پائے جاتے ہیں جو یکساں اسلوب کی تخلیق کرتے ہیں' جو اس ثقافت کی بہار کے آغاز میں ابھرتا ہے اور اس کی وجہ سے بعض ریاستیں جنم لیتی ہیں اور اس ثقافت کے ارتقا کے تمام سفر میں وہ آخری منزل تک ثقافت کے ساتھ ہم قدم رہتا ہے۔ یہ مقاصد عام حالات کے مقابلے میں بہت اعلیٰ اور بلند ہوتے ہیں' اور اس کا مظہرا یتھنی اور سپارٹن: جرمنی اور فرانسیسی' تسین اور تسو سے زیادہ کہیں نہیں پایا جاتا اور تمام فوجی تاریخ میں آپ کو عوامی نفرت اور تاریخی نتائج کو اپنے حق میں ہموار کرنے کے بلند پایہ دعوے ملیں گے اور جونہی کوئی ایسا طبقہ جو ثقافت کے خلاف ہو' تاریخی میدان میں نمودار ہو گا' تو ہر طرف آپ کو روحانی تعلقات کا غلبہ نظر آئے گا' جس کے ساتھ ہی ظلم و ستم کا بازار بھی گرم ہو گا---- یعنی ایسے لوگوں کا غلبہ جن کا ثقافت سے کوئی داخلی تعلق موجود نہیں ہوتا---- یہ صورت حال مصری آبادیوں' چینی ریاستوں اور کلاسیکی شہری ریاستوں میں واضح طور پر نمایاں تھی۔ یہ طریق کار اتنا طاقت ور ہوتا ہے کہ اس کے اثرات ہمسایہ ریاستوں پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ روسی عہد کے کار تھیجیوں کا مشاہدہ کریں جس کا نصف کلاسیکی اسلوب اور روسی جو اپنے آپ کو اپنے کلچر کے لحاظ سے مغربی سمجھتے ہیں' اور کیتھرین کے عہد سے لے کر زاروں کے اختتام تک اسی روش پر قائم رہے۔

وہ لوگ جو اپنی ثقافت کے اسلوب کے مطابق متحد ہوئے ہیں' انھیں' اقوام' کہتے ہیں۔ یہ اصطلاح قبل از ثقافت اور بعد از ثقافت کے باشندوں پر اطلاق نہیں ہوتی۔ یہ نہ صرف جمع متکلم "ہم" کے احساس کا نتیجہ ہے' جو تمام اتحادات کے مقابلے میں مضبوط ترین انضباط کی مظہر ہے' ---- بلکہ کسی قوم کے داخلی تصورات اور مضمرات کا مظہر ہے۔ یہ اجتماعی وجود کی نہر قضاوقدر' زمان' اور تاریخ پر مشتمل ہے۔ یہ ایک ایسا باہمی رشتہ ہے' جو ہر معاملے میں مختلف اثرات قبول کرتا ہے' یعنی تمام انسانی شناختوں مثلاً نسل' وطن' ریاست اور مذہب پر مبنی ہوتا ہے۔ جیسا کہ قدیم چینیوں کے اسلوب سے کلاسیکی اسلوب مختلف تھا' لہٰذا ان کے اسالیب تاریخ بھی مختلف ہوں گے۔

وہ حیات جو قدیم باشندوں اور فلاحین بسر کرتے رہے ہیں' وہ حیاتیاتی نشیب و فراز' اور غیر منصوبہ بند اعمال' بلا مقصد وقت گزاری کا نتیجہ تھی' اور حتمی تجزیے کے مطابق ہر قسم کی اہمیت سے خالی تھی۔ صرف ان لوگوں کو ہی قوم کہا جا سکتا ہے' جن کی کوئی تاریخی اہمیت ہو۔ ہمیں اس کی وضاحت کر لینی چاہیے کہ اس اصطلاح سے کیا مراد ہے۔ آسٹروگوتھ کا انجام بہت المناک ہوا۔ لہٰذا ان کے داخلی معاملات کی کوئی تاریخ موجود نہیں۔ ان کی جنگیں اور آبادیاں غیر ضروری تھیں' اس لیے ان کی حیثیت محض افسانوی ہے۔

ان کا اختتام بھی غیر اہم تھا۔ ۱۵۰۰ ق م میں مائی سینی اور تائیرین بھی ابھی تک کوئی قوم نہ تھے' اور جو لوگ کریٹ کے منعون میں آباد تھے وہ بھی کوئی قوم نہ تھے۔ طبر-لئس پہلا شخص تھا' جس نے رومیوں کو بطور قوم تاریخی شاہراہ پر روشناس کرنے کی کوشش کی' اور ان کو سنبھالا دے کر اس شاہراہ پر واپس لے آیا۔ مارکوس اور لی آس نے صرف رومی قوم کا دفاع کیا۔ اس میدان میں واقعات تو متعدد ہوئے مگر ان کی کوئی تاریخی اہمیت نہ تھی۔ میڈ (شنواری) آڑی' اور ہون قبائل سے قبل بھی کتنے آزاد باشندے موجود تھے۔ ان کے پیش روؤں کی معاشرتی گروہ بندی کی صورت کیا تھی؟ ان کے جانشین بھی ہوں گے اور انھوں نے حکومت بھی کی ہو گی' مگر ان کی کوئی تاریخی اہمیت نہیں۔ مگر ان کے عہد کا کوئی تعین کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان کی کوئی تاریخ ہے۔ مگر ہر قوم کا زمانہ حیات متعین کیا جا سکتا ہے اور ان کی تاریخی رفتار اور توازن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے' جس کی بنیاد پر وہ تاریخی تکمیل کی طرف حرکت کرتے ہیں۔ چاؤ کے دورانیے کے آغاز سے شی ہوانگ کے دور حکمرانی تک' اور ٹرائے کی داستان سے آگسٹس تک اور سینسائی عہد سے اٹھارویں خاندان تک تقریباً" نسلوں کی تعداد ہر جگہ برابر ہی رہی ہے۔ ثقافت کا آخری دور جو سولون سے اسکندر تک گزرا یا لوتھر سے نپولین کے عہد تک سامنے آیا' اس میں صرف دس نسلیں گزریں۔ ان حدود میں حقیقی ثقافتی باشندوں کی قضاوقدر اور اس کے ساتھ ہی بالعموم عالمی تاریخ اپنی کامیابی سے ہمکنار ہو گئی۔ رومی' عرب' پروشیائی' متاخر اقوام ہیں۔ فوبائی اور جونائی کی کتنی اقوام پیدا ہو کر ختم ہو چکی تھیں اور کتنی اقوام رومیوں اور کنائیوں کی طرح جنگیں لڑ چکی تھیں؟ (تاریخ کو اس کا اندازہ نہیں)۔

مزید برآں وہ اقوام تھیں جنھوں نے شہر آباد کیے ایسے مضبوط قلعے تعمیر کیے کہ اپنے شہروں اور قلعوں کی وجہ سے عالمی شعور میں اپنا مقام تسلیم کرا لیا' مگر انھیں عالمی شہروں میں وہ تحلیل ہو گئے۔ ہر شہر جس کا عالمی تاریخ میں کوئی کردار ہے' اس کا قومی کردار بھی ہے۔ گاؤں جو صرف نسلی وحدت ہے' اسے یہ تاریخی اہمیت حاصل نہیں ہوتی۔ عظیم شہروں کو بھی اس دور میں وہ اہمیت حاصل نہیں رہی (جو یونانی کلاسیکی دور میں تھی)۔ قوم کے یہی لازمی اطوار ہیں جو اس کی شناخت کا موجب ہیں۔ ان کا ذرا سا رنگ بھی اس کی عوامی حیات کی نشاندہی کر دیتا ہے ---- ہم اس اہمیت کو بہت کم محسوس کرتے ہیں ---- ہم خود کمتیت اور تنہائی کے عذاب کو پوری طرح محسوس نہیں کرتے۔ اگر دو مختلف ثقافتوں کے درمیان پردہ آویزاں کیا جا سکے' اگر کوئی مغربی باشندہ ہندوستان یا چینی ثقافت پوری طرح سمجھ نہ سکے تو اس کا مطلب بھی یہی ہے (کہ مغرب اور مشرق کے درمیان پردہ لٹکا دیا گیا ہے) یہ اس لیے بھی زیادہ غلط ہے کہ یہ پردہ اچھی طرح سے ترقی یافتہ ثقافتوں کے مابین ہو گا۔ اقوام بھی ایک دوسری کو اسی طرح کم سمجھتی ہیں جس طرح کہ افراد ایک دوسرے سے بے خبر رہتے ہیں۔ ہر ایک دوسرے کے متعلق اپنے تخلیق کردہ تصورات کے تحت ہی اور ایسے افراد جو ایک دوسرے کو اچھی طرح سے یا گہری واقفیت کے تحت جانتے ہیں' بہت کم ہوتے ہیں' مصریوں کو تمام کلاسیکی افراد اپنے عزیز و اقارب کی طرح سمجھتے تھے۔ مگر جہاں تک یونانیوں کا آپس میں ایک دوسرے سے رابطے کا تعلق ہے' انھوں نے ایک دوسرے کو کبھی نہیں سمجھا۔ ایتھنی اور سپارٹن باشندوں کی یہ صورت بہت مشہور ہے۔ جرمنی' فرانسیسی' اور انگریزی فلسفیانہ کیفیات فکر نمایاں ہیں۔ نہ صرف بیکن' ڈیکارٹیز'

اور لبنیز کی صورت میں بلکہ آغاز تعلیمات ہی سے یہ فرق چلا آ رہا ہے ۔ اب بھی جدید طبیعیات اور کیمیا میں' سائنسی طریق کار میں تجربات اور مفروضات کے انتخاب میں ان شعبہ جات کے باہمی روابط میں' ان کے مقاصد اور تحقیق کے طریق کار میں نمایاں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ جرمنی اور فرانسیسی نیکی' انگریزی اور ہسپانوی معاشرتی اخلاقیات' اس قدر مختلف ہیں کہ عام آدمی اور اس کے متعلق عوامی رائے جو ہر معاشرے میں مختلف فیہ ہی ہوتی ہیں' کوئی بھی معاشرہ کسی دوسرے معاشرے کو پوری طرح سے نہیں جانتا اور ہر قوم دوسری قوم کے متعلق غلط تصورات رکھتی ہے۔ رومی سلطنت میں لوگ ایک دوسرے کو سمجھنے لگے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کلاسیکی شہروں میں کوئی اہم شے موجود نہ رہی تھی' جب باہمی الہام و تفہیم کی صورت پیدا ہوئی تو یہ انسانیت نوازی اقوام میں زندہ نہ رہی اور اس لیے تاریخ کا حصہ بھی نہ رہی

اس تجربے کی گہرائی میں جانے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی ثقافت کا ہر باشندہ یکساں مہذب نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہر قوم میں مختلف درجات کے لوگ ہوتے ہیں۔ ابتدائی انسانوں میں ہر شخص میں یکساں گروہی احساس پایا جاتا تھا۔ مگر اپنی ذات کے متعلق شعور کی بیداری کی وجہ سے یہ جذبہ ختم ہو گیا۔ اس کی جگہ ہر قوم میں ہر شخص کا ایک مقام متعین ہونے لگا۔ بعض افراد قوم دوسروں پر غالب آ گئے اور اپنے تجربے کی بدولت حکمرانی کرنے لگے گویا ہر قوم کی تاریخ میں صرف اس کی ایک اقلیت کو نمائندگی ملتی ہے۔ آغاز عروج میں صرف شرفا ہی کو یہ امتیاز اور سعادت حاصل ہوتی ہے کہ انھیں سبد گل قرار دیا جائے۔ وہ عروق حیات' جن میں قومی کردار رواں دواں ہوتا ہے' جو اس کی کائناتی نبض میں بہت زیادہ محسوس ہوتا ہے ---- اسی سے اس کو اپنے مقدر کا اسلوب ملتا ہے۔ "ہم" سے مراد وہ سرداروں کی جماعت ہے جس نے مصر کے جاگیردارانہ نظام میں فروغ پایا۔ یہی صورت بارھویں صدی میں چین اور ہندوستان میں تھی۔ ہومر کے ہیرو "دانائی" تھے' اور نارمن سرداروں کا تعلق انگلستان سے تھا۔ کئی صدیوں بعد سینٹ سائمن ---- جو حقیقت میں ایک قدیم فرانسیسی مظہر تھا ---- کہا کرتا تھا کہ دنیا کی ہر شے فرانس ہی ہے۔ اسے بادشاہ کے قریب ترین رہائش دی گئی۔ اور ایک وقت ایسا بھی تھا جس میں روم اور رومی مجلس کو یکساں تصور کیا جاتا تھا اور قصبے میں ایک وقت ایسا بھی آیا جبکہ کسی قصبے کا شہری ہونا ہی قومیت کی علامت قرار پایا اور (جیسا کہ عقلیت پسندی کی ترقی سے ہمیں امید رکھنی چاہیے) قومی شعور شرفا کے گھرانوں میں جنم لیتا ہے اور تکمیل پاتا ہے۔ ایک خاص طبقہ ہی ہوتا ہے' جو عمدہ ماحول میں پرورش پاتا ہے اور قوم کا نام لے کر زندہ رہتا ہے۔ اس کا احساس اور عمل اسے یہ سکھا دیتا ہے کہ موت کو کس طرح قبول کرنا ہے' مگر ایسے حلقے روز افزوں وسعت اختیار کرتے جاتے ہیں۔ اٹھارھویں صدی میں قومیت کا تصور پیدا ہوا۔ (جیسا کہ بعد میں پوری قوت سے اس تصور کو تحفظ فراہم کیا گیا) اور جسے ہر شخص نے نہ صرف قبول کیا بلکہ اس کے دفاع کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دی۔ فی الحقیقت جیسا کہ ہمارے علم میں ہے' نقل مکانی کر کے آنے والے بھی اس تصور کے اتنے ہی پرجوش حامی تھے' جتنی کہ مقامی آبادی۔ جس کا تعلق جیکوبین سے تھا' وہ اپنے آپ کو فرانسیسی قوم ہی کا ایک حصہ سمجھتے تھے۔ ایک ثقافتی قوم کا جو ہر شے اور ہر شخص سے متعلق ہو کوئی وجود نہیں رکھتی۔ یہ صورت صرف ابتدائی انسان یعنی فلاحین ہی میں ممکن تھی' اور یہ بطور قدر مشترک تاریخ کی گہرائیوں میں ہی پائی جاتی ہے۔ جب تک کہ عامتہ الناس قوم کی شکل اختیار نہ کر لیں' اس وقت تک تاریخی ضروریات کی

تکمیل کے لیے حکمران اقلیت ہی زیر بحث رہے گی۔

(۴)

کلاسیکی دور میں اقوام' اپنی ثقافت کی جامد اقلیدسی روح کے مطابق بالکل چھوٹی چھوٹی مادی وحدتیں تھیں۔ یہ یونانی یا آئی عونی تو نہ تھے جن کو قوم کہا جاتا بلکہ ہر شہر میں بالغ افراد کا ایک گروہ' قانونی طور پر یا کسی ہیرو کے گروہ کی حیثیت سے موجود تھا' جس نے ماضی میں کسی گاؤں پر قبضہ کر لیا تھا' یا ان مغلوب دیہاتیوں نے مجتمع ہو کر کوئی شہر بسا لیا تو اس میں غالب افراد طبقہ اولیٰ قرار پائے اور مغلوب طبقہ ادنیٰ یعنی غلاموں کی حیثیت سے رہنے لگا ۔ قدیم دور کا پراسرار اتحاد جس میں کہ دیہاتی آبادی اپنے دیہات سے دست بردار ہو جاتی ہے اور لوگ پھر ایک قصبے کی شکل میں مجتمع ہو جاتے ہیں' ایک ایسے لمحے تک پہنچ جاتے ہیں' کہ انھیں شعور ذات حاصل ہو جاتا ہے۔ ہم آج بھی اندازہ کر سکتے ہیں کہ کس طرح ہومر کے دور سے لے کر آج تک اقوام اپنا وجود حاصل کرتی رہی ہیں اور کس طرح وہ اپنی آبادیوں کے دور نو کا آغاز کرتی ہیں ۔ یہ صورت کلاسیکی ارفع علامتی نظام کے مشابہ ہے جس میں ہر گروہ اپنی شناخت کا حامل تھا کہ جسے دیکھا اور شمار کیا جا سکتا تھا مگر یہ صورت جغرافیائی وقوع کے سراسر خلاف تھی۔

کلاسیکی تاریخ میں اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ اطالیہ کے اٹروسکی لسانی یا جسمانی مضبوطی کے باعث بحری قزاقوں کے ساتھ اس نام کے حصول کے اہل تھے یا نہیں یا ہومر کے زمانے سے قبل دانائی اور پیلا سگی میں کیا رشتہ تھا اور اس کے بعد ڈورک یا یونانیوں کے مابین کیا تعلق تھا۔ اگرچہ ۱۱۰۰ ق م کے قریب ڈورک اور ایٹروسکی قدیم باشندوں میں شمار ہوتے تھے۔ (جیسا کہ اس کا امکان ہے) اس کے باوجود ایک ڈورک یا ایٹروسکی قوم کا کبھی کوئی وجود نہیں تھا۔ ٹسکنی اور پیلوپونیز میں صرف شہری ریاستیں تھیں۔ وہی اقوام سمجھی جاتی تھیں۔ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا مگر ان میں وسعت کبھی نہیں آئی۔ روم کی ایٹروسکی جنگیں ہمیشہ ایک یا زائد شہروں کے خلاف لڑی جاتیں اور کبھی کبھی اہل فارس یا کار تھیج کے خلاف جو اقوام کی حیثیت کی حامل تھیں۔ ان کے مقابلے میں جو لوگ آئے وہ اسی یعنی شہری ریاستوں کی نوعیت ہی کے ہوتے۔ یونانیوں اور رومیوں کا ذکر جیسا کہ اٹھارھویں صدی کے محققین نے کیا اور ہم ابھی تک کر رہے ہیں' درست نہیں۔ یونانیوں کو ایک قوم کہنا ایک غلط تصور ہے ---- یونانی خود بھی کسی ایسے تصور سے آشنا نہیں تھے۔ ہیلن کے عرفی نام سے جو ۵۰۰ ق م میں اختیار کیا گیا' کوئی قوم مراد نہ تھی' بلکہ اس سے کلاسیکی ثقافت کے باشندوں کا ایک گروہ مراد تھا' جو متعدد اقوام کا مجموعہ تھا اور وحشی اقوام کے مقابلے میں ایک اتحاد تھا۔ رومی تو صرف شہری آبادیوں پر مشتمل تھے' انھیں کسی ریاست کے وجود کا کوئی شعور ہی نہ تھا اور نہ ہی وہ نسلی معاشرے کے قائل تھے اور یہ ایک ایسی سلطنت تھی جس میں نسلی عنصر کی جگہ مزید بیشتر عوامل سے قوم تشکیل پاتی ہے' انھوں نے ایک ایسا جمہوری نظام رواج دیا جس میں کہ اپنے زیر اقتدار قدیم نسلوں کے تمام باشندوں کو ہر اعتبار سے اپنی سلطنت کا حصہ بنا لیا بامر مجبوری قومی احساس رفتہ رفتہ ختم ہو گیا اور

اس کے ساتھ ہی کلاسیکی تاریخ کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

یہ مورخین کا فرض منصبی ہے اور فی الحقیقت ایک انتہائی مشکل فریضہ ہے کہ گم شدہ کلاسیکی نسلوں کو تلاش کر کے ان کی علیحدہ علیحدہ نشاندہی کرے۔ یہ متاخر کلاسیکی عہد کی اقوام مشرقی بحیرہ روم کے علاقوں میں منتشر ہیں۔ یہی دور تھا جس میں کہ نئی اقوام یعنی مجوسیوں نے بھی اپنی قومی روح کا مظاہرہ کیا۔

مجوسی قوم اپنی نوعیت میں ایک ہم اعتقاد باشندوں کا معاشرہ ہے' ایسے افراد کا اجتماع جو نجات کا درست راستہ جانتے ہیں اور داخلی طور پر بذریعہ اجماع ایک دوسرے سے باہم متفق ہیں شہریت کے لحاظ سے تو یہ لوگ کلاسیکی قوم سے تعلق رکھتے تھے' لیکن مذہبی رسوم پر عمل کے لحاظ سے یہ لوگ مجوسی تھے۔ یہودی ختنے کی رسم پر عمل کرتے تھے اور عیسائیوں کا اصطباغ پر یقین تھا۔ مجوسیوں کے نزدیک منکرین کی وہی حیثیت تھی' جو کلاسیکیوں کے نزدیک اجنبیوں کی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی سلام' کلام یا ازدواجی تعلق جائز نہ تھا اور اقوام میں علیحدگی کا یہ تصور فلسطین میں اس قدر عام ہو گیا کہ یہودیوں کی آرامی زبان اور عیسائیوں کی آرامی پہلو بہ پہلو مروج ہو گئیں۔ فاؤستی اقوام اگرچہ لازمی طور پر مذہب کی بنیادوں پر ایک دوسری سے منسلک ہیں' مگر عقائد کی صورت میں ایسا کوئی اتحاد موجود نہیں۔ کلاسیکی قوم مسلک کے لحاظ سے متحد نہ تھی۔ مگر مجوسی اقوام اپنے مختلف مذہبی فرقوں (مسالک) سے ذرہ بھر بھی ادھر ادھر نہیں ہوتیں۔ داخلی طور پر کلاسیکی قوم' شہروں سے منسلک ہے اور مغربی اقوام ارضی خطوں کے تحت مگر عرب نہ تو مادر وطن اور نہ مادری زبان کو قوم کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ بظاہر تو یہ ایک عالمی تناظر ہے' مگر اس کے اظہار کے لیے ایک نمایاں رسم الخط ضروری ہے' جو ہر قوم اپنے آغاز ہی میں مرتب کر لیتی ہے۔ مگر اسی باعث داخلیت اور پوشیدہ قوت ---- فی الحقیقت جادو ---- فاؤستی اقوام مجوسی اقوام کے نظریہ قوم اور اس کے احساس سے متاثر تو ضرور ہوتے ہیں مگر وہ قوم بغیر وطن کے تصور کو ایک معمہ اور پر اسرار سمجھتے ہیں۔ یہ خود حفاظتی خاموش اتحاد (جیسا کہ یہودیوں نے مغربی اقوام کے امکان میں قائم کر رکھا ہے) رومی قانون میں بھی سرایت کر گیا (اس کا لیبل تو کلاسیکی تھا' مگر یہ آرامیوں کا تیار کردہ تھا) عدالتی افراد کا تصور جو مجوسی تصور معاشرہ سے قطعاً مختلف نہیں۔ یہودیوں کے اخراج وطن کے بعد بھی یہودیت کی عدالتی حیثیت برقرار رہی اور اس واقعے سے بہت پہلے بھی لوگ اس قانونی صراحت سے آشنا تھے۔

وہ قدیم باشندے جو اس ارتقا سے قبل محض قبائلی زندگی بسر کرتے تھے' ان میں جنوبی عرب کے منائین بھی شامل تھے جو ایک ہزار سال قبل مسیح کے دوران نمودار ہوئے پھر جلد ہی (پہلی صدی ق م میں) میدان سے غائب ہو گئے یہی صورت آرامی بولنے والے کلدانیوں کی تھی' جو اسی طرح ایک ہزار سال قبل مسیح اچانک ظاہر ہوئے اور ۶۵۹ سے ۵۳۹ ق م تک بابل پر حکومت کرتے رہے۔ اسی طرح اسرائیلی بھی اخراج سے قبل اور ایرانی سائرس بھی اپنے جذبات پر اس شدت سے بضد تھے کہ اس کے بعد پجاریوں کا جو نظام قائم ہوا سکندر اعظم کے بعد بھی انھیں قبائل کے گم گشتہ یا فرضی ناموں سے موسوم کیا

گیا۔ یہودیوں جنوبی عرب کے سبائین انھیں لیوطی کہا جاتا' مگر میڈ اور اہل فارس انھیں ماگی کہتے (جو ایک ختم شدہ قبیلے کا نام ہے) اور نئے بابلی مذہب کے پیروکار انھیں کلدانی کہتے (یہ بھی ایک منتشر قبائلی گروہ کا نام تھا) مگر یہاں بھی جیسا کہ دوسری ثقافتوں میں دیکھا گیا ہے قومی اتفاق رائے کی توانائی نے' قدیم آبادی کی قبائلی نظام پر قائم تمام انتظامیہ کو ختم کر دیا جیسا کہ کثیر رومیوں نے اور بلاشبہ فرانسیسیوں نے سالیان فرانک اور قدیم رومانوی سیلٹی باشندوں کو' مقامی آبادی کے ساتھ سلوک کیا۔ اسی طرح مجوسی آبادی میں بھی اپنا قدیم نسلی تصور ختم ہو گیا اور میکابی یہودیوں کا طریق کار بہت طویل تھا۔ قبائل ابھی تک اپنے آپ کو یہودی میکابی عہد کے ساتھ منسلک کرتے ہیں اور عرب خلیفہ اول کے ساتھ۔ مگر داخلی طور پر اس دنیا کے ثقافتی باشندے مثلاً" تالمود دور کے یہودی' اب اس نسبت میں کوئی معانی نہیں پاتے' وہ شخص جو ایمان رکھتا ہے وہ ہم قوم بھی ہے۔ کوئی اور امتیاز کفر سمجھا جائے گا' بلکہ کسی اور امتیاز کو تسلیم کرنا بھی الحاد ہے۔ قدیم عیسائی عہد میں شہزادہ اڈیابین' اپنی رعایا کے ہمراہ یہودی ہو گیا اور اس عمل کی وجہ سے ان تمام کو یہودی قوم میں شامل کر لیا گیا۔ یہی اصول آرمینیا اور کاکینیا کے قبائل پر صادق آتا ہے۔ یہ لوگ اسی زمانے میں بڑے پیمانے پر یہودیت میں داخل ہو گئے ہوں گے اور اس کے مخالف سمت میں عرب کے بدو' جنوب کی آخری حد تک بلکہ ان سے بھی آگے افریقی قبائل جھیل چاڈ تک اسلام میں داخل ہو گئے (۳۷)۔ اس صورت میں بظاہر ایک مشترکہ قومی احساس کا پتہ چلتا ہے اور نسلی امتیاز کے باوجود یہ لوگ ایک قوم میں منسلک نظر آتے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ آج بھی یہودی اپنے مابین متعدد نسلوں کو شناخت کر سکتے ہیں' اور اس کے لیے انھیں زیادہ چھان بین نہیں کرنا پڑتی بلکہ پہلی نظر میں ہی وہ شناخت میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور یہ بھی کہ مشرقی یورپ کی یہودی آبادیوں میں قبائل (عہدنامہ عتیق کے مفہوم کے مطابق) واضح طور پر شناخت کیے جا سکتے ہیں۔ مگر ان میں کسی میں بھی قومی اختلاف کا شائبہ موجود نہیں۔ وون ارک کے مطابق مغربی یورپ کے یہودی اب تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور غیر یہودی کاکیشائی باشندوں کی اقوام میں بھی شامل ہیں' جبکہ ویزن برگ کے مطابق جنوبی عرب کے لیے سروں والے یہودیوں میں یہ خیال موجود نہیں۔ جہاں پر کہ سبائی قبر ---- پیکر اس نوعیت کا دستیاب ہوا ہے جسے رومن یا جرمن کہا جا سکتا ہے۔ وہ ان یہودیوں کا مورث اعلیٰ ہے جنھیں مبلغین کی کوشش کے تحت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے قریب العہد میں تبدیلی مذہب پر آمادہ کیا گیا تھا۔

قدیم قبائل میں یہ تصور کہ وہ مجوسی مذاہب اختیار کر لیں اور ایرانی یہودیوں مالنوئیوں اور عیسائیوں وغیرہ میں شامل ہو جائیں' بہت بڑے پیمانے پر اور فوری طور پر پیدا ہوا۔ میں نے پہلے بھی آپ کی توجہ اس طرف منعطف کرائی ہے کہ عیسائی تقویم کے آغاز سے بہت قبل اہل فارس ایک مذہبی معاشرے کے مقلد تھے اور جب انھوں نے مزدکی مذہب قبول کر لیا' تو ان کی تعداد میں مزید اضافہ ہو گیا' اور اس دور میں بابلی مذہب صفحہ ہستی سے مٹ گیا---- جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ماننے والوں کا ایک حصہ یہودی ہو گیا اور باقی نے ایرانی مذہب قبول کر لیا ---- مگر اس صورت حالات میں ایک نیا مذہب بھی وجود میں آ گیا جو داخلی طور پر یہودیوں اور ایرانیوں دونوں کے لیے اجنبی تھا۔ ستارہ پرستی کا مذہب' جسے کلدانی مذہب کا نام دیا

جاتا ہے۔ اس آرامی آبادی میں سے کلدانی' یہودی' اور فارسی قومیت کا وجود عمل میں آیا۔ اولیں طور پر بابل کے تالمود' غناسطی' مانوی' اور بعد ازاں اسلام کے دور میں صوفیا اور شیعہ عقائد کے لوگوں نے ایران میں رواج پایا۔

مزید برآں جیسا کہ اڈیسا میں دیکھنے میں آیا کلاسیکی دنیا کے باشندے بھی مجوسی نوعیت کی اقوام میں تبدیل ہو گئے۔ مشرقی زبانوں میں یونانی سے مراد وہ لوگ ہیں' جو تلیفتی عقائد کے پیروکار ہوں اور متاخر کلاسیکی مذہب کے اجماع کے باعث باہم متحد ہوں۔ اس عہد میں یونان کی شہری اقوام منظر سے ہٹ چکی تھیں۔ جس کا مطلب ہے کہ عقائد کے لحاظ سے صرف ایک قوم باقی رہ گئی تھی جو پراسرار قوتوں کی پرستش کرتی تھی جو "ہیلی اوس' جیوپیٹر یا متھرا" کے ناموں سے یاہوے یا اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ تمام مشرق میں یونانیت سے مراد ایک معین مذہبی تصور تھا اور اس لحاظ مکمل طور پر ان حقائق کے مطابق جو اس دور میں مروج تھے' شہری ریاستوں کا تصور تقریباً" ختم ہو چکا تھا اور مجوسی تصور میں کسی قوم کے لیے وطن اور نسل دونوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سیلوکس سلطنت میں یونانیت نے ترکستان اور سندھ کی وادی میں اپنے معتقد بنا لیے۔ یہ مسلک ایرانیوں اور وطن سے خارج کردہ یہودیوں سے ملتا جلتا تھا۔ بعد ازاں آرامی فرفور یئس نے جو افلاطینس کا شاگرد تھا' یونانیت کو عیسائیوں یا اہل فارس کی طرح کلیسائی تنظیم کی شکل دینا چاہی اور شاہ جولیئس نے اسے سرکاری مذہب قرار دیا۔ یہ عمل نہ صرف مذہب سے متعلق تھا' مگر سب سے بڑھ کر قومی بھی تھا۔ جب کوئی یہودی سول یا شمس کی قربانی دیتا' تو اسے یونانی ہونے کا درجہ مل جاتا۔ مثال کے طور پر اموني اس سکاس (وفات ۲۴۲) جو افلاطینس کا استاد تھا' اور غالباً" اوری گان بھی اس کا شاگرد تھا' وہ عیسائیت سے منحرف ہو کر یونانیت کا پیروکار بن گیا' اور اسی طرح مذہب تطبیق کا پیروکار جو مالکوس کی حیثیت سے پیدا ہوا (اور رومی جج اہمیان کی طرح)۔ نسلاً" فونیقی تھا اور ٹائر کا رہنے والا تھا۔ اس دور میں عدالتوں اور سرکاری محکموں کے عہدے دار لاطینی بولتے اور فلسفی اور علما اپنے نام یونانی رکھتے ---- جدید لسانیاتی تحقیقات میں ان افراد کو رومی' یونانی یا کسی کلاسیکی شہری ریاست کا باشندہ قرار دینا ایک مشکل امر ہے۔ اسکندر اعظم کے عہد میں متعدد ایسے یونانی ہوں گے جنھیں مجوسی اصطلاح کے مفہوم کے مطابق ہی یونانی کہا جا سکتا ہے۔ کیا ولادت کے لحاظ سے افلاطینس اور دائیو فینفلس یہودی یا کلدانی نہ تھے؟

عیسائی بھی آغاز ہی سے اپنے آپ کو مجوسی الاصل قوم سمجھتے تھے اور مزید برآں یونانیوں کو کافر قرار دیتے تھے' اور یہودیوں کو بھی ایسا ہی سمجھتے تھے۔ بالکل منطقی طور پر یہودی اپنے مذہب کے ترک کو کفر گردانتے تھے' اور اسے مذہب سے بغاوت سمجھتے تھے اور ان کی یونانی شہروں میں تبلیغ کو بھی حملہ اور فتح قرار دیا جاتا تھا جبکہ عیسائی بھی اپنے علاوہ دیگر مذاہب کے لوگوں کو الگ قوم یا کافر قرار دیتے تھے۔ جب یک طیعتی اور سطوری عیسائی الگ الگ ہو گئے اور قدیم مسلمہ عقائد کو ترک کر دیا تو متعدد نئی اقوام اور نئے کلیسا وجود میں آ گئے۔ ۱۴۵۰ سے لے کر نسطوری مار شمعون کی زیر نگرانی رہے ہیں' جو کسی دور میں ایک شہزادہ اور سلطان تھا اور بیک وقت مذہبی رہنما بھی تھا اس کی حیثیت ویسی ہی تھی جیسا کہ قدیم یہودیوں

میں ریش گلوتھا کی تھی۔ اس قومی شعور نے عالمی احساس کو تقسیم کر دیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر زمانہ مابعد میں عیسائیوں پر مظالم کا تجزیہ کرنا ہو تو اولین دور کے معاملات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ مجوسی ریاست قدیم تصورات کی پابند ہونے کی وجہ سے تقسیم نہیں ہو سکتی۔ خلافت' قوم' کلیسا داخلی وحدت کا کام دیتے ہیں۔ یہ ریاست ہی کا تصور تھا کہ اڈیابین نے یہودیت اختیار کر لی' اوسرہوئین (۲۰۰ء) (کتنا جلد) نے یونانیت کو ترک کر کے عیسائیت اختیار کر لی۔ چھٹی صدی میں آرمینیا یونانی گرجے سے یک وحدتی کلیسا کا پیروکار ہو گیا۔ ان میں سے ہر ایک واقعہ اس امر پر روشنی ڈالتا ہے کہ ریاست اور قدیم مذاہب میں یکسانیت پائی جاتی تھی اور ہر شخص اسے تسلیم کرتا تھا' اگر عیسائی مسلمان حکومتوں کے زیر نگیں رہتے تھے' نسطوری فارس میں' یہودی بازنطیہ میں تو ان کی حیثیت کفار کی نہ تھی' اور وہ سب اپنی فقہ پر عمل کرتے تھے۔ ان کو صرف اسی صورت میں تکلیف دی جاتی جبکہ ان کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا' یا ان کی یا ان کی مخالف قوتوں کی تبلیغی سرگرمیاں ناقابل برداشت ہو جاتیں' اور اس سے ان کے وجود کو خطرہ لاحق ہوتا یا ریاست کی شناخت نسل قرار پاتی اور اس تعصب کی بنا پر ان کو تکلیف پہنچتی' یا حکومت اور قوم کی طرف سے ایذا رسانی عام دستور اور فریضے کی صورت اختیار کر لیتی' اسی صورت حالات کے تحت تقلید پرست (یا یونانی) اور بعد میں نسطوری عیسائی ایرانی سلطنت میں مصائب کا شکار ہوئے۔ دائیو قلیلی جس نے اپنے آپ کو خلیفہ سمجھنا شروع کر دیا تھا (مختار کل بلا شرکت غیرے) اور اپنی حکومت کا ملحدین کے دوسرے کلیسا سے رابطہ استوار کر لیا تھا اور انتہائی خلوص سے عیسائیت پر ایمان رکھنے والوں کا کماندار بن گیا تھا۔ اس نے بعد میں دوسرے کلیسا کو دبانے کا فریضہ بھی اپنے اوپر عائد کر لیا تھا۔ قسطنطین نے صحیح کلیسا کو بدل دیا اور اسی عمل کے تحت بازنطینی سلطنت کی قومیت بھی بدل دی۔ اس واقعہ کے بعد عیسائیوں کو یونانی کہا جانے لگا اور بالخصوص اس عیسائی قوم کو' جسے بادشاہ نے اپنے حلقے میں شامل کر لیا تھا اور انھیں عظیم مجلس میں بیٹھنے کی اجازت دے دی تھی۔ لہٰذا بازنطینی تاریخ کی غیر یقینی حالت کا آغاز ہو گیا۔ ۲۹۰ میں یہ کلاسیکی سلطنت مزاج کے لحاظ سے ایک مجوسی حکومت بن گئی اور ۳۱۲ میں قوم کا نام تبدیل کیے بغیر ایک نئی قومیت وجود میں آ گئی۔ کفر نے اپنے لیے یونانی کا نام اختیار کر لیا اور بعد میں اسی نام کی قوم کی حیثیت سے اسلام کے خلاف جنگ شروع کر دی گویا یہ عیسائیت اور اسلام کی جنگ تھی۔ بعد میں اسلام بھی ایک قوم کی حیثیت سے ابھرا (اگرچہ ابتدائی مسلمان عرب تھے)۔ ان واقعات کی بدولت قومیت کا احساس زیادہ سے زیادہ ہوتا گیا لہٰذا یہ کہنا چاہیے کہ زمانہ حال کے یونانی مجوسی ثقافت کی پیداوار ہیں' جس کی تشکیل پہلے عیسائی کلیسا نے کی۔ اور بعد میں اسی چرچ کے نام پر شہرت حاصل کی (گریک آرتھوڈاکس چرچ)۔ اسلام جو حضرت محمد ﷺ کے گھر یعنی عرب سے نمودار ہوا' اپنے ساتھ اپنی قوم بھی لے کر آیا' یہ ایک غلطی ہو گی کہ اسلام کو بدویت سے منسوب کیا جائے۔ (یعنی ان بدو قبائل سے جو صحرا میں رہتے تھے)۔ وہ عوامل جنھوں نے نئی قوم کی تشکیل کی وہ جذباتی انداز اور مضبوط روحانی کردار تھا اور اہل اسلام کے اتحاد فکر (اجماع امت) کا مظہر تھا' اس میں اتحاد کی بنیاد نسل یا وطن نہیں جیسا کہ عیسائیوں' یہودیوں اور ایرانیوں میں تھی۔ لہٰذا اس کی مکانی منتقلی کو نقل مکانی یا ترک وطن کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ لہٰذا اس کی قوت کا انحصار آبادی کے انتقال پر نہ تھا بلکہ اس کی توسیع کی بہت بڑی وجہ مجوسی اقوام کا قبول اسلام تھی۔ ایک ہزار سال عیسوی کے خاتمے تک ان

اقوام کی بڑی تعداد فلاحین میں شامل ہو گئی اور فلاحین کی اصطلاح بلقان کے عیسائیوں نے ترک حکومت کے تحت پارسیوں نے ہندوستان میں اور یہودیوں نے مغربی یورپ میں اختیار کر رکھی ہے(۴۰)۔
مغرب میں فاؤستی نوعیت کی اقوام نمودار ہوئیں اور (۷۳-۹۳۶) آٹو کے عہد کے دوران زیادہ سے زیادہ نمایاں ہوتی چلی گئیں اور ان میں شامل کارولنگی دور کے قدیم باشندے بہت جلد تحلیل ہو گئے۔ ۱۰۰۰ء تک ایسے لوگ جن کی اہمیت بہت زیادہ تھی وہ ہر مقام پر بطور جرمن' اطالوی' ہسپانوی' اور فرانسیسیوں کے منقسم ہو گئے۔ یہ وہی لوگ تھے جو چھ نسلیں قبل فر۔ینکز' لمبارڈز' اور وزی گوتھ کہلاتے تھے۔

اس ثقافت میں قوم کی ہیئت' رومی فن تعمیر کی طرح احصائے صفاری پر مبنی ہے اور لامتناہیت کے رجحان کی طرف مائل ہے' مادی اور روحانی لحاظ لا محدود ہے۔ آغاز میں قومی احساس جغرافیائی اور ذریعہ اظہار و ابلاغ سے متعلق ہوتا ہے' جس کی مثال کسی اور ثقافت میں نہیں ملتی۔ مادر وطن کی حدود کا تعلق ایک خطے سے ہے' ان حدود کو بیشتر افراد نے کبھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا' مگر وہ ان کا دفاع کرتا ہے اور ضرورت پڑے تو ان کے لیے جان بھی دے دیتا ہے۔ یہ علامتی گہری محبت ایسی نوعیت کی ہے جسے دوسری ثقافتوں کے لوگ محسوس نہیں کر سکتے۔ مجوسی تصور قوم ارضی حدود کو تسلیم نہیں کرتا نہ اس کا کوئی کلاسیکی ثقافت میں ارضی تعلق کو مرکز ثقل سمجھا جاتا تھا۔ یہ حقیقت کہ رومی دور میں بھی اتحاد انسانی دریائے ایڈج کی وادیوں کی آبادی اور لتھوانیا کے قلعوں کے مابین اتحاد قدیم زمانے میں ناقابل تصور تھا' بلکہ چین اور مصر میں بھی یہ تصور موجود نہ تھا اور روم اور ایتھنز کے مقابلے میں یہ تصور برعکس تھا' یہاں تو جمہوریت کا ہر رکن ایک دوسرے پر گہری نظر رکھتا تھا۔

زمانی فاصلے احساس کے لحاظ سے اس سے بھی زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ پدر وطن کا یہ تصور (جو قوم کے وجود کا نتیجہ ہے) اگر کبھی موجود بھی تھا' تو اس کی بدولت ایک اور تصور وجود میں آیا' جس کے فاؤستی ثقافت کے لوگ ذمہ دار ہیں۔ "خاندانی سلسلوں کا تصور" فاؤستی لوگ اپنی تاریخ رکھتے ہیں' ایسی قومیتیں بھی موجود ہیں جن کا اتحاد اجماع عوام کی بدولت نہیں بلکہ تاریخی بنیادوں پر قائم ہے اور ان کا مجموعی مقدر حکومت وقت کا مرہون منت ہے۔ مصریوں اور چینیوں کے نزدیک خاندانی سلسلوں کی علامت کے معانی مختلف ہیں۔ اس میں جس چیز کی نشاندہی ہوتی ہے وہ عزم اور فعالیت دونوں صورتوں میں اس کا تعلق زمان سے ہے۔ وہ جو کچھ کہ ہم تھے یا جو کچھ کہ ہم ہوں گے اس کا تعلق صرف ایک نسل سے ہے اور ہماری عزت و افتخار کی منزل اس وقت دھڑام سے زمیں بوس ہو جاتی ہے' جب سربراہ معاشرہ نکما ثابت ہو۔ اہمیت فرد کی نہیں بلکہ تصور کی ہے' اور یہ صرف تصور ہی کی بنا پر ہوتا ہے کہ ہزاروں لوگ نسبی جنگوں میں شمولیت اختیار کر کے جان کا نذرانہ پیش کر دیتے ہیں۔ کلاسیکی تاریخ صرف کلاسیکی نقطہ نظر کے تحت ہی لکھی گئی لمحہ بہ لمحہ واقعات کا ایک سلسلہ اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مجوسی تاریخ صرف اس کے ارکان ہی کے لیے تھی۔ تدریجی حقیقت جو انسان کے متعلق عالمی منصوبے کے تحت لکھی گئی یہ منصوبہ خود خدا کا تیار کردہ تھا جو مخلوق کے سیلاب کا بہاؤ طے کرتا تھا مگر فاؤستی تاریخ' ہماری نظر میں عظیم کامرانیوں کی ایک داستان ہے جسے حکمرانوں نے اپنے عزم اور شعوری افعال کے ذریعے حاصل کیا۔ یہ نسلی اوصاف اور روایات کا مجموعہ ہے' اس لیے اس کی بنیاد کا معقولیت پر مبنی ہونا ممکن

نہیں۔ صرف اسے معقول محسوس کیا جاتا ہے اور چونکہ ایسا محسوس کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس پر اعتماد بھی کیا جاتا ہے۔
مثلاً" جرمنوں کی نقل مکانی کا زمانہ' جسے گوتھوں کے جاگیرداری نظام سے منسلک کر دیا گیا' یاروق کی وفاداری اور انیسویں صدی میں بغیر کسی شاہی خاندان کے سلسلے کے حب الوطنی کا مظاہرہ۔ ہمیں ان واقعات کی گہرائی اور شدید احساس کے متعلق غلط فیصلوں سے بچنا چاہیے' کیونکہ دروغ حلفی کے معاملات کے مہتم افراد(...) کی مسلسل مضحکہ خیز حرکات اور درباروں سے پیوست درباریوں کی ایک طویل فہرست موجود ہے جنھوں نے غلط بیانی سے کبھی اجتناب نہیں کیا۔ تمام ارفع علامات روحانی ہیں' اور انھیں ان کی اعلیٰ ہیئت ہی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ کسی پوپ کی نجی زندگی کا پاپائیت کے اعلیٰ مقام سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ شیردل ہنری کی غداری یہ ظاہر کرتی ہے کہ ایسے وقت میں جبکہ قوم اپنے تعمیری عمل میں مصروف ہوتی ہے' تو حقیقی حکمران یہ سمجھنے لگتا ہے کہ قوم کی قضاوقدر صرف اسی کی ذات سے مخصوص ہے۔ وہ قضاوقدر کے معاملات تاریخ کے فیصلے کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔

مغرب کی تمام اقوام نسلی بنیادوں پر استوار ہیں۔ رومانوی بلکہ قدیم گوتھ کے فن تعمیر میں قدیم کارولنگی روح جاری و ساری ہے۔ فی الحقیقت فرانسیسی' جرمن اور رومی روایات کا کوئی وجود نہیں۔ یہ سالیان' ربینی اور لومبارڈ روایات ہی کا تسلسل ہے۔ وزی گوتھی (شمالی ہسپانیہ اور جنوبی فرانس) اور لومبارڈ اور رومانوی سیکسن کا سلسلہ بھی اسی نوعیت کا ہے' مگر ان سب عوامل پر جلد ہی ایک اقلیت کا غلبہ ہو جاتا ہے' جو ہم نسل افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ وہ اپنی قوم پیشہ ور سیاست کی تاریخ قائم کرتی ہے۔ یہی اقلیت صلیبی جنگوں کا باعث بنتی ہے اور ان میں فرانسیسی اور جرمن جنگ آزما شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ فاؤستی آبادی کا نقطہ عروج ہے' کیونکہ اس مقام سے وہ اپنی تاریخ کی سمت کا تعین کرتے ہیں' مگر یہ سمت بندی نسلوں کے بعد وجود میں آتی ہے۔ اس سے ایک نسلی تصور وجود میں آتا ہے جو نسلاً" بعد نسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔

ڈارون کے نظریات جن میں نظریہ توارث اور نزول بھی شامل ہیں' رومی لقابت کے سامنے مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں اور دنیا تاریخی لحاظ سے' جس میں ہر فرد ایک منصوبے کے تحت زندگی بسر کرتا ہے' اس میں ہر شخص کے پاس اپنا شجرہ نسب موجود ہے' خواہ وہ حکمران ہو یا طبقہ عوام سے ہو' بلکہ اسے اپنے گردونواح کے واقعات اور رہنے والے افراد کے خاندانی کوائف سے پوری آگاہی ہوتی ہے۔ فاؤستی نسلی اصولوں کو سمجھنے کے لیے بہت گہرے مشاہدے کی ضرورت ہے جس میں تاریخی اور نسلی مقاصد کو بھی زیر غور لانے کی ضرورت ہے (مساوات ولادت) اور خون کے خالص ہونے کے دعوے فاؤستی ثقافت کا حصہ ہیں۔ مگر چینیوں اور مصریوں میں تمام تاریخی دعوؤں کے باوجود یہ تصورات موجود نہ تھے۔ مگر رومی اور باز نطینی سلطنتوں میں ان امور کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ اس کے برخلاف ہماری دیہاتی اور شہری آبادیاں ان اوصاف کے بغیر شناخت نہیں کی جا سکتیں۔ کسی قوم کا سائنس کی بنیادوں پر تصور جس پر اوپر بحث کی گئی ہے' فی الحقیقت رومی عہد کے نسلی مزاج کی مرہون منت ہے۔ شجرہ ہائے نسب نے اطالویوں کو یہ فخر عطا کیا کہ وہ قدیم رومیوں کے جانشین ہیں اور جرمن اپنے طیوطانی مورثان اعلیٰ پر فخر کرتے ہیں اور یہ قدیم یونانیوں کے اس تصور سے بالکل مختلف ہے جس میں اپنے آپ کو ازلی اور ابدی دیوتاؤں کی اولاد سمجھتے تھے۔

اور بالآخر جب ۱۷۶۹ء میں جب خاندانی اصول میں مادری زبان بھی شامل ہو گئی' پہلے صرف ہند آریائی باشندوں کی سائنس کے اصولوں کی بات ہوتی تھی جواب بڑھ کر آریائی نسل میں منتقل ہو گئی اور اس کے نتیجے میں نسل ہی قضاوقدر یا انجام کی علامت قرار پائی۔

مگر اقوام مغرب نے عظیم اقوام کا تصور پیش نہیں کیا بلکہ ان کے نتائج تخلیق کیے تاریخی ادوار میں ان میں سے کوئی نسل بھی موجود نہ تھی کارولنگی عہد میں مغربی نسلوں کا کوئی وجود نہ تھا۔ جنگ آزمائی کے طبقاتی تصور نے جرمنی' انگلستان' فرانس اور ہسپانیہ کی عام آبادی میں یہ تاثر پیدا کیا کہ انفرادی طور پر تمام ممالک میں نسل کا تصور پیدا ہو گیا' باقی تمام لوگ (جیسا کہ قبل ازیں بھی کہا گیا ہے) اقوام کا تصور ---- اس قدر تاریخی اور اس قدر اجنبی تھا' ---- اگرچہ تمام بنی نوع انسان برابر ہی پیدا ہوتے ہیں(ہم سرو ہم رتبہ) خون کے خالص ہونے سے بھی اس کیفیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن تفریق اس لیے پیدا ہوئی کہ حکمرانوں کے خاندانوں کا خون ان کی اولاد کی قضاوقدر کا معیار ٹھہرا۔ اور اس کے نتیجے میں تمام قوم کا مقدر بھی اسی خاندان کے افراد کے ساتھ منسلک ہو گیا۔ چونکہ باروق کا نظام حکومت نسلی تشکیل پر استوار تھا' وراثت کی بیشتر جنگیں خاندانی استحقاق کے باعث ہی لڑی گئیں۔ نپولین کی تباہی کا المیہ بھی' جس کے نتیجے میں سیاسی تنظیم کا مسئلہ کم از کم ایک صدی کے لیے طے ہو گیا' اسی حقیقت پر مبنی تھا۔ اس نے ایک قدیم خاندان کو' جو قومی علامت کی حیثیت رکھتا تھا' اپنی مہم جوئی اور خون بہا کر مٹانے کی کوشش کی۔ مگر شاہی خون کے حامیوں نے اس کا دفاع ضروری سمجھا کیونکہ جتنے لوگ بھی اس کے حملے کی زد میں آئے ان کا تعلق کسی نہ کسی خاندان سے تھا' جو ان کے لیے وجہ افتخار تھا۔ پرتگال میں ایک پرتگالی قوم آباد ہے مگر پرتگالی برازیل میں بھی پرتگالی آباد ہیں۔ یہ ملک ہسپانوی امریکہ کے عین وسط میں آباد ہے اور برگنڈی کے کاؤنٹ ہنری کی مناکحت کی بنا پر ۱۰۹۵ء میں وجود میں آیا۔ سوئٹزرلینڈ اور ہالینڈ کے باشندے ہیبس برگ کے خاندان کے خلاف رد عمل کے نتیجے میں علیحدہ علیحدہ ہوئے۔ لورین کسی قوم کا نہیں بلکہ ایک علاقے کا نام ہے مگر یہ نام لوتھر دوم کے بے اولاد ہونے کے باعث اس خطے کے ساتھ منسوب ہو گیا۔

قدیم متفرق شار لمینوں کو ایک منظم جرمن قوم میں مربوط کرنے کا تصور قیصر کے ذہن کی پیداوار تھا۔ جرمنی اور جرمن سلطنت کو علیحدہ علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہو ہنس ٹافن کی شکست کا نتیجہ یہ نکلا کہ چھوٹے چھوٹے مٹھی بھر خاندانوں نے ایک بڑے خاندان کی جگہ لے لی اور جرمن باروق کی آمد سے قبل ہی داخلی طور پر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور ان کا رومی اسلوب ختم ہو گیا۔ یہی دور تھا جبکہ پیرس' میڈرڈ' لندن اور ویانہ جیسے بڑے شہروں کے دانشوروں میں قوم کا تصور جنم لے رہا تھا۔ تیس سالہ جنگ نے تاریخ کے بیان کے مطابق جرمنی کو اس کے بہار کے موسم میں تباہ کر دیا۔ مگر اصل حقیقت یہ نہیں' یہ ملک داخلی طور پر اس قدر خزاں رسیدہ ہو چکا تھا کہ یہ وقت کبھی نہ کبھی ضرور آتا۔ ہوہنس ٹافن ہی شکست کا یہ آخری اور حتمی نتیجہ تھا۔ اس دعویٰ کا کہ فاؤستی اقوام' خاندانی وحدتیں ہیں' اس سے بہتر کوئی اور ثبوت دستیاب نہیں۔ پھر سالیان اور ہوہن شافن ---- کم از کم تصوراتی طور پر ---- روم میں اطالوی قوم کی تشکیل کی جس

میں لومبارڈ اور نارمن بھی شامل تھے' صرف سلطنت ہی نے انھیں ماضی تک وسعت کا امکان پیدا کیا۔ اگرچہ اجنبی قوتوں نے شہری طبقوں میں دشمنی کو ہوا دی اور دو ابتدائی تنظیموں کو ایک دوسری سے الگ کر دیا یعنی شرفا بادشاہ کے حامی ہو گئے اور پجاری پوپ سے منسلک ہو گئے۔ یہاں تک کہ اس مناقشے میں جو گلف اور گیبی لائن کے مابین تھا' شرفا نے جلد ہی اپنی اہمیت کھو دی اور پاپائیت نے خاندان مخالف شہروں میں برتری حاصل کر لی اگرچہ بالآخر غارت گر ریاستوں نے جن کی سیاسی نشاۃ ثانیہ گوتھک سلطنت کے بڑھتے ہوئے عروج کے خلاف تھی۔ کیونکہ قدیم میلان کے فریڈرک بار بروسہ کی بڑھتی ہوئی خواہشات کی خلاف ورزی کی تھی پھر بھی اطالیہ کا تصور جس کی وجہ سے دانتے نے اپنی زندگی کا سکون برباد کر رکھا تھا' وہ عظیم جرمن شہنشاہوں کے خاندان کی تخلیق تھی۔ نشاۃ ثانیہ جس کا دائرہ کار شہری محب وطن افراد تک محدود تھا' قوم کی اپنی ذاتی خواہشات کی تکمیل کے لیے جس قدر ممکن ہو سکتا تھا' رہنمائی کی ۔ باروق روکوکو کے تمام علاقوں میں آباد لوگوں کو اس حد تک دبایا گیا کہ وہ اجنبی خاندانوں کے غلام ہو کر رہ گئے اور یہ صورت ۱۸۰۰ء کے بعد تک قائم رہی' جبکہ رومانیت کا احیا ہوا اور رومی احساسات دوبارہ بیدار ہوئے اور سیاسی قوت کی صورت اختیار کر گئے۔

فرانسیسی قوم فرینک اور وزی گوتھ قومیتوں کو مخلوط کر کے بادشاہوں نے تشکیل کی۔ بووی عہد ۱۲۱۴ء میں اس نے اپنے آپ کو ایک مجموعی معاشرے کی صورت میں محسوس کیا۔ اس سے بھی زیادہ اہم ہیبس برگ کے خاندان کی تشکیل ہے جو ایسے عناصر کے اتحاد سے وجود میں آئی جو زبان' عوامی احساس یا روایت کسی بھی لحاظ سے متحد نہ ہو سکتی تھی۔ اسے آسٹریا کی قوم بنا دیا جس نے ماریہ تھریسا کے نپولین کے خلاف اہم کردار ادا کر کے اپنے آپ کو ایک قوم ثابت کر دیا' یہی اس کی پہلی اور آخری آزمائش تھی۔ باروق عہد کی تاریخ فی الواقع باربون اور ہیبرگ خاندان کی تاریخ ہے۔ و ٹلن خاندان کا ویلف کی جگہ عروج اس کا سبب ہے کہ ۸۰۰ء میں سیکسوتی کیوں ویسر میں مقیم تھے اور آج کل وہ ایلب میں ہیں۔ خاندانی معاملات اور بالآخر نپولین کی دخل اندازی کا یہ نتیجہ نکلا کہ بوریا اور آسٹریا کی تاریخ مشترک ہو گئی اور بوریا کی ریاست فرانکونیا اور سوابیا کے بیشتر علاقوں میں مشتمل ہے۔

مغرب کی سب سے آخری ریاست پروشیا ہے' جو ہوہن زولرن کی پیدا کردہ ہے' جیسا کہ رومی ریاست یونانی کلاسیکی شہری ریاستوں کی تخلیق تھی اور عرب ایک مذہب کے اجماع کے تحت ایک متحدہ ملک قرار پایا۔ فیسبلین کے مقام پر ایک نوزائیدہ ملک نے اپنا وجود منوایا۔ روس بیچ کے مقام پر اس نے جرمنی کو شکست دی۔ گوئٹے نے اپنی چشم بینا کی قوت سے اپنی مشہور نظم کہی جس سے جرمن زبان کی شاعری میں قومی شاعری کا آغاز ہوا۔ یہ ایک اور مثال ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مغربی اقوام اپنے آپ کو کس طرح ظاہر کرتی تھیں۔ اسی ایک جنبش سے جرمنی میں قومی شاعری کی ترویج ہو گئی۔ ہو ہنس ٹافن کی حکومت کی تباہی کے ساتھ ہی جرمنی میں گوتھک ادب کا رواج ہو گیا۔ آئندہ صوبوں میں جو کچھ یہاں وہاں وقوع پذیر ہوا' مغربی ادب کا تمام سنہری دور اس کا مرہون منت ہے مگر فریڈرک اعظم کی فتوحات کے بعد ایک نئی

شاعری کا آغاز ہوا۔ "لیسنگ سے ہیبل تک" بالکل اسی عمل کی تکرار ہے جو روس باخ اور سیڈن کی وجہ سے رونما ہوا۔ ایسی کوشش کی گئی کہ شیکسپیئر یا فرانسیسی ادیبوں کی شعوری تقلید کی جائے اور فوکس لیڈ کو ان کے برابر ٹھہرایا جائے اور بالآخر (رومانویت میں) الوالعزمی کی شاعری میں بعض ایسے شاہکار تخلیق کیے گئے جن کا ادبی تاریخ میں اپنا خاص مقام ہے۔ اگرچہ انھوں نے اپنا مقصد کبھی حاصل نہیں کیا مگر اس کے اکثر مقامات پر ہنر مندی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

اٹھارھویں صدی کے اختتام نے اس شاندار کامیابی کا منہ دیکھا' جس میں کہ قومی شعور نے اپنے آپ کو خاندانی اصولوں سے خلاصی حاصل کر لی۔ یہ عمل انگلستان میں اس سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں منشورِ اعظم (۱۲۱۵ء) بہت قارئین کے خیال میں آیا ہو گا۔ مگر بعض اس مشاہدے سے مستفید ہوں گے کہ اس منشور کے تحت خاندانوں کے حقوق کو تازگی مل گئی اور اسے اتنی عمدگی سے نافذ کیا گیا کہ براعظم یورپ کے لوگ اس عمل سے قطعاً بے خبر رہے۔ آج اگر انگلستان کا جدید باشندہ (بدون اظہار و قبول) دنیا میں سب سے زیادہ روایت پرست ہے تو اور اس کے نتیجے میں اس کی سیاسی انتظامیہ خاموشی سے قومی نبض پر ہاتھ رکھ دیتی ہے مگر زبان سے کچھ نہیں کہتی اور اس عمل میں سب سے زیادہ کامیاب رہی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اس نے بہت پہلے خاندانی احساس اور اس کے اظہار سے آزادی حاصل کر لی ہے اور شاہی اختیارات کو کم از کم حد تک محدود کر دیا ہے۔

فرانسیسی انقلاب' اس کے بخلاف' صرف معقولیت کی فتح تھی۔ اس نے قوموں کو تو آزادی نہیں دی مگر تصور قوم کو ضرور آزاد کیا۔ مغربی اقوام میں خاندانی تصورات بہت شدت سے رچ بس گئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ ان کی ذہنیت میں بھی گھر کر گئے ہیں۔ ہر خاندان کی تاریخ میں نمائندگی موجود ہے۔ یہ تاریخ ہی ہے جو کسی سرزمین کا گوشت پوست بن گئی ہے اور ذہانت لازمان اور لا تاریخ ہے۔ انقلاب کے تمام تصورات دائمی اور حقیقیت پر مبنی ہیں۔ عالمی انسانی حقوق' آزادی' مساوات ' صرف تحریری اور ادبی اصطلاحات ہیں' مگر مبنی برحقیقت نہیں۔ اس انقلاب نے قوت تو حاصل کر لی مگر تصورات کی قیمت پر اس نے جو کچھ حاصل کیا وہ اسی قدر تھا کہ قدیم معقول حب الوطنی انیسویں صدی کی مہذب قوم پرستی سے بدل لیا۔ یہ صرف ہماری ثقافت ہی میں ممکن تھا جو فی نفسہٖ فرانس میں بھی اور آج بھی غیر شعوری طور پر خاندانی اقدار کا رواج موجود ہے اور مادر وطن کا تصور ایک خاندانی وحدت کے طور پر سب سے پہلے ہسپانیہ اور پروشیا میں نپولین کے خلاف بغاوت میں ابھرا اور پھر جرمنی اور اٹلی میں شاہی خاندانوں کی جنگوں میں یہ سامنے آیا اور اس سے اتحاد کا کام لیا گیا۔ قوم اور زبان کی مخالفت میں خون اور ذہانت کے لیے ہتھیار نسلی تصورات کو دبانے کے لیے صف بستہ ہوئے اور مادری زبان کے جذبات ابھارے گئے۔ دونوں ممالک میں بہت جوش و خروش کا مظاہرہ ہوا۔ دونوں کی خواہش کہ شہنشاہی اور بادشاہی کا خاتمہ کر کے جمہوریت کو رواج دیا جائے اور اس کے لیے شعر و نغمہ سے بھی مدد لی جائے۔ اس میں فطرت کی طرف مراجعت کا شعور ملتا ہے۔ اب وراثت کی جنگیں ختم ہو گئیں اور زبان کے لیے کشمکش کا آغاز ہو گیا' جس کے تحت ہر ملک اپنی زبان

دوسرے پر مسلط کر کے اسے اپنی قوم میں شامل کرنا چاہتا ہے مگر ہر شخص یہ دیکھ سکتا ہے کہ ایسی صورت ممکن نہیں۔ یہ مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ اس معقول تصور سے بھی کسی گروہ کی لسانی وحدت کو نظرانداز تو کیا جا سکتا ہے مگر اسے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ خاندانی احساس یونانی باشندوں سے زائد جو ان کی شہری ریاستوں میں پایا جاتا تھا یا یہودیوں کی قومیت میں جسے وہ "اجماع" سے تعبیر کرتے ہیں' اور کہیں نہیں دیکھا گیا' مادری زبان میں نہیں آتی' بلکہ بذات خود بھی خاندانی ورثے کی پیداوار ہے۔ کیپی ٹس کے شاہی خاندان کے بغیر فرانسیسی زبان کا کوئی وجود نہ ہوتا' بلکہ ملک کے شمالی علاقوں میں رومانوی فرینکی' اور جنوب میں پروونکل رائج ہوتیں۔ اطالوی تحریر کی زبان کا سہرا جرمن شہنشاہوں کے سر پر بجتا ہے' جس میں خاص طور پر فریڈرک دوم کا نام سرفہرست ہے۔ جدید اقوام بنیادی طور پر قدیم تاریخی آبادیوں پر مشتمل ہیں۔ اس کے باوجود انیسویں صدی میں ایک اور تصور آسٹریا اور امریکہ میں وجود میں آیا جس میں تحریری زبان کو قوم کی بنیاد قرار دیا۔ اس کے بعد ہر ملک میں دو فریق پیدا ہو گئے' ایک تاریخی خاندانی وحدت کے حامیوں پر مشتمل تھا اور دوسرا دانش وروں کے گروہ پر مشتمل ہے ---- نسلی پارٹی اور لسانی پارٹی ---- مگر یہ محض سیاسی مسائل کے مظاہر ہیں جو وقت سے قبل اٹھ کھڑے ہوئے ہیں ان کے حل کے لیے قدرے انتظار کرنا ہو گا۔

(۵)

قدیم زمانے میں جب تک کہ شہر آباد نہیں ہوئے تھے یہ صرف معززین علاقہ ہی کا فرض منصبی تھا کہ وہ قوم کی نمائندگی کریں۔ کسانوں کی آبادی جو مستقل ہونے کے باوجود اپنی تاریخ سے محروم ہے' ثقافت کی روشنی کے طلوع سے قبل مدتوں ابتدائی آبادی کے اطوار کے ساتھ گزارہ کرتے رہے۔ دنیا ترقی کر کے آگے بڑھ گئی لیکن یہ اپنے حال پر قائم رہے۔ قوم ثقافت کی عظیم علامات میں سے ایک ہے مگر صرف چند افراد ہی اس کے فوائد سے مستفید ہوتے ہیں۔ جو محدودے چند اشخاص اس سے مستفید ہوتے ہیں ان کی صورت ایسی ہی ہے جیسے کہ بعض افراد فنون لطیفہ' فلسفے' عمل تخلیق اور تنقید کے ہنر سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ عام لوگ یا عوام الناس ان کے پیروکاروں میں شامل ہوتے ہیں اور اس طرح قوم کا حصہ قرار پاتے ہیں' جیسا کہ کلاسیکی شہروں میں' یہودیوں کے اجماع اور اقوام مغرب میں قوم کے بعض اصول متعین ہیں۔ جب کوئی قوم اپنی آزادی کی جنگ کے لیے آواز بلند کرتی ہے' تو آغاز میں صرف اس کی کوئی اقلیت ہی ہراول دستے کے طور پر عمل پیرا ہوتی ہے۔ جب عوام "بیدار" ہو جاتے ہیں تو پھر اجتماعی شعور بھی بیدار ہو کر اپنا اظہار کرتا ہے۔ وہ تمام افراد جو "ہم" کے احساس سے بہرہ ور ہوتے ہیں' اور ماضی میں ان کا شعور صرف خاندانی وحدت تک محدود رہتا تھا' اور بتدریج اپنے روزگار' اپنے شہر یا قصبے کے افق تک محدود رہتا تھا اچانک قوم سے کم کسی حیثیت کو قبول نہیں کرتا۔ ان کا فکر و احساس ان کی انا اور اس کا ساتھ "ہستی" کا شعور بہت گہرا ہو جاتا ہے اور تاریخی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اس کے بعد لاتاریخی کسان بھی تاریخ کا تجربہ حاصل کرتا ہے اور اسے خاموشی سے قریب سے گزرتے ہوئے نہیں دیکھتا۔

مگر عالمی شہروں میں اس اقلیت کے سوا جو تاریخ میں اپنا مقام حاصل کرتی ہے اور اسے زندگی میں

محسوس کرتی ہے اور قوم کی رہنمائی طلب کرتی ہے اس کے ساتھ ایک مزید اقلیت وجود میں آ جاتی ہے' لازمان' تاریخی' پڑھے لکھے لوگ جو نہ صرف قضاوقدر کے پابند ہیں بلکہ دانش و معقولیت سے بھی بہرہ ور ہیں اور علت و معلول کے اصولوں سے باخبر ہیں' یہ لوگ داخلی طور پر نبض' خون اور وجود سے منقطع ہوتے ہیں۔ ہمہ تن بیدار فکری شعور سے بہرہ ور ہونے کی وجہ سے وہ قوم کی تعبیر کے لیے کوئی واضح تصور نہیں پاتے' بین الاقوامی تصور دانشوروں کے اتحاد کا کرشمہ ہے۔ یہ داخلی طور پر قضاوقدر سے نفرت کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر قضاوقدر کی تشریح کے لیے تاریخ کا قائل نہیں۔ ہر وہ شے جو قوم سے متعلق ہے نسل کی ملکیت ہے۔ اس حد تک کہ اس کے اظہار کے لیے الفاظ اور زبان بھی قاصر ہیں۔ فکر کے تقاضوں میں بے ڈھب اور تباہ کن تقدیر پرستی کے تلے منجمد ہونے کی وجہ سے ناقابل قبول ہے' بین الاقوامیت ایک ادبی اصطلاح ہے اور انجام کار اصطلاح ہی رہے گی۔ اس کے حق میں دلائل بہت مضبوط ہیں جن کا خون کے ذریعے دفاع کیا جا سکتا ہے۔

مزید برآں دانش وروں کا یہ طبقہ اقلیت میں ہونے کے باعث اپنے دفاع میں عقل و دانش کا اسلحہ ہی استعمال کرتا ہے اور اس عمل پر قادر بھی ہے۔ جیسا کہ عالمی شہروں کی ریاستیں' خالص عقل و دانش کی پیداوار تھیں' مگر بہت ناپائیدار ثابت ہوئیں' اور اپنے مفروضات ہی کے تحت تہذیب کی مشترکہ جائیداد قرار پائیں۔ پیدائشی طور پر عالمی شہری' عالمی امن کے علمبردار اور عالمی صلح جوئی کا پیام بر چین کی مدئی ریاستوں میں بھی پائے جاتے تھے۔ بدھ مت کے پیروکار ہندوستان میں اور قدیم یونان میں بھی موجود تھے۔ اور آج کی مغربی دنیا میں بھی فلاحین کے روحانی رہنما موجود ہیں۔ صلح جوئی' امن پسندی ہی کا نسخہ ہے۔ ہر ثقافت کی تاریخ میں قوم مخالف عناصر موجود ہوتے ہیں۔ اس کی ہمارے پاس کوئی شہادت ہو یا نہ ہو خالص اور اپنے ذاتی مفاد کے لیے سوچ ہمیشہ سے مخالف زندگی رہی ہے اور اس لیے اسے مخالف تاریخ بھی قرار دینا چاہیے۔ اس میں جدوجہد کا جذبہ مفقود ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا کسی قوم سے بھی کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ انسانیت نوازی' کلاسیکیت' ایتھنز کے سوفسطائیوں کا گروہ' بدھ اور لاؤزے کی تعلیمات پر مجموعی انداز سے غور کریں۔ قومی شعور کے خلاف مذہبی اور فلسفیائی حلقوں کی طرف سے سرگرم مخالفت اور بین الاقوامی اتحاد اور یک جہتی اور بنی نوع انسان کی واحد عالمی نسل کے نظریات کی تحریکات جدید دور کی پیداوار ہیں۔ اگرچہ ان نظریات میں بھی داخلی تضاد موجود ہے' مگر عالمی نسل کا وجود اور اتحاد سب میں یکساں طور پر موجود ہے۔ مگر جب سیاسی (اور اس وجہ سے قومی) اور قومی جبلت (میرا ملک میرا وطن' یہ تصور غلط ہو یا صحیح) بحث کا موضوع ہو' تو نقطہ نظر معروضی نہیں رہتا اور ارتقا کا عمل نظر انداز ہو جاتا ہے۔ (دونوں متضاد صورتوں میں ایک کا انکار ناگزیر ہے)۔ ایک لفظ میں اس صورت حالات کا بیان "عزم لی القوت" کی اصطلاح سے کیا جا سکتا ہے۔ اس رجحان کو ختم ہو جانا چاہیے اور ان افکار کے لیے جگہ خالی کر دینی چاہیے جن کے علم بردار ذوق و شوق سے تو خالی ہیں' مگر منطقی دلائل میں کسی طرح کم نہیں اور صداقت' مقاصد اور عالم مثال کے حصول کے لیے مخلص ہیں۔ یہ کتابی لوگ ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ایک دن وہ واقعاتی امور کو منطق کے زور پر زیر کر لیں گے۔ وہ حقائق کی قوت کو تجریدی انصاف' قضاوقدر کو عقل محض' کے زور پر تبدیل کر لیں گے۔

ان کا تصور ایک دائمی خوفناک مرحلے سے شروع ہوتا ہے اور حقائق کی دنیا سے فرار ہو کر کتب خانوں کے حجروں میں پناہ لیتا ہے اور اس طرح روحانی دنیا میں کھو جاتا ہے۔ وہ دنیاوی فعالیتوں کی نفی کرتا ہے اور ہر ثقافت کو عالمی امن کے نام پر قربان کر دیتا ہے۔ ہر قوم کے پاس (تاریخی لحاظ سے کہا جاتا ہے) ایسا قابل تلفی مواد موجود ہے اور ان کے رہنما بھی ایسی تعبیرات کے قائل ہوتے ہیں۔ اور اپنی ذات ہی میں ایک گروہ ترتیب دے لیتے ہیں۔ دنیائے فکر میں تو ان کا مقام بہت بلند ہوتا ہے ---- اور ان کی فہرست میں بڑے بڑے نام شامل ہوتے ہیں ---- مگر تاریخی حقائق کی رو سے یہ لوگ بالکل نااہل ہوتے ہیں۔

ان معاملات عالم میں کسی قوم کا مقدر اس امر پر منحصر ہے کہ اس کا نسلی معیاز ان کو تاریخی لحاظ سے کتنا غیر موثر بنا سکتا ہے اور عالمی معاملات کے خلاف اپنے دفاع میں کس قدر کامیاب ہوتا ہے۔ غالباً" اس واقعے کی مثال دی جا سکتی ہے اور چین کی ریاستوں کی کش مکش میں (۲۵۰ ق م) تسین کی حکومت نے اس لیے فتح حاصل کی کہ اس نے اپنی ذات کو تنا طاؤ کے جذباتی نظریات سے محفوظ رکھا تھا۔ اس معاملے کو یہیں پر رہنے دیں مگر رومی قوم اس لیے تمام کلاسیکی عالم پر چھا گئی کہ وہ یونانیوں کی جبلت فلاح سے الگ حکمت عملی طے کرنے میں کامیاب رہی۔

قوم سے مراد انسانیت کو زندہ صورت میں پیش کرنا ہے۔ عالمی ترقی کے من حیث الکل نظریات متواتر کوئی صورت اختیار نہیں اس لیے تاریخ میں بھی ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ تمام دنیا ترقی کر جاتی ہے مگر عالمی شہری صرف فلاحین کے تصورات پر رکے رہتے ہیں۔ خواہ وہ اس حقیقت کو جانتے ہوں یا اس سے بے خبر ہوں۔ ان کی کامیابی کا مطلب یہ ہے کہ اس غرض کے حصول کے لیے اپنے قومی تصور اور وجود سے دست برداری اختیار کر لی جائے۔ اس سے دائمی امن تو حاصل نہیں ہو گا مگر ایک نئی قوم وجود میں ضرور آ جائے گی۔ عالمی امن ہمیشہ یک طرفہ کارروائی ہوتی ہے۔ عظیم روم آخری دور میں فوجی شہنشاہوں کے زیر نگیں رہا اور جرمنی کے شاہی ٹولے نے صرف یہی کام کیا کہ دس کروڑ عوام کو عزم لی القوت کا شکار بنا کر چھوٹے چھوٹے جنگ جو سرداروں کے حوالے کر دیا۔ اس امن کی قیمت پر امن قربانی میں ادا کی گئی اور اس کے علاوہ متعدد چھوٹے چھوٹے گروہ بالکل ہی مٹ گئے۔ بابلی' چینی' ہندوستانی' مصری' اقوام پر فاتحین یکے بعد دیگر غلبہ حاصل کرتے رہے مگر خون مغلوب اقوام ہی کا ان مقابلوں میں بہتا رہا۔ یہی ان کا ---- امن ہے۔ جب ۱۴۰۱ء میں منگولوں نے عراق فتح کیا۔ تو انھوں نے مقامی باشندوں کی ایک لاکھ کھوپڑیوں کے مینار بنائے۔ ان کی خطا یہی تھی کہ انھوں نے اپنا دفاع نہیں کیا تھا۔ دانش دروں کے نقطہ نظر کے مطابق بلاشک قوم کا وجود فلاحین کو تاریخ میں بلند مقام عطا کرتا ہے اور یہ لوگ ہمیشہ کے لیے تہذیب یافتہ قرار پاتے ہیں۔ مگر حقائق کی دنیا کے مطابق یہ کسی ریاست کی فطرت کی طرف مراجعت کا عمل ہے' جس کے نتیجے میں طویل غلامی اور خون کے ضیاع کا فوری اشتعال پیدا ہوتا ہے ---- عالمی امن نہ تو اس صورت حالات کو ختم کر سکتا ہے اور نہ کوئی تبدیلی لاتا ہے ---- قدیم زمانے میں لوگ اپنے دفاع کے لیے خون بہاتے تھے' اب انھیں دوسروں کے لیے بہانا پڑتا ہے۔ بعض اوقات اس کی مقدار اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ دوسروں کے لیے

سامان تفریح پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی فرق ہے جو پیدا ہوا ہے۔ ایک ثابت قدم مہم جو جو دس ہزار جنگ جو اپنے گرد جمع کر لیتا ہے، جو چاہتا ہے کر لیتا ہے، اگر تمام دنیا ایک ہی بڑی سلطنت میں تبدیل ہو جائے تو اس کے نتیجے میں اسے مہم جوؤں کو اپنی جنگ آزمائی کے لیے زیادہ وسیع میدان مل جائے گا۔

"غلامی سے موت بہتر ہے" قدیم فریسی کسانوں کا مقولہ ہے۔ جب کوئی تہذیب اپنے آخری مراحل میں داخل ہوتی ہے تو اس کی فکر اس کے برعکس ہو جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں مرحوم تہذیب کو اس تجربے کی جو قیمت ادا کرنا پڑتی ہے وہ کس قدر ہے!

باب ہفتم

عرب ثقافت کے مسائل

(الف)

نیم تاریخی اشکال یا تاریخی قلب ماہیت

(ا)

چٹانوں کے طبقات معدنیات کی قلموں کے دفینے ہیں۔ درزیں اور شگاف پیدا ہوتے ہیں تو پانی اندر رستا ہے۔ تو قلمیں آہستہ آہستہ گھل کر باہر نکل جاتی ہیں اور ان کا خالی سانچہ باقی رہ جاتا ہے۔ پھر آتش فشانی پھٹ پڑتی ہے، جس سے پہاڑیاں بھک سے اڑ جاتی ہیں، پگھلے ہوئے مادے بہ نکلتے ہیں اور باہر نکل کر منجمد ہو جاتے ہیں اور قلموں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں لیکن یہ اپنی ہیئت کی تشکیل کے لیے آزاد نہیں۔ وہ ان خالی جگہوں کو پر کرتے ہیں جو انھیں دستیاب ہوں اس کے نتیجے میں بے ڈھنگی شکلیں وجود میں آتی ہیں۔ ایسی قلمیں بنتی ہیں جن کی اندرونی اور بیرونی ساخت میں کوئی مماثلت نہیں ہوتی، ایک قسم کی حجریات کسی دوسری نوع کی حجریات کی صورت اختیار کر لیں گی۔ ماہرین ارضیات اس صورت کو قلب ماہیت کا نام دیتے ہیں۔

"تاریخی قلب ماہیت" کی اصطلاح میں ان معاملات کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جن میں کوئی قدیم اجنبی ثقافت، کسی خطہ ارضی پر اس قدر کثرت سے اپنے اثرات پیدا کرتی ہے کہ ایک نوزائیدہ ثقافت جو متعلقہ ارضی خطے میں پیدا ہوتی ہے، سانس نہیں لے سکتی، اور نہ صرف یہ کہ خالص اور مخصوص ہیئت اظہار سے

محروم رہتی ہے' بلکہ وہ شعور ذات کی تشکیل سے بھی محروم رہتی ہے۔ ہر وہ شے حیات تازہ کی گہرائیوں سے ابھرتی ہے' پرانے سانچوں میں ڈھل جاتی ہے تازہ احساسات آہستہ خرامی میں جامد ہو جاتے ہیں اور اپنی قوت تخلیق پر نمو پانے کے بجائے وہ صرف فاصلاتی قوت سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ ایسی نفرت جو بتدریج ایک عفریت کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔

عرب ثقافت کی بھی یہی صورت ہے' قبل از تاریخ عہد میں یہ کلی طور پر قدیم بابلی تہذیب کی حدود میں شامل تھی جو تقریباً" دو ہزار سال تک متعدد فاتحین کا یکے بعد دیگرے شکار رہی۔ اس کا میروونجی عرصہ' ایک چھوٹی سی ایرانی الاصل آمریت کے زیر نگیں گزرا۔ یہ فارسی قبیلہ آسٹروگوتھ کی طرح قدیم تھا۔ اس کا غلبہ دو سو سال تک قائم رہا' اس دوران اسے کسی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور اس کی بنیاد فلاحین کی غیر محدود خستگی پر قائم ہوئی۔ مگر ۳۰۰ ق م کے بعد آرامی زبان بولنے والے جدید قبائل میں بیداری کی زور دار لہر پیدا ہوئی جو سینا اور ساغروس کے علاقوں تک محدود رہی۔ ٹروجن کی جنگ کے زمانے میں جبکہ سیکسن شہنشاہوں کے دور میں خدا اور انسان کے مابین تعلقات تمام موجودہ مذاہب میں جنم لے رہے تھے' تمام خطوں میں ایک نیا عالمی احساس بیدار ہو رہا تھا۔ خواہ اس کا نام اہرمزدیا یاہوہ یا بعل ہو دنیا میں تخلیق کے متعلق جدید تصورات ابھر رہے تھے۔ فی الحقیقت یہ وہی عہد ہے جبکہ مقدونیائی آ پہنچے۔ یہ عمل اتنا برمحل تھا کہ کسی داخلی رابطے کو بالکل ناممکن نہیں قرار دیا جا سکتا۔ کیونکہ ایرانی سلطنت روحانی اصول موضوعہ پر قائم تھی اور یہی اصول تھے جو اس دور میں صرف نظر ہو چکے تھے۔ بابل کے لوگوں نے تو اہل مقدونیہ کو بھی دوسرے حملہ آور لشکروں کی طرح ہی سمجھا۔ انھوں نے کلاسیکی تہذیب کی ایک باریک چادر ترکستان اور ہندوستان پر بچھا دی۔ ڈایاڈوچی کی حکومت ممکن ہے کہ قدیم عرب ریاستوں کی طرح بے حس ہو چکی ہو۔ سیلوکس کی سلطنت جو آرامی بولنے والے باشندوں کے علاقوں سے منطبق تھی' اس کی ۲۰۰ ق م تک یہی حالت ہو چکی تھی مگر ڈیناکی جنگ کے بعد اس کا رخ مغرب کی جانب ہو گیا اور یہ زیادہ سے زیادہ کلاسیکی سلطنت کے ساتھ منسلک ہوتی گئی اور اس طرح اس نے اس قدر مضبوط قوت کار حاصل کر لی جس سے اس کا مرکز ثقل دور سے دور تر ہوتا گیا اور اس طرح قلب ماہیت کا عمل مکمل ہو گیا۔

مجوسی ثقافت جغرافیائی اور تاریخی لحاظ سے تمام اعلیٰ ثقافتوں کے عین درمیان میں واقع ہے۔ صرف تنہا جو زبان و مکان دونوں لحاظ سے تمام ثقافتوں سے مربوط و ملحق تھی' اس کی تاریخی تشکیل ہمارے عالمی تصور میں مجموعی طور پر صرف اس کی داخلیت پر منحصر ہے' جبکہ اس کی خارجی ہیئت اس کے وجود کی غلط ترجمانی کرتی ہے۔ بدقسمتی سے یہ ایک ایسی صورت ہے جس کے متعلق تاحال ہم کچھ نہیں جانتے۔ ہمیں مذہبی اور لسانی حسن ظن کا شکرگزار ہونا چاہیے بلکہ جدید رجحان متعلقہ خوش فہمی کی افزائش کا بھی' جس کی وجہ سے مغربی تحقیقاتی طریق متعدد شعبہ جات میں منقسم ہو کر رہ گیا ہے۔ ہر طریق کار کو نہ صرف مواد اور اسلوب کی بنا پر امتیاز کیا جا سکتا ہے بلکہ اس کے انداز فکر سے بھی ---- اور اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بعض بڑے بڑے مسائل کا مشاہدہ تک نہیں ہو سکا۔ معاملہ زیر بحث میں مہارت خصوصی کے نتائج سب سے ۱۰ دہ

تکلیف دہ برآمد ہوئے ہیں۔ محققین نے اپنا کام کلاسیکی لسانیات تک محدود رکھا اور کلاسیکی لسانی حدود ہی کو اپنی مشرقی سرحدوں کا افق تسلیم کر لیا۔ لہٰذا وہ اپنی سرحدوں کے دونوں اطراف ترقی کے لیے اتحاد کی ضرورت کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ اس صورت حالات کا کوئی روحانی وجود نہ تھا۔ اس کے نتیجے میں تاریخ تین حصوں قدیم' وسطانی' اور جدید' میں تقسیم ہو گئی۔ یہ تقسیم یونانی اور لاطینی دونوں زبانوں میں رواج پا گئی۔ قدیم زبانوں کے اظہار کے باعث آکسم' سابا' بلکہ ساسانی دور کے بیانات سے اختلاف مشکل ہو گیا اور اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ان کا ذکر تاریخ سے ناپید ہو گیا۔ صرف ادبی محقق (اور وہ بھی ماہرین لسانیات) زبان اور عمل کی روح کو خلط ملط کر دیتا ہے۔ آرامی خطے کی تخلیقات اگر وہ یونانی زبان میں لکھی گئیں یا صرف یونانی میں محفوظ رہ گئیں' محقق ان کو دور متاخر کا یونانی ادب قرار دے لیتا ہے اور اس کی ایک نئی صنف بندی "مخصوص دورانیے کا ادب" کے نام سے کر لیتا ہے۔ دوسری زبانوں میں اس نوعیت کے متون ایسی صنف بندی سے باہر رکھے گئے ہیں اور اسی مصنوعی انداز سے کسی اور گروہ میں شامل کر لیے گئے ہیں اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ تاریخ ادب اور تاریخ زبان میں کوئی باہمی ربط نہیں پایا جاتا

اس میں فی الحقیقت مجوسی قومی ادب کا ایک خود کفیل مجموعہ موجود ہے' جو روحانی لحاظ سے تو واحد اکائی ہے مگر اسے کئی زبانوں میں تحریر کیا گیا ہے جن میں کلاسیکی زبان بھی شامل ہے۔ کیونکہ مجوسی قوم کی کوئی مادری زبان نہیں' ان کے پاس تالمود' مینشی' نسطوری' یہودی بلکہ نوفیثاغورثی زبانوں میں قومی ادب موجود ہے مگر ہیلنی اور عبرانی نہیں۔

مذہبی تحقیق بھی مختلف ذیلی شعبوں میں تقسیم ہو گئی۔ مغربی یورپ کے متعدد فلسفیوں کے مطابق اس عمل سے مغربی اور مشرقی لسانیات کے مابین حدود کا وجود قائم ہو گیا اور آج تک قائم ہے' اس میں عیسائی دینیات بھی شامل ہے۔ اہل فارس' ایرانی لسانیات میں کھو کر رہ گئے۔ اوستا کے مختلف متن اشاعت پذیر ہوئے اگرچہ یہ کسی آریائی زبان میں تو نظم نہیں کیے گئے تھے مگر انھیں پھر بھی ہندوستانی تخلیقات ہی کے ضمن میں شمار کیا گیا' اسی وجہ سے انھیں عیسائی دینیات کے موضوع سے کلی طور پر خارج کر دیا گیا اور بالآخر تالمودی یہودیت کی تاریخ بھی آہستہ آہستہ غائب ہونے لگی کیونکہ عبرانی فلسفہ عہد نامہ عتیق کا غلام ہو کر رہ گیا۔ جن محققین سے میں آشنا ہوں انھوں نے یہودی فلسفے کا کبھی ذکر تک نہیں کیا حالانکہ وہ ہر ہندوستانی مسلک کا ذکر کرتے ہیں (کیونکہ عوامی اساطیر بھی اب خصوصی مہارت کا موضوع بن گئی ہیں) اور ہر قدیم حبشی مذہب بھی تحقیق کا موضوع بن گیا ہے۔ آج کے محقق تاریخ کا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ سوالات کے جواب کے لیے تیار ہو۔

(۲)

شہنشاہی دور کی رومی دنیا کا اپنی ریاست کے متعلق نظریہ بہت اعلیٰ تھا۔ متاخر مصنفین آبادی کم کرنے

کے تصور کے متعلق بہت شکایات کرتے ہیں مزید برآں افریقہ' ہسپانیہ' گال' اور مزید برآں مادر ممالک اطالیہ اور یونان کے روحانی خلا کے متعلق بھی وہ شاکی ہیں' مگر وہ علاقے جو مجوسی اقتدار کے تحت تھے ان کے خلاف انھیں کوئی شکایت نہیں۔ شام بالخصوص گنجان آبادی کا ملک ہونے کے باوجود اور عراق بھی خون اور روح کی قوتوں سے سرشار تھے۔

نوخیز مشرق صریحا اس وقعت کا اہل تھا کہ وہ بھی سیاست میں اپنا کردار ادا کرے۔ اگر ہمیں اس سمت میں تحقیقات کرنا ہے تو ہمیں مشہور رزمیوں کا مطالعہ کرنا ہو گا' مثلاً" مارکیس اور سلا' سیزر اور پومپئی' انٹنی اور اوکٹاوی' ان جن کی رو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشرق اس کوشش میں مسلسل مصروف رہا کہ وہ اپنے آپ کو مغرب کی بالا دستی سے نجات دلائے۔ فلاحین کی دنیا جاگ اٹھی تھی' دارالحکومت کی باز نطیہ میں منتقلی اس امر کی بہت بڑی علامت ہے۔ دائیو قلیطس نے نائکوڈیمیا کا انتخاب کر لیا تھا' اور سیزر اسکندریہ یا ٹرائے پر قبضہ کرنے کا آرزو مند تھا اور اس غرض کے لیے بہترین انتخابات الیلوک تھا۔ مگر اس پر عمل تین صدیوں بعد ہوا' مگر یہ طویل مدت مجوسی عروج کے لیے موزوں ترین تھی۔

ایکٹینم کے ساتھ ہی قلب ماہیت کا آغاز ہو گیا یہ وہ وقت تھا جبکہ این ٹونی کی ضرورت تھی۔ اب زیر بحث کینائی اور زاما کا مناقشہ نہ تھا' بلکہ اب تو ہنی بال کا مسئلہ تھا کہ وہ اپنی مقبوضہ زمین پر اپنا قبضہ برقرار رکھ سکتے ہیں یا نہیں' مگر یونانیت کے مقابلے میں تو نوزائیدہ عرب ثقافت تھی' جو ایک مضبوط فولادی کلاسیکی تہذیب کہی جا سکتی ہے۔ امر متنجع طلب موروثی بادشاہی اور خلافت تھا۔ اگر انٹونی فتح یاب ہو جاتا اس سے مجوسی روح کو آزادی مل جاتی اور اس کی شکست کی وجہ سے ان کی تمام اراضی رومیوں کے قبضے میں چلی جاتی اسی نوعیت کا واقعہ مغربی یورپ میں اس وقت پیش آیا جبکہ ۷۳۲ء میں طوروں اور پوائٹرز کے مابین جنگ ہوئی۔ اگر عربوں نے یہ جنگ جیت لی ہوتی' اور فرنگستان کو خلافت کا شمال مشرقی حصہ بنا لیا ہوتا عربی زبان' مذہب اور رواجات سے حکمران جماعتوں کو آشنائی ہو جاتی' غرناطہ اور کیروان جیسے بڑے بڑے شہر لوئر اور رہائن کے کنارے آباد ہو جاتے۔ رومی فن تعمیر کا مظاہرہ مسجدوں کی تعمیر اور عرب عمارتوں کی صورت میں ہوتا اور جرمن رہبانیت کی جگہ تصوف کا رواج ہوتا۔ اسی نوعیت کے واقعات عرب دنیا میں پیش آئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شام' ایران اتحاد چارلس مارٹل جیسا شخص متھرا ڈیٹز' بروٹس' اور کلاسی اس یا انٹونی کے ہمراہ میدان جنگ میں نہ بھیج سکا (ایسی صورت حالات میں ان کے بغیر بھی) اور روم کی راہ میں رکاوٹ پیدا کی جا سکتی۔

ایک اور قلب ماہیت جو ہمارے مشاہدے میں آئی وہ آج کا روس ہے۔ روسی جرات آزما داستانوں کی معراج شہزادہ ولاڈی میر کی رزمیہ داستانوں میں سنائی دیتی ہے (۱۰۰۰ء کے لگ بھگ)۔ اس کے ساتھ اس کی گول میز کانفرنس اور مقبول عام ہیرو الیا میورو مائٹز کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ تمام افتراقات جو روس اور فاؤستی ثقافت کے ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی تفصیلات متعدد ہمعصر مصنفین نے مہیا کی ہیں' جن میں

آرتھر' ارمانا رج' اور امیلون کے نام قابل ذکر ہیں۔ نقل مکانی کے دور کے واقعات ان کی تصنیفات Waltharilied اور Hildebrandslied میں تفصیل سے مرقوم ہیں۔ روسی میرو و نجینن عہد کا آغاز تاتاری غلبے سے آزادی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کے لیے آئی ون سوم (۱۴۸۰ء) نے جدوجہد کی مگر رورک کے خاندان کے شہزادوں کے عہد تک جاری رہی اور رومانوف رول سے لے کر پیٹر اعظم (۱۵۲۵-۱۶۸۹) تک کے بادشاہوں نے اس میں حصہ لیا۔ اس دوران کے واقعات کلووس (۵۱۱-۴۸۱) اور جنگ ٹیسٹری (۶۸۷) پر بعینہ منطبق ہوتے ہیں' جن کی وجہ سے کارولنگیوں کو واضح برتری حاصل ہو گئی۔ میں اپنے قارئین کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ طورز کے گریگری کی تاریخ کا مطالعہ کریں (۵۹۱ تک) اور کرامازین کی سرداری قبیلہ کے دوران کے منطبقہ واقعات سے ان کا موازنہ کریں' بالخصوص جو خوفناک آئی ون سے متعلق ہیں اور ان کا موازنہ بورس گڈونوف اور وسیلی شوسکی سے کریں۔ اس سے زیادہ باہم منطبق واقعات کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ ماسکو کے عظیم بوئر خاندانوں اور قبائلی سرداروں کا یہ عہد اس قدیم فریق کی مخالفت کا عہد ہے جس میں مغربی ثقافت کے دوستوں کی بھرپور مخالفت کی گئی۔ ۱۷۰۳ میں پیٹرز برگ کے آباد ہونے کے عہد کے ساتھ ہی اس قلب ماہیت کا آغاز ہو گیا جس نے قدیم روسی مزاج کو مجبور کیا کہ وہ اجنبی ہیئت کو قبول کر لے۔ اولیں طور پر باروق اور بعدازاں تحریک روشن خیالی' یکے بعد دیگرے سو سال کے وقفے سے قبول کی گئیں۔ وہ شخص جس نے روس کی قسمت بدل کر رکھ دی وہ پیٹر اعظم تھا جس کے ساتھ ہم شارلیمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں' جس نے پوری قوت کے ساتھ اور شعوری طور پر اس چیز کو نافذ کرنے کی کوشش کی جس کی راہ میں چارلس مارٹل نے رکاوٹ پیش کی تھی یعنی باز نطینی حکومت کی حکمت عملی اور حکومت کو قبول کر کے اپنی غلامی پر مہر ثبت کر لی جائے۔ اس امر کا امکان تھا کہ روسیوں کے ساتھ بھی وہی سلوک ہوتا جو کارولنگی یا سیلوکی آبادی سے ہوا تھا ---- اس کا مطلب تھا کہ قدیم روسی یا مشرقی معاشرت میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیا جائے اور رومانوف نے ثانی الذکر کا انتخاب کیا۔ سیلوکیوں کی خواہش تھی کہ وہ یونانیوں سے رابطہ قائم رکھیں وہ آرمینیا والوں سے کوئی تعلق نہ رکھنا چاہتے تھے۔ ماسکو کی قدیم زار شاہی آج بھی روسیوں کا موزوں طرز حکومت ہے۔ مگر پیٹرز برگ میں اسے مغربی خاندانی بادشاہت قرار دے کر اس کی شکل بگاڑ دی گئی تھی۔ مقدس مشرق کی کشش ---- باز نطین اور یروشلم ---- ہر قدامت پسند روح میں پوری قوت سے رچی بسی تھی۔ ماسکو کی آتش زدگی جو قدامت پسند لوگوں کا ایک پرزور اقدام تھا اور مکابئین کی طرف سے بیرونی بدعات کے خلاف رد عمل کا اظہار تھا جو الیگزانڈر اول کے پیرس کے داخلے کے بعد عمل میں آیا۔ مقدس اتحاد' اور عظیم مغربی قوتوں کا اتفاق وجود میں آ گیا اور اس کے نتیجے میں ایک قومیت جس کا کوئی مقدر نہ تھا اور جسے ابھی مزید چند نسلوں تک تاریخ سے محروم رہنا تھا' زبردستی حلقہ تاریخ میں داخل کر دی گئی۔ اگرچہ اس کی تاریخ جعلی اور فرضی ہی رہی کیونکہ قدیم روس کی روح تاریخی حقائق کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس کے باشندوں کو نئے دور کے فنون سائنس روشن خیالی' اخلاقیات' عظیم شہروں کی مادیت وغیرہ متعارف کرائے گئے' حالانکہ اس ملک میں اس سے قبل مذہب ہی ایک ایسا وسیلہ تھا جس کے ذریعے انسان اپنی ذات اور کائنات کو سمجھ سکتا تھا۔ یہ ایک ایسا ملک تھا جو قصبوں کے بغیر قدیم کسان آبادی کا گہوارہ تھا۔ اس میں غیر ملکی نوعیت کے شہر آباد کیے گئے جو ناسوروں کی نوعیت کے تھے ---- مصنوعی' غیر قدرتی اور ناقابل یقین

صورت پیدا کی گئی۔ دستاوسکی کہتا ہے کہ پیٹرز برگ دنیا میں سب سے زیادہ تجریدی اور مصنوعی شہر ہے۔ اگرچہ وہ خود اس میں پیدا ہوا تھا' مگر اسے یقین تھا کہ کسی روز یہ صبح کی اوس کے ساتھ حل ہو کر ختم ہو جائے گا۔ اسی قدر جناتی ناقابل اعتبار یونان کے مصنوعی شہر تھے جو آرامی کسانوں کی زمینوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ یسوع مسیح گیلیل کے متعلق اس صورت حالات سے آشنا تھا اور سینٹ پیٹر نے بھی اس کے تصنع کا احساس کر لیا ہو گا جب اس نے روم کو دیکھا تھا۔

اس کے بعد ہر شے جو اس کے گرد و نواح میں وجود میں آئی اسے روسی ہی سمجھا گیا' جس طرح کوئی جھوٹ یا زہر کو قبول کر لے۔ ایک صحیح کشفی نفرت یورپ کے خلاف پیدا کر دی گئی۔ مگر یورپ سے مراد روس بمع ایتھنز اور روم نہ تھے' بلکہ صرف مجوسی دنیا تھی جو ان کی نظر میں قدیم مصر اور بابل کے دور ہی سے ملحد اور شیطان تھے۔ اکساکوف نے دستاوسکی کو ۱۸۶۳ء میں لکھا کہ روسی روح کے اظہار کے لیے پہلی شرط کہ وہ پیٹرز برگ سے پوری قوت اور روح کی گہرائیوں سے نفرت کرے۔ ماسکو بھی پیٹرز برگ کی طرح شیطان ہی ہے۔ روس میں ایک افواہ مشہور ہے کہ پیٹر اعظم یسوع کا مخالف تھا' یہاں تک کہ آرامی قلب ماہیت تمام صحائف میں یہ پکار پکار کر کہہ رہی ہے' یہاں تک کہ آرامی قلب ماہیت سے آواز بلند ہوتی ہے۔ تمام کشوفات میں دانیال سے اینک تک' مکابی دور سے جون تک' بروج اور عذرا چہارم' یروشلم کی تباہی کے بعد انطاکیہ اور مسیح کی مخالفت' روم کے خلاف اور بابل کی رنڈیوں کے خلاف' اپنی تمام لطافت اور شان و شوکت کے مظاہر مغربی یورپ کے شہروں کے خلاف اور تمام کلاسیکی ثقافت کے خلاف روایات موجود ہیں۔ یہ تمام تخلیقات نادرست ہیں اور صاف بھی نہیں۔ ایک مہذب معاشرہ' ہوشیار فنکاری' فریق' اجنبی ممالک اپنی تمام سفارت کاری کے ساتھ انصاف اور انتظامی صلاحیتوں کے ساتھ اس غلط بیانی میں شامل ہیں۔ روس اور مغرب' یہودیوں اور عیسائیوں اور متاخر کلاسیکی عدمیت میں تضاد بہت زیادہ ہے۔ اس کی بنیاد اجنبیوں سے نفرت پر ہے۔ یہ شہری آبادی کے' ان کی اراضی پر آباد ہونے کے خلاف رد عمل کا اظہار ہے جبکہ ان کی اپنی ثقافت ابھی تک اراضی کے شکم میں ہے اور اجنبی آبادی کے بوجھ تلے اس کی نشوونما کا کوئی احتمال باقی نہیں رہتا۔ مذہبی احساس کی گہرائی الہام کی صورت میں چمکتی ہے اور عظیم بیداری کے خوف سے لرزاں ہو جاتی ہے۔ مابعدالطبیعیاتی خواب اور آرزوئیں اس قلب ماہیت میں خلط ملط ہو جاتی ہیں۔ دستاوسکی کہتا ہے کہ ہر شخص گلی کوچوں اور بازاروں میں ایمان کی نوعیت پر بحث کرنے لگتا ہے۔ یہی صورت حالات ایڈیسا اور یروشلم میں ہوئی ہو گی۔ ۱۹۱۴ء سے قبل کی روسی نوجوان آبادی گندہ زرد رو' وجد و کیف میں مدہوش' کونوں کھدروں میں مرتی ہوئی' ہروقت طریق انتخاب اور کیمیا کے موضوعات پر بحث کرتی ہوئی یا تعلیم نسواں کے موضوع میں الجھی ہوئی' یہ لوگ قدیم یہودی اور ابتدائی دور کے عیسائی تھے جو یونانی شہروں سے آ کر یہاں آباد ہو گئے' جس کے ساتھ رومی خندہ تضحیک اور خفیہ خوف کے ملے جلے جذبات رکھتے تھے۔ زار کے دور کے روس بورژوا کا کوئی وجود نہ تھا اور عام طور پر کوئی طبقاتی نظام بھی نہ تھا' مگر یہ صرف ایک فرینک کی نو آبادی تھی جو اپنے آپ کو کسانوں کے آقا سمجھتے تھے۔ روس میں قصباتی زندگی کا کوئی وجود نہ تھا۔ ماسکو قلعہ بند سرکاری قیام گاہوں پر مشتمل تھا۔ (کریملن) جس کے ہر طرف حلقے کی صورت میں ایک

منڈی آباد تھی۔ وہ نقلی شہر جو نشوونما پا کر اس کے گرد حلقے کی صورت میں پھیل گیا' روسی سرزمین کے ہر شہر کی یہی ہیئت تھی۔ ہر شہر کا ایک ہی مقصد تھا کہ وہ دربار کی ضروریات پوری کرے۔ انتظامیہ' تاجر' طبقہ' ہر کوئی اسی فرض کی انجام دہی کا پابند تھا مگر وہ لوگ جن کا تعلق اعلیٰ طبقات سے تھا وہ داستانوں کے کردار معلوم ہوتے تھے۔ دانشور لوگ مسائل تلاش کرتے رہتے اور اختلافات کی ٹوہ میں لگے رہتے اور طبقہ زیریں میں تباہ حال کسانوں کی آبادی تھی' جن کو گھربار سے محروم کر کے دنیا بھر کی پریشانیاں ان پر مسلط کر دی گئی تھیں' گویا مابعدالطبیعیاتی یاس' تشویش' اور بے چارگی کی مجسم صورتیں تھیں۔

دستاوسکی کو ہر وقت گھر کی یاد ستاتی تھی۔ اسے اپنے گاؤں کی کھلی سرزمین یاد آتی تھی' اسے خشتی دیواروں سے نفرت تھی جسے خلاف یسوع آبادی نے کھڑا کر رکھا تھا' ماسکو میں روح ختم ہو چکی تھی۔ بالائی طبقے کا مزاج مغربی ہو چکا تھا اور ادنیٰ طبقہ اپنے ساتھ اپنا دیہاتی مزاج لے آیا تھا۔ ان دونوں دنیاؤں میں کوئی باہمی ارتباط نہ تھا' نہ ابلاغ کی کوئی صورت تھی اور نہ نظر کرم۔ اس قلب ماہیت کے مظلوموں کے ترجمان کے طور پر دستاوسکی کا نام لیا جا سکتا ہے جو خود ایک کسان تھا' جبکہ ٹالسٹائی مغربی معاشرے کا باشندہ تھا۔ دستاوسکی کوشش کے باوجود بھی دیہاتی زندگی سے دوبارہ لطف اندوز نہ ہو سکا اور ٹالسٹائی اس امر کے باوجود کہ اس نے بے حد کوشش کی' کبھی بھی اس کے نزدیک نہ جا سکا۔

ٹالسٹائی میں ہمیں ماضی کا روس نظر آتا ہے' جبکہ دستاوسکی کا تعلق روس کے مستقبل سے ہے۔ ٹالسٹائی کی داخلی زندگی مغرب سے پیوستہ ہے' وہ پطرسی تصورات کا پیروکار ہے اگرچہ وہ ان سے انکار بھی کرتا ہے۔ مغرب منفی اقدار سے کبھی مبرا نہیں رہا۔ گردن زدنی کی مشین (مقصلہ) بھی ورسائلیز ہی کی دختر تھی ---- اور اس غصے کی مظہر تھی جو اسے مغرب کے لیے تھا ٹالسٹائی اس سے کبھی نجات حاصل نہیں کر سکا۔ اسے مغرب سے نفرت ہے' یہ نفرت اسے اپنی ذات سے بھی تھی' اسی جذبے نے اسے بابائے بالشویزم بنا دیا۔ اس مزاج' کم طاقتی' مجبوری اور ۱۹۱۷ء کا انقلاب اس کی بعداز مرگ طبع شدہ کتاب "روشنی ظلمات" میں دکھائی دیتی ہے۔ اس حقیقت سے دستاوسکی کبھی آشنا نہ ہو سکا' کہ اس کی جذباتی زندگی میں مغربی تصورات بھی مکمل صورت میں رچے بسے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ روس اور یورپ دونوں اس کے وطن ہیں۔ وہ پیٹری تعلیمات اور انقلاب دونوں سے آگے گزر گیا اور بعد میں مڑ کر دونوں کو دیکھنے لگا۔ اس کی روح میں ماورائیت کے شدید اثرات موجود ہیں' اس کی آرزوئیں ناتمام مگر مستقبل یقینی تھا "میں مغرب کا سفر کروں گا" دستاوسکی کا ایک کردار اپنی ماں الیوشا سے کہتا ہے۔ میں یہ بھی اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ وہاں جا کر میں صرف گرجا ہی جاؤں گا اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ گرجا گھر مجھے بہت عزیز ہے' میرے عزیز وہاں مردہ پڑے ہیں۔ ان کی قبروں کا ہر پتھر ان کی داستان بیان کرتا ہے۔ وہ اپنی کامرانیوں پر یقین کامل اور اپنی صداقتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور انھیں اپنے علم پر اس قدر اعتبار ہے ---- میں اب بھی یہ جانتا ہوں ---- کہ میں ان پتھروں پر گر کر ان کا بوسہ لوں گا"۔ اس کے برخلاف ٹالسٹائی ایک انتہائی فہیم' روشن خیال' اور مجلسی آدمی ہے۔ وہ جو کچھ اپنے متعلق دیکھتا ہے' وہ اسے بڑے شہروں اور مغربی نوعیت کے

مسائل کے پس منظر میں محسوس کرتا ہے جبکہ دستاوسکی یہ بھی نہیں جانتا کہ مسئلے کی نوعیت کیا ہے۔ ٹالسٹائی فی نفسہ مغربی ثقافت کا ایک حصہ ہے۔ وہ پیٹر اور بالشویک ازم کے درمیان ایستادہ ہے۔ نہ وہ خود اور نہ مذکورہ عناصر روسی سرزمین تک رسائی حاصل کر پاتے ہیں۔ وہ عوامل جن کے خلاف وہ جنگ لڑ رہے ہیں' دوبارہ اسی قابل شناخت حالت میں رونما ہو جاتے ہیں۔ ان کی مخالفت کسی القا پر مبنی نہیں بلکہ ذہانت کی پیداوار ہے۔ ٹالسٹائی کا نظریہ مخالفت جائیداد ایک معاشی تصور ہے اور معاشرے سے نفرت ایک مصلح کی پکار ہے اور ریاست سے نفرت ایک سیاسی مفکر کی صدا ہے' لہٰذا مغرب پر اس کے اثرات بہت گہرے ہیں۔ وہ اپنی فکر میں مارکس' ابسن اور زولا کے کسی نہ کسی پہلو سے متاثر ہے۔

اس کے برخلاف دستاوسکی ہر اس گروہ سے متاثر ہو جاتا ہے جس کا قدیم عیسائیت سے تعلق نہ ہو۔ اس کے ناپسندیدہ کردار روسی فلسفیوں نے بطور رجعت پسند نشان زد کیے مگر وہ خود ان تضادات سے بے خبر تھا۔ "قدامت پسند" اور "انقلابی" کی مغربی اصطلاحات سے وہ بے اعتنا رہا۔ اس کی روح ہر شے کے پس منظر میں جھانک لیتی تھی جسے ہم معاشرتی عمل قرار دیتے ہیں کیونکہ اس دنیا کی اشیا اس کے نزدیک اتنی غیر اہم تھیں کہ ان کی اصلاح لاحاصل تھی۔ کوئی بھی حقیقی مذہب حقائق کی دنیا کی اصلاح نہیں کرتا اور دستاوسکی بھی ہر قدیم روسی کی طرح دنیا کے حقائق سے بے خبر ہے اور کسی دوسری دنیا میں رہتا ہے جو ایک ماورائی اور مابعدالطبیعیاتی عالم ہے۔ اشتراکیت کے کس روحانی خلجان کا تعلق ہے؟ کوئی ایسا مذہب جو معاشرتی مسائل کا حل پیش نہیں کرتا وہ مذہب کہلانے کا مستحق نہیں رہا۔ مگر وہ حقیقت جس میں دستاوسکی زندگی بھر جتلا رہا' وہ براہ راست اس کی اپنی مذہبی تخلیق ہے۔ اس کی تخلیق الیوشا تمام ادبی تنقید سے بالا تر رہی ہے۔ اس پر روس میں بھی تنقید نہیں ہوئی۔ اگر وہ یسوع مسیح کی سوانح عمری لکھتا ---- جیسا کہ اس کا ارادہ تھا ---- تو وہ ویسی ہی ایک مذہبی تخلیق ہوتی جو ابتدائے عیسائیت میں مروج تھی' جو پوری طرح سے مروجہ کلاسیکی اور یہودی ادبی اسلوب سے مختلف ہوتی۔ اس کے برعکس ٹالسٹائی مغربی ناول کا ماہر ہے ---- اینا کری نینا' ہر مدمقابل سے بہت آگے ہے اور اپنے موجودہ لباس میں بھی ایک مہذب معاشرے میں نمایاں مقام کی حامل ہے۔

اس مقام پر ہم آغاز و انجام کو باہم متصادم پاتے ہیں۔ دستاوسکی ایک راہب ہے اور ٹالسٹائی صرف ایک انقلابی ہے۔ ٹالسٹائی جو پطرس کا صحیح جانشین ہے اور صرف اسی سے متاثر ہے' اشتمالیت کے ظہور کا باعث ہے' جو محض اس صدی کی پیداوار نہیں بلکہ پطرس کی تعلیمات کا اثر ہے۔ اسی سے مابعد الطبیعیات کی تردید ہوئی اور اسے معاشرے سے خارج کر دیا گیا اور "فیستا" ایک نئی قلب ماہیت وجود میں آئی۔ اگر پیٹرز برگ کی تعمیر عیسائیت کے خلاف پہلا کارنامہ ہوتا مگر اپنے معاشرے کی اپنے ہاتھوں تباہی میں اس کا دوسرا نمبر ہے' کسان آبادی کو اس کا احساس ہے' کیونکہ اشتمالی کوئی قوم نہیں' بلکہ کسی قوم کا کوئی حصہ بھی نہیں بلکہ اس پطری معاشرے میں اس کا تعلق ادنٰی طبقہ سے ہے۔ مگر ان کو یہ حیثیت بھی حاصل نہیں اور اس کے نتیجے میں اس ادنٰی گروہ کے خلاف نفرت کے جذبات برانگیختہ ہیں۔ یہ کیفیت مہذب شہری آبادی کے ساتھ

مخصوص ہے ---- معاشرتی سیاست کا ذہین طبقہ پہلے تو رومانی ادب تخلیق کرتا ہے اور پھر معاشی مسائل' آزادی اور اصلاحات کی زبان میں بات کرنے لگتا ہے اور اسے ایسے ناظرین دستیاب ہو جاتے ہیں جن کا تعلق محروم معاشرتی طبقے سے ہوتا ہے' اصل روسی دستاوسکی کے پیروکار ہیں۔ ممکن ہے کہ اس نے دستاوسکی یا کسی اور مصنف کا کبھی مطالعہ نہ کیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روس کی خاصی بڑی آبادی لاعلم ہے۔ مگر وہ اپنے سچے دل سے خود ہی دستاوسکی ہے۔ ہر روسی حضرت عیسیٰؑ کے وجود کو ایک انقلابی سمجھتا ہے اور خود بھی اسی طرز عمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ مگر ذہنی طور پر اتنا متعصب نہیں ہوتا اور انھیں اپنا سب سے بڑا دشمن دستاوسکی کے وجود میں نظر آتا ہے' جس وجہ سے روسی انقلاب کو قوت حاصل ہوتی' وہ دانش ور طبقے کی نفرت نہ تھی' یہ عوام خود تھے' جو نفرت کے بغیر ایک بیماری کو ختم کرنا چاہتے تھے' اور بغاوت کر کے قدیم مغربیت کے آثار کو تباہ کر دیا اور دیگر ناپسندیدہ اقدار کو وہ یکے بعد دیگرے اسی طرح ختم کرتے رہیں گے کیونکہ اس دیہاتی آبادی کی آرزو اپنی زندگی کا اسلوب' اس کا اپنا مذہب اور اس کی اپنی تاریخ ہے۔ ٹالسٹائی نے عیسائیت کو غلط سمجھا' جب وہ یسوع مسیح کا ذکر کرتا تو اس کے ذہن میں مارکس ہوتا' مگر دستاوسکی جس عیسائیت کا معتقد تھا وہ آئندہ ہزار سال تک بھی قائم رہے گی۔

(۳)

قلب ماہیت کے باہر اور زیادہ قوت کے ساتھ متوازن ملک' جس پر کلاسیکی اثرات کمزور ہوں' وہاں حقیقی جاگیرداری نظام قائم ہو جاتا ہے۔ مذہبی اور صوفیانہ اثرات جاگیردارانہ وفاداری' مذہبی حکومت' جہاد کی روح عرب ثقافت کی ابتدائی صدیوں میں یہ تمام عناصر موجود تھے اور ان کے متعلق ہمیں زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل ہو گی' جونہی ہم ان کا گہرا مطالعہ کریں گے۔ سیپ ٹی می اس سیویرس کے بعد بھی یہ عوامل برائے نام موجود تھے مگر مشرق میں یہ نوابی جاہ و حشم کا معاملہ ہے۔ لشکری تمام دنیا کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں۔ سرکاری ملازم نامزد کیے جاتے ہیں مگر فی الواقع اسے مسند نشینی اور عطائے جاگیر کا نام دینا چاہیے۔ مغرب میں سیزر کا خطاب نوابوں کو دیا جاتا تھا' مگر مشرق میں خلافت کے اولیں دور میں بھی رومیوں کی پختہ عمر ریاست کی تقلید کی جاتی۔ ساسانی سلطنت کے دور میں حورات میں (جو جنوبی عرب کا علاقہ تھا) اس علاقے میں ایک خالص جاگیردارانہ نظام قائم تھا۔ شاہ سبا کی حب منفعت اور شمیر جہارش ہمیشہ کے لیے یادگار رہیں گے جس طرح کہ رولینڈ یا آرتھر کا عہد ناقابل فراموش ہے۔ عرب رزمیے جو ہمیں ایران سے لے کر چین تک کی سلطنت کا بیان کرتے ہیں منائین کی حکومت اس کے ساتھ ساتھ واقع تھی ۔ معائین کی حکومت بنی اسرائیل کی سرحدوں کے ساتھ ساتھ تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح واقع تھی اور اس کے آثار (جن سے اس کا موازنہ مائی سینائی اور طائرین سے ہوتا ہے) افریقہ میں کافی دور تک چلے گئے ہیں ۔ مگر اب جاگیرداری کا عہد تمام عرب بلکہ حبشہ کی پہاڑیوں تک پھیل چکا تھا ۔ اکسوم میں ابتدائی عیسائی دور میں مضبوط قلعے اور شاہی قبرستان تعمیر ہوئے۔ ایک قبر کا تعویذ دنیا کی سب سے بڑی حجری تعمیری سمجھا جاتا ہے ۔ بادشاہوں کے مقبروں کے عقب میں امرا اور کبار کی قبریں ہیں۔ امرا کی وفاداری ہمیشہ مشکوک رہی

کیونکہ انھوں نے شاہی اختیارات کو محلات تک محدود کر رکھا تھا۔ جنوبی عرب اور اکشوم کی حکومتوں کے درمیان لا مختتم یہودی اور عیسائی جنگیں فی الحقیقت مہم جوئی کی نوعیت کی تھیں۔ بار بار بعض قلعوں کی ملکیت کے تنازع پر شروع ہو جاتیں' سبا پر ہمدانیوں کی حکومت تھی ---- جنھوں نے زمانہ مابعد میں عیسائیت اختیار کر لی' اس لیے انھیں اکشوم کی عیسائی حکومت کی مدد حاصل ہو گئی' جس کا روم سے بھی اتحاد تھا جو تقریباً ۳۰۰ میں سفید نیل سے لے کر خلیج فارس کے سومالی ساحل تک پھیلی ہوئی تھی۔ ۵۲۵ء میں اس نے حماری یہودیوں کو شکست دے دی۔ ۵۴۲ء میں معارب میں ایک شاہی ضیافت دی گئی۔ اس میں رومی اور ساسانی سفیر دونوں موجود تھے۔ آج بھی اس علاقے میں متعدد قدیم مضبوط قلعے موجود ہیں' جو قدیم زمانے میں مافوق الفطرت ہستیوں سے منسوب تھے۔ گومدان کا مضبوط قلعہ بیس منزلہ ہے -

ساسانی حکومت نے مقامی سرداروں کو جنھیں دخان کہتے تھے' زیرِ نگیں کر لیا تھا' جبکہ قدیم' مشرقی ہوہن شافن کا شاندار دربار ہر لحاظ سے ان باز نطینیوں کے لیے ایک نمونہ تھا جو بعد میں اس علاقے پر قابض ہوئے۔ یہاں تک بغداد کے عباسی حکمرانوں نے بھی اس کی نقل کرنا موزوں سمجھا اور ساسانی طریق حکومت کو بڑے پیانے پر مروج کیا اور دربار کو وہی زندگی اور اسلوب بخشا جو ساسانیوں کا طرہ امتیاز تھا۔ شمالی عرب میں غسانی اور لمیدی درباروں میں ایک حقیقی رومانی غنائی شاعری کا آغاز ہوا اور یہ شمشیرزن شاعر آپس میں الفاظ برچھوں اور تلوار کی لڑائیاں بھی اکثر لڑتے رہتے تھے۔ ان میں سے ایک یہودی تھا جو قلعہ ابلاق کا قلعہ دار تھا۔ اس کا نام سیموئیل تھا۔ اس نے شاہ حرا کا مقابلہ کیا اور قلعہ بند ہو گیا اور پانچ قیمتی خلعت دے کر رہائی حاصل کی۔ اس غنائیہ شاعری کے حوالے سے عرب کے متاخر دور میں بہت ترقی ہوئی۔ ان شعرا کی مثال "او ہلینڈیا ایکن ڈارف سے لے کر والٹرودن ڈرووگل ویلڈ" جیسے مغربی شعرا سے دی جا سکتی ہے۔

عیسوی تقویم کی ابتدائی صدیوں سے متعلق ان ممالک کے سلسلے ہمارے ماہرین آثار قدیمہ اور ماہرین مذاہب نے کبھی دھیان نہیں دیا' چونکہ ماہرین سلطنت روم سے وابستہ تھے اس لیے بحیرہ روم کے خطے کے ممالک کو محض قدیم اور غیر اہم آبادیوں پر مشتمل سمجھتے تھے' مگر پارتھی لشکروں کے دستے بار بار رومی افواج پر حملے کرتے۔ یہ مزدک کے پیروکار اپنے آپ کو سورما سمجھتے تھے اور ان میں مذہبی جنگ آزمائی کا جذبہ بھی موجود تھا۔ اگر یہ قلب ماہیت کا معاملہ نہ تھا تو ان کی جنگ آزمائی صرف عیسائیت کے خلاف تھی' جوش و خروش تو موجود تھا۔ تری ٹولین نے ایک عیسائی ملیشیا کا ذکر کیا ہے جس کے لشکری قسم وفا کے ساتھ میدان میں اترتے تھے مگر کچھ مدت بعد انھوں نے حضرت عیسیٰؑ کا دین قبول کر لیا اور ان کے مخالفین یعنی کفار سے لڑنے لگے۔ مگر اس زمانے میں رومی ابھی عیسائیت سے آشنا نہیں ہوئے تھے اور انھیں عیسائی لشکریوں اور سپہ سالاروں سے آشنائی نہ تھی' وہ صرف رومی فوجی قوت ہی کو اہمیت دیتے تھے۔ ابھی قلعے تعمیر نہیں کیے تھے۔ صرف بعض پشتے بنائے گئے تھے' کھیلوں کے مقابلوں کی بجائے کشت و خون ہی میں مشغول رہتے تھے۔ اس کے باوجود یہ جنگ آزمائی' فی الحقیقت پارتھی لشکریوں کے خلاف جنگ نہ تھی بلکہ یہودیوں کا اعلان جہاد

تھا جب ۱۱۵ میں ٹروجن مشرق کی سمت چڑھ دوڑے تھے اور ان کا ارادہ یروشلم کو تباہ کرنا تھا۔ کفار (یونانی) کی تمام قبرصی آبادی جو ۲۴۰۰۰۰ افراد پر مشتمل تھی' قتل کر دی گئی نسیوں کا یہودیوں نے دفاع کیا اور بہادرانہ کارنامے انجام دیے۔ جنگ جو ادرابین (دریائے دجلہ کی بالائی وادیوں میں) میں یہودی ریاست قائم تھی۔ روم کے خلاف تمام پارتھی اور اہل فارس کی جنگیں' شہری اور دیہاتی اور جاگیردارانہ افواج کی جنگیں آگے بڑھ کر لڑی گئیں۔

باز نطینی بھی عرب جاگیردارانہ عہد کے اثرات سے محفوظ نہ رہے اور متاخر انتظامی اصلاحات کے پردے میں جاگیر داری محصول عائد کر دیا گیا۔ (بالخصوص ایشیائے کوچک کے وسطی علاقوں میں) ان علاقوں میں بعض ایسے طاقت ور خاندان آباد تھے جن کی وفاداری مشکوک تھی جو شاہی تخت و تاج پر قبضے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یہ لوگ آغاز ہی سے دارالحکومت میں رہائش رکھنے کے پابند تھے اور وہ اسے حکومت کی اجازت کے بغیر چھوڑنے کے اختیار سے محروم تھے۔ یہ اقلیت بعدازاں اپنے اپنے صوبوں میں بڑی بڑی جاگیروں پر قابض ہو گئی۔ چوتھی صدی کے بعد انھوں نے آزاد ریاستوں کی حیثیت اختیار کر لی اور آہستہ آہستہ وہ شاہی اقتدار سے باہر ہو گئے -

اس دوران مشرق میں مقیم جدید رومی افواج دو صدیوں سے بھی کم مدت میں جاگیردارانہ قدیم نوعیت کی افواج میں تبدیل کر دی گئیں۔ سیوا روس کے عہد میں رومی لشکری تنظیم نو کے عمل کے تحت غائب ہو گئے - یہ واقعہ ۲۰۰ء میں ظہور میں آیا جبکہ مغرب میں افواج کے انبوہ کثیر جمع ہو رہے تھے۔ مشرق میں اگرچہ تاخیر سے ہی مگر ایک حقیقی حکومت چوتھی صدی عیسوی میں قائم ہو گئی۔ موم سن نے اس حقیقت کو بہت عرصہ قبل بیان کر دیا تھا مگر اس کی اہمیت بیان نہیں کی - نوجوانوں کو شاہ سواری' برچھا بازی اور تیراندازی کی مناسب تربیت دی جاتی۔ ۱۶۰ کے قریب شہنشاہ گیلی نس جو افلاطینس کا دوست اور ٹرائر کے پورٹاریگا کا بانی تھا اور فوجی بادشاہوں میں بدقسمت اور قابل توجہ تھا' اس نے جرمنوں اور مور باشندوں کو جمع کر کے ایک رسالہ مرتب کیا جس میں پیدل افواج بھی شامل تھیں صرف ایک اہم تبدیلی کا پتہ چلا ہے کہ قدیم شہری دیوتاؤں کو ترک کر دیا گیا اور فوجی مذہب میں ان کے لیے مطلق گنجائش نہیں رہی۔ مگر جرمن دیوتا جن کا تعلق ذاتی شجاعت سے تھا' مارس اور ہرکلیز کے نام سے باقی رہے دائیو قلیطنی کے پلاطینی ان پر سطوریوں کے نعم البدل ثابت نہ ہوئے جنھیں سپٹی می اس نے سیوی روس نے ختم کر دیا تھا' مگر ایک محدود اور نظم و ضبط کی پابند فوج جو سرداروں پر مشتمل تھی قائم رکھی گئی اور ان کے ساتھ متعدد دستوں کا الحاق کر دیا گیا۔ یہ قدیم دور ہی کی حکمت عملی تھی جو اپنے ذاتی حوصلے پر فخر کرتی تھی۔ حملہ کی صورت جرمن افواج سے نقل کی گئی جیسے "ریچھ کے سر" کا نام دیا جاتا ہے۔ ایک دبیز مجموعہ افواج جسے "گیو ی یاف" کا نام دیا جاتا ہے۔ جسٹینن کے عہد میں ہمیں معلوم ہوتا ہے' چارس پنجم کی حکمت عملی سے استفادہ کیا (۳۱) اور نئی افواج کو علاقائی بنیادوں پر استوار کیا گیا (۳۲) نارسس کی اس مہم کے متعلق پروکوپی اس نے تفصیلات اس طرح مہیا کی ہیں گویا کہ وہ ویلنسٹین کے کسی بڑے بھرتی کے میلے کی داستان سنا رہا ہو

مگر ان ابتدائی صدیوں میں' مجوسی نوعیت کے مذہبی اور صوفیانہ مدارس قائم کیے گئے جو بہت مشہور ہوئے' فارسی مدارس کٹیسی فون' ری سائنہ 'گنڈیسی پورا' اور سورا' نہاویہ' تسرین کے یہودی مدارس کی روایت موجود تھی۔ یہ مدارس فلکیات' فلسفہ' کیمیا اور طب کے عظیم الشان مراکز تھے' مگر مغرب انھیں قلب ماہیت کے زیر اثر صحیح مقام نہ دے سکا' مگر بنیادی طور پر مجوسی عناصر علوم نے مختلف مقامات پر اپنے عروج و کمال کا مظاہرہ کیا۔ اسکندریہ میں فلسفہ یونان کے مختلف شعبہ جات اور بیروت میں رومی قانون' کلاسیکی زبانوں میں تحریر کیے گئے ادبی اور علمی کارناموں کی سرپرستی کی گئی اور کلاسیکی تہذیب کے تکلیف دہ منطق کو نئی تشکیل دی گئی۔ یہی عہد تھا (ابھی اسلامی عہد کا آغاز نہیں ہوا تھا) جس میں عربی سائنس کا آغاز ہوا۔ مگر اس کے باوجود ہمارے ماہرین لسانیات نے صرف اسے دریافت کیا ہے جو اسکندریہ اور انطاکیہ میں حاصل کیا گیا انھیں اہل عرب کی علمی دولت اور عربی عروج کے دور کے متعلق ذرہ بھر بھی علم نہ تھا۔ وہ محور تحقیق اور تصورات سے محروم رہے اور گھوڑے کے آگے گاڑی جوتتے رہے اور یہ کہتے رہے کہ عرب کلاسیکی روایات کے تابع تھے۔ بالخصوص ہر وہ شے جو عدلیہ کے نقطہ نظر کے خلاف تھی یا لسانیات کی حدود سے باہر تھی اسے مغربی محققین نے کلاسیکی عہد کے دور آخر سے منسوب کر دیا۔ اس کی بڑی وجہ قدیم عربی مزاج کی داخلیت ہے اور اسی وجہ سے ہمیں عربی مذہب کے متعلق قلب ماہیت کا گمان ہوتا ہے۔

(۴)

کلاسیکی مذہب اپنے متعدد مسالک کی بنیاد پر زندہ رہا جو اپنی ہیئت میں فطری اور بدیہی شمسی تھے اور کوئی اجنبی ان میں شامل نہیں ہو سکتا تھا' جونہی اس نوعیت کے مسالک پیدا ہوں تو یہ کلاسیکی ثقافت کی علامت ہوتے ہیں اور جب ان کی روح میں تبدیلی آتی ہے' جیسا کہ رومی ثقافت کے دور آخر میں ہوا' تو اس کے ساتھ ہی متعلقہ ثقافت بھی ختم ہو جاتی ہے' اپنی سرزمین کے باہر نہ تو ان کی صورت حقیقی ہوتی ہے اور نہ وہ زندہ ہوتے ہیں۔ روحانی مظاہر کسی خاص مقام کے لیے اور اسی حوالے سے تشکیل پاتے ہیں اور ایک ہی مقام کی تخلیق ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق جامد اقلیدسی احساس سے ہوتا ہے۔ نتیجتاً" روحانیت سے انسان کا رابطہ مقامی مسلک کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس لحاظ سے انسان اور روحانی نظام کی اہمیت عقائد کی بجائے رواجات کی بجا آوری کے طریق میں رہ جاتی ہے' جس طرح کہ کلاسیکی دور کی آبادی مختلف مقامات پر پھیلی ہوئی تھی۔ فطری طور پر اس کا مذہب بھی مختلف مسالک میں تقسیم ہو جاتا ہے اور ان میں سے ہر ایک دوسروں سے مختلف تھا۔ وہ صرف ان کی تعداد میں اضافے میں دلچسپی رکھتے تھے' ان کے دائرہ کار سے وہ غیر متعلق تھے۔ کلاسیکی مذہب میں اضافہ تعداد ہی ترقی کا معیار تھا' جس میں کسی قسم کے تبلیغی عمل کو نظرانداز کر دیا جاتا تھا اگرچہ ایتھنز کے آخری دور میں خدا اور اس کی عبادت کا طریق کسی حد تک عمومی تصور کے قریب آ گیا تھا مگر یہ صرف فلسفے کی حد تک تھا' اس میں مذہب کا کوئی دخل نہ تھا۔ اس کا پیغام چند مفکرین

تک محدود تھا' مگر قوم کے متعلق معمولی سا احساس بھی نہ تھا ---- شہری نظام کا لب لباب یہی ہے۔

مجوسی مذاہب کی ہیئت اس کے بالکل برعکس ہے۔ کلیسا پر مبنی برادری جزو ایمان ہے' جس کا کوئی گھر نہیں اور ارضی حدود کا اس میں کوئی دخل نہیں' جو صرف حضرت عیسیٰؑ کے اس قول پر قائم ہے "جب دو یا زائد اشخاص میرے نام پر جمع ہوتے ہیں' ان میں میں بھی موجود ہوتا ہوں"۔ یہ بدیہی امر ہے کہ اس قول پر ایمان خدا کی وحدانیت پر یقین کی علامت ہے' وہ حق ہے اور باطل برائی کی علامت ہے خدا اور بندے کے مابین تعلق کی بنیاد صرف اقرار باللسان تک محدود نہیں بلکہ تصدیق بالقلب بھی ضروری ہے' جسے سحر کی علامت سے واضح کیا جاتا ہے (یہ عمل محض علامتی ہوتا ہے)۔ اگر یہ عمل موثر ہوں تو پھر ان کا علم اور اہمیت گرجا گھر میں ہوتی اس لیے ہر مجوسی مذہب کا مرکز ثقل مسلک کی بجائے عقائد میں ہے۔

جب تک کلاسیکی ثقافت روحانی طور پر مضبوط رہی' مشرق کے کلیساؤں کا اسلوب مغرب کی طرف منعطف رہا۔ یہ القا کا سب سے اہم پہلو ہے۔ ایرانی مذہب متھرا مسلک کی صورت اختیار کر گیا' کلدانی ---- شامی عنصر میں ستارہ پرستی کا مسلک شامل ہو گیا اور جبل (جیوپیٹر' مشتری' دولی چینس سیازی اس سول انوکٹس انرکیٹس) یہودیوں کا معبود یا ہوے (کیونکہ مصری قبائل کے بطلیموسی زمانے کے معبود پر کسی اور نام کا اطلاق ممکن نہیں) اور ابتدائی دور کی قدیم عیسائیت ---- جیسا کہ پال کے مکشوفات اور رومی زمین دوز قبرستانوں سے صاف واضح ہوتا ہے یہ لوگ عیسائی ہی تھے ---- یہ لوگ خواہ کتنی بلند آواز سے دیگر مذاہب کا نام لیں (انھوں نے حدری دور ہی سے قدیم دیوی دیوتاؤں اور کلاسیکی خداؤں کو پس پشت ڈال دیا تھا)۔ ان سے امید ہے کہ وہ خدائے واحد کے وجود کو تسلیم کریں گے۔ آئی سیس نے دعوی الوہیت کیا فی الحقیقت اس کا مسلک قدیم کلاسیکی انقطاعات سے مختلف نہیں یعنی وہ لامتناہیت کی کثرت کے قائل ہیں ہر معاشرہ صرف اپنے آپ تک محدود ہے اور اپنا مقامی مسلک رکھتا ہے۔ تمام مندر' قبرستان' متھرا' راہبوں کی قیام گاہیں سب مقدس مقامات سمجھے جاتے تھے' جن کے ساتھ (بطور احساس رسمی اظہار نہیں) ہر قسم کے دیوتا مسلک سمجھے جاتے تھے اس کے باوجود اس تقدیس میں بھی مجوسی احساس موجود ہے۔ کلاسیکی مسالک پر عمل کیا جاتا ہے اور ہر شخص جتنے مسالک پر چاہے عمل کر سکتا ہے مگر کوئی شخص بھی ان میں سے کسی ایک مسلک کا پابند نہیں ہوتا۔ قدیم دور کے نظام تبلیغ میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا مگر دور جدید میں کوئی اس پر دھیان نہیں دیتا اور مذہب کی منشا زیادہ سے زیادہ عقیدے کی پابندی پر مائل ہوتی جا رہی ہے۔

دوسری صدی کے بعد جبکہ شمسی ثقافت مٹتی جا رہی تھی اور اس کی جگہ مجوسی روح غلبہ پا رہی تھی تعلقات کی نوعیت برعکس ہو رہی ہے۔ قلب ماہیت کے نتائج جاری ہیں' مگر اب یہ مغربی مسالک کا دور ہے جو مشرق کے کلیسا پر حاوی ہو رہا ہے ---- گویا علیحدہ علیحدہ مسالک سے ایسے معاشروں کی بنیاد پڑتی ہے جو ان معبودوں پر اعتقاد رکھتے ہیں اور ان کے رسوم و رواجات پر عمل بھی کرتے ہیں' جس طرح قدیم دور میں

اہالیان فارس اور یہود وجود میں آئے' اسی طرح یونانی مجوسیوں کی قوم کا وجود قائم ہوا۔ جب تفصیلات کا ایک سخت نظام حاوی ہو جاتا ہے اور تفصیلات طے ہو جاتی ہیں' قربانی کا عمل' اور پر اسراریت عقیدے کا جزو قرار پاتے ہیں اور ان اعمال کی داخلی اہمیت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں' اب مسالک ایک دوسرے کی نمائندگی کرنے لگتے ہیں اور ان پر عمل کا قدیم عمل ترک کر دیا جاتا ہے بلکہ وہ اس کے عادی ہو جاتے ہیں اور چھوٹا سا مقامی دیوتا ---- تبدیلی کے عمل کے اظہار کے بغیر ---- اس مقام کا سب سے بڑا معلوم خدا بن جاتا ہے۔

جس احتیاط سے کہ تطبیق احتیاط کا اس دور میں جائزہ لیا جاتا ہے اس کی تعبیر کا راز ---- مشرقی کلیسا کو مغربی مسالک میں تبدیلی' کے عمل کا جائزہ نہیں لیا گیا ۔ مگر اس کلید کے بغیر عیسائیت کی ابتدائی تاریخ کا سمجھنا مشکل ہے۔ روم میں اختلاف مسیح اور متھرا کے مابین تھا' جبکہ مسکی ہیئت انطاکیہ کے مشرق میں طے ہو رہی تھی' جہاں پر کہ ایرانی اور عیسائی عبادت گاہوں کا تنازع چل رہا تھا مگر عیسائیت کو جو سب سے بڑی جنگ لڑنی پڑی جبکہ یہ قلب ماہیت کے عمل سے گزری اور اس نے اپنی ترقی کے لیے اپنا رخ مغرب کی طرف موڑ لیا تو اس کی صورت قدیم کلاسیکی دیوی دیوتاؤں سے مختلف نہ تھی۔ اس صورت حالات میں یہ کبھی بھی مقامی دیوتاؤں کے مسالک کے مقابل نہیں آئی کیونکہ وہ مدت سے ختم ہو چکے تھے۔ سب سے بڑا دشمن کفر یعنی یونانی انداز فکر تھا جو ایک طاقت ور جدید مسلک کی صورت میں ابھر رہا تھا اور اس کی روح بھی عیسائیت سے مختلف نہ تھی۔ بالآخر رومی سلطنت کے مشرق میں ایک کلیسا کی بجائے دو وجود میں آ گئے۔ اگر ان میں ایک مسیح کے پیروکاروں پر مشتمل تھا' تو دوسرا ان معاشروں کا مجموعہ تھا' جن کے ہزاروں مختلف نام تھے۔ شعوری طور پر وہ ایک ہی روحانی اصول کے پیروکار تھے۔

کلاسیکی بردباری پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ زیادہ وضاحت سے غالباً اس کا مشاہدہ مذہبی رواداری کی صورت ہی میں کیا جا سکتا ہے اور ایسے حدود کلاسیکی مذہب میں بھی دوسرے مذہبوں کی طرح موجود تھے۔ ان مذاہب کی یہ بڑی خصوصیت تھی کہ یہ متعدد تھے اور صرف عمل تک محدود تھے۔ ورنہ ان کے لیے بردباری کا لفظ صحیح معانی میں استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مگر مسلکانہ رواجات کا احترام جیسا کہ بیان کیا جاتا تھا اور کئی فلسفیوں نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اجنبیوں کو بھی اس حد تک رعایت موجود تھی کہ اگر ان سے کسی قانون یا رواج کی خلاف ورزی سرزد ہو جائے تو ان سے باز پرس نہ ہوتی تھی۔ مجوسی عبادت گاہوں کی تباہی ایک مختلف معاملہ ہے۔ کفار کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اپنے عقیدے کے خلاف اعمال کے لیے منع کرے اور غلط عقائد کا سد باب کرے۔ کلاسیکی مسلک عیسائی مسلک کو برداشت کر لیتا اور اس طرح اپنے متعدد مسالک میں ایک اور کا اضافہ کر لیتا مگر ان کا مذہبی عبادات کا نظام عیسائیوں کے کلیسا کی مخالفت پر مجبور تھا۔ عیسائیت کے خلاف بڑے بڑے مظالم (کفار کے خلاف دور آخر میں عیسائی مظالم کے مطابق) رومی ریاست کی طرف سے سرزد نہیں ہوئے بلکہ دوسرے مسالک کے مذہبی حلقوں کی طرف سے کیے گئے اور ان کی نوعیت سیاسی تھی' کیونکہ کلیسا قوم اور وطن دونوں کی علامت تھا۔ یہ مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ سیزر کی عبادت میں دونوں مقاصد

پنہاں ہیں مغرب کے کلاسیکی شہروں میں سب سے بڑھ کر روم میں ڈائی وس کا خصوصی مسلک کا تقاضا کہ خدا اور بندے کے مابین تکلم میں معاشرتی اور قانونی دونوں احترام مد نظر رہیں گے۔ مشرق میں اس کے برعکس سیزر کی نجات دہندہ حیثیت زیادہ قابل احترام تھی وہ تمام تلیسقات کا خدا تھا' جسے کلیسا اظہار کی قومی ہیئت عطا کرتا تھا۔ بادشاہ کے لیے قربانی کلیسا کی عشائے ربانی کا مقصد اولیٰ تھا۔ یہ عیسائیوں کے اصطباغ سے ملتی جلتی رسم تھی۔ لہٰذا دور ظلم و ستم میں احکام اور ان کی عدم تعمیل کی علامتی اہمیت کو سمجھنا آسان ہے۔ ان تمام عبادت گاہوں اور ان کے مقدس اسرار ' عشائے ربانی' اور اہل فارس کا ثمر حیات کا نچوڑ کر پینا' یہودیوں کی عدم توجہ اور عیسائیوں کی رسم پتسمہ جو آئی سیس اور سائبیل کے پیروکاروں میں بھی مروج ہے۔ ان کا ایک نظر مشاہدہ باہمی تبلیغ کی مشابہت کو بخوبی واضح کر دیتا ہے۔

تمام درست کلاسیکی اسرار' مثلاً" ایلی اوسیوس اور وہ جو فیثاغورث کے پیروکاروں نے ۵۰۰ ء کے قریب جنوبی اطالیہ کے شہروں میں رواج دی تھیں' وہ بعض مخصوص مقامات تک محدود رہیں اور محض علامتی افعال اور طریق کار ہی سے وابستہ رہیں۔ قلب ماہیت کے دائرہ عمل سے انھوں نے اپنے آپ کو آزاد کر لیا اور اپنے مخصوص مقامات سے ہٹ کر جہاں بھی معتقدین جمع ہو گئے' عمل کر لیا۔ اب ان کا مقصد مجوسی وجد کی کیفیت رہ گئی اور ترک دنیا صرف زندگی کے اسلوب کی تبدیلی کا نام رہ گیا۔ مقدس مقامات کے زائرین اپنے آپ کو متعلقہ مسلک کے مطابق ڈھال لیتے۔ جدید فیثا فورثیوں کے معاشرے میں جو ۵۰ ق م وجود میں آئی اور یہودی مسلک کے بالکل قریب تھی۔ اسے ماسوائے کلاسیکی فلسفے کے مدرسہ فکر کے علاوہ کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا۔ یہ تنظیم خالص توحید پر مبنی تھی' تطبیق مذاہب کے فرقوں میں تنہا نہ تھے جو عیسائی راہبوں اور مسلمان درویشوں کی تقلید کرتے تھے۔ ان معابد کفر کے اپنے درویش' ولی' پیغمبر معجزانہ کلام' مقدس کتب اور الہام اور وحی کا اپنا نظام تھا۔ ان تصورات کی اہمیت ایک شاندار تغیر وجود میں آیا جس پر ابھی تک تحقیق نہیں کی گئی۔ افلاطینس کے مقلدین میں سے لیمبی لی کوس نے ۳۰۰ ء میں ایک قدیم نوعیت کی دینیات کی بنیاد رکھی اور کفار کے معابد کے لیے ایک شدید نوعیت کا رواج ترتیب دیا اور اس کے شاگرد جولیئن نے اس پر پوری قوت صرف کی اور بالآخر اپنا عبادت خانہ اور مسلک لا متناہیت کے تصورات کے تحت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے عورتوں اور مردوں کے لیے ذکر و فکر کے حجرے بنانے کی کوشش بھی کی اس کے منصوبے کی بڑے زور شور سے تائید کی گئی۔ بالآخر اسے قتل کر دیا گیا اور اس کے مقلدین کو بادشاہ کی موت تک سخت تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے چند کتبات ابھی تک موجود ہیں۔ لیکن ان کا ترجمہ ممکن نہیں۔ لیکن ایک اصول موجود ہے کہ خدا صرف ایک ہے اور جولیئن اس کا رسول ہے ۔ اس کے دس سال بعد یہ گرجا ایک تاریخی یادگار کی صورت اختیار کر لیتا۔ مگر اس کا وجود قائم نہ رہا بالآخر نہ صرف اس کی قوت بلکہ اہم تفصیلات بھی متن کی صورت میں عیسائیت کو مل گئیں۔ یہ بالعموم کہا جاتا ہے کہ رومی کلیسا' رومی حکومت کی تشکیل کے مطابق ترتیب دیا گیا۔ یہ دعویٰ صحیح نہیں موخرالذکر تصور بھی کلیسا ہی کے تصور پر مبنی تھا۔ ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ دونوں باہم متعلق تھے کانسٹنٹائن بیک وقت اسقف اعظم اور مجلس منتظمہ کا سربراہ تھا۔ اس کی اولاد میں بھی یہ اعزازات برقرار رہے۔ پرجوش عیسائیوں

نے اسے ولی بنا لیا اور اسے نذرانے ادا کیے۔ سینٹ آگسٹائن نے دلیرانہ انداز میں اعلان کیا کہ عیسائیت سے قبل بھی سچا مذہب موجود تھا' اور اس کی صورت کلاسیکی تھی

(۵)

یہودیت کو سمجھنے کے لیے سائرس اور طائی طوس کے سارے دور کے متعلق تین امور کو ذہن میں رکھنا ہو گا۔ جس سے عالم طبقہ بے خبر نہیں ---- مگر ان کا تعلق لسانیات اور مذہبیات سے ہونے کی وجہ سے وہ انھیں اپنے مبحثات میں شامل نہیں کرتے۔ اول: یہودی ایک قوم ہیں۔ مگر ان کا کوئی وطن نہیں ان کا وجود اجماع پر قائم ہے اور اسی نوعیت کی دوسری اقوام میں گھل مل گئے ہیں اور اس طرح ایسی اقوام کی ایک اپنی دنیا قائم ہو گئی ہے۔ دوم: یروشلم قبلہ اول ہے ---- ایک مقدس مقام ہے۔ مگر یہ نہ کسی کا وطن ہے اور نہ روحانی مرکز اور آخر میں یہ کہ یہودی تاریخ عالم کا ایک عجوبہ ہیں اور یہ اس وقت تک ایسے ہی رہیں گے جب تک کہ ہم انھیں سمجھیں۔

یہ درست ہے کہ اخراج سے بعد کے یہودی قبل از اخراج بنی اسرائیل سے ممیز ہیں ---- ہیوگو ونکلر پہلا شخص تھا جس نے یہ حقیقت بیان کی کہ یہودی ایک مخصوص نوعیت کے انسان ہیں مگر مذکورہ نوعیت کے یہ واحد نمائندہ نہیں۔ اس عہد میں آرامی دنیا نے اپنے آپ کو اس نوعیت کے انسانوں کو مرتب کرنے کا عمل کیا جن میں اہل فارس اور کلدانی شامل تھے یہ سب ایک ہی ضلع میں رہتے تھے۔ مگر اس کے باوجود ایک دوسرے سے الگ تھلگ زندگی بسر کرتے اور ان کا رہن سہن خالص عربی تھا جسے عرف عام میں گیسٹو (یہود کی آبادی) کا نام دیا جاتا ہے۔

ان کا مذہب آغاز میں تو انبیاء کا مذہب کہلایا۔ ان کی داخلی کیفیت شاندار تھی یہ لوگ ۷۰۰ ق م کے قریب اپنے علاقے سے باہر نکلے اور قریب کے بادشاہوں اور باشندوں کو دعوت مبارزت دی وہ لوگ بھی آرامی پس منظر ہی سے متعلق تھے۔ اس امر پر جس قدر بھی غور کیا جائے آموس' اصالہ اور جرمیاہ اور دوسری طرف زرتشتی آپس میں قریبی رشتہ دار معلوم ہوتے ہیں' جو شے ان کو علیحدہ علیحدہ منقسم کرتی ہے وہ نیا عقیدہ نہیں بلکہ ایک دوسرے پر حملے کا منصوبہ ہے۔ اس قدیم اسرائیلی مذہب سے (جس کے پیرو کار وحشی کردار اختیار کر چکے تھے۔ اور کئی مذاہب کا مجموعہ تھے) یہ لوگ پتھروں اور درختوں کی پوجا کرتے تھے بے شمار مقامات ان کے نزدیک مقدس تھے (دان' بیتھل' جبران' شیچم' بیرشیبا اور گاپگال)۔ ایک واحد یا ہولے (یا الیوہیم) جس کا نام متعدد متجانس دیوتاؤں کی علامت ہے جن میں انسانی قربانی' رقص درویشاں اور مقدس بیسوائی کے تصورات بھی شامل ہیں اور انھیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے غلط منسوب کیا جاتا ہے۔ ان کے متعدد رواجات اور رزمیے بابلیوں کے دور آخر سے متعلق ہیں۔ کنعان میں طویل عرصے تک آباد رہنے کے باعث یہ لوگ زرعی معاشرے کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ دوسرا طبقہ

ایسا تھا جو قدیم ویدوں کا معتقد تھا اور آریائی ہیرو اور قزاقوں کا نام لیوا تھا' اسی راستے پر گامزن تھا بلا شک و شبہ اور یقینی طور پر انھیں حقیقت کی طرف مراجعت کے لیے بار بار دعوت کی ضرورت تھی تاکہ وہ اپنے مقدس مویشیوں کی شان و شوکت میں اضافہ کریں اور ان کی حفاظت بھی کریں۔ زردشت ۶۰۰ ق م کے لگ بھگ زندہ تھا' اسے اکثر غلط سمجھا گیا اور تنگ کیا گیا اور عالم ضعیفی میں منکرین کے خلاف جنگ لڑتا ہوا مارا گیا (۴۷) ---- یہ جرمیاہ کا ایک معزز اور محترم ہم عصر تھا وہ اپنی پیش گوئیوں کی وجہ سے اپنے ہم وطنوں کی نفرت کا شکار ہوا۔ بادشاہ وقت نے اسے قید کر دیا اور اس حادثے کے بعد مفرور اسے اٹھا کر مصر میں لے گئے اور وہاں جا کر قتل کر دیا گیا۔ میرا اعتقاد ہے کہ اس عظیم دور میں یہ تیسرا نبی تھا جو کلدانی مذہب میں پیدا ہوا۔

یہ اس کا علم فلکیات تھا جو ہر شخص پر اثر انداز ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ اسی کی شخصیت تھی جس نے اشعیا جیسے رتبے کا صاحب کمال پیدا کیا۔ یہ قدیم بابلی مذہب کے آثار کا تحفہ تھا (۴۸) ایک ہزار ق م کے قریب کلدانی قوم آرامی بولنے والے قبائل پر مشتمل تھی۔ یہی صورت اسرائیلیوں کی تھی کلدانی ساتیار کے قریب آباد تھے ---- حضرت عیسیٰؑ کی مادری زبان کو کبھی کبھی کلدانی بھی کہا جاتا ہے۔ سیلوکس کے زمانے میں یہ نام ایک طویل و عریض علاقے میں پھیلے ہوئے مذہبی معاشرے سے موسوم تھا۔ بالخصوص اس کے پجاریوں کے لیے یہی نام مخصوص تھا۔ کلدانی مذہب ستارہ پرستوں کا مذہب تھا جب کہ حمورابی سے قبل بابلی ستارہ پرست نہیں تھے۔ یہ مجوسی دنیا کی سنجیدہ ترین تشریح ہے۔ اس میں عالمی مغارہ اور قسمت کے تصورات کارفرما تھے (۴۹) اور اس کے نتیجے یہودیوں اور مسلمانوں کے بعض تصورات پر روشنی پڑتی ہے۔ بابلی ثقافت کلدانی مذہب کے آثار تھے کہ ساتویں صدی کے بعد علم النجوم کو ایک باقاعدہ سائنس کا مقام حاصل ہو گیا۔ یہ ایک مبنی برفراست مشاہدے کا فن ہے۔ اس نے بابلی' قمری ہفتے کی بجائے نجمی ہفتے کو رواج دیا۔ اشتار جو قدیم مذہب میں زندگی اور کامرانی کی دیوی کی حیثیت سے بہت مقبول تھی اب ایک ستارے کی حیثیت اختیار کر گئی اور اسے تموز کا نام دیا گیا جو ایک ثابت ستارہ تھا جو ہر روز مرتا اور زندہ ہوتا۔ یہ سبزیوں کا دیوتا قرار پایا۔ بالآخر توحید ناقص کا تصور ابھرا اور بخت نظر' مردوک اعظم (۵۰) ایک حقیقی دیوتا تھا جسے رحم کا دیوتا تصور کیا گیا اور نبو کو بورسیپا کا قدیم دیوتا قرار دیا گیا۔ یہ اول الذکر کا بیٹا اور عالم انسانیت کے لیے سفیر تھا۔ ایک صدی تک (۵۳۹-۶۲۵ ق م) کلدانی بادشاہ عالمی حکمران رہے مگر وہ ایک نئے مذہب کے بانی بھی تھے جب مندر تعمیر کیے جاتے وہ خود اینٹیں اٹھاتے بخت نظر کی دعائے ولی عہدی (جو یرمیاہ کا ہمعصر تھا) جو ابھی تک اپنی گہرائی اور گیرائی کے باعث بے نظیر سمجھی جاتی ہے۔ اس میں تقدس کا عنصر اس قدر وافر ہے کہ بنی اسرائیل کی کوئی پیش گوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کلدانی حمدیہ گیت یہودیوں کی حمدی نظموں سے موزونیت اور تشکیل کے لحاظ سے مشابہ ہیں ان میں انسانی غیر شعوری گناہوں کا اعتراف بھی ہے اور توبہ واستغفار کا تصور بھی موجود ہے' جو دیوتاؤں سے معافی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ عیسائیت کا وہی تصور ہے جو پالمائرہ (۵۱) کے مندر پر کندہ ہے۔

پیغمبرانہ تعلیمات کا مزاج مجوسی مذاہب کے قریب تر ہے۔ صرف ایک خدا کا تصور موجود ہے۔ اسے یاہوے اہرمزد' مردوک یا بعل کا نام دیں وہ خدائے واحد کا تصور ہے' خیر کا مجسمہ ہے' باقی تمام دیوی دیوتا یا تو بے حقیقت ہیں یا محض شر۔ اسی تصور سے مسیحا کی امید پیدا ہوئی جو اشعیا میں بالکل واضح ہے اور اس عہد کی ما بعد صدیوں میں بہت کھل کر بیان ہوئی اور یہ ایک داخلی ضرورت کا نتیجہ تھا' مجوسی مذاہب کا بنیادی تصور یہ ہے کہ اس میں خیر و شر کے تاریخی معرکے کا تصور آغاز ہی سے پایا جاتا ہے اور قیامت کے روز بالآخر حق (خیر) کو فتح ہو گی۔ یہ تاریخی سبق اہل فارس کلدانی اور یہودی آبادی میں مشترک ہے مگر جب یہ تصور بیرونی مقامات تک پہنچا' تو ختم ہو گیا کیونکہ مجوسی مذاہب میں وطن کے بغیر قوم کا تصور مروج ہے تو اس سے منتخب افراد کا تصور پروان چڑھا (۵۲) مگر یہ سمجھنا آسان ہے کہ وہ لوگ جن کا خون مضبوط ہے اور بالخصوص اعلیٰ خاندانوں کے لوگ' اس تصور کو قبول نہ کر سکے کیونکہ انھیں قدیم قبائلی برتری کا غالب احساس تھا "کمانٹ" کی تحقیقات کے مطابق ایرانی بادشاہوں کا مذہب خداؤں کی کثرت پر مبنی تھا اور اس میں توحید کا عقیدہ شامل نہ تھا یعنی وہ صحیح معنوں میں زرتشت کے پیروکار نہ تھے۔ بنی اسرائیل کے متعدد بادشاہوں کے متعلق بھی یہی نظریہ درست تھا اور اس امر کا امکان ہے کہ کلدانی نبو نبید (نبونیدوس) کا حال بھی ایسا ہی تھا۔ سائرس نے ان پر اسی لیے غلبہ پا لیا کہ یہ لوگ مردوک کی تعلیمات سے منحرف ہو چکے تھے۔ یہی وہ دور تھا جس میں یہودیوں کے ہاں ختنہ اور (کلدانی) سبت کا رواج حاصل ہوا۔

بابل سے اخراج نے بنی اسرائیل اور ایرانیوں میں شدید اختلاف پیدا کر دیا اور ان شعوری تقدس کے حتمی تصورات میں تفریق ہو گئی مگر ان تمام واقعات کی حقیقت کے باوجود سب سے اہم عنصر حقائق کے متعلق انسان کا باطنی رجحان ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یاہوے کے معتقدین (یہودیوں کو) گھر جانے کا موقع مل گیا اور موقع اہرمزد کے ماننے والوں نے فراہم کیا۔ ان دو چھوٹے چھوٹے قبائل میں غالباً دو سو سال قبل فوج کی تعداد برابر تھی لیکن ان میں سے ایک نے دنیا پر قبضہ کر لیا جبکہ دارا نے شمال میں دریائے ڈینیوب پار کر لیا اور جنوب میں مشرقی عرب تک پہنچ گیا اور سومالی لینڈ کے جزائر ستوطرہ تک رسائی حاصل کر لی (۵۳) جہاں تک دوسرے فریق کا تعلق ہے تو اس کی حیثیت خارجہ حکمت عملی میں شطرنج کے پیادے کی سی رہ گئی۔

یہی وہ واقعات ہیں جن کی بدولت کسی مذہب کو دنیاوی فوقیت حاصل ہو گئی اور دوسرا عاجز ہو گیا۔ طلبا کو یرمیاہ کی جگہ عظیم کتبات بے ستون کا مطالعہ کرنا چاہیے (۵۴)۔ بادشاہ کا فخر کتنا عظیم تھا۔ وہ اپنی فتوحات کو خدا کی مہربانی کہتا ہے اور وہ دلائل بھی کتنے عظیم ہیں جن کے تحت بنی اسرائیل کے انبیا اپنے خدا کی عظمت کا بیان کرتے رہے ہیں۔ اخراج کے بعد ہر یہودی ' فارس کی فتح کو زرتشتی تعلیمات کی فتح سمجھتا تھا۔ یہ یہودی پیش گوئیوں کے عین مطابق تھا (آموس۔ اشعیا' یرمیاہ)۔ کتاب مقدس میں تحریر تھا (اشعیا کے سابقات' ازکیل' ذکریا)۔ بنی نوع انسان کی تمام تصوریت' شیطانی ہوں یا فرشتہ اعظم کی طرف سے' جو ہفت افلاک سے اترا ہو' تمام کی تمام اہل فارس کی مشترک عالمی احساس کا نتیجہ ہیں۔ اشعیا نے لکھا ہے کہ سائرس خود بھی اپنے مسیح ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔ کیا اشعیا نے یہ تمام مشہور اقوال کسی زرتشتی سے سیکھے

تھے؟ کیا اس کا امکان ہے کہ اہل فارس نے یہودیوں کو دونوں مذاہب کی داخلی روح کی یکسانیت کے تصور سے نجات دلائی؟ لیکن یہ تو یقینی امر ہے کہ بعض امور کے متعلق دونوں مذاہب میں بعض اصول مشترک تھے اور دونوں مذاہب قدیم بابلی اور کلاسیکی مسالک و عقائد سے نفرت کرتے تھے جو کفار کے مذاہب تھے اور باہم بھی ایک دوسرے سے مختلف تھے۔

بہرحال ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات اور اپنے وطن مراجعت کا موقع مل گیا اور اس کے ساتھ بابل کے نقطہ نظر کو مد نظر رکھنا چاہیے' ایک بہت بڑی آبادی' جس کا تعلق ایک ہی نسل سے تھا فی الحقیقت ان تصورات سے بہت دور ہو چکی تھی' یا وہ انھیں محض تخیل اور خواب سمجھ رہی تھی اور کسانوں کا مضبوط طبقہ' صناع اور نوزائیدہ زمینداروں کا اعلیٰ طبقہ بڑے سکون سے اپنے ہی سردار کے تحت اراضی پر قابض رہا اور ریش گلوتھا میں مقیم رہا جس کا دارالحکومت نہاردیہ میں تھا (۵۵) جن لوگوں نے مراجعت اختیار کی ان کی تعداد بہت کم تھی۔ یہ لوگ ضدی اور خود سر تھے۔ یہ اپنے بیوی بچوں سمیت چالیس ہزار افراد تھے۔ یہ تعداد کل آبادی کا دسواں بلکہ بیسواں حصہ بھی نہ تھی (۵۶) جو شخص اس حقیقت سے ناواقف ہے وہ اس کے مابعد واقعات کو بھی سمجھنے سے قاصر رہے گا۔ یہودیوں کی مختصر دنیا ہمیشہ الگ تھلگ رہی اور پوری قوم نے کبھی بھی اتفاق و اتحاد سے اجتماعی زندگی بسر نہیں کی۔

مشرق میں کشوفاتی ادب جو پیش گوئیوں پر مشتمل تھا' بہت فروغ پذیر ہوا۔ یہ تمام شاعرانہ کلام حقیقتاً مقامی تخلیقات پر مبنی تھا اس میں شامل بعض نظمیں ابھی تک شاہکار سمجھی جاتی ہیں۔ "فرض منصبی کی کتاب" جو ہیئت کے لحاظ سے تو اسلامی تخلیق معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت میں یہودی ادب ہی کا حصہ ہے (۵۷) اس میں شامل بعض حکایات مثلاً جودتھ' توبت' اور اچیکار (۵۸) عرب دنیا کے تمام ادب میں شامل ہیں۔ یہودیت میں قانون کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ تالمود کی روح پہلے پہل ایزے کیل میں دیکھی گئی۔ اور ۴۵۰ ق م کے بعد تو یہ بہت اہمیت اختیار کر گئی۔ تورات میں شامل ہونے کے بعد اسے مشنا کے اہم عنصر کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس عالمانہ تخلیص پر نہ تو مسیح کی آمد کا کوئی اثر پڑا اور نہ ہی مندروں کی تباہی اس پر اثر انداز ہوئی۔ پھر وقت آیا کہ یروشلم مکہ کا غیر متزلزل معتقد بن گیا اور قرآن کو قانون کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اور اس میں بتدریج تمام قدیم تاریخ شامل کر لی گئی جس کی تشکیل نو فریسی تصورات کے تحت کی گئی (۵۹) مگر اس ماحول میں عالی فنون لطیفہ' شعر اور اس نوعیت کی عالمانہ تخلیقات کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ ہر وہ تصورات جو علم النجوم' طب' اور عدالتی علم کے متعلق تالمود میں درج ہیں وہ تمام کے تمام قدیم عراق (میسوپوٹامیہ) سے حاصل کردہ ہیں (۶۰) اس امر کا امکان بھی ہے کہ دور غلامی سے قبل میسوپوٹامیا (عراق) ہی میں کلدانی۔ فارسی۔ یہودی اتحاد کی بنیاد پڑی اور اس سے مجوسی ثقافت کا آغاز ہوا۔ اور مانی کی تعلیمات میں اس نے اپنی تکمیل کی۔ "قانون اور نبی" یہ دو اصطلاحات ہیں جو عراق اور یہود کو علیحدہ علیحدہ حیثیت دیتی ہیں۔ اہل فارس کے دور آخر میں اور ہر مجوسی دینیات میں دونوں رجحانات کا اتحاد موجود ہے۔ یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ ان کی علیحدگی مکانی فاصلے کی بنیاد پر ہوئی۔ یروشلم میں کیے گئے فیصلے پر مقام پر قبول کیے جاتے

مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان پر عمل کہاں تک ہوتا تھا۔ گلیلی کے قریب ترین مقام پر بھی فریسی شک کا شکار تھے۔ جبکہ بابل میں کسی ربی کو خطاب کی اجازت نہ تھی۔ پال کے استاد گمالیل کے خطاب میں یہ شامل تھا کہ اس کے فیصلوں پر یہودی بھی عمل کرتے تھے' ان میں غیر ملکی یہودی بھی شامل تھے۔ مصر میں یہودیوں کو کس قدر آزادی حاصل تھی' حال ہی میں ا یلفنسٹائن اور اسوان کی دریافت کردہ دستاویزات سے ظاہر ہوتا ہے (۶۱) ۱۷۰ کے قریب عونیوں نے ایک مندر کی تعمیر کے لیے بادشاہ سے اجازت طلب کی اور یہ وجہ بیان کی کہ یروشلم میں جتنے مندر بھی موجود تھے وہ باہمی داخلی نزاع کے شکار تھے۔

ایک اور موضوع پر غور ضروری ہے' کہ یہودیت بھی اہل فارس کی طرح اپنے قدیم قبائلی حدود سے بہت زیادہ بڑھ چکی تھی۔ یہ یہودیت کے قبول و ارتداد کی وجہ سے ہوا۔ اس لیے ایک ایسی قوم کے لیے جس کے پاس اپنی زمین نہ ہو فتح ہی واحد طریق کار رہ جاتا ہے اس لیے تمام مجوسی مذاہب میں فطری طور پر یہی طریق اختیار کیا گیا۔ شمال میں یہودی ریاست ادیابین' کاکیشیا تک وسیع ہو گئی' جنوب میں غالباً خلیج فارس کے ساتھ ساتھ سبا تک وسیع ہو گئی۔ مغرب میں یہ اسکندریہ سائرین اور قبرص تک چلی گئی۔ مصر کی انتظامیہ اور پارتھی سلطنت کی حکمت عملی یہودیوں کے ہاتھ میں تھی۔ مگر یہ تحریک صرف عراق سے اٹھی اور اس کی روح تالمودی کی بجائے کشوفی تھی' یروشلم پر قبضہ کر لیا گیا اور غیر مذاہب کے افراد پر بہت سی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ لوگوں کو یہودیت قبول کرنے کے لیے آمادہ کرنے کا عمل ترک نہیں کیا گیا۔ ایک فریسی نے اپنے آپ کو دنیا میں مقبول بادشاہ ہائر کینس کے سامنے پیش کیا (۱۰۶۔۱۳۵ ق م) اور عرض کیا کہ اسے اعلیٰ پجاری کے عہدے سے معزول کر دیا جائے کیونکہ اس کی ماں کسی وقت کفار کی قوت سے ہمدردانہ رویہ رکھتی تھی (۶۲) یہ وہی تنگ نظری ہے جو قدیم جودیا عیسائی برادری میں اس صورت میں نمودار ہوئی کہ کفار کو عیسائی دین کی تبلیغ نہ کی جائے۔ مشرق میں کبھی کسی شخص کے ذہن میں ایسی پابندی کا تصور بھی پیدا نہیں ہوا ہو گا جو کہ مجوسی تصورات کے تمام اصولوں کے خلاف ہے۔ مگر کیا مشرق کی روحانی برتری صرف اسی ایک تصور کی مرہون منت تھی۔ یروشلم کے مذہبی حلقوں کے پاس مسلمہ مذہبی اقتدار ہو گا مگر سیاسی لحاظ سے اور اس باعث تاریخی لحاظ سے بھی' ریش گلوتھا کے اختیارات کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ یہودی اور عیسائی محققین ان حالات کا صحیح اندازہ کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ جہاں تک میرا علم ہے کسی نے اس اہم حقیقت کا ادراک نہیں کیا کہ انطاکیہ کے مذہبی مافوق البشر ہستیوں کا قتل عام یہودیوں کے خلاف نہ تھا' مگر جوڈیا کے خلاف تھا اور اس سے ہمیں ایک اور حقیقت کا پتہ چلتا ہے جو بہت اہم ہے۔

یروشلم کی تباہی سے قوم کا ایک انتہائی چھوٹا سا حصہ متاثر ہوا جو روحانی اور سیاسی طور پر بہت کم اہم تھا۔ یہ درست نہیں کہ یہودی آبادی نے منتشر زندگی بسر کی۔ اس کے بعد یہ صدیوں تک (ایسے ہی اہل فارس اور دیگر اقوام بھی) ایسی قوم کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے رہے جس کا اپنا کوئی وطن نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس ہم اس حقیقت کو بہت کم محسوس کرتے ہیں کہ اس جنگ کا حقیقی یہودی آبادی پر کیا اثر ہوا اور جوڈیا (مقام) اور یہودیت لازم ملزوم سمجھتے ہیں۔ کفار کی فتح اور پناہ گاہ کی تباہی روح کی گہرائیوں سے محسوس

کی (۶۳) اور ۱۱۵ کی صلیبی جنگ میں اس کا پورا پورا بدلہ لے لیا گیا (۶۴) مگر اس میں یروشلم کی بجائے یہودیت کو نشانہ بنایا گیا۔ یہودیت سائرس کے زمانے کی طرح اور جیسا کہ دور حاضر میں ہے صرف ایک مختصر اور روحانی طور پر تنگ نظر اقلیت تھی۔ اگر وطن کے نقصان کو ایک مصیبت سمجھا گیا (جیسا کہ مغرب میں ہم سمجھتے ہیں) تو مارکوس آری لی اس کے بعد سینکڑوں ایسے مواقع ملے کہ شہر مذکور کو واپس لیا جا سکتا تھا مگر اس سے مجوسی تصور قوم کی نفی ہوتی جس کا بلند بانگ اوعا اور نامیاتی مقصد یہودیوں کی دینی مجالس تھا۔ خالص اجماع' ---- ابتدائی عہد کی عیسائی کلیسا کی طرح اور اسلامی تصورات کے مطابق ---- اور فی الحقیقت جوڈیا کی تباہی کی وجہ یہی تھی ---- اور یہ پہلا موقع تھا کہ جوڈیا کی قبائلی روح حقیقی مقصد کے طور پر تسلیم کر لی گئی۔

وسپا سی جنگ جوڈیا کے خلاف تھی اور یہودیت کی آزادی کی کوشش تھی جس کے نتیجے میں اس محدود آبادی کے گروہ نے یہ مطالبہ تسلیم کرا لیا کہ وہ بھی ایک قوم ہیں اور اپنی گئی گزری روحانیت کو اجتماعی نمائندگی کا نشاں قرار دے لیا۔ تحقیق' مذہبیت' اور تصوف جو مشرقی درس گاہوں کا امتیاز تھا تمام ان کے حقوق کی جھولی میں ڈال دیا گیا۔ مثال کے طور پر جج کارنانے' جو کم وبیش الیسنان اور پاپلی نی آن کا ہمعصر تھا' ہزادیہ کی درس گاہ میں دیوانی قانون کا پہلا ضابطہ مرتب کیا (۶۵) اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ اس نے اپنے مذہب کو اس قلب ماہیت سے بچا لیا' جس میں کہ ۲۰۰ ء سے عیسائیت مبتلا تھی۔ اس دور میں ایسا ادب تخلیق کیا جا رہا تھا' جس کا نصف یونانی اور نصف یہودی تھا۔

موعظت (کلیسائی رہنما) میں بہت قیمتی اصول درج ہیں (۶۶) سلیمان کی دانائی' میکابی' تھیوڈوسن اور ارسلیا کی تحریروں (۶۷) کا مطالعہ کریں ان میں بے معنی اقوال کی ایک بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا تعلق یہودیت سے ہے یا یونانیوں سے۔ ۱۶۰ء کے قریب ایسے یونانی' پجاری تھے جنھوں نے عیسائیت میں یونانی تصورات کو داخل کر دیا اور ان کے بعد ایسے حکمران آئے مثلاً "ہائرکنوس' اور ہیروڈ' جنھوں نے سیاسی عمل کے تحت یہی کارنامہ انجام دیا' ۷۰ء کے قریب یہ خطرہ خود بخود ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

دور مسیح میں یروشلم میں تین رجحانات تھے' جنھیں حقیقی طور پر آرمینائی کہا جا سکتا ہے اور جن کی نمائندگی فریسی کرتے تھے۔ ان کے علاوہ سدوسی اور اسین تھے۔ اگرچہ ان ناموں کے مضمر مفہوم میں اختلاف ہے اگرچہ ان کے متعلق عیسائی اور یہودی محققین نے علیحدہ علیحدہ نقطہ ہائے نظر پیش کیے ہیں اس کے باوجود کہا جا سکتا ہے کہ اس رجحان کا تقدس کے لحاظ سے پہلے پہل یہ رجحان یہودیوں ہی کے ہاں پیدا ہوا۔ اس کے بعد کلدانیوں میں اور بعد ازاں یونانیوں نے ان اثرات کو علی الترتیب قبول کیا اس کا بنیادی اثر مسلک کا وجود تھا (یہ تقریباً ایک نظام ہی تھا) جو متھرا سے منسوب تھا اور ایشیائے کوچک کے مشرقی علاقوں میں مروج ہوا۔ سدوسیوں کا گروہ اگرچہ یروشلم میں ایک نمایاں اقلیت کی حیثیت کا حامل تھا جو سفس

ان کو لذت کوشوں کا مماثل گردانتا ہے۔ یہ لوگ خالص آرامی تھے۔ ان کے کشوفات اور معادیات کے نظریات آرامی ہی تھے۔ ان میں بعض عناصر ایسے بھی تھے جن کی بنیاد پر انھیں اپنے قدیم عہد کا دستاویکی بنا دیتا ہے۔ یہ اپنے ابتدائی دور کے تصوف کی وجہ سے فریسیوں کے قریب معلوم ہوتے ہیں اور کلیسا سے ربط کی وجہ سے سینٹ پال سے ان کی نسبت قرار پاتی ہے اور کائناتی قوانین کی مشابہت سے یہ زرتشتی معلوم ہوتے ہیں (۶۸)۔ کشف و کرامات ایک مقبول عام تصور ہے اور اس کے متعدد اوصاف تمام آرامی دنیا میں یکساں ہیں۔ تالمود' اوستا اور فریسیوں کی دستاویزات دوسرے مذاہب کو دیس نکالا دینے کی شعوری کوششیں ہیں۔ اور ان میں عدم تعاون کا شدید مظاہرہ کیا گیا ہے۔

اسینی (یہودی راہبوں کا ایک ملک) بطور مواحد یروشلم میں وارد ہوئے ۔ یہ لوگ جدید فیثا غورثیوں کے مشابہ تھے۔ ان کے پاس بعض خفیہ متون تھے۔ یہ لوگ قلب ماہیت کے نمائندہ تھے۔ ۷۰ء کے بعد یہ لوگ یہودیت سے ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئے۔ یہی وہ عہد تھا' جس میں عیسائی ادب مکمل طور پر یونانی زبان میں لکھا گیا لیکن اس کا یہ سبب قطعاً نہیں کہ یونان سے متاثر مغربی یہودی' مشرق کی طرف جانے پر مجبور ہوئے اور بتدریج عیسائی ہو گئے (۶۹)۔

مگر کشوفات بھی جو اپنے اظہار کے لحاظ سے غیر شہری اور شہروں سے مرعوب آبادی سے متعلق معلوم ہوتے تھے جلد ہی یہودی عبادت گاہوں سے غائب ہو گئے۔ شدید تباہی کے حادثے کے بعد یہ ایک عجیب وغریب ردعمل تھا (۷۰) جب یہ ثابت ہو گیا کہ حضرت عیسیٰؑ کا ظہور بھی یہودیت کی اصلاح کے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے گا بلکہ ایک نئے مذہب کا آغاز ہو گا اور جب ۱۰۰ء کے قریب یہودیوں اور عیسائیوں کے خلاف روزانہ بددعائے لعنت کا طریق وضع کیا گیا تو کشف والہام کا سلسلہ نوزائیدہ کلیسا میں منتقل ہو گیا۔

(۶)

جس وجہ کی بنیاد پر عیسائیت کو تمام ہمعصر اور مروجہ مذاہب کے مقابلے میں عروج حاصل ہوا' وہ خود حضرت عیسیٰؑ کی ذات تھی۔ ان ایام میں کوئی اور تخلیق وجود میں نہیں آئی' جس کا ان سے موازنہ کیا جا سکے۔ تمام روایات جو متھرا' علیس اور اوسی ریس سے منسوب ہیں' ان کا حضرت عیسیٰؑ کے مصائب سے کوئی مقابلہ نہیں۔ یروشلم کا آخری سفر' آخری شب کا طعام' رومی دربار عدالت میں مایوسی اور صلیب پر موت ایسے مظالم ہیں جن کی مثال نہیں ملتی۔

اس میں کوئی فلسفے کا مسئلہ نہیں حضرت عیسیٰ کا کلام جو متعدد عقیدت مندوں کے ذہنوں میں محفوظ رہا وہ اپنے عالم ضعیفی میں بھی اسے یاد کرتے رہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بچہ اجنبی' بیمار اور عمر رسیدہ دنیا میں پھنس گیا ہو۔ یہ معاشرتی مشاہدے پر رائے زنی نہیں بلکہ ایک مسئلے کا مبحث ہے۔ ایک بابرکت اور

پرسکون جزیرے کی طرح اور ان ماہی گیروں اور ہنرمندوں کی جھیل گینس رتھ کے کنارے' عظیم طبری کے دور میں تمام عالمی تاریخ سے دور' حقیقت پر معصوم عمل میں مشغول رہا جبکہ اس کے قریب ہی یونان میں تماشہ گاہیں اور مندر' ان کی باذوق مغربی معاشرت' ہنگامہ خیز اجتماعات میں تفریح' ان کے رومی بازکشید اور ان کا یونانی فلسفہ سب کچھ اس کے ماحول میں دستیاب تھا۔ جبکہ اس کے دوست احباب' شاگردوں کے مصیبت زدگی کے باعث بال سفید ہو گئے اور یروشلم میں اس کا بھائی ہی گروہ مذکورہ کا صدر تھا۔ وہ سب ایک جگہ جمع ہوئے چھوٹے چھوٹے اجتماعات میں اس کے حالات زندگی بیان کرتے اور ان کے داخلی تاثر سے بہرہ یاب ہوتے۔ ان واقعات کا اسلوب اظہار ہی مختلف تھا اس کی مثال نہ تو کلاسیکی اور نہ عربی ثقافتوں میں ملتی ہے۔ انجیل بے مثال ہے عیسائیت ہی ایک ایسا مذہب ہے جس میں ایک آدمی کی تقدیر نے جو حال مطلق میں موجود تھا تمام مخلوق کے لیے ایک قابل تقلید اور نقطہ مرکزیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ایک عجیب و غریب جوش بالکل ویسا ہی جو جرمنوں کو ۱۰۰۰ء میں پیش آیا ان ایام میں تمام آرمینائی سرزمین میں پھیل گیا۔ مجوسی روح بیدار ہو گئی۔ وہ عناصر جو پیغمبرانہ مذاہب میں پائے جاتے ہیں اور اسکندر کے زمانے میں مابعدالطبیعیات کے روپ میں ابھرے اب تکمیلی سطح پر پہنچ گئے اور یہ کامرانی بیدار ہو گئی اور اس میں ناقابل بیان توانائی تھی اور خوف کا وہ جذبہ بھی تھا جو ابتدائی انسان میں پایا جاتا تھا۔ اناکی پیدائش اور عالمی تشویش جو دونوں باہم مشابہت کی حامل ہیں انسانی حیات اور متحرک انسانی اقدار کی علامت ہیں۔ عالم صغریٰ کے مقابل' ایک عالم کبریٰ بھی ہے جو بہت وسیع اور طاقت ور ہے۔ اجنبیت کی گہرائی بھی ہے ایک ایسا وجود اور فعالیت بھی ہے جو تنہا خودی کو واپس اپنے دامن میں لے لینا چاہتی ہے۔ زندگی کے تاریک ترین ایام میں بھی کوئی بالغ فرد اس خوف کا تجربہ کرتا ہے جو کسی بچے نے حالت بیداری میں کیا ہو۔ دوسری یا نئی ثقافت کے طلوع کے ساتھ ہی موت کا خوف بھی طاری ہو جاتا ہے۔ مجوسی عالم احساس کی ابتدا میں بزدلی اور تذبذب اور جہالت و لاعلمی میں اپنی ذات کو استثنا نہیں۔ نومولود آنکھیں دنیا کے خاتمے کا بالکل قریب سے نظارہ کرتی ہیں۔ یہی وہ پہلی فکر ہے جسے ہر ثقافت کو یوم اول ہی سے بطور علم ودیعت کر دیا جاتا ہے۔ تمام سطحی ارواح الہام ' معجزات اور بنیادی اشیا کے علم کے سامنے لرزاں ہو گئیں۔ انسانی زندگی صرف کشوفات کے تصورات تک محدود رہ گئی۔ حقیقت منکشف ہوئی عجیب و غریب اور خوفناک نظارے پر اسرار طور پر ایک دوسرے کو بتائے گئے۔ بلکہ بعض پوشیدہ اور غیر حقیقی متون سے پڑھ کر سنائے گئے۔ جنھیں داخلی تیقن کے ساتھ قبول کر لیا گیا۔ یہ تحریریں ایک معاشرے سے دوسرے معاشرے تک منتقل ہوتی رہیں گاؤں سے گاؤں اور یہ ممکن نہیں کہ انھیں کسی خاص مذہب کے ساتھ منسوب کر دیا جائے (۷۱) ان تحریروں کا رنگ فارسی' کلدانی اور یہودی ہے مگر ان میں ہر وہ موضوعات موجود ہیں جو انسانی ذہن میں اکثر پیدا ہوتے رہتے ہیں جبکہ قانونی کتب ہر قوم کی اپنی اپنی ہیں۔ کشوفاتی ادب اس لفظ کے مفہوم کے مطابق بین الاقوامی ہے یہ موجود ہے مگر کسی نے اسے تخلیق نہیں کیا۔ اس میں موجودہ مواد غیر متعین ہے ---- یہ آج ایک خاص انداز میں پڑھا جاتا ہے اور کل کسی اور انداز میں پڑھا جائے گا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ شاعری ہے (۷۲) ---- یہ شاعری نہیں ----

یہ خوفناک عفریت فرانس کے کلیساؤں کے پیش منظروں کے مشابہ ہیں جنھیں فنی شاہکار نہیں کہا جا سکتا بلکہ خوف کا مجرباتی منظر کہا جا سکتا ہے۔ ان شیاطین اور فرشتوں سے ہر شخص آشنا ہے۔ روحانی انداز میں آپ افلاک پر عروج حاصل کر کے واپس زمین پر گر جاتے ہیں۔ آدم ثانی جو خداوند تعالیٰ کا سفیر ہے جو آخری ایام کا منجی ہے۔

پسر آدم .... ازلی و ابدی شہر' اور روز حشر(۷۳) میں ممد معاون ہو گا۔ اجنبی شہروں میں جا کر یہود یا اہل فارس میں بلند پایہ پجاریوں کے عہدوں پر فائز ہو کر مختلف اصول و عقائد پر واضح اور قطعی بحث کی جا سکتی ہے مگر عوام الناس کے طبقہ زیریں میں کسی مخصوص مذہب کا عملی نفاذ نہ تھا بلکہ صرف ایک عام مجوسیانہ مذہبیت مروج تھی جو ہر روح کو انبساط و اطمینان عطا کرتی تھی اور ہر قابل تصور ابتدا کے نظاروں کو بہرہ ور کرتی تھی۔ قیامت کا زمانہ قریب تھا لوگ جانتے تھے کہ جس کا انتظار تھا وہ آنے والا ہے۔ پیش گوئیوں کے مطابق لوگ اس کے ظہور کے منتظر تھے۔ کئی نبی پیدا ہوئے' زیادہ سے زیادہ معاشرتی گروہ جمع ہوئے وہ اس پر یقین رکھتے تھے کہ یا تو انھوں نے روائتی مذہب کو بہتر انداز میں سمجھ لیا ہے یا انھوں نے سچا مذہب ہی دریافت کر لیا ہے۔ اس وقت میں جبکہ روز افزوں تشویش اور مسیح کے سال ولادت کے قریب مدت میں ان واقعات کا ظہور ہوا۔ متعدد معاشروں اور قومیتوں کے علاوہ ایک اور مذہب سے نجات ہوئی جو مندائین (ندائیان) کا مذہب تھا جس کے متعلق ہم جانتے ہیں' جس کے بانی یا ابتدا کے متعلق کسی کو کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ یروشلم میں یہودیوں کے خلاف نفرت کے باوجود' اور ان کی فارسی تصورات سے نجات کے باوجود مندائین مذہب کے لوگ سیریائی یہود کے مقبول عام اعتقادات کے بالکل قریب تھے۔ یکے بعد دیگرے عجیب و غریب دستاویزات دستیاب ہو رہی ہیں اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ "ابن البشر" ایک نجات دہندہ جسے اس لیے زمین پر بھیجا گیا کہ وہ خود بھی نجات حاصل کرے اور انسانی توقعات کا مقصد ٹھہرے۔ جان کی انجیل میں "باپ کمال کے مقام پر بیٹھ کر' نور میں نہا رہا ہے۔ اپنے اکلوتے بیٹے سے کہتا ہے۔: "میرے بیٹے! تم میری سفارت اختیار کرو عالم ظلمات میں جاؤ جہاں کوئی بھی روشنی کی کرن موجود نہیں"" اور بیٹا باپ کو پکارتا ہے:" باپ! میں نے کون سا گناہ کیا ہے کہ آپ مجھے عالم ظلمات میں بھیج رہے ہیں" (۷۴)۔

عظیم انبیا کے مذاہب کی خصوصیات کے مطابق' اور کشوفات کے مابعد جمع کردہ مجموعوں کی روشنی میں بنیادی تصورات کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ اس مجوسی باطنی مذہب میں کلاسیکی فکر کا ایک خیال بھی شامل نہیں ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نئے مذہب کا آغاز کا حصہ ناقابل تلافی حد تک ضائع ہو چکا ہے مگر مندائی مذہب کی ایک جھلک حیران کن امتیاز کے ساتھ ایک تاریخی پیکر سے ملی۔ اس میں شخص مذکور کے المیے اور مسیح کے انجام سے مشابہ موت کی خبر ملتی ہے ---- جان ---- اصطباغی (۷۵)۔ اس نے یہودیت سے نجات حاصل کی۔ اسے یروشلم سے شدید نفرت دی ---- بالکل اسی طرح جس طرح کہ قدیم روسی پیٹرزبرگ سے نفرت کرتے تھے۔ وہ دنیا کے اختتام کی تبلیغ کرتا ہوا برناشا پہنچا۔ ابن آدم جسے اب یہود کے قومی مسیحا کا کوئی انتظار نہ تھا مگر صرف عالمی آتش زدگی (۷۶) کا خواہاں تھا۔ حضرت عیسیٰؑ اس کے پاس آئے اور وہ مرید

بن گیا (۶۷)۔ وہ تیس سال کا تھا جب کہ اسے روحانی بیداری حاصل ہوئی' اس کے بعد اسے کشوفات ہونے لگے اور وہ مندائی فکر سے بہرہ ور ہو گیا۔ تاریخ حقائق کی ایک اور دنیا نے اسے گھیر لیا' یہ سب اس کے لیے مصنوعی' اجنبی اور غیر اہم تھا' وہ سمجھتا تھا کہ اب خدا کا ظہور ہو گا اور اس کے ساتھ دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اسے غیر حقیقی تصورات پر پختہ یقین تھا اور اپنے آقا جان کی طرح وہ اس تصور کے شاہی نقیب کی طرح مشغول ہو گیا' ہم قدیم الہامی کتب میں دیکھ سکتے ہیں' جن کی جھلکیاں عہدنامہ جدید میں شامل ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دوران جب وہ ہوش میں ہوتا وہ نبی ہوتا (۷۸)۔

مگر اس کی زندگی کی ایک جھلک یہ بھی ہے جب وہ کسی ایک لمحے پورے یقین کے ساتھ اس کی طرف آیا "یہ تم ہی ہو (۷۹) یہ تمہارا ہی وجود ہے" یہ ایک راز تھا' جیسے وہ پہلی دفعہ قبول نہ کر سکا اور پھر اس نے اس کا قریبی دوستوں اور ساتھیوں سے ذکر کیا' جسے وہ مکمل خاموشی سے سنتے رہے۔ یہ مبارک عمل تھا پھر انھوں نے اس صداقت کو دنیا پر منکشف کرنے کے لیے یروشلم کا سفر اختیار کیا۔ اگر ان بادلوں میں کوئی حقیقت تھی تو وہ اس کی فکر کی مکمل تقدیس اور احترام تھا۔ اسے یہ شک رہتا تھا کہ کہیں اسے غلط فہمی تو نہیں ہوئی اور یہ شک اسے بار بار اپنے قبضے میں لے لیتا۔ بالآخر اس کے شاگردوں نے اس سے اس کے متعلق کھل کر کہا۔ وہ اس کے گھر آتا ہے۔ دیہاتی اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ قدیم بڑھئی کو پہچان لیتا ہے جس نے غصے میں اپنا کام چھوڑ دیا۔ خاندان ---- ماں اور تمام بہن بھائی سب اس کی وجہ سے شرمندہ ہوئے اور اسے گرفتار کرنا چاہتے تھے تمام شناسا آنکھیں اس پر لگی ہوئی تھیں جن سے وہ پریشان ہو گیا اور اس نے سمجھا کہ تمام طلسماتی قوت اس سے زائل ہو گئی ہے۔ (مارک ۴)۔ گتھسی مین اس کے مقاصد پر شک کیا گیا اور انھیں آئندہ ممکنہ خوفناک اشیا سے خلط ملط کر دیا گیا اور صلیب پر بھی لوگوں نے تشویش ناک صدا سنی کہ خدا نے اسے معاف کر دیا ہے۔

اپنی آخری ساعتوں میں بھی اس نے اپنی زندگی اپنے کشوفات کے مطابق بسر کی جو کہ کبھی بھی حقیقی نہیں سمجھی گئی۔ نیچے استادہ رومی پہریداروں کے لیے یہ تمام ایک مجبوری کا حیرت ناک مظاہرہ تھا ایک التباس کسی بھی لمحے بغیر اطلاع عدم میں کھو جائے گا۔ وہ ایک ایسی روح کا مالک تھا' جس کا شہروں اور قصبوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ شہروں کی زندگی اور روح اس کے لیے قطعی اجنبی تھے۔ کیا اس نے کبھی نیم کلاسیکی یروشلم کو دیکھا تھا؟ جہاں پر کہ وہ ابن آدم کی حیثیت سے سواری کرتا رہا اور کیا وہ اس کی تاریخی نوعیت سے آشنا تھا؟ جب ہم اس کے آخری ایام کی زندگی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ مسئلہ ہم میں جوش و خروش پیدا کر دیتا ہے۔ واقعات اور صداقتوں کا ٹکراؤ یہ دو مختلف عالم ہیں جو کبھی ایک دوسرے کو سمجھ نہیں پائیں گے اور وہ بھی ان معاملات سے بے خبر تھا' جو اسے پیش آ رہے تھے۔

پس اس نے اپنا پیغام صاف صاف بیان کر دیا اور پورے ملک کو مخاطب کیا جو صرف فلسطین تک محدود تھا۔ اس کی ولادت کلاسیکی سلطنت کے دور میں ہوئی تھی اور وہ فلسطین میں یہودیوں کی آنکھوں کے

سامنے پل کر جوان ہوا' جب اسے اپنے خوفناک فرض منصبی کا انکشاف ہوا' اس نے ادھر ادھر دیکھا تو اس کو رومی حکومت اور فریسی آبادی کی مخالفت کا مشاہدہ ہوا۔ وہ ثانی الذکر کے متعصبانہ اور شدید مخالفانہ خیالات سے آگاہ تھا جو اس نے منادیوں اور ہمعصر وسیع مشرقی یہودیوں کے سامنے بیان کیے۔ اسے اس بات پر بہت غصہ آیا کہ ساری آبادی صرف اسی کے طریق کار پر آزادی کے حصول کے لیے تکیہ کیے بیٹھی تھی۔ اس کے باوجود صرف اسی کی ذات تھی جو نوع دیگر کی تقدیس کا مظاہرہ کر سکتی تھی اور یہ صرف اس کا یقین کامل پجاریوں کی منطق کا سامنا کر سکتا تھا پس جس مقابلے کا آغاز ہوا وہ قانون اور انبیا کے مابین تھا۔

لیکن جب مسیح کو پائلیٹ کے روبرو بھیجا گیا تو یہ موقع تھا جبکہ دنیا کے واقعات اور عالمی صداقتیں تمام تعصبات اور مخالفتوں کے پس منظر میں ایک دوسری کے مد مقابل استادہ ہوئیں۔ یہ ایک نظارہ تھا' جو خوفناک حد تک نمایاں اور ناقابل برداشت علامتی صورت تھا۔ ایسا کہ تاریخ عالم نے نہ کبھی اس سے پہلے دیکھا تھا' نہ اس کے بعد دیکھا گیا۔ وہ اختلاف جو تمام متحرک زندگی کی تہ اور شعور میں پایا جاتا ہے۔ یہ اس کے وجود کا نتیجہ ہے۔ اس معاملے میں اپنی ان حدود تک پہنچ چکا تھا جن کا امکانی طور پر مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور کسی انسانی المیے میں اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ رومی دلال کا مشہور سوال "سچ کیا ہے" ؟ ---- یہی ایک لفظ جو عہدنامہ عظیم میں خالص نوعیت کا ہے' پوری انسانی تاریخ کا اظہار ہے۔ عمل کی غیر متعلق بلاشرکت غیرے قدر ہے' ریاست کی عزت' جنگ اور خون' طاقت کی فتح' اور شاندار موزونیت کا افتخار ہے۔ منہ سے تو کچھ نہیں بولا مگر مسیح کا خاموش احساس' اس سوال کا جو جواب پیش کرتا ہے وہ وہی ہے جو ہر مذہب میں فیصلہ کن قرار پاتا ہے۔ کیونکہ پائی لیٹ درحقیقت بیمار تھا' اسے کسی شے سے سروکار نہ تھا۔ اگر اس سارے قصے میں کوئی شے بھی فی الحقیقت مذہب سے متعلق ہوتی تو وہ تاریخ مخالف نہ ہوتی اور تاریخ کی قوت کا انکار نہ کرتی یا ایک فعال زندگی کے خلاف فیصلے کی ذمہ داری قبول نہ کرتی اور اس طرح تاریخ کی روح کے سامنے کھڑی نہ ہوتی۔

یہ دنیا میری سلطنت نہیں ہے یہ اس کا آخری کلمہ تھا جو اس نے کہا۔ اس پر کوئی پردہ نہیں ڈالا جا سکتا اور اسی سے اس کی شخصیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پیدائش سے اس کی فطرت کو کس نہج پر ڈال رکھا تھا ایک وجود جو شعور بیدار سے کام لیتا ہے' یا شعور بیدار جو اپنا راستہ خود متعین کرتی ہے۔ نبض کی روانی یا تشویش' خوف یا دانش تاریخ یا فطرت' سیاست یا مذہب ان میں سے ایک کا انتخاب کرتا تھا۔ باطل کے ساتھ کوئی سمجھوتا ممکن نہ تھا۔ ایک مدبر سچے دل سے مذہبی ہو سکتا ہے۔ ایک نیک آدمی اپنے ملک کا وفادار ہوتا ہے ---- لیکن ان دونوں کو اس کا علم ہونا چاہیے ---- کہ حق و باطل میں وہ کس کے ساتھ استادہ ہیں۔ ایک پیدائشی سیاست دان داخلی طریق فکر سے بغاوت کر سکتا ہے وہ اپنے تصورات سے صرف نظر کر سکتا ہے اور ایک فلسفی اخلاقیات زندگی کے واقعات سے آنکھ بند کر سکتا ہے اور پھر بھی وہ اپنے آپ کو درست سمجھتا ہے۔ خدا پر ایمان رکھنے والوں کے لیے تمام آرزوئیں اور کامرانیاں جو تاریخ بہم کرتی ہے۔ خطا کا درجہ رکھتی ہیں اور ان کی کوئی مستقل قدروقیمت نہیں یہ بھی اپنی حد تک درست ہے۔ ایک حاکم جو

دین کی اصلاح کرنا چاہتا ہے اور اسے سیاسی یا عملی مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے احمق ہے' ایک معاشرتی مبلغ جو صداقت' حقیقت' امن' اور عفو و درگزر کو دنیائے حقائق میں لانا چاہتا ہے وہ بھی احمق ہے۔ کسی عقیدے نے آج تک دنیا نہیں بدلی' اور کوئی واقع ایمان کی تردید نہیں کر سکتا۔ سمتی زمان اور لازمانی لامتناہیت کے مابین کوئی پل نہیں۔ اسی طرح تاریخی صراط اور الہیاتی تنظیم عالم کا آپس میں کوئی رابطہ نہیں۔ جس کی تشکیل میں تقدیر یا سلسلہ علت و معلول میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو گا۔ یہ اس لمحے کے آخری معانی ہیں جس میں کہ مسیح کو گزرنا پڑا اور مسیح اور پائلیٹ کو ایک دوسرے کے روبرو ہونا پڑا۔ ایک دنیا میں جو تاریخ سے متعلق تھی' رومیوں نے ایک گلیلی کو مصلوب کر دیا۔ اس کی قضاوقدر یہی تھی۔ دوسری ان کی تمام جدوجہد خواہ وہ اس دنیا کے خلاف ہو یا آخرت سے متعلق' ان کے کردار کی وجہ سے ان پر تھوپ دی جاتی ہے اور اس میں خارجی حالات کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ روح کو متضاد عوامل میں بن دیا جاتا ہے اور اس کے پاس نجات نام کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ کلاسیکی دور میں سٹیج کے کردار' اس کے برخلاف' تمام کے تمام رول ہوتے اور انھیں کردار نہ کہا جا سکتا۔ دوسری دنیا میں روم ابدی عذاب کا سامنا کرنا ہو گا اور صلیب نجات کا ایک وسیلہ قرار پائی ---- خدا کی یہی مرضی تھی (۸۰)۔

مذہب مابعدالطبیعیاتی ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں اور یہ مابعدالطبیعیات' علم' دلائل' ثبوت (جو صرف فلسفہ' علمیت ہے) نہیں بلکہ ایک مابعدالطبیعیات ہے جو ہمارے تجربات اور روز مرہ حیات سے متعلق ہے۔ اسے ایک یقین کی صورت میں احاطہ فکر میں نہیں لایا جا سکتا۔ مافطری بطور حقیقت مگر زندگی جس صورت میں بھی موجود ہے غیر حقیقی ہونے کے باوجود ایک صداقت ہے۔ یسوع نے اپنی زندگی اسی عام نہج پر بسر کی۔ ایک لحہ بھی اس نے کسی مختلف طریق حیات میں بسر نہیں کیا وہ کوئی اخلاقی فلسفی نہیں تھا اور اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ مذہب کا حتمی مقصد اخلاقی پرچار ہے تو وہ غلط ہے۔ اخلاقیات انیسویں صدی کی روشن خیالی کا انسانی بے کیف مظہر ہے۔ اگر کوئی مسیح کو معاشرتی مقاصد کا داعی سمجھتا ہے تو یہ توہین مذہب ہے۔ اس کے شاذونادر معاشرتی اقوال' جو قابل تصدیق ہیں' اور محض اس کے نام سے منسوب نہیں کر دیے گئے زیادہ سے زیادہ علمی اور روحانی نوعیت کے ہیں ان کے کسی نئے نظریہ اخلاق کو متعارف نہیں کرایا گیا وہ صرف مروج محاورات پر مشتمل ہیں۔ اس کی تعلیمات کی صورت ایک اعلان کی تھی انھیں جذبات کا اعلان جن سے وہ اپنے آخری ایام میں لبریز تھا۔ نئی زندگی کا طلوع' فلکی سفارت کی بجا آوری' روز حشر کا انصاف' ایک نئی زمین اور نیا آسمان (۸۱)۔ مسیح کے ہاں مذہب کا کوئی نیا تصور نہ تھا اور نہ ہی تاریخ کے متعلق اس کا احساس بہت گہرا تھا۔ مذہب ہی اول اور آخر مابعدالطبیعیات ہے اس کے علاوہ دنیا داری ہے اس دنیا میں باقی جو کچھ ہے اس کا ادراک بالحواس ممکن ہے مگر حواس کی شہادت صرف پیش منظر پیش کرتی ہے۔ اسے سطحی حواس سے زندگی بسر کرنے کا عمل قرار دیا جاتا ہے جس مقام سے ادراک اصل منزل کا آغاز ہوتا ہے بلکہ اس کی وجود کے شعور کی اہلیت پیدا ہوتی ہے تو کوئی نہ کوئی کمی رہ جاتی ہے' اور حقیقی مذہب وہاں پر ختم ہو جاتا ہے۔ "میری حکومت اس دنیا میں نہیں" اور صرف وہی شخص جو اس کی گہرائی میں غور کر سکتا ہے اسے ہی اس روشنی کا ادراک ہوتا ہے اور وہ ان آوازوں کو سن سکتا ہے جو اس میں پیدا ہوتی ہیں۔ دور

متاخر میں جو اس کی شہری زندگی سے متعلق ہے اس میں فرد ان اسرار کی گہرائیوں میں جھانکنے سے محروم رہتا ہے۔ وہ صرف مذہب کی خارجی دنیا میں کھو جاتا ہے اور مذہب کو معاشرتی علوم' مابعدالطبیعیات اخلاقیات اور معاشرتی منطق کی شکل دے دیتا ہے۔

مسیح براہ راست اس کے خلاف ہے جو سیزر کا حق ہے وہ اسے دے دو" اپنے آپ کو حقیقی دنیا کے لیے موزوں بناؤ صبر کرو' اور برداشت کرو۔ مگر یہ سوال نہ کرو کہ کیا یہ درست ہے اصل مقصد روح کی نجات ہے یہ سوچو کہ سوسن کا مطلب کیا ہے۔ امیری اور غریبی پر غور نہ کرو کیونکہ دونوں روح کو پابہ زنجیر کرتی ہیں۔ تاکہ اس دنیا میں آسائش حاصل ہو انسان خدا اور دولت کے بت کی پوجا بیک وقت نہیں کر سکتا۔ دولت کے بت سے مراد تمام دنیاوی واقعات ہیں۔ یہ سطحی ہے۔ یہ بزدلی ہے کہ ان مطالبات کی اہمیت کو دلائل کے زور سے ٹال دیا جائے۔ انسان کو اپنی ذاتی دولت کے اضافے اور عوام کی معاشرتی بہبود میں کسی طرح کا فرق ملحوظ نہیں رکھنا چاہیے۔جب دولت اسے ہول پیدا کرے اور جب یروشلم کی قدیم معاشرت ایک سخت گیر نظام کی پابند تھی' اور کوئی معاشرتی کلب نہیں تھی وہ ذاتی ملکیت کو قبول نہیں کرتی تھی اور ان معاشرتی جذبات کے قطعاً" خلاف تھی' جو بعد میں وجود میں آئے۔ وہ ظاہری اشیا پر اعتبار نہ کرتے تھے وہ اسے ہی سب کچھ نہ سمجھتے تھے' بلکہ اسے ہیچ قرار دیتے تھے وہ اس مادی دنیا کے آرام و آسائش تک ہی اپنی دنیا کو محدود نہ سمجھتے تھے بلکہ اس کے لیے غیر مشروط نفرت کا اظہار کرتے تھے۔ یہ درست ہے کہ ہمیشہ اس کے خلاف کوئی نہ کوئی صورت پیدا ہوتی رہتی اور وہ اس کی نفی کرتے رہتے۔ ہم دوبارہ ٹالسٹائی اور دستاوسکی کے مابین اختلاف کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ٹالسٹائی ایک شہری اور مغربی باشندہ تھا اسے یسوع میں صرف ایک مصلح ہی نظر آیا' جس کی مابعدالطبیعیاتی اہمیت تھی ـــــ تمام مہذب مغرب کی طرح جو صرف تقسیم کا عمل اختیار کرتی ہے' دست برداری کا نہیں اور عیسائیت کو ایک معاشرتی انقلاب کا نام دیتی ہے۔ دستاوسکی خود غریب تھا' مگر کبھی کبھی وہ راہب نظر آتا ہے اس نے کبھی معاشرتی بہبود کے متعلق کبھی کچھ نہیں سوچا۔ افلاس کے خاتمے سے انسانی روح کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

(۷)

یسوع کے دوستوں اور شاگردوں پر یروشلم کے سفر کے متعلق خوف طاری تھا۔ چند دن بعد یہ خبر مشہور ہو گئی کہ وہ دوبارہ جی اٹھا ہے اور ظاہر ہو گیا ہے۔ ایسی خبر کے ایسے حالات میں اثرات متاخر بنی نوع انسان کی سمجھ بوجھ کے مطابق نہیں ہو سکتے۔ وہ مروج مجوسی روح کے مطابق تمام کشوفات کی تکمیل کے متمنی تھے۔ موجودہ آئی عون کے مصائب کے خاتمے کے لیے نجات دہندہ سے طالب تھے جسے وہ آدم ثانی کا خطاب دیتے تھے۔ علاوہ ازیں اسے اور بھی کئی ناموں سے موسوم کرتے تھے' موسوشیافت' ای نوش بارناشا اور مزید کئی نام جن سے اسے موسوم کیا بالعموم "باپ" کا خطاب زیادہ رائج ہوا۔ اس کے ساتھ ہی مستقبل کے متعلق قبل از وقت بیان اور آئی عون کی نئی دنیا' حکومت افلاک' ایسے خطابات تھے جو اس کی حیات ہی میں

فوری طور پر اس سے منسوب کر دیے گئے۔ یہ خطابات تاریخ نجات میں فیصلہ کن محسوس کیے گئے۔

اس یقین نے اس چھوٹی سی اقلیت کا عالمی تصور مکمل طور پر بدل دیا۔ اس کی تعلیمات جنھیں انھوں نے اس کی نرم خو طبیعت اور شریفانہ فطرت سے حاصل کیا تھا اور ان پر انسان اور خدا کے مابین روابط کے داخلی احساس کو واضح کیا تھا اس عظیم تشریح کو اس نے کلمہ " محبت" سے واضح کر دیا تھا۔ یہ تعلیم پس منظر میں چلی گئی اور وہ اس کی تعلیمات کی جستجو کرنے لگے۔ گویا اس کے شاگردوں کے لیے علاوہ ازیں کچھ اور بھی جسے وہ واضح کرتے۔ (اس کے علاوہ اور کیا تھا؟)۔ یہی (لفظ محبت) سب سے زیادہ اہم اور حتمی صورت تھی لیکن عوام اس سے مستقبل کے تصور کی بجائے یادداشت (ماضی) کا مطالبہ کرتے تھے۔ یہ سب سے زیادہ فیصلہ کن عنصر تھا جسے اس سے قبل کبھی نہیں سنا گیا تھا ـــــ ایک حقیقت کو' جو آپ کی زندگی سے متعلق ہے اور جس کا آپ کو ذاتی تجربہ ہو' اسے ایک داستان عظیم میں تبدیل کرنا عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ یہودی (جن میں نوخیز پال بھی شامل تھا۔ اور میندانی (جن میں اصطباغی جان کے مرید بھی شامل تھے) ان سب نے مل کر ایک جذباتی جنگ لڑی اور یسوع کو ایک باطل مسیحا" ثابت کرنے کی کوشش کی جیسا کہ قدیم فارسی متون میں کچھ افراد کا ذکر تھا کہ مسیح کی آمد ابھی متوقع ہے۔ اگر انھوں نے اسے دیکھا نہ ہوتا اور اس کے ساتھ زندگی کا کچھ حصہ نہ گزارا ہوتا ہمیں غیر مشروط طور پر یہ تصور قبول کر لینا چاہیے' اگر ہمیں یہ علم ہو کہ ان ایام میں اسے کس قدر برتری حاصل تھی۔ فاصلے (۸۲) سے اسی کے متعلق غیر یقینی جھلک دیکھنے کی بجائے اس کی بجائے کہ ایک خوفناک تیقن کا انتظار کیا جائے' جو آ کر آزادی سے ہمکنار کرے گا' کیوں نہ اسی خوشخبری کو قبول کر لیا جائے جس کا اعلان کیا گیا تھا"۔

مگر یہ خوش خبری کیسے دی گئی تھی؟ اور نئے کشوفات کیسے ہوئے تھے؟ مسیح اور اس کے دوست پیدائشی یہودی تھے۔ لیکن ان کا سرزمین جودیا سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یروشلم کے لوگ اس مسیح کے انتظار میں تھے' جس کا مقدس کتب میں ذکر تھا۔ ایک مسیح جو یہودیوں کے لیے ظاہر ہو گا۔ اسے قدیم قبائلی روح کے مطابق سمجھا جا رہا تھا اور اسے صرف انھیں کے لیے مخصوص قرار دیا جا رہا تھا مگر تمام آرمیتائی ایسے مسیح کی تلاش میں تھے جو تمام دنیا کا نجات دہندہ ہو۔ منجی ہو اور ابن آدم ہو وہ اس تمام کشوفاتی ادب کا پیکر ہو' جس کا ذکر اہل یہود' اہل فارس' کلدانیوں منارائین سب کی الہامی کتب میں ہو (۸۳) ایک نقطہ نظر کے مطابق مسیح کی موت اور دوبارہ ظہور کی نوعیت محض مقامی تھی اور دوسرے کے مطابق اس واقعے سے عالمی تبدیلی عمل میں آئی کیونکہ ہر جگہ یہودی' مجوسی نسل کا ایک حصہ تھا۔ جن کا نہ کوئی وطن تھا اور نہ ولادت کی بنا پر کوئی نسل تھی۔ یروشلم محض ایک قبائلی تصور تھا۔ اس امر میں کوئی اختلاف نہ تھا کہ یہود کو تبلیغ کی جائے یا صرف شرفا کو مخاطب کیا جائے ـــــ فرق اس سے زیادہ عمیق تھا۔ تبلیغ کا لفظ ہمیشہ ذومعنی ہوتا ہے۔ جودیا کے باسیوں کے نقطہ نظر کے مطابق بھرتی کی کوئی ضرورت نہ تھی ـــــ یہ مسیح کے تصور سے بالکل برعکس تھا۔ الفاظ "قبیلہ" اور "مقصد" میں بظاہر کوئی شے مشترک نہیں۔ منتخب افراد کی جماعت کے ارکان' بالخصوص پجاریوں کے شعبے کو اپنی ذات کو اس امر کا یقین دلانا تھا کہ ان کی آرزو پوری ہو گئی ہے۔

مگر مجوسی قوم کی بنیاد اجماع یا احساس پر تھی۔ دوبارہ جی اٹھنے سے ایک مکمل اور معین صداقت ظہور میں آ گئی اور اس کی تصدیق پر اجماع سے ایک حقیقی قوم کے اصول کی صداقت مسلمہ ہو گئی۔ اسے اس وقت تک وسعت ملنی چاہیے جب تک کہ قدیم اور نامکمل مقاصد موجود ہیں۔ "ایک گڈریا اور اس کی بھیڑیں" قوم کا ایک نیا تصور ہے منجی کی قوم بنی نوع انسان کے عالمی اصول پر قائم ہے چنانچہ جب ہم اس ثقافت کی ابتدائی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس کے حواریوں کی مجلس میں اختلاف کا عنصر موجود تھا (۸۴) جس کا فیصلہ پانچ سو سال قبل ہو چکا تھا' اور حقائق سے اس کی تصدیق ہو چکی تھی۔ جلاوطنی کے بعد کی یہودیت (ماسوائے خود کمتنی جودیا کے علاقے کے) اہل فارس' کلدانیوں اور اہل افریقہ کی طرح وطن اور ابتدا کے متعلق کبھی متفکر نہیں ہوئی۔ اس حقیقت میں اب کسی قسم کا کوئی اختلاف باقی نہیں رہا کہ کبھی بھی یہودی قومیت کے دماغ میں یہ بات نہیں آئی کہ اس کی اصل کیا ہے۔ صرف اسی سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان کا نسلی وجود انتشار ہی ہے۔ قدیم یہودی متون کے برعکس جس کی تعبیر یہودی ربائیوں نے اپنے تک محدود کر لی تھی' اس حلاخہ (قانون) کو انتہائی محتاط انداز سے ہمیشہ ایک محفوظ خزانہ سمجھا گیا۔ مگر کشوفاتی ادب معرض تحریر میں لایا گیا اور اسے ہر کس و ناکس تک پہنچا دیا گیا تاکہ انھیں بیداری حاصل ہو اور اس کی اس طرح تشریح کی گئی کہ وہ ہر گھر تک پہنچ سکے۔ اسے سمجھنا آسان ہے کہ وہ کون سے تصورات تھے جو مسیح کے قدیم دوستوں کے تھے کیونکہ وہ اپنے آپ کو یروشلم کے قدیم دور کا معاشرہ کہتے تھے۔ اور عبادت گاہ میں ہمیشہ جاتے رہتے تھے۔ کیونکہ یہ سادہ لوح لوگ جن میں مسیح کے بھائی بھی شامل تھے جنھوں نے کھلے عام اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بلکہ اس کی ماں کو بھی اور اب وہ اس کے مصلوب بیٹے کو ماننے لگے تھے جودیا کی مقامی قوت کشوفات کے مقابلے میں ان کے نزدیک زیادہ مضبوط تھی۔ یہودیوں کو مطمئن کرنے میں وہ ناکام رہے (حالانکہ اس سے قبل فریسی بھی غالب آ چکے تھے) اس طرح وہ یہودیت قبول کیے بغیر بھی ایک نسلی گروہ کی حیثیت سے زندہ تھے اور ان کی تخلیق پطرس کے اعتراف سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ وہ صرف اپنے آپ ہی کو صحیح یہودی سمجھتے تھے اور ارباب مجلس باطل تھے (۸۵)

اس حلقے کا حتمی انجام (۸۶) یہ تھا کہ یہ لوگ گوشہ گمنامی میں گم ہو گئے۔ تمام مجوسی دنیا نے جدید کشوفاتی تعلیمات کو خوش آمدید کہا۔ مسیح کے آخری حواریوں سے متعدد مجوسی تھے' جن کا فریسیوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ پال سے بہت مدت قبل انھوں نے تبلیغ کا مسئلہ حل کر لیا تھا۔ ان کو تبلیغ نہ کرنا گویا زندگی سے انکار کے مترادف ہے اور اب وہ دجلہ و فرات کی وادیوں میں ہر جگہ موجود تھے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسیح کو بھی سابقہ پیغمبروں کے حلقے میں شامل کر لیا گیا (۸۷) اس سے ایک نیا اختلاف ابھر کر سامنے آیا' جو کفار اور یہودیوں کے لیے علیحدہ علیحدہ تبلیغی مقاصد کے سلسلے میں تھا اور یہ جودیائی اور باقی دنیا کے اختلاف سے زیادہ اہم تھا' کیونکہ اس کا فیصلہ کیا جا چکا تھا۔ مسیح کلیلی میں رہ چکا تھا اس کی تبلیغ کا رخ مغرب کی طرف ہو یا مشرق کی طرف ؟ کیا یہ مسیح کا مذہب ہو گا یا نجات حاصل کرنے کی ایک تنظیم؟ کیا اسے ایرانیوں سے قریبی تعلقات قائم کرنے چاہیں یا کشوفی کلیسا کے ساتھ' دونوں صورتوں کی تشکیل ہو رہی تھی؟

اس کا پال نے فیصلہ کر دیا جو اس نئی تحریک میں پہلی عظیم شخصیت تھی' اور پہلا شخص جسے نہ صرف صداقت کی حقیقت کا احساس تھا بلکہ واقعات کی نوعیت کا بھی ادراک رکھتا تھا'

یہ مغربی علاقوں کا ایک نوجوان ربی تھا اور طنائم میں سے کسی مشہور طنائم کا شاگرد تھا۔ اس نے بطور یہودی عیسائیوں کا قتل عام کیا تھا اور پھر اسے بیداری حاصل ہوئی جو اس دور میں ایک معمول تھا۔ اس نے اپنا رخ مغرب کی چھوٹی چھوٹی معاشرتوں کی طرف موڑ لیا اور اس نے ان سب کو اپنی مرضی کے ایک کلیسا میں منضبط کر لیا۔ کفار اور عیسائیوں کے کلیسا پہلو بہ پہلو چل رہے تھے اور متواتر ایک دوسرے کے خلاف اپنے رد عمل کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ لیمیت لیچس اور اےتمناسی اسی تک یہ عمل جاری رہا (۳۰۰ء تک)۔ اس وقت تک پال نے یروشلم کی عیسائی اقلیت کے متعلق اپنی نفرت پر کبھی پردہ نہیں ڈالا۔ اس مکتوب میں زیادہ جو غلطیوں کو لکھا گیا انجیل میں اور کوئی نمایاں نوعیت کی دستاویز موجود نہیں۔ اس نے جو کچھ کیا خود اپنی مرضی سے سرانجام دیا۔ اس نے جو تعلیم دی وہ اس کی ذاتی مرضی کے مطابق تھی اور اس نے جو تعمیری کام کیا وہ بھی اس کی اپنی مرضی کے مطابق تھا۔ بالآخر چودہ سال بعد وہ یروشلم گیا تاکہ وہاں پر بھی اپنی مضبوط ذہنیت کا مظاہرہ کر سکے اس کی کامیابی اور مسیح کے پرانے ساتھیوں پر موثر بالادستی اور یہ منوانے کی کوشش کہ اصل انجیل پال ہی کے قبضے میں تھی۔ پطرس اور اس کے شاگرد جو اس حقیقت سے بے خبر تھے' اس کی گفتگو کے دور رس نتائج کا اندازہ نہ کر سکے اور اسی لیے قدیم معاشرت اپنا مقام زائل کر کے سطحی حیثیت اختیار کر گئی۔

پال ذہنی لحاظ سے ربی تھا مگر احساس کے لحاظ سے کشوفاتی۔ وہ یروشلم کی تائید کرتا تھا مگر اسے ابتدائی ترقی کا زینہ قرار دیتا تھا۔ اس کے نتیجے میں ایک ہی کلام الٰہی (عہد نامہ قدیم) کے ماننے والوں میں دو مذہب وجود میں آ گئے اور حلافہ (قانون) دو ہو گئے۔ ایک کا رخ تالمود کی طرف تھا جسے طنائم نے ۳۰۰ ق م مرتب کیا تھا اور دوسرا وہ جسے پال نے وجود بخشا اور دوسرے پادریوں نے مل کر انجیل کی تعلیمات کے مطابق مکمل کیا۔ اس کے علاوہ پال نے تمام کشوفات کو یکجا کیا اور نجات کی آرزو میں اسے طول و عرض میں شائع کیا (۸۸) تاکہ اس کی نجات یقینی ہو سکے لیکن دمشق میں اس پر یہ ظاہر کر دیا گیا کہ "یسوع نجات دہندہ ہے اور پال اس کا نبی ہے" یہی اس کے تمام پیغام کا مطلب ہے۔ اس کی محمد ﷺ کے ساتھ کوئی مماثلت نہیں (کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے نبی ہیں پال کی طرح یسوع کے خود ساختہ نبی نہیں۔ اسلام اور عیسائیت میں نبوت کے تصورات مختلف ہیں اسلام حضرت عیسیٰ علیہ اسلام کو بھی خدا کا برحق رسول سمجھتا ہے۔ اسلام میں نبی صرف اللہ تعالیٰ کا پیغمبر ہوتا ہے اور کسی نبی کا کوئی نائب یا مرسل نبی نہیں ہوتا جیسا کہ پال اپنے متعلق دعویٰ کرتا ہے کہ وہ یسوع مسیح کا نبی ہے اسے اگر ایسے کشف ہوئے ہوں گے تو محض وساوس ہیں۔ مظفر حسن ملک)

(لہٰذا پال اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور پال میں کسی قسم کی مشابہت کی تلاش بے سود

ہے۔ دونوں کے پس منظر اور تصور نبوت ہی قطعاً مختلف ہیں) م ح م -

پال کے ساتھ ہی شہری آبادی اور اس کی ذہانت پیش منظر میں آ جاتے ہیں دوسرے لوگ خواہ وہ یروشلم اور انطاکیہ سے واقف بھی ہوں انھیں شہری مزاج سے پوری طرح آگاہی نہیں ہوتی۔ وہ مخصوص خطہ ارضی کے ساتھ پابند رہتے ہیں اور دیہاتی ہونے کی وجہ سے ان کی روح کا احساس بے تکلف ہوتا ہے مگر اب اس مزاج کو ترویج حاصل ہو چکی تھی جو کلاسیکی بڑے شہروں میں پروان چڑھی تھی ایسے مزاج کے لوگ شہروں ہی میں رہ سکتے تھے۔ یہ لوگ نہ تو دیہاتی کسان کو سمجھتے تھے نہ اس کا احترام کرتے تھے۔ فائلو کے ساتھ تفہیم کا امکان تھا' مگر پطرس نے کبھی اس پر عمل نہیں کیا پال پہلا شخص تھا' جس کی وجہ سے مشکل وقت میں حیات ثانیہ کا تجربہ وجود میں آیا۔ کلیسا کا جلال نے نوجوان کے دماغ میں تبدیلی پیدا کر دی اور اسے روحانی اصولوں میں اختلاف پیدا ہوا یہ اختلاف رائے کیا تھا ---- گیتھے مین کی جدوجہد اور دمشق کا حال: ایک بچہ اور دوسرا جوان ' روحانی آرزو اور عقل کا فیصلہ تامرگ قربانی اور تصورات کی تبدیلی کے پس منظر میں پال نے محسوس کیا کہ یہودیوں کی طرف سے یروشلم کے فریسیوں کو خطرات لاحق ہیں اور اسے فوری طور پر احساس ہوا کہ ناصری حق پر تھے۔ یہ ایک ایسا جملہ تھا جو مسیح کے منہ سے کبھی نہ نکلا اور اس سے یہودیوں کے حقوق پر زد پڑتی تھی۔ اس نے ایسی ذہانت سے کام لیا جو قبل ازیں نہیں لیا گیا اور گزشتہ تجربات کے علم پر مبنی تھا۔ ذہانت کا بلند معیار ہونے کے باوجود وہ از راہ سادگی دوسری ذہین قوتوں کے ہاتھوں میں چلا گیا یعنی مغربی شہروں کے اثر میں آ گیا۔ خالص کشوفاتی میں عقل محض کا دخل نہیں ہوتا' پرانے ساتھیوں کے مطابق اس کی کارروائی کو سمجھنا ممکن نہ تھا ---- اور افسوس کے ساتھ اور شک کے ساتھ وہ اسے دیکھتے رہتے ہوں گے' جب وہ ان سے خطاب کرتا تھا ان کے نزدیک مسیح کا پیکر (جسے پال نے کبھی نہیں دیکھا تھا) اس کی چمکدار سخت گیر روشن آنکھوں کے سامنے زرد پڑ جاتا تھا۔ اس کے تصورات اور مسلمات سب کے سب ان کی فہم سے بالاتر تھے۔ بعدازاں مقدس یادیں درسی نظام میں بدل گئیں۔ مگر پال اپنے تصورات میں بالکل واضح تھا اس کے تمام تبلیغی سفر مغرب کی سمت تھے اور مشرق کو اس نے بالکل نظرانداز کر دیا۔ وہ کلاسیکی شہروں سے کبھی باہر نہیں نکل۔ا جنگ کبھی روم کے علاقوں میں نہیں گئی اور نہ ہی کورنتھ اڈیسہ یا کیسی فون پر اس کے اثرات ہوئے اور اس کی کیا وجہ تھی کہ اس نے ہمیشہ شہروں میں کام کیا اور کبھی گاؤں گاؤں نہیں پھرا۔

یہ سب کچھ تنہا پال کی حکمت عملی کے مطابق تھا۔ اس کی عملی توانائی اور احساس کے سامنے کسی اور کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ چنانچہ نوزائیدہ کلیسا نے شہری اور مغربی رجحانات کو فیصلہ کن انداز میں قبول کر لیا اس قدر فیصلہ کن انداز میں کہ بعد ازاں کہ بعد کے دور میں وہ باقی ماندہ کفار کو جاہل اور بت پرست کہنے لگا اور دیہاتی آبادی کو بھی ان میں شامل کر لیا۔ اس عمل سے وہ خطرات پیدا ہوئے جس سے صرف جوان نسل ہی نے کلیسا کو نجات دلائی۔ کلاسیکی دنیا کے فلاحین نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اس عمل کے نشانات ابھی تک نمایاں ہیں مگر یسوع کے اثرات کس قدر دور ہو گئے تھے۔ جس کی ساری زندگی دیہات میں دیہی آبادی کے

ساتھ گزری تھی وہ قلب ماہیت جس میں وہ پیدا ہوا تھا اس نے قطعاً" محسوس نہ کی۔ اس کی روح پر اس کے ذرہ برابر اثرات نہ تھے ---- اور اب اس کے بعد ایک نسل گزر جانے پر جبکہ ابھی تک اس کی ماں زندہ تھی جو اس کی موت کے بعد روحانی مرکز کا مقام حاصل کر چکی تھی' وہ اس قلب ماہیت سے بالکل غیر متعلق رہی۔ اب تمام رسومات کی انجام دہی اور عقائد کی تعمیر کا مرکز کلاسیکی شہروں میں منتقل ہو گیا اور مشرق کی طرف معاشرتی رخ صرف خاموشی اور احتیاط سے ہوا (۸۹) ۱۰۰ء تک دریائے دجلہ سے آگے تک عیسائی موجود تھے مگر جہاں تک کلیسا کا تعلق ہے ان کا وجود اور ان سے متعلق عقائد موجود نہیں تھے۔

یہ دوسری تخلیق جوپال کے اس دورے کی وجہ سے ظہور میں آئی اور یہی تخلیق تھی جس نے بنیادی طور پر کلیسا کی نئی ہیئت کا باعث بنی۔ مسیح کی شخصیت اور داستان حیات کا مطالبہ تھا کہ اسے شاعرانہ صورت میں معرض تحریر میں لایا جائے مگر پھر بھی یہ ایک شخص مرقس کی کوشش تھی کہ انجیل وجود میں آئی۔ پال اور مرقس کے سامنے معاشرے کی مضبوط روایت تھی یعنی "انجیل" جو مسلسل اور با تکرار روایات پر مبنی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ آرامی اور یونانی زبان میں لکھی گئی غیر اہم یاداشتیں بھی موجود تھیں مگر وہ غیر مرتب تھیں یقیناً" کسی نہ کسی وقت میں کوئی سنجیدہ دستاویز بھی وجود میں آئی ہو گی۔ مگر ان کی فطری نوعیت اسی کے مطابق تھی' جو ان لوگوں کے اذہان میں تھی' جنھوں نے مسیح کے ساتھ زندگی بسر کی تھی (اور مشرق کی روح سے بالعموم آشنا تھے)۔ یہ اس کے فرمودات کا مستند' مجموعہ تھا جس میں تمام مضمرات حتمی تعینات جن کو مختلف مجالس نے بعثت ثانیہ کے حوالے سے بیان کیا تھا مگر مرقس کی انجیل نے اس سلسلے میں تمام مشکوکات کا خاتمہ کر دیا۔ یہ ۶۵ ء میں معرض تحریر میں آئی یہ وہی وقت تھا' جوپال کے آخری مکشوفات سے متعلق تھا اور اسی نوعیت کا یونانی زبان میں مواد موجود تھا۔ غالباً" اس کے لکھنے والے کے ذہن میں کوئی شکوک نہ تھے (۹۰) بلکہ اس سے اسے ایک بہت بڑی اہمیت حاصل ہو گئی جو نہ صرف عیسائیت تک محدود تھی بلکہ بالعموم عرب ثقافت پر اس کے اثرات مرتب ہوئے تمام قدیم کوششیں ختم کر دی گئیں اور انجیل کی موجودہ صورت کو فرمودات مسیح کی حیثیت دے دی گئی (یہاں تک کہ انجیل کا متن ہی بشارت کی مصدقہ صورت قرار پایا)۔ یہ سارا کام پال کے ایسے ادبی حلقے نے سرانجام دیا جس نے مسیح کے متعلق کبھی کسی سے کچھ بھی نہیں سنا تھا۔ یہ ایک فاصلاتی اور کشوفاتی صورت ہے۔ زندگی کے تجربات کو بیان سے بدل دیا گیا ہے اور بیان کو ایسے براہ راست مواد سے جو کشوفات پر مبنی تھا (۹۱) جو انسانی ظاہری حواس پر مبنی نہیں ہوتا۔ بہرحال یہ کشوفات ہی روایت سے مشروط ہیں یہ حضرت عیسیٰؑ کے الفاظ نہیں بلکہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات' جن کو پال نے ہیئت عطا کی' مرقس کی انجیل کی صورت بھی یہی ہے عیسائی کتاب پال کی تخلیقات پر مبنی ہے مگر بعد ازاں کتاب اور اس وارثان کے بغیر سوچ بچار سے ماورا ہو گئی۔

موجودہ حالات میں پال (جو ایک پیدائشی استاد تھا) کا یہ مجموعہ ہی' جس کے متعلق اس کا خود اپنا ارادہ نہ تھا مگر اس کی تخلیق کے رجحان کے مطابق "عیسائیت کے مسلک کا قومی کلیسا" قرار پایا اور تطبیق عقائد کا معاشرہ اپنے شعور کے مطابق مختلف مسالک ترتیب دیتا رہا اور مجوسی معاشرے نے بالآخر ایک توحید ناقص کی

صورت تشکیل کر لی۔ قدیم مغربی معاشرتوں کا مسیحی مسلک عمل جراحی سے گزارا گیا اور ان کو جمع کر کے ایک بڑا مسلک تخلیق کر لیا گیا تقریباً" ولادت مسیح کے دور میں جس کے متعلق شاگردوں کو کوئی علم نہ تھا اس کے بچپن کے متعلق ایک داستان مشہور ہو گئی مرقس کی انجیل ابھی تک وجود میں نہیں آئی تھی کسی فارسی الہامی کتاب میں یہ موجود تھا کہ آخری نجات دہندہ ایک کنواری کے ہاں جنم لے گا جسے سوشانت کہا گیا تھا مگر جدید مغربی حکایت ایک اور اہمیت کی حامل تھی اور اس کے بے شمار نتائج تھے کیونکہ قلب ماہیت کے علاقے میں ایک اور شخصیت نمودار ہوئی یعنی مسیح کی والدہ' جس کا وہ بیٹا تھا یعنی خدا کی ماں وہ اپنے بیٹے کی طرح ایک سادہ مزاج عورت تھی اس کی شخصیت اس قدر عظیم تھی کہ وہ معبد میں مقیم ایک سو ایک کنواریوں اور ماؤں میں سب سے نمایاں تھی۔ آئی سیس' تانیت' قانسیل دیمیتر ---- اور تمام ولادت اور تکلیف کے راز سے آشنا اپنے آپ کو اس کی پناہ میں لے آئیں کیونکہ آئی ریناؤس کے قول کے مطابق وہ جدید دور کی حوا تھی۔ اس کا کنوارا پن موجود تھا بنی نوع انسان کے لیے نجات دہندہ پیدا کرنے والی گویا خود ہی عالمی نجات دہندہ تھی۔ مریم' خدا کی ماں' کلاسیکی حدود کے باہر عیسائیوں کے لیے ایک بہت بڑی رکاوٹ تھی اور اسی عقیدے کی وجہ سے پاک طبیعتی اور نسطوری فرقے الگ ہو گئے انھوں نے خالص مسیحی مسالک قائم کر لیے مگر فاؤستی ثقافت جب دوبارہ بیدار ہوئی اور اسے ایک علامت کی ضرورت پیش آئی کہ زمانی لامتناہیت کو اس کے بنیادی معانی اور آئندہ نسلوں کی ضرورت کے مطابق بیان کیا جائے تو اس نے مقدس مادر کا سہارا لیا اور مظلوم منبجی سے اس معاملے میں صرف نظر کیا۔ چنانچہ جرمن کیتھولک عیسائیت اور رومی دور میں اور متواتر کئی ثمربار صدیوں میں اس نسوانی پیکر کی داخلی کیفیات' مغربی فنی دنیا کا موضوع رہی جو مغربی عالمی احساس کا مظہر تھا۔ آج بھی رومن کیتھولک کلیسا کی مذہبی روم اور اس کے عوام کی فکر میں مسیح کو مریم کے بعد دوسرا مقام دیا جاتا ہے

مریم کے مسلک کے علاوہ متعدد بزرگ راہبوں نے متعدد مسالک قائم کر لیے اور ان کی تعداد قدیم بت پرستوں کے مسالک سے بھی زیادہ ہو گئی۔ جب کفار کا کلیسا ختم ہو گیا تو عیسائیوں نے تمام کلیسائی مسالک راہبوں کے احترام کے ساتھ اپنے اندر جذب کر لیے۔

پال اور مرقس ایک اور معاملے میں مجلس میں اختلاف کے باوجود متفق تھے یہ پال کے مقصد کا نتیجہ تھا' کہ ابتدائی امکانات کے باوجود' یونانی زبان کلیسا کی سرکاری زبان بن گئی۔ انجیل اول کی رہنمائی کے بعد اور مقدس یونانی ادب کے احترام کے باوجود قارئین کو غور کرنا ہو گا کہ اس روحانیت کا آغاز اور اجنبی عناصر علم کے ساتھ انسلاک کیا نتائج پیدا کر سکتے تھے۔ مسیح کا کلیسا اپنی روحانی بنیادوں سے مصنوعی انداز میں الگ کر دیا گیا اور ایک اجنبی مدرسہ فکر سے منسلک کر دیا گیا مادر وطن کی آرمینائی زبان سے تعلق منقطع ہو گیا۔ اب کلیسا کے دونوں مسالک میں ایک ہی زبان مروج ہو گئی' ایک ہی تصوراتی روایت قائم ہو گئی' ایک ہی نوعیت کی کتب اور ایک ہی مدرسہ فکر کا رواج ہو گیا مشرق کا آرامی ادب جو مقابلتاً" بہت کم ترقی یافتہ تھی۔ مگر حقیقی طور پر مجوسی الاصل تھی اور حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں ان کے حواریوں کی تحریری زبان تھی۔

اس کے ترک سے یہ لوگ کلیسا کی زندگی سے منقطع ہو گئے تھے۔ ان کی تحریروں کو پڑھا نہ جا سکتا تھا یہ لوگ نظرانداز ہو گئے اور بالآخر انھیں فراموش کر دیا گیا۔ بالآخر قطع نظر اس امر کے کہ فارسی رسم الخط میں اوستا تحریر کی گئی اور یہودیوں کا سارا ادب عبرانی میں تھا اور اس عہد کا تمام ادب اسی زبان میں تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کے تمام الہامات اور تعلیمات کی بھی یہی زبان تھی بعد ازاں عراقی جامعات میں ذریعہ تعلیم آرامی زبان تھی یہ تمام کا تمام ذخیرہ زبان کی تبدیلی کی وجہ سے اوجھل ہو گیا اور افلاطون اور ارسطو کی تصنیفات عام ہو گئیں ان پر کام کی رفتار میں اضافہ ہوا۔ اور انھیں عیسائیوں کے دونوں فرقے اور اساتذہ مدارس صحیح معانی میں سمجھ نہ سکے۔

اس سمت میں ایک حتمی اقدام ایک ایسے شخص نے اٹھایا' جو انتظامی صلاحیتوں میں پال کے برابر تھا مگر ذہانت اور تخلیقی لحاظ میں اس سے برتر تھا' مگر حقائق کے امکانات کو سمجھنے میں اس سے کمتر تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے مقاصد میں بری طرح ناکام ہوا۔ (مارکلن) نے محسوس کیا کہ پال کی تخلیق اور اس کے نتائج ہی میں صحیح مذہب نجات کی بنیاد تلاش کی جا سکتی ہے۔ اسے دو مذاہب کے باہمی متناقضات کا احساس تھا' جو بلاوجہ آپس میں جنگ و جدل میں مصروف تھے' جبکہ دونوں کے پاس ایک ہی روحانی امر تھا ---- یعنی یہودی قانون۔ ہمیں آج یہ قابل تصور معلوم نہیں ہوتا کہ کبھی ایسا بھی ہوا ہو گا مگر فی الحقیقت ایسا ہوا اور ایک صدی تک جاری رہا ---- مگر ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہر مجوسی مذہب میں مقدس متن سے کیا مراد ہے۔ ان متون ہی میں مارشین کو صداقت کے خلاف ایک سازش نظر آئی اور اس کی نظر میں مسیح مجوزہ عقائد اور نظریات پر ابھی عمل نہیں ہوا تھا۔ پال جو مسیح کا رسول تھا اس نے عہد نامہ قدیم کو تکمیل شدہ اور حاصل شدہ قرار دیا۔ مارشین جو اس مسلک کا بانی تھا اس نے اسے شکست خوردہ اور منسوخ قرار دیا۔ اس نے کوشش کی کہ ہر یہودی سلسلے کو بالکل آخری تفصیل تک منقطع کر دیا جائے۔ اس نے تمام زندگی یہودیوں کی مخالفت میں گزار دی۔ ہر صحیح بانی کی طرح' اور ہر مذہبی' تخلیقی دورانیہ کی طرح' زرد تشت کی طرح' اسرائیل کے انبیا کی طرح' اور ہومر کے عہد کے یونان کی طرح اور ان جرمنوں کی طرح جنھوں نے عیسائیت قبول کر لی تھی' اس نے قدیم دیوتاؤں کو شکست خوردہ قوتوں میں بدل دیا جسے ہو واہ جو خالق الکل خدا سمجھا جاتا تھا اور ڈیمی ارج جو عادل ہونے کی وجہ سے "شر" سمجھا جاتا تھا' اور یسوع جس نے منجی خدا ہونے کے لیے یہ شکل اختیار کی تھی' اجنبی قرار دیا گیا ---- یہ ایک عمدہ اصول ہے مجوسی مذاہب کی بنیاد بالخصوص اہل فارس کے مذہب کا اصول اس کے نقطہ نظر میں مکمل موجود ہے۔ مرشین سائی نوپ کا رہائشی تھا جو متھرا کا قدیم دارالحکومت تھا جو ایک تاریخی سلطنت تھی اور اس کا مذہب بادشاہوں کے ناموں سے موسوم ہوتا تھا اسی قدامت میں متھرا مسلک کی بنیاد پڑی۔

مگر نئے عقائد کی بنیاد فی الحقیقت آسمانی کتاب پر تھی۔ " قانون اور انبیا جو ابھی تک تمام عیسائی دنیا کے لیے دستور کی حیثیت رکھتے تھے' وہ یہودی خداؤں کا بائبل تھا۔ اور فی الحقیقت وہ حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں ہی علمائے یہود کے ہاتھوں مکمل صورت میں پیش کیا گیا۔ اس لیے جو عیسائیوں کے پاس عہد نامہ قدیم کا

نسخہ تھا وہ ایک شیطانی کتاب تھی جسے اب نجات دہندہ خدا کے خلاف استعمال کیا جا رہا تھا اور اسی طرح یہودی معاشرے میں اس عہد تک بھی دستاویزات کی جمع تفریق جاری تھی اور ایسی سادہ کتب مرتب کی جا رہی تھیں جن کی کوئی قانونی اہمیت نہ تھی اور نہ کوئی ایسا دعویٰ تھا۔ تورات کی جگہ ---- اس کا یہ نظریہ ہے ---- کہ اب انجیل آ چکی ہے۔ جو صرف واحد سچی کتاب ہے۔ جیسے وہ متعدد و علیحدہ علیحدہ نسخوں سے یکجا کر رہا تھا' جو اس کی نظر میں تحریف کردہ اور غلط نسخے تھے۔ اسرائیلی انبیا کی جگہ وہ صرف مسیح کے ایک نبی پال کو درست تسلیم کرتا ہے۔

لہٰذا مرشین عہدنامہ جدید کا حقیقی مصنف بن گیا مگر اس سلسلے میں ان پراسرار شخصیتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا' جو اس کے ساتھ وابستہ تھے جو انجیل کی تحریر سے قلیل مدت قبل "جان کے مطابق" اس کے ساتھ شامل ہوئے۔ اس مصنف کا ارادہ نہ تو انجیل کو قابل فہم بنانا تھا اور نہ اس پر کوئی اور مسودہ مسلط کرنا تھا' اس نے جو کچھ کیا ---- اور مرقس کے برعکس شعوری طور پر جو کچھ کیا بالکل ایک نئی تخلیق کو وجود میں لانا تھا۔ اس نے عیسائیت کی مقدس کتاب کو حوالہ آتش کر دیا جو اس نئے مذہب میں قرآن کی حیثیت رکھتی تھی (یعنی عیسائیوں کے نزدیک اس کی اہمیت اتنی ہی تھی جتنی مسلمانوں کے نزدیک قرآن کی ہے۔ م ح م   اس کتاب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مذہب مذکور کو مکمل اور دائمی تصور کر لیا گیا تھا۔ دنیا کے فوری اور اچانک خاتمے کا تصور جسے یسوع نے ہمیشہ تسلیم کیا اور جو پال اور مرقس بھی تسلیم کرتے تھے جان اور مرشن کے تصورات میں شامل نہ تھا۔ اس دور میں مکشوفات کا خاتمہ ہو گیا اور مارشینی دور کا آغاز ہوا۔ اس میں شامل مواد کا مسیح سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ ہی پال کی مسیح کے متعلق تعلیمات سے اس کا کوئی تعلق تھا مگر اس دنیائے دنی کا معمہ اور کائنات کے مسائل کا بیان کیا گیا تھا۔ اس عقیدے کی رو سے انجیل کا کوئی مقام نہیں اور نہ ہی منجی کی ذات کا کوئی مسئلہ ہے۔ صرف کلمہ الٰہی اور تثلیث کا اصول پیش کیا گیا ہے عقل کل خود ایک معنی ہے اور معانی کی دریافت کا ذریعہ نہیں۔ بچپن کی داستان سے مکمل طور پر انکار کر دیا گیا ہے اور تثلیث یعنی خدا روح القدس اور کلام الٰہی قدیم عیسائیت کی اس مقدس کتاب میں پہلی دفعہ مجوسی مسئلہ "جوہر" زیر بحث لایا گیا۔ جو آئندہ تین صدیوں میں تمام مسائل پر حاوی رہا اور بالآخر اس کی وجہ سے مذہب تین مختلف کلیساؤں میں منقسم ہو گیا ---- اس میں ایک سے زیادہ پہلو اہم ہیں ---- کہ اس مسئلے کا درست حل جان کے نزدیک (جو مشرقی نسطوریوں کے تصور کے قریب تر ہے) کہ کلام الٰہی یا اقنوم ثانی کا تصور (یونانیوں کے نزدیک لفظ کا اپنا وجود ہے)۔ انجیل میں یہ عنصر سب سے زیادہ مشرقی ہے اور مسیح کو بطور حتمی اور آخری منجی کی حیثیت سے پیش نہیں کرتا اور نہ ہی اس کے پیغام کو آخری پیغام تسلیم کرتا ہے۔ وہ صرف دوسرا سفیر ہے اس کے بعد تیسرا بھی آئے گا (جو باعث اطمینان ہو گا جس کا نام فار قلیط ہو گا۔ جان ۱۴- ۱۶- ۲۶- ۱۵- ۲۶)۔ یہی وہ حیرت انگیز عقیدہ ہے جس کا اعلان مسیح نے خود کیا اور اس معمائی کتاب کی فیصلہ کن تصریح ہے یہ اس مقام پر اچانک واضح کر دی گئی ہے یہ مجوس مشرق کا مذہب ہے اگر کلمہ الٰہی نہ جائے تو فار قلیط نہیں آ سکتا   (جان ۱۴' ۷)۔ مگر ان کے مابین آخری طویل دور ہو گا جس میں اہرمن کی حکومت ہو گی (۱۴: ۳۰) ہیئت منقلبہ کا کلیسا پالی دانشوروں کے قبضے میں تھا۔ یہ لوگ جان کی

انجیل کے خلاف طویل عرصے تک جنگ آزما رہے اور اسے اسی وقت تسلیم کیا جبکہ اس سیاہ نشان کے عقیدے پر پال کی تشریح کا غلبہ تسلیم کر لیا گیا۔ صحیح صورت حال کو' کوہستانی تحریک (ایشیائے کوچک ۱۶۰) نے واضح کیا۔ جس نے زبانی روایات پر توجہ کی اور فار قلیط کے ظہور اور قرب کا اعلان کیا۔ یہ تصور بہت زیادہ مقبول ہوا۔ طرطولین ۲۰۷ء میں خود کار تسیح گیا۔ ۲۴۵ء میں مانی نے جو مشرقی عیسائیت سے بخوبی واقف تھا اس نے پال کا انسانی مسیح کا عقیدہ ختم کر دیا اور جان کا عقیدہ تثلیث (اقنوم ثانی) اور حضرت عیسیٰؑ کے وجود کو کلمہ الٰہی قرار دینے کے عقائد کو درست تسلیم کیا اور اپنے آپ کو چوتھی انجیل کے مطابق فار قلیط کے نام سے موسوم کیا۔ کار تسیح میں آگسٹائن مینشی بن گیا اور اس سے یہی نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے کہ دونوں عقائد نے مل کر باطنی راہبانہ تحریک کو تقویت دی (مارشن ازم۔ جس کی رو سے حضرت عیسیٰؑ کو خدا تسلیم نہیں کیا جاتا)۔

اب مارشین کی ذات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یہی شخص تھا جس نے جان کے تصورات کو ترویج دی اور اس طرح عیسائی عہد نامہ وجود میں آیا اور جب یہ بوڑھا ہو رہا تھا اور مغربی معاشرتی گروہوں نے اس کے خلاف خوف زدہ ہو کر بغاوت پر آمادہ ہو گئیں   تو اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ اپنا نجات دہندہ کلیسا تشکیل دے گا   ۱۵۶ء سے لے کر ۱۹۰ء تک یہی واحد قوت تھی یہ اس کے بعد کی صدی میں ممکن ہوا کہ قدیم کلیسا نے مارشینیوں کو محض بدعتی قرار دے دیا تمام مشرق میں ترکستان تک بہت عرصے تک اس کی اہمیت برقرار رہی اور اس کا خاتمہ اس وقت ہوا جب یہ فرقہ مینشیوں کے ساتھ مدغم ہو گیا

اگرچہ وہ اپنی شعوری برتری کے باعث اس نے مروجہ ماحول کو کم رتبہ سمجھا مگر اس کی جدوجہد ضائع نہیں گئی۔ وہ اپنے پیش رو پال اور بعد میں آنے والے اتھاناسی اس کی طرح عیسائیت کے لیے اس وقت نجات دہندہ ثابت ہوا جبکہ وہ انتشار کا شکار ہو رہی تھی مگر اس کے تصورات کی عظمت کسی طرح بھی کم نہیں ہوئی کہ عیسائیت کا اتحاد اسی کی مساعی سے قائم ہوا۔ قدیم کیتھولک کلیسا ---- جو قلب ماہیت کا کلیسا تھا ---- ۱۹۰ء کے قریب اپنے عروج کو پہنچا اور اس کے بعد یہ مارشینی کلیسا کے خلاف دفاع میں مشغول ہو گیا اور اس میں اسے اسی کلیسا کی ایک تنظیم کی مدد حاصل ہو گئی۔ مزید برآں اس نے مارشینی عہدنامے کو اس نوعیت کے ایک اور عہد نامے سے تبدیل کر دیا۔ اس میں انجیل اور فرمودات مسیح شامل تھے اس کے بعد اس نے قانون اور پیغمبرانہ روایات کو یکجا کر دیا۔ بالآخر دونوں عہدناموں کو یکجا کرنے کے بعد کلیسا کا یہود کے متعلق رویہ فیصلہ کن صورت اختیار کر گیا۔ بعد ازاں اس نے مارشین کی تیسری تخلیق اس کا اصول نجات ختم کرنے کی کوشش کی اور اس غرض سے اس نے اپنی دینیات مرتب کی جس کی بنیاد اس کے اپنے ایجاد کردہ حل مسائل پر تھی۔

مگر اس عمل کا آغاز کلاسیکی سرزمین پر ہوا۔ اس لیے مارشینسی تحریک کے خلاف جو کلیسا وجود میں آیا' اور یہود کی جو مخالفت ہوئی اسے تالمودی یہودیوں نے حقارت کی نظر سے دیکھا (جس کا تمام مرکز ثقل عراق

اور عراقی جامعات میں تھا) اور اسے محض یونانی کفر کا ایک حصہ قرار دیا گیا۔ یروشلم کی تباہی ایک فیصلہ کن واقعہ تھا جس کی کوئی بھی روحانی قوت تلافی نہیں کر سکتی تھی۔ اسی سے اس داخلی ارتباط کا احساس ہوتا ہے' جو شعور بیدار' مذہب اور زبان کا یونان سے مکمل انقطاع کی صورت میں ۷۰ء کے بعد وجود میں آیا۔ اس سے یونانی قلب ماہیت اور آرامی (جو خالصتاً ایک عرب علاقہ ہے) ---- دو مختلف نمایاں علاقے وجود میں آ گئے جہاں مذہبی ارتقا عمل میں آیا اس نوخیز ثقافت کی مغربی سرحد پر ملحد مسلک کا کلیسا اور مسیح کا کلیسا (جسے وہاں سے پال نے باہر نکال دیا تھا) اور فائلو کے نشان کے ساتھ یونانی بولنے والے یہودی زبان اور ادب کے لحاظ سے اس قدر باہم مربوط تھے کہ آخرالذکر نے پہلی صدی ہی میں یہودیت اختیار کر لی اور یونانیوں اور عیسائیوں نے مل کر پہلی صدی عیسوی کا مشترک فلسفہ مرتب کیا۔ آرامی زبان کی دنیا میں اور انطس سے دجلہ تک یہودی اور اہل فارس متواتر مل کر اور اتحاد باہم کے جذبے کے تحت رو بعمل رہتے۔ دونوں نے اپنی اپنی دینیات اور قوانین مرتب کیے جو تالمود اور اوستا کی صورت میں وجود میں آئے اور چوتھی صدی تک یہ دونوں مجموعے آرامی بولنے والے عیسائیوں کے لیے مشعل راہ کا کام دیتے رہے۔ اس سے قلب ماہیت کا عمل رک گیا اور آخر کار انھیں بنیادوں پر نسطوری فرقے کا وجود عمل میں آیا۔

مشرقی انسانی شعور بیدار میں اختلاف یہیں سے وجود میں آیا۔ ایک لفظی معانی اور دوسرے باطنی معانی اور چشم بینا (مشاہدے) اور تحریر میں بھی یہ اختلاف قائم رہا۔ اس سے خالص عربی تصوف کی بنیاد پڑی اور تعلیمی و تدریسی ادارے وجود میں آئے کشوفاتی تیقن پہلی صدی کے مفہوم کے مطابق روحانی عرفان جسے مسیح پیدا کرنا چاہتا تھا روحانی انہماک اور جذباتی شعور بنی اسرائیل کے انبیا کا عطیہ ہے۔ گاتھا' اور تصوف کی صورتیں ہمارے ہاں بھی ہیں اور سپائی تورا میں نمایاں ہیں۔ پولینڈ کے مسیح بعل میں اور مرزا علی محمد میں جس نے بہائی مذہب کو ایجاد کیا اسے ۱۸۵۰ء میں تہران میں پھانسی دے دی گئی۔ یہ خرق عادت کا ایک اور مظہر ہے۔ الفاظ کا تالمودی جادو' پال اسی فن کا ماہر تھا۔ اس کے بعد کے تمام اوستائی افعال پر اور نسطوری منطق پر اور اسلامی دینیات پر اس کے اثرات موجود ہیں۔

دوسری طرف قلب ماہیت واحد اور کل ہے۔ یہ دونوں صورتیں مجوسی قبول و اعتقاد کا حصہ ہیں (یعنی ایقان) اور اس کے مابعدالطبیعیاتی واخلیت عناسیت (یعنی عرفان) مجوسی عقائد کو مغربی صورت پہنانے کے سلسلے میں ارنائی اوس اور سب سے بڑھ کر ٹیرولی آن نے کام کیا جس کی مشہور ضرب المثل اس ساری بحث پر حاوی ہے (Credo quiu absurdum) (نسلی اختلافات بے معنی شے ہے)۔ کفر کا نمائندہ افلاطینس تھا وہ اپنی تصانیف میں (بالخصوص (Return of the soul to God)" روح کی خدا کی طرف مراجعت" میں بعض ایسے تصورات پیش کرتا ہے جو عیسائیت سے قریب تر ہیں' مثلاً" باپ بیٹا اور ان کے مابین وسطانی وجود جیسا کہ فائلو کی تثلیث کا ذکر ہو چکا ہے جس میں پہلوٹھا بیٹا اور دوسری صورت خدا کی ہے۔ وجدان فرشتوں اور شیاطین کے متعلق عقائد اور روح کی شویتی ماہیت ان لوگوں میں عام طور پر مروج تھی چونکہ افلاطینس اور اوریجن دونوں ایک ہی استاد کے شاگرد تھے ان میں مدرسیت اور متعلقہ قلب ماہیت یکساں طور پر موجود تھی

اور اسی مجوسی تصورات اور فکر کے بھی ان پر اثرات تھے۔ انھوں نے افلاطون اور ارسطو کے متون کی نہ صرف تشریح کی بلکہ ان کی قدروقیمت میں اضافہ کیا۔

تمام قلب ماہیت کے اطوار اور فکر کا مرکزی تصور تثلیث کا اقنوم ثانی ہے یہی تصور مروج ہے اور متعقدین کے ہاں تصور پروان بھی چڑھتا ہے۔ اس امر کا کوئی امکان نہیں کہ اس تصور میں کلاسیکی یونانی اثرات موجود ہیں ۔ اس دور میں ایسا کوئی فرد واحد بھی موجود نہ تھا کہ جس کے تصورات میں ہیرا کلائٹس اور سٹوآ کے تصورات کی ذرا سی جھلک بھی موجود ہو مگر بعض ایسے محققین بھی موجود ہیں جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسکندریہ میں یہ دونوں متضاد عقائد پہلو بہ پہلو مروج تھے مگر وہ اپنے اس دعوے کو ثابت نہیں کر پائے اور اقنوم ثانی کا ذرا سا شائبہ بھی تلاش نہیں کر سکے۔ جبکہ اہل فارس اور کلدانیوں کے تصورات ---- بطور روح اللہ یا کلام اللہ ---- اور یہودیوں کے عقائد میں ---- روچ اور میمرہ کا تصور ---- یہ وہ اثرات ہیں جنھوں نے فیصلہ کردار ادا کیا۔ تثلیث کے اقنوم ثانی کے عقیدے نے مغرب پر لیا اثرات مرتب کیے وہ یہ تھے کہ ان کے نتیجے میں ایک کلاسیکی طریق عمل وجود میں آ گیا۔ جو فائلو اور جان کی انجیل کی صورت میں ظاہر ہوا (اس کا مغرب پر مستقل اثر یہ تھا کہ درسگاہوں میں یہ تصورات غالب آ گئے)۔ یہ ہدف عیسائی تصوف کی صورت میں تھے' بلکہ بعد ازاں عقیدے کی صورت اختیار کر گئے یہ ناگزیر تھا۔ یہ عقیدہ جو دونوں کلیساؤں میں مشترک تھا اس علم کے متوازی تھا جو مذہب کے اعتبار سے اجماع تیقنین پر مبنی تھا اور مسلک کے لحاظ سے مرلم اور رشی منی پر اور ان سب تصورات کو مشرقی ذہن نے قبول نہ کیا اور بالآخر چوتھی صدی عیسوی کے بعد اس کے خلاف بغاوت کر دی ۔

تاریخ کے نقطہ نظر سے ان تصورات و احساسات کو مجوسی میں دہرایا گیا ہے قلب ماہیت کی بنیادی صورت باسلیق ہے جو ولادت مسیح سے بہت مدت قبل بھی مغربی یہودیوں اور کلدانی یونانیوں کے ہاں موجود تھی۔ انجیل میں پیش کردہ جان کے تصور تثلیث پیش کیا ہے۔ یہ کلاسیکی نوعیت کا مجوسی بنیادی عقیدہ ہے لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ باسلیق بھی مجوسی دالان ہی کی ایک صورت ہے جس کا اندرونی حصہ کلاسیکی معابد کے بیرونی حصے پر منطبق ہوتا ہے۔ عمارت کے مسکی حصے کو اندرونی دالان میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ خالص مشرقی انداز تعمیر میں گنبد ایک مخصوص عنصر ہے جو عیسائی گرجاؤں کی تعمیر سے بہت عرصہ پہلے سے جاری تھا۔ یہ اہل فارس' کلدانیوں اور عراق کے کنائس اور غالباً اہل سبا کی عبادت گاہوں میں بھی اس کا رواج تھا باز نطین کی کلیسائی کونسل میں یہ کوشش کی گئی کہ مشرق و مغرب کے طرز ہائے تعمیر کا اجتماع کیا جائے اور یہ کوشش ایک مرکب یا سلیق کی علامتی صورت تشکیل ہوئی تاریخ کی اس مد میں مذہبی عمارتوں کی تعمیر' فی الحقیقت ایک اہم تبدیلی ہے جو اتھناسی اوس اور کنسٹیشائن' جو عیسائیت میں آخری بڑے نمایاں کردار تھے' کی مساعی سے وجود میں آئی ایک نے مضبوط مغربی رہبانیت کے عقیدے کو تخلیق کیا اور دوسرے نے عیسائی قومیت کی داغ بیل ڈالی جسے بعد میں یونانیت سے منسوب کر دیا گیا اور اس عبوری دور کی علامت کے طور پر گنبدی باسلیق کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

باب ہشتم

عرب ثقافت کے مسائل

(ب)

مجوسی روح

(ا)

یہ ہوئی دنیا جو مجوسی شعور بیدار کے لیے ایک قسم کی توسیع کی حامل ہے' اسے غار سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ مغربی باشندوں کے لیے یہ مشکل ہے کہ وہ اپنے ذخیرہ ء الفاظ میں سے کوئی ایک ایسا لفظ منتخب کر سکے جو مجوسی کلمہ "زمان" کا ایسا مکمل مفہوم بیان کر سکے' جسے اشارے سے زیادہ اہمیت حاصل ہو۔ کیونکہ زمان' ایسی اصطلاح ہے جس کے ہر ثقافت میں مختلف معانی ہیں۔ یہ عالم بطور غار' عالم بطور حد شوق سے مختلف ہے' ثانی الذکر فاؤسٹی ثقافت کے پس منظر میں بیان ہوا ہے' جبکہ کلاسیکی مفہوم میں اسے مجسم اشیا پر مبنی سمجھا جاتا تھا۔ کوپر نیکی نظام میں یہ ارض اپنا وجود کھو دیتی ہے' مگر ایسا تصور عربی فکر میں احمقانہ اور غیر سنجیدہ سمجھا جاتا ہے۔ مغربی کلیسا اس معاملے میں بالکل درست تھا' جب اس نے حضرت عیسیٰؑ کے نظریات عالمی احساس سے متضاد تصورات اور کلدانی ممتی ہیئت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ تصور یہودیوں اور اہل فارس کے لیے تو طبیعی اور فطری تھا' مگر اسلام کے نزدیک قلب ماہیت کے درجے کے تحت آتا ہے۔ یونانیوں کی چند نسلوں تک تو یہ نظریہ مقبول رہا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ زمانی' نظریے کی قدر و قیمت میں تبدیلی ممکن ہے۔

عالم صغیر اور عالم کبیر کے مابین کشاکش (جو کہ شعور بیدار کے عین مطابق ہے) ہمیں ہر ثقافت کے عالمی تصور کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور مزید برآں علامتی اہمیت کی مخالفت میں اضافہ کرتی ہے۔ ہر انسان کا تحس یا ادراک' ایمان یا علم' بنیادی مخالفت ہی سے اپنی صورت اختیار کرتا ہے اس سے نہ صرف فرد کی فعالتیں ترکیب پاتی ہیں' بلکہ اس کی شخصیت کی جامعیت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ کلاسیکی فلسفے میں عالمی طور پر غالب شعور بیدار مادے اور ہیئت کے اختلاف پر مرکوز ہے۔ مگر مغرب میں یہ اختلاف توانائی اور مادے کے درمیان ہے۔ اول الذکر صورت میں یہ کشاکش اپنے آپ کو چھوٹے چھوٹے حصوں اور اجزا میں منقسم کر لیتی ہے جبکہ ثانی الذکر میں یہ اپنا استغراغ کام کی صورت میں کر کے سکون حاصل کرتی ہے۔ عالمی عمق میں "اس کے برعکس' یہ حالت سفر میں رہ کر ادھرادھر جھولتی ہے اور اس کی تمام جدوجہد غیر یقینی ہوتی ہے اور اس طرح سامی ثنویت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس کی ہزاروں صورتیں ہیں اور اسے کوئی بھی نام دیا جا سکتا ہے لیکن مجوسی عالم کی اسی سے تشکیل ہوتی ہے ۔ بالاخر عمق سے روشنی بلند ہوتی ہے جو ظلمات سے جنگ کرتی ہے (جان ۔ ا' ۵)۔ یہ دونوں تصورات مجوسی ہیں ۔ ملائے اعلیٰ اور تحت الثریٰ ' افلاک اور ارض' یہ سب آزاد قوتیں ہیں' اور باہم آویزش میں مبتلا ہیں ۔ مگر ان کے تضادات ابتدائی کشاکش میں پوشیدہ ہیں جو شامتہ بھی ہیں اور معترض بھی ۔ خیر و شر سے آشنا ہیں اور خدا اور شیطان کے تصور سے بھی لاعلم نہیں۔ جان کی انجیل کے مصنف اور صحیح مسلمان پر موت وارد نہیں ہوتی۔ موت سے زندگی کا خاتمہ نہیں ہوتا مگر ایک خاص شے' جو کہ موت کی قوت کا مقابلہ قوت حیات سے ہوتا ہے جو انسان کے قبضے میں ہے۔

مگر اس سے زیادہ اختلاف روح اور نفس میں ہے (روح اور نفس دونوں الفاظ عبرانی الاصل ہیں)۔ (فارسی میں ابو اور اروان اور مندائی میں موتو ہد اور گیان' یونانی میں پنیوما اور سائکی') پیغمبرانہ مذہب میں بھی جو کچھ بھی نبی کے منہ سے نکلتا ہے' وہ تمام مکشوفات پر غالب آ جاتا ہے۔ اور بالاخر ثقافت بیدار کے تمام تفکر کی رہنمائی کرتا ہے۔ فائلو' پال' افلاطینس' گنوسٹکس' اور منداز ئین' آگسٹائن اور اوستا' اسلام اور قبالہ' ان تمام عناصر سے ثقافت اپنا وجود مکمل کرتی ہے۔ روح کے لفظی معنی ہوا کے ہیں اور نفس کے معانی سانس کے ہیں نفس کسی نہ کسی طور پر جسم اور ارض سے منسلک رہتا ہے۔ یہ زیریں' شر اور ظلمات کی علامت ہے۔ اس کی کوشش ہمیشہ بلندی کی طرف عروج کی ہوتی ہے۔ روح کا تعلق الوہیت سے ہے' افلاک سے اور نور سے۔ یہ انسان کو اس وقت متاثر کرتا ہے جب اسی کا نزول ہوتا ہے یعنی شمعون کی جرات' ایلی جاہ کی بددعا' منصف کی دور اندیشی' (حضرت سلیمانؑ کے فیصلے) اور ہر طرح کی الوہیت اور کیف' یہ سب کچھ پھوٹ کر نکلتا ہے (اشعیاہ ۱۱-۲) مسیح نے روح اللہ کا حلول حاصل کیا۔ فائلو اور اسلامی دینیات انسان کو دو حصوں میں منقسم کر دیتے ہیں۔ پیدائشی نفسی اور پیدائشی روحانی ۔ (منتخب شدہ۔ ایک ایسا تصور جو عمق عالم کے لیے موزوں ہے عرف عام میں قسمت)۔ یعقوب کے تمام فرزند روحانی کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں ۔ پال کے نزدیک(1.Cor XI)۔ حیات ثانیہ کا مطلب یہ واضح کرنا تھا کہ روحانی اور نفسی انسانوں کے تصور کے علاوہ بھی ایک تیسرا تصور موجود ہے اس کے' فائلو اور بدوچ کے مصنف کے مطابق' افلاک اور ارض یا روشنی اور ظلمات کی طرح ہے پال کے مطابق مسیح روح افلاک ہے جان کی انجیل میں کلمہ

ایک نور ہے تو افلاطینی فکر میں اس کا ظہور نفس کی صورت میں ہوا۔ کلاسیکی اصطلاح کے مطابق تمام یکجا ہو کر مادیت کی تردید کرتے ہیں پال اور فائلو اپنے کلاسیکی رجحانات کے مطابق (یہ مغربی تصور ہے) اپنا تصوراتی معیار قائم کرتے ہیں اور روح اور جسم کو خیر اور شر سے علی الترتیب تشبیہ دیتے ہیں۔ آگسٹائن بطور ایک نیشی کے' فارسی 'مشرقی امتیاز کے معیار پر مبنی تصور کے مطابق جسم اور روح دونوں کو یکجا کر کے فطری شر قرار دیتا ہے وہ اسے مجموعہ جسم و روح کو خیر یا خیرالکل کہنے سے پرہیز کرتا ہے اور اس اصول کے تحت وہ خدا کے رحم و کرم کا اصول وضع کرتا ہے (اگرچہ اس کے اثرات سے بالکل آزاد) مگر بعد کے زمانے میں یہ اصول اسلام میں بھی مروج ہوا۔

مگر ارواح زیریں سطح پر جدا جدا وجود ہیں جبکہ جوہر حیات ایک ہی اور ہر جگہ یکساں ہے۔ ہر شخص کی ایک روح ہوتی ہے مگر وہ صرف نور اور خیر میں اپنا حصہ ادا کرتی ہے۔ اس پر روحانی تجلیات کا نزول ہوتا ہے ۔ اس طرح تمام زیریں وجود یکجا ہو کر عالم بالا کی ایک حقیقت سے منسلک ہو جاتے ہیں ۔ یہ ابتدائی احساس جو مجوسی انسان کے نقطہ ہائے نظر اور اعتقادات کو یکجا کرتا ہے کلی طور پر صرف ایک ہے ۔ نہ صرف یہ کہ وہ ان کے تصور عالم کو صورت عطا کرتا ہے' بلکہ ان کے مذہبی مزاج کی روح کو بھی ہیئت بخشتا ہے۔ یہ ثقافت جس کا ابھی ذکر ہوا ہے' یہ ازمنہ وسطیٰ کی ثقافت تھی۔ اس کے تصورات اور افکار دوسری ثقافتوں سے حاصل کردہ ہوں گے اور یہ حقیقت کہ اس نے ایسا نہیں کیا اور تمام ترغیبات اور تحریصات کے باوجود اس نے اپنی ہیئت قائم کر رکھی ہے ۔ اس سے ان اختلافات کا ثبوت ملتا ہے' جن کو کبھی ختم نہیں کیا جا سکتا۔ بابل اور مصر کے تمام مذاہب میں سے صرف چند نام رہ گئے ہیں اور کلاسیکی اور ہندوستانی تہذیبیں اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکی ہیں ۔ یونانیت اور بدھ مت نے اپنی صورت اظہار کو اس قدر تبیہ کر لیا ہے کہ قلب ماہیت کے درجے تک پہنچ چکے ہیں۔ مگر وہ اپنے مذاہب کی تعلیمات تک کبھی بھی رسائی حاصل نہیں کر سکے۔ مجوسی ثقافت کے تمام مذاہب اشعیا سے لے کر زرتشت تک' حتیٰ کہ اسلام تک' عالمی تصور کے مطابق ایک یکساں داخلی احساس کے حامل ہیں مگر اوستا کی روایات میں برہمنی فکر کا نشان تک نہیں ملتا۔ یہی صورت ابتدائی عیسائیت کی ہے اس میں کلاسیکی احساس کی خوشبو موجود ہے۔ یسوع کا مذہب جرمن کلاسیکی کیتھولک مغربی عیسائیت کے لیے قابل قبول ہے چنانچہ اس کی تمام روایات کے ذخیرے اور تعلیمات کو مجموعی حیثیت سے قبول کر لیا گیا ہے اور اس پر عمل کیا گیا ہے۔

جبکہ فاؤستی تہذیب کا باشندہ اپنی خودی کا بہت خیال رکھتا ہے مگر جہاں تک لاتناہیت کے مسئلے کا تعلق ہے اس پر وہ اپنا حتمی فیصلہ خود کرتا ہے۔ جہاں تک شمسی فرد کا تعلق ہے اگرچہ وہ ایک معاشرے کا فرد ہے' اس کے باوجود وہ انفرادی فیصلہ کرتا ہے۔ مجوسی معاشرے کا فرد جو روحانی وجود کا قائل ہے وہ معاشرے کے ایک جزو ہی کی حیثیت سے اپنے ردعمل کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک اجتماعی صورت (جماعت) جس کا ملااعلیٰ سے نزول ہوتا ہے اور تمام مومنین کی جماعت میں سے ایک فرد ہے۔ بطور جسم اور روح اس کا تعلق صرف اپنی ذات تنہا سے ہے۔ مگر اس کے علاوہ بھی ایک ذات ہے جو اجنبی اور ارفع ہے' خود اس کی ذات کے اندر موجود ہے۔ جس کے نور کی جھلک اور اس پر اعتقاد کی وجہ سے وہ ایک اجتماعیت کا فرد ہے۔ مظہر

ذات خداوندی' جو مبرا من الخطا ہے مگر اظہار ذات کے لیے خودی کا وجود بھی برحق ہے۔ اس کے نزدیک صداقت (حق) کا وجود ہمارے تصور سے مختلف ہے۔ وہ ہمارے تمام روحانی نظام سے مختلف اور الگ ہے اور اس کا انحصار ذاتی انصاف پر ہے۔ یہ ایمانی کیفیت عشق اور دیوانگی کی صورت اختیار کر لیتی ہے جس کا سائنسی نتیجہ شر کی صورت میں نکلتا ہے جس کی وجہ روح کو اپنے مقاصد اور افتاد طبع یا مزاج تشویش اور غلطی کا احتمال پیدا ہوتا ہے۔ یہ وہ صورت یا کیفیت ہے' جسے مغربی مزاج سمجھنے سے قاصر ہے۔ یہ مجوسی عمق عالم کا ایک راز ہے ---- جس کا شعور ممکن نہیں ۔ ان تمام مذاہب میں خودی کا بنیادی تصور معمر ہے۔ کلاسیکی مذہب میں انسان خدا کے سامنے ایک متوازی جسم کی طرح کھڑا ہوتا تھا جبکہ فاؤستی خودی اس وسیع عالم میں اپنے آپ کو خالق کے مدمقابل دیکھتی ہے اور اپنے آپ کو مستعد غیر یقینی' ایک معمائی قوت کے سامنے سرنگوں ہے یہ قوت رحم و کرم یا جلال کا اظہار کرتی ہے' ظلمات پر اپنا نور نازل کرتی ہے لیکن یہ سب کچھ اس کی اپنی رضا پر منحصر ہے۔ فرد کا تصور ارادہ و عزم بالکل بے معنی ہے کیونکہ انسانی عزم و فکر بنیادی عناصر نہیں بلکہ خدائی اثرات کے تحت ہے۔ ناقابل تغیر بنیادی احساس کے تحت' جس کے اظہار کا صرف تکرار کیا جاتا ہے' اس میں کسی تغیر' روشنی یا عالمی لطافت کی وجہ سے کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ سے الوہی ثالثی کا وجود سامنے آتا ہے' جو اس تکلیف دہ صورت کو برکت میں بدل دے ۔ تمام مجوسی مذاہب اس تصور کی وجہ سے باہم وابستہ ہیں اور تمام دوسری ثقافتوں سے علیحدہ ہیں۔

کلمتہ اللہ یا تثلیث کے اقنوم ثانی کا تصور' مجوسی مذاہب میں نور عمق ہی کی تجریدیت ہے اور مجوسی تصور و فکر کی بعینہ صورت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ناممکن الحصول ربوبیت سے "کلمہ" ظہور میں آیا جو اپنے ساتھ نور "اور خیر لایا' وہ انسان کو معراج عطا کرنے کے لیے اس کے ساتھ رابطہ استوار کرتا ہے اس میں سرایت کر کے اسے نجات دلاتا ہے۔ تین عناصر کی یہ صراحت مذہبی فکر میں توحید کے تصور کی تردید نہیں کرتی جو پیغمبرانہ مذاہب میں معروف ہے۔ ہرمزد کا بیان کردہ نور بھی لفظ (کلمہ) ہی ہے۔ (یشت ۱۳۔۳۱) اور قدیم گاتھامیں سے ایک میں اسے مقدس روح بھی کہا گیا ہے (سپنتا مائن یو) جو روح شر (اینگرا مائن یو) کا مقابلہ کرتی ہے (یا نسا ۱۵۔۲) اور یہی تصور تمام قدیم یہودی ادب میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ فکر جو کلدانیوں نے تشکیل دیا اس کی بنیاد خدا اور اس کے کلام کے علیحدہ علیحدہ وجود پر رکھی گئی اور مردوک اور نبودو مختلف وجود تشکیل دیے گئے جو تمام آرامی مسالک و مذاہب کے الہامی ادب میں فعال اور تخلیق کار رہا ہے۔ فائلو' جان 'مارشین اور مانی' نے اسے تسلیم کیا ہے اور تالمود کی تعلیمات اور ازاں بعد قبالی کتب یسیرہ اور سوہار میں بھی اسے شامل کر لیا گیا۔ کلیسا کی مجالس' پادریوں کی تخلیقات' اس کے بعد اوستا میں' اور بالآخر اسلام میں بھی یہ تصور داخل ہوا جس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو بتدریج نور میں تبدیل کر دیا گیا اس طرح اس مقبول مذہب میں محمدؐ کی ذات کو یسوعؑ کے پیکر میں تبدیل کر دیا گیا مجوسی مذاہب کے مزاج میں یہ تصور اس قدر رچا بسا ہے کہ اس کی وجہ سے مسلمانوں نے اپنے اصل عقیدہ توحید کو بھی خیرباد کہا اور خدا کے ساتھ' خدا کے کلام (کلمہ) مقدس روح (رب) اور محمدؐ کے نور کو شامل کر لیا گیا ہے

کیونکہ اس مقبول عام مذہب کے مطابق نور اولیں کا ظہور جو تخلیق کائنات کا باعث ہے وہ ذات محمدؐ ہے۔ اس مور کی صورت میں جو سفید موتیوں سے جڑا ہوا ہے اور متعدد پردوں کے اندر بند ہے مگر مور خدا کی ذات کا نمائندہ ہے اور سب سے بلند مرتبہ روح ہے۔ اور یہ تصور مندائین کے قدیم مذہب میں بھی موجود تھا اور ابتدائی عیسائیت میں استدام کی صورت میں یہ تصور تھا' جس کا اظہار سنگین تابوت کی صورت میں کیا جاتا تھا چمکدار موتیوں کا تصور جو جسم کے اندھیرے جسم کو منور کرتا ہے روح کی شکل میں داخل ہوتا ہے اور فکر بھی اسی کا عنصر ہے مندائنوں کے نزدیک یہ طاس کا عمل ہے۔ جزی۔ جزوی فرقے کے لوگ تثلیث کے اقنوم ثانی کو مور اور نور سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ موتیوں کی کان کی پہاڑی کے بعد یہ دوسرا تصور ہے' جو عیسائیوں نے خالص فارسی الاصل تصور سہ عناصر سے حاصل کر کے محفوظ کر لیا ہے۔

گویا بار بار ہمیں تثلیث کے تصور میں قدیم مجوسی معتقدات نور کی جھلک نظر آتی ہے۔ مجوسی مذاہب کی دنیا پریوں کی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ بدروحیں اور شیاطین انسان کو ڈراتے ہیں اور فرشتے اور پریاں اسے تحفظ فراہم کرتی ہیں۔ اسی سے تعویزوں اور طلسمات کا آغاز ہوا۔ پراسرار ارضی خطے' شہر' عمارات اور مخلوق' خفیہ حروف' سلیمانی مہر' فلسفیوں کے حجرات یہ سب اسی نوعیت کی اشیا ہیں۔ بہرحال ان سے عالی عمق میں روشنی پیدا ہوتی ہے ورنہ غار کا اندھیرا مخلوق کو ہڑپ کر جاتا۔ اگر قاری ان اشکال کے وجود پر حیرت زدہ ہو' تو اسے یاد کرنا چاہیے کہ مسیح بھی ان کے درمیان گزارہ کرتا رہا اور مسیح کی تعلیمات کو اسی پس منظر کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے۔ مکشوفات بھی ایک ایسی ہی داستان ہے جو انتہائی خطرناک قوتوں کی وجہ سے وجود میں آتی ہے۔ ادریس (خنوخ) کی کتاب میں ہمیں خدا کے عبوری گھر کا تصور ملتا ہے قیمتی پتھروں کی پہاڑی اور مرتد ستاروں کی جیل کا ذکر بھی موجود ہے۔ مندائنوں کے تمام تصورات تعجب خیز ہونے کے علاوہ حواس پر غلبہ بھی پا لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں غناسطیوں' مشیوں' اور ی گن اور ایرانی "بنداہش" کا پیکر' اور جب عظیم تجلی کا وقت گزر گیا' تو یہ تصور بھی داستانی منظومات میں گم ہو گئے اور متعدد مذہبی تجربات اور داستانیں' جن کے حضرت عیسیٰؑ کے بچپن کی داستانوں میں نمونے ملتے ہیں جو انجیل میں درج ہیں۔ ان کے ساتھ ٹامس کے افعال اور فرضی عناصر کو بھی شامل کر لیا جائے' ایک ایسی ہی داستان حضرت ابراہیمؑ سے متعلق ہے' جس میں جودی میں چاندی کے تیس سکے معروب کرتے ہیں۔ ایک اور خزانے کی غار کی کہانی ہے جس میں کہ گل گو تھا کی پہاڑی کی تہ میں جنتی خزائن اور حضرت آدمؑ کی ہڈیاں مدفون ہیں دانتے کا شاعرانہ مواد تو شاعری ہی تھا مگر یہ سب کا سب حقیقت پر مبنی تھا۔ صرف یہی ایک دنیا تھی جس میں کہ یہ لوگ مسلسل وقت بسر کرتے رہے۔ یہ محسوسات زندہ انسانوں کی رسائی سے ماورا ہیں جو اس عالم متحرک میں زندگی بسر کرتے ہیں اگر ہمیں تھوڑا سا بھی پتہ چل جائے کہ حضرت عیسیٰؑ کی داخلی زندگی ہم سے کتنی مختلف تھی تو مغربی عیسائیوں کے لیے ایک اندوہناک کیفیت پیدا ہوگی اور وہ یہ خواہش کرے گا کہ مذکورہ داخلی تقدس کسی صورت میں اسے نصیب ہو سکے۔ اگر آج ہم یہ معلوم کر سکیں کہ دور حاضر میں ایک پارسا مسلمان ہی اپنی زندگی میں اس تجربے سے گزر سکتا ہے تو ہم اس حیرت ناک عالمی تصور میں ڈوب جائیں گے جو فی الواقع حضرت عیسیٰؑ کا عالمی احساس تھا اور صرف اسی صورت میں ہمیں یہ احساس ہوگا کہ فاؤستی تہذیب

و ثقافت نے کلیسائی قلب ماہیت کی دولت سے کس قدر کم حصہ پایا ہے۔ اس کے عالمی احساس سے کچھ بھی نہیں مگر اس کے تصورات اور پیکران سے بے شمار دولت وصول کی ہے۔

[illegible]

(۲)

[illegible]

مجوسی مزاج میں کب (زمان) کا کہاں (مکان) سے اجرا ہوتا ہے۔ اس صورت میں شمسی بھی نقطہ خال سے پیوستہ نہیں رہتے اور نہ ہی فاؤستی لامتناہی مقاصد کے حصول پر زور صرف کرتے ہیں۔ اس معاملے میں وجود کا پہلو مختلف ہے۔ لہٰذا شعور بیدار کا زمانی احساس بھی مختلف ہوتا ہے جو مجوسی مکان کے تصور کے برعکس ہے۔ اس ثقافت میں سب سے ارفع شے بنی نوع انسان کا وجود ہے۔ غریب غلاموں اور قلیوں میں سے پیغمبر اور خلیفہ پیدا ہو سکتے ہیں۔ تقدیر (قسمت) کا لکھا محدود نہیں اگر گزرا ہوا وقت ہاتھ نہیں آتا' مگر کسی خاص دن کا آغاز اور انجام پہلے سے طے شدہ ہے' اور ہر شخص کا ایک مخصوص مقام پہلے سے طے شدہ ہے۔ نہ صرف عالمی مقام بلکہ عالمی زمان بھی اس عمق امکان میں فیصلہ شدہ ہے۔ [illegible] مجوسی مذاہب میں ایک محاورہ مروج ہے کہ "ہر شے کا وقت مقرر ہے" حضرت عیسیٰؑ کے ظہور کے وقت سے جو قدیم کتب میں متعین کر دیا گیا تھا اور ہر روز کے متعلق تفصیلات لکھ دی گئی تھیں اور جن کی روشنی میں فاؤستی تعجیل بے معنی اور ناقابل تصور ہوتی۔ یہ صورت حال بھی قدیم مجوسی تصورات کے مطابق ہے (اور بالخصوص کلدانی)۔ علم نجوم جو دعویٰ کرتا ہے کہ ہر معاملے کا فیصلہ ستاروں کے اختیار میں ہے اور سائنس کی رو سے ستاروں کے راستے متعین کیے جا سکتے ہیں مگر تمام ارضی معاملات پر فیصلوں کے اختیارات انھیں ستاروں کو دے دیے گئے ہیں۔ کلاسیکی ہاتف صرف ان سوالات ہی کا جواب دیتا' جو شمسی آبادی کے لیے باعث تکلیف ہوتے ---- یہ ہیئت اور آئندہ واقعات کی کیفیت کہ ان کے وقوع کا انداز کیا ہوگا؟ مگر اس مکان ارضی کا مسئلہ ہے "کب؟" تمام پیشین گوئیوں میں مسیح کی روحانی زندگی' کیتھابس مین کے مقام پر تکالیف اور حیات نو کے معاملات واضح نہیں۔ اگر ہم نے مجوسی مذاہب کے بنیادی سوال کا اچھی طرح سے ادراک نہیں کیا۔ لہٰذا یہ مفروضہ لاینحل ہی رہ گیا۔ یہ وہ صورت ہے جس کے تحت کلاسیکی علم نجوم کالعدم ہو جاتا ہے جو مغربی دنیا میں آج تک قدم بقدم علم ہیئت کی صورت میں فروغ حاصل کرتا رہا۔ کسی اور معاملے میں عبوری دور کے ارتعاش اس قدر نمایاں نہیں' جتنا کہ ٹھیک اسی سے متعلق ظہور پذیر ہوئے۔ جس کی تمام تاریخ ہی تذبذب اور عالمی تصورات کی تاخت و تاراج سے عبارت ہے۔ اولین طور پر ایک سچے رومی کی حیثیت سے وہ قدیم شہر کے دیوتاؤں پر قبضہ کرتا ہے پھر ایک ذہین بین الاقوامی باشندہ ہونے کی بنا پر' ان کے اعتقادات کو مبنی بر اوہام قرار دیتا ہے' اور پھر رواقی ہونے کے ناطے (اس وقت تک رواقیت کی روح مجوسی ہو چکی تھی)' وہ سات سیاروں کی قوت کا ذکر کرتا ہے' جو کہ انسانی قسمتوں کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زمان ہی مقدر ساز قرار پاتا ہے یعنی ہر شے وقت کے تہ خانے میں مدفون ہے جو ہر سمت سے بند ہے۔ لہٰذا اسے بطور ایک حقیقت کے قبول کیا جا سکتا ہے اور آنکھ سے اس کی شناخت ہو سکتی ہے ---- فارسی تصوف میں اسے خدا کے نور کی حیثیت حاصل ہے یعنی زروان اور عالمی اختلاف متعلق خیر و شر پر حکمران ہے۔

زروانیت ایران کا ۲۳۸ تا ۴۵۷ سرکاری مذہب تھا۔

بنیادی طور پر یہ اعتقاد کہ تمام معاملات ستاروں پر تحریر کر دیے گئے ہیں' عرب ثقافت کو اوصاف کے لحاظ سے ادوار میں تقسیم کر دیتا ہے یعنی وقت کا عرفان کسی ایسے واقعے کے آغاز سے ہوتا ہے جس کا تعلق کسی اہم اور قابل احساس واقعے سے ہو' سب سے اہم اور اولیں آرامی تقویم ہے جو ۳۰۰ ق م سے جو کشمکش اور سیلوکی عہد سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد متعدد تقویمات وجود میں آئیں' جن میں سیائین کی تقویم ہے جس کا آغاز تقریباً ۱۱۵ ق م میں ہوا مگر اس کے نقطہء آغاز کا درست تعین نہیں ہو سکا۔ وائیو قلیلی یہودی تقویم تخلیق جس کی مجلس کی منظوری کے بعد ۳۴۶ میں آغاز ہوا ایرانی تقویم کا آغاز یزدگرد (ساسانی دور کے آخری بادشاہ) کی موت سے ہوا جو ۶۳۲ کے مطابق ہے اور ہجری تقویم کا آغاز اس عہد سے ہوا جبکہ آخری سیلیوکس کو شام اور عراق میں معزول کر دیا گیا ان کے علاوہ اگر کوئی اور تقویمات ہیں تو وہ بعض عملی اقدامات کی نقل ہیں جیسا کہ مارشینن کی تقویم جو اس کی کلیسا سے علیحدگی ۱۴۴ سے شروع ہوتی ہے اور عیسائیوں کی وہ تقویم جو حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کے ۵۰۰ سال بعد متعارف کرائی گئی۔

تاریخ عالم' عالم زندہ کی تاریخ ہے۔ جس میں انسان اپنی ذات کو ولادت' مورثان اعلیٰ اور اولاد کے حوالے سے مشاہدہ کرتا ہے اور جسے وہ اپنے عالمی احساس کے ذریعے ادراک کرنا چاہتا ہے۔ کلاسیکی انسان کی تاریخ محض حال مطلق تک محدود ہے۔ اس میں صحیح تکوین کی تفصیلات کا فقدان ہے بلکہ ایک پیش منظر کا وجود جس میں لازمانی فیصلہ شدہ اساطیر کے پس منظر کا وجود بھی شامل ہے جسے سنہری دور کہہ کر جواز مہیا کیا جاتا ہے۔ لہٰذا وجود مختلف الالوان جھنڈ کی طرح کبھی اوپر کبھی نیچے' کبھی خوش قسمت' کبھی بدبخت' اندھا' مگر قریب تر' ازلی تغیر' مگر ہر دفعہ رنگ بدل کر بھی پھر اپنی اصل حالت میں موجود' نہ اس کی سمت متعین ہے' نہ مقصد' نہ زمان کا کوئی تعین ہے بلکہ اس کے برخلاف ایک عمیق غار کا احساس ہے کہ اسے قابل جائزہ تاریخ دستیاب ہو تاکہ وہ اپنے آغاز اور انجام کا اندازہ کر سکے اور اپنے آپ کو کائنات میں مناسب مقام عطا کر سکے کیونکہ کائنات بھی انسانی آغاز و انجام سے منسلک ہے۔ یہ خدائے واحد کی فعالیت ہے جو کہ انتہائی طاقت ور اور حیران کن ہے اور اس تغیر و تبدل یا نشیب و فراز کے مابین کائنات کے زمان و مکان میں خیر و شر کی ایک جنگ جاری ہے جسے نور اور ظلمات کا جنگ کا نام بھی دیا جاتا ہے یا فرشتوں اور یزدانی قوتوں کی شیاطین' اہرمن اور ابلیس سے معرکہ آرائی' اور ان تمام میں انسان اس کی روح اور نفس شامل ہیں۔ موجودہ عالم کو خدا تباہ کر کے ایک نیا عالم تخلیق کرنے پر قادر ہے۔ فارسی' کلدانی مکشوفات نظارے کے لیے مکمل طوالت زمانی کا لازوال ادوار کا سلسلہ مہیا کر سکتا ہے اور مسیح اپنے دور میں موجودہ دور کے خاتمے کا منتظر رہا اس کے نتائج کو اخذ کرنے کے لیے تاریخ کا مطالعہ لازمی ہے جو اسلام میں بالکل فطری انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یعنی مقررہ ادوار کا جائزہ لیں ---- بنی نوع انسان کے عالمی تصورات فطری طور پر تین بڑے حصوں میں منقسم ہوتے ہیں' آغاز عالم نشوونما اور عالمی تباہی۔ ایک مسلمان کے لیے جسے اخلاقی اقدار کا گہرا احساس رہتا ہے۔ عالمی نشوونما میں داستان نجات انتہائی اہم ہے اور زندگی کا اخلاقی راستہ' اگر اس کے ساتھ مربوط

ہو تو یہی ایک باکمال زندگی ہے۔ انسان کی اخلاقی تاریخ میں رخنہ اندازی اور گمراہی کی ترویج ہی انسانی تباہی کا پیش خیمہ ہے

مزید برآں مجوسی انسانی بقا کے احساس کے لیے زمان و مکان کا اس نوعیت کا تصور' کردار کی پاکیزگی کے لیے ناگزیر ہے جسے ہم عمق عالم کے منور کرنے کے لیے بھی استعمال میں لا سکتے ہیں۔ عزم و ارادے سے دست برداری کا خودی کو علم نہیں' جب وہ معاشرتی عزم کی روحانیت کو محسوس کرتا ہے' تو اس پر نور الوہیت کا ظہور ہو جاتا ہے۔ اس نمونے کی عرب دنیا صرف اسلام میں ہے (اسلام کا مطلب تسلیم ہے) مگر یہی اسلام حضرت عیسیٰؑ کی روز مرہ زندگی میں بھی نمایاں تھا۔ مزید برآں ہر وہ خصوصیت جو اس ثقافت میں موجود تھی' وہ بھی حضرت مسیح میں موجود تھی۔ کلاسیکی تقدس کلیتاً اس سے مختلف تھا جہاں تک ہماری اپنی (مغربی) ثقافت کا تعلق ہے' اگر ہم ینٹ تھریسا اور لوتھر اور پاسکل کی ذہنی پاکیزگی اور خودی کا مشاہدہ کریں ---- وہ خودی جو اپنے عزم کو ہر صورت میں قائم رکھنا چاہتی ہے' صرف لامتناہی ذات خداوندی کے سامنے سرنگوں ہوتی ہے ---- مگر اس کے بعد باقی تو کچھ بھی نہیں رہے گا۔ فاؤستی عقیدہ استغفار یہ مفروضہ قبل از وقت قائم کر لیتا ہے کہ ایسی صورت حالات پر قابو پایا جا سکتا ہے لیکن اسلام کے عقائد کے مطابق کوئی ایسا مفروضہ قائم نہیں کیا جا سکتا کہ انسان کو اتنی آزادی حاصل ہے کہ وہ گناہ و خطا میں ملوث ہو کر تائب ہو سکتا ہے اور ہر حال میں توبہ قبول ہوگی۔ ایسی کوئی شعوری جسارت خطا ہے۔ البتہ اگر ایسی کوئی شہادت موجود ہو کہ لاعلمی اور شر کے غلبے کے تحت اس سے یہ خطا سرزد ہو گئی ہو اور اس کے ضمیر پر شیطانیت کا غلبہ آگیا ہے' تو اس کی توبہ استغفار ضرور قبول ہوگی (اگر نیک نیتی سے کی گئی ہو)۔ مجوسی شعور بیدار خیر و شر کی قوتوں کا میدان جنگ ہے اور فی نفسہ فیصلہ کن قوت نہیں۔ اس قسم کی صورت حال میں علت و معلول کی گنجائش نہیں رہتی۔ ایسے کسی موثر' متحرک' تسلسل کا تو ذکر ہی چھوڑیں' گناہ اور سزا میں کوئی لازمی ارتباط بھی موجود نہیں۔ کسی انعام کا کوئی لالچ نہیں' کسی قدیم اسرائیلی عدل و احسان اور صالحیت کا کوئی وجود نہیں۔ اس نوعیت کے افعال جو کسی ثقافت میں پیدا ہوتے ہیں وہ اس کی تہ میں چلے جاتے ہیں قوانین فطرت طے شدہ نہیں ہیں اور بذریعہ خرق عادت یا معجزات خدا انھیں تبدیل بھی کر سکتا ہے۔ چنانچہ یہ قوانین فطرت (کہنا چاہیے) کہ ارادہ الٰہی کے تابع ہیں' جو کسی کے سامنے جوابدہ نہیں اور ان کا منطقی لزوم مغربی ثقافت کے اصولوں کے تحت نہیں۔ تمام کائنات میں علت اولیٰ صرف ایک ہی ہے' جو تمام فعالیتوں کے عقب میں کارفرما ہے۔ یہ خداوند تعالیٰ کی ذات ہے جس کی مشیت کے لیے کسی علت کی تلاش بے معنی ہے' اللہ تعالیٰ کے افعال کی علت کی تلاش بھی خطا ہے۔

اس بنیادی احساس سے مجوسی تصور رحم و کرم کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ اعتقاد تمام مجوسی ثقافتوں کی تہ میں پنہاں ہے (بالخصوص بپتسمہ کے عقیدے میں) اور فاؤستی تصور استغفار کی تہ میں بھی یہ تصور موجود ہے۔ استغفار میں عزم خودی کا مفروضہ پہلے سے موجود ہے۔ یہ آگسٹائن کی بہت بڑی کامیابی ہے کہ اس نے ایک خالص اسلامی عقیدے کو ایک ناقابل تردید منطق کے زور پر عیسائیت میں شامل کر لیا" اور اس کا استدلال

اتنا واضح تھا کہ پیلاگیوس سے لے کر آج تک فاؤستی ثقافت نے اس تیقن کو بدلنے کی ناکام کوشش کی ہے ---- اور اس کے اظہار کے لیے آگسٹائن کے اپنے ادراک الوہیت کو اسی کی زبان میں یہ کہنا چاہیے کہ ان اسرار و مسائل کو ہمیشہ غلط سمجھا گیا ہے اور اس طرح ان کی قدر و قیمت بھی درست متعین نہیں کی جا سکی۔ فی الحقیقت یہ قدیم عرب کلیسا کا آخری مفکر تھا مگر اس کے باوجود وہ مغرب کی ذہانت کا بھی اولین نمونہ تھا نہ صرف یہ کہ وہ ایک وقت میں مانی تھا مگر بعض اہم اوصاف کی بنا پر وہ عیسائی بھی تھا، مگر اس کے سب سے زیادہ قریبی تعلقات متاخر اوستا سے تھے جس کی رو سے وہ خطا اور فضل ایزدی کے عقیدے کا قائل تھا۔ ایک نوع کے دیوتا کا جو خدائی اور انسانی دونوں صفات کا حامل تھا، وہ قائل تھا اللہ تعالیٰ کا نور اپنے اشعاع کا عمل جاری رکھتا ہے انسان اسے حاصل کرتا ہے، مگر اس میں اس کی ذاتی مساعی کا دخل نہیں ہوتا۔ آگسٹائن اور سپائی نوزا سے کئی صدیوں بعد قوت کا تصور غائب ہو گیا، ان دونوں کے نزدیک آزادی کا مسئلہ خودی کے حوالے سے نہیں بلکہ عزم سے متعلق ہے۔ ایک کائناتی روح جو انسان میں پھونک دی گئی ہے اور وہ دوسروں سے اس کے روابط کا اہتمام کرتی ہے۔ مجوسی بیدار وجود دو مختلف تعینین خیر و شر کا میدان کارزار ہے جو نور اور ظلمات کے مثل ہیں۔ قدیم فاؤستی مفکرین مثلاً ڈیوٹن سکوٹس اور اوکم کا ولیم، اس کے برعکس متحرک شعور بیدار کے اندر ہی کش مکش دیکھتے ہیں: خودی کی دو قوتوں عزم اور عقل محض کے مابین یہ جنگ جاری رہتی ہے۔ لہٰذا آگسٹائن کا پیدا کردہ سوال اپنی ایسی نوعیت تبدیل کرتا ہے، جسے آگسٹائن خود بھی نہ سمجھ سکتا۔ کیا عزم اور فکر آزاد قوتیں ہیں یا نہیں ہیں؟ ہم اس سوال کا اپنی مرضی سے کوئی بھی جواب دے سکتے ہیں مگر اس میں ایک شے یقینی ہے کہ ہر انفرادی خودی کو یہ جنگ لڑنی پڑتی ہے اور محض اس سے گزرنا نہیں پڑتا۔ مغربی فاؤستی تصور کے مطابق، رحم و کرم ارادے کی کامیابی سمجھا جاتا ہے، اور اسے عنصر قرار نہیں دیا جاتا۔ یہ کلیسائی نظام حکومت (۱۲۱۶ء) میں اعتراف گناہ کی یہی علامت ہے باقی تمام دنیا سے خدا خوش ہوا، جس کا کسی نامعلوم مجلس میں اعلان ہوا وہ اپنی رضا سے رحم و کرم کو وسعت دے سکتا ہے یا محدود کر سکتا ہے۔ تمام مخلوقات پر اس کی قدرت حاوی ہے وہ ان کو کسی خطا پر عذاب دے سکتا ہے اور نیکی کا ثمر عطا کر سکتا ہے۔ اس کے شاندار انصاف کی تعریف کرنا ضروری ہے۔ دوسرا تصور رکنہ لطف و کرم سے محرومی ہر اعزم اور غلبت کا مقدر ہے مگر ماسوائے حقوق العباد سے متعلق خطاکاری کے جہاں یہ سوال بھی اٹھانا گناہ ہے کہ ایسے مجرم کو سزا کیوں دی جائے اس کا اظہار ایک خوبصورت اور زور بیان کی حامل نظم میں کیا گیا ہے۔ اس نظم کی مثال تاریخ عالم میں اور کہیں نہیں ملتی یہ عرب کے زمانہ جہالت کے وسطی دور میں لکھی گئی اسے کتاب ایوب کا نام دیا گیا ہے۔ ایوب کو خود تو احساس نہیں ہوتا مگر اس کے دوست یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی تمام تکالیف کا باعث اس کے گناہ ہیں، وہ ---- ہر ثقافت اور متعلقہ ثقافت میں مروج اصول کی روشنی میں (جن میں زمانہ حال کے قارئین اور نقاد بھی شامل ہیں) عمل کرنے والے لوگ اس مابعد الطبیعیاتی تصور سے محروم ہیں، جو تمام گناہوں کا عذاب اسی دنیا میں ملنے پر یقین سے متعلق ہے۔ صرف داستانوں کا ہیرو ہی حتمی کامرانی تک جنگ جاری رکھتا ہے۔ اسلام میں خیر کی کامرانی مسلمہ ہے۔ اس لیے یہی ایک اسلامی تصور ہے، جو فاؤستی تہذیب کے پہلو بہ پہلو چلتا ہے۔

(۳)

ہر ثقافت کا شعور بیدار داخلیت کے دو پہلوؤں کی طرف رہنمائی کرتا ہے جن کی بنیاد پر احساسات، ادراک کی صورت اختیار کرتے ہیں یا پھر اس کے برعکس ہوتا ہے (یعنی ادراک، احساس کی صورت اختیار کرتا ہے)۔ مجوسی غور و فکر کو سپائی نوزا" خدا کی دانشورانہ محبت " کا نام دیتا ہے (محو)۔ اس کی شدت مجوسی وجد و حال قرار دیتا ہے جسے متعدد بار افلاطینس کی کرم گستری کہا گیا اور اس کے شاگرد پروفیسری پر بھی عالم ضعیفی میں یہ کیفیت ظاہر ہوتی تھی۔ اس کی دوسری صورت، ربیوں کا علم کلام سپائی نوزا میں علم ہندسہ کے طریق پر ظاہر ہوتا ہے اور عرب یہودیوں میں بھی دور آخر میں بطور علم کلام مروج تھا۔ بہرحال دونوں اس امر پر اکتفا کرتے ہیں کہ مجوسی ثقافت میں انفرادی خودی کا کوئی وجود نہیں بلکہ صرف ایک اجتماعی خودی جو ہر ایک میں جاری و ساری ہے اور وہی حق ہے۔ اس پر مزید زور دینا ضروری نہیں کہ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا تصور "اجماع" قوم کے عام تصور سے زیادہ مضبوط ہے اور یہ ایک زندہ تجربہ اور غالب قوت ہے اور مجوسی معاشرے کی بنیاد اسی پر ہے اور اس پر عمل کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی بھی ثقافت میں ایک علیحدہ گروہ کی حیثیت کے حامل ہیں۔ اسلام میں صوفیانہ مسلک اسی مقام سے لاانتہائیت کی جانب روانہ ہوتا ہے وہ قبر کی حالت سے بھی آگے نکل جاتا ہے، قبرستان میں گزشتہ نسلوں کے لوگ محو خواب ہیں اور وہ بھی ہیں جو اسلام سے ماقبل دور میں بھی ہدایت پر تھے ۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان سے متحد ہونے کا پابند ہے۔ وہ دوسروں کی مدد کرتا ہے، لہٰذا دوسرے بھی اس کی طرف اپنی مدد کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں جو ہمیشہ الہیت کے مطابق ہوتی ہے عیسائیوں اور تطبیق عقائد مسلک نے جب "Polis" اور "Civitas" (شہری مملکت، معاشری اجتماع) کے الفاظ استعمال کیے تو ان سے ان کا یہی مطلب تھا۔ یہ الفاظ قبل ازیں اجتماعی معاشرت کے لیے مستعمل تھے اب اجماع کے لیے استعمال ہونے لگے۔ مگر جب آگسٹائن نے یہی اصلاح استعمال کی تو اس کی مراد نہ تو کلاسیکی شہری حکومت تھی اور نہ مغربی کلیسا مگر صرف معتقدین کا اتحاد تھا جس پر خدا اور فرشتوں کی رحمت کا نزول جاری تھا۔ متھرا کے کمیون، اسلام اور مینیشینٹ اور ایران سب اس اعتقاد پر قائم تھے۔ چونکہ معاشرے کی بنیاد اجماع تھی اور یہی اصول اس معاشرے میں ثقافت اور قانون دونوں پر حاوی تھا اور ریاست کی بنیاد بھی یہی تھی۔ اسلامی معاشرے بھی فرفوریئوس اور آگسٹائن کی طرح تمام دنیا کو اپنے حلقے میں شامل کرتا ہے۔ یہاں اور وہاں یا اس سے بھی آگے، اصول پرست اور معصوم فرشتے اور ارواح اور معاشرے اور ریاست میں شامل مسلمان ایک قوم ہے، اور ایک وحدت ہے اور ایک ہی قانون کی تابع ہے۔ مجوسی دنیا میں، اس کے نتیجے میں، مذہب اور سیاست کا ایک دوسرے سے آزاد ہونا، ناممکن اور خلاف عقل حرکت ہے۔ جبکہ مغربی فاؤستی ثقافت میں کلیسا اور حکومت کا مجادلہ ہر جگہ جاری ہے اور اس کے خمیر میں شامل ہے اور ایسا منطقی نتیجہ ہے جس کا کوئی انجام ممکن نہیں۔ مجوسی مذاہب میں دیوانی اور کلیسائی قوانین یکساں ہیں۔ قسطنطنیہ میں بادشاہ کے ساتھ ساتھ پوپ بھی موجود تھا۔ بادشاہ اور زرتشتی مذہب کا پجاری باہم گزارہ کر سکتے تھے۔ ایکسی لارج کے ساتھ، گاؤن، خلیفہ کے ساتھ شیخ الاسلام، بیک وقت حکومت میں باہمی ایک دوسرے کے ممد ہوتے تھے لیکن روم میں بادشاہ اور پوپ کے آپس میں تعلقات کی یہ نوعیت نہ

تھی۔ اسی طرح کلاسیکی دنیا میں بھی یہ تصورات بالکل اجنبی تھی۔ دائیو قلیطس کے آئین میں ریاست کا جوسی تصور کہ ریاست کی بنیاد مذہب پر ہو، پہلی دفعہ حقیقت کی شکل حاصل کر سکا اور کانسٹائن نے اسے عملی شکل دی۔ یعنی اجماع کی صورت نے زندہ انسانوں میں مقام پایا۔ مجوسی معاشرہ جسے اختیارات خدا کی طرف سے ودیعت کیے گئے۔ اس لیے اس کے لیے ایک بدیہی امر تھا کہ ہر معاملے کے طے کرنے کے لیے مجالس شوریٰ قائم کرے۔

(۴)

مگر اجماع کے علاوہ بھی حق و صداقت کے اظہار کا ایک اور طریق بھی ہے یعنی "کلام الٰہی"۔ یہ اصطلاح مجوسی تصور کی پوری پوری ترجمانی کرتی ہے۔ یہ تصور کلاسیکی اور مغربی تصورات سے بہت بعید ہے اور نتائج کے لحاظ سے متعدد غلط فہمیوں کا باعث ہے۔ کتاب مقدس جس کی رو سے یہ بدیہی امر کی حیثیت مقدس احکامات شامل ہیں ہر مجوسی مذہب کے ذخیرہ کا حصہ ہے۔ اس مثیلہ کے تحت تین مجوسی تصور باہم مربوط ہیں۔ ان میں سے ہر ایک ہمارے (مغربی) ادراک کے لیے مشکلات کا باعث ہے اور پھر ان تینوں کا اتحاد اور انتشار ہماری سمجھ میں آنا مزید مشکلات پیدا کر سکتا ہے اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس اشکال کی بدولت ہماری (مغربی) فکر اس کے برعکس تصورات پیدا کر لیتی ہے۔ یہ تصورات یہ ہیں "خدا" روح القدس اور کلام"۔ جان کی انجیل کی تمہید میں تحریر ہے کہ "آغاز میں کلام تھا اور کلام خدا کے پاس تھا اور کلام خود ہی خدا تھا۔" مگر اس سے بہت پہلے ایران میں سپنیٹا مینیو اور یوہو مانو کا تصور موجود تھا جو یہودیوں اور کلدانیوں کے ہم آہنگ ہے۔ یہی وہ مزاج تھا جس کے لیے چوتھی اور پانچویں صدی میں معرکہ آرائی ہوئی مگر مجوسی مذاہب کے لیے حق (صداقت) فی نفسہ ایک عنصر ہے اور باطل اس کے بعد دوسرا عنصر ہے اور حق کا لفظ خدا کے لیے بھی مروج ہے۔ اسی روشنی میں ہم مسیح نے اس بیان کو سمجھ سکتے ہیں "میں حق ہوں اور حیات بھی" میرا کلام برحق ہے اور اسی سے ہم یہ ادراک کر سکتے ہیں، کہ اس ثقافت نے کتب مقدس کو کس نظر سے دیکھا اس مرئی وجود میں صداقت شامل ہو گئی تھی۔ جان کے الفاظ میں (۱۔۱۴) کلام نے گوشت پوست حاصل کیا اور ہم میں شامل ہو گیا یاسنا کے مطابق اوستا افلاک سے نازل ہوئی اور تالمود کے بیان کے مطابق حضرت موسیٰؑ پر تورات جلد بہ جلد نازل ہوئی۔ مجوسی طریق کار ایک صوفیانہ طریق کار ہے جس میں خدا کا کلام یا خدا کے الفاظ ایک شخص کے منہ سے نکلتے ہیں۔ وہ انسان کے اندر اس لیے داخل کیے جاتے ہیں تاکہ ان کو آوازوں اور حروف میں منتقل کیا جا سکے " قرآن کے لفظی معانی پڑھنے کے ہیں۔ حضرت محمدؐ نے قرآن کے لپٹے ہوئے اوراق بہشت میں دیکھے تھے (حالانکہ وہ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے) اور انھوں نے اسی وقت تمام مطالب کو سمجھ لیا۔ انھیں کہا کہ خدا کے نام سے پڑھو یہ ایک کشف کی صورت (وحی) ہے جو مجوسی ثقافت میں بلا استثنا موجود ہے بلکہ سائرس کے دور ہی سے اس نے یہ صورت اختیار کرنا شروع کی قدیم انبیائے بنی اسرائیل اور بلاشک و شبہ زرتشت بھی حالت کشف میں ایسی آواز سنتے ہیں، جس کی بعد ازاں وہ تبلیغ کرتے ہیں۔ رومن کیتھولک مسلک کو دیے جانے والے صحیفے (۶۲۱) کسی مندر میں پڑے

ملے تھے جن کا مقصد یہ تھا کہ انھیں باپ کی دانائی کے طور پر قبول کر لیا جائے ایک اور اہم مثال جس کا ذکر سورۃ بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰؑ کو تورات کی الواح کے دینے کا ذکر ہے۔ بتدریج یہ عقیدہ یہ صورت اختیار کر گیا کہ الہامی کتب کے لیے نزول کا عمل ضروری قرار دیا گیا۔ یہ اخراج کے بعد کا واقعہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو کوہ سینا پر الواح قانون عطا کی گئیں ۔ بعد ازاں تمام تورات کے لیے اسی عمل کا سہارا لیا گیا اور مکابعین کے دور میں تمام عہد نامہ کے لیے یہی شان نزول مقرر کر لی گئی۔ مجلس جاہنا (تقریباً ۹۰ ق م) تمام کلام الٰہی بذریعہ وحی نزول تسلیم کر لیا گیا جس طرح کہ کوئی شے واقعی آسمان سے نیچے گری ہو (یعنی لفظی مفہوم کے مطابق)، مگر اوستا کے متعلق اس مفہوم کی سائنسی بنیاد قائم رکھی گئی مگر مادی نزول کا تصور دوسری صدی ق م میں رائج ہوا۔ اس سے سو سال قبل تک اسے تمثیلی معانی ہی میں لیا جاتا تھا مگر بعد ازاں آسمانی کتب کا طبیعی نزول تسلیم کر لیا گیا۔ کلدانی، غناسطی اور مانداِئی، تحریروں کو بھی مکشوفات میں شامل کر لیا گیا ۔ نوفیثا غورسی اور نوفلاطینیوں نے بھی اپنے آقاؤں کی تحریروں کو الہامی قرار دے لیا۔ "قانون" کے ایک اصطلاحی معانی یہ بھی ہیں کہ ان سماوی کتب کے لیے اسے استعمال کیا جائے تاکہ ہر مذہب کو منزل من اللہ ہونے کا درجہ مل سکے۔ یہ اس مفہوم میں قانونی تسلیم کی گئیں کہ کلیسائی مجموعے اور کلدانی معجزات ۲۰۰ کے قریب وجود میں آئے۔ آخر الذکر ایک مقدس کتاب ہے، جسے نوفلاطینی تسلیم کرتے ہیں، جسے پروکلوس نے جو بابائے کلیسا تھا افلاطون طیماؤس کے برابر تسلیم کر لیا۔

آغاز میں عیسائیت اور خود حضرت عیسیٰؑ نے یہودی قانون کو تسلیم کر لیا۔ پہلی انجیل میں ایسا کوئی دعویٰ موجود نہیں کہ انجیل کو مادی حیثیت میں ظاہر کیا گیا۔ صرف جان کی انجیل میں یہ دعویٰ موجود ہے کہ یہ خدا کی طرف سے نازل کردہ کلام ہے۔ اس کا نامعلوم مصنف اور اس تصور کا بانی اس خیال کا حامی تھا کہ عیسائیوں کے پاس بھی قرآن کی طرح کی کوئی کتاب ہو۔ یہ ایک سنجیدہ اور مشکل فیصلہ تھا کہ کیا نئے مذہب کو اس مذہب سے (یہودیت سے) الگ ہو جانا چاہیے، جس پر خود حضرت مسیح کا اعتقاد تھا اور کیا یہودی کتب سماوی کی پیروی اسی طرح کی جائے ، جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ خود کرتے رہے تھے اور کیا انھیں اب بھی کتب برحق سمجھا جائے۔ جان کی انجیل میں اس کا جواب خاموشی سے دیا گیا اور مرشیئن نے کھل کر کہا کہ "نہیں" مگر پادریوں کے طبقے نے غیر منطقی طور پر کہا کہ "ہاں"۔

ان مابعد الطبیعیاتی تصورات کے نتیجے میں ایسے محاورات وجود میں آئے مثلاً" خدا فرماتا ہے" اور "آسمانی کتب میں مذکور ہے" جو حقیقت کے لحاظ سے عیسائی تصورات کے بالکل برعکس تھے اور یکسانیت کا شکار تھے ہمارے لیے تو یہ الف لیلیٰ کے قصوں سے کم نہیں کہ خدا کی ذات کو اس طرح کے طلسمات میں پابند کیا جائے۔ اس موضوع پر جس قدر کم گفتگو کی جائے ان تصورات کے اثرات کے لیے اتنا ہی مفید ہوگا۔ ان کتب کی تفاسیر، تخلیقی تحریک کے فیضان سے کم نہیں اور ان کا زبان پر آنا ایک صوفیانہ پراسرار تجربہ ہے (مارک ۱۔۳۲)۔ لہٰذا ان کی تقدیس کا عقیدہ متضاد اور کلاسیکی احساس کے برعکس ہے جس کے زیر اثر ان قیمتی دستاویزات کو تحفظ فراہم کیا گیا۔ ان کی آرائش کا سامان نوخیز مجوسی ثقافت میں پہلے سے موجود تھا۔

بار بار نئے مسودات وجود میں آئے' جو ان کے زیر استعمال لانے والوں کی نگاہ میں اتنی قوت کے مالک تھے کہ گویا حق ان پر نازل کیا گیا ہے۔

مگر قرآن کے متعلق یہ تصور غیر مشروط طور پر درست ہے اس لیے اس کے متن میں نہ کوئی تبدیلی لائی جا سکتی ہے اور نہ اصلاح کی جا سکتی ہے ۔ البتہ یہ ہوتا رہا ہے کہ آیات کے باطنی معانی تلاش کر کے بعض فرقوں میں اپنے خیالات کو مروج کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نوعیت کا شاہکار جسٹانین کی تلخیص ہے' جو عہد نامہ قدیم کی ہر کتاب کے متعلق کہی جا سکتی ہے اور بلاشک و شبہ گاتھا' اوستا اور افلاطون کے مروج مسودات پر بھی اس کا اطلاق کیا جا سکتا ہے نیز ارسطو اور دیگر ملحدانہ مذاہب کے مسودات بھی اس کے دائرہ کار میں شامل ہیں۔ ان خصوصیات کے علاوہ تمام مجوسی مذاہب میں خفیہ معانی' خفیہ نزول یا باطنی مفہوم کے تصورات موجود ہیں۔ ایسے مطالب نہ صرف معرض تحریر میں آئے بلکہ بعض گروہوں میں زبانی بیان کے مطابق نسلاً بعد نسل منتقل ہوتے رہے۔ یہودیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت موسیٰؑ کو نہ صرف الواح عطا کی گئیں بلکہ بعض زبانی خفیہ احکام تورات بھی مرحمت ہوئے اور ان کے متعلق یہ حکم تھا کہ انہیں معرض تحریر میں نہ لایا جائے۔ تالمود میں تحریر ہے کہ خدا نے اسے قبل از وقت دیکھ لیا تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ تورات کفار کے ہاتھ میں آ جائے گی اور وہ بنی اسرائیل سے کہیں گے کہ ہم بھی خدا کی اولاد ہیں۔ اس وقت خدا کا جواب یہ ہوگا کہ صرف وہی لوگ جو میری اولاد کے علم میں لائے گئے خفیہ معانی کا علم رکھتا ہے اور یہ خدا کے اسرار ہیں یعنی زبانی فرمودات اور اس کے بعد تالمود میں بہت کم مقدار میں مذہبی ادب شامل کرتا ہے اور وہ بھی ایسی صورت میں جیسا کہ عیسائیوں کے پاس بھی اپنے ابتدائی عہد میں موجود تھا۔ مرقس نے عذاب اور حیات ثانی کا ذکر صرف اشارات میں کیا گیا ہے اور جان فار قلیط کا ذکر تفصیل سے کرتا ہے اور عشائے ربانی کا واقعہ مکمل طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔ حواری ان رموز کو بخوبی سمجھتے تھے مگر کفار سے انھیں خفیہ رکھنا ضروری تھا۔ اس کے بعد ایک خفیہ مجلس منعقد ہوئی جس میں عیسائیوں سے کہا گیا کہ اسے خفیہ رکھیں اور کفار کے سامنے اصطباغ' استغفار' اعتراف اور دیگر امور کے متعلق گفتگو نہ کریں۔ ان میں کلدانی' تو فیثا غورثی' کلبی' یہودی اور زمانہ مابعد میں مسلمان بھی شامل تھے۔ اس رجحان کو اس قدر فروغ حاصل ہوا کہ ان کے خفیہ اصولوں کا بیشتر حصہ خود عیسائیوں کے علم میں بھی نہیں۔ جب سے خاموشی پر اجماع ہوا یہ الفاظ صرف اذہان ہی میں رازہائے سربستہ کی صورت میں رہ گئے۔ اس کے باوجود ہر عیسائی یہ سمجھتا ہے کہ دوسرا انھیں جانتا ہے ۔ ہم خود بھی متعدد اہم معاملات میں بڑی احتیاط کے باوجود غلط تعبیر کا شکار ہو جاتے ہیں اور مجوسی مسودات کے اصولوں کو پوری طرح سے نہیں سمجھتے اور حقیقی مطالب سے لاعلم رہتے ہیں ۔ رومی عیسائیت میں کوئی رازداری نہ تھی اس لیے انھوں نے تالمود پر کبھی اعتبار نہیں کیا جس کے متعلق وہ سمجھتے تھے کہ یہ صرف یہودیوں کے مذہب کا پیش منظر ہے۔

مجوسی مذاہب میں بھی قبالہ کے نام سے جو اعداد' حروف' اشکال ' نقاط اور جنبش کے دائرہ کار سے باہر بعض رازہائے سربستہ کو واشگاف کرتا ہے اس لحاظ سے وہ بھی اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ کلام اور جزو کلام ہی

کی حیثیت سے موجود ہے۔ یہ خفیہ عقیدہ کہ کائنات کو عبرانی کے بائیس حروف تہجی کی مدد سے تخلیق کیا گیا اور اس میں اذکائیل کے رتھ پر قائم تخت کا تصور بھی استعمال کیا گیا۔ یہ روایت مکابئین کے دور میں بھی قائم تھی۔ مقدس الہامی کتب میں مذکور داستانیں بھی اسی کے قریب قریب ہیں' مشنا میں مذکور تمام روایات' پادریوں کے بیان کردہ افسانے' اسکندر کے عہد کے تمام فلسفیوں کے نظریات اور کلاسیکی اساطیر بلکہ افلاطون کا بھی' تجزیہ کیا جانا ضروری ہے۔ حضرت موسیٰؑ (مشائی اوس) کا اور ان کے جانشین انبیائے بنی اسرائیل نے بھی تخلیق عالم کے متعلق روایات بیان کی ہیں۔

کتب سماوی میں سے صرف قرآن حکیم ہی ایسا مواد فراہم کرتا ہے جسے سائنسی اصولوں کے تحت جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے کیونکہ کلام کے مسلمہ کو نہ تو تبدیل کیا جا سکتا ہے نہ اس کی اصلاح کی جا سکتی ہے۔ اس کی تفسیر دوبارہ کی جا سکتی ہے۔ اسکندریہ میں یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ افلاطون غلطی پر تھا بلکہ اس سے ہدایت حاصل کی جاتی اور یہ عمل ہلاخہ کلی کی ہیئت کے بموجب کیا جاتا اور ان ضروریات کی تکمیل کے لیے تحریری ہدایات تشریح کی صورت میں مرتب کی جاتیں۔ یہ تفاسیر اس ثقافت کے تمام مذاہب کے فلسفیانہ فکر اور دانش مندانہ ادب میں بڑے احترام سے دیکھی جاتی ہیں۔ عناسطی مذہب کے طریق کار کے مطابق عیسائی پادریوں نے بھی بائبل کی تفسیریں لکھنی شروع کر دیں بالکل اسی طرح ایران میں زند کی تفسیر بھی لکھی گئی جو اوستا کے ساتھ ساتھ جاری رہی اور مدراش' یہودی قانون کی تشریح کے لیے لکھی گئی مگر رومی منصفوں نے تقریباً ۲۰۰ عیسوی اور متاخر کلاسیکی فلسفیوں نے ----- یہ لوگ مسکی گرجوں کے مدرسین تھے ----- نے بھی یہی راستہ اختیار کیا ۔ اس کلیسا کی مکشوفات کی پوسی ڈونی اس کی تقلید با تکرار شرحیں لکھی گئیں۔ یہ مجموعہ افلاطون کی طیماؤس کی شرح تھا مشنا' تورات کی بہت بڑی شرح ہے اور جب قدیم تفسیریں وقت گزرنے کے ساتھ مستند تسلیم کر لی گئیں تو قرآن کی تفاسیر کی تفاسیر لکھی جانے لگیں۔ مغرب میں یہی عمل آخری فلا فینس' سمپلی شی اس کی تحریروں پر اموریم نے کیا جس نے مشرق مشنا پر جمارا کا اضافہ کیا اور باز نطینیوں کی حکومت میں منصفین نے شاہی دستور کی تشریح کی۔

یہ طریق کار اگرچہ اپنی روایات کا فرضی سلسلہ بہت دور تک قائم کر لیتا ہے مگر اس کی انتہا تالمودی روایات میں ہو گئی۔ اسلامی ادب میں بھی روایات کا طویل سلسلہ موجود ہے۔ حدیث کی صورت میں یہ پابندی ہے کہ سلسلہ غیر منقطع نہ ہو اور اس سلسلے کی کوئی بھی کڑی ضعیف (ناقابل اعتبار) نہ ہو اور یہ سلسلہ مصدقہ طور پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہو۔ یروشلم میں روایات کے لیے میزان مقرر کی گئی تھی کہ متعلقہ روایت کو ثقہ استاد کے حوالے کر دیا جائے' وہ دیکھے گا کہ اس کے استاد نے کبھی اس کی تصدیق کی ہے۔ زند میں تو ہر روایت کے ساتھ راویان کے سلسلے کو بیان کرنا قانون کی حیثیت رکھتا ہے اور آئی رینا آئیوس' اپنی دینیات کے استناد میں روایت کے سلسلے کا ہی سہارا لیتا ہے' کہ ہر روایت کا سلسلہ پولی کارپ کے واسطے سے قدیم دور تک پہنچے۔ قدیم عیسائی ادب میں بدیہی حیثیت حلاخہ کی صورت اختیار کر گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر بیان صحت پر مبنی ہو یعنی وہ اصل فرمان کے مطابق ہو۔ اس امر کے قطع نظر کہ

قانون اور پیغمبر کے متعلق با تکرار حوالہ جات کے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چاروں اناجیل (مرقس کے مطابق) جن میں سے ہر ایک مستند سمجھی جاتی ہے اس میں خدا کا کلام موجود ہے جو پیش کیا گیا ہے ۔ اس طرح روایات کا ایک سلسلہ پیدا ہوا جو حضرت عیسیٰؑ تک پہنچ گیا۔ اس میں کسی مبالغے کی گنجائش نہیں۔ آگسٹائن یا جیروم کے کسی پیرو نے ان کا تصور عالم ہی روایت کیا ہو یہ ایک ایسے عمل کی بنیاد ہے' جس کی وجہ سے اسکندر کے دور سے لے کر یہ رواج ہو گیا کہ مذہبی اور فلسفیانہ روایات کو تحریری صورت میں بھی راویان کے اسما کے ساتھ پیش کیا جائے مثلاً" ایوخ (ادریس) سلیمان' عذرا' ہرمس' فیثا غورث کی وجہ سے روحانی دانش میں اضافہ ہوا اور کلام کو قدامت عطا ہوئی ہمارے پاس ابھی تک بعض ایسے تصورات موجود ہیں جن کی بارورچ سے نسبت ہے' جس کا بعد میں زرتشت سے موازنہ کیا گیا۔ ہم اس کے متعلق یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ارسطو اور فیثا غورث سے منسوب تحریریں کس کی تخلیق ہیں۔ نوفلاطونی ادب میں ارسطو کی دینیات نے گہرے تاثرات مرتب کیے۔ بالآخر حوالہ جات کے باطنی معانی کا اسلوب مذہبی رہنماؤں' پادریوں' ربائیوں' یونانی فلسفیوں اور رومی فلاسفہ نے اور بالآخر ویلنٹائن سوم کے قوانین میں مروج کر دیا گیا اور بالآخر یہودی اور عیسائی قوانین سے اس عمل کو خارج کر دیا گیا۔ یہ ایک بنیادی تصور تھا' جس کی رو سے تحریری سرمائے کو اس میں بنیادی اختلافات کی وجہ سے الہامی روایاتی ذخیرے سے خارج کر دیا گیا۔

(۵)

اس نوعیت کی تحقیقات کی بنیاد پر اس امر کا امکان ہے کہ مجوسی مذاہب کی تاریخ لکھی جا سکے۔ ان مذاہب میں ایسی مشترکہ روح اور ارتقا موجود ہے' جسے علیحدہ علیحدہ نہیں کیا جاسکتا اور کسی کو بھی یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ ان میں سے کسی مذہب کو بھی دوسروں کو نظرانداز کر کے سمجھا جا سکتا ہے۔ ان کی ولادت کا دورانیہ ۰۔۔۔۵۰۰ ق م ہے۔ یہ مدت مغربی مذہبی کلیونی تحریک پر منطبق ہوتی ہے جسے تحریک اصلاح بھی کہا جاتا ہے۔ ایک باہمی "کچھ لو اور کچھ دو" کا اصول جو انتہائی کامیابی سے ہمکنار ہوا اور جس میں عمل تغیر' ملمع بازی' نقل مکانی' اخذ و قبول' رد و قدح کے عمل کے تحت صدیاں گزر گئیں' مگر کسی نظام نے دوسرے نظام پر غلبہ پانے کی کوشش نہیں کی۔ صرف تشکیل اور ہیئت میں تبدیلی آتی رہی مگر ان مذاہب کی ۃ میں روحانیت کی ایک ہی صورت رواں دواں رہی۔ مگر مذاہب کی اس دنیا میں ہمیشہ یہی روحانیت اپنا اظہار کرتی رہی۔

بابل کی وسیع دنیائے فلاحین میں انسان کی ابتدائی نسلیں آباد تھیں۔ ہر شے کا آغاز ہو رہا تھا۔ مستقبل کی اولیں اور پیشگی تیاریاں ۷۰۰ ق م میں شروع ہوئیں۔ ان کی تین مختلف صورتیں تھیں۔ فارسی' یہودی اور کلدانی۔ ---- تکوین کا تصور جو ان تمام مذاہب میں یکساں ہے اس کا خاکہ تورات میں موجود ہے اور اس کے ساتھ ہی سمت بندی' رخ اور مقصد آرزو کا تعین ہو گیا۔ مستقبل بعید کے متعلق تصور کا تصفیہ ہو گیا۔ اگرچہ ابھی تک غیر معینہ اور دھندلا سا ہی تھا مگر یہ یقین لازماً موجود تھا کہ ایسا ہونا ناگزیر ہے۔ یہی وہ

نقطہ آغاز ہے جس سے انسان کے تصور میں مقصد کا احساس پیدا ہوا۔

۳۰۰ ق م کے بعد مکشوفات کی ایک نئی اور مضبوط لہر بلند ہوئی۔ اس میں مجوسی شعور بیدار کار فرما تھا۔ جس نے مابعد الطبیعیاتی تصورات کو مستقبل کی طے شدہ ثقافت اور عمق عالم کے نظریے کے تحت تشکیل دیا۔ دنیا کے اختتام کے ہولناک تصور' روز حشر (یوم مکافات)' حیات ثانی' بہشت اور دوزخ اور ان کے ساتھ ہی نجات کا اصول جس میں کرہ ارض اور انسان کے مستقبل کے امور ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ تصورات کس ملک یا قوم نے تخلیق کیے تھے مگر ان کو عجیب و غریب اشکال' پیکران اور ناموں کے ساتھ مزین کر دیا گیا تھا۔ مسیح کا پیکر پہلی جنبش ہی میں مکمل نظر آنے لگتا ہے۔ شیطان کی خواہش نجات ایک داستان کی صورت میں بیان کی گئی ہے(۴۱) مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک گہرا اور روز افزوں خوف اپنی ناگزیر حقیقت کے ساتھ حاوی رہا جو سر پر کھڑا ہے ---- تمام معاملات کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور ہر شے ماضی کا حصہ بن جائے گی۔ مجوسی زمان نے لمحات کو عمق عالم میں نئی ہیئت عطا کی' حیات کو نئی نبض فراہم کی' اور کلمہ "قضاو قدر" فراہم کیا۔ انسان کا خدا کے ساتھ رویہ اچانک بدل گیا۔ پالمیرا کی باسلیق میں جو تحریر موجود ہے اس کے مطابق (جسے طویل عرصے تک عیسائی یادگار سمجھا جاتا رہا) بعل خیر کا مجسم قرار پایا جو سراپا رحم اور شفقت تھا اور اسی احساس کے تحت رحمٰن کی عبادت مروج ہوئی جو جنوبی عرب کا ایک تصور تھا۔ یہ کلدانیوں کے حمدیہ نغموں میں نمایاں ہے' اور ان کی وساطت سے یہ زرتشت کے الہامی مذہب میں بھی سرایت کر گیا اور اس کی تعلیمات میں شامل ہو گیا اور دور مکابئین میں یہ تصور یہودیت میں قبول کر لیا گیا۔ متعدد حمدیہ نظمیں اسی دور میں تحریر ہوئیں ---- اور یہ تصور ان تمام معاشروں میں بھی مروج ہو گیا جنھیں مدت سے تاریخ فراموش کر چکی ہے' مگر وہ کلاسیکی اور ہندوستانی دنیاؤں میں موجود تھیں۔

تیسرا خروج اس وقت عمل میں آیا' جب سیزر حکمران تھا' اور مذہب نجات کا آغاز ہوا اور اسی کے ساتھ ثقافت نے عروج حاصل کیا اور اس کے ساتھ ایک یا دو صدیوں میں مذہبی تجربے کا تسلسل قائم رہا۔ اس کی قبل ازیں کوئی مثال نہیں ملتی اور کوئی اور تجربہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا ۔ اسی کشمکش میں رومی اور ویدوں کی ثقافت کا خاتمہ ہو گیا اور ہر ثقافت اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ اس پر ایک نہ ایک دور ایسا آتا ہے جب اس کے شباب کا آغاز ہوتا ہے۔

ایران میں مندائین' یہودیوں' عیسائیوں کے حلقہ ہائے اعتقاد کا رواج ہوا۔ اس کے ساتھ ہی' مغرب میں قلب ماہیت کے عمل کا آغاز ہوا اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان بھی اسی نوع کے تجربے سے متاثر ہوا۔ یہ دور کلاسیکی اور مغربی (نیز ہندوستانی) جرات آزمائی کی داستانوں کا ہے۔ بڑی بڑی اساطیر وجود میں آئیں' اس میں عرب ثقافت' مذہب اور قومی جرات آزمائی زیادہ نمایاں نہیں رہیں کیونکہ اس عہد کے عرب میں قوم کلیسا اور حکومت یا مقدس اور دنیاوی قانون الگ الگ خانوں میں بانٹے جا سکتے تھے۔ انبیا کوشہ زوروں اور جنگ آزماؤں میں شامل کر لیا گیا اور مظلوم ترین انسانی کہانیوں نے رزمیہ کی صورت اختیار کر لی نور و ظلمات

کی داستانیں' عظیم شخصیات کی کہانیاں' فرشتوں اور شیاطین کی جنگ' نیک ارواح کے مابین جدال کا سلسلہ جاری رہا اور یہ دنیا ان قوتوں کے لیے ایک میدان جنگ کی صورت ہے اور یہ معرکہ آرائی عالم کی تباہی تک جاری رہے گی۔ سطح زمین پر جو بنی نوع انسان کی دنیا ہے' اس میں بھی مذہب کے نقیب' ہیروں اور شہیدوں نے بھی اپنا اپنا کردار ادا کیا اور صعوبتیں برداشت کیں' اس ثقافت کہ ہر مذہب کے پاس اپنے اپنے رزمیے موجود ہیں۔ مشرق میں ایرانی نبی سے متعلق عظیم رزمیہ شاعری موجود ہے۔ اس کی ولادت پر زرتشت کا قہقہہ افلاک میں بلند ہوا' اور تمام فطرت میں اس کی صدائے بازگشت سنائی دی گئی۔ مغرب میں حضرت عیسیٰؑ کی داستان مظلوی امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ وسعت حاصل کرتی رہی ہے۔ عیسائی دنیا کا سب سے بڑا رزمیہ یہی داستان ہے۔ اس کے علاوہ اس کے بچپن کی کہانیاں' جنھوں نے تمام عیسائی شاعری میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ خدا کی ماں کا پیکر اور اس کے حواریوں کے کارنامے ایسی صورت اختیار کر گئے کہ گویا وہ بھی صلیبی جنگوں کے ہیرو ہیں اور ان کی داستانیں رومانی وسعت کی حامل ہیں (تامس کے اعمال۔ فرضی رحم دلی) جو دوسری صدی میں نیل سے فرات تک ہر جگہ دوہرائی جانے لگی۔ یہودی حقدہ اور طرغوم میں' ساول' داؤد' سرگروہان قبائل اور طنائم' مثلاً" شہودہ اور مکبہ'یہ اور اس دور کی نہ بجھنے والی پیاس کے اثرات ان اساطیر پر بھی پڑے جن کا حقیقی تعلق متاخر کلاسیکی مسلک سے تھا اور ان مسالک کے بانیان (فیثا غورث' ہرمیس اور اپالونی اس' طیانوی) کی سوانح بھی منظوم کی گئیں۔

دوسری صدی کے خاتمے کے ساتھ ہی اس کی تعریف و توصیف کی آوازیں خاموش ہونے لگیں۔ رزمیہ داستانوں کی بہار قصہ ماضی بن گئی اور اس کی جگہ صوفیانہ اور مذہبی شاعری نے لے لی۔ نئے کلیساؤں کے عقائد' دینیاتی نظام کا حصہ بن گئے۔ جرات آزمائی کی داستانوں کی جگہ مذہبی شاعری نے لے لی۔ مشاہد اور طلب پجاری کا سرمایہ قرار پایا۔ قدیم مذہبی جوش و خروش جو ۲۰۰ء میں ختم ہو گیا۔ (جیسا کہ مغربی تقریباً ۱۲۰۰ میں اختتام کو پہنچا) اسی میں تمام غناسطی ادب اپنے وسیع تر معانی کے ساتھ شامل تھا' جان کی انجیل کے مصنف' ویلنٹنوس' بارڈیے سیتر اور مارشین' اپالوجسٹس اور ابتدائی عہد کے پادری' آئی ریناؤس اور ٹرٹولیئین تک اور آخری طنائم ربی یہودہ' تمام کی تمام مشنا' نوفیثا غورثی اور رہبانیت کا مرکز اسکندریہ' یہ تمام کے تمام اس جوش و خروش کے حامی تھے' جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ یہ تمام واقعات اس عہد میں رونما ہوئے' جبکہ مغرب میں مدرسہ منشورات' انسلم' جوچم فلوری' شرواکس کا برنارڈ' ہیوگوڈی سینٹ وکٹر محو عمل تھے۔ نیوفلاطونی نظام کے ساتھ ہی پوری مذہبی تنظیم کا عمل شروع ہوا جسے کلیمنٹ اور کریجن نے شروع کیا جو پہلا اموراتم اور جدید اوستا کا خالق تھا۔ یہ اردشیر (۲۲۶۔۲۴۱) کے زمانے میں ہو گزرا اور شاپور اول اور مزدکی مسلک کا سب سے بڑا پجاری تنواسر انتہائی سرگرم رہے۔ اسی دور میں بیک وقت اعلیٰ مذہبیت کا جوش و خروش پیدا ہوا جس کی رو دیہاتی زرعی معاشرے کی تقدیس کو خود ساختہ کشوفات کے حوالے سے علیحدہ کر دیا گیا جو ابھی تک روحانی زندگی کا تابع فرمان تھا۔ اس معاشرے کے لیے کئی نام مقرر تھے ترکی عہد میں انھیں فلاحین کہا جاتا تھا۔ جبکہ شہروں کے اعلیٰ طبقات کے باشندے جن میں اہل فارس' یہودی اور عیسائی شامل تھے۔ حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

آہستہ آہستہ بڑے بڑے کلیسا اپنی کامرانیوں کی طرف رسائی حاصل کرنے لگے۔ یہ فیصلہ کیا گیا جو دوسری صدی کا سب سے اہم مذہبی تتمہ تھا ——— یعنی عیسائیت کو یہودیت سے مناقشہ پیدا کرنا نہیں چاہیے بلکہ ایک جدید کلیسا جو مغرب کی سمت اپنا رجوع کر رہا تھا رک جائے اور یہودیت اپنی داخلی قوت کو نقصان پہنچائے بغیر مشرق کی طرف رخ کر جائے۔ تمام تیسری صدی دینیات کی ذہنی تخلیق میں گزر گئی۔ ایک طریق عمل کی صورت جسے حاصل کر لیا گیا اور اس طرح دنیا کا خاتمہ ٹل گیا اور جدید عقائد کی روشنی میں تصور عالم کی جدید وضاحتیں کی گئیں۔ اب جبکہ رہنمائی کا عمل بالغ نظر لوگوں کے ہاتھوں میں آ گیا تو ان لوگوں نے اندازہ کر لیا کہ نظام مدرسی کے عقائد کتنی مدت تک چل سکیں گے اور اس جدید نظام کو قائم کرنے میں کتنا وقت صرف ہو گا۔

ان کی کوششوں کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آرامیوں کی مادر وطن کا تین سمتوں میں ارتقا ہوا۔ مشرق میں' زرتشتی مذہب اور ہنجامنشی دور میں اور ان کے مقدس مذہبی ادب میں جس کے نتیجے میں وہاں ایک مزدکی کلیسا وجود میں آ گیا جس میں مذہبی پیشواؤں کی ایک متشددانہ حکومت اور مشقت طلب رواجات' جن میں قربانی اور اعتراف (پاتیت) شامل تھے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ تنواسر نے جدید اوستا کی ترتیب کا حکم دیا اور مواد کو جمع کرنے کے کام کا آغاز کیا۔ شاپور اول کے دور میں (جیسا کہ تالمود کے متعلق ہو رہا تھا) طب' قانون اور علم النجوم کے متعلق مواد کا اضافہ کیا گیا۔ اسی کام کی تکمیل شاپور دوم کے عہد میں مہراسفند کے ہاتھوں انجام پائی (۳۰۹۔۳۷۹) ۔ مجوسی ثقافت کے دور میں یہی توقع کی جا سکتی تھی کہ اس کا پہلوی میں ترجمہ ہو سکے گا۔ جدید اوستا' یہودیوں اور عیسائیوں کی بائبل کی طرح' مختلف تحریروں پر مشتمل ایک مجموعہ قانون تھا۔ اگر ہم اصل تحریروں کے حوالے سے اس کا مشاہدہ کریں (جن کی تعداد ابتدا میں اکیس تھی) جواب ضائع ہو چکی ہیں' اصل میں یہی تحریریں زرتشت کی آسمانی کتاب تھی۔ وشتاشپ جو ایک غناسطی تھا' ایک داستان بیان کرتا ہے کہ یہ کتاب ابتدا میں ایک قانونی کتاب تھی اور اس میں شاہان فارس کے نسب نامے بھی شامل تھے' ضائع ہو گئی۔ جبکہ لی ونی کس جو فارسی زبان میں تحریر تھی' نمایاں طور پر مکمل محفوظ رہی۔

۲۴۲ء میں ایک اور بانی مذہب منظر پر آیا' یہ مانی تھا۔ اس نے غیر منجی یہودیت اور کلاسیکیت کی تردید کی اور اس نے تمام مجوسی مذاہب کو منضبط صورت میں جمع کر لیا۔ اس زمانے میں یہ مضبوط ترین مذہبی نظام تھا بلکہ تمام عالم میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ۲۷۶ء میں اس کو مزدکی پجاریوں نے قتل کرا دیا۔ اپنے باپ کی صلاحیتوں سے آراستہ (جس نے اپنی آخری عمر میں خاندان کو چھوڑ کر ایک مندائی تنظیم میں شامل ہو گیا تھا) اسے اپنے عہد کے تمام علوم پر دسترس حاصل تھی۔ اس نے کلدانیوں' اہل فارس' یوحنائیوں اور ایرانی عیسائیوں کے تصورات کو باہم جمع کر لیا۔ یہ ایک ایسا کام تھا' جس کے لیے پہلے بھی مساعی کی گئی تھیں اور اس میں عیسائی اہل فارس' اور بردے سانیسی غناسطی شامل تھے مگر انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ ایک نیا کلیسا کس

طرح قائم کیا جائے اس نے جوہانائن کی شخصیت میں ایک صوفیانہ پیکر تیار کیا جسے تثلیث کے اقنوم ثانی کا مثیل قرار دیا (اس کے لیے یہ مثالی پیکر فارسی وہ ہو مانو کا تھا) اور اسے اوستا کا اساطیری زرتشت' اور دور متاخر کا بدھ بنا کر پیش کیا اور اپنے یوحنا کی انجیل کا فارقلیط کہا۔ ایران میں ساؤشیانت کے نام سے ایک شخصیت کے مستقبل میں ظہور کا تصور موجود تھا جیسا کہ اب ہم جانتے ہیں اور اس دریافت کے لیے طرفان کا شکر گزار ہونا چاہیے جس میں مانی کلی تخلیقات کے اجزا بھی شامل ہیں (اس دریافت سے قبل یہ تخلیقات گم ہو چکی تھیں) مزدکوں اور منیشیوں اور نسطوریوں کی زبان پہلوی تھی' اگرچہ ان تینوں نے بغیر باہمی مشاورت کے آزادانہ طور پر اختیار کیا تھا۔

مغرب میں دو مختلف کلیسائی مسلک وجود میں آئے (یونان میں) ایک ایسی دینیات جو نہ صرف اس کے متجانس تھی' بلکہ بڑی حد تک اس سے ملتی جلتی تھی۔ مانی کے دور ہی میں آرامی۔ کلدانی سورج پرستی کے مذہب کا آغاز ہوا اور آرامی ۔ یونانی متھرائی تصورات کو ایک ہی مسلک میں پرو دیا گیا۔ اس مسلک کا اولیں پروہت آئی ایم بلا لیکس تھا۔ (۳۰۰ء) جو اتھاناسی اوس کا ہمعصر تھا اور ڈائیو کلیشین کا بھی ہم عہد تھا۔ شہنشاہ نے ۲۹۵ء میں میتھرا کو سرکاری مذہب توحید ناقص کا خدا قرار دے لیا تھا۔ روحانی نظام کے تحت اس مذہب کے پجاری عیسائی پادریوں ہی کے مشابہ تھا۔ پروکلوس (جو کہ صحیح معانی میں ایک پروہت تھا) اس نے یہ دعوی کیا کہ عالم خواب میں اسے مشکل متون کی تشریح کا عرفان ہوا ہے اس کے نزدیک طیماوس اور کلدانی رہنمائی درست تھی اور اگر اسے ضائع شدہ فلسفے کا مزید مواد مل سکتا تو وہ اس کا خوشی سے مطالعہ کرتا۔ اس کے حمدیہ نغمات' دل آزاری اور نفس سوزی کی علامات تھے۔ ہیلی اس اور اس کے دیگر ساتھی اسے بدروحوں سے بچانے کی کوشش کرتے۔ ہائی روکلیس نے اپنے معتقدین کے لیے ایک اخلاقی نظم لکھی جو نو فیثا غورثی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس نظم میں اس نے خاص خیال رکھا کہ اس میں عیسائی تصورات شامل نہ ہوں۔ اسقف سائی تیسی اس' نیوفلاطونیت کا ممتاز رہنما تھا' بعد ازاں اس نے عیسائیت قبول کر لی مگر اس قبولیت میں عقیدے کی تبدیلی کا عمل شامل نہ تھا۔ اس نے اپنا دینی نظام قائم رکھا اور صرف نام تبدیل کیے۔ نوافلاطونی اسکلیپیاڈی کے لیے یہ ممکن تھا کہ اس نے ایک ایسی کتاب تحریر کی جس میں کہ تمام مذاہب کی تائید کی گئی تھی۔ ہمارے پاس ایسی اناجیل ہیں' جو انتہائی ملحدانہ انداز میں قصص الانبیا کا بیان کرتی ہیں اور ایسی بھی ہیں' جو عیسائی عقیدے کے مطابق ہیں۔ اپالونی اس نے فیثا غورث' ماری نوس' پروکلوس' داماشی اس اور آسی ڈورے کی سوانح لکھیں اور کسی بھی تصنیف میں ذرہ بھر بھی فرق نہیں۔ تمام کا آغاز اور انجام دعا پر ہوتا ہے اور سب میں عیسائی شہدا کے کارنامے شامل کیے گئے ہیں۔ پروفاری' ایمان' محبت' امید اور صداقت کو دین کے چار اہم عناصر قرار دیتا ہے۔

ہم ان مشرقی اور مغربی کلیساؤں کے مابین ہم جنوب کی طرف اڈیسا کا رخ کرتے ہیں۔ یہ تالمود کا کلیسا ہے۔ (یہودیوں کی عبادت گاہ سائناگوگ) جس کی تحریری زبان آرامی ہے۔ ان عظیم اور مضبوط بنیادوں پر یہودی عیسائی مذہبی اتحاد قائم ہوا (جیسا کہ ابیونلی اور ابلکا زائلی متحد ہوئے۔ منشیوں اور کلدانیوں نے بھی

اسی قسم کا اتحاد قائم کیا۔ (بشرطیکہ ہم منیشیوں کو اسی مذہب کی جدید صورت قرار نہ دیں) کیونکہ یہ لوگ "فردا" فردا" اپنا وجود قائم نہ رکھ سکتے تھے' لہٰذا ان کے لیے اتحاد ناگزیر تھا۔ یہ لوگ بے شمار چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم ہو چکے تھے اور اس کے بعد یہ بڑے بڑے کلیساؤں میں مدغم ہو کر غائب ہو گئے۔ جیسا کہ اس سے قبل مارشینی اور منطانسی' منیشیوں میں مدغم ہو چکے تھے۔ ۳۰۰ء کے قریب' کفار' عیسائی' فارسی' یہودی اور منیشی گرجاؤں کے علاوہ کوئی بھی مجوسی مذہب اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکا۔

(۶)

اس پختہ فکر کلیسائی نظام کے ساتھ ساتھ ۲۰۰ء سے یہ کوششیں بھی جاری کر دی گئیں کہ نمایاں معاشروں کی نشاندہی کی جا سکے۔ جوں جوں اس تنظیم میں شدت پیدا ہوتی گئی ریاست کا تصور ابھرتا گیا۔ یہ مجوسی ثقافت کے احساس عالم کا نتیجہ تھا' اسی بنا پر بادشاہت' خلافت میں تبدیل ہو گئی۔ ---- ایک مسلکی معاشرے کے سربراہ جو حکومت کے سربراہوں کے مقابلے میں زیادہ بااختیار تھے ------ تصور تقلید پسندی اور عقیدے کی راعیت کی بنیاد پر شہریت' جس کے تحت باطل مذاہب کو راہ راست پر لانے کا فریضہ (اسلام میں جہاد کا تصور اتنا ہی قدیم جتنی کہ یہ ثقافت قدیم ہے' اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جہاد کا رواج زیادہ تھا) ایک خصوصی حکومت کے لیے جو منکرین کی ریاست کے اندر واقع تھی' صرف اسے اسی صورت میں برداشت کیا جاتا تھا جبکہ ان کے قانون پر عمل پیرا ہو (کیونکہ قانون الٰہی کفار کے لیے نہیں تھا) اور اس کے ساتھ ساتھ یہودیوں کے گھیٹو کی طرح کلی رہائش کی بھی اجازت نہ تھی۔

سب سے پہلے آرامی مرکز میں اوستھوئین نے عیسائیت کو قبول کیا اور ۲۰۰ء کے قریب اسے سرکاری مذہب قرار دے لیا۔ ۲۲۶ء میں ساسانی حکومت کے تحت مزدکیت نے بھی یہی حیثیت حاصل کر لی۔ جبکہ اولیسن کے عہد حکومت میں (وفات ۲۷۵ء)۔ مزید برآں دائیو قلیطی دور میں (۲۹۵ء) تطبیق عقائد کے تحت 'دائیودس' سول اور میتھرا کے مسالک بھی رومی سلطنت کے سرکاری مذاہب قرار پائے۔ کانسٹائن نے ۳۱۲ء میں اور تردات بادشاہ آرمینیا نے ۳۲۱ء میں اور جارجیا کے بادشاہ میریان نے اس کے چند سال بعد عیسائیت قبول کر لی۔ جنوب بعید میں تیسری صدی کے ابتدائی سالوں میں ہی عیسائیت قبول کر لی گئی جبکہ اکشوم چوتھی صدی میں عیسائی ہوئے۔ دوسری طرف اسی دور میں حمارستائی ریاست نے یہودیت قبول کر لی۔ جولین اس کے برخلاف کوشش کر کے کفار کے کلیسا کو اقتدار دلا دیا۔

اس کے برخلاف اس ثقافت کے تمام مذاہب میں' ہم دیکھتے ہیں' رہبانیت کو فروغ حاصل ہونے لگا جس کی وجہ سے تاریخ ممالک اور بالعموم حقائق پر خاصہ اثر پڑا۔ کیونکہ بالآخر وجود محض اور وجود بیدار میں تضاد پیدا ہوا جسے سیاست اور مذہب کا اختلاف کہنا مناسب ہوگا۔ یہ اختلاف تاریخ اور فطرت سے بھی متعلق ہے اور مجوسی کلیسا اس پر پوری طرح سے قابو نہ پا سکا اور یہ ریاست اور قوم پر مبنی شناخت پر منتج ہوا۔ قوم

زندگی پر حاوی ہو گئی اور اس نے مذہب پر غلبہ حاصل کر لیا۔ کیونکہ موخرالذکر نے زندگی کے تمام پہلوؤں پر قابو پایا ہوا تھا مگر اس علاقے میں قوم اور مذہب کے اختلاف میں وہ شدت نہ تھی' جو رومی عہد میں دیکھنے میں آئی تھی اور اس کے نتیجے میں دنیا میں نکوکاری اور زہد و ریاضیت میں اختلاف نمایاں ہونے لگا۔ مجوسی مذاہب بنیادی طور پر سماوی نور سے مربوط رہتے ہیں جس کا مظہر انسانی شکل میں ہوتا ہے جسے وہ ہم مشرب و ہم عقیدہ لوگوں کے معاشرے میں اظہار کرتا ہے۔ علاوہ ازیں دوسرے انسان بدی اور ظلمات میں رہتے ہیں مگر انسانوں پر حکومت کا حق صرف روحانی انسان کو ہے۔ اس ثقافت میں رہبانیت کا عمل صرف پجاری تک محدود نہیں جس طرح کہ دور حاضر میں پادریوں کو کوئی احترام حاصل نہیں اور بالعموم اسے اجازت ہے کہ وہ شادی کر لے۔ ---- مگر اس کے باوجود اس سے مکمل تقدیس کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ رہبانیت کے بغیر تمام مذہبی ضروریات کا پورا کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے نتیجے میں استغفار کے لیے علیحدہ ادارے اور خانقاہیں اور درس گاہیں' اپنی اہمیت بنا لیتی ہیں تاکہ مابعد الطبیعیاتی ضروریات کی تسکین کر سکیں۔ مغرب تو ایک طرف ایسے ادارے چین اور ہندوستان میں بھی موجود نہ تھے۔ مغرب میں تو یہ نظام قائم اور برسرپیکار تھا---- یہ حرکت پذیری کی صورت ہے ---- اور ایسی وحدتیں مختلف حیثیتوں میں موجود تھیں نتیجتاً" مجوسی عالم کے افراد کو ہم دنیا اور خانقاہوں میں عزلت گزیں نہیں سمجھنا چاہیے یعنی دو مختلف اسالیب حیات میں تقسیم ہونے کے باوجود تمام دنیاوی اور مذہبی امکانات کی تکمیل کر رہے ہوں' ہر نیک آدمی ایک قسم کا راہب بھی ہے دنیا اور خانقاہ کی زندگی میں کوئی فرق نہ تھا بلکہ صرف درجے کا فرق تھا۔ مجوسی کلیسا اور نظام متجانس معاشروں پر مشتمل ہیں' جن میں امتیاز صرف ایک دوسرے کے طریق کار کا ہے جیسا کہ ہم پال کے کلیسا میں محسوس کرتے ہیں' جبکہ متھرا کا مذہب اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے' بعض معاملات میں بہت شدید اور بعض میں بہت وسیع القلب ہے۔

ہر مجوسی کلیسا فی نفسہ ایک نظام ہے۔ یہ صرف انسانی کمزوریوں کی وجہ سے ہے کہ رہبانیت کی درجہ بندی کر دی گئی ہے۔ ان کے متعلق کوئی حکم تو نہیں۔ یعنی یہ فرائض میں شامل نہیں بلکہ ان کی اجازت دے دی گئی ہے۔ جیسا کہ مارشینیوں میں تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ ایک مجوسی قوم میں متعدد نظام بیک وقت جاری رہتے ہیں جو چھوٹے چھوٹے شدت پسند گروہوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ بالآخر راہبوں' درویشوں اور منارہ نشینوں میں شامل ہو گئے۔ اب ان کے لیے دنیا میں کوئی اور دلچسپی باقی نہیں رہی۔ یہ شعور بیدار صرف روح القدس کی ملکیت ہے۔ پیغمبرانہ مذاہب کے ماحول میں کشوفات کے تحت متعدد معاشرے پیدا ہو جاتے ہیں' جو بظاہر مختلف نظام سمجھے جاتے ہیں۔ مغرب کے دو مسلکی کلیساؤں نے بے شمار راہب' راہبات' فرائر (برادر) مختلف نظام پیدا کیے جن کو صرف متعلقہ روحانی قوت کے حوالے سے شناخت کیا جا سکتا ہے جس کے نام سے انھیں موسوم کیا جاتا ہے" یہ سب روزے رکھتے ہیں' عبادت کرتے ہیں' مجرد رہتے ہیں اور غربت میں گزارہ کرتے ہیں۔ یہ معاملہ مشکوک ہے کہ ۳۰۰ء میں ان دونوں میں سے کون سا کلیسا زیادہ دینی رجحان کا حامل تھا۔ نوفلاطونی راہب سرپی اون' اس لیے صحرا میں چلا گیا' تاکہ اپنا سارا وقت اور فن حمدیہ کلام کے مطالعے میں بسر کر سکے۔ داماشی اس' خواب میں حاصل ہونے والی ہدایات کے باعث ایک گہرے غار میں چلا

گیا تاکہ وہ مسلسل' قابیل کی عبادت کر سکے فلسفے کے مختلف مدرسہ ہائے فکر بھی راہبانہ نظام ہی تھے نو فیثاغورثی یہودیوں کے متھرا مسلک کے مزاج کے قریب تر تھے۔ ایک سچا مسلک صرف مردوں ہی کو اپنی جماعت اور اس کے شعبہ جات میں شامل کرتا۔ شہنشاہ جولین کا ارادہ تھا کہ کفار کی خانقاہوں کی سرپرستی کرے۔ مندائی مذہب کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ یہ مختلف مسالک کے گروہوں پر مشتمل تھا۔ ان میں ایک یوحنا اصطباغی بھی تھا۔ عیسائی رہبانیت کا آغاز پاکومیئس (۳۲۰ء) کے ساتھ نہیں ہوا۔ وہ صرف اس سلسلے کی پہلی خانقاہ کا معمار تھا۔ اس تحریک کا آغاز یروشلم کے اصل معاشرے ہی میں ہوا۔ متی کی انجیل اور حواریوں کی تمام تخلیقات راہبانہ جذبات کا شدید اظہار کرتے ہیں۔ ۔ فارسی اور نسطوری فرقوں کے لوگوں نے خانقاہی نظام کو مزید تقویت دی اور اسلام نے اسے پوری طرح سے اپنے اندر جذب کر لیا اور آج تک مشرقی تقدیس پر اسلام پوری طرح سے حاوی ہے اور اس میں اخوت کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے اور یہودیت اپنے قدیم عمل ارتقا پر عمل کر رہی ہے جو قرائیوں نے جاری کیا تھا۔ اس کا آغاز آٹھویں صدی سے ہوا اور اٹھارھویں صدی کے پولینڈ کی صیہونیت تک جاری رہی

عیسائیت دوسری صدی میں بھی ایک توسیعی نظام سے زیادہ نہ تھی اس کا عوام میں تاثر تمام اندازوں سے بڑھ کر' اس کے معتقدین پر اچانک بڑھ گیا' ۲۵۰ء تک اس کے ماننے والوں کی تعداد میں اچانک اضافہ ہو گیا۔ یہ وہی دور ہے جبکہ کلاسیکی عہد کی شہری آبادیوں کا مسلک متاثر ہو چکا تھا' اسے عیسائیت کی وجہ سے نقصان نہ پہنچا بلکہ نوزائیدہ کافر کلیسا اس کے لیے مضر ثابت ہوا۔ فریٹر آرویلز کا ریکارڈ' روم میں ۲۴۱ء میں اپنی انتہا کو پہنچ گیا اور اولمپیا میں پائی جانے والی کندہ تحریر کا تعلق ۲۶۵ء سے ہے۔ یہ ایک رواج ہو گیا کہ مختلف مسالک کی خصوصیتیں ایک آدمی کے ساتھ وابستہ ہو جاتیں کہ یہ مختلف مسالک اپنا اپنا علیحدہ وجود نہیں رکھتے' اور ایک ہی مذہب کی مختلف شاخیں ہیں اور یہ مذہب مختلف علاقوں میں پھیلتا گیا اور یونانی ---- رومی نسلوں میں رائج ہو گیا۔ اس کے برعکس عیسائی مذہب نے عرب میدانوں پر تنہا قبضہ کر لیا اور صرف اسی وجہ سے یہ ناگزیر ہو گیا' کہ اس میں تمام داخلی اختلافات کا خاتمہ کر دیا جائے۔ یہ اختلافات بعض افراد کی بدولت نہ تھے' بلکہ مختلف خطوں میں آبادیوں کے مزاج پر مبنی تھے اور ان اختلافات نے عیسائیت کو مختلف مذاہب میں تقسیم کر دیا اور یہ تقسیم مستقل حیثیت اختیار کر گئی۔

یہ اختلاف خود مسیح کی فطرت کے متعلق بھی تھا اور اسی بنیاد پر اس کا فیصلہ ہو گیا۔ مسئلہ زیر بحث مسیح کی ذات تھی جو اسی صورت میں تمام مجوسی مذاہب میں موضوع بحث بنا رہا ہے نوفلاطینی کلیسائی' پروفائری لیمبلی کوس اور سب سے بڑھ کر پروکاموس نے اسے مغربی انداز فکر میں حل کرنا چاہا اور اس میں جو انداز فکر اختیار کیا گیا وہ فائلو اور پال کے قریب تر تھا۔ مگر روح القدس' اقنوم ثانی اور باپ کے مابین ابتدائی رشتہ اور مابین رابطہ (ثالث) بنیادی حوالے سے تصور کیا گیا۔ یہ طریق عمل بہت اہمیت کا حامل تھا۔ اسی سے تقسیم یا نفوذ کا مسئلہ طے ہو جاتا۔ سوال یہ تھا کہ کیا ایک دوسرے میں شامل ہے؟ یا وہ تینوں یکساں ہیں؟ یا باہم متفرق ہیں؟ کیا تثلیث بیک وقت توحید بھی تھی؟ مشرق میں یوحنا کی انجیل کے حوالے سے ایک مختلف

خیال مروج تھا۔ بارڈے سانیان غنا سطی بھی اس کا حامی تھا۔ یعنی وہی رشتہ جو ہرمزد اور روح القدس کے مابین (سپنٹاما تینو) اور وہ ہومانو کی فطرت سے ہے۔ اس تصور نے اوستا کے پجاریوں کو مدت تک مصروف رکھا اور یہ ایفے سوس اور چالسے ڈان کی مجالس کے بعد طے ہوا کہ زرواتیت (۴۳۸-۴۵۷) عارضی طور پر غالب آ گئی ہے۔ زروان کو عالمی طریق روحانیت پر فوقیت حاصل ہو گئی (زروان کو تاریخ زمان قرار دے دیا گیا) اور عقائد کی جنگ میں اسے برتری کا مقام مل گیا۔ بعد ازاں اسلام نے اس موضوع کو دوبارہ اٹھایا اور اسے فطرت کے حوالے سے حل کرنے کی کوشش کی۔ اس میں قرآن اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیت کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ یہ مسئلہ تو مجوسی ثقافت کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا جیسا کہ مغرب میں "عزم و ارادے" کا مسئلہ جسے فاؤستی ثقافت کے آغاز ہی میں بنیادی مسئلے کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ان مسائل کی طرف توجہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں' یہ صرف اسی وقت سامنے آتے ہیں' جب ثقافت ان کے متعلق سوچتی ہے' تو یہ فکر کا بنیادی مسئلہ بن جاتے ہیں اور بعض اوقات تمام شعبہ ہائے علم میں ان کا کوئی تصور بھی نہیں ہوتا' پھر بھی یہ کبھی نہ کبھی سر اٹھاتے رہتے ہیں۔

مگر عیسائیت میں اس مسئلے کے تین حل پیش کیے گئے جو مشرق' مغرب اور جنوب کی طرف سے آئے۔ یہ حل غناسطیوں کے ہاں تو پہلے سے موجود تھے۔ ہم ان کو تین نام دیتے ہیں۔ باردے سین' جیسی لائنڈز اور والینٹی نس ان کا مقام اتصال ایڈیسا تھا۔ جس کی گلیوں میں جنگ و جدل کا ہنگامہ برپا ہوا۔ جن میں نسطوری' فتح یاب ایفے سوس اور انون کے خلاف اعتقاد یک طبیعت مسیح کے نعرے بلند کرتے رہے اور یہ مطالبہ کرتے رہے کہ بشپ عیاس کو بھوکے درندوں کے سامنے سرکس میں پھینک دیا جائے۔

اتھناسی اوس نے سب سے بڑا سوال اٹھایا' جس کی ابتدا قلب ماہیت سے ہوئی جس کے متعدد تصورات اپنے ہم عصر لیپ لی کوس سے ملتے جلتے تھے۔ ایری اوس کے برخلاف جس نے مسیح کی ذات میں خدا کا مثیل دیکھا تھا اور اسے باپ کے مشابہ قرار دیا۔ اس نے یہ دعویٰ کیا کہ باپ اور بیٹا ایک ہی مادے سے بنے ہیں' جس نے مسیح میں انسانی صورت اختیار کر لی' کلام نے گوشت پوست کی صورت اختیار کر لی۔ اس مغربی طریق کار کے مطابق مسکی کلیسا کے مرئی حقائق کا پتہ چلتا ہے اور کلام کی ایسی صورت ابھرتی ہے جس کی تصویر کشی ممکن ہے۔ یہی وہ دور تھا جبکہ مغرب میں لیمبلی کوس نے اپنی کتاب متعلقہ "پیکران الٰہی" لکھی۔ جس میں روحانیت کا عنصر بہت حد تک موجود تھا اور اس سے معجزات پیدا ہوئے تثلیث کی تجریدی صورت میں ہر جگہ ماں اور بیٹے کے جذباتی رشتوں کا مظاہرہ کیا گیا ہے اور یہی دوسری صورت ہے' جسے اتھاناسی اکوس کے طریق فکر سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔

جب باپ اور بیٹے کے رشتے کو تسلیم کر لیا گیا تو پھر اصل مسئلہ وجود میں آیا کہ مجوسی مذاہب کی ثنویت کو کس طرح خود بیٹے کی تاریخ میں شامل کیا جائے۔ عالمی عمق میں روحانی اور انسانی دونوں جوہر موجود ہیں۔ روحانی معبود اور انفرادی کا کسی نہ کسی طرح گوشت پوست کے جسم سے رابطہ استوار ہو جاتا ہے۔ اس

کیفیت میں مسیح کی کیا صورت ہوگی؟

یہ فیصلہ کن امر تھا ---- اور ایکیٹیم کا ایک نتیجہ ---- یہ اختلاف یونانی زبان میں زیر بحث لایا گیا اور ایسی سرزمین میں جہاں قلب ماہیت کا آغاز ہوا ---- گویا مغربی کلیسا کے خلیفہ کے بالکل روبرو۔ نکائیا کی مجلس کا خود کنسٹینٹائن صدر تھا۔ جہاں پر کہ اتھناسی اس کے اصول کو تسلیم کر لیا گیا۔ مشرق میں جہاں آرامی زبان اور فکر مروج تھی (جیسا کہ ہمیں افرات کے خطوط سے پتا چلتا ہے) اسے بمشکل زیر عمل لایا گیا۔ ان لوگوں نے کسی ایسے مسئلے پر بحث کا جواز تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جو مدتوں پہلے طے ہو چکا تھا۔ مشرق اور مغرب کے مابین اس شگاف نے ایفے سوس (۴۳۱ء) کی کونسل میں عیسائی اقوام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا' فارسی کلیسا اور یونانی کلیسا۔ مگر یہ قدیم افتراق ہی کی جدید صورت تھی' جو دو مختلف خطہ ہائے ارض میں فکر کے اختلاف پر مبنی تھی۔ نسطوری اور تمام مشرق مسیح کو آدم ثانی سمجھتے تھے۔ آخری عصر کا روحانی سفیر مریم کے ہاں انسانی صورت میں ایک بچہ پیدا ہوا تھا جس کے اندر خدائی صفات موجود تھیں۔ مغرب کا تصور یہ تھا کہ مریم خدا کی ماں تھی اس کے جسم میں روحانی اور انسانی دونوں جوہر موجود تھے (کلاسیکی محاورے میں وہ ایک شخص تھا ایک اتحاد جس کا سائرل نے ایک مخصوص نام رکھا۔ جب ایفے سوس کی مجلس نے مریم کو خدا کی ماں قرار دے دیا' یعنی وہ خاتون جس نے خدا کو جنم دیا' تو ڈائنا کے قدیم شہر جو صحیح معانی میں کلاسیکی طرز کا تھا' خوشیاں منانے لگا

مگر اس سے بہت مدت پہلے شامی شمسیوں نے آقا کے جنوبی تصور کی خبر دے رکھی تھی' یعنی زندہ مسیح نہ صرف جوہر تھا بلکہ مادہ بھی تھا۔ الوہیت نے اس میں حلول نہیں کیا تھا بلکہ اس کی قلب ماہیت کر دی تھی۔ ایک انسانی جوہر (جیسا کہ گریگوری نازلی ائنزم نے اس کے برعکس تصور پیش کیا' جو بہت اہم ہے اور یک طبیعتی مسیح کے تصور کا اظہار کرتا ہے جو بعد میں سپائی نوزا نے بھی پیش کیا' (یعنی ایک جوہر کا کسی دوسرے ہیولی میں ظہور ہوا) یک طبیعتی عقیدے کے عیسائی چالسیڈون کی مجلس میں (۴۵۱ء جس میں کہ مغرب ایک بار پھر غالب رہا) مسیح کو ایک ایسا بت کہتے تھے' جس کے دو چہرے ہوں' وہ نہ صرف یہ کہ کلیسا سے باہر نکل گئے' اور فلسطین اور مصر میں شدید بغاوت کی اور جب جسٹینین کے عہد میں' اہل فارس کے لشکریوں نے جو مزدکی تھے' نیل کی وادیوں میں داخل ہو گئے' ان کو یک طبیعتی مسیح کے پیروکاروں کے طور پر خوش آمدید کہا گیا۔

اس مایوس کن مناقشے کا بنیادی مقصد جو محض اس وجہ سے عمل میں آیا کہ اس صدی کا مزاج ہی یہی تھا۔ اس کی بنیاد کوئی عالمانہ مبحث نہ تھا بلکہ ایک خطہ زمین کی آبادی کی یہ خواہش تھی کہ انھیں آزادی نصیب ہو۔ اس سے پال کا کیا ہوا سارا کام ختم ہو گیا۔ اگر ہم دو نوزائیدہ اقوام کی روح تک رسائی حاصل کر سکیں اور ہم کوئی شے مخفی نہ رکھیں اور عقائد کے چھوٹے چھوٹے اختلافات کو فراموش کر دیں تو ہمیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ عیسائیت نے مغربی یونان کی سمت متعین کر لی اور اس کی ذہنی رغبت ملحدانہ کلیسا کی طرف کس طرح پیدا ہوتی جبکہ مغرب کا حکمران بالعموم عیسائیت کا بھی سربراہ ہوتا تھا. کنسٹنٹائن کے ذہن

میں یہ جاگزیں تھا کہ پال کی تعلیمات عیسائیت سے ہم آہنگ ہیں۔ بیزائن رجحان کے یہودی اور عیسائی اس کے نزدیک کافر گروہ تھے اور جوہانیہ کے مشرقی عسائی تو کبھی اس کے ذہن ہی میں نہیں آئے۔ جب قلب ماہیت کی روح کا اظہار تین مختلف مجالس میں ہوا (نکائیہ ' ایفے سوس' اور چالسی ڈون) تو اس نے ان مجالس میں طے کردہ عقائد پر ہمیشہ کے لیے ایک ہی دفعہ مہر لگا دی ۔ حقیقی عرب دنیا' اپنی طبیعی قوت کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے خلاف باڑ کھڑی کر دی۔ عرب دنیا کے اقتدار کے خاتمے کے ساتھ' عیسائی تین مختلف مذاہب میں تقسیم ہو گئے' جن کو تین علامتی ناموں سے موسوم کیا جا سکتا ہے' پال ' پطرس اور یوحنا۔ ان میں سے کوئی بھی زمانہ حال میں تاریخ اور عقیدے کے لحاظ سے غیر متعصب آنکھ کو صحیح عیسائی معلوم نہیں ہوتا۔ یہ تین مذاہب فی الحقیقت تین مختلف اقوام بھی ہیں۔ اگر ہم قدیم نسلی تفریق قائم رکھیں' تو یہ یونانی ' یہودی اور اہل فارس ہیں اور جس زبان کو وہ کلیساؤں میں استعمال کرتے رہے' وہ انھیں اقوام کی زبانیں تھیں' یعنی یونانی آرامی اور پہلوی۔

(۷)

نکایا کی مجلس کے بعد مشرقی کلیسا نے اپنے آپ کو ا ستقی نظام حکومت کے طور پر منظم کر لیا اور اپنا دستور بنا لیا۔ ان کا سرگروہ کیتھولی کوس تھا جو کتھوسی فون کا رہنے والا تھا۔ اس نے اپنی مجلس ' دعاؤں کی کتاب اور قانون خود وضع کیے ۴۸۶ء میں اس نے اپنے عقیدے کو سب کے لیے لازمی قرار دیا اور اس کا قسطنطنیہ کے ساتھ تعلق ختم ہو گیا۔ اس وقت کے بعد مزدکی' مینیشی اور نسطوری ' عیسائیوں نے ایک مشترک منزل مقصود قائم کر لی' جس کا بیج باردیسی غناسطیوں نے کاشت کیا تھا۔ یک طبیعی مسیحی کلیساؤں میں جو جنوب میں قائم تھے قدیم معاشرتی رو از سر نو پیدا ہوئی اور مزید پھیل گئی ۔ یہ توحید کے مسئلے پر کوئی سمجھوتہ کرنے پر تیار نہ تھا' اور اس معاملے میں وہ آغاز ہی سے یہود کا ہمنوا تھا۔ اسلام کا نقطہ آغاز بھی توحید ہی تھا (لاالہ الا اللہ)۔ مغربی کلیسا نے ہمیشہ اپنے آپ کو رومی حکومت کی قسمت سے وابستہ رکھا۔ اس کا مطلب ہے کہ کلیسائی ملک ریاست میں تبدیل ہو گیا۔ بتدریج اس نے اپنے آپ کو کافرانہ کلیسا میں گم کر لیا اور اس کے بعد اس کی اہمیت فی نفسہ خود اس میں نہ رہی اور اسلام کے نقطہ نظر کے مطابق اس نے اپنے آپ کو ختم کر لیا۔ مگر حادثاتی طور پر مغرب نے اسلام ہی سے عیسائی نظام تخلیق حاصل کیا مزید برآں لاطینی کے زیر اثر جو انتہائی مغرب میں مروج تھی اور جو یونانیوں کے لیے بے معنی تھی کیونکہ روم بھی اب ایک یونانی شہر کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اور لاطینی زبان افریقہ اور گال تک سمجھی اور بولی جانے لگی تھی۔

مجوسی قوم کے ضروری اور بنیادی تصورات ایسے وجود کے حامل تھے جن کی بنیاد توسیع پر تھی اور آغاز ہی سے وسعت پذیری کے لیے مستعد اور فعال تھے۔ یہ تمام کلیسا ارادۃ اور قوت کے زور پر اور کامیابی کے لحاظ سے تبلیغی کلیسا تھے مگر یہ اس وقت تک ممکن نہ ہو سکا جب تک دنیا کے خاتمے کو ناگزیر ہونے کا تصور ترک نہیں کیا گیا اور دنیا میں اس عقیدے کو فروغ نہ دیا گیا کہ یہ ایک طویل عرصے تک قائم رہے گی۔ مگر

مجوسی مذاہب نے مسئلہ جوہریت کی طرف اپنا نقطہ نظر نہ قائم کر لیا اور یہ کہ ثقافت کی توسیع اس قدر تیز رفتاری' آرزو کے تحت ہوئی کہ تمام عناصر سے آگے نکل گئی اور اسلام میں اسے متاثر کن حد تک حتمی اور کسی لحاظ سے بھی آخری پذیرائی نصیب ہوئی لیکن کسی لحاظ سے بھی یہ واحد اور آخری مثال نہیں۔ ان زبردست حقائق کی مورخین بالکل غلط تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ بحیرہ روم کے آس پاس سے آگے نہیں جاتی۔ مغربی مشاہدہ صرف ان حدود ہی کے اندر محدود ہو کر رہ جاتا ہے اور یہ صرف قدیم وسطانی اور جدید کے نقطہ نظر سے آگے بڑھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس منصوبے کے علاوہ مصنوعی اتحاد عیسائیت کی قبولیت ترک نہیں کر سکتے وہ ایک خاص دور کو یونانی اور لاطینی ادوار کے مابین عبوری دور کہتے ہیں مگر اس کے بعد وہ یونانی دور کو قطعاً" فراموش کر دیتے ہیں۔

مگر عیسائیت سے قبل بھی اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر پوری توجہ کبھی مبذول نہیں کی گئی اور اس کی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا گیا اور اسے تبلیغی کوشش کے طور پر مقام نہیں دیا گیا کفار کا کلیسا تطبیق عقائد کے مسلک کی بنیاد پر جیت گیا۔

شمالی افریقہ ہسپانیہ' گال' برطانیہ اور رائین اور ڈینیوب کے حدود تک اس کے زیر اثر آگئے۔ حدودی ازم جسے سیزر نے گال میں روشناس کرایا تھا قسطنطین کے عہد تک اس کا بہت کم حصہ باقی رہ گیا تھا۔ مقامی دیوتاؤں کو مجوسی نام دے کر جو مسالکی کلیساؤں سے متعلق تھے (مثلاً میتھرا' سول ' جیوپیٹر)۔ دوسری صدی کے بعد روشناس کرانے کا مقصد ان علاقوں پر قبضہ کرنا تھا اور شہنشاہ کی عبادت کا مقصد بھی یہی تھا ان علاقوں میں عیسائیت کی تبلیغی مساعی زیادہ کامیاب نہیں ہوئیں جیسا کہ دوسرے مسالک کو کامیابی ہوئی۔ اس کی قریبی عزیز (یہودیت) بھی اس سے قبل کامیاب نہ ہو سکی۔ مگر آخرالذکر کی تبلیغ بربری قبائل تک محدود تھی۔ پانچویں صدی میں اسطلے پیاڈوس سے الفروڈی سیاسی کے نام کا ایک کاریان شہر' عیسائیت سے کفر میں تبدیل کر لیا۔

یہودیوں نے جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے ' اپنا تبلیغی کام مشرق اور جنوب کی طرف جاری رکھا۔ جنوبی عرب سے وہ افریقہ کے وسط تک پہنچ گئے غالباً" یہ عمل ولادت مسیح سے قبل اختیار کیا گیا جبکہ مشرق کی طرف ان کی چین میں موجودگی کے آثار ملتے ہیں دوسری صدی میں بھی یہ چین میں موجود تھے۔ اس کے بعد یہودی مذہب کے پیروکار منگول ملتے ہیں' جو ہنگری کی جنگ لیچ فیلڈ ۹۵۵ء میں شامل ہوئے۔ مور یہودی علما نے بازنطینی شہنشاہ سے (۱۰۰۰ء) یہ درخواست کی کہ وہ اس سفارت کی حفاظت کی ضمانت دے جو خزریوں سے یہ دریافت کرنے کے لیے آرہی تھی کہ کیا وہ اسرائیلی گم شدہ قبائل میں سے تھے۔

دجلہ کی وادیوں سے مزدکوں اور مینیوں اپنے دونوں سمت واقع سلطنتوں کے علاقوں میں دخل اندازی کی۔ رومیوں اور چینیوں نے اپنی سرحدوں کو مضبوط کیا۔ ایرانی جو میتھرا مسلک کے پیروکار تھے۔ برائطین پر

حملہ آور ہوئے۔ ۴۰۰ء تک منیشی یونانی عیسائیت کے لیے خطرہ بن چکے تھے اور جنوبی فرانس میں صلیبی جنگوں کے آخری دور تک منیشی موجود تھے مگر ان دونوں مذاہب نے مشرق کی طرف بھی پیش قدمی کی اور دیوار چین تک پہنچ گئے۔ (اس علاقے میں عظیم پولی گلاٹ کتبات دستیاب ہوئے ہیں کارابا لگاسون اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ منیشی مذہب اوئی گور حکومت کے علاقوں میں سرایت کر چکا تھا)۔

ایسے کتبات شنتونگ میں بھی پائے گئے ہیں چینیوں کے وسطی علاقوں میں اہل فارس کے آتش کدوں کے آثار ملے ہیں اور ۷۰۰ء کے بعد کی چینی دستاویزوں میں ایرانی علم نجوم کے اثرات دریافت ہوئے ہیں۔

تینوں عیسائی کلیسا جہاں کہیں بھی گئے' ان کی مخالفت ہوئی جب ۴۹۶ء میں مغربی کلیسا نے فرانکش بادشاہ چلوڈوگ کو عیسائی مذہب میں داخل کر لیا' تو اس وقت مشرقی کلیسا کے مبلغین سری لنکا تک پہنچ چکے تھے اور مغربی کلیسا کے مبلغین چین کی عظیم دیوار کے محافظین تک رسائی حاصل کر چکے تھے اور جنوبی کلیسا کے مشنری اکسوم کی سلطنت میں داخل ہو چکے تھے۔ اسی دور میں یونی فیس (۷۱۸ء) جرمنی نے عیسائیت قبول کر لی۔ نسطوری مبلغین تو اس کے قریب پہنچ چکے تھے کہ چین میں کامیابی حاصل کر لیں۔ وہ شنتونگ میں ۶۳۸ء میں داخل ہوئے۔ شہنشاہ کاؤسونگ (۸۳ ـ ۶۵۱ء) نے اپنے صوبوں میں گرجے تعمیر کرنے کی اجازت دے دی۔ ۷۵۰ء میں عیسائیت کی تبلیغ شاہی محلات میں بھی کی جارہی تھی' ۷۸۱ء میں آرامی اور چینی کتبات کے مطابق جو سنگافو کے ایک یادگار ستون پر کندہ ہیں اور آج تک محفوظ ہیں۔ "تمام چین میں اتحاد کے محلات دکھائی دیتے تھے۔" مگر سب سے اہم کنفیوشس کی شخصیت تھی جسے مذہبی معاملات میں کم ہنر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ وہ نسطوریوں مزدکیوں' اور منیشیوں کو اہل فارس کے ایک ہی مذہب کی حیثیت دیتا جیسا کہ مغربی رومی صوبوں کے لوگ میترا اور یسوع میں کوئی فرق نہ کرتے تھے۔

لہٰذا اسلام کو تمام مجوسی مذاہب میں سب سے زیادہ پابند شرع ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس کا آغاز ایک مذہب کے طور پر ان علاقوں میں ہوا جن میں جنوبی کلیسا اور تالمودی یہودی مذہب کا عروج تھا۔ یہ ان گہرے اثرات ہی کا نتیجہ ہے کہ (جہاد اور جدل وقتال کا نہیں) اس کی بے مثال کامیابیوں اور کامرانیوں کی کلید کا پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ سیاسی میدان میں اس مذہب نے بہت زیادہ تحمل اور برداشت کا مظاہرہ کیا۔ جان دماسینس ' جو یونانی کلیسا کا آخری قابل الذکر عقیدت مند تھا المنظر کے نام سے خلیفہ کے خزانچی کی خدمات بجالاتا تھا۔ یہودیت ' متروکیت' اور جنوبی اور مشرقی کلیسا اس علاقے میں فوراً" اور مکمل طور پر تحلیل ہو گئے۔ سیلوسیا کا کیتھلکوس' اور جوزف سوم یہ شکایت کرتے ہیں کہ ہزار ہا عیسائیوں نے اس مذہب کو جونہی اس کا اعلان ہوا قبول کر لیا اور شمالی افریقہ میں جو آگسٹائن کا وطن تھا' تمام کی تمام آبادی مسلمان ہو گئی۔ حضرت محمدؐ کا وصال ۶۳۲ء میں ہوا۔ ۶۴۰ء میں تمام توحید پرست اور نسطوری (اس لیے تالمود اور اوستا کے پیروکار) اسلام کو قبول کر چکے تھے۔ ۷۱۷ء میں اسلام قسطنطنیہ کی دیواروں کے سامنے آکھڑا ہوا اور یونانی کلیسا کا نام ونشان باقی نہ رہا۔ ۶۱۸ء ہی میں حضرت محمدؐ کے رشتہ دار چین کے بادشاہ طائی دسونگ کے پاس تحائف

لے کر پہنچ چکے تھے اور اپنا تبلیغی مرکز قائم کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ ۷۰۰ء تک شنتونگ میں مساجد قائم ہو گئیں اور ۷۲۰ء میں دمشق سے جنوبی فرانس میں یہ ہدایات روانہ کی گئیں کہ فرینکس کی حکومت پر قبضہ کر لیا جائے۔ اس کے دو صدی بعد جب کہ مغرب میں ایک نیا مذہب پیدا ہو رہا تھا جسے قدیم کلیسا کی باقیات کو یکجا کر کے سہارا دیا جا رہا تھا' اسلام سوڈان اور جاوا تک پہنچ چکا تھا۔

ان تمام وجوہات کی بنا پر اسلام ' مذہب کی خارجی تاریخ کے لیے بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے' مجوسی مذاہب کی داخلیت کی تاریخ جسٹانین کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ فاؤسٹی ثقافت چارلس پنجم اور ٹرنٹ کی مجلس کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی ۔ تاریخ مذاہب کی ہر کتاب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عیسائی مذہب میں دو ایسے ادوار گزرے ہیں جن میں کہ عظیم فکری تحریکات جاری تھیں' ۵۰۰ مشرق میں اور ۱۵۰۰ ـ ۱۰۰۰ مغرب میں

مگر ثقافتوں کی معراج کے بھی دو ادوار ہیں اور ان میں غیر مسیحی صورتیں بھی شامل ہیں جو ہر مذہبی تعمیر میں شامل ہوتی ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ جسٹی نین نے جب ۵۲۹ء ایتھنز کی یونیورسٹی بند کر دی' تو اس سے کلاسیکی فلسفے کا خاتمہ ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ کلاسیکی فلسفہ صدیوں قبل ہی ختم ہو چکا تھا۔ اس نے صرف یہ کیا کہ حضرت محمدؐ کی ولادت سے چالیس سال قبل اس نے کافر کلیسا کو' اس کا مدرسہ بند کر کے ختم کر دیا۔ جبکہ مورخین اس امر کا اضافہ کرنے سے پہلو تہی کرتے ہیں کہ اس نے انطاکیہ اور اسکندریہ میں بھی عیسائی دینیات کے مدارس بند کر دیے۔ عقیدہ اپنی تکمیل کے بعد ختم ہو گیا جیسا کہ مغرب میں ٹرینٹ کی مجلس (۱۵۶۴ء) اور آگس مرگ کا اعتراف (۱۵۴۰ء) کہ شہر کے خاتمے کے ساتھ ہی دانش مندانہ مذہبی تخلیقی قوت کا خاتمہ ہو گیا۔ بالکل یہی عمل یہودیت اور اہل فارس کے ساتھ ہوا۔ تالمو ۵۰۰ء میں اختتام پذیر ہوئی اور جب خسرو نوشیرواں نے ۵۳۲ء میں مزدکی اصلاحات کو خونریز قوت سے دبا دیا جو ہماری عدم اصطباغ کی تحریک سے مختلف نہ تھی۔ اس میں مناکحت اور جائیداد کے تصورات کو ترک کر دیا گیا تھا۔ اس تحریک کو کیقباد اول کی مدد حاصل تھی۔ یہ ایسا ہی تھا گویا کلیسا اور شرفا کے اختیارات کو ختم کر دیا جائے۔ اوستا کی تعلیمات بھی اسی طرح انجماد کا شکار ہو چکی تھیں۔

باب نہم

عرب ثقافت کے مسائل

(ج)

فیثا غورث، محمدؐ اور کرام ویل

مذہب کا بیان کسی زندہ مخلوق کے شعور بیدار کے ان لمحات کے حوالے سے کیا جا سکتا ہے جب وہ وجود پر غلبہ حاصل کرتا ہے، قابو پالیتا ہے یا ترک کرتا ہے یا اسے بالکل ختم کر دیتا ہے۔ جب اس کی آنکھیں وسیع تر کشاکش اور نور سے لبریز دنیا کو دیکھتی ہیں اور جب زمان و مکان کے سامنے شکست تسلیم کرلیتا ہے تو اس لیے اس کی بنض کی رفتار ماند پڑ جاتی ہے تکمیل کی نباتاتی آرزو ختم ہو جاتی ہے اور اپنی ابتدائی حالت کو ترک کرکے اسے تکمیل کا حیوانی خوف طاری ہو جاتا ہے، کیونکہ تکمیل کا دوسرا مطلب موت ہے، نہ نفرت نہ محبت، بلکہ مذہب کے بنیادی احساسات، خوف اور محبت ہیں۔ نفرت اور محبت میں وہی فرق ہے جو زمان اور مکان میں ہے، خون اور آنکھ میں ہے یا بنض اور کشاکش میں ہے جرات آزمائی اور دردمندی میں ہے اور اسی طرح محبت کا مسابقتی مزاج مذہبی مزاج محبت سے مختلف ہے۔

تمام مذاہب نور کی سمت کی نشاندہی کرتے ہیں - وسعت پذیر ذات مذاہب کی پیروکار ہوتی ہے جیسا کہ دنیائے چشم جب خودی سے ہمکنار ہوتی ہے تو مرکزِ نور کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے - سماعت اور لمس مرئی اور غیر مرئی سے مربوط ہو جاتے ہیں - جب ان کی فعالیتوں کا احساس ہوتا ہے تو ان میں عفریتی قوت نظر آتی ہے جو کچھ بھی ہم لفظ "الوہیت" سے مراد لیں، اس نورانی حقیقت میں "القا" "نجات" "تقسیم" کا عنصر کسی نہ کسی صورت ضرور موجود ہوگا - موت انسان کے لیے ایسی شے ہے - جسے وہ دیکھتا ہے اور دیکھنے سے اس

کا علم رکھتا ہے اور موت ہی کے حوالے سے ولادت بھی ایک دوسرا راز ہے - یہ کائناتی شعور کے دو مرئی حدود ہیں - یہ ہر زندہ وجود میں اور روشن مکان میں زندہ مثال ہیں -

گہرے خوف کی دو اقسام ہیں - ایک خوف (جس کا حیوانات کو بھی علم ہے) وہ مکان کے عالم صغریٰ میں آزادانہ موجودگی سے متعلق ہے۔ اس میں خود مکان اس کی قوت کا اور قبل از موت خوف شامل ہیں اور دوسرا خوف کائناتی وجود کی لہر کا ہے جو نہ صرف زندگی سے متعلق ہے بلکہ زمانی سمت سے بھی - پہلا خوف اس تاریک احساس کو جنم دیتا ہے۔ آزادی وسعت ایک نئی قسم کا گہرا احساس ہے جو نباتاتی عالم پر انحصار پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے اور ہر فرد کو اس کی اس کمزوری کا احساس دلاتا ہے کہ اسے ہر وقت دوسروں کی قربت ضروری ہے۔ شدت آرزو سے گفتگو وجود میں آتی ہے اور ہمارا تکلم ہی ہمارا مذہب ہے۔ ہر مذہب کی بنیاد یہی ہے۔ مکانی وسعت کے خوف سے زندگی کی دیوی وجود میں آتی ہے اور کائنات فطرت کا مظہر بن کر ابھرتی ہے اور دیوی دیوتاؤں کے مسالک وجود میں آتے ہیں۔ زمانی خوف کے باعث زندگی، جنس اور نسل، ریاست آباؤاجداد کی عبادت وجود میں آتے ہیں - امتناعات اور ٹوٹم میں یہی فرق ہے کیونکہ ٹوٹم کے نظام میں بھی مذہب کی ایک صورت موجود رہتی ہے۔ اس کے مقدس جلال کے باعث تمام ادراک وجود میں آتا ہے - اس کے باوجود یہ جلال ہمیشہ اجنبی ہی رہتا ہے۔

بلند پایہ مذہب خون کی قوتوں کے خلاف شدید احتیاط کا تقاضا کرتا ہے۔ - اور اس کے حصول کے بعد ہمیشہ گہرائیوں میں جھولتا رہتا ہے تاکہ نوجوان نسلوں کے بنیادی حقوق کو دوبارہ اپنے قبضے میں لے لے "اپنی حفاظت رکھو اور عبادت کرو تاکہ تم ہوس میں مبتلا ہونے سے بچ جاؤ" اس کے باوجود آزادی ہر مذہب کا ایک بنیادی لفظ ہے اور ہر وجود بیدار کی ایک ازلی خواہش۔ اس عمومی صورت میں تقریباً قبل از مذہب احساس کا مطلب ہے آزادی کی خواہش تاکہ شعور بیدار کی آرزو اور شدت تمنا سے نجات ہو - تلاش سے پیدا شدہ خوف کا نام ونشان مٹانے کے لیے اور خودی کی تنہائی کے احساس کو ختم کرنے کے لیے فطرت کی شدید تشریط اور غیر متحرک حدود عالم پیرانہ سالی اور موت کے وجود سے نجات کے امکان کی تلاش قائم رہتی ہے -

نیند بھی ایک قسم کی آزادی ہے "موت اور اس کی بہن نیند" اور شراب طہور عالم مدہوشی روح کی کشاکش کی شدت کو کم کردیتی ہے اور رقص جو فنون لطیفہ کی دیوی ہے اور وجد و حال کی دیگر تمام اقسام۔ یہ تمام عالمی تشویش واضطراب سے نجات کے ذرائع ہیں - یہ شعوری کیفیت سے ایک طرف ہٹ جانے کی صورت ہے۔ اس سے کائناتی وجود سے منقطع ہو کر یا مکان سے آزاد ہو کر زمان میں گم ہوجانے کا اہتمام ہے۔ اس کے لیے ضمیر "ہذا" مستعمل کیاجاتا ہے مگر ان سب ذرائع سے بالاتر خوف سے بچنے کا سب سے بڑا ذریعہ اسی "ہذا" کا عرفان ہے اور وہ مذہب کی بدولت حاصل ہوتا ہے - عالم صغریٰ اور عالم کبریٰ کے مابین کشاکش وہ صورت اختیار کرلیتی ہے جس سے ہم محبت کرسکتے ہیں یا جس میں ہم خود کلی طور پر جذب ہو سکتے

ہیں - ہم اسے "ایمان" کا نام دیتے ہیں اور ہر فرد کی دانش مندانہ حیات کا آغاز اسی سے ہوتا ہے

صرف سرسری ادراک خواہ استخراجی ہو یا استقرائی، خواہ اس کی بنیاد تحسین پر ہو یا نہ ہو- یہ امتیاز ناممکن ہے کہ اس کی علت نمائی کون سی ہے کیونکہ دونوں صورتوں میں اظہار یکساں ہوتا ہے - جب کوئی شے ہمارے لیے حقیقی وجود رکھتی ہے تو ہم اس کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اس کی منطقی اصولوں سے تعلیل کرتے ہیں، جیسا کہ ہم اپنی ذات کو اور اپنی فعالیتوں کا علم رکھتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ ہمارے ہر مسئلہ کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے (علت و معلول) مگر ہر فعل کی علت مختلف ہوتی ہے - ہر معاملے میں علت کا تعین یکساں نہیں ہوتا- یہ صرف مذہبی معاملات تک ہی محدود نہیں بلکہ انسانی غیر نامیاتی منطق میں بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے - کوئی حقیقت کسی لمحے کسی خاص نوعیت کی معلوم ہوتی ہے اور کسی دوسرے لمحے اس کی علت نمائی مختلف معلوم ہوتی ہے - ہر قسم کی فکر ہر شخص کے لیے اس کے اپنے حالات کے مخصوص نظام کی روشنی میں تعین ہوتی ہے - روزمرہ کی زندگی میں ایک علتی رابطہ بعینہ تکرار نہیں کرتا- جدید طبیعیات میں بھی زیرِ عمل مفروضے، سلسلہ علت و معلول کے مطابق جو کسی حد تک باہم منافی ہوتے ہیں پہلو بہ پہلو استعمال ہوتے رہتے ہیں، مثال کے طور پر برقی حرکیات کا نظام اور حرارت کا حرکیاتی نظام دونوں بیک وقت عمل پیرا ہوتے ہیں- اس سے فکر کے مفہوم کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ شعور بیدار کے مسلسل عمل کی وجہ سے ہی ہم ادراک حاصل کرتے ہیں - ہم سب کو یکساں سمجھتے ہیں - حالانکہ ہر فعالیت کی علت مختلف ہوتی ہے -تمام دنیا کا بطور فطرت جائزہ لینے کے لیے ہر انفرادی شعور کو واحد علتی نظام میں ہم آہنگ کرنا ایک ایسی خواہش ہے جو کبھی پوری نہیں ہوسکتی - اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری فکر صرف ایک وحدت کی فعالیت کے طور پر حرکت کرتی ہے اور یہ اعتقاد قائم رہتا ہے- فی الحقیقت یہ صرف ایمان کی قوت ہے جس کی بدولت ہم دنیا کے مذہبی ادراک کی بنیاد بنا سکتے ہیں - اس کا جب بھی بغور مشاہدہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ معبود کا تصور ہی فکر کا لزوم ہے - عارضی دیوتا جو صرف یک روزہ ہوتے ہیں اور حادثاتی امور سے متعلق ہوتے ہیں ان کے متعلق دوبارہ کوئی نہیں سوچتا اور بعض مادی معبود جو مخصوص مقامات اور ٹھکانوں سے متعلق ہیں (چشمے، اشجار، پتھر، پہاڑیاں، ستارے وغیرہ وغیرہ) یا عالم گیر (خدائے افلاک جنگ کا دیوتا دانش مندی کی دیوی) جو کہیں بھی موجود ہو سکتے ہیں - یہ معبود صرف انفرادی خوبی ہی کے حامل ہوتے ہیں ان میں سے ہر ایک کسی ایک علیحدہ فعالیت یا فکر کا دیوتا ہوتا ہے جسے آج خدا کی صفت سمجھا گیا کل اسے خدا مان لیا گیا - کچھ ایسے بھی ہیں کہ آج مختلف دیوتاؤں کا مجموعہ ہیں اور کل ایک واحد اکائی ہیں اور پھر ایک غیر متعین کیفیت ---- بعض ایسے ہیں جن کی کوئی شکل وصورت نہیں اور شے لامدرک ہیں،(محض اصول) اگر انھیں کوئی وجود عطا کر دیا جائے تو وہی مادی صورت اختیار کرکے شئے مدرک میں تبدیل ہوجائیں گے   کلاسیکی فلسفے میں مقدر اور ہندوستان میں کرما، کی کوئی نہ کوئی بنیاد موجود ہے اور اس کی روحانیت کی ہیئت تراشی جاسکتی ہیں- اس کے بر خلاف مجوسی قضاؤ قدر کا تعلق ایک ایسے بر تر خداوند وحدہ لا شریک سے ہے جس کی کوئی ہیئت (شکل وصورت) نہیں- مذہبی فکر ہمیشہ اقدارِ اعلیٰ کی تخلیق کرتی ہے اور اعلیٰ اصولوں کی سمت رہنمائی کرتی ہے اور خدائے برتر کی طرف لے جاتی ہے جو ایسی ذات ہے کہ تمام اسباب وعلل کی مالک ہے- تمام مذاہب اور ادراک کے نظام

ہائے فکر میں اسے مسبب الاسباب تسلیم کیاجاتا ہے - اس کے بر خلاف سائنس کو جامع طور پر مبادیات کی تفہیم کے لیے استعمال کیاجاتا ہے جو اسباب وعلل میں امتیاز کے لیے ضروری ہیں - جو کچھ سائنسی علوم سے معلومات حاصل ہوتی ہیں ان کی حیثیت قانون کی ہے قضا و قدر یا نظامِ عالم کی نہیں-

علت کا ادراک آزادی سے ہمکنار کرتا ہے- تلاش کردہ سلسلے پر اعتماد عالمی خوف کو پسپائی پر مجبور کر دیتا ہے- خدا انسان کے لیے اس انجام سے پناہ مہیا کرتا ہے، جیسے وہ تجربہ ہائے حیات سے محسوس کرتا ہے مگر اس کے متعلق سوچنے سے گریز کرتا ہے اور اس کی شکل و صورت یا نام کا تعین نہیں کرتا اور اس طرح وہ اسے کچھ عرصے کے لیے معرض التوا میں ڈال دیتا ہے اور یہ التوا صرف اسی وقت تک ہوتا ہے جب تک کہ شدید خوف کی حقیقت کا ادراک نہیں ہوتا(یعنی اسے دیگر عوامل سے الگ نہیں کیا جا سکتا)- جب پس منظر میں اسباب و علل کے وجود کی شناخت ہو جاتی ہے تو پھر بصارت اور بصیرت دونوں اس کا ادراک کرلیتی ہیں- یہ ایک مایوس کن معمہ ہے جس میں اعلیٰ ذہانت کا انسان وجود کے مسلسل تضادات کو اپنے پختہ عزم کی بدولت حل کرلیتا ہے اب وہ اس کی حیات کی خدمت ترک کر دیتا ہے مگر اس پر حکمرانی کی اہلیت سے محروم ہے اور اس کے نتیجے میں اہم اتفاقات لاینحل عناصر کی صورت میں رہ جاتے ہیں ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان سے آزاد قرار دے لے اور ہر شخص اس کے نتیجے میں محسوس کرے گا کہ اس کی تشریط مکمل ہو چکی ہے- اگر کسی شخص میں اتنا حوصلہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو تشریط شدہ تسلیم کر سکے تو اسے یہ احساس ہو گا کہ اس نے آزادی حاصل کر لی ہے (گوئٹے)-

ہم عالم کے علتی مسائل کو فطرت کا نام دیتے ہیں جبکہ ہمیں اس کا یقین ہو جاتا ہے کہ مزید کوئی رائے اس میں تغیر پیدا نہیں کر سکتی -یہی" صداقت ہے- "حق" حقائق قائم ہوتے ہیں اور زبان سے متاثر نہیں ہوتے مطلق العنان فرماں روا جس کا تاریخ یا انجام سے کوئی تعلق نہیں اور اس کا ہماری زندگی کے واقعات اور موت جیسے واقعات سے بے نیاز ہے -یہ حادثات ہمارے لیے بھی داخلی آزادی، اطمینان اور نجات کا ذریعہ بنتے ہیں کیونکہ موت سے اس دنیا کے لا تعداد مصائب حادثات و واقعات سے آزادی نصیب ہوتی ہے، مگر جیسا کہ دماغ میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ انسان تو چلا جاتا ہے مگر حق، باقی رہ جاتا ہے-

ہمارے ماحول کی دنیا میں کچھ نہ کچھ محکم بنیادوں پر استوار ہوتا ہے جو جامد اور مبہوت کن ہے انسان کے متعلق عرفان زیادہ مشکل نہیں خواہ یہ از منۂ قدیم کے مطابق جادو ٹونے سے متعلق ہو یا دورِ جدید کے طریق کار کے مطابق کوئی ریاضی کا کلیہ ہو- آج بھی فطرت کے میدان میں فتح کا احساس ہر تجربے کی کامیابی کے ساتھ منسلک رہتا ہے جس سے کسی نہ کسی حقیقت کا تعین ہو جاتا ہے- خواہ وہ خدائے افلاک کے مقاصد اور اختیارات کے متعلق ہو یا طوفانی ارواح یا ارضی عفریت ہو یا طبیعی علوم کے معبود سے متعلق ہو (جوہری سائنس اشعاع نور یا کشش ثقل) یا پھر تجریدی معبود کا تصور، جسے انسان خود اپنے تصور کے تحت تخلیق کرتا ہے (تصور- زمرہ -استدلال) اور اس کا تعین کرنے کے لیے اسے سلسلہ علت و معلول میں منجمد کر لیتا ہے-

اس غیر نامیاتی قتل کن' احساس کے محافظ کے تجربے میں جو انسانی ادراک اور تجربہ حیات کی دو صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے ۔ نظریہ اور طریق کار اگر یہی حقیقت زبان مذہب میں ادا کی جائے تو اسے اساطیر اور مسلک کا نام دیا جائے گا۔ اس کے مطابق اگر قائل مذہب اپنے اردگرد کی دنیا کے راز ہائے سربستہ افشا کرنا چاہے یا انھیں محفوظ رکھنا پسند کرے' دونوں صورتوں میں انسانی ادراک کے اعلیٰ معیار کا مظاہرہ ہو گا۔ یہ دونوں کیفیتیں یا تو خوف کا نتیجہ ہوں گی یا محبت کا۔

خوف پر مبنی اساطیر بھی موجود ہے جیسا کہ بچی کاری' اور زمانہ قدیم کی اساطیر عشق' اس کی مثالیں ابتدائی عیسائیت اور روی تصوف میں ملیں گی ۔ اسی صورت میں ذاتی اندفاع کا طریق کار بھی موجود ہے اور ایک اور طریق کار مفروضات سحر کا ہے اور قربانی اور عبادت میں امتیاز اسی بنیاد پر قائم ہوتا ہے اور انھیں بنیادوں پر ابتدائی اور بالغ نظر انسان کی نشاندہی ہوتی ہے۔ مذہبیت ایک روحانی صفت ہے' مگر مذہب ایک ذوق یا استعداد یا ذہانت کا نام ہے۔ نظریہ بصارت کا مطالبہ کرتا ہے بلکہ نورانی بصیرت کا جو کچھ لوگوں کے پاس بہت کم ہوتی ہے اور کچھ کے پاس بالکل نہیں ہوتی ۔ یہ عالمی تصور کی ایک صورت ہے جو اپنی ابتدائی حالت میں ہے کیونکہ جو کچھ انسان کو نظر آتا ہے وہ تو صرف قوت کا (یا اختیار کا) کارخانہ ہے (یا شہری زندگی کے خشک حقائق کے مطابق خوف اور محبت دونوں کے بغیر محض تجسس) جس میں قانون فطرت کی حکومت ہے۔ امتناعات اور ٹوٹم کے راز معبود پر اعتقاد اور روح پر اعتقاد کا نتیجہ ہیں اور نظریاتی طبیعیات اور حیاتیات کے اصولوں کے تحت سمجھے جاتے ہیں ۔طریق کار ذہانت اور معاملات کی سمجھ بوجھ کو لازمی عطا سمجھتا ہے۔ نظریاتی انسان تنقید کی نگاہ سے مشاہدہ کرتا ہے اور صناع ایک پجاری ہے' مگر جو حقائق کو دریافت کرتا ہے وہ پیغمبر ہے ۔

وہ مطالب جن میں کہ ذہانت کی تمام قوت اپنے آپ کو مرکز کرتی ہے وہ حقیقت کی قوت ہے' جس کو کلام کے بصیرت سے حاصل کیا جاتا ہے ۔ہر شعور بیدار اس کے جوہر کا امتیاز نہیں کر سکتا ۔تصوری محدودیت جو قانون ابلاغ نام عدد پر مشتمل ہے اس سلسلے میں ممد ثابت ہوتی ہے۔لہٰذا ہر دیوتا کی شعبدہ بازی کی بنیاد اس کے اصل نام' رسوم و روایات کے عمل اور قربانی جو کہ عمل میں لائی جاتی ہے جس میں کہ مستعمل الفاظ اور طریق کا درست ہونا لازم ہے اس کے اطلاق نہ صرف قدیم جادو پر ہوتا ہے بلکہ اس قدر ہمارے طبیعی (بالخصوص طبی) طریق کار پر بھی ہے ۔اسی سبب سے ریاضی میں تقدیس کے اطوار پائے جاتے ہیں اور وہ باقاعدہ طور پر مذہبی ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔(فیثاغورث ڈیکارٹیز اور پاسکل)۔ تصوف کے بعض سلسلوں میں اعداد کی تقدیس تسلیم کی جاتی ہے (۳:۷:۱۲) ہر مذہب میں اور متعلقہ آرائش (جسے مسکی فن تعیر میں معراج حاصل ہے) میں بھی اعداد کو مختلف صورتیں میں پیش کیا جاتا ہے۔یہ جامد اور مجبور کن صورتوں ہوتی ہیں۔ اظہار خیال کا ذریعہ اور علامات ابلاغ کا کام دیتے ہیں ۔انھیں عالم صغریٰ میں شعور بیدار اس غرض سے استعمال کرتا ہے تاکہ عالم کبریٰ سے اس کا رابطہ استوار رہے مقدس نشانات کے ہنر میں انھیں مدرکات کہا جاتا ہے اور سائنس میں قوانین کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ فی الحقیقت یہ دونوں

نام اعداد ہی کے ہیں اور قدیم انسان ان میں اور جادو میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتا تھا۔ جبکہ اس کے گاؤں کا پجاری ان کی مدد سے بھوت پریت پر حکمرانی کرتا تھا اور جدید دور میں مہندس ان ہی کی مدد سے اپنی مشینیں چلاتا ہے۔

اولیں طور پر اور غالباً واحد نتیجہ جو انسانی عزم ادراک نے پیدا کیا ہے وہ ایمان ہے ۔میں سمجھتا ہوں کہ مابعدالطبیعیات خوف کے مقابلے میں یہ سب سے عظیم 'کلہ' ہے اور اسی کے ساتھ ہی یہ مظہر محبت بھی ہے۔ اگرچہ کسی کی تحقیقات اور ذخیرہ علوم اچانک اپنے عروج کی منازل طے کر لیں اور فیصلہ کن مراحل میں داخل ہو جائیں پھر بھی اس کا اپنا احساس اور ادراک اس وقت تک بے معنی رہے گا جب تک دوئی اور اجنبیت کا اختتام نہیں ہوتا ۔جب تک کہ اس کی یقینی صورت سامنے نہ آجائے (ایمان کے بعد یقین یعنی اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب) سلسلہ علت و معلول کے عمل میں بھی ایمان و ایقان کا وجود لازمی ہے۔ لہٰذا ارفع ترین ذہنی صلاحتیں بھی انسان کے لیے استقرائی فکر پر مبنی گفتار سے متعلق ہیں۔

یہ کسی شے پر پختہ ایمان اور اعتقاد ہی ہے جو اسے عام زمانی روش اور انجام سے محفوظ رکھتا ہے جو اس نے غور و فکر سے قبول کیا ہے اور اس کا نام اور عدد کا تعین کر لیا ہے ۔ پھر وہ کیا چیز ہے جو حتمی تجزیے میں بھی سامنے نہیں آتی ؟ کیا وہ کائنات کی کوئی خفیہ منطق ہے جس سے رابطہ ہوا تھا پھر وہ صرف سلوطہ یا نیم رخ سایہ ہے ؟ یہیں سے تمام آرزوئیں او کشاکش دوبارہ وجود میں آ جاتی ہیں اور بے تاب تلاش و تجسس اس نئے شک کے ازالے کے لیے سرگرداں ہوجاتے ہیں ۔ ممکن ہے کہ اس عمل میں مایوسی کا سامنا کرنا پڑے ۔ ایسے حالات میں اسے کوئی قابل حصول مقصد متعین کرنا چاہیے ۔ وہ مقصد یہ ہے کہ اس حتمی شے پر ایمان لایا جائے جس کے دروازے سب پر کھلے ہیں اور پریشان خیالی کو ترک کر دیا جائے کیونکہ اس تشکیک کا یہی باعث ہے جو ناقابل حصول رازوں کا بقیہ ہے ۔ اس دنیا کے ہر کونے کھدرے کو منور کرنا ہوگا اس کے بغیر نجات کی کوئی دوسری صورت نہیں ۔

یہی وہ مقام ہے جہاں اعتقاد اس بے یقینی غالب آ جاتا ہے ۔ جو علم کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے بلکہ صحیح یہ ہے کہ متعلقہ پر اعتقاد ہی اس کا باعث ہوتا ہے کیونکہ آخرالذکر انحصار زیادہ تر اول الذکر ہی پر ہوتا ہے ۔ اگرچہ یہ عقبی اور مصنوعی ہوتا ہے اور بہت حد تک قابل اعتراض بھی---- مزید برآں مذہبی نظریات---- جو معتقدین کے تصورات کا نتیجہ ہیں---- پجاریوں کے طریق کار کی رہنمائی کا نتیجہ ہوتے ہیں ۔ مگر سائنسی نظریات اس کے برعکس' اپنے آپ کو روزمرہ کے تیکنیکی علم کی بنیاد پر کرا لیتے ہیں پختہ ایمان جو نور بصیرت القا فوری قابل اعتماد جھلک اس مشقت سے آزاد کر دیتے ہیں جو تحقیقی عمل سے پیدا ہوتی ہے مگر تنقیدی عمل کی بنیاد اس مفروضے پر ہوتی ہے کہ بالاخر مطلوبہ نتائج ہی دستیاب ہوں گے ۔ یہ صورت تازہ تصورات کے متعلق پیدا نہیں ہوتی بلکہ مسلمہ حقائق ہی سے یہ اطمینان وجود میں آتا ہے مگر تاریخ یہ سبق دیتی ہے کہ اعتقاد پر تشکیک علم میں اضافے کا موجب ہوتی ہے (تنقیدی مناسب ترین موقع

کے بعد) اوراس سے دوبارہ اعتقاد اور ایمان کی طرف مراجعت کی جاتی ہے - نظریاتی علم کے طور پر اپنے آپ کو تفو ستی اعتماد سے آزاد کرلیتا ہے - یہ گویا اپنی ذات کی تباہی کی طرف اقدام ہے - اس کے بعد جوباقی بچ جاتا ہے - وہ سادہ اور تمام تیکنیکی تجربہ ہے -

اعتقاد اپنے قدیم اور غیر واضح حالت میں دانائی کے ایسے برتر منابع کو تسلیم کرتاہے جن کو انسانی لطافت اپنے طور پر کبھی آشکار نہ کر سکتی اور وہ محض وجدانی القا کی بنا پر کم و بیش واضح ہیں - مثلاً" پیغمبرانہ اقوال کی بدولت خواب' معجزات' مقدس تحریروں اور مقدس آوازوں کی وجہ سے واضح ہیں۔ اس کے برعکس تنقیدی مزاج اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ ہرشے کا خود مشاہدہ کرے - یہ نہ صرف اجنبی صداقتوں کو قابل اعتماد نہیں سمجھتی بلکہ ان کے امکانات سے انکار کر دیتی ہے۔ اس کے نزدیک صرف اس علم کا نام ہے جس کی تصدیق ہو چکی ہو اور اگر خالص تنقید محض اس کے معانی کو اس سے خارج کر دے تو یہ ضروری نہیں کہ طویل عرصے تک اشیائے مدرکہ کی حقیقت اوجھل رکھی جاسکے۔ کسی شے کے متعلق یہ حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی حقیقت پردہ اخفا ہی میں رہے گی - یہ ممکن ہے کہ کسی ایک خاص عرصے تک فراموش کر دیا جائے مگر یہ عمل ہمیشہ کے لیے جاری نہیں رہتا - اسی طرح تنقیدی عمل بھی کسی طریق کار کا محتاج ہوتا ہے اور اس طریق کار کی نشاندہی کا امکان پھر تنقیدی عمل ہی پر منحصر ہے - کیونکہ یہ سارا عمل لحاتی فکر کی ترتیب ہی پر ہوتا ہے ایسے علم پر اعتماد جس کا کوئی اصول موضوعہ نہ ہو ایسی سادہ لوحی کی علامت ہے جس کا اظہار دور معقولیت میں کیا گیا ہو - طبیعی علوم کے نظریات کی حقیقت یہی ہے کہ پرانے اعتقادات کو نئے انداز میں پیش کر دیا گیا ہے اور ان سے فائدہ صرف اسی حد تک ہے کہ زندگی کو ان سے مفید فنی طریق کار حاصل ہوتا ہے جس کی کلید یہ علمی نظریات مہیا کرتے ہیں - یہ اس سے قبل کہا جا چکا ہے کہ کسی مفروضے کی قدر و قیمت اس کی صحت کی بجائے اس کی افادیت پر منحصر ہے - مگر وہ دریافتیں جو " حق" کی تلاش میں کی جاتی ہیں اپنے پرامید مفہوم کے مطابق وہ ہمیشہ سائنس کے خالص مفہوم پر پوری نہیں اترتیں - کیونکہ یہ بعض تنقیدی اور تحقیقی نتائج کے متعلق قبل از وقت مفروضات قائم کر لیتی ہیں۔ لہٰذا ان پر عمل جراحی کا امکان باقی رہتاہے جیسا کہ باروق کی سائنس نے رومی مذہب پر جراحی کا عمل ہمیشہ جاری رکھا۔

ایمان اور سائنس کے مقاصد خوف اور تجسس ہیں - زندگی کے تجربات سے نہیں بلکہ کائنات کو بطور فطرت سمجھنے - اگر دنیاکو بطور تاریخ سمجھنے کا مطالبہ کیاجائے تو ان دونوں صورتوں میں اس کی نفی ہوگی مگر شعور بیدار کا راز دو پہلو رکھتا ہے۔ یہ ہمیشہ دو قسم کے خوف سے دوچار رہتا ہے اور اس کا مخالف تخیل داخلی عالم سے متعلق ہے - دونوں ہی میں بعض حقیقی مسائل موجود ہیں اور ان کا میدان عمل بھی اپنا اپنا ہے۔ معبود کو خدا کے لقب سے یاد کیاگیا ہے یہ روح کا میدان ہے لیکن جب دیوی دیوتاؤں کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا جائے تو ان کے معتقدین' تو پھر ان کی قدرو قیمت محض میکانکی رہ جاتی ہے جسے اس دنیا کے حوالے سے دیکھا جا سکتا ہے مگر ان کی روح اور مغز میں کوئی تبدیلی نہیں آتی - وہی کلاسیکی مادیت اور ہیئت مجوسی تصورات میں نور اور ظلمات' فاؤستی ثقافت میں قوت اور مادہ اور اس کی کیفیت ہمیشہ جراحی کی صورت میں

قائم رہتی ہے قدیم دور میں روح پر اعتقاد تھا اور اس کا اختتام ہمیشہ یکساں ہوا - وہی نتائج برآمد ہوئے جو پہلے سے متعین تھے - ماہر طبیعیات اسے داخلی نفسیات کا موضوع سمجھتا ہے اور وہ اسے انسان میں تلاش کرتاہے - اگر یہ کلاسیکی سائنس ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مادی اشیا کی طرح روح بھی مختلف اجزا میں تقسیم کی جاسکے گی - اگر مجوسی روح کی حقیقت یہ (روح اور نفس) ہے۔ اگر فاؤستی روح کا تصور قبول کیا جائے تو یہ (فکر +احساس + ارادہ) روحانی قوتوں کاامتزاج ہوگا۔ یہ وہ صورتیں ہیں جن کو مذہبی وجدان وفکر نے خوف اور محبت کے جذبات کے تحت تخلیق کیاہے۔ ان کے بعد جرم گناہ معافی توبہ ضمیر اجر اور سزا و جزا کے معاملات پیدا ہوتے ہیں جن کو سلسلہ علت ومعلول میں زیر غور لایا جاتاہے -

وجود ایک راز ہے - جونہی ایمان اورسائنس اس کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتے ہیں تو یہ انھیں متوقع غلطی کی طرف لے جاتا ہے - اس کی بجائے کہ ان پر کائناتی اسرار کا انکشاف کرے (جو فعال شعور بیدار کے امکانات کی حدود سے مکمل طور پر باہر ہے) جسم کی معقول حرکت جو آنکھوں کے مشاہدے میں آتی ہے اور ایک میکانکی علتی سلسلہ جسے اس سے حاصل کیا گیا ہے ان سب کا تجزیہ کیا جاتا ہے مگر حقیقی زندگی شعور کی بجائے رہنمائی کی محتاج ہے - "حق" وہی ہے جو پابندی زمان سے آزاد ہے - حق تاریخ اور زندگی دونوں کی حدود سے ماورا ہے - اور اس کے برعکس زندگی تمام سلسلہ ہائے علت ومعلول کے حقائق سے آزاد ہے۔ اس صورت میں تنقید دونوں حالتوں میں خواہ وہ شعور بیدار سے متعلق ہو یا وجود کی تنقید کے متعلق' واقعیت سے بعید اور حیات سے اجنبی ہیں۔ مگر پہلی صورت میں تنقید کا اطلاق کلی طور پر درست ہے کیونکہ اس میں تنقید کا ارادہ اور متعلقہ مقاصد کی داخلی منطق کو زیر بحث لایا گیا ہے' جبکہ دوسری صورت میں یہ کیفیت مفقود ہے۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ ایمان اور علم کے مابین امتیاز یا خوف اور تجسس یا القااور تنقید حتمی امتیاز کا درجہ نہیں رکھتے - علم تو اعتقاد کی آخری صورت ہے مگر اعتقاد اور زندگی وہ محبت جو دنیا سے خفیہ خوف کے باعث وجود میں آتی ہے اور وہ محبت جو جنس سے خفیہ نفرت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے - علم جس کا تعلق غیر نامیاتی سے ہے اور وہ احساس جس کا تعلق نامیاتی منطق سے ہے اسباب اور قضا و قدر' اعتقاد ان سب کابہت بڑا دشمن ہے - اسی پس منظر میں ہم انسان کا اس کے مقاصد اور فکر کی بدولت امتیاز نہیں کرتے بلکہ اس بنا پر کہ کیا وہ مفکر ہیں (قطع نظر اس امر کے کہ ان کی فکر کا موضوع کیاہے) یاکار کن ہیں -

عمل کے میدان میں شعور بیدار اسی وقت سرگرم ہوتاہے جب وہ فنی مہارت کی صورت اختیار کر لے - مذہبی علوم بھی ایک قوت ہیں - انسان نہ صرف اسباب سے کام لیتا ہے بلکہ ان کو اپنی مرضی سے پیدا بھی کرتا ہے۔ وہ شخص جو عالم صغریٰ اور عالم کبریٰ کا عرفان رکھتا ہے ان پر حکومت بھی کرتاہے خواہ اسے یہ علم القا کی وجہ سے حاصل ہوا ہو یا اس کی اپنی محنت سے۔ لہٰذا وہ شخص جو جادو دکھاتا ہے وہ جو شعبدہ باز ہے دونوں کا تعلق انتہائی قریق سے ہے - ایک دیوی دیوتاؤں' سائنسی محرکات سے یا عبادت سے کسی خاص مقصد کے حصول کے لیے مجبور کرتا ہے۔ وہ ایسے رواجات اور قربانیوں پر اس لیے عمل کرتا ہے کہ اس کے نتیجے میں خاطرخواہ نتائج حاصل ہوتے ہیں اور جو کوئی بھی اس طریق کار کو جانتا ہے وہ ان سے فائدہ بھی

حاصل کرتا ہے - وہ ستاروں اور مقدس کتب کا مطالعہ کرتا ہے - اس کے اختیار میں لازمان قوتیں شامل ہوتی ہیں - وہ تمام حادثات سے محفوظ رہتا ہے - علتی روابط جن کا تعلق گناہ اور کفارے سے ہے یا استغفار یا مطلق العنانی' قربانی یا رحم وکرم سے ہے اس کا مقدس ابتدا اور نتائج کا سلسلہ اسے پر اسرار قوتوں کا مالک بنا دیتا ہے - لہٰذا وہ نئے اثرات کا باعث بنتا ہے - لیکن یہ ضروری ہے کہ عمل سے قبل اسے ان پر اعتقاد بھی ہو اس کے بعد ہی وہ ان کی دوسروں کو بھی تعلیم دے سکتا ہے -

اس نقطہ آغاز سے ہم وہ کچھ سمجھ سکتے ہیں (جسے یورپی اورامریکی دنیا نے مکمل طور پر فراموش کردیا ہے) جسے مذہب کے حتمی معانی یعنی اخلاق نیک چلنی کہا جاتا ہے - جہاں پر بھی یہ رجحان صحیح اور مضبوط ہو وہاں روایت اور عمل میں پوری شدت سے رابطہ قائم رہتاہے (بقول لویولا) معراج روحانیت یہی ہے کہ ہرعمل اس انداز سے کیا جائے کہ خدا دیکھ رہاہے جس کی رضا جوئی اور خوشی ہی سب سے اعلیٰ مقصد ہے - مجھے اپنے بچاؤ کے لیے کیا کرناہوگا- یہ "کیا" ہی تمام حقیقی اخلاقیات کی کلید ہے - اس سوال کی تہ میں کبھی کبھی "کب اور کیوں "بھی ان عظیم فلسفیوں کے ہاں بھی پیدا ہوتے ہیں جو صرف اخلاق برائے اخلاق کے قائل ہیں -

مگر وہ اپنے دل میں اعتراف کرتے ہیں کہ انھیں "کیوں" کا بھی احساس ہے اور کچھ ایسے لوگ بھی ہیں' جو ان کو سمجھ سکتے ہیں' صرف علتی اخلاق ہی کا وجود ہے"- یہ صرف اخلاقی بیان کا ایک طریق کار ہے جسے مسلہ مابعدالطبیعیاتی پس منظر میں استعمال کیا جاتا ہے۔

زندگی کے کردار اور تمام کوائف کے علاوہ اخلاق عام برتاؤ کا شعوری اور منصوبہ بند وطیرہ ہے جو ازلی ' ابدی اور عالم گیر طور پر قابل جواز ہے - یہ نہ صرف زمانی قیود سے آزاد ہے بلکہ زمان مخالف بھی ہے اور اسی وجہ سے صداقت' بھی ہے۔ اگر بنی نوع انسان کا وجود نہ بھی ہوتا' اخلاقیات درست اور جائز ہوتا یہ صرف دو از کار تشبیہ نہیں بلکہ نظام دنیا کے اخلاقی غیر نامیاتی منطق کا اظہار ہے جسے فی الحقیقت استعمال میں لایا جا رہا ہے۔ کوئی بھی اس کا اعتراف نہیں کرے گا کہ اس نے تاریخی تقاضوں کو پورا کرنے کے تکمیلی مراحل طے کر لیے ہیں۔ مکان' زمان کی نفی کرتا ہے سچا اخلاقی نظام ایک قانون موضوعہ ہے یقیناً" مکمل ہے اور ہر جگہ ایک ہی ہے۔ اس کی تہ میں ہمیشہ زندگی کی نفی موجود رہتی ہے اور ہمیشہ فنا اور موت کے حوالے غالب رہتے ہیں۔ اس کے تمام جملوں میں نفی کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ اخلاقیات مذہب اصولوں کی بجائے امتناعات پر زور دیا جاتا ہے ۔ تمام امتناعات کی فہرست ان امور پر مشتمل ہے' جن سے دست برداری مقصود ہے۔ عالمی حقائق سے اپنے آپ کو آزاد کر کے قضا و قدر کے امکانات سے پہلو تہی اختیار کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی دوڑ ہے جس میں کوئی انسان اپنے خلاف ہی زور آزما ہو۔ کوئی سخت ترین نظام عقائد اور اس کی مشق ہی سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی عمل بھی کسی علت یا مسیح کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ یہ عمل صرف خون پر چھوڑ دیا جاتا ہے---- ہر عمل محرکات اور نتائج پر چھوڑ دینا چاہیے اور اس پر احکام کے مطابق عمل

ہونا چاہیے۔ شعور وادراک کی شدید کشاکش کا ہونا لازمی ہے۔ دوسری صورت میں گناہ کی گہرائیوں میں گر جائیں گے۔ اولین طور پر ایسی پرہیزگاری مطلوب ہے جو خون' محبت اور عائلی رشتے پر مبنی ہے۔ محبت اور نفرت انسان کے خمیر میں ہیں مگر دونوں ہی شر ہیں۔ جنسی محبت خدا کی محبت اور خوف کے بالکل برعکس ہے۔ اس لیے یہی بڑا گناہ ہے اسی کی بدولت آدم کو جنت سے نکالا گیا تھا اور انسان پر جرم کا بوجھ ڈال دیا گیا استقرار حمل اور موت جسم انسانی کا مکان میں ہونے کی مدت کا نام ہے اور یہ حقیقت کہ (اس دنیا میں انسانی جسم ہی زیر بحث آتا ہے) سابقہ گناہ اور بعدازاں سزا کا جواز مہیا کرتی ہے (کلاسیکی توضیح کے مطابق جسم روح کی قبر ہے)۔ آرفینی مذہب اس کا اعتراف کرتا ہے ایچی لس اور پنڈر وجود کو علامت قرار دیتے ہیں اور تمام ثقافتوں کے درویش اسے تجسس قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا اس کا ختم کرنا ضروری ہے (اس کے ساتھ ہر شے جو اس سے متعلق ہو) تاریخ کے میدان میں عمل' کارناموں' جرات آزمائی' میدان جنگ میں شادمانی' فتح اور مال غنیمت سب شر ہیں۔کیونکہ یہ ایسے افعال ہیں جن میں کائناتی نبض دروازے پر زور زور سے دستک دیتی ہے اور فکر میں خلل اندازی کرتی ہے تمام دنیا---- دنیا بطور تاریخ کے معانی میں ----کچھ نیک نام نہیں۔ یہ دست برداری کی بجائے جنگ آزمائی کرتی ہے۔ اس میں قربانی کا تصور نہیں۔ یہ واقعات کو ایسی صورت دیتی ہے کہ حق مغلوب نظر آنے لگے۔ یہ بنفس حالات پر نظر رکھتی ہے اور علت ومعلول کی فکر کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ لہٰذا وہ بلند پایہ قربانی جو ایک دانش ور پیش کر سکتا ہے وہ فطرت کو ذاتی تحفے کی صورت میں پیش کر دیتا ہے۔ ہر اخلاقی فعالیت اسی قربانی کا ایک حصہ ہے اور اخلاقی زندگی ایسی قربانیوں کا غیر منقطع سلسلہ ہے۔ سب سے بڑھ کر کسی کی حوصلہ افزائی اور ایسی ہمدردی جس میں کہ کوئی داخلی طور پر مضبوط اور زبردست انسان کسی کمزور اور زیردست پر زیادتی نہ کرے۔ بلند حوصلہ شخص اپنے نفس کو مارتا ہے مگر ان ہمدردانہ جذبات کو ہمیں مذہب کے تصور کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہیے' نہ ان منتشر خیالات کے ساتھ پیوستہ کرنا چاہیے جن کا روز مرہ زندگی میں سستی جذبائیت کے تحت مظاہرہ ہوتا رہتا ہے۔ وہ شخص جو نہ تو خود پر قابو رکھ سکتا ہے نہ اس میں بدلہ لینے کی قوت ہے وہ بھی اس زمرے میں نہیں آئے گا اور ایسے شخص کو تو بالکل ہی نظرانداز کر دینا چاہیے جو نسلی تفاخر کا شکار ہو' یا نظام فتوت کے تحت جرات آزمائی کا مظاہرہ کرتا ہو۔ ان معاملات کو کبھی بھی اخلاقی اور قانونی جواز نہیں دیا جا سکتا بلکہ اسے زیادہ سے زیادہ صاف' واضح اور بدیہی پابندی رواج کہا جا سکتا ہے جو معاشرتی دباؤ یا تشریط کے ساتھ وجود میں آتا رہتا ہے۔ مہذب معاشروں میں جسے معاشرتی اخلاق کا نام دیا جاتا ہے اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں بلکہ مذہب کے متوازی اس نظام کا وجود ہی یہ ظاہر کرتا ہے کہ متعلقہ معاشرے کی مذہبی حالت درست نہیں اور اس کا مابعد الطبیعیات پر یقین زائل ہو چکا ہے جب یہ صورت حال پیدا ہو جائے تو اسے معاشرے میں شدید دباؤ کے تحت بہبود عوام کے نام پر ایسا اخلاقی نظام قائم ہو گا جس میں عزت نفس کی کوئی گنجائش نہ ہو گی۔ اس کے لیے پاسکل اور مل کی اخلاقیات کے متعلق غوروفکر کریں۔ معاشرتی اخلاقیات عملی سیاست کے علاوہ اور کوئی شے نہیں۔ یہ عالمی تاریخ کا بہت متاخر ثمر ہے جس کی بہار (تمام ثقافتوں میں یکساں طور پر) نے اپنے اپنے دور میں ثمروبار پیدا کیے ہیں اور ایسے ایسے اخلاقی نظام پیدا کیے ہیں جو تاریخ اور قضا و قدر کے بار سے سبکدوش ہوتے رہے ہیں۔ ایسے فطری اور مدرکہ معاشرتی ردعمل شرافت کی جبلت کا لقب دیتا رہا ہے۔ ایک

اخلاقی نظام جس میں بے ہودگی کو گناہ نہ سمجھا گیا ہو ایک بار پھر قلعے اور کلیسا کا مقابلہ ہے۔ قلعے کی ثقافت اپنے کردار کی تائید میں استدلال کی محتاج نہیں فی الحقیقت یہ کوئی بھی سوال نہیں اٹھاتی اس کے ضوابط اس کے خون میں ہوتے ہیں جو نبض میں رواں دواں رہتا ہے۔ اس کا خوف کسی سزا یا بریت کا محتاج نہیں۔ وہ صرف بے عزتی بالخصوص خود پیدا کردہ بے عزتی کا حقدار ہے۔ یہ بے غرض یا بے لوث نہیں۔ اس کے برعکس یہ انسانی نفسانی شدت سے پیدا ہوتا ہے مگر رحم وکرم روح کی عظمت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ پس بے لوث بہار ہے جو لطف وکرم کے مجسم افراد اور درویشی کے برگزیدہ اشخاص کو وجود میں لاتی ہے۔ اسیسی کا فرانس اور کلیئرداکس کا برنارڈ جو دوسخا کے مجسمے تھے جو ذاتی قربانی کو اپنے لیے برکت سمجھتے تھے ان کے اندر دنیا کا تحلیل ہو چکا تھا۔ان کی اخلاقیات میں غیض وغضب نہ تھا اور وہ زمانی اور تاریخی حدود میں مقید نہ تھے۔ عالمی خوف ان کی بے لوث اور بے غرض محبت میں علیل ہو چکا تھا وہ اخلاقی علت ومعلول کے ایسے بلند مقام پر فائز تھے جس کی دور حاضر میں مثال ناممکن ہے۔

خون کی قربانی کے لیے خون کا ہونا لازمی ہے۔ اس کے نتیجے میں ہم جنگ و جدل کے عہد کے جرات آزماؤں ہی میں رہبانیت کی اعلیٰ جھلک کا مشاہدہ کرتے ہیں اگر آپ مکان کی زمان پر فتح کا نظارہ دیکھنا چاہتے ہوں تو کسی جنگ جو کی رہبانیت میں منتقلی میں دیکھیں وہ پیدائشی خواب دیکھنے والا اور کمزور نہیں ہو گا جو خلقی طور پر منجمد قطرہ خون ہو اپنی کمزوریوں کو چھپا لینا آج کل اخلاق سمجھا جاتا ہے۔ اپنے کسی قریبی عزیز سے محبت اور اپنائیت اور مناسب رجحان' یا نیکی کا عمل یا بخشش و عطا کا اس غرض سے مظاہرہ کہ اس وجہ سے سیاسی قوت حاصل ہو سکے یہ کوئی باعزت اخلاق نہیں۔ ایک دفعہ پھر کہا جاتا ہے کہ اعلیٰ اخلاق وہی ہے جو موت کے خوف کی بنیاد پر اختیار کیا جائے۔ اس کا ماخذ وہ خوف ہے جو تمام بنی نوع انسان کے شعور بیدار میں جاگزیں ہے جس کے اسباب و نتائج مابعد الطبیعاتی ہیں وہ محبت جو زندگی پر حاوی ہوتی ہے' ایک شعور جو ہر طرح کے سحر سلسلہ علت ومعلول اور مقدس قوانین ومقاصد میں پنہاں ہے جن کا بطور صداقت احترام کیا جاتا ہے جن کو انسان یا تو کلی طور پر قبول کر لے یا رد کر دے کشائش پیہم اپنی ذات پر نگاہ رکھنا اور تحمل دینا یہ ایسے افعال ہیں جن کی وجہ سے تاریخی وجود عدم ہو جاتا ہے ایک انسان کو یا تو ہیرو ہونا چاہیے یا درویش۔ ان دونوں کے درمیان معمولی نوعیت کے کردار تو مل جاتے ہیں مگر دانش مندوں کا وجود نہیں ہوتا۔

(۲)

اگر صداقتیں وجود کی لہروں کے بغیر بھی قائم رہتیں تو پھر ان کی تاریخ لکھنے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی۔ اگر کوئی ایک بھی مذہب ازلی اورابدی طور پر سچا ہوتا تو پھر تاریخ مذاہب ایک نا قابل ادراک تصور ہوتا۔ لیکن جب بھی کسی فرد کی زندگی اس عالم صغریٰ میں بہت زیادہ ترقی یافتہ ہو گی' تو وہ ترقی پذیر زندگی پر جھلی کی طرح مڑھ دی جائے گی۔ وہ نبض میں جاری خون کی طرح تحت الجلد کائناتی صراط مستقیم سے بغاوت کرتی رہے گی۔ تشکیک کی تمام صورتوں پر نسل غالب رہتی ہے' ادراک کے ہر لمحے کا مقدر یہی ہے کہ زمان کو

مکان پر حاوی نہ ہونے دے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ازلی صداقتوں کا کوئی وجود نہیں' ہر آدمی کے پاس ان کا ذخیرہ موجود رہتا ہے۔البتہ ان کی مقدار اس کے دورانیہ حیات اور نظام فکر میں اس کے ادراک کے مساوی ہوتی ہے۔ عالم فکر کی نوعیت متعدد تاروں کے جال کی سی ہے جو باہم مربوط ہیں اور کسی خاص دور میں ان کے نظام ربط میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ تمام نتائج علت و معلول کے آہنی سلسلے کی بنیاد پر وجود میں آتے ہیں۔ فکر کو اعتماد ہے کہ اس صورت حال میں کبھی کوئی تغیر رونما نہیں ہو گا' مگر فی الحقیقت یہ زندگی کی صرف ایک موج ہے جو اپنی ذات کی بیداری اور دنیا کو بیک وقت اٹھائے پھرتی ہے۔ مگر ایک وحدت کی حیثیت سے ہر واقعے کی اپنی تاریخ ہوتی ہے۔ حقیقت اوراضافیت باہم دگر قاطع اورنسلی طول بلد کی صورت میں واقع ہیں۔ آخر الذکر مکان سے غافل ہے جبکہ اول الذکر کو زمان کی کوئی پرواہ نہیں۔ منظم مفکر لمحاتی علت و معلول میں گم رہتی ہے۔ صرف قیافہ شناس ہی کیفیات کی حقیقت کو محسوس کر سکتا ہے اورپے بہ پے تبدیلیوں کا اندازہ کر سکتا ہے کہ "حقیقت" کیا ہے۔

یہ اصول دائمی صداقتوں کے لیے بھی کار آمد ہے۔ جونہی ہم دریائے تاریخ میں ان کا تعاقب کرتے ہیں اوران کو نسلوں کے ظہور و عدم کے عناصر کی صورت میں دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے مختصر دورحیات میں کسی ایک مذہب کو ازلی' ابدی'صداقت' تسلیم کرتا ہے جو قضا و قدر نے بوقت و مقام ولادت ہی سے اسے تفویض کر دیا ہے۔ اسی پس منظر میں وہ محسوس کرتاہے' اور جب وہ اس لیے باہر نکلتا ہے تو وہ اپنے اعتقادات کو زمانے کے حالات کے مطابق دیکھتا ہے۔ وہ اپنے مذہب کے کلام اور نوعیت کی سختی سے پابندی کرتا ہے حالانکہ جن امور پر اس کا اعتقاد ہے وہ خود ہی متواتر تغیر کا شکار ہو رہے ہیں۔ عالم بطور فطرت ایک ابدی صداقت ہے اورعالم بطور تاریخ میں یقینی طور پر تبدل پذیر صداقت موجود ہے۔

مذہبی تاریخ کی ایک قلب ماہیت کے فریضے کی نوعیت اس طرح کی ہے کہ اس سے صرف فاؤستی ثقافت ہی عہدہ برا ہو سکتی ہے اور جو صورت حال اس وقت موجود ہے اس سے معاملہ کرنے کو تیار ہے۔ یہ معاملہ وضاحت سے پیش کر دیا گیا ہے اور ہم میں اتنی جرات کا ہونا ضروری ہے کہ ہم اپنے اعتقادات کو بالائے طاق رکھ کے دنیا کی ہر شے کو ایسی نظر سے دیکھیں کہ گویا وہ ہمارے لیے اجنبی ہے لیکن یہ عمل کتنا مشکل ہے جو شخص یہ فریضہ اپنے ذمے لے لے اس میں اتنی قوت ضرور ہونی چاہیے کہ نہ صرف یہ کہ وہ اپنے آپ کو اس التباسی صورت حال سے منقطع کرنے کی ہمت رکھتا ہو اور ان حقائق و اعتقادات سے اپنے آپ کو الگ رکھ سکتا ہو اوران حقائق کو بھی فراموش کر سکتا ہو جن کو وہ عالمی ادراک کا ماخذ قرار دیتا ہو اور ان صداقتوں کو بھی وقتی طور پر نظرانداز کر سکے جن کو وہ تصورات اور راہ عمل قرار دیتا ہو۔ لیکن فی الحقیقت اپنے نظام ہی کا قیافہ شناسی کی بنیاد پر گہرا جائزہ لے۔ گویا ان کی تہ تک پہنچ جائے اور صرف اس صورت ہی میں یہ ممکن ہو گا کہ صرف کسی ایک زبان میں جس میں کہ اس کی ثقافت کا تمام مابعدالطبیعاتی

ذخیرہ موجود ہو' بیان کر کے پھر دوسری زبانوں میں منتقل کرے

اس کے آغاز کے لیے قدیم دور کے پہلے ہزار سال میں موجود بنی نوع انسان کی آبادی کا تصور کریں جو اپنے ماحول سے ہر وقت خائف رہتی تھی' جن کے مسائل ہر آن ان کے سر پر سوار رہتے تھے کیونکہ ان میں کوئی ایک بھی ایسا انسان موجود نہ تھا جو منطقی طور پر ان کا حل پیش کر سکے۔ ان کے مقابلے میں حیوان زیادہ خوش قسمت ہے جو بیدار تو ہے مگر وہ سوچنے سے محروم ہے۔ حیوانوں کو خوف کا احساس ہر واقعہ کے ساتھ ہوتا ہے جبکہ انسان تمام دنیا سے ہر وقت خوف زدہ رہتا ہے۔ اس کی داخلیت اور خارجیت کی ہر شے اندھیرے میں ہے اور کسی کا بھی کوئی حل موجود نہیں۔ ہر عفریت ایک دوسرے سے باہم مربوط ہے جس کا کوئی حل نہیں جس کے عمل کا کوئی قاعدہ قانون نہیں۔ اس کے شب و روز دہشت ناک اور تکلیف دہ مذہب کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ ان میں ایسا کوئی ایک لمحہ بھی نہیں ہوتا' جو مذہبی شعور کی نعمت عطا کرے تاکہ حوصلہ حاصل ہو' اس عنصر سے بھی بہت الگ' عالمی خوف کی ابتدائی صورت بھی موجود ہے' مگر ایسا کوئی اصول موجود نہیں جو محبت عالم کی سمت رہنمائی کرے۔ ہر وہ سنگ گراں جس سے انسان ٹھوکر کھاتا ہے' ہر وہ ہتھیار جو وہ اپنے ہاتھ میں لیتا ہے' ہر وہ پتنگا جو اس کے قریب سے آواز نکالتا ہوا گزر جاتا ہو' خوراک' پناہ گاہ' موسم' یہ تمام کے تمام عفریت ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ اس خوف کا نتیجہ ہے جس میں کہ انسان مبتلا تھا یا وہ انھیں خوفناک صورت میں استعمال کر رہا تھا۔ ایسے تمام عناصر اب بھی موجود ہیں اور ان سے کوئی شخص اسی حالت میں محبت کر سکتا ہے جبکہ اسے ان کے وجود کا یقین ہو۔ محبت آغاز سے قبل کسی عالمی نظام کا مفروضہ قائم کرنا چاہتی ہے جس کے باعث استحکام پیدا ہو۔ مغربی تحقیقی عمل نے اس سلسلے میں بڑی محنت کی ہے کہ نہ صرف انسانی مشاہدات کو دنیا کے طول و عرض سے یکجا کر کے جمع کر لیا جائے اور ان کو اس طرح مرتب کر لیا جائے تاکہ روحانی مدارج میں عرفان ہو (یا آپ اپنی مرضی کے مطابق ان عقائد کا حوالہ دے لیں جن پر متعلقہ فرد عمل پیرا ہوں۔)۔ بدقسمتی سے صرف ایک ہی ایسا مذہب ہے جس نے اس منصوبے کی اقدار مہیا کی ہیں۔ چینی اور یونانی اس منصوبے کو فاؤستی انداز سے مرتب کرتے۔ فی الحقیقت ایسا کوئی تدریج موجود نہیں جو عام انسانی ارتقا کی منزل کا تعین کر سکے۔ قدیم انسان کے اردگرد کی دنیا کے منتشر ادراک لمحہ بہ لمحہ تجربات کی موثر ترجمانی کر سکے تاکہ منزل ارتقا کے حصول کے بعد انسان ہر وقت بالغ نظر مکمل بالذات اور محفوظ نظر آئے - ہر قسم کے اختلافات اور خوف و دہشت سے مامون ہو - اسے ہر وقت ایسے نظام کا سہارا حاصل ہو اور اسے کوئی پرواہ نہ ہو کہ یہ صورت تجریدی ہے یا عالم نوانی کے فکر کا نتیجہ ہے یا یہ کہ یہ ہر وقت خود اس کے اندر موجود ہے۔ اس عالمی تصور میں کوئی ترقی نہیں ہوتی نہ ہی یہ بعض کوائف کا مجموعہ ہے کہ اس میں سے یہ یا وہ منتخب کر لیا جائے (اگرچہ بالفعل ایسا ہوتا ہے) اور ان کا آپس میں زبان' مقام' یا آبادی کے قطع نظر باہمی موازنہ کیا جائے - فی الحقیقت یہ عالمی مذہب کی مختلف صورتیں ہیں جو تمام دنیا میں مروج ہیں (اور کہیں یہ اب برائے نام ہی قائم ہیں پھر بھی انھیں مروج ہی کہا جائے گا)اوران کی بدولت اصل' نمو' توسیع اور خاتمے کا صحیح پتہ چلتا ہے' نیز تشکیل' اسلوب' رفتار اور دورانیہ کی کیفیات کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے - اعلیٰ ثقافتوں کے مذاہب ان عناصر سے ارتقا پذیر نہیں ہوتے بلکہ ان کا

اسلوب ظہور مختلف ہوتا ہے۔ وہ نور میں زیادہ واضح اور دانش مندی میں زیادہ برتر ہوتے ہیں۔ انھیں علم ہے کہ محبت کا مفہوم کیا ہے۔ ان میں مسائل اور تصورات بالکل واضح ہوتے ہیں - اعلیٰ دانش وری کے اصول اور نظریات کا ان میں وفور ہوتا ہے - مگر وہ علامتی تکلفات اور نمائش کو قصہ پارینہ سمجھتے ہیں قدیم لوگوں کا مذہب ہر شے میں دخل انداز ہوتا تھا مگر متاخر اور انفرادی مذاہب خود کفیل اور اپنی دنیا کے خود مالک ہیں۔

لہٰذا سب سے بڑا معمہ وہ ادوار ہیں جو عظیم ثقافتوں کے نمودار ہونے سے قبل گزر چکے ہیں اور زیادہ سے زیادہ اس قابل ہیں کہ ان کی نشاندہی کی جا سکے' مدد سے سمت کا تعین کیا جا سکے - یہ دورانیہ چند صدیوں پر محیط ہے۔ اس کا درست جائزہ لینا ضروری ہے اور اس کا آپس میں موازنہ کر کے خود اس کے نتائج اخذ کیے جائیں' مستقبل کا ماحول اپنے آپ کو کون سی صورت میں تشکیل کر رہا ہے - مجوسی مذاہب کی نظر میں یہی وہ مدت ہے جسے ان مسائل کی دہلیز قرار دیا جا سکتا ہے' جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اس پس منظر میں پیغمبرانہ مذہب پیدا ہوا جس نے مکشوفات تک رہنمائی کی - ایسا کیوں ہوا کہ یہ مذہب اس مخصوص ثقافت کی تہ تک رچا بسا ہے ؟ یا یہ کیوں ہوا کہ کلاسیکی مذاہب میں مائی سینی معبود جن کی اشکال متعدد حیوانات کے مشابہ ہیں' پائے جاتے ہیں یہ جنگ جوؤں کے معبود نہ تھے جو میگاران اور مائی سیناؤں کے قلعوں کے اوپر بنائے گئے تھے کیونکہ ان اقوام میں آباواجداد کی انتہائی عزت و احترام کے ساتھ پرستش کی جاتی ہے' جیسا کہ ان کے موجود آثار سے ظاہر ہوتا ہے۔ مگر سطحی مقامات پر اور کسانوں کے گھروندوں میں جو بت ملے ہیں' ادنیٰ طبقات کے افراد کے معبود تھے - شمسی مذہب کے انسانی شکل کے دیوتا جو تقریباً گیارہ سو ق م ایک بڑی بغاوت کے بعد وجود میں آئے وہ ان کے ہمہ جہت سیاہ ماضی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان اشکال میں سے شاید ہی کوئی کسی طرح کے عرف یا لقب کے بغیر ہو یا کسی صفت یا ایسی حکایت و داستان کے بغیر جو ان کی اصل کی نشاندہی کرتی ہو - ہومر کے نزدیک ہیرا کی آنکھیں گائے کی طرح تھیں اور زیئو دیوتا کی شکل بیل نما تھی اور پوزیدان تیلپوپاپاسان روائتی گھوڑے تھے - اپالو (شمس) متعدد دیوتاؤں کا نام تھا' پھر وہ بھیڑیا بن گیا (لائی کائی اوس) - رومی مریخ کی طرح جو اب ڈولفن مچھلی کی شکل کا تھا تو پھر سانپ کی شکل اختیار کر گیا۔ سانپ بھی زیئو ملیشس کا مظہر ہے۔ یہ شکل یونانی قبروں پر اکثر کندہ ہے۔ اس کے علاوہ ایس کلی پی اس اور فوریس بلکہ ایس چی لس کی اشکال بھی تراشیدہ ہیں۔ آرکیڈیا میں گھوڑوں کے سروں والے ڈی میٹرفی گالیا کے مندر میں دستیاب ہوئے ہیں۔ آرکادی آرٹی مس کاسٹو' مادہ ریچھ نظر آتی ہے' نیز ایتھنز میں آرٹی مس براؤ رونیا کو ریچھ ہی کہا جاتا تھا ڈائنا جسے اب بیل کی شکل عطا کر دی گئی ہے کبھی کبھی بارہ سنگھے کی شکل میں نظر آتی ہے اور پان دیوتا میں کسی درندے کا عنصر آخر تک قائم رہا۔ ساتکی مصری روح بائی کی طرح' روح کے پرندے کی شکل کا تھا۔ متعدد دیوتاؤں کے حیوان نما مجسمے قدیم کلاسیکی فطرت کی تصویر پیش کرتے ہیں

اب دیکھنا یہ ہے کہ مارو ونجی قدیم مذاہب کی شکل و صورت کیا تھی؟ جس نے رومی بغاوت کی رہنمائی کی جو کہ اس عہد میں برپا ہوئی۔ بظاہر یہ دونوں ایک ہی مذہب نظر آتے ہیں' جب ان کی تہ میں

اختلاف کا وجود دیکھتے ہیں تو اس سلسلے میں عیسائیت ہماری کوئی مدد نہیں کرتی (مگر ہمیں اس کے متعلق پوری وضاحت ہونی چاہئے)۔ کیونکہ قدیم نوعیت کا مذہب اس کے ذخیرہ عقائد میں موجود نہیں مگر صرف روحانی انداز میں یہ اپنے احساسات، تکلم اور افکار میں ان کا شریک ہے۔ طالب علم کو اس کا علم ہونا چاہئے کہ قدیم عیسائیت (زیادہ صحت کے ساتھ مغربی کلیسا کی ابتدائی عیسائیت) دوبار ایک قدیم دیوی کی اظہار کا ذریعہ ثابت ہوئی اور اس طرح اس نے ایک قدیم مذہب کی شکل اختیار کر لی جسے کیلٹی۔۔۔ جرمانک مغربی مذہب کے نام سے موسوم کرنا ہو گا۔اس کا دور ۵۰۰ تا۹۰۰ء تھااور روس میں آج تک موجود ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان مذاہب کو ترک کرنے والوں کو دنیا نے کس انداز میں دیکھا؟باز نطینی تعلیم سے آراستہ چند پادریوں کے سوا ان رواجات اور عقائد کے متعلق عام لوگوں کی رائے کیا تھی؟طور کا بشپ گریگوری کہتا ہے کہ ہمیں جسے یاد رکھنا چاہیے، وہ اپنی نسل کا ذہین ترین شخص تھا جو ایک دفعہ کسی درویش کی قبر سے خاک لے کر جسم پر ملتا ہوا دیکھا گیا تھا۔وہ یہ کہہ رہا تھا کہ 'اے درویش تو جو تمام اطبا سے زیادہ برتر ہے جو سقمونیہ کی طرح تمام داغوں کو دھو دیتی ہے اور اس طرح ہمارا ضمیر پاک ہو جاتا ہے۔ اس کے نزدیک قتل مسیح ایک جرم تھا جس سے اسے شدید نفرت تھی مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ حیات ثانی کو وہ اس کے برعکس ایک بے معنی تصور سمجھتا تھا۔وہ اپنے آپ کو جسمانی تربیت یافتہ کسرتی کہتا تھا۔اور اپنے آپ کو اصل نجات دہندہ قرار دیتا تھا۔وہ داستان آرزو کے صوفیانہ معانی سے قطعاً" ناآشنا تھا

روس میں ۱۵۵۱ء میں سو پادریوں پر مشتمل ایک مجلس کے فیصلے، ایک قدیم نظام اعتقاد کی نشاندہی کرتے ہیں۔داڑھی مونڈھنے اور صلیب کے غلط استعمال پر سزائے موت دی جا سکتی تھی۔ایسے گناہگار شیاطین کے چیلے تھے۔۱۶۶۷ء کی مسیح مخالف مجلس کے نتیجے میں راسکول تحریک سے متعدد لوگ علیحدہ ہو گئے کیونکہ اس کے بعد صلیب کا نشان دو انگلیوں کے بجائے تین سے ظاہر کرنا لازمی ٹھہرا اور مسیح کے نام کا تلفظ یسوس قرار پایا۔اور یسوع یا عیسیٰ کا نام ترک کر دیا گیا اور اس کے نتیجے میں ایماندار لوگوں پر جادو کا اثر نہ ہو سکے گا   مگر اس خوف کے اثرات نہ تو صرف واحد وجہ تھی نہ یہ اتنی اہم وجہ تھی۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ مرودنجی عہد میں اس کا معمولی شائبہ بھی نہیں پایا جاتا اور اس روشن داخلیت اور آرزو کے مابعد الطبیعیاتی سمندر میں ڈوب جانے کا گمان بھی نہیں تھا، یہاں تک کہ مجوسی کشوفات کا دور آ گیا اور (۱۹۱۱۔۲۱۷ء) کی مقدس مجلس کا روس میں انعقاد ہوا۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ پیٹر اعظم کے دور سے راس کولینی کی تحریک تجرد تک، افلاس زیارت، فنائے ذات اور رہبانیت اس قدر خوفناک اور شدید صورت میں مروج نہ تھی؟اور سترھویں صدی میں اس نے ہزاروں انسانوں کو مذہبی شعور میں مبتلا کر دیا تاکہ وہ اجتماعی طور پر شعلوں میں کود جائے۔ کلا ئستیوں کے عقائد روسی مسیحوں کے ساتھ مل کر (جن میں سے ابھی تک سات کا شمار ہو چکا ہے)، دخابرین اپنی کتاب حیات کے ساتھ جسے وہ اپنی بائبل کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس میں مسیح کی وہ مناجاتیں شامل ہیں جو اس سے زبانی روایت کی گئی ہیں اپنے خوفناک قطع وبرید عقائد کے ساتھ ایسے حالات پیدا کر دیے۔جن کے بغیر ٹالسٹائی اور مروجہ نظام کبھی وجود میں نہ آتے اور سیاسی انقلاب کا وجود بھی نہ ہوتا   اس کی کیا وجہ ہے کہ فرا کش کے دور کے ساتھ اس عہد کا موازنہ بدمزہ اور سطحی نظر

آتا ہے ؟کیا صرف آرامی اور روسی ہی مذہب کے ٹھیکیدار ہیں؟ (جیسا کہ ان فیصلہ کن صدیوں میں دیکھا گیا۔)۔کیا ظالمانہ روایات کی تقدس تباہ کر دی گئی ہے؟

(۳)

قدیم مذاہب کا کوئی وطن نہ تھا۔ یہ بادلوں اور ہوا کی طرح تھے۔ قدیم باشندوں کے گروہ حادثاتی طور پر اور ترک وطن کر کے کسی ایک مقام پر جمع ہو جاتے۔اس لیے ان کا اصل مقام ہمیشہ معمہ ہی رہا۔ ان کا باہمی تعلق صرف دفائی نقطہ نظر پر ہوتا جو ان پر تھوپ دیا جاتا اور سرایت کر جاتا۔وہ کسی مقام پر رک جائیں یا آگے بڑھتے جائیں، کیا وہ کسی تبدیلی کو قبول کریں یا نہ کریں جہاں تک ان کی داخلی اہمیت کا تعلق ہے یہ سوالات ان کے لیے بے معنی تھے۔

ان حالات کے تحت بلند پایہ ثقافتوں کے باشندے ارضی حدود کے تحت مختلف علاقوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں مگر ان کی مادر وطن کی سرزمین ان کے اظہار میں بار بار نمایاں ہوتی رہتی ہے اور بالکل ریاست کے انداز میں۔ مندر، اہرام اور کلیسا اپنی تاریخ کی تکمیل کے لیے مجبور ہیں کہ ان کے تصورات کہاں وجود میں آئے تھے اس لیے بڑے مذہب کا زمانہ عروج اس کے وجود کی تمام جڑوں سے لے کر اسی سرزمین تک جہاں اس کا عالمی تصور پروان چڑھا ہے، سب کی نشاندہی ضروری سمجھتا ہے۔ پاکیزہ اعمال اور عقائد دور دور تک پھیلائے جا سکتے ہیں مگر ان کی داخلی قوت ان کے مرز بوم ہی میں پھلتی پھولتی ہے۔ اس امر کا کوئی امکان نہیں کہ کلاسیکی سروں کے نظام کا ذرا سا شائبہ بھی گال میں دریافت ہو سکے یا فاؤستی عیسائیت کے عقائد کا سراغ امریکہ میں لگایا جا سکے۔ جہاں کہیں کسی تحریک کا تعلق اپنے وطن سے کٹ جاتا ہے اس میں شدت آ جاتی ہے اور وہ جامد ہو جاتی ہے۔

یہ صورت ہر معاملے میں بڑے شہر کے انداز میں ہوتی ہے۔ خوف اور دفاع کے بدمزہ خلط ملط کے نتیجے میں خالص داخلی بیداری اچانک وجود میں آ جاتی ہے اور اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے، بالکل ایک درخت کی طرح مادر ارض سے اور عمق عالم نور سے آشنا ہو کر اسے واحد زاویہ نگاہ سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ جہاں کہیں بھی مفہوم زندگی میں مشاہدہ نفس کا مسئلہ درپیش ہو، تو اس تبدیلی کو نہ صرف خوش آمدید کہا جاتا ہے بلکہ اسے داخلی نمود نو تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس لمحے نہ اس سے قبل اور نہ (بالکل سابقہ گہری شدت کے ساتھ) اس کے بعد ـــــــیہ زمان نور کا انتخاب کر لیتی ہے اور منتخب روح کی حیثیت حاصل کر لیتی ہے اور اس طرح خوف کے تمام خطرات محبت کی برکت میں تحلیل ہو جاتے ہیں اور غیر مرئی کا ظہور جتنا کم ہو اس سے مایوس نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہ کسی بھی لمحے اچانک مابعدالطبیعیاتی اشعاع میں ظہور پذیر ہو گا۔

یہ وہ صورت حالات ہے جس میں کہ ہر ثقافت اپنی اعلیٰ علامت کا اظہار کرتی ہے ہر ایک میں محبت

کی مخصوص نوعیت ہے ہم اسے فلکی کہہ سکتے ہیں یا پسند کریں تو مابعدالطبیعیاتی بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کی مدد سے انسان سوچتا سمجھتا اور اپنے آپ کو خدا کے حوالے کرتا ہے جو کچھ باقی ثقافتوں کے پاس رہ جاتا ہے وہ نہ صرف ناقابل رسائی ہے اور بے مقصد بھی ہے۔ کیا یہ کائنات کسی روشن گنبد کے نیچے قائم ہے جیسا کہ مسیح اور اس کے حواریوں کا تصور تھا؟ یا صرف ستاروں بھری گم ہو جانے والی لامتناہیت ہے؟ جیسا کہ جیانو برونو نے اسے محسوس کیا۔ کیا ارفیسی اپنے جسمانی خداؤں کو اپنی ذات کے اندر جذب کر لیتے ہیں؟ یا افلا طینس کی روح حالت وجد و سرور میں خدا کی روح سے الحاق کر لیتی ہے؟ یا سینٹ برنارڈ اپنے صوفیانہ اتحاد میں لامختتم قوت کے ساتھ متحد ہو جاتا ہے۔ روح کی شدید آرزو صرف اپنی ثقافت کی علامات کے ساتھ زیر عمل آتی ہے۔ علاوہ ازیں اور کچھ نہیں جو اس پر اثرانداز ہو سکے۔

شاہان مصر کے پانچویں خاندان میں (۲۶۸۰ ۔ ۲۵۴۰) جس کے بعد عظیم اہرام تعمیر کیے گئے جوردس عقاب کا مسلک مروج تھا جو جلد ہی ختم ہو گیا۔ قدیم مقامی مسالک بالخصوص ثوت کا مذہب' ہرموپولس جس کا پیرو کار تھا' پس منظر میں چلا گیا اور شمس پرست مذہب دوبارہ مروج ہو گیا۔ چنانچہ اس کے مقبرے سے مغرب کی طرف ہر بادشاہ نے سورج کے تحفظ خانے تعمیر کرنے شروع کر دیے اس نے انسانی زندگی کی ایسی علامت کی صورت اختیار کر لی جو ولادت سے قبر کے تعویذ تک حاوی رہتی۔ فی الحقیقت اسے عظیم اور ابدی علامت کی حیثیت دے دی گئی۔ زمان و مکان کو وجود اور وجود بیدار کی حیثیت حاصل ہوئی قضا و قدر اور سلسلہ علت و معلول ایک دوسرے کے بالمقابل آ گئے مگر دنیا کے کسی اور فن تعمیر میں یہ علامات استعمال نہیں کی گئیں۔ دونوں کو ایک حریصانہ طریق کار رہنمائی مہیا کرتا ہے کیونکہ سورج کے ساتھ جو دیواری نقش و نگار بنائے گئے ان میں سورج دیوتا کی قوت کا حیوانی اور نباتاتی دنیا پر حاوی ہونا اور موسموں کی تبدیلی شامل تھے۔ کسی دیوتا کی صورت یا مندر تعمیر نہ کیے گئے بلکہ صرف سنگ جراحت سے تیار کردہ ایک قربان گاہ ہر گھر کی پیش گاہ میں بنا دیے گئے۔ صبح سویرے جب سورج طلوع ہوتا' تو خود فرعون بھی گھر کے اندھیرے سے نکل کر اسے خوش آمدید کہتا۔

یہ جواں فکر داخلیت دیہاتی زندگی ہی میں وجود میں آتی ہے اور جھونپڑوں' مقدس مقامات' تنہا خانقاہوں اور صومعات میں پرورش پاتی ہے۔ یہاں اعلیٰ باخبر معاشرہ وجود میں آتا ہے جسے روحانیت سے رغبت ہوتی ہے۔ داخلی طور پر وہ تمام دنیا سے الگ ہوتا ہے۔ اس کے وجود میں بہادری اور جرات آزمائی کی لہریں موجزن ہوتی ہیں۔ معاشرے کے دو بڑے طبقات پجاری اور شرفا جو کلیساؤں میں غور و فکر کرتے ہیں اور قلعوں کے سامنے کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں' نیکی اور شریفانہ رواجات سے ان کی خصوصی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ خلیفہ اہلِ ایمان کا دنیاوی بادشاہ بھی تھا   فرعون نے دونوں مقامات پر قربانیاں پیش کیں۔ اگرچہ جرمن بادشاہ نے اپنے خاندان کا گھر گرجے کے نیچے تعمیر کیا مگر دو مختلف معاشرتی نظاموں اور زمان و مکان کے افتراق کو کوئی ختم نہ کر سکا۔ مذہبی تاریخ اور سیاسی تاریخ' صداقتوں کی تاریخ اور واقعات کی تاریخ دونوں کا دائرہ کار علیحدہ علیحدہ ہے اور ان کا باہمی ادغام نہیں ہو سکتا۔ ان کا اختلاف کلیسا اور قلعے سے شروع ہوتا

ہے۔

مگر قصباتی اضافہ پذیر آبادیوں میں اس میں ترقی ہوتی ہے اور جب تاریخی وسعت اختتام پذیر ہوتی ہے تو یہ دانش مندی اور قوت محض کی جنگ بھی ختم ہو جاتی ہے۔

مگر یہ دونوں تحریکات بنی نوع انسان کے عروج میں شروع ہوتی ہیں۔ کسان اس کے تحت اپنی تاریخ سے محروم رہتا ہے۔ وہ عقائد کی دنیا کا ماہر ہے مگر سیاست سے نابلد ہے۔ درویشوں کے گروہوں کے نوزائیدہ مذہب کے تحت چھوٹے چھوٹے نوآباد قصبوں میں رہبانیت اور تصوف کو فروغ ملتا ہے ۔ اصلاح ' فلسفہ' اور علم دنیا' گلی کوچوں اور چوکوں کے ہنگاموں میں پرورش پاتا ہے۔ روشن خیالی جب بے مذہبی کی صورت اختیار کرتی ہے تو اس کا شعور سنگ و خشت کے پہاڑ نما بڑے بڑے شہروں میں پھیلتا ہے۔ شہروں سے باہر آباد کسانوں کے اعتقاد میں کوئی تبدیلی نہیں آتی وہ دائمی ہوتا ہے اور دائمی ہی رہتا ہے۔ مصر کی عام آبادی کو شمس دیوتا کا کوئی علم نہ تھا۔ اس نے نام تو سن رکھا تھا کیونکہ شہروں میں تاریخ کا ایک بہت بڑا باب معرض تحریر میں آ رہا تھا۔ وہ تو قدیم ثیناٹی معبودوں کی پرورش کیے جا رہا تھا جبکہ چوبیسویں خاندان کا دور آ گیا اور اپنے فلا حینی مذہب کی بنیاد پر اسی نے دوبارہ برتری حاصل کر لی۔ اطالیہ کے لوگ آگسٹس کے زمانے میں بھی اسی طرح عبادت کرتے رہے جس طرح کہ ہومر کے دور سے بھی بہت پہلے کیا کرتے تھے اور آج بھی اپنی اسی روش پر قائم ہیں۔ بڑے بڑے مذاہب کے نام اور عقائد جو پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں اس تک شہروں سے وارد ہوتے ہیں اور انھوں نے اس کے الفاظ کی آوازوں کو بدل کر رکھ دیا ہے مگر اس کے نزدیک متعلقہ الفاظ کے معانی میں کبھی فرق نہیں آیا ۔ فرانسیسی کسان آج بھی مارونجی دور میں رہتا ہے فریا یا مریم' درودی یا ڈومینکی' روم یا جنیوا ' اس کے مغز اعتقاد تک کوئی بھی اپنی رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔

مگر ایک شہری سطح ایسی بھی ہے۔ جس کا معاشرہ مقابلتاً اپنے عقائد پر قائم رہتا ہے۔ وہ اپنا قدیم دیہاتی نوعیت کا مذہب ترک نہیں کرتا۔ ایک اور بھی مقبول عام مذہب ہے جو قصبات کے زیریں طبقے کا ہے اور صوبہ جات میں مروج ہے ۔ کوئی ثقافت جس قدر عروج حاصل کرتی ہے---- وسطانی عہد کی حکومت' برہمنوں کا دور' سقراط سے قبل کا عہد کنفیوشس سے قبل کا دور۔ باروق---- تو ان لوگوں کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے جن کے ہاتھ میں حق و صداقت کی دولت ہوتی ہے اور صرف نام و نمود کا ڈھول نہیں پیٹتے۔ جو لوگ سقراط۔ آگسٹائن اور پاسکل کے ساتھ رہے ان میں کتنے انھیں سمجھتے تھے؟ مذہب میں بھی انسانی مینار بہت جلد بلند ہوتا ہے' جب ثقافت مکمل ہوتی ہے تو یہ عمارت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر جاتی ہے۔

۳۰۰۰ ق' م' کے قریب مصر اور بابل میں دو بڑے مذاہب نے اپنی اپنی راہ حیات کا تعین کیا۔ مصر میں اصلاح کا دور قدیم حکومت کے آخری عہد سے متعلق ہے۔ اسی عہد میں شمسی توحید کی مضبوط بنیاد رکھی گئی۔ اس مذہب میں علما اور پجاریوں کا بہت اثر و رسوخ تھا۔ باقی تمام دیوتا اور دیویاں---- جن کو کسان

اورغربا پوجتے تھے۔ بدستور آبادی کے اس حصے میں مقبول رہے---- اعلیٰ طبقات میں انھیں اوتار یا ری کے خدام سمجھا گیا۔ ہر موپولیس کا مخصوص مذہب بھی' اپنے علم ہیئت کے ساتھ مذکورہ بڑے نظام میں شامل کرلیا گیا' اور ایک مذہبی مکالمے کے نتیجے میں ممبس کے پیرو کاروں کو بھی تخلیق کے بلند تدریجی نظام میں جذب کرلیا گیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ جسٹی نین اور چارلس پنجم کے دور میں شہری حلقوں نے دیہات پر غلبہ حاصل کرلیا۔ اس دور عروج کی قوت کا خاتمہ ہوگیا۔ عقیدہ تو پایہ تکمیل تک پہنچ چکا تھا۔ اس کی مزید کانٹ چھانٹ کے نتیجے میں اور اس کے معقولیت میں اضافے کے عمل نے اس کی اصلاح تو نہیں کی مگر اس کی تشکیلی ہیئت میں کمی واقع ہو گئی۔ وہ فلسفہ جو عقائد سے متعلق وسطانی عہد میں شروع ہوا وہ بارونق سے بھی زیادہ غیر اہم تھا۔

۱۵۰۰ق م سے تین نئی مذہبی تاریخوں کا آغاز ہوا---- پہلا ویدوں کا مذہب تھا جس کا آغاز پنجاب میں ہوا' دوسرا ہوانگ ہو میں چینی مذہب تھا اور تیسرا کلاسیکی مذہب تھا جو بحیرہ آز کے شمال میں پیدا ہوا۔ کلاسیکی انسان کے عالمی تصورات' اعلیٰ علامات اور جسمانی وحدت تو ہمیں نمایاں انداز میں معلوم ہے' مگر عظیم کلاسیکی قدیم مذہب کے متعلق تو اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔ اس کمی کی وجہ سے ہمیں ہومرکی نظموں کا سہارا لینا پڑتا ہے جن کی مدد سے ہماری معلومات میں تو کوئی اضافہ نہیں ہوتا البتہ رکاوٹ ضرور پیدا ہوتی ہے۔ جدید خدائی تصور جو اس ثقافت کا مخصوص مطمح نظر تھا' وہ ایک انسانی جسم ہے جسے بار بار پیش کیا گیا ہے۔ ہیرو خدا اور انسان کے مابین ثالث کا کردار ادا کرتا ہے---- یہ عمل اس قدر کثرت سے ہوتا ہے کہ الیڈ میں بھی اس کی شہادت موجود ہے۔ یہ جسم ممکن ہے کہ شمس دیوتا نے منور کیا ہو یا ڈائنا کے طوفانوں نے اسے پارہ پارہ کر دیا ہو مگر ہر صورت یہ وجود کی بنیادی صورت تھی۔ مکان کائنات کی توسیعی صورت ہے اور کائنات اشیا پر مشتمل ہے۔ وجود جو واحد ہے اس نے اپنے آپ کو وسعت بخشی اور تثلیث کی دوسری حالت جو نور کی ایک کیفیت ہے---- اس سارے عمل کا پجاری عینی شاہد تھا۔ چنانچہ اس بنیادی قوت کے سہارے نیا مذہب ایجاد کرلیا۔

مگر ہومرکی شاعری تو بڑے خاندانوں کا خالص رزمیہ ہے - یہ دو دنیاؤں کی کہانی ہے۔ اس میں ایک طبقہ شرفا کی دنیا ہے اور دوسری پجاریوں کی یا امتناعات اور ٹوٹم کی داستان ہے' جرات آزمائی اور تحفظ کی داستان ہے۔ ان دونوں میں سے صرف ایک زندہ رہتا ہے۔ یہی صورت ایڈا کی شاعری کی ہے اور یہی ہومر کی۔ یہ طبقہ شرفا کے لیے ایک ضابطہ حیات ہے۔ اس عالم فانی کے انسانوں کے لیے اس کا جاننا فتح کی کلید ہے۔ کلاسیکی بارونق کے مفکرین ایکسینو فینس سے لے کر افلاطون تک دیوتاؤں کی زندگیوں کے یہ نظارے غیر محتاط اور حقیر" قرار دیتے تھے اور اپنے اس طرز عمل میں وہ درست تھے۔ انھوں نے بالکل اسی طرح محسوس کیا جس طرح کہ بعد کے دور میں مغرب کے فلسفے اور دینیات نے جرمنوں کے رزمیات کے متعلق محسوس کیا۔بلکہ گورٹ فرائڈ اور سٹراس برگ اس وولفرام اور والتھر کے متعلق محسوس کیا۔ اگر ہومر کے رزمیے پہلوانوں کے نغموں کی حیثیت سے گمنامی میں نہ چلے جاتے جن کو شارلیمن نے جمع کیا تھا تو یہ ظاہر نہ ہوتا کہ

کلاسیکی ثقافت اپنی روایات کے تحفظ کے لیے زیادہ سنجیدہ نہ تھی۔ نیز پجاریوں کا ادارہ زیادہ طاقت ور نہ تھا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب کلاسیکی شہر وجود میں آئے تو دانشوری کے حوالے سے ان پر پجاریوں کے بجائے شرفا کے طبقے کا قبضہ تھا۔ ان کے مذہب کے اصل عقائد کو ہومر کے برخلاف اپنے آپ کو آرفی مذہب سے منسلک کرتے تھے(غالباً)یہ عقائد آج تک معرض تحریر میں نہیں آئے۔

بہرحال ان کا وجود ضرور تھا۔ یہ کون جانتا ہے کہ کالجات اور ثائرسیاس کی اشکال کے پس منظر میں کتنا کچھ پنہاں ہے۔ ثقافت کے آغاز میں زبردست بغاوت ہوئی ہوگی کیونکہ ایسی صورت ہر ثقافت کو پیش آتی ہے۔ یہ بغاوت بحیرہ آز سے لے کر ایٹروریا کے دور دراز مقامات تک پھیل گئی۔ مگر الیڈ میں محض اس کے چند آثار بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً" نیلونگ کی وضع طبیعی اور رولینڈ کا مظاہرہ داخلیت ' جوچم' اورفلورس کا داخلیت اور تصوف کا اظہار ہی کیا گیا ہے۔ سینٹ فرانس اور صلیبی جنگیں یا ڈاکس آئرا آف ٹامس آف سیلینو میں سے تیرھویں صدی کی عدالت محبت میں کون بچ سکا ہو گا۔ ان میں سے اکثر برگزیدہ اشخاص نے پراسرار متصوفانہ صورت اختیار کرلی ہو گی اور اس طرح عام روش زمانہ میں شمولیت اختیار کرلی ہوگی۔ لیکن ہم ان کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ ہم تو ان کی مسرت افزا چکا چوند اور آرام وہ پہلوئے زندگی ہی سے آشنا ہیں۔ کیا ٹروجن کی جنگ ایک فساد تھا یا یہ بھی کوئی مذہبی جنگ تھی؟ ہیلن کا مطلب کیا ہے؟ یروشلم کے ہاتھ سے نکل جانے کو بھی دنیاوی اورمذہبی نقطہ نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔

ہومرکی شاعری کے شرفا سے متعلق حصے میں ڈائناسی سوس اورڈ میٹر کو بطور پجاری یا دیوتا تذلیل کی نظر سے دیکھا گیا ہے   مگر ہسی اوڈ میں اسکرا کے چرواہے بھی محققین کی نظر میں نہیں آئے کیونکہ ان کے عوامی اعتقادات کی وجہ سے انھیں کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ قدیم زمانے کے تصورات کو جیک بھومے دی کابلر میں بھی خالص حالت میں نہیں دیکھا گیا

دوسری مشکل یہ ہے کہ قدیم عظیم مذاہب بھی ایک مخصوص طبقے کی ملکیت تھے اور نہ عوام کے لیے دستیاب تھے اور نہ قابل فہم۔ قدیم رومی تصوف بھی محدود اور منتخب حلقوں تک محدود تھا جس پر لاطینی زبان کی مہر ثبت تھی۔ لہٰذا تمام تصورات اوراشکال بھی لاطینی ہی تھیں جن کو نہ تو طبقہ شرفا اور نہ کسان سمجھ سکتے تھے بلکہ وہ تو اس کے وجود ہی سے ناآشنا تھے آثار قدیمہ کی کھدائی خواہ وہ کتنی بھی اہم ہو' ہمیں کلاسیکی دیہات کے مذہب کے متعلق کچھ نہیں بتاتی۔ حالانکہ دیہاتی گرجے جو ایلے لارڈ اور بونا و-تنلورا میں ملے ہیں' کثیر معلومات مہیا کرتے ہیں۔

مگر ایسی چی لس اور پنڈار بہرحال عظیم پجاریوں کی روایت کے زیر اثر تھے۔ ان سے قبل فیثا غورثی گزر چکے تھے جنھوں نے دیمیٹری مسلک کو اپنا مرکز تسلیم کرلیا تھا(گویا ایسی نشاندہی کر دی تھی کہ اساطیر کا منبع کہاں تلاش کیا جائے؟)۔ ان سے بھی قدیم ایلیوسینائی اسرایت اور آرفیسی اصلاحات کا دور ساتویں

صدی قبل مسیح میں گزر چکا تھا اور آخر میں فریسائڈیوں اور ا سی میناڈوں کے گروہ تھے جو زمانہ قدیم میں اولیں حیثیت کے مالک تو نہ تھے مگر قدیم دنیائے عقائد کے فی الحقیقت آخری آثار ضرور تھے۔ یہ تصور کہ عدم تقدیس ایک توارثی گناہ تھا اور اس کے اثرات آئندہ نسلوں بلکہ ان کی آئندہ نسلوں پر پڑتے تھے ہسی اوڈ اور سولون کے علم میں تھا۔ علاوہ ازیں ہابرس کا عقیدہ (جو شمیوں میں بھی مروج تھا) اس سے بھی یہ واقف تھے۔ افلاطون بحیثیت آرفیسی ہومر کے تصورات حیات کا مخالف تھا۔ اس نے ایک قدیم تصور کو دوبارہ فروغ دیا کہ عالم برزخ میں مردوں کو عذاب ہو گا۔ اس کا ذکر اس نے فیڈو میں کیا ہے۔ ہمیں آرفیسیوں کے شاندار مسلمات کا علم ہے -ان کے ہاں اسراریت کی نفی کا جواب اگون کے اثبات سے دیا گیا ہے -یہ تصور کم از کم ۱۱۰۰ ق م میں پیدا ہوا۔ یہ شعور بیدار کا وجود کے خلاف احتجاج تھا' یعنی جسم کی حیثیت روح کی قبر کی ہے----- ایسی صورت میں انسان اپنے آپ کو کوئی ایسی شے تصور نہیں کر سکتا جو نسل کشی قوت اور حرکت پر قادر ہو اور اپنے اس ادراک کے بعد خود اپنی ذات سے خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ کلاسیکی تصور مکافات عمل کا آغاز اسی سے ہو جاتا ہے جو تمام رسومات اور کفاروں کے باوجود بلکہ شعوری خودکشی کے باوجود اس کی نجات اقلیدسی وجود جسم کے بغیر ممکن نہیں-یہ قبل ازافلاطون دور کے نظریات کی انتہائی غلط تعبیر ہے۔ کہ یہ روشن خیالی کے نقطہ نظر کے مطابق ہے کہ وہ لوگ ہومر کے خلاف بولتے ہیں-یہ ایک راہبانہ طریق تھا جس پر وہ عمل کرتے تھے-یہ لوگ ڈیمکاریز اور لینیز کے ہم عصر تھے جن کی پرورش قدیم آرفیسیوں کے عظیم نظام کے تحت کی گئی تھی جو قدیم خانقی درس گاہوں میں روایات کے مطابق قائم تھا۔ قدیم اور مشہور مقدس مقامات ---- جس طرح رومی علم کلام کو باروق روشن خیال جامعات میں محفوظ رکھا گیا تھا۔ ا سمی ڈوکلیز کی فنا ذات سے یہ سلسلہ چلتا ہے اور رومی رواقیوں کی خودکشی تک قائم رہتا ہے اور پھر واپس آرفیسیوں تک اس روایت کی کڑیاں ملتی ہیں۔

ان دو محفوظ نشانات کے علاوہ ہمارے پاس ایک اور بھی ذریعہ ہے جس سے روشن اور نمایاں سراغ دستیاب ہوتے ہیں' جس طرح کہ تمام رومی داخلی سمت مریم شہزادی جنت کی طرف جاتی ہے اور کنواری اور ماں کی نسبت دوہرائی جاتی ہے' اسی طرح تمام کلاسیکی عالم اس دور میں اساطیر اور تخیلاتی روایات کا' ڈیمیٹر کے اردگرد ایک ہار پرو دیا گیا-یہ ایک حاملہ ماں کا تصور تھا' گایا کے اردگرد اور پرے فون اور ڈایانی سوس' جو باپ بننے والا تھا' اور چتھونیاں اور لنگ پرستی کے ساتھ ساتھ موت اور پیدائش کے مسالک عام ہو گئے تھے۔ یہ اپنے طریق کار کے لحاظ سے خالص کلاسیکی رسوم ورواجات تھے جو ان کے عام فلسفے "حال مطلق" کی مادیت کے مطابق تھے۔ شمسی مذہب جسم کا پجاری تھا۔ جب کے آرفیسی اس کا استرداد کرتا تھا۔ ڈیمیٹر' استرار حمل اور ولادت کی دیوی تھی۔ یہ وہ عمل تھا جس سے کہ جسم اپنا وجود حاصل کرتا تھا۔ اس میں ایک تصوف بھی تھا جس کے زیر اثر حیات کی قدر کی جاتی تھی۔ اس عقیدے میں علامت اور نقل کا رواج تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ عیش و نشاط کا مسلک بھی مقبول تھا۔ کیونکہ جسم کو ضائع کرنا رہبانیت اور مقدس زنا کاری کی وجدانیت کو زمان کی نفی سمجھا جاتا تھا (غالباً" وقت گزاری کا مشغلہ جسے تقدیس کا جزو بنالیا گیا تھا-م-ح-م-)۔ یہ شمسی سکون کے برعکس تھا گویا ہیریلس کی دہلیز پر ایک قسم کا پردہ ڈالنے کے بجائے لہرا

دیا گیا تھا جس کسی نے ان اشیا کا روحانی طور پر تجربہ کیا ہو اس کا جسد فانی خیر کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ ان دنوں میں بھی عظیم بزرگ اور نگران موجود ہوں گے' جو ہرکلیٹس اور ا مپیڈ وکلیز کی شخصیتوں سے بھی بلند ہوں گے اور کلیت اور رواقیت کے اساتذہ قرار پاتے ہوں گے۔ اسی طرح کے لوگ گمنام نہیں ہوتے اور نہ ہی ان کی شخصیت غیر نمایاں ہوتی ہے۔ اس دور میں جبکہ ا پیلز اور اوڈیسی اس کے نغمات ہر جگہ ختم ہوتے جا رہے تھے تو اس دور میں قدیم مقدس مقامات پر وجود میں آگیا جس میں تصوف اور ایک مدریت دونوں کی آمیزش تھی۔ اس میں ترقی یافتہ طریق بھی تھے اور ایک مخفی سینہ بہ سینہ روایات بھی۔ جیسا کہ ہندوستان میں بھی رواج تھا اور ہم تک جو دور متاخر کے آثار پہنچے ہیں ان سے ہم کچھ بھی ثابت نہیں کرسکتے کہ دور قدیم میں کیا تھا؟

اعلیٰ طبقات کی شاعری اور عوامی مسالک کو ایک طرف کرتے ہوئے ہم اس موضوع (کلاسیکی تہذیب) پر مزید معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔ مگر اس کی راہ میں ایک تیسرا نشیب بھی حائل ہے۔ وہ یونانی اور رومی مذاہب کے مابین مبینہ مخالفت ہے' کیونکہ فی الحقیقت ایسی کسی مخالفت کا کوئی وجود نہ تھا۔

متعدد شہری ریاستوں میں سے صرف روم ہی واحد شہر ہے جو نوآبادیاتی دور میں قائم ہوا-یہ شہر اٹروسکیوں نے قائم کیا-مذہبی لحاظ سے اٹروسکی خاندان کے عہد میں اس کی ترمیم ہوئی- یہ چھ سو قبل مسیح کا زمانہ تھا' اس لیے ممکن ہے کہ اس میں مشتری گروہ کے دیوتا' جیوپیٹر' جیونو' منروا' نے قدیم دور کے دیوتاؤں کی تثلیث جیوپیٹر مریخ اور کیوری نس کی جگہ لے لی ہو جن کا تعلق نیوما مذہب سے تھا اور وہ کسی نہ کسی لحاظ سے تارکوئین خاندان سے تھا جس میں منروا' شہر کی دیوی تھی جو ہر لحاظ سے ایتھنی پولیاس سے مشابہ تھی یہ واحد شہر ہے جس کا مسلک یونانی بولنے والے شہروں کے مسالک سے مشابہ ہے اور انھیں کے برابر ترقی یافتہ اور بالغ نظر ہے مثلاً سپارٹا اور تھیبس سے جو کسی بھی لحاظ سے اس سے زیادہ شان وشوکت کے مالک نہ تھے۔

جو کچھ بھی موخرالذکر شہروں کے متعلقات سے ہمیں معلوم ہوا ہے وہ جس قدر یونانی مزاج کا حامل ہے اسی قدر اطالوی بھی ہے اور جہاں تک اس دعویٰ کا تعلق ہے کہ رومی مذہب یونانی مذہب سے اس لحاظ سے متمیز ہے کہ اس میں اساطیر کا کوئی وجود نہیں تو اس دعویٰ کی تائید میں ہمارے علم کی بنیاد کیا ہے ؟ ہمیں تو یونان کے دور عروج کے رزمیات تک کا علم نہیں' دیوتاؤں کا تو ذکر ہی چھوڑیں۔ اگر ہمارے پاس یونانی شہروں ریاستوں کے تیہاروں کی تقویم ہی ہوتی یا یونانی ریاستوں کے عوامی مسالک ہی کا مواد موجود ہوتا' جس طرح ایفے سوس کی مجلس سے مسیح کی پاکیزگی کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں کرسکتے یا تحریک اصلاح کلیسا سینٹ فرانسس کے متعلق کوئی معلومات مہیا نہیں کرتی' بالکل اسی طرح ہمیں یونانی مذاہب کے دور عروج کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں۔ مینالاڈس اور ہیلن لاکونی لامذہب ریاست کے معبود تھے۔ اس کے علاوہ ان کی کوئی اور حیثیت نہ تھی۔ کلاسیکی اساطیر کا تعلق اس دور سے ہے جب شہری ریاستوں کے دساتیر اور میلے ٹھیلے ابھی وجود

میں نہیں آئے تھے جب کہ اس وقت تک روم کا بھی کوئی وجود نہ تھا بلکہ ایتھنز بھی ابھی تک آباد نہ ہوا تھا۔ مذہبی دیوتاؤں اور شہروں کا تصور جو انتہائی معقول لوگ تھے' قدیم دور سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا بلکہ دوسری ثقافتوں کے مقابلے میں کلاسیکی ثقافت میں اساطیر اور مسلک کا آپس میں کوئی تعلق نہ تھا۔ اساطیر کسی لحاظ سے بھی یونانی ثقافت کا حصہ نہیں۔ یہ اس ثقافت کی تخلیق نہیں اور یہ کسی لحاظ سے یونانی بھی نہیں مگر یونان میں تخلیق ہوئے (جیسا کہ مسیح کے ایام طفلی کے واقعات اور گریل کی کہانی)۔ اس یا اس گروہ میں لیکن کلی طور پر مقامی' دباؤ اور داخلی خواہشات کے تحت ان کی تخلیق ہوئی۔ مگر ان کا وجود عظیم شہروں کے فلسفوں کا مرہون منت نہیں' مثلاً اولیمپک کا تصور تھیلے اور تھیتس میں پیدا ہوا' اور یہ تمام تعلیم یافتہ طبقات کی مشترک ملکیت تھا۔ یہ قبرص سے نکل کر اٹروریہ تک پھیل گیا اور روم بھی اس تصور میں شامل ہوگیا۔ اٹروسکی نقاشی تو اس مفروضے کا مظہر ہے کہ یہ عوام کا ایک مشترک سرمایہ ہے اور اسی لیے ٹراکوسیز اور ان کی عدالت اس تصور سے آشنا ہوں گے۔ ہم اس عقیدے میں کوئی مضمرات بھی شامل کر سکتے ہیں (جہاں کہیں بھی وہ مطالب سے ہم آہنگ ہوں) اور اس طرح اس اسطور کو مکمل کرلیں مگر بنیادی نقطہ یہ ہے کہ وہ رومنوں کے لیے بھی اتنے ہی قابل جواز ہوں' کہ بادشاہ کے علاوہ تیکیا اور کور سائرہ کے باشندے انھیں قبول کر سکیں۔

آپ نے دیکھا کہ جدید محققین نے یونان اور روم کی ثقافت کی تصویر کشی کی ہے۔ وہ اصل حالات سے کتنی مختلف ہے۔ یہ نہ صرف حقائق کی تلاش میں غلطی کی وجہ سے ہوا ہے بلکہ اس غرض سے جو طریق کار وضع کیا گیا وہ بھی غلط تھا۔ جہاں تک روم (موم سن) کا تعلق ہے تو اس کے تیوہاروں کی تقویم جو سرکاری مسالک کی نشاندہی کرتی ہے اسے اور یونان کے شعری ادب کو نقطہ آغاز بنایا جا سکتا ہے۔ وساوا کا لاطینی طریق کار استعمال کریں جس کی وجہ سے اس نے یونانی شہروں کی تفصیلات مہیا کیں تو آپ دیکھیں گے کہ اس سے بالکل ویسے ہی نتائج برآمد ہوں گے جو وساوا نے بیان کیے' مثال کے طور پر تلسن کے گر پچستی فیس ٹن کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

جب اس مسئلے پر غور کیا جائے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ کلاسیکی مذہب میں مکمل داخلی اتحاد موجود ہے۔گیارھویں صدی (ق م) کی عظیم دیوتائی داستانیں' جن پر موسم بہار کی شبنم کے آثار موجود ہیں ان کی تقدیس کو جو الیے پیش آئے وہ ہمیں تختیمس مین بالڈر کی موت اور فرانسس کی موت کے واقعات کی یاد دلاتے ہیں۔ یہ صرف قیاسی غور و فکر کا نتیجہ ہے کہ اس عہد کی تمام عالمی تصویر ہمارے سامنے آ جاتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ایسا منتخب گروہ موجود ہے جس کا تعلق نبوت سے ہے' مگر تھوڑی مدت کے بعد ہی شہری مذہب ایک فن کی صورت اختیار کر گیا۔ رسمی عبادت اور اس طرح یہ زندگی کا صرف ایک رخ ہے۔(اور یہ پہلو مختلف ہے۔) جسے پارسائی کہا جاتا ہے۔ ان کا تعلق نہ تو مابعدالطبیعیات سے ہوتا ہے اور نہ ہی اخلاقیات سے۔ ان کا مقصد محض مذہبی رسومات کی تکمیل سے ہے اور بالآخر مختلف شہروں میں مسالک کا انتخاب کر لیا گیا اور اکثر یہ انتخاب' اساطیر کی طرح کسی اجتماعی عالمی تصور کی بنیاد پر نہیں ہوا بلکہ حادثاتی طور

پر اور امرا کے آباواجداد کے مذہبی اصولوں کی مدد سے ترتیب کیا گیا جو اپنے (بالکل رومی روایات کی طرح) مقدس مربی دیوتاؤں کے پیکر تراشے' ان کی پرستش پر بھی اپنی اجارہ داری قائم کرلی' مثال کے طور پر روم میں لوپر کالیا کا دیوتا ماؤنس' جو زراعت کا دیوتا تھا' صرف کو تنک طائی اور فایائی قبائل سے مخصوص تھا۔

چینی مذہب جو چاؤ خاندان کے عہد سے متعلق تھا' رومیوں کے ۱۳۰۰ــــــ۱۱۰۰ ق م کا ہمعصر تھا۔ اس کا مطالعہ بہت محتاط انداز میں کرنا چاہیے۔ چینی مفکرین جن میں کنفیوشس اور لاؤتسے بھی شامل ہیں' سطحی لفاظی کے عادی ہیں ۔ یہ اپنے قدامت پسند دور کی پیداوار تھے۔ کسی کے آغاز میں پیدا ہونے والے تصوف اور عظیم روایات کا تجزیہ خاصا مشکل کام ہے' لیکن یہ امر یقینی ہے کہ اس نوعیت کا تصوف اور اساطیری روایات کا وجود غیر مشکوک ہے ۔ مگر بڑے بڑے شہروں کے منظم فلسفے سے ان پر کوئی روشنی نہیں پڑتی' مثلاً ہومر کے کلام سے ہمیں اس کی ہمعصر کلاسیکی روایات کا کیا پتہ چل سکتا ہے ؟ یہ ایک مزید مثال ہے جو ماخذ کی کوتاہیوں کو واضح کرتی ہے۔ہمیں ان اطلاعات کی ضرورت ہے جن سے رومی پارسائی کے متعلق اندازہ کیا جائے مگر اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ تمام تحریریں روایت پرست فلسفیوں کے دست برد سے بچ گئی ہوں جن میں لاک' روسو اور وولف جیسے لوگ شامل ہیں۔ اسی اصول کے تحت کنفیوشس جیسے فلسفی کے ہاتھ سے گزرنے والی معلومات میں کتنی تحریف ہوئی ہو گی' ہم اندازہ نہیں کر سکتے۔ فی الحقیقت اگر ہم مزید تحقیقات نہ کریں تو ہم چینی مذہب کی کشوفات سے آگاہ نہیں ہو سکتے

اب ہم جانتے ہیں کہ پرانی تحقیقات کے برخلاف قدیم چین میں پجاریوں کا ایک مضبوط نظام قائم تھا(ز ۱) ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ شوکنگ کے متن میں جرات مندوں کے رزمیے اور دیوتاؤں کی اساطیر معقولیت سے مرقوم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اب تک محفوظ ہیں' بالکل اسی طرح ہوسل' تگی لی اور شی کنگ سے بہت سی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ بشرطیکہ ہم اس نیت سے ان کا مطالعہ کریں کہ ان سے مفید مطلب مواد اخذ کیا جا سکتا ہے اور جو کچھ کنفیوشس یا اس کے ساتھیوں نے لکھا ہے اس کے علاوہ بھی ان میں کچھ مواد موجود ہے۔ ہم سنتے ہیں کہ قدیم چاؤ دور میں جنسی اعضا کی پرستش کی جاتی تھی۔ آرغستی رسوم میں یہ بھی شامل تھا کہ دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے وجد اور رقص کیا جائے - خدا اور پجاریوں میں نقلی مکالمات بھی کیے جاتے انھی مکالمات کی بنیاد پر (یونان کی طرح) چین میں بھی ڈرامہ وجود میں آیا: ا بالآخر ہمیں یہ اطلاعات دستیاب ہوئیں کہ دیوی دیوتاؤں کی پرورش انتہائی عیش وعشرت کے ماحول میں ہوتی اور بہت سی اساطیری روایات کو بادشاہوں کی روایات میں شامل کرلیا جاتا کیونکہ نہ صرف وہ بادشاہ جن کا رزمیات میں ذکر تھا بلکہ ۱۴۰۰ سے قبل کے تمام بادشاہ جن کا تعلق ہیاہ اور شانگ خاندانوں سے تھا انھوں نے بھی یہی وطیرہ اختیار کیا اور بعض اساطیر اپنے ناموں کے ساتھ منسوب کرلیں اور ان کے تاریخی پس منظر کی بھی کوئی پرواہ نہ کی۔ ہر نئی ثقافت میں اس طریق کار کے آثار ملتے ہیں فطری عفریتوں کے مقابلے میں آباواجداد کی پرستش ہمیشہ غالب رہتی ہے۔ ہومر کے تمام ہیرو اور مائینوتھی سی اوس اور رومولوس دیوتا تھے جو بعد میں بادشاہ بن گئے۔ ہیلی اینڈ میں مسیح کو بھی بادشاہ بنایا جارہا تھا۔) مریم کو جنت میں ملکہ کا تاج پہنادیا گیا۔یہ

ایک عام طریق کار ہے۔ (بالخصوص غیر شعوری طور پر) جس میں کسی کو احتراماً" ناگ (فرضی) تخت پر بٹھا دیا جاتا ہے۔ ان کا تصور یہی ہے کہ جسے عظیم تسلیم کر لیا جائے تو نسلی لحاظ سے بھی وہ برتر ہو۔ اس کے تمام آباواجداد نواب اور سلطان ہوں پجاریوں کی ایک جماعت نے ان زمانی اساطیر کی شدومد سے تردید کی ہے۔

مگر اس روایت نے کلاسیکی اور چینی مدد سے اپنا غلبہ قائم رکھا۔ بلکہ پجاریوں کا غلبہ جس قدر کم ہوا دنیاوی آقاؤں کی قوت میں اسی قدر اضافہ ہوتا رہا۔ قدیم دیوتا اب بادشاہ بن گئے اور معاشرتی ادارے ان کی ملکیت میں شامل ہوگئے۔ کنفیوشس کے لیے اس سے زیادہ پسندیدہ اور کیا صورت ہو سکتی تھی۔ اساطیر ہی ایک ایسی صورت تھی جو تمام معاشرتی اخلاقی رجحانات کو اپنے اندر سمو سکتی تھی۔ ضرورت صرف اس امر کی تھی کہ اصل اور فطری اساطیر کے نشانات مٹا دیے جائیں۔

قدیم چینی شعور بیدار کے مطابق افلاک وارض کائنات کا نصف تھے۔ ان میں کوئی اختلاف نہ تھا بلکہ ایک دوسرے کا آئینہ تھے۔ اس پس منظر میں نہ تو مجوسی ثنویت کا کوئی تصور تھا اور نہ فاؤستی قوت فعال کا وجود تھا۔ اس دو مختلف قوتوں کے باہمی تعاون پر مبنی دو اصول سرگرم کار تھے جن میں سے ایک یانگ اور دوسرا ین تھا۔ ان کو ایک دوسرے کے مقابل یا متخالف کی بجائے میثاقی سمجھا جاتا تھا۔ اس کے مطابق انسان کے اندر دو روحیں ہیں' کیوپئی جو ین کے ساتھ منطبق ہے۔ ارضی' ظلمات اور زمہریر ہے اس کی شناخت جسم سے ہوتی ہے اور سین جو کہ ارفع و بلند ہے روشن بھی ہے اور مستقل بھی مگر ان کے علاوہ انسانی جسم کے باہر ان دونوں انواع کے متعدد ارواح ہیں ارواح کے لشکروں نے ہوا' پانی اور زمین پر ٹھکانہ بنایا ہوا ہے۔ ہر جگہ کیو۔تز اور سین آباد ہیں۔ انسان اور فطرت دونوں ان قوتوں کی تماشہ گاہ ہیں۔ دانائی' عزم' قوت اور نیکی اسی تعلق پر قائم ہیں۔

ترک دنیا اور عیش و نشاط بیاؤ کے رئیسانہ رواجات ہیں جس کے مطابق بزرگوں کی تذلیل کا بدلہ صدیوں بعد بھی لیا جا سکتا ہے اور یہ حکم بھی موجود ہے کہ شکست کبھی بھی تسلیم نہ کی جائے اور ین کا عقل پر مبنی اخلاق جو معقولیت کے فیصلے کے مطابق علم سے وجود پاتا ہے اور کوئے ای اور سین کے تصورات سے اپنا وجود حاصل کرتا ہے

اور اس کا تعلق بنیادی لفظ تاؤ میں ہوتا ہے۔ یانگ اور ین میں اختلاف اگر انسان کے جسم کے اندر پیدا ہو جائے تو یہ اس کی زندگی کا تاؤ ہو گا۔ ارواح کے جھنڈ اس کے جسم کے باہر فطرت کے تاؤ ہوتے ہیں۔ دنیا میں تاؤ کی مقدار بھی اتنی ہی ہے جتنی کہ ضربات توازن اور لمحات ہیں اس کے پاس لی کی مقدار بھی اتنی ہے جتنی کہ انسان کے علم میں ہو سکتی ہے اور اس میں سے وہ مستقبل کے استعمال کے لیے لے سکتا ہے۔ زمان' قضاوقدر' سمت' نسل' تاریخ ------- ان تمام موضوعات پر چاؤ کے ابتدائی زمانے میں غور فکر کیا جا چکا تھا۔ ان کا مضمون صرف اسی ایک اور لفظ (تاؤ) میں سمو دیا گیا۔ فرعون کی قبر کا اندھیرا راستہ

بھی اسی سے متعلق ہے اور اسی فاؤستی تیسرے بعد کی آرزو بھی اسی سے وابستہ ہے مگر تاؤ لی نفسہ تسخیر فطرت کے کسی بھی تصور سے بے نیاز ہے۔ چینی میدان طاقت ور تناظر سے گریز کرتا ہے۔ یہ افق در افق اپنے مقاصد کو آگے بڑھاتا ہے اور بعید ترین منازل کی آرزو رکھتا ہے۔ قدیم دور کا چینی کلیسا لی یانگ اپنے طویل راستوں کے ساتھ ڈیوڑھی سے سیڑھیوں پلوں اور میدانوں سے ہوتا ہوا گزرتا ہے۔ یہ نہ مصریوں کی طرح منازل کی گہرائی متعین کرتا ہے اور نہ رومیوں کی طرح فکر کی گہرائی تک پہنچتا ہے۔

جب سکندر دریائے سندھ کے کنارے پہنچا تو اس دور میں ان تینوں ثقافتوں (چینی' ہندوستانی اور کلاسیکی) تاؤ ازم' بدھ مت اور رواقیت کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ مگر زیادہ مدت نہ گزری کہ اس علاقے میں مجوسی مذہب کا آغاز ہو گیا' جو کلاسیکی اور ہندوستانی علاقوں کے درمیاں واقع تھا اور یہ اسی دور میں ممکن ہوا ہو گا کہ مایا اور انعا کی مذہبی تاریخ کا آغاز ہوا ہو گا جو اب دنیا سے محوشدہ ثقافتوں میں شامل ہو چکی ہیں۔ اس کے ایک ہزار سال بعد جب کہ یہاں بھی ہر شے داخلی طور پر مکمل ہو چکی تھی تو فرانس کی بنجر سرزمین پر بہت ساعت سے آگے بڑھنے والا عیسائیت کا روم کیتھولک فرقہ وجود میں آگیا۔ اس معاملے میں بھی جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے اسا کا تمام ذخیرہ مشرق ہی سے مستعار لیا گیا اور ہزارہا دیویاں اور دیوتا قدیم جرمن اور کیلٹی مسالک سے حاصل کیے گئے۔ روی مذہب اس قدر جدید تھا کہ پہلے اس کے متعلق کبھی کچھ بھی نہیں سنا گیا اور جس کی حتمی گہرائی اس قدر عسیر الفہم ہیں کہ اس عقیدے سے باہر کا کوئی شخص انھیں تاریخی سلسلے کی تدبیر میں بے معنی قلابازی ہی تصور کرے گا۔

اس نوجوان مسلک کے اردگرد جو اساطیری دنیا قائم ہوئی وہ قوت عزم اور سمت کو لامتناہیت سے منسلک کرنے کی علامت تھی۔ فاصلے کے لحاظ سے یہ بہت مشکل کام تھا۔ اس میں گہرے اختلافات کے خوف اور برکت کے امکانات دونوں موجود تھے' لیکن اس کے باوجود اس میں مذہبیت کا تصور اس قدر فطری تھا کہ وہ لوگ جو اپنے آپ کو اس سے الگ رکھتے' قطعی طور پر لاتعلق نہ ہو سکتے اور اسے ایک وحدت ہی قرار دیتے۔ وہ اسی کے اندر زندہ تھے۔ اس کے بر خلاف ہمارے لیے جبکہ ہم اس کی اصل سے تیس نسلیں دور ہو چکے تھے۔ یہ عالم اتنا اجنبی اور اثر انگیز معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہر لمحہ اس کی تفصیلات کو حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں اور اس طرح ہم اس کی سالمیت اور ناقابل تقسیم نوعیت کے قائل رہتے ہیں۔

مذہبی رہنما اسے ایک قوت قرار دیتے جو دائم عظیم اور ہر جگہ موجود فعالیت تھی۔ مقدس سلسلہ علت و معلول جو انسانی بصارت کے لیے اپنی کوئی صورت تشکیل نہ کر سکتی مگر اس تازہ نسل کے لیے ایک مکمل آرزو اور توانا گردش کناں خون کے لیے زبردست خواہش۔ اس کے باوجود اس خون نے اپنے معانی کنواری ماں مریم کے روپ میں دریافت کر لیے اور اسی کے سامنے جھک گیا۔ قدیم روی فن میں اس کی بہشت میں تاجپوشی کی تصاویر موجود تھیں۔ یہ ایک پیکر نور ہے جس کے اردگرد سبزی اور نیلے رنگ پیکران جنت نے

نمایاں کر رکھے ہیں۔ وہ اپنے نوزائیدہ بچے پر جھکی ہوئی ہے۔ وہ تلوار کی انی اپنے دل میں چبھتی ہوئی محسوس کرتی ہے۔ وہ صلیب کے قدموں میں بیٹھی ہے اور مردہ بیٹے کی لاش تھامے ہوئے ہے - دسویں صدی کے بعد کے زمانے سے پطرس دمیانی اور برنارڈ آف کلیئرواکس نے اس کا مسلک اختیار کر لیا۔ ایوماریہ اور فرشتوں کی مبارک باد کا شور بلند ہوا اور بعد ازاں ڈومینکی نے گلاب کے پھولوں کا تاج تیار کیا۔ اس کے پیکر کے تمام طرف لاتعداد اشکال نمودار ہوئیں وہ کلیسا کی برکت کے ذخیرے کی محافظ ہے وہ ایک عظیم پناہ ہے -

فرانس والوں کی طرف سے عذاب الٰہی سے بچنے کی تقریب منائی گئی۔ برطانیہ والوں کے ہاں دعائے خیر کی صدا بلند ہوئی(۱۱۰۰ سے بھی قبل)۔ ہر کوئی تصورات عقیدت میں مسابقت کا خواہاں تھا۔ اس پس منظر میں اس کا مقام خطہ خاک سے عالم نور متعین ہوا۔

مگر یہ عالم تقدیس' نور اور جمال کی روح ایک ناقابل تصور پیکر ہے جس کا کوئی مخالف تصور ہو ہی نہیں سکتا۔ اس میں ایک روسی مقولہ قابل ذکر ہے جو اس کی نا قابل پیمائش تخلیق کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے جو زمانہ حال میں فراموش کر دیتا ہے اور جان بوجھ کر بھلا دیتا ہے۔ مگر وہ اپنے تخت پر بیٹھی ہوئی ہے' مسکراہٹ لطافت اور حسن وجمال سے تمام بنی نوع انسان مسحور کر رہی ہے مگر اس کے پس منظر میں ایک اور دنیا بھی ہے جو تمام عالم اور تمام بنی نوع انسان کے لیے برائی کا تانا بانا بنتی ہے' برائی تخلیق کرتی ہے' گھس کر تباہ کر دیتی ہے' غلط ترغیب فراہم کرتی ہے۔ وہ شیطان کی حکومت ہے۔ یہ تمام مخلوقات کے اندر داخل ہو کر ہر جگہ گھات لگائے بیٹھی ہے۔ اس کے چاروں طرف بھتنوں کی ایک فوج ہے۔ رات کی چڑیلیں بدروحیں' خوف ناک بھیڑیے یہ سب انسانی روپ میں ہیں کوئی نہیں جانتا کہ اس کے ہمسائے نے اپنے آپ کو کسی شیطان کے ہاتھوں بیچ دیا ہو۔ کسی نوزائیدہ بچے کے متعلق کوئی کہہ نہیں سکتا کہ یہ کوئی شیطانی روح نہ ہو۔ ایک تکلیف دہ خوف جو قدیم مصر کے ابتدائی ایام میں طاری تھا' انسان پر طاری ہے۔ ہر لمحے وہ تحت الثریٰ میں گرتا جاتا ہے۔ کالا جادو ہوتا تھا اور شیطانی بھوت اور چڑیلیں بھی ہوا کرتی تھیں' ہفتے کی رات پہاڑوں کی چوٹیوں پر منائی جاتی تھیں۔ جادو سے خشک سالی دور کی جاتی اور اس کا طریق کار متعین تھا - دوزخ کا شہزادہ اپنے رشتہ داروں کے ہمراہ ---- ماں اور نانی - کیونکہ اس کا وجود ہی شادی کی قربانی سے نفرت پر مبنی تھا' اس کی بیوی اور بچے نہ ہو سکتے تھے مگر راندے ہوئے فرشتے اور چیلے موجود رہتے تھے۔ یہ تاریخ مذہب کی ایک مہیب شخصیت تھی۔ جرمن شیطان لوکی اس کی صرف ابتدائی صورت ہے۔ ان کی سینگوں والی مضحکہ خیز صورتیں' جن کے ساتھ پنجے یا گھوڑوں کے سم اضافہ کر دیے جاتے گیارھویں صدی کے پراسرار کھیل تھے۔ ہر مقام پر فنکار ایسے کرداروں کی صورت میں موجود رہتے اور ڈیورر اور گرون ورلڈ کے عہد تک روحی مصوری کا ان کے بغیر تصور بھی ناممکن تھا۔ شیطان مکار' نقصان رساں' کینہ جو اپنے مگر بالاخر نوراتی قوتیں اس پر قابو پا لیتی ہیں - وہ اور اس کے چیلے جو بدخو' اجڈ اور حد درجہ شرارت پسند ہیں۔ بالکل عفریتی شکل و صورت کے ہیں۔ دوزخی قہقہے ان میں حلول ہو چکے ہیں - یہ خاتون جنت کی مسکراہٹ کے خلاف ہیں اور گناہ

گاروں کی استغفار کے بھی مخالف ہیں

اس کی عظمت میں مبالغہ آمیزی کا کوئی امکان نہیں یا اس اخلاص کا اندازہ ممکن نہیں جو اس کے معتقدین کا اس پر تھا۔ مریم کے متعلق اساطیر اور شیطانی اساطیر دونوں پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا بھی دوسرے کے بغیر امکان موجود ہوتا' ان دونوں میں کسی ایک پر بھی اعتبار نہ کرنا ہولناک گناہ ہوتا۔ مریم کا عمل عبادت اور شیطان کا عمل جادوگری دونوں کے لیے ٹونے ٹوٹکے موجود تھے۔ انسان ایک گھڑے کا سوار تھا جس کی تہ ندارد تھی اس دنیا میں زندگی کا بسر کرنا گویا شیطان کے ساتھ ایک مستقل جنگ کرنا ہے جس میں کہ ہر شخص کلیسائی جنگ جو کی حیثیت سے شامل ہوتا ہے۔جس سے وہ نہ صرف اپنی ذات بلکہ اپنے سرداروں کی حفاظت کے لیے بھی لڑتا ہے۔ کلیسا کو فرشتوں اور بزرگان مسلک کی تائید اور امداد حاصل ہے اور فتح اس کا مقدر ہے - اس لیے وہ اپنے بلند مقام پر استادہ برائی سے نفرت کرتا ہے اور اس کے عسکریوں کو خدا کی برکت اور تائید حاصل ہوتی ہے۔ مریم ان کی محافظہ ہے اور اس کی شفقت کی بنا پر وہ ہر تکلیف سے محفوظ ہے۔ وہ اپنے عسکریوں کو ان کی بہادری پر القامات عطا کرتی ہے دونوں جہاں انھیں کے لیے ہیں۔ ان کی اساطیر' فن' عبادت' تعلیم اور تصوف ان ہی کے دم سے قائم ہیں۔ شیطان کی طرف سے بھی خرق عادت واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ مذہبی عروج کے دور میں ہی یہ علامتی رنگ آمیزی مقبول ہوتی ہے۔ کنواری کے لیے سفید اور نیلا رنگ مخصوص ہیں - شیطان کے لیے کالا سیاہ رنگ مقرر ہے۔ علاوہ ازیں گندھک کا رنگ اور سرخ رنگ بھی اسی کے حصے میں آئے ہیں - فرشتے اور روحانی مخلوق خلا میں گھومتے رہتے ہیں مگر شیاطین اچھل اچھل کر چھلانگیں لگاتے ہیں اور چڑیلیں رات کو اڑتی پھرتی ہیں۔ یہ دونوں عوامل ساتھ ساتھ یعنی رات اور روشنی اور گوئٹے کا سارا فن جس کی داخلیت کا بیان ممکن نہیں' یہ صرف داخلیت کا بیان ہے' کسی فنکارانہ خوش خیالی کا نہیں۔ ہر آدمی کو اس کا علم تھا کہ دنیا میں فرشتے اور شیاطین دونوں کی آبادی ہو گی - تمام فرشتے ' نیک روحیں اور قدیم روحانی حکمران اور روئی صورت والی اشیا جو عظیم کلیساؤں کے پھاٹکوں میں موجود ہوں گی' یہاں تک کہ ہوا میں بھی دیکھی جا سکیں گی۔ انسان ان کے وجود کو ہر جگہ محسوس کرے گا۔ آج تو ہم یہ نہیں جانتے کہ اساطیر کیا ہے کیونکہ جمالیاتی طور پر یہ کوئی عمدہ ذریعہ اظہار نہیں مگر یہ حقیقت کا ایک ایسا حصہ ضرور ہے جو شعور بیدار کے ہر کونے کی تلاشی لیتا ہے اور وجود کے داخلی میدان کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ یہ مخلوق ہمیشہ سے ہی موجود رہی ہے۔ یہ ایسی شے ہے جسے بغیر دیکھے بھی مشاہدے میں لایا جا سکتا ہے' ان کے وجود کا یقین کے ساتھ احساس کیا جاتا ہے اور ان کے وجود کا ثبوت طلب کرنا بے عزتی سمجھا جاتا ہے جس کو آج ہم اساطیر کہتے ہیں وہ قدیم دور کا ادب ہی ہے۔ اسے اسکندری ادب ہی کہہ لیں' قدیم لوگ اس سے لطف اندوز نہیں ہوتے تھے کیونکہ اس کے پس منظر میں موت ہی کا ذکر ہوتا۔

کیونکہ شیطان نے انسانی ارواح پر قبضہ کر لیا اور ان کو کفر' عیاشی' اور سیاہ فنون کی ترغیب دی۔ زمین پر اس کے خلاف جنگ لڑی گئی اور یہ جنگ آگ اور تلوار سے ان کے خلاف لڑی گئی جنھوں نے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ ہمارے لیے آج بڑا آسان ہے کہ ہم اپنے آپ کو ایسے تصورات سے باہر

بجھیں لیکن اگر ہم ان تمام عناصر کو رومی پریشان کن حقائق سے باہر نکال دیں تو پھر باقی صرف رومانیت رہ جائے گی - یہ صرف مریم کے لیے محبت افزا نغمات ہی نہ تھے مگر ایسی فریاد بھی تھی جو جنت تک پہنچ گئی' اس پہیے کی رفتار کلیسا کے لیے گراں تھی۔ اس دور میں ہر شخص شدید خطرے کے احساس کے ساتھ زندگی بسر کر رہا تھا۔ یہ دوزخ کا خوف تھا' کوئی پھانسی پر لٹکائے جانے کا خوف نہ تھا۔ ہزارہا چڑیلیں ایسی وجود میں آ گئیں جو اپنے آپ کو فی الحقیقت ایسا ہی سمجھتی تھیں۔ وہ اپنی ذات کی نفی کرتیں دعائیں کرتیں کہ انھیں اس طرح کی زندگی سے نجات ہو اور صرف حق کی خالص محبت کے لیے وہ اعتراف کرتیں کہ کتنی راتیں انھوں نے برائی کے ساتھ بسر کیں اور اپنے آپ کو فروخت کیا۔ منصفین نے ان کی روح کو بچانے کی لیے انھیں سولی پر چڑھا دیا۔ یہ رومی اساطیری روایت ہے اسی سے کلیسا' صلیبی جنگ آزماؤں ' روحانی نقاشی اور تصوف کا رواج ہوا۔ ان کے سائے میں جو رومی پھولوں کی بہار آئی' آج ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کارولنگی دور میں یہ تصورات عجیب و غریب اور بعید تھے۔

شارلیمن نے اول سیکسنی قبضے (۷۸۷ء) کے بعد قدیم جرمن عقیدہ آفات شب پر پابندی لگا دی۔ یہ پابندی ۱۱۲۰ء تک جاری رہی جبکہ اسے غلط تسلیم کر لیا گیا اور وورم کے برکارڑ نے اس کے خلاف فیصلہ دے دیا۔ مگر بیس سال بعد قدرے نرم صورت میں یہ پابندی دوبارہ عائد ہوگئی۔ ہسٹرباخ کا قیصریئس اس شیطانی داستان سے بخوبی واقف تھا اور اس کی کتاب لیجنڈا اوریا میں یہ داستان اسی قدر گرم جوشی سے بیان کی گئی ہے جس طرح کہ مریم کی داستان زبان زد عام تھی۔ ۱۲۳۳ء میں جب مینز اور سپئیر کے کلیسا زیر تعمیر تھے۔ روم میں بل واکس نمودار ہوا جس کی وجہ سے شیطان اور چڑیل کی داستان قانونی طور پر تسلیم کر لی گئی - سینٹ فرانسس کی نظم سورج کی منقبت کو لکھے ہوئے بہت عرصہ نہ گزرا تھا' فرانسیسیوں نے مریم کے بت کے سامنے گھٹنے ٹیکنے شروع کر دیے تھے اور اس کے مسلک کی تبلیغ کا آغاز کر دیا تھا۔ جبکہ ڈومینیکوں نے اپنے آپ کو شیطان کے خلاف جنگ کرنے کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا تھا اور انھوں نے اس غرض کے لیے بے دینوں کے خلاف عدالت قائم کر لی۔ آسمانی محبت نے اپنی توجہ مریم کی طرف کر لی تو اس کے نتیجے میں ارضی محبت کو شیطانی محبت قرار دے لیا گیا۔۔ عورت گناہ ہے۔۔۔۔پس بڑے راہبوں نے محسوس کیا جیسا کہ کلاسیکی چین میں محسوس کیا گیا تھا اور ہندوستان میں بھی ایسا ہی تصور تھا کہ عورت کا وجود گناہ کا مجسمہ ہے اور شیطان عورت ہی کے ذریعے حکمرانی کرتا ہے۔ عورت ہولناک گناہوں کا پرچار کرتی ہے۔ تھامس ایکوی ناس نے ان کوبس اور سکوبا کا نظریہ پیش کیا۔ داخلی تصوف جو بونا و نطورا' البرطوس ' میگنوس' ڈونس سکوطوس ایجاد کیے۔ وہ تمام کے تمام شیطانی مابعد الطبیعیات تھے۔

جہاں تک عالمی تصورات کا تعلق ہے نشاۃ ثانیہ رومی تصورات سے بے حد متاثر تھی جب وسری نے سیمابیو اور جیوٹو کو مراجعت فطرت کے لیے اپنا استاد تسلیم کیا تو اس کے ذہن میں فطرت کا تصور وہی تھا جو رومیوں کے ذہن میں تھا جس میں وہ تمام فرشتے اور شیاطین موجود تھے جو رومی اساطیر کا حصہ ہیں۔ شیاطین ہمیشہ نور پر غلبے کے لیے کوشاں تھے۔ فطرت کی نقل سے مراد اس کی روح کی نقل تھی سطح کی نہیں۔ ہمیں

اس تصورے نجات حاصل کرنی چاہئے کہ نشاۃ ثانیہ کی وجہ سے کلاسیکی قدامت کو نئی زندگی ملی - نشاۃ ثانیہ سے مراد یہی تھی کہ رومی تصورات جن کا تعلق ۱۰۰۰ء کے بعد کے دور سے ہے ان کو آگے بڑھایا جائے جدید فاؤستی تجربہ جدید عالمی احساس جو خودی کو لامتناہیت سے منسلک کرتا ہے' بلاشک یہ چند افراد کے لیے اس سے مراد کلاسیکیت کی پرجوش حمایت ہی سمجھی گئی - (یا ان تصورات کی جن کو کہ غلطی سے کلاسیکی سمجھ لیا گیا) یہ صرف ذوق کا معاملہ ہے اور اس سے زائد کچھ نہیں - کلاسیکی اساطیر تو محض ذریعہ تفریح تھا تمثیلی ڈرامہ جس پر ایک پتلا سا پردہ چڑھا دیا گیا تھا جیسا کہ آغاز ہی سے (یہ پردہ) موجود تھا اور قدیم رومی حقیقت اس کے عقب میں پنہاں تھی - قدیم جال ہٹا دیے گئے اور فلورنس کی ثقافت فی الفور نمایاں ہو گئی۔ فلورنس کے باشندوں کی جدوجہد کلیسا کے لیے تھی اور انھوں نے اپنے عقیدے کی پختگی کے ساتھ اس کے لیے جدوجہد کی۔ رافیل تمام جدید مصوری سے آشنا تھا۔ اس کے فن اور ادب میں شیطان کی کارروائیوں سے نجات اور اس کے لیے بزرگوں کی مدد کا دل سے قائل ہونے کا ثبوت ملتا ہے اور متعدد مصوروں' ماہرین فن تعمیر اور انسانیت نوازوں کے ہاں ہمیں سسرو' ورجل' وینس اور اپالو کے نام بھی ملتے ہیں' لیکن چڑیلوں کے مجسموں کو جلانا اور شیطانوں سے حفاظت کے لیے تعویذوں کا پہننا ایک فطری عمل معلوم ہوتا ہے۔ مرسیلی اس فی سی نس کی تحریریں شیاطین اور چڑیلوں کے اثرات سے ازالے کی عالمانہ تحریریں ہیں۔ فرانسکو ڈیلا میران ڈولا نے (فصیح لاطینی میں) اپنا مقالہ چڑیل" کے عنوان سے تحریر کیا' تاکہ اپنے حلقے کے دوستوں کو وہ اس عذاب سے بچالے - جب لیونارڈو ڈاونسی' نشاۃ ثانیہ کا سربراہ تھا اس نے اپنا سلیڈرنا" چڑیلوں کا ہتھوڑا " پر روم میں (۱۴۸۷) کام کا آغاز آ کیا۔ انسانیت نواز لاطینی کی یہ اولین تصانیف تھیں یہی کتب ہیں جن کو نشاۃ ثانیہ کا سرمایہ قرار دیا جاتاہے اور ان کے بغیر ہم روم مخالف رومی تحریک کا اندازہ کبھی نہیں کر سکتے۔ وہ لوگ جنھوں نے شیطان کو قریب سے کبھی نہیں دیکھا وہ "ڈیوائن کامیڈی" یا "اوردیٹو" - یا سسٹائن کے گرجے کی چھت کی تخلیق کبھی نہ کر سکتے۔

یہ اسی اساطیر کا مضبوط پس منظر تھا' جس نے فاؤستی روح کے اندر وہ احساس پیدا کیا جو اسی کا حصہ ہے' ایک انا لامتناہیت کا حصہ بن گئی ایک خودی جو قوت محض تھی مگر لامتناہیت میں وہ ایک کمزور قوت تھی۔ وہ تمام کی تمام عزم کا مجسمہ تھی مگر ایک ایسا عزم جو اپنی آزادی سے خوف زدہ تھا۔ اس سے قبل مسئلہ آزادی کو اس قدر سنجیدگی اور گہری فکر سے کبھی نہیں لیا گیا۔ ہماری ثقافتوں میں ایسی مثال موجود نہیں مگر محض اس وجہ سے کہ مجوسی قوت ارادہ کی سبکدوشی ناممکنات میں سے تھی ---- کیونکہ وہ فکر جس میں وجود کا عنصر مفقود تھا یا وہ کسی مکمل روح کا صرف ایک جزو تھا مگر ایک فرد جو اپنی خودی سے محض اس لیے برسرپیکار تھا کہ اسی (خودی) کا وجود قائم رہے۔ وہ آزادی کو ایک ایسی زنجیر سمجھتا تھا جسے ساری زندگی وہ اپنے ساتھ گھسیٹتا رہے' اور اس کے نتیجے میں زندگی بھی ایک زندہ موت بن کر رہ جائے اور اگر ایسا ہو تو کیوں؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ یا کس غرض سے؟

اس مسئلے پر غور کے بعد جرم کا شدید احساس پیدا ہوتا ہے جو ان صدیوں میں ایک طویل بین کی

طرح نوحہ یاس بن چکا ہے۔ کلیسا خدا کی مہربانی سے بلند سے بلند تر ہوتے رہے ۔ رومی محراب اور گنبد گویا عبادت کے لیے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں اور طویل غلام گردشوں میں اونچی کھڑکیوں سے ذرا بھر بھی روشنی منعکس نہیں ہو رہی۔ کلیسا کی حلق سوز تانیں لاطینی حمدیہ نظمیں' چھلے ہوئے گھٹنے اور راتوں کو کوڑے کھانے کے لیے عقوبت خانوں میں جانا سب کچھ برداشت کیا جاتا تھا۔ مجوسی مذاہب میں جنت قریب تھی مگر رومیوں کے نزدیک یہ مقام بہت دور تھا بلکہ لاانتہائی فاصلوں پر تھا۔ کوئی ہاتھ بھی اس طویل فاصلے سے مدد کو نہیں پہنچ سکتا تھا اور تنہا خودی کے لیے شیطانی عالم ہر وقت خطرے کا باعث تھا۔ اس لیے تصوف کی سب سے بڑی خواہش اپنی خود ساختہ ہیئت سے نجات حاصل کرنا تھا (جیسا کہ ہنرک سیوس کا قول ہے) کہ آلائش عالم مع اپنی ذات کو ترک کر دو ۔ اور ان آرزوؤں میں سے بعض ایسے لطیف تصورات کا وجود ممکن ہوا ہے جن پر بار بار عمل جراحی کیا گیا ہے تاکہ ان کی وجوہات تک رسائی حاصل ہو سکے اور بالآخر ایک عالمی احتجاج اور درخواست کہ رحم وکرم کا سلوک کیا جائے۔ اس مرحمت سے مراد مجوسی رحم وکرم کا وجود نہیں بلکہ فاؤستی تصور رحم و کرم' جو عزم و ارادے کو کھلا چھوڑ دیتا ہے۔

عزم وارادے کی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تہ میں وہ آرزو ہے جسے فاؤستی ثقافت بطور تحفہ طلب کرتی ہے یعنی عشائے ربانی کی سات تقریبات جو روم میں مروج ہیں اور پیٹر لیمبارڈ نے انھیں ایک ہی تصور کیا ہے اور ۱۲۱۵ء کی لیٹران مجلس میں طے کیا گیا اور تھامس ایکوی ناس نے اس پر اپنے تصوف کی بنیاد رکھی۔ اس کا مطلب صرف اور صرف اسی قدر ہے کہ ان کے ہمراہ ایک روح موجود ہے' روح کی یہ اکائی ولادت سے موت تک ان کو سفلی اعمال سے تحفظ فراہم کرتی ہے جو ان کو اور ان کے عزم وارادے کو اپنے جال میں پھنسانا چاہتی ہیں۔ اپنے آپ کو شیطان کے پاس فروخت کرنے کی یہی مراد ہے کہ اپنا عزم اس کے حوالے کر دیا جائے۔ جنگ جو کلیسا جس کا وجود ہمیں روئے زمین پر نظر آتا ہے ان لوگوں پر مشتمل ہے جو عشائے ربانی سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور اس سے اپنے عزم میں پختگی پیدا کرتے ہیں۔ آزاد وجود کا یہ یقین قربان کی دعوت تک قائم رہتا ہے اور اسی مقام پر اس کے معانی میں ایک بڑی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ کایا پلٹ کے خرق عادت واقعات جو ہر روز پجاریوں کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوتے ہیں ---- اس تقدیس و تحریم کا میزبان جو کلیسا کی بلند قربان گاہ پر استادہ ہے جبکہ معتقد اس کے سامنے کھڑا ہے جس نے اپنے آپ کو محض ارادے کی آزادی کے حصول کے لیے قربان کیا ہوا ہے۔ اسے وہ اطمینان اور سکون محسوس ہوتا ہے جس کا جدید دور کے لوگ اندازہ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا یہ تشکر ہی کا نتیجہ تھا جبکہ کیتھولک مسلک کی عظیم دعوت کی کورپس کرسٹی کے گرجے میں بنیاد رکھی گئی یہ ۱۲۶۴ء کا واقعہ ہے

مگر اس سے بھی زیادہ اہم ----اور بعید تر ---- فاؤستی دعوت توبہ ہے۔ یہ تقریب اساطیر مریم اور اساطیر شیطان کے علاوہ رومیوں کی تیسری بڑی تشکیل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس تیسری عظیم تخلیق کی بدولت پہلی دو تخلیقات کی قدر وقیمت میں اضافہ پیدا ہوتا ہے۔ اس سے اس ثقافت کے راز ہائے سربستہ کی روح عیاں ہوتی ہے اور اس کی بنا پر ہم اس ثقافت کا دوسری ثقافتوں سے امتیاز قائم کر لیتے ہیں۔ مجوسی اصطباغ کے اثرات یہ تھے کہ متعلقہ فرد کو بھی اس اجماع میں شامل کر لیا جائے۔ اس کے اندر بھی روحانی

مزاج پیدا کیا جائے جو دوسروں میں موجود ہے اور بعدازاں اجتماعی عزم اس کا فرض بن کر اس پر عائد ہو جاتا ہے مگر اس فاؤستی اصطباغ میں شخصیت کا تصور بھی شامل ہے ۔ مگر اس دریافت کا سہرا نشاۃ ثانیہ کی تحریک پر نہیں اس نے صرف اس حد تک کیا کہ شخصیت کو نکھار کر نمایاں کر دیا' جہاں سے کہ ہر شخص کی توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی شخصیت کا تصور رومیوں کے ہاں پیدا ہوا۔

اس لحاظ سے یہ رومیوں کی مخصوص ملکیت ہے بلکہ رومی روح کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ اصطباغ ایک ایسی فعالیت ہے جو ہر شخص انفرادی طور پر بجالاتا ہے۔ وہ اپنے ضمیر کو تنہا تلاش کرتا ہے۔ وہ لاانتاہیت کے سامنے غمگین صورت میں کھڑا ہوتا ہے اور اسے اپنی ماضی کی کوتاہیوں کا صدق دل سے اعتراف کرنا ہوتا ہے۔ وہ اپنے ضمیر کی خود تلاشی لے سکتا ہے اور اپنی خطاؤں کا اپنے الفاظ میں اظہار کر سکتا ہے اور استغفار کی وجہ سے جب اس کی خودی آزاد ہو جاتی ہے تو دوبارہ خطاکاری سے بچنا اس کی اپنی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اصطباغ شخصی فعل نہیں' یہ فرض اس لیے ادا کرنا ہوتا ہے کہ بحیثیت انسان یہ اجتماعی ذمہ داری ہے' اس لیے نہیں کہ یہ فلاں آدمی ہے مگر تصور استغفار سے یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ ہر فعل کی ذمہ داری صرف اس کے فاعل پر ہے۔ مغربی ڈرامے اور کلاسیکی ڈرامے میں یہی فرق ہے۔ چینی اور ہندی ڈرامے بھی کلاسیکی نہج پر ہی ہیں۔ اسی لیے ہمارا دستور ہمیشہ فاعل کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے اور فعل کی بجائے فاعل ہی کے حوالے سے بات کرتا ہے اور ابتدائی اخلاقی تصورات کی بنیاد انفرادی افعال پر ہوتی ہے نہ کہ کسی مخصوص کردار پر۔ فاؤستی ذمہ داری مجوسی تسلیم ورضا کے برعکس نیز انفرادی بجائے اجماع اور قبولیت کے مقابلے میں طلب رعایت اور بوجھ سے خلاصی حاصل کرنے کے تصور پر مبنی ہے اور اس کے پس منظر میں دوبارہ عمق عالم اور لاانتہائی تحرک کا فلسفہ موجود رہتا ہے۔ اصطباغ صرف ایک شخص کا ہوتا ہے اور استغفار ایک ایسا فعل ہے جو ایک فرد خود انفرادی طور پر خود ہی بجا لاتا ہے اور اس میں انسان خود اپنا ماضی خود تلاش کرتا ہے۔ اپنے ماضی کی شہادت دیتا ہے اور آئندہ تربیت کی تیاری کرتا ہے۔ اس سے انسان کے متعلق فاؤستی تاریخی تصور کا اظہار ہوتا ہے اور کوئی ایسی ثقافت نہیں جس میں کہ ایک زندہ انسان کی شخصی زندگی کی ہر جہت کی اس طرح نشاندہی کی جاتی ہو اور اسے اتنی اہمیت دی جاتی ہو کہ اس کا تفصیلی بیان کیا جاتا ہو۔ اگر مغرب میں تاریخی تحقیق اور سوانح عمریوں کا اہل مغرب میں رواج پڑ گیا ہے تو اس کی وجہ یہی رسم ہے۔ چونکہ اس میں ذاتی پڑتال اور اعتراف دونوں شامل ہیں۔ اگر ہماری زندگیاں ایک یقین اور تاریخی پس منظر کے شعوری حوالے سے بسر کی جانی مطلوب ہیں تو مغرب کے سوا کہیں بھی اس کے امکان اور برداشت کا تصور موجود نہیں۔ اگر ہم بالاخر تاریخ پر دوبارہ ایک نظر ڈالیں اور ہزاروں سالوں کا جائزہ لیں کیونکہ یہی ہماری عادت ہے کہ ہم تاریخ پر محض تفریح یا حاشیہ آرائی کے لیے نظر نہیں ڈالتے بلکہ ہزاروں سالوں کے حساب سے اس کا جائزہ لیتے ہیں۔ چین اور کلاسیکی عالم میں یہ صورت نہ تھی وہ لوگ کسی سمت یا تقدیس کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ ہمارے ذہن میں رومی کلیسا میں عشائے ربانی کی تقریب کا تصور موجود ہے۔ یہ ہماری تاریخ کا ایک اہم مقام ہے۔ اس کے تصور سے ہم اپنی خودی کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں اور اس کے لیے شکرگزاری کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ ہر اعتراف کے موقع پر ایک سوانح عمری لکھی جاتی ہے -

ہمارے لیے عزم کی یہ آزادی اس قدر ضروری ہے کہ اگر مغفرت سے انکار کر دیا تو ہم مایوسی کا شکار ہو جائیں گے بلکہ تباہ ہو جائیں گے۔ صرف وہ اشخاص جو اس داخلی تجربے کا احساس رکھتے ہیں وہی اس قربانی کا مطلب سمجھ سکتے ہیں۔ عشائے ربانی حیات نو کی امید ہے۔ یہ دعوت ان لوگوں کے لیے ہے جو ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں

جب اس عظیم فیصلے کے بعد روح صرف اپنے سہارے پر رہ جاتی ہے تو بعض غیر طے شدہ امور اس پر ایک بادل کی طرح چھائے رہتے ہیں۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں دوسرا کوئی اور ایسا مذہب نہیں جس نے اپنے پیروکاروں کے لیے اتنی مسرت کا اہتمام کیا ہو۔تمام داخلی اور فلکی محبت جو اس رومی یقین کا نتیجہ ہے جو پادری کو تفویض کردہ اختیار پر مبنی ہیں' وہ عدم تحفظ جس کا آغاز اس رسم استغفار کے زوال کے نتیجے میں ہوا۔ اس کے نتیجے میں رومی مسرت 'مریم کا نورانی عالم دونوں پردے میں اوجھل ہو گئے' صرف شیطانی عالم قائم رہا' جس میں پریشانیوں کے بادل اڈ رہے ہیں اور بجائے اس کے کہ برکت حاصل کی جائے ناقابل حصول حد تک ضائع ہو چکے ہیں۔ 'پروٹسٹنٹ اور پرہیزگاری کی جرات آزمائی کا دور آگیا جو ہمیشہ برسر پیکار رہے گا خواہ اس سے کوئی نتیجہ نکلے یا نہیں اور ہار کر بھی لڑتا رہے گا۔ گوئٹے نے ایک دفعہ کہا کہ "اذنی اعتراف کبھی بھی بنی نوع انسان سے حاصل نہیں کرنا چاہیے تھا" ان ملکوں میں جن میں کہ یہ رواج ختم ہو چکا ہے اس کے لیے ایک بہت بڑی خواہش پیدا ہوئی۔ اخلاقیات'لباس 'فن اور فکر' رات کے رنگوں پر چھا گیا اور صرف اساطیر کا وجود غالب آ گیا۔ کانٹ کے اصول کے مساوی کوئی کلیہ اس قدر روشن نہیں۔" ہر شخص خود اپنا پادری ہے مگر پادری کے ذمے متعدد فرائض کے علاوہ ایک اعتراف کی رسم کی رہنمائی بھی ہے۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے بخشش یا نجات کے احکام جاری کرنے کے اختیارات تفویض ہو گئے ہیں۔کوئی شخص تنہا نجات کے داخلی یقین کے ساتھ اعتراف نہیں کرسکتا۔ مگر روح کی ضرورت یہی ہے کہ اسے ماضی سے نجات حاصل ہو اور اسے دوبارہ راہ راست پر ڈالا جائے۔یہ ضرورت ہمیشہ سے اتنی ہی شدید رہی ہے جتنی کہ ماضی میں تھی۔ ابلاغ کے تمام ارفع ذرائع قلب ماہیت کا شکار ہو چکے ہیں اور پروٹسٹنٹ ممالک میں موسیقی اور نقاشی 'خطوط نویسی اور یادداشتیں جو تمام بیان کی صورتیں سمجھی جاتی ہیں " انھیں نفی ذات یا ملامت خود کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے اور اسی کو لامحدود اعتراف اور تریاق قرار دے لیا گیا ہے۔ کیتھولک حلقوں میں بھی ----- سب سے بڑھ کر پیرس میں فن کو نفسیات کے زیراثر عشائے ربانی' نجات اور اعتراف کا بدل سمجھ لیا گیا ہے۔ دنیا کے متعلق تصورات انسان کے اندر تباہ کن جنگ کے تحت ختم ہو گئے۔ لامتناہیت کی جگہ اپنے ہمعصر یا ورثا کو پادری اور منصف مقرر کر دیا گیا۔شخصی فن جو گوئٹے 'دانتے 'ریم براںڈ اور مائیکل انجلو کے ذہن میں تھا' اسے اعتراف اور استغفار کا بدل سمجھ لیا گیا۔ اس سے جو علامات ظاہر ہوئیں وہ یہی تھیں کہ موجودہ ثقافت اپنے آخری ایام پورے کر رہی ہے

۴

تمام ثقافتوں میں تحریک اصلاح کلیسا سے مراد یہی ہے کہ مذہب کو دوبارہ اس کی اصل اور خالص حالت میں لایا جائے جیسا کہ وہ اپنے آغاز کی صدیوں میں تھا۔ ہر ثقافت میں یہ تحریک موجود ہوتی ہے' خواہ اس کا ہمیں علم ہو 'جیسا کہ مصر میں یا ہم اس سے لاعلم ہوں جیسا کہ چین میں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شہر اور شہری روح آہستہ آہستہ اپنے آپ کو آزاد کر رہی ہے اور دیہات سے اپنا رشتہ منقطع کر رہی ہے اور اس طرح ثانی الذکر کی تمام قوتوں کو اپنے خلاف کر کے ایسے فکر و احساس کے متعلق سوچ رہی ہے جو قدیم شہری مزاج کے مطابق تھی اور اسے جدید دور کے حوالے سے برسر عمل لا رہی ہے - یہ قضاوقدر کا فیصلہ تھا کسی کی ذہنی اپج نہ تھی جس نے کہ مجوسی اور فاؤسی ثقافتوں کو اس موقع پر نئے مذاہب کی تخلیق پر مجبور کیا۔ ہم آج جانتے ہیں کہ چارلس پنجم کے عہد میں لوتھر اپنے ایک فعل کی وجہ سے مصلح بن کر تمام غیر منقسم کلیسا کو اپنے زیر نگین لانا چاہتا تھا۔

تمام مصلحین کی طرح جو ہر ثقافت میں ہو گزرے ہیں 'لوتھر کے لیے بھی یہ آخری موقع تھا جس نے اسے کھلے میدانوں کے پادری کی حیثیت سے کھینچ کر شہری اسقف بنا دیا - تحریک اصلاح توروم نے جاری کی تھی اور عہد نامہ جدید کو مکمل کیا تھا -لوتھر کے نغمات اجتماع (Ein feste burg)فی الحقیقت باروق کے مزاج کے مطابق تھے' ان میں اس وقت بھی لاطینی شان و شوکت موجود تھی' کلیسا کے متخاصم طبقے کا آخری مضبوط شیطانی نغمہ تھا

لوتھر نے بھی ان مصلحین کی طرح جو ۱۰۰۰ء کے بعد پیدا ہوئے کلیسا کے خلاف اس لیے جنگ نہیں کی کہ اس کے مطالبات بہت زیادہ تھے بلکہ اس لیے کہ اس کے مطالبات بہت کم تھے۔ سب سے زیادہ بھاپ کلونی نے خارج کی اگرچہ بریشیا کا آرنلڈ یہ چاہتا تھا کہ ہمیں دور اول کی سادگی کی طرف مراجعت کرنی چاہیئے مگر اسے ۱۲۵۵ء میں زندہ جلا دیا گیا۔ اگرچہ فلورنس کا جوچم جس نے کہ مصلح کا لفظ پہلی دفعہ استعمال کیا فرنسکی نظام کی روحانی شخصیت ' جیکوپوں ڈاٹوڈی انقلابی اور نغمہ سرا وہ سردار تھا جو اپنی بیوی کی موت کے ایک سال بعد راہب بن گیا اور بونی فیس ہشتم کو معزول کرنے کی کوشش کی' کیونکہ وہ کلیسا کے انتظام میں سستی کا مظاہرہ کرتا تھا۔اگرچہ وائی لف اور ہوفس اور سیوونارولا سے لے کر لوتھر' کارلس ٹیڈ' زونگلی' کابون اور لوبولا اس کے مددگار تھے۔ ان لوگوں کا مقصد اول سے لے کر آخر تک یہی تھا کہ رومی عیسائیت پر غلبہ حاصل کیا جائے اور اسے داخلیت تک محدود کر دیا جائے۔ مرشیئن ' آتھانے سی اس یک طبیعتی مسیحی اور نسطوری جنھوں نے مجالس ایفے سوس میں اور چالس ڈون میں یہ خواہش ظاہر کی کہ اصل کی طرف مراجعت اختیار کی جائے - کلاسیکی دور کی ساتویں صدی (ق م) میں آرفیتی اس نوعیت کے اولین باشندے نہیں بلکہ آخری تھے' جنھوں نے ۱۰۰۰ ق م میں مصر میں قدیم سلطنت کے آخری ایام میں رومی مذہب کے دوبارہ اجرا کی کوشش کی۔ یہ ایک عبر کا خاتمہ تھا۔ نئے عہد کا آغاز نہ تھا کہ جس کی یہ نشاندہی کرتے ہیں۔ اسی

نوعیت کی ایک تحریک اصلاح ویدوں کے مذہب میں دسویں صدی (ق م) میں عمل میں آئی اور اس کے نتیجے میں برہمن اقتدار دوبارہ وجود میں آ گیا اور نویں صدی میں ایسا ہی انقلاب چین کی مذہبی تاریخ میں بھی آیا ہو گا۔

بہرحال مختلف ثقافتوں میں تحریکات اصلاح مذہب کے طریقہ ہائے کار باہم مختلف ہوں‘ سب کا مقصد ایک ہی تھا کہ عقائد میں دور دہریت یا مذہبی آزادی کے زمانے میں جو کمزوریاں پیدا ہو چکی ہوں ان کو میدان فطرت میں‘ صفائی شعور بیدار کے ساتھ مذہب کے ابتدائی ایام کی روح سے ہم آہنگ کیا جائے اور اس کے منظم اسباب اور اسباب نفوذ کا سہارا لیا جائے۔ معاشیات کی دنیا میں (دولت) سائنس کا نفوذ کیا جائے اور وہ "غربت" جو نسلی بنیادوں پر منتقل ہو رہی ہے اسے دور کیا جائے (نشاۃ ثانیہ اور تحریک اصلاحات نے بھی انھیں خطوط پر کام کیا)۔ سب سے پہلے روحانی اور رہبانوی طبقات کی حالت بہتر بنائی جائے اور بالآخر (اگرچہ ناممکنات میں معلوم ہوتا ہے) سیاسی اور مفاد پرست عناصر کی اصلاح کی جائے اور اسباب وعلل کی مقدس دنیا میں جو انسانی عمل دخل کی بدولت اور نسلی اثرات کی وجہ سے جو خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں ان کو رفع کیا جائے۔

ان ایام میں مغرب ---- اور دوسری ثقافتوں میں بھی صورت حال یکساں ہی تھی ---- معاشرے کو تین طبقات میں تقسیم کر دیا گیا (یہ شہری معاشرے سے متعلق ہے) سیاسی‘ مذہبی اور معاشی مگر اس تصور کا تعلق صرف شہری آبادی سے تھا اور قلعے اس سے الگ رہے اور دیہات بھی محفوظ رہے۔ سرکاری ملازم (عمال) منصفین کا تعلق اول الذکر طبقے سے تھا‘ پڑھے لکھے لوگ دوسرے طبقے میں شامل تھے مگر کسانوں کو فراموش کر دیا گیا۔ نشاۃ ثانیہ اور تحریک اصلاح کلیسا کی مخالفت کی کلید یہی ہے۔ یہ ایک طبقے کی مخالفت تھی اور عالمی احساس کی مخالفت نہ تھی جیسا کہ نشاۃ ثانیہ اور رومی عہد میں عمل میں آیا قلعوں کی آبادی کا ذوق اور صومعات شہروں میں منتقل ہو گئے اور پھر مستقل آباد ہو گئے اور جب ان کی مخالفت شروع ہوئی جیسا کہ فلورنس اور میڈی سی سے لے کر ساوونا رولا تک یا جس طرح کہ یونان میں شہری شرفا کی آبادی مخالفت کا شکار ہوئی ---- یہ وہ عہد تھا جب کہ ہومر کی تصنیفات مکمل ہو چکی تھیں ---- اور آئیسوں کا یہ دور آخر تھا۔ یہ لوگ بھی تحریر کے دھنی تھے۔ نشاۃ ثانیہ کے فن کار اور انسانیت نواز ٹروباڈوروں اور منسٹروں کے صحیح جانشین ہیں اور جس طرح کہ آرنلڈ سے لے کر بردشیا تک اور پھر لوتھر تک ایک طویل سلسلہ قائم رہا۔ اسی طرح برٹرینڈ ڈی بورن اور بیری کارڈینل بذریعہ پیٹرارچ سے آری اوسٹو تک بھی یہ سلسلہ قائم رہتا ہے۔ قلعے شہری مقام بن گئے اور فوجی سرداروں نے قبائلی سرداروں کا روپ اختیار کر لیا۔ تمام تحریک محلات تک محدود ہو کر رہ گئی اور عدالتوں کی صورت اختیار کر گئی۔ اب ان کا دائرہ کار اس حد تک محدود رہ گیا جو نرم گو معاشرے تک محدود ہوتا ہے۔ اس کی ظاہری چمک دمک اور خوش مزاجی نمایاں ہوتی ہے کیونکہ اس کا تعلق انصاف کے عمل سے ہوتا ہے۔ ہومر اس کی ایک مثال ہے اور وہ ماحول جس میں بدذوقی کے مسائل موجود رہتے تھے اس میں دانتے اور مائیکل اینجلو کا کوئی مقام نہ تھا۔ یہ علاقے لیس سے لے کر شمال تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان کا کوئی نیا عالمی نظریہ تو نہ تھا مگر ذوق بالکل نیا تھا۔ شمالی نشاۃ ثانیہ صرف تجارتی اور

سرمایہ دار طبقات پر مشتمل تھا اور مغرب میں اطالوی سرداروں کی جگہ فرانسیسی جرات آزمائی نے لے لی۔

مگر آخری مصلحین لوتھر اور ساوانا رولا بھی شہری راہب تھے اور یہی فرق ان کو جوچم اور برنارڈ کے طبقے سے الگ کرتا ہے۔ ان کے دانش ورانہ شہری رجحانات ان کی ترقی میں ممد ثابت ہوئے اور ان کے کلیسا انھیں کتب خانوں کی سہولت مہیا کرتے رہے۔ اس باعث انھیں باروق کی روایات سے بہت فائدہ پہنچا انھیں تجربات کا نتیجہ ہے جس نے لوتھر کو نظریہ برایت پیش کرنے میں مدد دی مگر اس کا تجربہ سینٹ برنارڈ جیسا نہ تھا جس نے جنگلوں‘ پہاڑوں‘ بادلوں اور ستاروں کا کھلے آسمانوں کے نیچے مطالعہ کیا تھا بلکہ ایک ایسے شخص کا مشاہدہ جو تنگ کھڑکیوں سے نیچے تاریک گلیوں‘ گھروں کی دیواروں اور پاکھوں کو دیکھتا رہتا ہے اور آزادانہ شعور جو اسے مقامی سرزمین سے منقطع کر دیتا ہے‘ اس کے اندر واقع ہے شہروں کی تنگی دیواروں کے سائے تلے شعور بیدار احساس اور معقولیت اپنا اپنا راستہ الگ کر لیتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں اور شہری تصوف جس کا تعلق مصلحین ماضی سے ہے اس دور میں عقل محض کا تصوف بن جاتا ہے۔ اس کا تعلق بصارت سے نہیں‘ اس سے مقاصد میں چمک دمک پیدا کی جاتی ہے جس سے قدیم اساطیری شخصیات زرد ماحول میں گم ہو جاتے ہیں۔

اس کے نتیجے میں یہ معاملہ اپنی تمام گہرائیوں کے ساتھ محض چند ہاتھوں تک محدود ہو کر رہ گیا۔ ماضی میں جو کچھ تھوڑا بہت غربا کے لیے کیا جا رہا تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ لوتھر کا شدت آمیز فعل محض ایک ذہنی فیصلہ تھا۔ اوکام کے سلسلے کا آخری آدمی کا خطاب اسے بلاوجہ نہیں دیا گیا۔ اس نے فاؤستی شخصیت کو مکمل طور پر آزاد کر دیا۔ پادری جو لامتناہیت اور عام آدمی کے مابین ایک واسطہ تھا الگ کر دیا گیا۔ اب وہ تنہا تھا اپنی سمت خود متعین کرتا‘ وہ اپنا پادری بھی خود ہی تھا اور جج بھی خود ہی تھا مگر عام آدمی صرف محسوس کر سکتا تھا ۔ مگر اس میں آزادی کے کسی عنصر کو سمجھ نہیں سکتا تھا۔ انھوں نے اس کا جوش و خروش سے استقبال کیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ انھیں بعض فرائض سے سبکدوش کر دیا گیا ہے مگر وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ جو فرائض معقولیت کے نام پر ان پر عائد کیے گئے ہیں وہ پہلے سے بھی شدید ہیں۔ اسیسی کے فرانسس نے بہت کچھ دے کر بہت کم لیا تھا مگر شہری اصلاحات نے لے تو بہت کچھ لیا مگر جہاں تک عوام کی اکثریت کا تعلق ہے اسے بہت کم حاصل ہوا۔

اس مقدس علت عشائے ربانی اور توبہ کو لوتھر نے داخلی تجربات نجات سے بدل دیا جو صرف ایمان پر مبنی تھے۔ وہ ذہنی لحاظ سے کلیئر واکس کے برنارڈ کے بالکل قریب آ گیا اور اس نے تصور ندامت کو پوری زندگی پر محیط قرار دیا اور اسے ایک ذہنی عمل قرار دیا جس کا خارجی دنیا میں ظاہری اعمال سے کوئی تعلق نہ تھا۔ دونوں سمجھتے تھے کہ استغفار ایک روحانی معجزہ ہے ۔ جہاں تک کہ کوئی انسان تبدیلی قبول کرتا ہے تو خدا ہی اسے اس کی توفیق عطا کرتا ہے مگر جسے عقلی تصوف تبدیل نہیں کر سکتا وہ فطرت آزاد کے باہر مقام 'تو' ہے۔ اس میں خدا اور مخلوق کو الگ الگ خانوں میں بانٹ دیا گیا ہے یعنی ایک کی دوسرا رہنمائی کرتا ہے۔

تمہیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ خدا نے تمہیں معاف کر دیا ہے مگر برنارڈ کے نزدیک یہ اختیارات پادری کے پاس تھے جو اس نے اپنے علم کی بدولت حاصل کیے تھے مگر لوتھر کے نزدیک یہ شک اور مایوسی میں جان پر کھیل جانے کا عمل تھا' یعنی ایک چھوٹی سی خودی جسے کائنات سے علیحدہ کر دیا گیا ہے' ایک انفرادی وجود میں جکڑ دی گئی ہے (اس لفظ کے معانی ومفہوم کتنا خطرناک ہے) اسے صاحب اختیار کی قربت کی ضرورت ہے اور عقل جتنی کمزور ہو گی اسے اسی قدر زیادہ صحبت سالک کی ضرورت ہوگی۔ مغربی پادری کے حتمی مطالب یہی ہیں جسے ۱۲۱۵ء سے عوام پر امتیاز بخشا گیا ہے تاکہ وہ عشائے ربانی کا اہتمام کرے اور اپنے نا قابل فراموش کردار کا مظاہرہ کرے۔ وہ ایک مددگار ہاتھ ہے جس کے ذریعے سے ایک بد نصیب غریب بھی خدا کا ہاتھ تھام سکتا ہے۔ لامتناہیت کے ساتھ یہ ظاہری واسطہ بھی پروٹسٹنٹ مسلک نے تباہ کر دیا۔ بعض مضبوط روحوں نے اسے اپنے لیے دوبارہ حاصل کر لیا مگر کمزور انسان کے لیے ہی بتدریج ختم ہو گیا۔ برنارڈ کے لیے گو یہ داخلی معجزہ کامیابی سے ہمکنار ہوا مگر وہ دوسروں کو اپنی راہ سے بے راہ نہ کر سکا۔ کیونکہ ہر شخص کی روح اسے عالم مریم کی فطرت زندگی سے شناسا کرتی ہے۔ وہ ہر وقت قریب تر اور مددگار رہتی ہے۔ لوتھر صرف اپنی ذات سے آشنا تھا اور اسے عوام سے کوئی واقفیت نہ تھی۔ اس نے حقیقی انسانی کمزوریوں کی بجائے اعلانیہ جرات آزمائی کا مظاہرہ کیا۔ اس کے نزدیک زندگی شیطان کے خلاف ناگزیر جنگ تھی اور اس نے ہر شخص سے مطالبہ کیا کہ وہ اس جنگ میں حصہ ادا کرے اور ہر وہ شخص جس نے اس جنگ میں حصہ لیا تنہا صرف اپنے طور پر لیا۔

تحریک اصلاح کلیسا نے رومی اساطیر کی تمام روشن اور اطمینان بخش کیفیت کا خاتمہ کر دیا---- مسلک مریم' بزرگوں کا احترام' قدیم آثار' اجتماعات سب ختم ہو گئے۔ مگر شیطانوں اور جادوگرنیوں کی اساطیر قائم رہیں کیونکہ یہ داخلی عذاب کے یہی اسباب تھے اور اب یہ عذاب اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ ظاہر ہو گیا(۵۱)۔ لوتھر کے نزدیک اصطباغ ایک جھاڑ پھونک کا عمل تھا' ایک ایسا عمل جس سے شیطان دور رہتا تھا۔ اس کے نتیجے میں شیطان کے متعلق بڑی مقدار میں ادب تخلیق ہوا۔ رومیوں کی دنیائے رنگ میں صرف سیاہ باقی رہ گیا۔ اس کے فنون موسیقی بالخصوص آرگن موسیقی میں دلچسپی باقی رہ گئی مگر اساطیر کی ہلکی پھلکی دنیا جسے ایمان کی قربت کی وجہ سے عوام ترک نہ کر سکتے تھے۔ لہٰذا جرمن اساطیر کا مدتوں سے دفن شدہ ذخیرہ دوبارہ سطح پر آ گیا۔ یہ اس قدر خفیہ انداز میں ظاہر ہوا کہ آج بھی اس کی اصل اہمیت کی نشاندہی ممکن نہیں "عوامی کہانیاں" اور "مقبول عام رواجات" کی اصطلاعات اس کے ادائے مطلب کے لیے ناکافی ہیں۔ یہ فی الواقع اساطیر ہی ہیں۔ جن میں ٹھگنوں' ہودں' فرضی وجودوں' خانگی بلاؤں اور تیرتے ہوئے بادلوں جو اپنی شکل و صورت کھو چکے تھے' اس کے ساتھ ایک صحیح مسلک جو کہ رواجات خیرات اور شعبدہ بازی میں دیکھا جاتا تھا اور رعب و جلال کے زیر اثر دیکھی جا سکتی ہیں۔ جرمنی میں کسی نہ کسی صورت میں رزمیات کی ایسی صورت پیدا ہو گئی جو ان حالات میں نا قابل تصور تھی اور ان کا اساطیر مریم سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مریم کو فراؤہولڈے کا خطاب دیا گیا اور جن مقامات پر کبھی راہب استادہ ہوتے تھے اب معتقدین کے تکیے بن گئے۔ انگلستان میں جو صورت پیدا ہوئی اسے بائبل کی اشیا پرستی کا نام دیا گیا۔

لوتھر میں جو کمی تھی ---- اور اس جرمنی کی "داخلی حادثاتی ہلاکت" کہنا چاہیے ---- وہ حقائق پر نگاہ رکھنا اور عملی تنظیم کی قوت تھی۔ اس نے اپنا عقیدہ کسی واضح نظام کے تحت پیش نہیں کیا اور نہ ہی اس نے کسی بڑی تحریک کی رہنمائی کی اور نہ ہی اپنا کوئی مقصد متعین کیا۔ اس کی اگر کوئی تصنیف ہے تو وہ بھی اس کے جانشین کالیسین کی تخلیق ہیں۔ لوتھر کی تحریک بغیر کسی رہنما کے وسطی یورپ میں پھیلتی رہی۔ اس نے جینیوا کو اپنا مقام آغاز بنا لیا' جہاں سے کہ اس نے اپنے پروٹسٹنٹ مسلک کا آغاز کیا اور اپنے تصور کے منطقی نتائج اخذ کیے اس لیے وہ تنہا واحد عالمی قوت بن گیا۔ چنانچہ یہ کالو اور لویولا کے ارواح کے مابین ایک کشمکش تھی جو فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ ہسپانوی بحری بیڑہ کے واقعے کے بعد سے باروق کا عالمی سیاست کا ورثہ تھا یعنی بحری اقتدار کے لیے جدوجہد جبکہ وسطی یورپ میں تحریک اصلاح ومخالف اصلاح تحریکات برسرعمل تھیں مگر اس کا دائرہ عمل چند چھوٹے چھوٹے شاہی شہروں اور سوئٹزرلینڈ کے چند قصبات تک محدود تھا۔ کناڈا' دریائے گنگا کا دھانہ' راس' مسی سی پی میں بڑے بڑے فیصلے ہو رہے تھے - فرانس' ہسپانیہ' برطانیہ اور ہالینڈ فیصلہ کن جنگیں لڑ رہے تھے اور ان جنگوں میں سابقہ مذہب مغرب کی دو تنظیمیں ہر جگہ اور ہر وقت موجود رہتیں۔

۵

آخری دور کی تخلیقی ذہانت تحریک اصلاح کے ہمراہ نہیں بلکہ اس کے بعد شروع ہوئی - اس کی انتہائی مخصوص تخلیق آزاد سائنس کی صورت میں سامنے آئی - لوتھر کے خیالات کے مطابق تو علم وسائنس دینیات ہی کے ملازم تھے اور کالون کے پاس ڈاکٹر سروت برنٹ ایک آزاد مفکر کی صورت میں موجود تھا۔ اس زمانہ عروج کی فکر فاؤستی' مصری' ویدک اور آرفیسی ---- تمام کے تمام اپنے اپنے افکار کی غلط سمت کو تسلیم کر چکے تھے اور ان پر تنقید کرنے لگے تھے - اگر تنقید کامیاب نہ ہوتی تو اس کا مطلب ہے کہ طریق تنقید ہی غلط تھا۔ علم کا مطلب ایمان کی تائید تھا' نہ کہ ایمان کی تنقیص -

اس دور میں شہری ارباب دانش کی قوت اتنی زیادہ ہو چکی تھی کہ اس کی مزید تائید ممکن نہ رہی تھی۔ بہرحال اس کا جائزہ ضروری تھا۔ مسلمہ امکانات کا ذخیرہ بالخصوص جو ادراک کی قوت سے حاصل کردہ تھے - نہ کہ دل کی منشا کے مطابق تھے - اعمال کی جراحی کے لیے یہ مسئلہ پہلا نشانہ تھا' اس سے دور عروج کی مدرسی اور باروق کے حقیقی فلسفے میں امتیاز پیدا ہوتا تھا جس طرح کہ ہم نوافلاطونیت کو اسلامی' ویدک کو برہمنی اور آرفیسی کو قبل از سقراط فعالیت و فکر سے الگ پہچان سکتے ہیں' (کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ) انسانی زندگی کی لادینی ملیت' ماحول' شعور کے معانی اور طریق کار انسان کے لیے لاینحل مسائل ہیں - مصری فلسفے نے وسطی حکومت کے عہد میں اس فلسفے کی مدد سے انسانی حیات کی قدروقیمت کے جائزے کی کوشش کی اور اسی کے مطابق اغلبا" دور آخر کا چینی کنفیوشس کا فلسفہ بھی تھا۔ جو ۸۰۰ سے ۵۰۰ ق م میں وجود میں آیا -

صرف ایک کتاب جو کوان تسے (وفات ۶۴۵ ق م) کی تصنیف ہے' ہمیں اس فلسفے کے متعلق کچھ دھندلے تصورات پیش کرتی ہے' مگر یہ نشاندہی خواہ کتنی بھی کمزور ہو' علمی اور حیاتیاتی لحاظ سے حقیقی فلسفے کے عین درمیان بیٹھ کر مسائل کا حل تجویز کرتی ہے۔ اس کا وجود اس لیے غنیمت ہے۔ کہ چین کا حقیقی فلسفہ اپنا وجود گم کر چکا ہے۔

باروق فلسفے کے مابین مغربی طبیعی علوم اپنے قدموں کے سہارے استادہ ہیں۔ کسی اور ثقافت میں یہ خوبی موجود نہیں اور یقینی طور پر یہ اپنے آغاز ہی سے مذہبی اثر ورسوخ سے پاک رہے ہیں۔ مگر علم کا عزم لی القوۃ اس مقام تک رسائی حاصل کر گیا اور اس میں اس نے عملی تجربات اور ریاضی کے اصولوں یعنی دونوں ذرائع کو استعمال کیا۔ اس کی بنیاد ہی عملی میکانیت پر قائم کی گئی۔ یہ اولین طور پر ایک ہنر ہے اور اس کے بعد ایک نظریہ۔ اس لیے اس کی عمر اسی قدر ہوگی جس قدر کہ خود فاؤستی انسان کی ہے۔ اس کے نتیجے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۰۰۰ء ہی میں تیکنیکی عمل کا وجود ملتا ہے تیرھویں صدی کے لگ بھگ رابرٹ گورس ٹیسٹے مکان کو نور کا عمل ثابت کرنے کے لیے جائزے لے رہا تھا۔ پیٹرز پیراگرینس نے ۱۲۸۹ میں عمدہ ترین تجربات کے بعد مقنا طیست پر مقالہ لکھا جو گلبرٹ (۱۶۰۰) سے قبل شائع ہو چکا تھا اور راجر بیکن جو ان دونوں کا شاگرد تھا' اس نے ایک طبیعی علوم کے متعلق ایک ایسا نظریہ ایجاد کیا۔ جو تیکنیکی تحقیقات کے لیے بنیاد کا کام دے سکتا تھا مگر متحرک روابط باہم کی دریافت نے علم کی وسعت میں مزید اضافہ کیا۔ کوپرنیکی نظام کے متعلق ۱۳۲۲ء ہی میں اشارات ملتے ہیں اور چند دہائیاں بعد پیرس کے رہنے والے اوکاسٹ بوریدان اور سیکسونی کے البرٹ اور اوسے نے اس نظریے کو ریاضی کی مدد سے ثابت کر دیا۔ ان دریافتوں سے پیدا ہونے والے مسلمات کے متعلق ہمیں اپنے آپ کو دھوکا نہیں دینا چاہیے۔ معقولات پر مبنی خالص فلسفے نے تجرباتی عمل کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہوتا۔ مگر اس سے مغرب کے فاؤستی تصور برائے مشین پر تو کوئی اثر نہ پڑتا۔ بارھویں صدی ہی میں مشین کا تصور پیدا ہو چکا تھا اور کسی حد تک تیار بھی ہو چکی تھیں۔ بارھویں صدی میں دھات کے عناصر کا تصور مغربی ذہانت نے پیش کر دیا تھا۔ ہمارے لیے تو سب سے اہم عملی مفروضات ہیں۔ یہ فکر کی وہ صورت ہے جو دوسری ثقافتوں میں ناپید ہے۔ یہ ایک حیرت ناک حقیقت ہے کہ (جس کو ہمیں بھی رواج دینا چاہیے) کہ جو نظری علم ہمیں حاصل ہو اسے علمی طور پر استعمال میں لانے کے لیے فوری جدوجہد کی جائے۔ فاؤستی ثقافت کے علاوہ یہ تصور کہیں بھی موجود نہیں (اور وہ لوگ جو جاپانیوں یہودیوں اور روسیوں کی طرح اپنی تہذیب کے دانشورانہ دور سے گزر رہے ہیں) ان کے لیے اس عملی منصوبے کا تصور ہی کائنات کی متحرک ترکیب کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ نظریات ہی حقیقت کے رخ پر سے پردہ ہٹاتے ہیں۔ اس صورت میں رہبانیت کی اہمیت ثانوی رہ جاتی ہے اور تیکنیکی آرزوؤں کے نتیجے میں یہ لوگ بھی فاؤستی طریق کار کی طرف راغب ہو رہے ہیں اور ان کا خدا کے متعلق تصور یہ ہے کہ وہ مشین کا سب سے بڑا آقا ہے اور خدا انھیں ہر شے مہیا کر دے گا جن کے متعلق یہ خواہش رکھتے ہیں۔ غیر محسوس طور پر کلام الٰہی ہر صدی کے گزرنے کے بعد زیادہ سے زیادہ دائمی متحرک ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح بالکل نادانستہ طور پر فطرت کے مطالعے میں تیزی آتی جا رہی ہے اور تجرباتی عمل کے مدارس فکر میں اضافہ ہو

رہا ہے اور روی اساطیر پر پردہ پڑتا جا رہا ہے۔ راہب بھی اپنے تصورات میں گلیلیو کے بعد جدید سائنس کے اصولوں کی صحت پر یقین کرنے لگے ہیں اور سائنس کے کلیات پر سنجیدہ تنقید کرتے ہیں۔ تصادم اور کشش ثقل' رفتار' نور اور برق ان تمام عناصر نے ہماری عملی زندگی میں توانائی کی ایسی صورت اختیار کر لی ہے کہ ایک طرح کی طبیعی توحید کا تصور سامنے آ رہا ہے۔ یہ وہ تصورات ہیں جو طریق کار کے عقب میں فعال رہتے ہیں۔ اس لیے شواہد کی بنا پر اپنی بصیرت سے بھی کام لیں۔ اعداد فی نفسہٖ تیکنیکی عناصر ہیں۔ بیرم اور پیچ دنیا کے راز دانوں میں شامل ہو چکے ہیں۔ کلاسیکی فطرت کا خیال تھا کہ۔۔۔ علاوہ ازیں دیگر ثقافتوں کا بھی۔۔۔ کہ انھیں دنیا میں اقتدار کے حصول کے لیے اعداد کی ضرورت نہیں۔ فیثاغورث اور افلاطون کی خالص ریاضی کا دیموقراطس اور ارسطو کے فطری تصورات سے کوئی تعلق نہ تھا۔

کلاسیکی ذہن نے پردے تھی اس کے دیوتاؤں کے متعلق تصور گستاخانہ سمجھا۔ اسی طرح باروق نے بھی مشین کو شیطان پرستی قرار دیا۔ دوزخ کی روح نے انسان پر بذریعہ مشین دنیا پر قابو پانے کے راز آشکار کر دیے اور اسی طرح اپنے آپ کو الوہیت کا حصہ قرار دے لیا اور خالص پجاری فطرت یہ ہے کہ صرف روحانی دنیا میں زندگی بسر کی جائے اور اس مادی عالم سے کوئی توقع نہ رکھی جائے ----- مزید برآں خاص طور پر تصوراتی' فلسفی' کلاسیکی انسانیت نواز بلکہ نسطوری بھی ---- تیکنیکی امور کے لیے خاموش دشمنی کے سوا کسی اور ردعمل کا اظہار نہیں کرتے۔

ہر سابقہ فلسفہ بھی اس معاملے میں شدید احتجاج کا اظہار کرتا ہے۔ اسے وجدانی عروج کی عدم مخالفت منظور نہیں مگر معقولیت کے خلاف یہ تنقید اپنی برتری کے احساس کی پیداوار ہے اور مذہب کے میدان میں اسے سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ دور آخر کی خصوصیت ہے۔ ہر دور آخر پر تنگ نظری اور سخت گیری کا غلبہ ہوتا ہے۔

تنگ نظری اپنے آپ کو کرام ویل اور اس کے آزاد رفقا کی طرف لے جاتی ہے۔ جو بائبل پر فولاد کی طرح کا شدید اعتقاد رکھتے ہیں اور حمدیہ گیت گاتے ہوئے میدان جنگ میں اتر جاتے ہیں اور فیثاغورثیوں میں شامل ہو کر ان کے ہم نوا بن جاتے ہیں۔ جنھوں نے اپنے فرض کی ادائیگی کے زعم میں سائبارس کے آباد اور خوشحال شہر کو ملیامیٹ کر دیا اور کہا کہ یہ ایک بداخلاق شہر تھا۔ ابتدائی خلفا کے عہد میں نہ صرف ملک فتح کیے گئے بلکہ ان کی روحوں پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ ملٹن کی گم گشتہ جنت میں قرآن شریف کی کئی سورتیں شامل کر لی گئی ہیں۔ فیثاغورث کی تعلیمات کے متعلق ہم بہت کم جانتے ہیں۔ وہ ایک متوازن روح کے جوش وخروش کی صورت ہیں۔ یہ شدت کی خنکی اور خشک تصوف کا مظہر ہیں۔ تیز لفاظی کا وجدان نمایاں ہے۔ اس کے باوجود ان میں نیکی کی شدید جھلک جگمگاتی رہتی ہے۔ تمام داخلی ماورائیت جو ایک شہر کی ارضی روح پر قبضے کے بعد یکجا مرتکز ہوتی ہے۔ اس میں ایک طرح کا خوف موجود رہتا ہے ورنہ یہ غیر حقیقی اور سریع الزوال ہوگی اور تلیقی طور پر یہ بے صبر' بے رحم اور سنگدل ہوگی جو کسی کو معاف نہیں کرے گی۔

شدت پرستی کا وجود صرف مغرب ہی میں نہیں بلکہ تمام ثقافتوں میں ہوتا ہے۔ یہ اس مسکراہٹ سے محروم ہے جو مذہب کی بہار پیدا کرتی ہے ---- ہر بہار ---- جو زندگی میں بے حد مسرت لاتی ہے - باعث طرب ونشاط ہے - اس سے زیادہ کوئی اور شے باعث برکت نہیں جو مجوسی ادب میں مسیح کے بچپن کے متعلق بانتکرار بیان ہوئی ہیں یاگریگوری نازیان زین نے بیان کی ہیں - یہ حکایات قرآن میں بھی مزکور ہیں مگر ملٹن کی صریحی یا وہ گوئی میں اس موضوع پر کچھ نہیں - البتہ سینٹ فرانسکو کے کچھ گیت ضرور شامل ہیں۔ پورٹ رائل کے جنسی ذہن میں ہولناک جوش وخروش پیدا ہوتا ہے جب سیاہ پوش سرمنڈوں کا ذکر آتا ہے' جن کے ساتھ شیکسپیئر کے کردار "میری انگلینڈ" سیمبرلیس ایک دفعہ پھر ---- چند سالوں ہی میں ختم ہوگئے۔ اب پہلی دفعہ شیطان کے خلاف جنگ شروع ہوئی جس کی جسمانی قربت کو سب محسوس کر رہے تھے - اس کا مقابلہ سخت ترین ظلماتی غصے سے کیا گیا - سترھویں صدی میں دس لاکھ سے زیادہ چڑیلیں جلا کر خاک کردی گئیں - یہ عمل شمالی پروٹسٹنٹ علاقوں میں بھی ہوا اور جنوبی کیتھولک علاقوں میں بھی بلکہ امریکہ اور ہندوستان کے بعض معاشروں میں یہ عمل دوہرایا گیا۔ اسلامی فرائض کے اصولوں (فقہ) میں کوئی فرحت موجود نہیں بلکہ قانون کی حاکیت کی سختی زیادہ ہے اور اسی طرح ویسٹ منسٹر کیتھولک ازم ۱۶۴۳ء میں بھی اور جیسنتی مسلک (جینسن آگسٹی ۱۶۴۰) میں بھی ----- نیرلویولا کے دور اختیار میں بھی مذہب کا تجربہ عملی مابعدالطبیعات کی حیثیت سے کیا گیا ہے مگر اس تجربے میں روح کے علاوہ جسم کو بھی شامل کرلیا گیا ہے جیسا کہ آزاد منش کا نظارہ کر سکیں - ہم دیکھیں گے کہ تینوں ثقافتوں میں ایک ہی تحریک رواں دواں ہے۔

نیشاغورث فلسفی نہ تھا۔ سقراط سے قبل کی تمام روایات مطلع کرتی ہیں کہ وہ ایک بزرگ آدمی تھا۔ شاید پیغمبر بھی تھا۔ وہ ایک ایسے معاشرے کا فرد تھا جس میں مذہبی جوش کی فراوانی تھی۔ وہ اپنے ایمان کی صداقت کو اپنے چاروں طرف ہر قوت سے پھیلانا چاہتے تھے' جس میں سیاست اور عسکریت بھی شامل تھی۔ سائبریس اور کروٹن کی تباہی ایک ایسا واقعہ تھا جس کے متعلق ہمیں یقین ہے کہ وہ اس لیے تاریخ میں زندہ رہ گیا کہ یہ مذہبی نوعیت کی ایک شدید جنگ تھی۔ یہ اسی نفرت کا ایک مظاہرہ تھا جو چارلس اول اور اس کے شاداماں لشکریوں نے نہ تو محض عقیدے کی غلطی کی بنا پر کیا بلکہ ایک دنیا داری کے اصول کے تحت عمل میں لایا تاکہ کسی شے کو اس کی جڑ سے اکھاڑ کر تباہ و برباد کر دیا جائے۔ یہ ایک ایسی اساطیری روایت تھی جسے مسفی کر لیا گیا تھا۔ اور تصوراتی طور پر محفوظ بنا لیا گیا تھا اور اس کے ساتھ سخت اخلاقی اصول شامل کر لیے گئے تھے۔ اور وہ اس پر یقین رکھتے تھے کہ سب سے پہلے ان کی نجات عمل میں آئے گی۔ تھورائی اور ہیٹیلیا میں جو زریں الواح ملی ہیں جو کسی مردے کے ہاتھ میں تھمادی گئی تھیں ان پر خدا کی طرف سے یہ یقین دلایا گیا تھا۔ "خوش رہو اور برکت سے سرفراز رہو۔ اس کے بعد تم فانی نہیں رہے بلکہ دیوتا بن چکے ہو" یہ وہی یقین ہے جو قرآن تمام مومنین کو فراہم کرتا ہے "جنھوں نے کفار کے خلاف جہاد کیا ہو۔ اسلامی توحید سے مراد جہاد ہے۔ ایک حدیث میں اس کی تصدیق کی گئی ہے۔ کرام ویل نے بھی اپنے جانبازوں کی مدد سے بادشاہ کے مخالفین "فلیٹیز" اور امالاکا نٹز" کو مارسٹن میراور ناسبی میں تتر بتر کر دیا۔

اسلام اب صحرائی مذہب نہ رہا تھا جیسا کہ زونگلی بیان کرتا ہے۔لوگ دعویٰ کرتے ہیں اور نیشاغورثی اور مسلمان سب اس کا عملی تجربہ کرتے ہیں۔ یہ تجربہ بالحواس تو نہیں ہوتا مگر بنیادی طور پر تصوراتی سطح پر ہوتا ہے۔ پرشوا (۵۶) جس نے ۶۰۰ ق م میں وادی گنگا میں پابندیوں سے آزاد مسلک ایجاد کیا۔ وہ بھی اپنے عہد کے کٹر مذہب پرستوں کی طرح یہ تعلیم دیتا تھا کہ نجات نہ تو استحقاق کی بنا پر اور نہ قربانیوں سے حاصل ہوتی ہے بلکہ صرف آتما اور برہما کے متعلق شناخت اور علم سے حاصل ہوتی ہے۔ تمام مذہبی شاعری میں قدیم روی تصورات کو بلا تخصیص قبول کر لیا گیا ہے مگر پھر بھی بنجر حالت میں یا تمثیلیہ کی حالت میں۔ بیدار شعور میں یہ سنیاس صرف ایک حقیقی قوت کا تصور فراہم کرتا ہے۔ پاسکل عمر بھر تصورات کے لیے جنگ لڑتا رہا جبکہ مسٹرایکارٹ شکل و صورت کی حمایت میں مشغول رہا۔ چڑیلیں اس لیے جلائی گئیں کہ وہ چڑیلیں ثابت ہو گئی تھیں - اس لیے نہیں کہ انھیں کسی نے فضا میں اڑتے دیکھا تھا۔ پروٹسٹنٹ منصفین نے اپنا عدالتی ہتھوڑا اس لیے چلایا کیونکہ اس کا عیسائی معدلہ اسی مقصد کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔قدیم رومیوں کی کنواری اپنی شان و شوکت کے ساتھ ظاہر ہوتی تھی مگر برنتی کو کبھی کسی انسان نے نہیں دیکھا۔ ان کا وجود اس لیے قائم ہے کہ ثابت ہو چکا ہے اور اس قسم کے وجود کے لیے ایک خاص قسم کا جوش وخروش بھی موجود ہے۔ ملٹن جو کرام ویل کا عظیم سیکرٹری تھا' وہ تصورات کو اشکال مہیا کیا کرتااور بنیان نے تمام مقصدی اساطیر کو اخلاقی تماثیل کی فعالیت میں تبدیل کر دیا - اس سے اگلا قدم کانٹ ہے جس کی اخلاقیات میں شیطان اپنی حتمی صورت یعنی انتہائی برائی میں ظاہر ہوتا ہے -

ہمیں تاریخی سطح سے اپنے آپ کو نجات دلانا ہوگی۔ بالخصوص معنوی حدبندیوں کو ایک طرف ہٹانا ہوگا۔ جن پر مغربی سائنس کے طریق کار نے قبضہ جما رکھا ہے۔ اس سے پیشتر کہ ہم نیشاغورث' محمد ﷺ اور کرام ویل۔ اب یہ مذہب بالخصوص بلند پہاڑوں کا مذہب بن چکا تھا۔ اس امر کی ایک حادثے سے زیادہ اہمیت نہیں کہ مجوسی دنیا کی اس خالص مذہبی تحریک کا آغاز مکہ کے ایک رہائشی کے ہاتھوں ہوا۔ اور کسی یک جہتی عیسائی یا یہودی گھرانے سے نہیں ہوا۔ جبکہ شمالی عرب میں غسانی اور لکھماتی عیسائی ریاستیں موجود تھیں اور جنوبی سبائین میں عیسائیوں اور یہودیوں کے مابین مذہبی جنگیں جاری رہتی تھی۔ ان جنگوں میں اسوان سے لے کر ساسانی سلطنت تک کے لوگ شامل ہو جاتے تھے۔

معارب کے شہزادوں کی مجلس میں صرف ایک کافر شامل ہوا اور اس تاریخ کے چند دنوں کے بعد ہی جنوبی عرب ایرانیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ یہ مزدکی حکومت تھی۔ مکہ عرب کی قدیم آبادی کا یہود اور نصاری کے درمیان ایک چھوٹا سے جزیرہ تھا۔ یہ قدامت کی ایک یادگار کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس میں قدیم مجوسی مذاہب کے آثار موجود تھے۔ کفر کی بعض روایات جو اس بستی کے مکینوں میں کسی حد تک سرایت کر چکی تھیں ان کا ذکر احادیث میں ملتا ہے۔ بعض تفاسیر میں بھی اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ شام اور عراق کے ذہین اور دانش ور طبقات کا بھی اہل مکہ پر اثر تھا(کیونکہ ان سے تجارتی روابط تھے) - فی الحقیقت اسلام ان لوگوں کے لیے صرف اسی حد تک نیا مذہب تھا جس حد تک کہ اہل یورپ کے لیے لوتھر کے خیالات

تھے۔ فی الحقیقت یہ قدیم (آسمانی) مذاہب ہی کی توسیع تھی۔ اس کی وسعت کی بڑی وجہ مسلمانوں کی دوسرے ممالک میں ہجرت نہ تھی (جیسا کہ اکثر بیان کیا جاتا ہے) بلکہ مومنین کا وہ جوش و خروش تھا جو ایک لاوے کی طرح طول و عرض میں پھیل گیا اور یہودیوں' اور عیسائیوں' اور مزدکیوں کو (اپنے حسن اخلاق سے) اپنی لپیٹ میں لے لیا اور انھیں پر جوش مسلمانوں میں تبدیل کر دیا۔ یہ آگسٹائین کے ہم وطن بربر تھے جنھوں نے ہسپانیہ فتح کیا اور یہ عراق کی سرحدوں پر آباد اہل فارس تھے جن کی تبلیغ نے اسلام کو دریائے آمو تک پہنچا دیا۔ وہی لوگ جو ماضی میں دشمن تھے۔ اب اول درجے کے دوست اور ساتھی بن گئے۔ بہت سے عرب فوجی جنھوں نے ۷۱۷ء میں قسطنطنیہ پر حملہ کیا' وہ عیسائی پیدا ہوئے ۶۵۰ء کے قریب باز نطینی ادب ختم ہو گیا اور اس کے بعد وہ تمام حکایات عربی زبان میں منتقل ہو گئیں ۔ اس واقعے میں مضمر معانی پر کبھی غور نہیں کیا گیا۔ مجوسی ثقافت کی روح نے اسلام کے وجود سے اپنا آزادانہ اظہار کیا اور اس کے بعد وہ صحیح معانی میں عربی ثقافت کا حصہ بن گیا اور قلب ماہیت کی پابندیوں سے آزاد ہو گیا۔ بت شکنی کی تحریک' اسلام نے جس کی رہنمائی کی یک طبیعتی عیسائیوں اور یہودیوں نے بہت عرصہ قبل شروع کی تھی اور باز نطینی علاقوں سے بھی آگے نکل چکی تھی جبکہ شامی لیوسوئم (۷۱۷-۷۴۱) نے ایک مذہبی تحریک چلائی جس کا نام اسلام -- عیسائی قبائل رکھا۔ پال کے پیروکار ۶۵۰ء کے قریب اور بعد میں بوگو ملز اس تحریک میں اکثریت رکھتے تھے۔

حضرت محمدؐ کے سلسلے کے بڑے بڑے نام 'مثلاً ابوبکرؓ اور عمرؓ انگریزی انقلاب پائرن اور ہمپڈن کے مشابہ تھے۔ ہم ان میں مشابہت کو مزید سمجھ سکتے ہیں اگر ہم حنفیوں کے متعلق پوری طرح سے واقف ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دین ابراہیمؑ پر پیغمبر اسلام سے قبل بھی سختی سے قائم تھے۔ ان تمام نے یہ ضمانت قبل از وقت حاصل کرلی تھی کہ وہ خدا کے منتخب افراد تھے۔ عہد نامہ قدیم نے مجلس شوریٰ میں وجد و کیف پیدا کر دیا اور آزادی کے اس کیمپ نے متعدد انگریز خاندانوں کے نام روشن کیے۔ یہ روایت انیسویں صدی تک قائم رہی۔ یہ اعتقاد کہ انگریز بنی اسرائیل کے دس گم شدہ قبائل سے تعلق رکھتے ہیں اور اس طرح ان لوگوں کی نسل سے ہیں جن کو دنیا کی حکومت تفویض کی گئی ہے۔ امریکہ میں کی گئی نقل مکانی میں بھی غالب اکثریت انگریزوں ہی کی تھی جس کا آغاز پادریوں کے سفر زیارت سے ہوا جو ۱۶۲۲ء میں عمل میں آیا۔ اس سے اس مذہب کی تشکیل ہوئی جسے آج کا امریکی مذہب کہا جاتا ہے۔ اس سے انگریزوں کو مخصوص سیاسی برتری کا یقین ہو گیا اور یہ اعتماد پیدا ہوا کہ ان کی جڑوں کو تقدیر نے مضبوط استوار کر دیا ہے۔ نیشا فورثی خود بھی (کلاسیکی عالم کی مذہبی تاریخ میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں) سیاسی قوت کو بڑھاتے رہے تاکہ اپنا مذہب پھیلا سکیں اور شہر در شہر رائج کر سکیں۔ ان کے علاوہ ہر سیاسی وحدت کا اپنا اپنا مذہب تھا اور ہر ایک دوسرے کو اپنی مذہبی رسومات کی ادائیگی میں آزاد سمجھتا تھا۔ صرف اسی دور میں ہم ایک مذہبی رہنماؤں کا گروہ نظر آتا ہے اور یہ بھی کہ ان کی عملی توانائی قدیم آرفیقیوں سے بھی آگے بڑھ کر اصلاح کلیسا کی جنگوں کو بھی پیچھے چھوڑ گئی۔

مذہبی شدت میں بھی عقلیت پسندی کے بیج موجود رہتے ہیں اور چند پرجوش نسلوں کے بعد یہ پھوٹ

پڑتے ہیں اور سب پر غالب آ جاتے ہیں۔ یہ اقدامات کرام ویل سے لے کر بتدریج ظاہر ہوتے رہے۔ کوئی خاص شہر نہیں بلکہ بڑے شہروں میں سے کوئی بھی نہیں بلکہ بعض مخصوص شہری تاریخ دانشوری کا میدان بن کر ابھرے۔ سقراط کا' ایتھنز عباسیوں کا بغداد اٹھارھویں صدی کے لندن اور پیرس روشن خیالی اس عہد کی ایک صفت تھی سورج طلوع ہوتا ہے مگر وہ کونسی قوت ہے جو افلاک کو صاف کر کے سورج کی مشکل راہوں کو آسان بناتی ہے؟

روشن خیالی مشکل تفہیمات کے ادراک کے لیے اعداد و شمار کے کوائف پر اعتماد کا واحد سامان پیدا کرتی ہے (یہی استدلال ہے)۔ دور عروج میں لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں ہر شے حاصل ہے کیونکہ انھیں یقین تھا کہ قابل فہم اور نا قابل فہم دونوں دنیا کے لازمی عناصر تھے جن میں کہ صوفی خود کو گم کر دیتے ہیں اور ان میں استدلال بھی دخل اندازی کر سکتا ہے لیکن صرف اسی حد تک جس حد تک کہ خدا دخل اندازی کی توفیق دے مگر اس میں ایک سربستہ راز کی صورت میں عدم معقولیت کا تصور وجود میں آتا ہے۔ چونکہ یہ تصور ناقابل ادراک ہے اس لیے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اسے کھلم کھلا وہم قرار دینا چاہیے۔ صرف منازل تنقید سے گزر کر آنے والے مدرکات ہی کی قدروقیمت ہوتی ہے اور یہ تمام راز محض جہالت کی شہادت دیتے ہیں۔ وہ جدید مذہب جس میں کوئی راز سربستہ نہ ہو' اور مکانات کی فراوانی ہو اسے دانائی کہا جاتا ہے۔ ارسطو کے مطابق کہ قدیم مذہب اس لیے ناگزیر ہے تاکہ جہلا کا اطمینان قائم رہے اور یہی خیال کنفیوشس اور گوتم بدھ کا بھی ہے۔ لیسنگ اور والٹیئر بھی اسی خیال کے حامی ہیں۔ لوگ ثقافت سے مراجعت کر کے فطرت کی طرف رجوع کرتے ہیں مگر یہ فطرت کوئی زندہ شے نہیں کہ اسی کا تجربہ ممکن ہو بلکہ ایک ایسی شے جو ثابت شدہ ہے جو ظہور میں آ چکی ہے اور صرف دانشمندوں کی رسائی میں ہے۔ فطرت کا دہقانوں کے لیے کوئی وجود نہیں۔ فطرت سے انسان کبھی مرعوب نہیں ہوتا بلکہ اسے صرف اس کا احساس ہوتا ہے۔ مذہب فطرت سے مراد معقولیت پر مبنی مذہب ہے۔ توحید خدا پرستی یہ محض زندہ مابعدالطبیعیات نہیں بلکہ ایک مدرکہ میکانیت ہے جسے کنفیوشس قانون الٰہی کا نام دیتا ہے اور یونانی اسے روحانیت کا نام دیتے ہیں ماضی میں فلسفہ ماورائی مذہبیت کی کنیز تھا مگر اب معقولیت کا دور ہے۔ لہٰذا فلسفے کو بھی ایک سائنسی علم کی حیثیت اختیار کر لینی چاہیے جو فطرت پر تنقید کرے اور اقدار پر بھی ناقدانہ نگاہ ڈالے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی وقت یہ سمجھا جاتا تھا کہ فلسفہ ماسوائے تحلیل کردہ عقائد کے اور کچھ نہیں مگر یہ خیال اس تصور کی وجہ سے وجود میں آیا کہ علم محض بھی فی نفسہ ممکن ہے۔ تمام نظام تناظری ضمانت کے آغاز کے ساتھ وجود میں آئے لیکن کچھ مدت بعد یہ ہوا کہ خدا کے نام کی جگہ قوت نے لے لی' اور لامتناہیت کی جگہ بقائے توانائی نے حاصل کر لی۔ تمام کلاسیکی معقولیت کے تحت صرف اولیمپس ہی کا ذکر آئے گا اور مغرب میں فلسفہ صرف مذہب اور تیکنیکی علوم کے درمیان پنڈولم کی طرح متحرک رہے گا اور اس کی تعریف بھی اس حقیقت پر منحصر ہے کہ تعریف کی خالق کوئی مذہبی شخصیت ہے یا کسی تیکنیکی علوم میں ماہر ہے۔

شعور بیدار کے تحت روشن خیالی کی لاادریت ' ایک مخصوص اصطلاح ہے۔ یہ ایک ایسی دنیا کا تصور

پیش کرتی ہے جس میں خدا کا کوئی وجود نہیں اور جب حسی ادراکات انسانی معقولیت کے مطابق نہیں ہوتے تو حواس ہی کو باطل' قرار دے دیا جاتا ہے اور وہ واقعات جن کو کسی وقت اساطیر قرار دیا جاتا تھا۔ وہی حقیقت کا وجود ثابت کی جاتی ہیں ---- اور ان کو اس طریق کار کے تحت لایا جاتا ہے جسے "تاریخی" اساطیریت' یا ' یو ہمفریت کا نام دیا جاتا ہے۔ تقریباً" ۳۰۰ ق م کلاسیکی الوہیت کی اس طرح وضاحت کی گئی جس کی بنا پر ماضی میں خوب کامیابی رہی اور یہی طریق کار روشن خیالی کے ہر دور میں کسی نہ کسی طرح سے انھیں اصولوں سے کام لیا جاتا رہا ہے - ہم دوزخ کی اساطیری تشریح نہیں کر سکتے' یہ نہیں کہہ سکتے کہ دوزخ شیطان کے مجرم ضمیر یا بدنیتی کا مظہر ہے اور خدا کی ذات فطرت کا حسن وجمال ہے لیکن جب ہم ایتھنز کی قبروں کے تعویذ جو ۴۰۰ ق م میں تعمیر کیے گئے ' مشاہدہ کرتے ہیں تو ہمیں یہی کچھ ملتا ہے - یعنی شہر کی دیوی ایتھین کی بجائے ہمارا واسطہ ایک اور دیوی ڈیموس سے پڑتا ہے جو عقل کی دیوی جیکوبین کی قریبی رشتہ دار ہے جبکہ سقراط کی تجویز کردہ اصطلاحات سے مراد دیگر فلسفی ہیں لیکن عرف عام میں انھیں زیوس کا مرتبہ دے دیا گیا۔

کنفیوشش عالم بالا "شانگ تی" کی بجائے افلاک کی اصطلاح استعمال کرتا ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ صرف قوانین فطرت پر یقین رکھتا تھا - چین میں جو قانونی دستاویزات جمع کر کے کنفیوشس نے مرتب کی تھیں وہ ایک اساطیریت کے سلسلے کا بہت بڑا کارنامہ تھا - یہ تمام کا تمام مواد قدیم توحیدی مذاہب کا سرمایہ تھا اور جو اس میں شامل ہونے سے رہ گیا وہ ضائع کردیا گیا اور اسے روشن خیالی کے کنہیات کا نام دیا گیا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو ہماری اٹھارھویں صدی کی تحریک روشن خیالی کے لیے روحی سرمایہ بطور اساس موجود ہوتا کنفیوشس چینیوں کا نمائندہ تھا مگر یورپ میں اٹھارھویں صدی میں جو تحریک چلی اس میں اس کے خیالات کی جھلک پائی جاتی تھی۔ لاؤتسے '(جو اس سے نفرت کرتا تھا) وہ فلاؤ کی تحریک کے درمیانی نقطے پر قائم ہے جس میں پروٹسٹنٹوں 'شدت پسندوں اور تقدیس پسندوں کی روایات کا مشترک اظہار کرتا ہے اور بالآخر دونوں نے میکانکی عالمی نظریات کی تبلیغ شروع کر دی۔ چین کے دور آخر میں طاؤ کا لفظ اپنے بنیادی تصورات میں مسلسل تبدیلیوں میں سے گزرتا رہا - اور اسی میکانکی سمت میں بڑھتا رہا جس سے کہ لفظ اقنوم ثانی کلاسیکی دور میں' ہرڈی کلاتس سے لے کر پوسیڈونیوس تک گزرا اور جس طرح کہ قوت کا لفظ گلیلیو سے لے کر ہمارے دور تک شکل تبدیل کرتا رہا جسے کسی زمانے میں عظیم تخلیق اساطیر اور مسلک کہا جاتا تھا' اب پڑھے لکھے لوگوں میں اسے فطرت اور نیکی کا نام دیا جانے لگا۔ مگر فطرت ایک معقول میکانیت ہے جبکہ نیکی علم ہے کنفیوشس 'بدھ اور سقراط اور روسو اس تصور میں متفق ہیں۔ کہ کنفیوشس زندگی میں کسی حد تک عبادت کو حیات بعد الموت کے لیے موزوں سمجھتا ہے اور وحی کے متعلق کوئی بات نہیں کرتا اور قربانیوں اور رسوم و رواجات کی پابندیوں کو لاعلمی اور غیر معقولیت قرار دیتا ہے - گوتم بدھ اور کا ہم عصر مهاویر جو جین مت کا بانی تھا دونوں کا تعلق وادی گنگا کے حصہ زیریں سے تھا جو قدیم برہمنی ثقافت کے میدان سے مشرق کی سمت واقع ہے -جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے انھوں نے خدا'مسلک اور اساطیر کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ بدھ کی صحیح تعلیمات کیا تھیں اس دور میں کچھ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا---- کیونکہ جو کچھ بتایا جاتا ہے اس میں بہت بڑی مقدار الحاقی ہے اور محض اس کے نام سے منسوب کر دی گئی ہے اور اس پر دور آخر کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ مشروط امکانات کے نتائج کے متعلق جو کچھ بدھ ادب میں پایا جاتا ہے اس

کی بنیاد جہالت کے نتیجے میں پیدا شدہ مصائب سے ہے - چار بنیادی صداقتوں کا علم ضروری ہے یہی اصل دانش ہے -ان کے نزدیک نروان کا حصول روشن خیالی پر مبنی ہے اور یہ رواقیوں کے تصور خودکفالت اور نظریہ مسرت سے مشابہ ہے -یہ ادارک اور شعور بیدار کی وہ شرط ہے جس کا وجود اب قائم نہیں -

اس دور میں تعلیم یافتہ شخص کا تصور عظیم بزرگ کا تھا۔ بزرگ فطرت کی طرف مراجعت کرتا ہے -وہ باہر جنگلات میں نکل جاتا ہے -عظیم شہروں کا باشندہ ہونے کا یہ سب سے زیادہ زیرک طریق ہے- بزرگ کو تمام قیمتی ذرائع حاصل رہتے ہیں۔ اس کی عبادت اور ریاضت یہ ہے کہ وہ اس دنیا کو عقبیٰ کے لیے ترک کر دے اور اپنا وقت گیان دھیان میں بسر کرے - روشن خیالی اور دانائی اپنے مسلک سے عظیم رہبانیت کے لیے بھی دستبرداری اختیار نہیں کرتے بلکہ موت بھی ان کی راہ میں حائل نہیں ہوتی جب نیکی اور دانائی کا اتحاد ہو جاتا ہے تو یہی لطف اندوزی کا راز قرار پاتا ہے - ایک انتہائی دانا خودی کا یہی طرز عمل ہے -لہٰذا معلم اخلاقیات جو حقیقی مذہب میں شامل نہیں ہوتا اس کی صورت فلسطین (تنگ نظر۔ بدذوق) کی سی ہو جاتی ہے۔ بدھ' کنیفیوشس اور روسو (خدا پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے)فلسطین ہیں کیونکہ ان کے مرتب کردہ تصورات کی شرافت و عظمت اور سقراط دانائی حیات کے متعلق لفاظی صرف افادیت پسندی ہے -

اس کے ساتھ ساتھ (کیا ہمیں ایسا کہنا چاہئے) معقول استدلال کی مدریت کے لیے ضروری ہے کہ تربیت یافتہ تصوف کے حصول کے لیے داخلی خواہش بھی ضروری ہے۔ مغربی روشن خیالی کی اصل انگلستان میں ہے اور یہ شدت پسندی کی اولاد ہے۔ یورپ کے براعظم کی روشن خیالی کی تحریک کلی طور پر لاک کی ایجاد ہے -اس کے خلاف جرمنی میں تحریک تقویٰ کے حامی (ہیرن ہٹ '۱۷۰۰ء سپنر اور فرانک اور دور ٹمبرگ میں اوٹی نگر)اور انگلستان میں میتھوڈسٹ (ویزے بیدار از ہیرن ہوٹ -(۱۷۳۸ء)- دوبارہ لوتھر اور کالون کا ذکر ناگزیر ہے --- انگریزوں نے دوبارہ عالمی تحریک کے لیے منظم کیا اور جرمنوں نے یورپ کے وسط میں مجلس منحرفین کی تنظیم کی۔ مسلمان تقویٰ پسند اہل صفا(صوفیا) میں ملیں گے۔ اس کی بنیاد ایرانی نہیں' بلکہ آرامی ہے اور آٹھویں صدی میں یہ تصوف تمام عرب میں پھیل گیا -تقویٰ پسند یا میتھوڈسٹ ہندوستان میں بھی موجود ہیں۔ سنیاسی جو گوتم بدھ سے کچھ مدت قبل زندگی کے چکر (سنسار) سے آزادی کا پرچار کیا کرتے تھے اور یہ بتایا کرتے تھے کہ آتما او برہما میں کیا فرق ہے مگر تقویٰ پسندی یا تصوف لاؤتسو اس کے چیلوں میں بھی موجود تھے' قطع نظر ان کی روشن خیالی کے۔ کلبی منگتے اور سفری یا گشتی مبلغین اور رواقی معلم' گھریلو پجاری اور قدیم یونانیت کے استغفاری بھی ساتھ ساتھ موجود رہے ہیں -تقویٰ پسندی' روشن خیالی کی بصارت سے بھی بلند تر ہو سکتی ہے' جس کی سب سے بڑی مثال سویڈن برگ ہے جس نے رواقیوں اور صوفیوں کے لیے ایک نئی اور دلچسپ دنیا پیدا کر دی اور انھیں وجوہات کی بنا پر بدھ مت کی نو ترمیم صورت مہایانہ وجود میں آئی۔ بدھ مت اور طاؤ ازم کی توسیع ان کی اصل اہمیت کے لحاظ سے امریکہ میں میتھوڈسٹ تحریک کے ہم معنی ہے -یہ کوئی حادثاتی امر نہیں تھا کہ یہ دونوں تحریکات (بدھ مت اور طاؤازم)گنگا کی زیریں وادیوں اور دریائے ینگ سی کیانگ کے جنوب میں پروان چڑھیں اور انھوں نے متعلقہ ثقافتوں کو بہت

بڑا سہارا دیا۔

(۶)

کٹر عیسائیت کی تحریک کے دو صدیوں بعد دنیا کا مشینی تصور اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گیا۔ یہ زمان حاضر کا موثر ترین مذہب ہے -وہ لوگ بھی جو اپنے آپ کو قدیم مفہوم میں مذہبی آدمی تصور کرتے تھے اور ان کا خدا پر ایمان پختہ تھا اب دنیا کو سمجھنے میں غلطی کر رہے تھے جس میں کہ شعور بیدار آئینہ دکھا رہا تھا۔ مذہبی حقائق کو وہ مشینی حقائق سے الگ خیال نہ کرتے تھے اور بالعموم یہ روایتی الفاظ کے استعمال کی عادت تھی جس نے فطرت پر اساطیر کا رنگ چڑھا دیا تھا اور جسے سائنسی حقائق کے مطابق سمجھ لیا گیا تھا۔ ثقافت ہمیشہ مذہبی تخلیقیت کے ہم معنی ہوتی ہے۔ ہر عظیم ثقافت کا آغاز ایک طاقت ور موضوع سے ہوتا ہے جو شہری زندگی سے قبل دیہات میں پرورش پاتا ہے اور اسے بتدریج شہروں میں منتقل کیا جاتا ہے' جہاں یہ فنون لطیفہ اور روشن خیالی کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور عالمی شہروں کی مادیت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے مگر اس کی آخری تاریں بھی مجوسی کلید ہی سے وابستہ رہتی ہیں۔ چینی' ہندوستانی' کلاسیکی' عربی' مغربی مادیت کا وجود تو ہے مگر ان میں سے ہر ایک ابتدائی اساطیری ذخیرے کی شکل وصورت کے سوا جسے تجرباتی عناصر سے صاف کر دیا گیا ہے' جسے بغور مشاہدے اور میکانیکی تصورات کی نظر سے دیکھا گیا ہے اور کچھ نہیں۔

کنفیوشس کے نظریات کو یانگ چو نے اس مفہوم میں واضح کیا ہے کہ لکایا تا کا نظام اس لیے طوالت اختیار کر گیا کہ یہ عالمی روح کے خاتمے سے بیزار تھا۔ یہ گوتم بدھ' مہاویر اور ان کے ہمعصر تقویٰ پسندوں کا ایک مشترک رویہ تھا جو انھوں نے سانکیا کی دہریت سے اخذ کیا تھا۔ سقراط بھی ان لوگوں ہی کی طرح سو فسطائیوں کا وارث تھا اور کلبی جہاں کشتوں اور فلاسفہ تشکیک کا ابوالاہا تھا۔ یہ تمام لوگ شہری حلقوں کی روشن خیالی کی برتری کا مظہر تھے اس سے نامعقولیت کا خاتمہ ہو گیا یہ ایسے شعور بیدار سے نفرت کرتا ہے جو آج بھی پراسراریت کی تصدیق کرتا ہے۔ رومی شخص ہر اس شے کے سامنے جھک جاتا جو ناقابل پیمائش ہوتی یا اس کا رعب وجلال اس کے عقائد میں قائم ہوتا مگر زمانہ حال میں کیتھولک بھی اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ کائنات کے معمے کو سائنسی بنیادوں پر حل کیا جائے۔ معجزات کو اعلیٰ درجے کے طبیعی افعال کہا جاتا ہے اور آج انگریز پادری یہ کہتا ہے کہ برقی قوت اور عبادت کی قوت دونوں ایک ہی متجانس فطرت کی پیداوار ہیں۔ اعتقاد کی حقیقت توانائی اور مادے پر اعتقاد ہے۔ قطع نظر اس کے کہ خدا اور کائنات ربوبیت اور انسان کی اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں۔

برخود مکتفی اور فقید المثال کی اصطلاحات بھی فاؤستی ثقافت کے پورے معانی ادا کرنے کے لیے کافی نہیں اس میں کائناتی مسائل کے تیکنیکی حل کی صلاحیت تکمیل کے مراحل پر پہنچ چکی ہے۔ تمام کائنات ایک متحرک نظام ہے جسے ریاضی کے اصولوں کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس کی علت اولیٰ سے لے کر سارا

وجود تجربات سے قابل جائزہ ہے اور اس کے اعداد وشمار کا تعین کیا جا سکتا ہے تاکہ انسان اسے مسخر کر سکے۔ فطرت کی طرف مراجعت سے ہماری یہی مراد ہے علم نیکی ہے۔ اسے کنفیوشس بدھ اور سقراط تسلیم کرتے تھے" مگر علم ایک قوت ہے" کا جملہ صرف یورپ اور امریکہ ہی میں مروج ہے۔ فطرت کی طرف مراجعت سے بھی یہی مراد ہے کہ ان تمام حدود کو عبور کر لیا جائے جو عملی ذہانت اور فطرت کے مابین حائل ہیں۔ باقی تمام دنیا میں مادیت نے اپنے قیام پر ہی سمجھوتہ کر لیا ہے (خواہ یہ منطقی طور پر ہو' یا غور وفکر کا نتیجہ ہو جیسی بھی صورت ہو) اور یہ سادہ حقیقت قبول کر لی ہے کہ فطرت کے تمام امور بعض علل کے نتیجے میں طے ہو جاتے ہیں اور کوئی راز سربستہ باقی نہیں' اور ہر ماورائے فطرت عمل' دنیائے علم سے خارج کر دیا گیا مگر عظیم دانش کے مظاہر اساطیر جن کا بنیادی تعلق مادے اور توانائی سے ہے اور ایک عظیم مفروضہ یا مسلمہ بھی ہیں۔ یہ تصویر فطرت کی اس طرح نقاشی کرتے ہیں کہ انسان اس کا واضح مشاہدہ کر سکے۔ قضاوقدر سے مراد بھی ایک میکانکی ارتقا ہے جو ہر نظام میں تعمیر وترقی کو مرکزی حیثیت عطا کرتا ہے۔ عزم وارادہ ہر طریق کار میں مرکزی حیثیت کا حامل ہے اور یہ تمام اصول' توحید' ڈاروِن ازم' اثباتیت وغیرہ وغیرہ امریکی تجارت نے اپنے اندر جذب کر لیے ہیں اور تجارتی اخلاقیات کا حصہ بنا لیا ہے۔ برطانوی سیاست دان اور جرمنی کا احمق ترقی پسند دونوں یکساں ہیں اگر ان کا حتمی جائزہ لیا جائے تو یہ روشن خیالی کی ایک بھدی صورت میں ظاہر ہوں گے جو ماضی کے بعض عقائد کو صحیح ثابت کرنے میں مشغول ہیں۔

مادیت اس وقت تک مکمل نہ ہوگی جب تک کہ مناسب وقفوں سے ذہنی کشاکش میں سکون نہ پیدا کیا جائے۔ اس کے لیے اساطیری کیفیت بھی پیدا کی جا سکتی ہے اس کے لیے بعض رسوم ورواجات سے لطف اندوزی بھی مفید عمل ہے۔ ازراہ مزاح مداریوں کے تماشے' غیر معقول اور احمقانہ غیر فطری اندفاعات اور اگر ضرورت ہو تو لایعنی نکاہات سے بھی لطف انداز ہوا جا سکتا ہے۔ یہ رجحان جس سے ہم خوب آشنا ہیں منگتے کے دور (۲۸۹ - ۳۷۲ ق م) ہیں اور بدھ برادری کے ابتدائی ایام میں بھی موجود تھا (اور اسی اہمیت کے ساتھ) یونانیوں میں ایک نمایاں عادت کے طور پر پایا جاتا تھا۔ ۳۱۲ ق م کے قریب کالی ماچوس کی قسم کے فاضلین نے اسکندریہ میں سیراپس مسلک ایجاد کیا اور اس کے ساتھ ایک مفصل داستان بھی منسلک کر دی۔ روم میں آئی سیس کا مسلک دونوں مروجہ مسالک سے مختلف تھا۔ وہ بادشاہ کی پرستش سے بھی مختلف تھا جس کا کہ یہ جانشین تھا اور اس مسلک سے بھی مختلف تھا جو سچے دل سے آئی سیس کی پوجا پر مبنی تھا۔ جو کہ صحیح معانی میں مصری مذہب تھا۔ یہ اعلیٰ طبقے کے لوگوں کے لیے ایک مذہبی تفریح کا سامان تھا۔ کبھی کبھی تو عوام اس کا مذاق اڑاتے اور یہ استہزا کا نشانہ بنتا اور کبھی کبھی یہ عوامی فضیحت کا موجب ہوتا جس کے نتیجے میں اس مسلک کے تمام مراکز بند کر دیے گئے کلدانی علم النجوم ان دنوں میں ایک فیشن کی صورت اختیار کر گیا تھا (اور حقیقی کلدانی مذہب سے اس کا کوئی واسطہ نہ تھا اور کلاسیکی معجزات اور خوراق عادت سے بھی اس کا کوئی تعلق نہ تھا اور سب اس دور کی سب سے بڑی قوت یعنی مجوسی مذہب بھی اس سے لاتعلق تھا۔ یہ ایک تفریح تھی۔ چلو اسی طرح وقت گزاریں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لاتعداد جھوٹے مدعی اور نقلی پیغمبر بھی تھے جو مختلف شہروں میں دورے کرتے رہتے' تاکہ نیم خواندہ لوگوں کو اپنی شعبدہ بازی سے اس مذہب

میں شامل کرتے رہتے۔ بالکل اسی طرح کے واقعات ہم دور حاضر میں بھی یورپ اور امریکہ میں دیکھتے ہیں کہ علوم سری کے معتقدین اور عرفان کے قائلین دھوکا دہی کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ امریکی عیسائی سائنس اور ایوانوں میں پیدا ہونے والا فرضی بدھ مت اور مذہبی فن کاری کی تجارت (جو انگلستان کے مقابلے میں جرمنی میں زیادہ رائج ہے) جو قدیم رومی مسالک کے پیروکار گروہوں متاخر کلاسیکیوں یا طاؤ ازم کے ماننے والوں کے جذبات کھیل کر انھیں بے وقوف بناتے ہیں ہر جگہ یہ اساطیر کے کھلونے پیش کرنے کا عمل ہے جن کو کوئی بھی حقیقی معانی میں قابل اعتماد نہیں سمجھتا۔ کسی مسلک کا ذائقہ چکھنے کے لیے کہ شاید داخلی خلا کو پورا کر سکے اصل اعتقاد تو جوہری قوت اور اعداد وشمار میں ہے مگر ان فضولیات کو محض زندگی میں قوت برداشت کی قوت پیدا کرنے کے لیے گوارا کر لیا جاتا ہے ۔مادیت سطحی ہونے کے باوجود دیانت دار ہے جبکہ نقلی مذاہب سطحی بھی ہیں اور بددیانت بھی مگر یہ حقیقت ہے کہ محض اصل مذاہب کی نقل ہونے کی وجہ سے اس امر کا امکان رہتا ہے کہ یہ اصل مذاہب پر بھی غلبہ حاصل کر لیں مگر بہت جلد مہذب شعور بیدار انھیں رد کر دیتا ہے۔

اس دوسرے مرحلے کو میں ثانی مذہبیت کا نام دیتا ہوں۔ یہ تمام تہذیبوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ان تہذیبوں کا وہ دور ہوتا ہے جب وہ پوری طرح سے مکمل ہو چکی ہوتی ہیں اور تکمیلی مراحل طے کرکے فنا کے قریب ہوتی ہیں۔ اس لیے ان کے لیے کسی بھی واقعے کی کوئی اہمیت باقی نہیں ہوتی۔ (جہاں تک مغربی تہذیب کا تعلق ہے ہم اس مقام سے کئی نسلیں ابھی پیچھے ہیں)۔ یہ مذہب ثانی سیزرازم کا درست مدمقابل ہے جو فی الحقیقت سابقہ تہذیب ہی کا بقایا عنصر ہوتا ہے۔ اس کا ظاہر ہونے کا دور کلاسیکی عہد میں آگسٹائن کا زمانہ تھا اور چین میں شی ہوانگ کا عہد دونوں تناظر میں متعلقہ ثقافت کی قدیم تخلیقی لہر ختم ہو چکی تھی مگر اس کے باوجود دونوں کی عظمت باقی تھی۔ مذہبیت ثانی میں گہرے تقدس کا وجود باقی رہتا ہے جو شعور بیدار کے خلا کو پورا کر دیتا ہے۔ وہ تقدیس جس سے ہیرو ڈوٹس مصر کے آخری دور میں بہت متاثر ہوا اور اس کے اثرات مغربی یورپ ' چین ' ہندوستان اور اسلام پر بھی پڑے اور قیصریت سے متعلق قوت پر تو کبھی کسی قسم کی پابندی عائد نہیں ہوئی نہ تو اس تقدیس کے سلسلے میں اور نہ ہی رومی سلطنت کے بارے میں کوئی ایسی شے ظاہر ہوئی جسے بے ساختہ اور بنیادی کہا جا سکے۔ کوئی نئی شے وجود میں نہیں آئی' کوئی نیا خیال ظاہر نہیں ہوا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر سے دھند چھٹ گئی اور قدیم منظر نظر کے سامنے آ گئے مگر اتنا فرق ضرور ہوا کہ پہلے سے زیادہ صاف نظر آنے لگے۔

جن اشیا کا وجود پہلے غیر یقینی تھا مگر زیادہ نمایاں ہو گیا۔ دوسری مذہبیت کا مواد سادہ ہے اور اصل مذہب ہی کی نقل ہے۔ صرف طریق اظہار نیا ہے یعنی ایک نیا تجربہ جسے نئے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کا آغاز ایسے ماحول میں ہوا جب کہ روشن خیالی کی تحریک یاس کی حالت میں گم ہو رہی تھی تو ایسی حالت میں اس کا عروج منظر پر آگیا اور بالآخر تمام دنیا پر قدیم مذہب جو جدید ایمانی قوتوں کے سامنے ماند پڑ چکا تھا دوبارہ منظر عام پر آگیا اور اپنے مقبول مکاشفات کے بل بوتے پر مقبول عام ہو گیا۔ یہ صورت حالات ہر ثقافت کے

مسحر

اس دور میں ظاہر ہوتی ہے جو وہ اپنے آخری مراحل میں ہو۔

روشن خیالی کا ہر دور لامحدود استدلال کی پرامید فضا میں شروع ہوتا ہے۔ یہ ہمیشہ بڑے شہروں کی شان وشوکت سے منسلک ہوتا ہے اور اس میں غیر مشروط تشکیک کا غلبہ بھی ہوتا ہے۔ آزاد شعور بیدار جسے مصنوعی دیواروں نے فطرت زندہ سے بیگانہ بنا رکھا ہوتا ہے اسے اس چار دیواری سے باہر موجود کسی شے کا ادراک نہیں ہوتا' اس کے خیالی وجود کو زیر تنقید لایا جاتا ہے جس کی وضاحت یہ روز مرہ کے حسی تجربات کی بنا پر کرتا ہے۔ یہ عمل اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ کوئی لطیف نتیجہ برآمد نہ ہو جو تمام صورتوں پر حاوی اعلیٰ ہیئت ہے ---- فی نفسہ جسے عدم کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی طبیعیات کے تمام امکانات اور تفہیم عالم کے ذرائع ختم ہو جاتے ہیں اور مابعدالطبیعیات کی طلب دوبارہ شروع ہو جاتی ہے مگر یہ ایک مسلکی تفریح نہیں ہے جو پڑھے لکھے اور دانشور طبقات کے لیے لطف اندوزی کا سامان مہیا کرتی ہے اور اس غرض کے لیے دوسری مذہبیت کا سامان فراہم کرتی ہے۔ اس کا منبع وہ معصومانہ اعتقاد ہے جو نمایاں طور پر تو نہیں بلکہ بغیر کسی نشاندہی کے اچانک پیدا ہو جاتا ہےاور طبقہ عوام اس سے متاثر ہوتا ہے کیونکہ اس میں کسی حد تک تصوف کی حقیقت کا شائبہ موجود ہوتا ہے (اگرچہ اس میں کوئی حتمی مقصد اور رسمی ثبوت موجود نہیں ہوتے اور ماسوائے لفظی الٹ پھیر کے اس میں کچھ نہیں ہوتا) اور ہر دل کی ایک اور سادہ ضرورت' ہر مسلک کے ساتھ ملحق ایک اساطیری روایات کا سلسلہ ہے' اس سلسلے میں نہ تو کوئی پیش گوئی ممکن ہوتی ہے اور نہ انتخاب۔ یہ خودبخود ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ جہاں تک ہماری اپنی ذات کا تعلق ہے ہم اس منزل سے ابھی کوسوں دور ہیں مگر کامت اور سپنسر کی آرا میں مادیت توحید اور ڈارون کے نظریات نے انیسویں صدی کے اعلیٰ دماغوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ ان کی شدت اس قدر زیادہ تھی کہ انھوں نے عالمی تصورات کی صورت اختیار کر لی۔

۲۵۰ء تک کلاسیکی فلسفہ اختتام پذیر ہو چکا تھا۔ اس کے بعد کسی علم کا تجزیہ نہیں کیا گیا اور نہ اس میں کوئی اضافہ ہوا مگر ایک اعتقاد تھا جو عادت کی صورت اختیار کر چکا تھا چونکہ ایک قدیم اور اچھی طرح سے آزمایا ہوا طریق کار موجود تھا' یہ عادت قائم رہی سقراط کے زمانے میں۔

کردار کے نظریات وعمل جن کی تعلیم بدھ نے دی وہ خستگی عالم اور ناامیدی دانش کا نتیجہ تھی۔ ان کا مذہبی مسئلے سے کوئی تعلق نہ تھا اور پھر بھی ہندوستان کے دور آغاز میں (۲۵۰ ق م) وہ فی نفسہ ایک روحانی پیشوا بن چکا تھا' اس کا نظریہ نروان صرف علما ہی کی سمجھ میں آسکتا تھا۔

اس میں جنت اور دوزخ اور نجات کے مادی اصول بیان کیے گئے تھے۔ یہ اصول بظاہر دوسرے اجنبی ذرائع سے مستعار لیے گئے تھے غالباً" ان کا منبع ایرانی مکشوفات تھا۔ اشوک کے دور میں بدھ فرقوں کی تعداد اٹھارہ ہو چکی تھی۔ جہاں تک مہایانہ مسلک کا تعلق ہے تو اس کا سب سے بڑا داعی اسوا گوشا (۵۰ ق م) تھا

اور اس کی تکمیل نگار جونا نے (۱۵۰ء میں) کی مگر ان تعلیمات کے ساتھ ساتھ قدیم ہندوستان کی تمام اساطیر بھی طول وعرض میں پھیل گئیں۔ وشنو اور شو کے مذاہب ۳۰۰ ق م میں اپنی ہیئت کی تکمیل کر چکے تھے اور تطبیق عقائد کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ اب رام اور کرشن کی داستانیں وشنو کے ساتھ منسلک ہو چکی تھیں۔ ہم نے یہی نظارہ مصر کی نئی سلطنت میں بھی مشاہدہ کیا ہے جہاں پرامن اور تھیسس نے مل کر تطبیق عقائد کا ایک بہت بڑا مرکز قائم کر لیا۔ یہی صورت عرب ممالک عباسی عہد میں تھی جس میں کہ عوامی مذاہب جن میں برزخ' دوزخ' روز حشر اور کعبہ جنت کے تصورات موجود تھے اقنوم ثانی اور خود حضرت رسول اکرمؐ کی ذات تک سے بھی انحراف کر لیا۔

اس دور میں بعض اعلیٰ پائے کے فطین بھی موجود تھے۔ نیرو کا اتالیق سینکا اور اس کا مدمخالف پسی لس جو فلسفی شاہی اتالیق اور باز نطینی قیصریت کے دور کا سیاستدان بھی تھا۔ اسی طرح مارکس اور یلی اکس جو ایک رواقی تھا اور اشوک(۷۰) جو کہ بدھ مت کا پیرو کار تھا یہ دونوں خود بھی قیصر ہی تھے جس طرح فرعون' ایمن' ہوتیپ چہارم (اخناطون) جس کے اہم تجربات کو کفر قرار دیا گیا اور ایمن پجاریوں نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ یہ خطرہ اشوک کو بھی برہمنوں کی طرف سے درپیش تھا۔

قیصریت نے فی نفسہ چین میں بھی رومی سلطنت کی طرح شہنشاہی پرستش کا مسلک ایجاد کیا اور اس طرح شاہی مذہب کی شریعت تلیسق کی بنا ڈالی۔ یہ ایک بے سروپا بات ہے کہ چین میں بادشاہ کی تقدیس کسی پرانے مذہب کی نشانی ہے۔ چینی ثقافت کی تمام تاریخ میں کبھی کوئی شہنشاہ نہیں ہوا۔ ریاستوں کے بادشاہوں کو وینگ کہا جاتا تھا (یہ کنگ ہی کی چینی صورت ہے)۔ چینی آگسٹس' مینگ تسے کی فتح کے ایک صدی قبل ---- انیسویں صدی کے مابین لکھا---- کہ ملک میں عوام ہی سب سے بڑی قوت ہیں' اس کے بعد مفید دیوتاؤں اور فصلوں کا درجہ ہے اور سب سے آخری اہمیت حکمران کی ہے۔ بادشاہوں کو خدا بنانے کی تجویز کنفیوشس اور اس کے ہمعصر ساتھیوں کی تھی۔ اس کی دستوری اور معاشرتی اور اخلاقی ہیئت ان کی روشن خیالی کے مقاصد کا تقاضا تھی اور انھوں نے چینی قیصریت کے اساطیر سے خطاب اور تصور دونوں حاصل کیے انسان کو خدائی کا مقام عطا کرنا اس دور عروج کی یادگار ہے جس میں کہ دیوتاؤں کو ہیرو بنا کر پیش کیا گیا تھا۔ بالکل اسی طرح ہومر کے شہنشاہ اور دیگر کردار تھے اور یہ صورت تمام مذاہب میں دوسرے درجے میں موجود ہے۔ ۵۷ء میں کینفیوشس کی حکم عدولی کی گئی جب کہ بدھ مت کو بہت پہلے سے شاہی مذہب کی حیثیت حاصل تھی۔ الغزالی (۱۰۵۰ء) جس نے اسلام میں دوسری مذہبیت کے قیام کی اب وہ عام اعتقاد کے مطابق ایک روحانی شخصیت اور محبوب بزرگ اور حامی اسلام کی حیثیت کا حامل ہے (۷۱) ۔ کلاسیکی فلسفے کے مدارس فکر میں ایک مسلک افلاطونی تھا اور ایبی کیوریوس اور اسکندر کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ علی الترتیب ہراکلیس اور قیصر کی اولاد سے ہیں اور دائیوس کے مسلک سے متعلق ہیں جن میں کہ آرفیئی تخیلات کے تحت متعدد خاندانی مذاہب پیدا ہوتے رہے جیسا کہ قدیم چینی اساطیر میں ہوانگ تی کا مسلک موجود ہے۔

مصر

مگر شہنشاہیت کے مسلک کے وجود کے بعد ان ہر دو مسالک میں دوسری مذہبیت کی تنظیم قائم کرنے کی کوشش کی گئی جس کا نام نسلی تنظیم کلیسا رکھا گیا۔ یہ بالکل دور عروج کے معاشرے کی نقل تھی جس میں کہ ذات برادری معاشرتی مرتبے کی علامت تھی۔

آگسٹائن کی اصلاحات میں بھی' مردہ شہروں کے مسلک کی احیا کی کوشش کی گئی۔ جیسا کہ فریٹرز آرویل کے رواجات میں مگر یہ صرف یونانی پراسرار مذاہب ہی سے مخصوص تھا۔ اس کا کچھ تعلق میتھرا ازم سے بھی تھا(۷۲)۔ اس تنظیم کے عبادت خانوں اور دیگر رواجات کا کلاسیکی دور کے اختتام کے ساتھ ہی آغاز ہوا اور جلد ہی ختم ہو گیا۔ مصر میں اس کے متوازی نظریاتی ریاستوں کا پروہت بادشاہوں کا نظام تھا' جو گیارھویں صدی میں تھیسس میں رائج تھا اس کا چینی مثیل ہان کے دور کے تاؤ مندر ہیں' بالخصوص وہ جو چانگ لو نے تعمیر کرائے جن کی بدولت پیلی پگڑیوں کا دوبارہ رواج شروع ہوا۔(رومن سلطنت کے خلاف صوبائی بغاوتوں کو یاد کریں) جس سے تمام علاقہ تباہ وبرباد ہو گیا اور ہان خاندان بھی ختم ہو گیا(۶۷)۔ اور تاؤ ازم کا نقش ثانی جس میں شدت اور زوردار اساطیر کا وجود تھا وہ متاخر باز نطینی راہبوں کی ریاستیں تھیں' مثلاً سٹوڈیون اور خود مختار خانقاہیں جو ایتھوز میں ۱۱۰۰ء میں تعمیر کی گئیں اور وہ اس قدر بدھ مت سے مشابہ ہیں کہ کوئی اور نظیر نہیں ملتی۔

بالاخر مذہبیت ثانی فیلاب مذہب میں ملتی ہے۔ اس میں شہری اور صوبائی حکومتوں کا اختلاف ختم ہو چکا تھا جیسا کہ قدیم اور ترقی یافتہ ثقافتوں میں اس کا کوئی وجود نہ تھا۔ کیا اسے فلاحین کا تصور سمجھیں ؟ جن کا تعلق گزشتہ ابواب میں ہو چکا تھا۔ مذہب کی تاریخی حیثیت اس وقت ختم ہو جاتی ہے جبکہ متعدد سالوں کے بعد نیا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اب متعدد صدیاں اپنی اہمیت کے بغیر گزر جاتی ہیں۔ اور سطحی تبدیلیوں کے نشیب وفراز' داخلی کیفیت' نا قابل تغیر ہونے کا مظاہرہ کرتی ہے جو نیوژن ازم کا چین میں آغاز ہوا۔ ۱۲۰۰ء جو کنفیوشس کے عقائد سے مختلف تھا۔ یہ کب قائم ہوا؟ اور کیا اسے کوئی کامیابی نصیب ہوئی؟ یہ مسائل قابل تحقیق ہیں اور اس امر کی بھی کوئی اہمیت نہیں کہ ہندوستانی بدھ مت مدت سے کثیرالخدائی مذہب بن چکا تھا اور جدید برھمنیت سے شکست کھا گیا (جن کا عظیم رہنما شنکارا ۸۰۰ء کے قریب زندہ تھا) اور یہ جاننا بھی زیادہ اہم نہیں کہ کون سی تاریخ کو بدھ مت وشنو اور شیوا کے مسلک میں شامل ہو گیا۔ یہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا کہ بعض انتہائی ذہین انسان پیدا ہوتے رہیں گے' جیسا کہ ہندوستان میں برہمن اور چین میں میڈرن اور مصر کے پجاری جن کو دیکھ کر ہیرو ڈوٹس حیران رہ گیا۔ مگر فلاحین کا مذہب ہمیشہ سے قدیم رہا ہے۔ جانوروں کو پوجا کا مسلک جس کا رواج مصر کے تھبیسویں خاندان میں تھا۔ بدھ مت کنفیوشس ازم اور تاؤازم کا مرکب' اب چین کا ریاستی مذہب ہے اور آج کے مشرق میں اسلام کا دور دورہ ہے۔ ازدیوں کا مذہب بھی قابل غور ہے جیسا کہ کورٹز نے کہا کہ مایا تہذیب کے مذہب کے متعلق کوئی بھی رائے قائم کرنا اب ممکن نہیں (کیونکہ اس تہذیب کا کوئی ایک فرد بھی زندہ نہ رہا)۔

(۷)

یہودی مذہب بھی فلاحیں کے مذہب ہی کی ایک کڑی ہے جب سے کہ یہودہ بن حلیوی (اپنے مسلمان استاد الغزالی کی طرح) فلسفے کی سائنس کو تشکیک کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اور کزاری (۱۱۴۰) نے فلسفے کا کوئی مقصد بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا' ماسوائے اس کے کہ یہ قدیم مذاہب کی کنیز کی حیثیت کا حامل تھا۔ یہ تصور اس عبوری دور کے تصورات کے عین مطابق ہے جو وسطانی عہد کے رواقیوں اور متاثر عہد کے شہنشاہی ادوار میں قائم تھا اور مغربی ہان خاندان کے خاتمے کے دور میں چین میں مروج تھا۔ اس سے بھی زیادہ اہم موسیٰ نائے منادی کی شخصیت تھی جس نے ۱۱۷۵ میں یہودیت کے تمام عقائد کو جمع کیا اور اسے ایک مکمل کتاب کی صورت میں مرتب کیا اور جیسا کہ چینی لی اوج نے کیا تھا۔ جس نے اس امر کا بھی کوئی خیال نہ رکھا کہ کسی مخصوص مد کی اس دور کے حوالے سے کوئی معنوی حیثیت بھی موجود ہے یا نہیں؟ یہودیت نہ تو اس دور میں اور نہ ہی کسی اور زمانے میں تاریخ کی کسی نمایاں حیثیت کی حامل رہی ہے۔ اگرچہ اس نقطہ نظر سے مغربی ثقافت نے اسے اپنے طور پر خاص اہمیت دی ہے اور اس طرح اس کی اہمیت پیدا ہوئی ہے ۔ یہ صرف یہودیوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں کہ جو کچھ وہ برداشت کرتے ہیں اس کا کوئی تصور ہی نہیں ہوتا۔ یہودیت کا نام ہی ہر دور میں اپنے معانی تبدیل کرتا رہا ہے۔ اہل فارس کی داستان میں بھی قدم بقدم ایسا ہی ہوتا ہے۔

ان کے میرودنجی دور میں ---- کم و بیش آخری پانچ صدیاں حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے قبل یہودی اور اہل فارس قبائلی حیثیت سے ترقی کر کے مجوسی نسل کا حصہ بن گئے ۔ اگرچہ ان کے پاس کوئی زمین نہ تھی۔ ان کی اصل ایک نہ تھی' اور (پھر اس قدر جلد) اپنی گیٹو رہائش کے باوجود اس صورت حالات میں زندہ رہے جو پارسیوں کو بمبئی میں اور یہودیوں کو بروک لین میں درپیش ہیں۔ اپنے زمانہ عروج میں (عیسائی تقویم کی پہلی پانچ صدیوں میں) یہ بے خانماں قوم جغرافیائی طور پر ہسپانیہ سے لے کر شنٹونگ تک پھیل گئی۔ یہ یہودیوں کی جرات آزمائی کا دور تھا اور اس کے ساتھ روی مذہب کی تخلیقی قوت کا بھی زمانہ تھا۔ بعد کے مکاشفاتی دور میں مسیحا نیز ابتدائی عیسائیت (جسے ٹراجن اور ہڈرین دور تک علیحدہ قومیت کی حیثیت حاصل نہ ہوئی تھی) نے مل کر قوم کی تشکیل کی۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ اس دور میں یہودی کاشتکاری کرتے تھے۔ کہیں کہیں دستکاری سے بھی وابستہ اور چھوٹے چھوٹے قصبات میں رہتے تھے اور تجارت کا بڑا کاروبار مصریوں' یونانیوں اور رومیوں کے ہاتھ میں تھا۔ کلاسیکی دنیا کے اراکین کی یہی صورت تھی۔

تقریباً" ۵۰۰ میں یہودیوں کے بارونق کا آغاز ہوا مغربی ماہرین اسے یک طرفہ کہنے کے عادی ہیں۔ کیونکہ اس میں ہسپانوی دور کو شہرت و ناموری کا دور کہا گیا ہے۔ یہودی اجماع بھی اس دور میں اہل فارس' مسلمانوں اور باز نطینیوں کی طرح شہری روشن خیالی کی طرف بڑھنے لگا اور اس کے بعد سے شہری معاشیات اور سائنسی علوم پر قبضہ کر لیا۔ تاراگونا' ٹولیڈو اور غرناطہ میں یہودیوں کی اکثریت ہے۔ موروں کے

اعلیٰ طبقات میں بھی یہودی اہم عناصر کی حیثیت کے حامل ہیں ۔انھوں نے اپنی ہیئت بدل لی ان میں جرات سپہ سالاری کا وہ جذبہ پیدا ہوا کہ صلیبی جنگ جو ان کو دیکھ کر حیران رہ گئے بلکہ وہ ان کی نقل کرنے لگے ۔مگر اس کے علاوہ سفارت کاری' جنگ کے اہتمام کے علاوہ اعلیٰ سائنسی مقالات بھی لکھے جانے لگے۔ ربائی اسحاق حسن کی رہنمائی میں یہودی' مسلمان اور عیسائی داناؤں نے الفانسو دہم کے حکم پر سیاروں پر نیا کام شروع کیا۔ (۱۲۵۰ء) دوسرے الفاظ میں یہ کامرانی مجوسی ثقافت کی تھی جس میں فاؤستی ثقافت کا کوئی دخل نہ تھا مگر مراکو اور ہسپانیہ میں یہودی اتفاق رائے بہت کم دیکھنے میں آیا۔ مگر یہ اتفاق رائے محض الفاظ تک محدود نہ تھا (اور غالب حیثیت میں)۔ اس میں روحانی اہمیت کا وجود بھی شامل تھا۔ اس میں ایک شدید نوعیت کی مذہبیت کی تحریک شامل تھی جس کے تحت تالمود کو ترک کر کے واپس توراۃ کی طرف مراجعت کے لیے کہا گیا تھا۔ قرا ئسلیوں کا گروہ جو کئی ترقی پسندوں سے بھی برتر تھا۔ شمالی شام میں ۷۴۰ء میں وجود میں آیا ۔ یہ وہی علاقہ ہے جس میں ایک صدی پہلے پال کے بت شکن پیدا ہوئے تھے اور مزید سو سال بعد مسلمان صوفیا نے اپنی تحریک کا آغاز کیا۔ ان کے مجوسی رجحانات جن کے داخلی رشتوں پر کسی غلط فہمی کا جواز نہیں۔ قرا ئلی بھی کٹر عیسائیوں اور دیگر ثقافتوں کی طرح قدامت پسندی اور روشن خیالی کا بیک وقت مظاہرہ کرتے تھے۔ ربائیوں کا ردعمل غرناطہ' فیض' جنوب' عرب اور فارس سے نعرہ زن ہوا مگر اس دور میں روشن خیالی پر مبنی تصوف بھی ظہور میں آیا۔ بسیرو جرمین اپنے قبائلی بنیادی تصورات کے ساتھ اور ہمعصر یونانی جادو گری کی مدد سے دوسرے درجے کی عیسائیت کو وجود میں لے آیا اور اس طرح عوامی مذہب یعنی اسلام کا مقابلہ کرنے کے آغاز کیا۔

لیکن اس وقت ایک بالکل نئی صورت پیدا ہوگئی جب ۱۰۰۰ء کے قریب یہودیت کی آبادی کے مغربی حصے نے اپنے آپ کو اچانک نوجوان مغربی ثقافت میں گھرا ہوا محسوس کیا ۔ اس دور میں یہودی بھی پارسیوں یا باز نطینوں اور مسلمانوں کی طرح تہذیب اور شہری تمدن اختیار کر چکے تھے' جبکہ جرمن اور روی ابھی تک دیہاتی زندگی بسر کر رہے تھے اور وہ آبادیاں جو ابھی ابھی آباد ہوئی تھیں (یا آباد ہو رہی تھیں) وہ خانقاہوں کے اردگرد واقع تھیں یا منڈیوں کے قریب تھیں ۔ ابھی تک وہ اپنی حقیقی روح کے اظہار سے نسلوں پیچھے تھیں جب کہ یہودیوں نے فلاحین کا درجہ حاصل کرلیا تھا۔ اہل مغرب ابھی تک قدیم دور میں زندگی بسر کر رہے تھے ۔ یہودیوں کو رومیوں کی داخلیت' قلعوں اور کلیساؤں سے پوری آگاہی نہ تھی اور نہ ہی وہ عیسائیوں کے مزاج سے پوری آگاہ تھے ۔ حالانکہ وہ ہر لحاظ سے یہودیوں سے بر تر تھے مگر اس کے باوجود یہودی منہ پھٹ اور مالی معاملات میں بہت طاق تھے ۔ دونوں کے مابین نفرت اور حقارت کے جذبات پیدا ہو گئے ۔ اس کی وجہ نسلی امتیاز تو نہ تھا بلکہ منزل ارتقا کا فرق تھا۔ یہودیوں نے بالاتفاق رائے اپنے دیہات' دیہاتی قصبے اور بڑے بڑے شہر الگ بسا لیے تھے۔ پرولتاری یہودی بستیاں ۔ گھاٹو کہلاتی ہیں ۔ یہودی بستیاں روی قصبات سے ایک ہزار سال آگے ہیں ۔ حضرت عیسیٰ کے دور میں روی قصبے اور دیہات جیسرات جھیل کے اردگرد واقع تھے مگر یہ نوزائیدہ اقوام نہ صرف یہ کہ اپنی سرزمین اور تصورات وطن سے پیوستہ تھیں۔ اور وہ لوگ جن کے پاس کوئی اراضی نہ تھی وہ اجماع کے پابند تھے جو کسی باقاعدہ تنظیم کے تحت وقوع پذیر

نہ ہوتا تھا بلکہ بالکل غیر شعوری طور پر محض مابعدالطبیعیاتی انگیخت ۔ عام مجوسی احساس عالم کے مطابق اور براہ راست صورت میں عوام کو پراسرار' غیر ارضی اور ناقابل فہم معلوم ہوتا' یہی دور تھا جس میں کہ آوارہ یہودی قبائل کا افسانہ تراشا گیا۔ اس کا پسندیدہ پہلو یہ تھا کہ کوئی سکاٹ لینڈ کا راغب کسی لمبارڈ خانقاہ میں جاتا' اور پھر یاد وطن میں مراجعت اختیار کر لیتا'مگر جب مینز کا کوئی ربی مغرب میں تالمودی مرکز قائم کر لیتا یا کسی لیزرنو نے قاہرہ' مرو یا اجرہ' میں اقامت اختیار کر لی تو ہر یہودی آبادی اس کا گھر بن جاتی' ہر گھر اس کا استقبال کرتا۔ اس تصور اتحاد نے ایک نئی مجوسی قوم کی تشکیل کی ۔ ---- اگرچہ ہمعصر مغرب ان واقعات سے بے خبر تھا۔ کیونکہ یہ صرف یہود کا معاملہ تھا لیکن جہاں تک اس عہد کے یونانیوں' پارسیوں اور مسلمانوں کا تعلق ہے تو ان میں ریاست' کلیسا اور عوام سب کو ایک ہی سمجھا جاتا۔ اس ریاست کا اپنا قانون موضوعہ تھا۔ اور (جس کے متعلق عیسائیوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا) اور ان کی اپنی عوامی زندگی تھی۔ اور وہ اپنے اردگرد کے لوگوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور مقامی لوگوں کو جو ان کے مہمان نواز ہوتے' ان کو بھی غیر سمجھتے اور یوریئل اور سپائی نواز کو بغاوت کے جرم میں جلا وطن بھی کیا گیا ۔ مقامی لوگ اس واقعہ کے حقیقی مطالب کو کبھی نہ سمجھ سکے اور ۱۷۹۹ء ہیں مشرقی جسیڈیوں میں ایک مفکر سلمان سینئر ربائی مخالفین پیٹرز برگ کی حکومت کے حوالے کیا۔ گویا کہ وہ کسی اجنبی حکومت سے معاملہ کر رہے تھے ۔

مغربی یہودیوں نے کھلی زمین (کاشتکاری) سے اپنا رشتہ بالکل منقطع کر لیا ہے حالانکہ ہسپانیہ کے اسلامی دور میں یہ لوگ کاشتکاری بھی کرتے تھے ۔ اب کوئی یہودی کاشتکاری نہیں کرتا تھا۔ ایک چھوٹی سی یہودی بستی بھی اراضی کے ایک ٹکڑے ہی پر واقع ہے خواہ وہ کتنے ہی بڑے شہر کا حصہ ہو ۔ یہ باشندے (چینیوں اور ہندوستانیوں کی طرح) ذات پات کے بندھوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔

ربائی' یہودی آبادی کے مندر کا برہمن ہے اور مزدوروں کا طبقہ' مہذب' خنک مزاج' اعلیٰ دانشمند اور تاجروں کی نظر میں بے توقیر تھا۔ مگر ذات پات اور پیشہ ورانہ تقسیم کسی خاص قوم کے ساتھ مخصوص نہیں۔ کیونکہ تمام مجوسی مذاہب میں صلیبی جنگوں کے دور کے بعد طبقاتی تقسیم رائج ہو گئی تھی جس طرح یہودی یورپ اور امریکہ کی تجارت پر چھائے ہوئے ہیں اسی طرح پارسیوں کا بھی ہندوستانی تجارت پر قبضہ ہے اور یونانی جنوبی یورپ میں تجارت یونانیوں کے ہاتھ میں ہے ۔ ہر ثقافت میں یہ صورت حالات موجود ہے جب یہ اپنے شباب کے تناظرے سے تناظر سے گزرتی ہے تو یہ صورت حال وجود میں آ جاتی ہے ۔ چینیوں کو کیلی فورنیا میں دیکھیں (جہاں پر کہ وہ سامیوں کی مخالفت کا ایک بڑا نشانہ ہیں)۔ جاوا اور سنگاپور میں بھی تجارت چینیوں کے ہاتھ میں ہے ۔ ہندوستانی تاجر مشرقی افریقہ میں اور رومی قدیم عرب دنیا میں تجارت پر قابض تھے ۔ آخری دور میں حالات آج کے برعکس ہو چکے تھے کیونکہ اس دور کے یہودی روم کے متوطن تھے اور آرامی اپنے آپ کو کشوفاتی نفرت کا شکار سمجھتے تھے جیسا کہ دور حاضر کے مغرب میں سامی مخالف رجحان موجود ہے۔ ۸۸ء میں ایک ہنگامے میں تقریباً ایک لاکھ رومی تاجر قتل کر دیے گئے تھے ۔ یہ ایک وحشیانہ منظم قتل عام تھا۔

ان مخالفتوں کے علاوہ نسلی مخاصمت بھی موجود تھی۔ جو بے عزتی سے آگے بڑھ کر نفرت میں تبدیل ہو چکی تھی ۔ اس کی مقدار میں اسی رفتار سے اضافہ ہو رہا تھا جس رفتار سے مغربی ثقافت تہذیب کے مدارج طے کر رہی تھی اور عمر میں فرق اسلوب حیات میں دکھائی دے رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ذہانت میں کمی آتی جا رہی تھی ۔ مگر اس کا آریائی اور سامی کے احمقانہ نعرے سے کوئی تعلق نہ تھا جو علم لسانیات سے مستعار لیا گیا تھا۔ ہماری نظر میں ایرانی اور آرمینائیوں کا یہودیوں سے امتیاز کرنا ممکن نہیں اور جنوبی یورپ اور بلقان میں بھی یہودیوں اور عیسائیوں میں کوئی جسمانی فرق نہیں۔ یہودی تصورات عرب ممالک کے دوسرے باشندوں کے تصورات سے مختلف نہیں۔ یہودی قوم بھی دوسری عرب اقوام ہی کی طرح ہے۔ یہ حد سے بڑھی ہوئی تبلیغی جدوجہد اور صلیبی جنگوں کے دوران علیحدگی کا تصور بار بار تبدیل ہوتا رہا۔ یہودیوں کا ایک گروہ قازقستان' جنوبی روس اور تاتارستان میں اور یہودیوں کی ایک بہت بڑی آبادی جو مغربی یورپ سے افریقی لیبیا تک پھیلی ہوئی ہے' سب نسلی لحاظ سے یکساں ہیں اور ان علاقوں میں آباد دوسری نسلوں کے ساتھ بھی مشابہ ہیں ۔ یورپ میں جس امر نے سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر لی ہے۔ وہ قدیم رومیوں کا نسلی تصور ہے' جو ان کے زمانہ عروج میں بہت بڑھ گیا تھا اور سفاردی یہودیوں کو علیحدہ نسل سمجھا گیا تھا۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنی علیحدہ بستیاں قائم کیں اور مخصوص روحانی تربیت' سخت خارجی حالات میں دی جاتی ۔ اس کے ساتھ ہم بلاشبہ اس حقیقت کا بھی اضافہ کر سکتے ہیں کہ متعلقہ ماحول میں رہنے والے دوسرے انسانی گروہوں مابعدالطبیعیاتی مدافعتی ردعمل کا اظہار ہوا ۔ بالخصوص جب ان کی مادری عربی زبان سے ان کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو یہ علاقہ ایک خود مکتفی دنیا کی صورت اختیار کر گیا اور مختلف ہونے کے احساس نے دونوں اطراف کے باشندوں میں ایسی نفرت کی فضا پیدا کر دی' گویا ہر شخص مختلف نسل سے تھا۔ یہ نسل سے متعلق ہونے کی خواہش کا نتیجہ تھا' اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اسی سے دانش وروں کو فلسفی صاحب اصول اور صاحب خیال کی حیثیت حاصل ہوتی ہے لیکن یہ لوگ بھی اس مابعدالطبیعیاتی نفرت کی تہ تک نہیں پہنچ سکے۔ یہ اس بے ہنر ناقابل برداشت لہر کا نتیجہ ہے جو دونوں طبقات کے خون میں موجود ہے۔ یہ ایک ایسی نفرت ہے جو کسی وقت دونوں کے لیے خطرناک ہو سکتی ہے۔ یہی نفرت کی لہر ہندوستانی ثقافت میں بھی موجود ہے اور اس کا اظہار شودروں میں ہوتا رہتا ہے۔ رومیوں کے دور میں' یہ فرق گہرا اور مذہب سے متعلق تھا۔ اس نفرت کا مقصد مذہبی اجماع تھا۔ صرف مغربی تہذیب کے وجود کے ساتھ اس نے مادی صورت اختیار کر لی اور یہودیوں پر ان کی دانش و فکر اور تجارت کے میدانوں میں حملے ہونے لگے اور مغرب کو اچانک احساس ہوا کہ اس کا برابر کی فکر سے مقابلہ ہے۔

مگر علیحدگی اور تلخی کا سب سے سنجیدہ عنصر وہ ہے جس کے مکمل المیے کو کبھی سمجھا نہیں گیا۔ جبکہ مغربی انسان سیکسن شہنشاہوں ہی کے عہد سے آج تک (ان الفاظ کے صحیح مفہوم میں) تاریخ میں زندہ رہا ہے اور اس شعور سے زندہ رہا ہے کہ کوئی دوسری ثقافت اس کی برابری نہیں کر سکتی۔ یہودی اجماع کی اپنی کوئی تاریخ باقی نہیں۔ اس کے تمام مسائل حل ہو چکے تھے۔ اس کی داخلی ہیئت مکمل ہو چکی تھی اور فیصلہ کن

مراحل پر پہنچ چکی تھی اور اب ناقابل تغیر ہو چکی تھی۔ کیونکہ اس معاملے میں اسلام ' یونانی کلیسا اور پارسی صدیوں سے اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔ اس کے نتیجے میں داخلی طور پر اجماع تو درکنار ان میں سے کوئی بھی اس آرزو کو سمجھ بھی نہیں سکتا جسے مغربی فاؤستی تہذیب نے بڑے مختصر عرصے میں تجزیہ زندگی میں سمو لیا ہے اور تاریخ کے فیصلہ کن مراحل میں اپنا انجام متعین کر لیا ہے صلیبی جنگوں کے آغاز میں تحریک اصلاح کلیسا انقلاب فرانس جرمنی کی جنگ ہائے آزادی اور مختلف اقوام میں زندگی کے ایسے موڑ تاریخ میں ہمیشہ کے لیے اپنا مقام پیدا کر لیتے ہیں۔ یہودیوں کے لیے یہ مرحلہ تیس نسلیں قبل آباد تھا اور ان کے حلقے کے باہر تاریخ اپنا سفر طے کرتی رہی۔ ہر صدی نے بنیادی انسانی تبدیلیوں کا نظارہ دیکھا مگر یہودیوں کی بستیوں اور ان کے کینوں کی ارواح میں ہر شے جامد رہی۔ ایسی حالت میں بھی جب یہودیوں نے دنیا کی دوسری اقوام کو بھی موجود پایا اور اپنے آپ کو ایک مشترک دنیا کا حصہ دار سمجھا اور ان کے اچھے برے ایام میں' ان کے ساتھ چلنے کی کوشش کی ---- جیسا کہ ۱۹۱۴ء میں یہ بہت سے ممالک میں ہوا تو یہودیوں نے اس تجربے کو کبھی اپنی ذات سے منسلک نہیں کیا بلکہ اس کا اشتراک محض حصہ دار کے طور پر ایک معاون کی حیثیت سے ہی رہا۔ اس نے ان معاملات کو ایک تماشائی کی حیثیت سے جانچا۔ ایک یہودی رسالے کا جرنیل تیس جنگ میں لڑتا رہا (اب وہ پراگ کے پرانے یہودی قبرستان میں مدفون ہے) مگر اس کے نزدیک لوتھر اور لویولا کے تصورات کی کیا حقیقت ہے؟---- اس کا کوئی فائدہ ہے کہ باز نطینی یہودیوں کے قریبی رشتہ دار ہیں؟ صلیبی جنگوں پر اس حقیقت کے اثرات تھے؟ یہ اعلیٰ درجے کی تاریخ کے السیاتی لزومات میں شامل ہے جو انفرادی ثقافتوں کے راستے میں آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں اور اکثر اپنے آپ کو دوہراتی بھی رہتی ہیں۔ رومی اس دور میں اپنی طبیعی عمر پوری کر چکے تھے۔ انھیں اس کا علم نہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کے خلاف مقدمے کی سماعت سے یہودیوں کو کیا دلچسپی تھی یا بار کو چیساس کو کھڑا کرنے سے یہودیوں پر کیا اثر پڑتا؟ یورپی امریکی دنیا نے ایک مکمل فلاحی انقلاب کا ۱۹۰۸ء میں ترکی میں مشاہدہ کیا اور یہی تجربہ ۱۹۱۱ء میں چین میں ہوا۔ ان لوگوں کی داخلی زندگی اور فکر اور نتیجتاً ان کی ریاست اور آزادی کے تصورات (ایک میں خلیفہ اور دوسرے میں افلاک کا شہزادہ) بالکل علیحدہ نوعیت کے ہیں اور اس طرح ایک مہر کردہ کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے سلسلہ واقعات نہ تو جانچا سکتا ہے اور نہ ہی قبل ازوقت اس کا کوئی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک اجنبی ثقافت کا محض ایک تماشائی ہو سکتا ہے۔ اس لیے وہ ماضی کے متعلق بیانیہ تاریخ نگار بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ کبھی بھی ایک مدبر نہیں ہو سکتا۔ یعنی ایک ایسا شخص جو مستقبل کے طریق کار کو محسوس کر سکے۔ اگر اس کے پاس وہ قوت نہ ہو جس کے نتیجے میں وہ اپنی ثقافت میں مناسب کارروائی کر سکتا۔ اجنبیوں کو نظر انداز کر سکے یا خوش اسلوبی سے قبول کر لے (ایسی صورت پیدا ہو سکتی ہے جیسا کہ رومیوں کو مشرق میں پیش آئی یا ڈسرائیلی کو انگلستان میں سامنا کرنا پڑا)۔ ایسی صورت میں جبکہ مذکورہ قوت اس کے پاس نہ ہو تو وہ مجبور محض واقعات کے مابین کھڑا رہ جاتا ہے۔ یونانی ہمیشہ اپنا شہری اسلوب حیات دوسروں کے معاملات میں شامل کرنے کے عادی تھے۔ جدید یورپی ہمیشہ اپنی تضاد وقدر کو دستور پارلیمنٹ اور جمہوریت کی روشنی میں دیکھنے کے عادی ہیں۔ حالانکہ ان تصورات کو دوسروں پر ٹھونسنا بے مقصد اور بے معنی ہے اور یہودی اجماع کے ذریعے زمانہ حال کی تاریخ پر عمل کرتے ہیں (جو فاؤستی تہذیب کے علاوہ مزید کچھ نہیں جو براعظموں اور سمندروں پر پھیل چکی

ہے)۔ اس پر مجوسی بنی نوع انسان کے احساسات حاوی رہتے ہیں جبکہ وہ اپنی فکر کے مغربی انداز سے آشنا ہے۔

ہر مجوسی اجماع جغرافیائی اور علاقائی پابندیوں سے آزاد اور لامحدود ہوتا ہے۔ یہ غیر شعوری طور پر ان تمام مسائل کو سمجھتا ہے جو فاؤستی تہذیب کو درپیش ہیں' مثلاً مادر وطن' مادری زبان' شاہی خاندان ' شہنشاہیت ' دستور' ایسے طرز عمل کا ترک جو اغیار سے وابستہ ہو (اس لحاظ سے بے معنی بوجھ اور بے معنی ہو)۔ وہ صرف ایسی فعالیتیں اختیار کرتا ہے جو اس کی اپنی فطرت کے مطابق ہوں اس لیے" بین الاقوامی" کی اصطلاح خواہ اس کا تعلق اشتمالیت' امن پسندی" یا سرمایہ داری سے ہو' اس کے جوش و خروش میں اضافہ کرتی ہے مگر جو کچھ وہ اس سے مطلب اخذ کرتا ہے وہ بے وطنی اور لامحدودیت پر مبنی اجماع ہے - جبکہ یورپی اور امریکی جمہوریت کے لیے دستوری جدوجہد اور انقلابات کا مطلب مہذب تصورات کی جانب انقلابی اور ارتقائی اقدام ہے۔ اس کے لیے ان کا مطلب جیسا کہ وہ سمجھتا ہے (مگر اس نے شعوری طور پر کبھی اسے قبول نہیں کیا) یہ ہے کہ ہر اس شے کو توڑ کر رکھ دے جو اس کے لیے کسی اور نے تعمیر کی ہو۔ اس صورت میں بھی جبکہ اس کے اندر اجماع کی قوت ختم ہو چکی ہو اور میزبان قوم کے لیے لوگوں میں توجہ پیدا ہو رہی ہو اور وہ جب الوطنی کے مقام تک پہنچ گیا ہو۔ پھر بھی وہ ایسی سیاسی جماعت میں شامل ہوگا جس کے مقاصد اس کی مجوسی فکر کے ہم آہنگ یا قریب تر ہوں۔ لہٰذا جرمنی میں وہ ڈیموکریٹ پارٹی کا حامی ہو گا اور انگلستان میں (ہندوستان میں آباد پارسیوں کی طرح) وہ شہنشاہیت کا حامی ہوگا۔ یہ تقریباً" اسی نوعیت کی غلط فہمی ہے جس کے تحت نوجوان ترکوں اور چینی مصلحین کو ہم اصل قرار دیا گیا تھا۔ یہ رجحان دستوریت کا پیدا کردہ ہے اگر کوئی باطنی رشتہ موجود بھی ہو تو انسان اس کو ختم کرتے ہوئے بھی اس کی تصدیق کرتا ہے اور اگر باطنی اجنبیت موجود ہو تو اس کے اثرات ہمیشہ منفی صورت میں برآمد ہوتے ہیں۔ خواہ اس کی خواہشات تعمیری بھی ہوں جو کچھ مغربی ثقافت نے برباد کر دیا ہے اور اس کی وجہ اس کی اپنی مرضی کے مطابق اصلاحات کیں' جہاں کہیں اسے اختیار حاصل تھا تو پھر اس نے سوچنے کی زحمت کبھی گوارہ نہیں کی - یہودیت نے بھی ہمیشہ تباہی پھیلائی ہے جہان کہیں بھی اسے دخل اندازی کا موقع ملا ہے۔ یہ باہمی غلط فہمی احساس ناگزیریت کی پیداوار ہے - اس سے ایسی نفرت پیدا ہوتی ہے جو خون میں جذب ہو کر انسانی طبیعت کا خاصہ بن جاتی ہے اور اس کے نمایاں نشانات' نسل' اسلوب' حیات' پیشے' گفتار کی وجہ سے دونوں طرف تباہی ضیاع اور خونی دخل اندازی پر منتج ہوتی ہے جہاں کہیں بھی اسے حالات پیدا ہوں۔

یہ اصول فاؤستی ثقافت کی مذہبیت پر بھی لاگو ہوتا ہے. جسے اسی امر کا شدید احساس ہے کہ اس کے ساتھ نفرت کی جاتی ہے۔ اسے خطرہ درپیش ہے اور یہ اجنبی مابعدالطبیعیات میں اس کی جڑیں کھوکھلی کی جا رہی ہیں۔ ہیو آف کلونی اور سینٹ برنارڈ اور لیٹران کی کونسل (۱۲۱۳ء) کی اصلاحات سے لے کر لوتھر اور کالون اور سخت گیر مسلک عیسائیت تک اور پھر دور روشن خیالی تک ہمارے شعور بیدار میں کیا کیا مد جزر آتے رہے ہیں جبکہ یہودی مذہبی تاریخ مدت مدید سے ختم ہو چکی تھی۔ ہم مغربی یورپ میں اتفاق رائے

(اجماع) کے متعلق دیکھتے ہیں کہ جوزف قاطو اپنے شولتوں اروخ (۱۵۶۵ء) میں اس امر کا تکرار کرتا ہے کہ مائمو نائڈ کے متن کی مروجہ شکل سے مختلف ہے اور اس کا امکان ہے کہ ۱۴۰۰ یا ۱۸۰۰ء میں بھی یہ عمل کیا گیا ہویا نہ کیا گیا ہو۔ اسلام کے استقلال میں صلیبی جنگوں کے بعد باز نلینی عیسائیت (اور اسی طرح چین کا دور متاخر اور مصر کے عہد آخر) میں ہر شے رسمی اور ہموار معلوم ہوتی ہے۔ نہ صرف خوراک کے امتناعات عبادت کے لیے مقرر رونی حروف' خاندانی قبائل نیز تالمودی قوانین وہی ہیں جن پر صدیوں سے عمل کیا جارہا ہے۔ بمبئی میں پارسیوں کا دستور اور قاہرہ میں قرآن اپنی اصل حالت پر قائم ہیں۔یہودیوں کا تصوف (جو خالصتاً" صوفیوں کا ادارہ ہے جیسا کہ اسلام میں بھی تصوف کی روایت موجود ہے) اسلام ہی کی طرح ناقابل تغیر رہا ہے اور آخری صدیوں میں اس شعبے میں تین مزید بزرگ پیدا ہوئے جنھیں مشرقی تصوف میں اہم مقام حاصل ہے۔ اگرچہ ہم ان کی شناخت کے لیے اپنا مغربی رنگ چڑھا دیتے ہیں۔ سپانی نوزا روح کی بجائے مادے کے متعلق زیادہ سنجیدہ ہے اور اس کی مجوسی ثنویت مسلم فلسفیوں سے مستعار ہے۔ یہ فلغی مرتضی اور شیرازی ہیں۔

وہ مغربی باروق کے تصورات کو استعمال کرتا ہے اور خود تصوراتی ماحول میں اس قدر گم رہتا ہے 'گویا خود کو بھی دھوکا دے رہا ہو' مگر اس سطح کے نیچے روحانی طور پر وہ میموتائدی اور ابوسینا اور تالمود کا غیر متزلزل پیروکار ہی رہتا ہے اور اس کا طریق کار ان سے بھی زیادہ ہندسی ہے۔ بعل سامی کی صورت میں جوہا سیدیم فرقے کا بانی تھا (یہ شخص دوبلینا میں ۱۶۹۸ء کے قریب پیدا ہوا) صحیح معنوں میں مسیحا تھا۔ وہ پولینڈ کی یہودی بستیوں میں گھومتا پھرتا رہا اور وہ ایسے خرق عادت واقعات کا مظاہرہ کرتا رہا جن کی مثال ابتدائی مسیحی داستانوں میں مل سکتی ہے۔یہ ایک ایسی تحریک تھی۔ جس کا منبع قدیم مجوسی لہروں میں تھا۔ قبالیتی تصوف جس نے بڑی تعداد میں مشرقی یہودیوں کو متاثر کر لیا اور اس کے باوجود بلاشبہ وہ عربی ثقافت کی مذہبی تاریخ میں ایک اہم مقام کا حامل تھا مگر اس حیثیت کے قطع نظر وہ ایک اجنبی ماحول میں سرگرم عمل تھا۔ اور وہ اس میں سے غیر محسوس طور پر گزر گیا۔ خدا کے لیے جو خاموش جنگ بعل سام نے تالمود اور اپنے دور کے فریسیوں کے خلاف لڑی اس کا مسیح کی طرح کا پیکر اور وہ داستانیں جو بہت جلد اس کی شخصیت کے متعلق اور اس کے شاگردوں کے بارے میں مشہور ہو گئی تھیں' یہ تمام کی تمام خالص مجوسی روح کے مطابق ہیں اور باطنی حیثیت سے موجودہ دور کی مغربی عیسائیت کے بھی اس قدر مخالف ہیں جتنی کہ ابتدائی عیسائیت کے متعلق تھیں۔ ہسیڈیوں کا طریق فکر اور تحریریں غیر یہودیوں کے لیے عملی طور پر ناقابل فہم ہیں۔ یہی حال اس فرقے کے رسوم و رواجات کا ہے۔ عبادت کے جوش میں بعض افراد وجد میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور بعض مسلمان درویشوں کی طرح محو رقص ہوجاتے ہیں بعل سام کی اصل تعلیمات زادکیت کے کسی چیلے نے مرتب کی تھیں اور وہ بھی اس نوعیت کے لحاظ سے زادکیت بزرگوں نے نسلا بعد نسل منتقل کی تھیں اور محض ان کا قرب ہی باعث نجات ثابت ہو سکتا تھا۔ اسے مسلم محدثین اور بالخصوص شیعہ اماموں کے متعلق عقائد سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ جن کے اندر رسول اکرمؐ کا نور موجود ہوتا ہے۔ ایک اور شاگرد سلیمان میمن' جس کی ایک ذاتی سوانح عمری محفوظ ہے اس نے بعل سام سے کانٹ تک کی منزل طے کی (جس کی تجریدی

نوعیت کی فکر تالمودی دانش وروں کے لیے توجہ کا باعث رہی ہے)۔ تیسرا شخص آٹودی ننگر ہے جس کی اخلاقی ثنویت خالص مجوسی تصور پر محمول ہے اور جس کی موت روحانی جدوجہد فی الحقیقت مجوسی تجربات کا شریف ترین منظر---- اور ---- ماضی کی مذہبیت کا تکرار ہے یہ ایک ایسی صورت جس کا تجربہ روس میں موزوں رہے گا مگر نہ تو کلاسیکی اور نہ ہی فاؤستی روح اس کے لیے مستعد ہے۔

روشن خیالی میں جس کا دور دورہ اٹھارھویں صدی میں ہوا مغربی ثقافت بھی شہری اور دانش ورانہ مزاج کی عادی ہوگئی اور اس کے نتیجے میں اچانک دانشورانہ اجماع وجود میں آگیا بعد ازاں یہی رجحان مغرب میں قدیم دور کے سفاری اسلوب حیات کو واپس لے آیا مگر یہ تمام عمل مشرقی اور منفی انداز کا تھا اور اس کا یہ المیہ بھی تھا کہ یہ غیر فطری بھی تھا جس کا نتیجہ ناگزیر طور پر نقالی کے احساس کی صورت میں نکلا مگر یہ ردعمل تنقیدی اور منفی صورت ہی میں برآمد ہوا' جس کا مستقل اثر تاریخی لحاظ سے مکمل ہو چکا تھا اور کسی نامیاتی ارتقا کے قابل نہ تھا اور میزبان ملک کی بڑی تحریک ہی میں گم ہو گیا۔اس نے ہلا کر اپنے آپ کو آزاد کرا لیا اور اس کی گہرائیوں میں گم ہو کر بے اثر ہو گیا۔ کیونکہ فاؤستی مزاج کے لیے روشن خیالی اس کے اپنے طریق کار کے مطابق ایک ارتقائی اقدام تھا۔ بلاشک یہ اقدام پرانے ملبے پر ہی تھا' مگر پھر بھی اپنی ہی میں یہ اقدام اثباتی ہی تھا مگر یہودیت کے لیے یہ تباہی کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ اس سے اجنبی تشکیل ختم ہو گئی جو اس کی سمجھ میں نہیں آیا اور یہی وجہ ہے کہ اتنی کثرت سے اس تقریب کا نظارہ کرتے ہیں۔ ہندوستان میں پارسیوں کا معاملہ بھی اس سے ملتا جلتا ہے اور عیسائی تناظر میں چینیوں اور جاپانیوں کا مسئلہ بھی اسی نوعیت کا ہے کہ روشن خیالی پر اتنا زور دیا جائے کہ بے حیائی کی حدود کو چھولے (امریکہ اور چین کے تعلقات کا پس منظر بھی یہی ہے)۔ ایک غیر مشروط دہریت جسے ایک اجنبی مذہب کے مقابلے میں لا کھڑا کیا ہو جبکہ اس سے فلاحین کا معاشرہ قطعاً" متاثر نہیں ہوتا ۔اشتمالی سطحی طور پر مگر انتہائی وفاداری سے ---- ہر مذہب کی مخالفت کرتے ہیں۔ مگر ذاتی طور پر اشیائے خوردنی میں ممانعات کی پابندی کرتے ہیں اور عبادت بھی کرتے ہیں اور تورات کے تراشے بڑے خلوص سے مطالعہ کرتے ہیں۔ داخلی طور پر وہ اجتماعات سے اغماض کرتے ہیں۔ان کی صورت ایسے ہندوستانی طالب علم کی ہے جو برطانوی جامعات میں لاک اور مل کا فلسفہ پڑھنے کے بعد ہندی اور مغربی دونوں مذاہب کے خلاف نفرت کا اظہار کرنے لگتا ہیاور ممکن ہے کہ ان دونوں کے ملبے میں وہ خود ہی دفن ہو جائے۔ نپولین کے دور سے قدیم مہذب اتفاق رائے' جدید' ناپسندیدہ اور نو تہذیب یافتہ مغربی شہری معاشرے کے ساتھ ساتھ خلط ملط ہو گیا ہے اور ان کے معاشی اور سائنسی طور طریق کو قبول کر لیا ہے اور دور حاضر کی خنک برتری کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں -چند نسلوں بعد جاپانی جو قدیم عہد سے دانش ور چلے آ رہے ہیں اسی طریق عمل کو اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اور غالباً" ان کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ کامیابی ہوئی۔ اس کے علاوہ ایک اور مثال کار تھیوں کی ہے' جو بابلی تہذیب کے بعد عروج میں آئے' یہ لوگ اس وقت بھی ارتقا کی بلند منازل طے کر رہے تھے' جب اٹروسکی ---- ڈوروی باشندے ابھی تک تہذیب کی دہلیز تک بھی نہیں پہنچے تھے اور انھوں نے یونانی دور کے متاخر ایام میں اپنے آپ کو فنا کے حوالے کر دیا۔ انھوں نے اپنے آپ کو پدرسری معاشرے میں منظم کر لیا تھا -ان

کی ریاست اور علاوہ ازیں جو کچھ بھی مذہب اور فنون لطیفہ سے متعلق تھا اس میں بھی یہ جھلک موجود تھی۔ وہ یونانیوں سے اور رومیوں سے تجارت میں بہت برتر تھے اور اسی لحاظ سے وہ ان سے نفرت بھی کرتے تھے

زمانہ حال میں مجوسی نسل' اپنی یہودی آبادیوں اور اپنے مذہب کے ساتھ خاتمے کے خطرے سے دو چار ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ دونوں ثقافتوں کے مابعدالطبیعیاتی تصورات ایک دوسرے کے قریب ہیں (کیونکہ یہ ایک ناممکن امر ہے) بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں اطراف کا اعلیٰ دانشور طبقہ مابعدالطبیعیات سے بالکل بیگانہ ہو چکا ہے۔اس سے ان کی داخلی ہم آہنگی ختم ہو چکی ہے جو کچھ باقی رہ گیا ہے وہ صرف عملی مسائل میں اتفاق رائے ہے۔ اس قوم کو جو برتری حاصل تھی وہ تجارتی امور میں تھی -وہ ہر روز کم سے کم تر ہوتی جا رہی ہے (جہاں تک امریکا سے تجارت کا تعلق ہے اس میں یہ برتری ختم ہو چکی ہے) اور اس نقصان کے بعد یہ اپنی اس آخری منزل تک پہنچ جائے گی جس میں وہ علاقائی اتفاق رائے بھی قائم نہیں رہے گا جو اس علاقے میں پہلے ہی مختلف حصوں میں بٹ چکا ہے۔ اس لیے جبکہ یورپی امریکی شہروں کے مہذب طریقہ ہائے کار اپنی بلوغت کی منزل میں پہنچ چکے ہیں -یہودیوں کی قضاوقدر ---- کم از کم اس یہودیت کی جو ہمارے مابین موجود ہے (روس میں یہودیوں کا مسئلہ مختلف ہے) ضرور کامیاب ہو گی۔

اسلام کے پاؤں کے نیچے زمین باقی ہے۔ اس نے عملی طور پر فاؤسیوں 'یہودیوں' نسطوریوں اور یک طبیعتی مسیح کے پیروکار عیسائیوں کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے - باز نطینی اور یونانی اقوام کے پاس بھی اپنے اپنے وطن موجود ہیں مگر پارسیوں کی باقی ماندہ قوم ہندوستان میں ایک قدیم اور فلاحین کی نوعیت کی تہذیب کے اندر رہی ہے مگر یورپ اور امریکہ کے یہودیوں کا اجتماع جس نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر دیا ہے۔ اور باقی ماندہ یہودیوں کی قضاوقدر کو بھی اپنے ساتھ وابستہ کر لیا ہے اور اس طرح وہ ایک نوجوان تہذیب کا ایک جزو بن چکی ہے۔ صدیاں گزر چکی ہیں مگر اس طرح کی اپنی کوئی سرزمین نہیں مگر اس نے اپنی بستیوں میں بند ہو کر اپنا سلسلہ حیات قائم رکھا ہے -اس طرح یہ قوم مختلف اجزا میں منقسم ہو کر انتشار کا شکار ہو رہی ہے اس کی قضاوقدر یہی ہے-یہ فاؤسی ثقافت کا حصہ نہیں' اس کا اصل مقام مشرق میں ہے اور یہ مجوسی ثقافت کا حصہ ہے

باب دہم

ریاست

(ا)

ریاستوں کے مسائل۔ طبقہ شرفا اور مذہبی پیشوا

ا

کائناتی بہاؤ کا جسے ہم دریائے حیات کہتے ہیں' ایک سربستہ ناقابل پیمائش راز تمام انواع کی دو اصناف میں تقسیم ہے' نباتات کی اگرچہ زمین جامد ہے' لہروں کو بھی جنسی لحاظ سے ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے' جیسا کہ پھولوں کی علامات سے ہم پر انکشاف ہوتا ہے' کہ نباتات کی ایک جنس وہ ہے جو قائم رہتی ہے' اور ایک وہ ہے جو اس کے استدام کی ضامن ہے' حیوانات کی دنیا آزاد ہے' گویا کائنات کی وسعتوں میں اس کی اپنی دنیا ہے--- کائنات---- جو کہ کائنات صغیر کے مقابلے میں ایک وسیع اور کائنات کبیر ہے' اور جوں جوں عالم حیوانات اس کی تاریخ کو نمایاں کرتا ہے تو شویتی وجود کی سمت نر اور مادہ میں منقسم ہو کر اپنا اظہار کرتی ہے۔

مادہ جنسی کائنات کے قریب تر ہے اس کی جڑیں زمین میں زیادہ گہری ہیں۔ یہ فوراً" ہی فطرت کے دوری توازن میں اپنے آپ کو شامل کر لیتی ہے۔ نر مقابلتاً" زیادہ آزاد ہوتا ہے اس میں حیوانیت بھی زیادہ ہے' اور متحرک بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اس میں تحس اور ادراک اور دوسری خوبیاں بھی زیادہ ہوتی ہیں --- یہ زیادہ بیدار اور زیادہ تیلا بھی ہوتا ہے۔

زاپنی حیات کے دوران قضا و قدر کے زیادہ تجربات برداشت کرتا ہے اور سلسلہ علت و معلول کو بخوبی سمجھتا ہے' وہ وجود کے منطقی علائل کا بھی گہرا شعور رکھتا ہے۔ اس کے بخلاف مادہ خود ہی قضا و قدر بھی ہے اور تکوینی زمان اور نامیاتی منطق بھی ہے اور صرف اسی سبب سے اصول علت معلول مرد کے مقابلے میں اس کے لیے زیادہ اجنبی ہے۔

جب کبھی بھی مرد نے قضا و قدر کو کوئی مادی شکل دینے کی کوشش کی ہے تو اسے اس کی مادہ صورت ہی نظر آئی ہے' اور اس نے اسے موئراتی۔ پارسئی اور تواتر کے نام دیے ہیں۔ سب سے برتر قوت فی نفسہ کبھی قضا و قدر کے روپ میں ظاہر نہیں ہوئی مگر ہمیشہ یا تو اس کی نمائندہ ہوتی ہے یا آقا جس طرح مرد عورت پر قابو پاتا ہے یا اس کی نمائندگی کرتا ہے۔ بدوی دور ہی سے عورت روشن ضمیر رہی ہے۔ یہ اس لیے نہیں کہ اسے غیب کا یا مستقبل کا علم ہے' بلکہ اس لیے کہ وہ خود ہی مستقبل ہے۔ پجاری خرق عادت واقعات کی محض تعبیر کرتا ہے' مگر عورت خود ایک معجزہ ہے اور زمان اسی کی معرفت کلام کرتا ہے۔

مرد تاریخ ساز ہے' عورت خود تاریخ ہے۔ اس موقع پر معمہ خود بخود حل ہو جاتا ہے کہ تمام زندہ واقعات کے ہمیشہ دو پہلو ہوتے ہیں' ایک طرف تو ہم کائناتی بہاؤ کا مشاہدہ کرتے ہیں' اور دوسری طرف سلسلہ واقعات اور انفرادی تدریج ہمیں واپس کائناتی وسعت میں لے جاتی ہے تاکہ ہمیں واقعات کی تحصیل کے بعد ان کی رفتار کو محفوظ کر سکیں۔ تاریخ کا یہ دوسرا پہلو ہے جو اطوار کے لحاظ سے مرد ہے۔ سیاسی معاشرتی زیادہ باشعور' آزاد تر اور دوسروں کے مقابلے میں زیادہ احتجاج کرنے کا عادی ہے۔ یہ حیوانی عالم کی زیادہ سے زیادہ گہرائی میں چلا جاتا ہے اور بلند درجے کے مثالی علامتی اور عالمی تاریخی اظہار کے اعلیٰ ثقافتی طریق حیات کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے برخلاف مونث ایک بنیادی ازلی مادریت نباتات کی طرح (کیونکہ نباتات میں ہمیشہ نسوانیت کی کوئی نہ کوئی صورت موجود رہتی ہے۔) نسلی تدریج کی لاثقافتی تاریخ ہوتی ہے جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آتی' مگر یکساں طور پر خاموشی سے ہر حیوانی وجود اور انسانی انواع میں سے گزر جاتی ہے۔ اگرچہ ہر ثقافت انفرادی طور پر مختصر مدت پر محیط ہوتی ہے۔ مگر نسوانیت اس میں بھی اپنا وجود قائم رکھتی ہے۔ مگر ماضی کے حوالے سے یہ حیات کے ہم معنی ہے۔ تاریخ بھی نسوانی جنگوں اور المیات سے خالی نہیں۔ عورت اپنے بچپن میں اپنی فتح جیت لیتی ہے۔ ازتکی' میکسیکی ثقافت کے روی۔ یہ لوگ عورت کی عزت اس طرح کرتے تھے گویا کہ وہ کوئی میدان جنگ میں صف بستہ ہو اور اگر وہ مرجاتی تو اس کے ساتھ وہی سلوک ہوتا جو ایک ہیرو کے لیے مخصوص ہے۔ عورت کی حکمت عملی یہ ہے کہ وہ مرد پر فتح حاصل کرے' کیونکہ اسی کی اعانت سے وہ بچوں کی ماں بن سکتی ہے۔ اسی کی وجہ سے وہ اپنی تاریخ اور قضاؤ قدر کی تشکیل کرتی ہے اور اپنا مستقبل طے کرتی ہے اس کی معصوم حیا کا نشانہ' اس کا شاطرانہ مکر و فن صرف اپنے بیٹے کے باپ پر مرکوز ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف مرد جس کی کشش ثقل کا مرکز لازمی طور پر کسی اور قسم کی تاریخ میں ہوتا ہے' وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا صرف اس کا بیٹا ہی رہے۔ وہ اس کا وارث ہو اور اس کے خون کو آئندہ

نسلوں میں منتقل کرے اور اس طرح اس کی تاریخی روایت قائم رہے۔

گویا مرد اور عورت تاریخ کے دو مختلف کردار اقتدار کے حصول کی جنگ لڑتے ہیں۔ عورت مقابلتاً مضبوط ہے اور کلی طور پر وہی ہے جس کا وہ مظاہرہ کرتی ہے اور وہ مرد اور بیٹوں کا تجربہ محض اپنے رشتوں کے لحاظ سے کرتی ہے اور اسی حوالے سے اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ مرد ہونے کے ناطے اس میں چند تضادات پائے جاتے ہیں۔ کہ وہ مرد بھی ہے اور اس کے علاوہ وہ کچھ اور بھی ہے۔اس تضاد کو عورت نہ تو سمجھ سکتی ہے اور نہ تسلیم کرتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ ان تضادات کی بنا پر اس کے تقدس پر ڈاکہ ڈالا جا رہا ہے اور تشدد کا ارتکاب ہو رہا ہے۔ یہ راز اور اصناف کی بنیادی جنگ اس وقت سے جاری ہے جب سے اصناف کا وجود عمل میں آیا' اور اسی طرح جاری رہے گی' خاموشی سے تلخ ناقابل معافی اور نا قابل رحم۔ جب تک کہ اصناف کا وجود قائم ہے اس میں بھی حکمت عملیاں' جنگیں' اتحاد' صلح نامے' بغاوتیں موجود ہیں۔ محبت اور نفرت کے نسلی احساسات جن کی ابتدا عالمی آرزوؤں کی گہرائیوں میں ہوتی ہے' اور سمتوں کی ابتدائی جبلتوں میں بنیاد پڑتی ہے' یہ اصناف کے مابین بھی موجود ہوتی ہے' اور پراسرار قوت آفرینی کے تحت عمل میں آتی ہے اور اس سے کہیں زیادہ شدید ہوتی ہے' جو مرد اور مرد کے مابین ہوتی ہے ۔ محبت آمیز نغمے اور عشق آمیز رقص اور اسلحہ بردار رقص جزو حیات کے طور پر موجود رہتے ہیں ' اور المیوں کی بھی دو اقسام ہیں۔ اوتھیلو اور میکبتھ مگر کلائسٹا مینسٹرا یا کریم ہیلڈ کی کینہ پروری کی کوئی مثال نہیں۔

اس لیے عورت اپنے علاوہ دوسری تاریخ سے نفرت کا اظہار کرتی ہے۔ مردوں کی سیاسیات ہے---- جن کو وہ کبھی نہیں سمجھ سکتی۔ اس میں صرف وہ یہی دیکھتی ہے کہ اسے اس کے بیٹوں سے جدا کر دیا جاتا ہے۔ اس سے اسے کیا حاصل ہوتا ہے کہ کسی جنگ میں فتح حاصل کرنے کے لیے ہزاروں بچوں کے بستر خالی ہو چکے ہوتے ہیں؟ مردوں کی تاریخ' تاریخ نسواں کو اپنی خواہشوں پر قربان کر دیتی ہے۔ بلاشک عورتوں میں بھی جرات آزمائی موجود ہے جو بڑے فخر سے اپنے بیٹوں کو قربانی کے لیے پیش کر دیتی ہے (کیتھرین سفوزرا نے ائی مولا کی دیواروں پر)۔ مگر اس کے باوجود یہ حقیقت بھی ہے اور ہمیشہ موجود رہے گی کہ عورتیں خفیہ طور پر سیاست میں حصہ لیتی ہیں اور اس طرح اپنے مردوں کو تاریخ کے دھارے سے علیحدہ کر دیتی ہیں جس سے وہ نسلی توارث سے محروم ہو جاتے ہیں اور انھیں اپنی حد تک محدود کر لیتی ہے ' اور اس لیے مردوں کی تاریخ میں جو کامرانیاں حاصل ہوتی ہے ان کی جنگ میں نعرے چولھے اور گھر سے بلند ہوتے ہیں ۔ مائیں' بیویاں اور بچے ہم آہنگ ہو کر ان مقاصد کی تائید میں موت و حیات کی جنگ میں حصہ لیتے ہیں۔ مردوں کے مابین تنازعات ہمیشہ مستورات کے خون پر مبنی ہوتے ہے۔ عورت' زمان کی طرح تاریخ کی مالک ہے۔

عورت محسوس کرتی ہے کہ نسل کا وجود اسی سے قائم ہے۔ ایسی صورت میں بھی جبکہ وہ اس کی حقیقت سے بے خبر وہ خود ہی قضا و قدر ہے۔ کھیل مردوں کی جنگ سے شروع ہوتا ہے جو عورتوں پر قبضہ

حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ ہیلن اور کارمن کا المیہ اور کیتھرائن دوم اور نپولین اور ڈی سائری کلاری جس نے بالآخر برانڈ وٹے کو دشمنوں کی طرف دھکیل دیا---- یہ صرف انسانوں ہی کا کھیل نہیں کیونکہ یہ جنگ حیوانات میں بھی ہوتی ہے اور تمام انواع حیات میں یہ داستان دہرائی جاتی ہے اور اس کا انجام ماں بیوی یا محبوبہ کی صورت میں ہوتا ہے ۔ سلطنتوں کا انجام بگل کی داستان میں ویلکرڈ فرینکی شہزادی برون ہائلڈ مروز یہ جس نے مقدس ذخیرہ آپ اپنی پسند کے مرد کے حوالے کر دیا ۔ مرد اپنی تاریخ میں بلند مقام حاصل کر لیتا ہے یہاں تک کہ وہ کسی ملک کا مستقبل اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے---- پھر کوئی عورت آتی ہے اور اسے اس کے گھٹنوں کے بل کر دیتی ہے۔ اس کے نتیجے میں عوامل اور ریاستیں کھنڈرات میں دفن ہو سکتی ہیں ۔ مگر تاریخ متعلقہ خاتون کا نام بطور فاتح درج ہو جائے گا۔ یہی آخری تجزیہ ہے' جو کسی بھی نسل کی سیاسی خواتین میں بطور سیاسی خواہشات کے وجود میں آ سکتا ہے۔ لہٰذا تاریخ کے دو معانی ہیں' جن سے کوئی بھی گستاخانہ نہیں ' یا تو یہ کائناتی ہے یا سیاسی' یہ یا تو وجود ہے یا وجود کی محافظ ہے ۔ دو قسم کے انجام ہوتے ہیں اور جنگوں کی بھی دو ہی اقسام ہوتی ہیں ۔ المیے کی بھی دو ہی اقسام ہیں عوامی المیہ یا ذاتی المیہ ۔ دنیا کی اس ثنویت کو کوئی بھی ختم نہیں کر سکتا۔ یہ سختی سے حیوانی مزاج میں جاگزیں ہے ۔ کائناتی طور پر بھی۔ اور کائنات میں شراکت دار کے طور پر بھی یہ ہر اہم معاملے میں فرائض کے تضاد کی صورت میں عیاں ہوتی ہے۔ یہ فرائض صرف مردوں پر عائد ہوتے ہیں۔ عورتیں ان سے مستثنیٰ ہیں۔ اعلیٰ ثقافتوں میں ان تضادات پر کبھی قابو نہیں پایا گیا بلکہ یہ مزید گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ ایک انسانی معاشرتی زندگی ہوتی ہے اور دوسری نجی عوامی قانون اور نجی قانون قبائلی مسالک اور خانگی مسالک ---- بطور ریاست' بطور تاریخ اس کی ذاتی ہیئت ہوتی ہے ۔ وجود سے مراد واحد تاریخ ہے جبکہ نسل سے تاریخ کی ایک لہر رواں ہو جاتی ہے اور ایک دوسری تاریخ وجود میں آ جاتی ہے۔ جرمن زبان میں "تلوار کی سمت" اور "تکلے کی سمت" کے محاورے استعمال ہوتے ہیں اور اس سے مراد خونی رشتے ہوتے ہیں۔ سمتی زبان کا اعلیٰ ترین اظہار تصورات ریاست اور خاندان میں ملتا ہے۔ خاندانی زندگی کی تشکیل اور اہمیت میں کوئی تبدیلی اور گھر کی تبدیلی کا منصوبہ بھی اس پر اثر انداز ہوتا ہے ۔ کلاسیکی خانہ داری کی کیفیت کلاسیکی اسلوب کی اشتعال انگیزی پر منطبق ہوتی ہے۔ اس کا تعین یونانی شہری قانون میں زیادہ وضاحت سے کیا گیا ہے ۔ اس کے بعد رومی قانون میں بھی وضاحت موجود نہیں۔ یہ تمام اقلیدسی جاگیر کے حوالے سے آتا ہے ' جسے موجود حالات کے تحت جانچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جیسا کہ قدیم شہری نظام کو موجودہ دور میں دستیاب اداروں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ خونی رشتے اس معاملے میں نہ تو ضروری ہیں اور نہ ہی کافی ہیں۔ یہ پدر سری کے معاملات کو ختم کر دیتی ہے۔ اس کا آئندہ نسلوں سے کوئی خونی رشتہ نہیں ہوتا اور اس طرح یہ قبیلے یا خاندان کی صورت میں خود مکتفی اکائی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح ماں بھی آئندہ نسلوں سے کوئی رشتہ نہیں رکھتی۔ اگرچہ وہ اس کے شکم سے پیدا ہوتے ہیں مگر وہ بھی پدر سری روایات کے تحت اپنے خاوند کے نام سے شناخت پاتی ہے۔ اس طرح وہ خونی رشتے میں اپنے بچوں کی بڑی بہن ہوتی ہے۔ اتفاق رائے یا اجماع مجوسی خاندانی تصور پر منطبق ہوتا ہے' (عبرانی میں مشوپاشا) جو پدر سری اور مادر سری دونوں خونی رشتوں سے منسلک ہوتے ہیں اور اس میں کسی حد تک اجماع کی روح ضرور موجود ہوتی ہے' مگر اس کا کوئی مخصوص عنوان نہیں ہوتا۔ اس سے

کلاسیکی مزاج کے خاتمے اور مجوسی تصور کے آغاز کی نشاندہی ہوتی ہے کہ شاہی دور کا رومی قانون جدی رشتہ داری سے قرابت داری کی صورت اختیار کر گیا۔ جسٹینن کی ۱۱۸ اور ۱۲۷ دفعات کے تحت جو جدید ترمیمات وجود میں آئیں ان سے مجوسی خاندانی تصور کو فتح حاصل ہو گئی۔

دوسری طرف ہم یہ بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ بعض افراد کے گروہ جو ماضی میں وجود میں آئے اور اپنی تاریخ بنا گئے۔ خالص تر' سنجیدہ تر' مضبوط تر اور قابل یقین۔ ان نسلوں کا مشترک سرمایہ نسلی افتخار اور ذاتی جرات تھی۔ لامتناہیت سے ان کا آغاز ہوا۔ ان میں شامل ہر شخص صدق دل سے ان کے ساتھ تھا۔ ان کی نبض یکساں دھڑکتی تھی اور سب باہم متحد تھے۔ مختلف نظام' قومیتیں' پیشے یا مدارس فکر جو مشترک حقائق کی بنا پر باہم مربوط تھے مگر جب کبھی میدان جنگ میں ضرورت پڑتی تو خونی رشتہ داروں کی طرح متحد ہو جاتے۔

موجودات کی ایسی لہریں بھی ہیں جن کو کھیل میں ایک ٹیم کے مفہوم میں سمجھنا چاہیے۔ ایک میدان میں رکاوٹوں کی دوڑ میں شرکت کرنے والے گھوڑے اپنا توازن ہر طرح سے قائم رکھ سکیں اور ان کی ٹانگیں اور سم ان کے قابو میں ہوں تو اسی صورت میں وہ اپنی فارم میں ہوں گے۔ جب پہلوان' شمشیر زن یا گیند بلا کھیلنے والے اپنی فارم میں ہوتے ہیں' تو خطرناک افعال و حرکات بھی باسانی اور فطری انداز میں سرزد ہوتی ہیں۔ ایک فن کار اس وقت فارم میں ہوتا ہے۔ جب روایت اس کی فطرت ثانیہ بن جائے جس طرح کہ باخ کے لیے معاون موسیقی تھی۔ ایک فوج اس وقت فارم میں ہوتی ہے۔ جیسا کہ نپولین کی فوج آسٹرلٹز میں تھی اور مولٹکے کی فوج سیڈان میں تھی۔ عملی طور پر عالمی تاریخ میں میدان ہائے جنگ میں جو کامرانیاں حاصل کی گئی ہیں' یا جنگ کے تسلسل کی معرکہ آرائی میں حاصل کی گئی ہوں' اور ان کے لیے ذہنی صلاحیتوں کو عمل میں لایا گیا ہو' ہم ان کو سیاست کہتے ہیں(۵)۔ تمام کامیاب سفارتی عمل میں مصافیات' ماہرانہ لشکر کشی اور حکمت عملی کی مہارت' ممالک' جماعتوں یا فریقوں کے مابین زندہ اتحاد کا کرشمہ رہے ہیں' جو اسی صورت میں وجود میں آتی ہیں جبکہ متعلقہ سیاست دان فارم میں ہوں۔(فارم = موزونیت)

نسل یا تولید کی تعلیم کے لیے معین لفظ تربیت ہے' جو تشکیل سے قدرے مختلف ہے' جو قومیتوں کی شعور بیدار کی بنیاد پر تشکیل کرتی ہے' جس میں اعتقادات کی اجتماعی صورت بھی موجود رہتی ہے۔ مثال کے طور پر کتابیں مختلف اشکال بنانے کی ذمہ دار ہیں جبکہ نبض کی مسلسل رفتار اور تناظر جس کے پس منظر میں انسان اپنی ذات کا احساس حاصل کرتا ہے اور فی نفسہ زندہ رہتا ہے۔ گویا کہ وہ ایک نوآموز یا ابتدائی رومی دور کی کسی کتاب کا ایک صفحہ ہے۔ ایسے لوگوں پر تربیت کے آثار مترتب ہوتے ہیں۔ اعلیٰ (فارم) موزونیت اور متعلقہ معاشرے کی رسومات وجود کی مختلف انواع حواس کے مظاہرے کی نمائندگی کرتی ہے اور ان پر قابو پانے کے لیے فرد کو نبض شناسی کی ضرورت ہوتی ہے۔ چونکہ عورتیں جبلی طور پر کائناتی موزونیت کے قریب تر ہوتی ہیں' اس لیے مردوں کے مقابلے میں نئے تناظر کو جلد قبول کر لیتی ہیں۔ مستورات اگرچہ اپنے کام کا آغاز معاشرے کی سب سے زیریں سطح سے کرتی ہیں۔ اور پورے یقین کے ساتھ معاشرے میں چند سالوں

بعد اپنا مقام متعین کر لیتی ہیں اور پھر جلد ہی تہ میں چلی جاتی ہیں مگر مرد میں تبدیلی آہستہ آہستہ آتی ہے' کیونکہ وہ زیادہ بیدار اور خبردار ہوتے ہیں۔ پرولتاری مرد کبھی بھی طبقہ شرفا میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح طبقہ شرفا کا کوئی شخص پرولتاری نہیں ہو سکتا۔ نئے ماحول کا اظہار صرف اگلی نسل ہی میں ہو سکتا ہے۔

کوئی شخص جس قدر خلوص کے ساتھ اپنی موزونیت کا مظاہرہ کرے گا وہ اسی قدر زیادہ سختی سے نفرت انگیز بھی ہو گا۔ بیرونی شخص کو تو یہ ایک نوع کی غلامی نظر آئے گی' مگر اس کے بر خلاف اس کے ارکان کا اس پر مکمل اور آسان قابو ہو گا۔ شہزادہ ڈی لائن مقدار سے کسی صورت میں بھی کم نہ تھا۔ وہ اپنی موزونیت کا غلام نہیں تھا بلکہ آقا تھا' اور ہر شریف پیدائشی رئیس مدبر اور رہنما کی یہی صورت ہو گی۔

تمام اعلیٰ ثقافتوں میں اس لیے کسانوں کا طبقہ بھی ہوتا ہے۔ وہ عام مفہوم میں ایک نسل یا گروہ کی صورت میں ہوتا ہے (اور اس لحاظ سے کسی حد تک وہ فی نفسہ فطرت بھی ہوتا ہے)۔ وہ خود ہی ایک معاشرہ ہوتا ہے' جو کسی حد تک برخود غلط اور بڑے زور سے اپنی موزونیت کا دعوے دار ہوتا ہے۔ یہ مختلف طبقات یا جاگیروں کا مجموعہ ہوتا ہے' اور بلاشبہ مصنوعی اور عبوری ہوتا ہے مگر ان طبقات اور جاگیروں کی تاریخ ہی عالمی یا اعلیٰ امکانات کی تاریخ ہے۔ اسی حوالے سے ہمیں کسان بغیر کسی تاریخ کے معلوم ہوتا ہے۔ گزشتہ تمام تاریخ جو کم و بیش چھ ہزار سال پر مشتمل ہے' اعلیٰ ثقافتوں ہی کی تاریخ ہے' کیونکہ ان ثقافتوں ہی نے اپنی تخلیقی قوت سے جاگیریں قائم کیں جس کے ساتھ ان کی نسلی خصوصیات اور تربیت بھی شامل رہی لہٰذا ان کی کامرانیوں کے دوران ان کی تربیت اور نسلی خصوصیات کی تکمیل ہو گئی۔ ثقافت فی نفسہ ایک روح ہے جس نے ذاتی اظہار میں معقول موزونیت کا مظاہرہ کیا' مگر یہ موزونیت زندہ اور ارتقا پذیر ہے(۶)۔ ان کا سانچہ کسی وجود یا گروہ کی کاوش کے تحت تشکیل پاتا ہے یعنی اس موزوں وجود میں جس کا میں نے ابھی حوالہ دیا تھا اور جب تک کہ یہ وجود اپنی مکمل تشکیل حاصل نہیں کر لیتا اور وہ مقام حاصل نہیں کرتا جس پر پہنچ کر یہ نمائندہ ثقافت کی بھی نمائندگی کرنے لگے۔

نہ صرف یہ کہ یہ ثقافت ایک عظیم کارنامہ ہے بلکہ نامیاتی عالم میں اس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ یہی ایک مقام ہے جہاں سے انسان اپنے آپ کو فطرت کی قوتوں سے بھی بالاتر پاتا ہے' اور خود ہی خالق بن جاتا ہے۔ بلکہ نسل' خاندان کے لحاظ سے یہ خود ہی خالق فطرت بن چکا ہے۔ اس کی تولید ہی ایسی ہوئی ہے مگر جہاں تک جاگیر کا تعلق ہے اسے بھی یہ خود ہی پیدا کرتا ہے' جیسا کہ یہ اعلیٰ اقسام کے جانور اور پودے پیدا کرتا ہے جو کہ ہمیشہ اس کے اردگرد رہتے ہیں' اور یہ ان میں گھرا رہتا ہے' اور یہ طریق کار بھی اپنے گہرے اور حتمی معانی کے لحاظ سے ثقافت ہی ہے۔ ثقافت اور جماعت ایک دوسرے سے قابل تبدیل اظہار ہیں۔ یہ اکٹھے ہی پیدا ہوتے ہیں اور اکٹھے ہی فنا ہو جاتے ہیں۔ منتخب اقسام کے انگور یا دوسرے پھل اور پھول پیدا کرنا یا اچھے گھوڑوں کی نسل کشی کرنا اور اعلیٰ درجے کے انسانوں کی تولید و پرورش بالکل یکساں مفہوم کے حامل ہیں۔ یہ وجود ہی کا اظہار ہے جو اپنی موزونیت کے کمال پر پہنچ گیا ہے۔

صرف اسی وجہ سے ہر ثقافت میں اس امر کا تیزی سے احساس پیدا ہوا کہ یہ شخص یا وہ شخص متعلقہ ثقافت سے متعلق ہے یا غیر متعلق۔ کلاسیکی تصورات ' بربری اور عربی اقوام کے منکرین (امہاری اور جیا اور) ہندوستان کے شودر یہ دراڑیں پڑنے کی صورتیں خواہ کتنی بھی مختلف ہوں 'اس لحاظ سے یکساں ہیں کہ ان کے مستعمل الفاظ میں بنیادی طور پر بے عزتی یا نفرت کا اظہار موجود نہیں۔ صرف یہ ثابت کرتے ہیں کہ ان طبقات کی نبض میں کوئی فرق موجود ہے جو ایک ناقابل عبور حد قائم کر دیتا ہے جس سے گہری سطح پر تمام رابطے ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ واضح ترین اور غیر مبہم تصور جو ہندوستانی معاشرے نے چوتھی قوم کی صورت میں پیش کیا' حالانکہ اب ہم جانتے ہیں کہ ابتدا میں ایسی کسی قوم کا کوئی وجود نہ تھا۔

منو کا ضابطہ' جس میں کہ شودروں کے ساتھ سلوک کے ضوابط درج ہیں' اس کے ملک ہندوستان میں انتہائی ترقی یافتہ فلاحین کے طبقے کا پتہ دیتے ہیں اور عملی حقائق کے باوجود خواہ موجود یا قابل حصول قانون سازی کی بدولت یہ برہمنیت کے دھندے' تصورات کا مظہر ہے' جس کے تحت وہ اپنے مخالفین کے ساتھ سلوک کرنا چاہتے ہیں '. جس طرح کہ آخری کلاسیکی دور میں کارکن باناؤسوں کے ساتھ سلوک کیا گیا تھا۔ اس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ یہ صرف ہندوستان ہی نہیں کہ ایک طبقے کے ساتھ اتنا برا سلوک کیا جاتا ہے بلکہ کلاسیکی ثقافت میں بھی یہ عمل رائج تھا۔

ایسے تمام معاملات میں جو شے فی الحقیقت ہمارے سامنے آتی ہے' وہ ایسی باقیات ہیں جو کسی ثقافت کے داخلی میدان میں کبھی زیر غور نہیں آئیں' اور ہر اہم صنف بندی میں انھیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے' بلکہ اسی طرح مشرق بعید میں نچلے طبقوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ رومی اصطلاح اجتماع عیسائیت سے مراد یہی تھی کہ یہودیوں کا اس ملک میں کوئی استحقاق نہیں۔ عرب معاشرے میں دیگر مذاہب کے لوگ صرف یہودیوں' عیسائیوں اور اہل فارس کی بستیوں میں اپنے ہم قوموں کے ساتھ رہ سکتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلامی انتظامیہ نے بوجہ نفرت اپنا دائرہ کار صرف مسلمانوں تک ہی محدود کر لیا ہے

کلاسیکی دنیا میں تو نہ صرف یہ کہ بربریوں کو اچھوت سمجھا جاتا تھا' بلکہ غلاموں کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ بالخصوص وہ اصلی باشندے جن میں پینتائی اور تھیسالی شامل تھے اور سپارٹا کے ہیلوٹ جن کے ساتھ ان کے آقا اس قدر بدسلوکی کرتے تھے کہ اینگلو سیکسن دور کے ان طیوطانی سرداروں کی یاد آ جاتی ہے' جنھوں نے مشرقی سلوانیہ میں ظلم کے پہاڑ توڑ دیئے تھے ۔ منو کا ضابطہ شودروں کے خطاب کو قائم رکھنا چاہتا تھا۔ یہ وہ غلام ہیں جنھیں زیریں گنگا کی وادیوں میں ان قدیم باشندوں پر آریاؤں نے فتح حاصل کر لی تھی (مگدھ کی ریاست بھی ان میں شامل ہے۔ اس امر کا امکان ہے کہ قیصر اشوک کی طرح گوتم بدھ خود بھی ایک شودر ہو' اشوک کا دادا چندر گپت ایک بہت چھوٹے خاندان کا فرد تھا)۔ باقی سب پیشوں کے نام ہیں' اس سے ہمیں یہ حقیقت یاد آتی ہے کہ مغرب اور دوسرے علاقوں میں بھی بعض پیشے اچھوت

سمجھے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر گداگر(ہومر کی تصنیفات میں ان کا ذکر ایک جماعت کی حیثیت سے کیا گیا ہے)، لوہار، گویّے اور پیشہ ور غربا، جن کی کلیسا اجتماعی پرورش کرتا تھا۔ اور قدیم روم میں ان کا گزارہ صرف خیرات پر تھا۔

لیکن ذات پات کا لفظ جس قدر بھی استعمال ہوا ہے؟ اسی قدر غلط استعمال ہوا ہے کہ مصر کی قدیم اور وسطانی سلطنتوں میں ذات پات کا کوئی وجود نہ تھا اور گوتم بدھ سے قبل ہندوستان میں بھی اس کا رواج نہ تھا اور وہاں کے دور سے قبل چین میں بھی اس کا کوئی وجود نہ تھا۔ یہ بہت ہی بعد کے حالات کی پیداوار ہے، اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا رواج تمام ثقافتوں میں ہو گیا ہے۔ مصر کے اکیسویں خاندان کے بعد سے (۱۱۰۰ ق م) مصر پر تھیبن مذہبی پیشواؤں کا غلبہ تھا اور پھر لیبیائی جنگی اقوام غالب آگئیں اور بعد ازاں یہ طریق عمل شدت اختیار کرتا گیا اور ہیرو ڈوٹس کے زمانے تک یہی غلط صورت قائم رہی۔ مصر کے متعلق ان ایام کے اس کے خیالات اتنے ہی غلط ہیں، جتنے کہ ہمارے ہندوستان کے متعلق ہیں۔ مصر میں مختلف طبقات میں فرق فی الحقیقت قدیم ثقافت اور جدید تہذیب کا فرق ہے۔ جب بڑی بڑی جاگیریں وجود میں آئیں اور شرفا اور مذہبی پیشواؤں کے طبقات وجود میں آئے تو ثقافت نے بھی وسعت اختیار کی جبکہ اس دور میں طبقاتی تقسیم سے مراد فلاحین کی نشاندہی تھی اور ان کی علیحدہ ریاست کا اعتراف تھا۔ ریاست ہی کا وجود پائدار ہوتا ہے، اور ثقافت اس کی تکمیل کے لیے کوشاں ہوتی ہے۔ ہیئت حیات کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا اظہار کرے   ذات کا تصور اس کا تکمیلی مرحلہ ہے یعنی تعمیر کے ناقابل تغیر جمود کا دور آگیا ہے۔

مگر بڑی بڑی جاگیریں چھوٹے چھوٹے پیشہ ور طبقات سے بالکل مختلف ہوتی ہیں جن میں کاریگر عمال ہنرور شامل ہوتے ہیں جنھیں پیشہ ورانہ طور پر تکنیکی روایت کے تحت ان کی روح، اشغال باہم مربوط رکھتی ہے۔ وہ فی الحقیقت گوشت پوست کے اشتراک کی علامت ہیں جن کا کل وجود ایک تناظر ایک رویے اور فکری کیفیت، سب کے معانی علامتی ہوتے ہیں، ہر ثقافت میں۔ مزید برآں کسانوں کا طبقہ فطرت محض اور نشوونما اور اس لحاظ سے مکمل طور پر غیر ذاتی اظہار ہے۔ شرفا کا طبقہ اور مذہبی پیشواؤں کی جماعت اعلیٰ خاندانوں اور ہیئت سے متعلق ہے اور اس وجہ سے وہ مکمل شخصی ثقافت کا اظہار کرتے ہیں جو اپنی ہیئت کی عظمت کی بنیاد پر نہ صرف وحشیوں کے طبقات کو رد کرتے ہیں بلکہ ان کو بھی جو معاشرتی لحاظ سے ان کے ہم پلہ نہ ہو۔ باقی طبقات کے متعلق طبقہ شرفا ان کو عوام الناس کہتا ہے اور مذہبی پیشواؤں کا طبقہ انھیں دنیا دار کہتا ہے اور شخصیت کا یہ اسلوب ایسا مواد ہے جو اس وقت وجود میں آتا ہے جب کہ فلاحین کا دور وجود میں آئے اور پھر وہ ایک قومیت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور صدیوں تک اپنی اسی حالت پر قائم رہتے ہیں اور ہر زندہ ثقافت میں نسل اور جاگیر کے اس تصور میں تضاد اور ذاتی اور غیر ذاتی رجحانات کی آمیزش ہوتی ہے۔ فلاحین کے دور میں عوام الناس اور اعلیٰ ذات کے طبقات قلی اور برہمن رسمی اور غیر رسمی معاشروں میں تضاد کی علامت ہیں۔ زندہ ہیئت ایک مسلمہ طریق عمل ہے جب تک کہ وہ اپنا اسلوب قائم رکھیں اور اس اسلوب پر سختی سے عمل کریں۔ ذات پات کا نسلی اسلوب ایک لطافت، شان وشوکت اور

ذہانت کا مظہر ہے۔ اس سے انسان اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھتا ہے۔ بنی نوع انسان اور ثقافت کی ترقی کا یہ اہم عنصر ہے۔ ہم اس شان و شوکت کا بمشکل ہی اندازہ کر سکتے ہیں جس کے تحت ماندرین اور برہمن یورپی فکر اور فعالیتوں پر نگاہ ڈالتے ہیں یا کوئی مصری مذہبی پیشوا کسی فیثا غورثی یا افلاطون کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ بازنطینی شان وشوکت ماند پڑ گئی ہے کیونکہ اس کے تمام مسائل اور لاینحل مشکلات پیچھے رہ گئی ہیں۔

۲

قبل از ثقافت کا کارولنگی انسان اپنے معاشرے کو تین طبقات میں تقسیم کرتا تھا غریب، سردار اور پروہت۔ یہ قدیم زمانے کی تفریق ہے جس کا انحصار محض خارجی زندگی کے حقائق پر ہے مگر قدیم یونانی دور میں عام نقطہ نظر یہ تھا:

"خدا نے تین انواع کی زندگیاں تخلیق کی ہیں؟ غریب، سردار اور مذہبی پیشواؤں کی جماعتوں میں منقسم ہیں۔"

یہ تصور ایک اعلیٰ ثقافت میں مدارج کا فرق ظاہر کرتا ہے۔ ایک ایسی اعلیٰ ثقافت جس کی بیداری کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ جس میں کہ مذہبی پیشوا اور شمشیر زن ہل یعنی کسان کے مدمقابل اکٹھے کھڑے ہیں اور اپنی برتر قوت کا اظہار کر رہے ہیں اور دوسروں کو اپنے مقابلے میں کمزور سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ جن کے پاس جاگیریں نہیں ہیں وہ بھی اپنے آپ کو پسند کرتے ہیں مگر وہ جو ان جیسے نہیں ہیں ان کے ساتھ بھی اپنا وقت گزارتے ہیں لہٰذا اس تضاد و افتراق کی کوئی بنیادی اہمیت نہیں۔ یہ افتراق فی الحقیقت داخلی طور پر محسوس ہوتا ہے، مقدر میں لکھا ہے اور اس قدر طاقت ور ہے کہ کسی تدبیر سے بھی اس سے نجات ممکن نہیں۔ دیہات سے نفرت کا طوفان بلند ہوتا ہے اور قلعوں سے واپس منعکس ہوتا ہے۔ کوئی قبضہ ' اقتدار پیشہ انسانوں کی زندگی میں یہ عالم اسفل پیدا نہیں کرتا اس کے لیے منطقی جواز نہیں پایا جاتا۔ یہ مابعد الطبیعیاتی نوعیت سے متعلق ہے۔

بعد ازاں شہروں میں بورژوا کا طبقہ بطور تیسری قوت ابھرتا ہے۔ قصبات بھی دیہاتی آبادیوں کو نفرت سے دیکھنے لگے جسے وہ کند ذہن سمجھتا ہے۔ غیر متبدل اور اپنے حال پر صابر و شاکر اور اس کے مقابلے میں اپنے آپ کو زیادہ بیدار، زیادہ آزاد اس لحاظ سے شاہراہ ثقافت بہت آگے تصور کرتا ہے۔ وہ چھوٹے زمینداروں کو بھی نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ان کی زمینیں اور شخصیت ذہنی طور پر اسے بہت نیچے دکھائی دیتی ہیں اور تاریخی لحاظ سے بہت پیچھے معلوم ہوتی ہیں۔ پھر بھی جب ان دو کا موازنہ کیا جاتا ہے، خود قصبات کی آبادی بھی اتنی ہی مفلس ہے جیسا کہ اس کے پاس کچھ بھی باقی نہ بچا ہو۔ مراعات یافتہ طبقے کی نظر میں کسان کی کوئی وقعت نہیں، قصبات کی اپنی اہمیت ہے 'مگر محض مدمقابل اور پس منظر کی حیثیت سے یہ اس

قدر کمزور ہے کہ اسے دیکھ کر دوسرے اپنی ذات کی اہمیت کے متعلق محتاط ہوجاتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ یہ اہمیت ایک ایسی شے ہے جو عملی ضروریات و شرائط کی حدود سے باہر ہے۔

جب ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ تمام ثقافتوں میں ایک ہی طرح کے حالات پیدا ہوتے ہیں اور ان کی ایک ہی نوعیت ہوتی ہے' بہرحال ایک ثقافت کا دوسری کے مقابلے میں علامتی نظام مختلف ہوتا ہے' مگر ان کی تاریخ اس گروہی تضاد کے باوجود اپنی تکمیل کی منزل طے کرلیتی ہے۔ ہیجان انگیز کسان اپنے عروج میں جنگ آزمائی کرتا ہے' مگر بعد کے روشن خیال دور میں ذہانت پر مبنی مناقشات وجود میں آتے ہیں' پھر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بعض واقعات کے معانی کو زندگی کی گہری بنیادوں میں تلاش کرنا چاہیے۔

ان دو بڑے طبقات اور صرف ان ہی سے متعلق تصور موجود ہے' وہ ان کو یہ مضبوط احساس عطا کرتا ہے کہ ان کو یہ رتبہ خدا کی طرف سے عطا کردہ ہے' اور اس لیے اس پر کوئی تنقید نہیں کی جاسکتی---- ایک ایسا احساس جوان کو احترام ذات اور شعور ذات مہیا کرتا ہے' مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک سخت نوعیت کا ذاتی ضبط بھی (اور ضرورت پڑنے پر جان کی بازی بھی لگانی پڑتی ہے)۔ بطور فریضہ اور داخلی آرزو دونوں طبقات اپنی تاریخی برتری کے ساتھ روحانی سحر' جو طاقت کے بل بوتے پر حاصل نہیں ہوتا بلکہ خود وجود میں آتا ہے' ان کی مدد کرتا ہے۔ وہ لوگ جو ان جاگیروں سے متعلق ہیں' یہ باقی آبادی سے کسی حد تک مختلف لوگ ہیں۔ ان کی زندگیاں 'کسانوں' اور قصباتی آبادی کے برخلاف ہر طرح کی علامتی شان و شوکت کی مظہر ہوتی ہیں - یہ اپنی زندگیاں محض اس لیے نہیں گزارتے کہ انھیں زندہ رہنا ہے' بلکہ ان کی زندگیوں میں معانی پنہاں ہوتے ہیں۔ یہ زندگی کے دو آزاد پہلو ہیں' جس کا اظہار ان جاگیروں میں ہوتا ہے۔ ان میں ایک تو صرف وجود ہے اور دوسرا مکمل طور پر شعور بیدار۔

اشرافیہ کا ہر معاشرہ زندہ زمانی علامت ہے جبکہ مذہبی پیشواؤں کے گروہ کا تعلق مکان سے ہے۔ قضا و قدر اور مقدس علت ومعلول' تاریخ اور فطرت 'کب اور کہاں' نسل اور زبان' جنسی حیات اور حیات احساس ---- یہ تمام ان دونوں میں بلند تر امکانی اظہار پاتے ہیں۔ دنیا میں طبقہ شرفا عالم حقائق سے متعلق ہے اور مذہبی پیشوا صدا قتوں کا مظہر ہے۔ ایک کے پاس دانائی ہے اور دوسرے کے پاس علم۔ ایک فعال ہے اور دوسرا مفکر۔ طبقہ شرفا کا عالمی احساس لازماً" حس نبض ہے۔ مذہبی پیشواؤں کا احساس عالم تمام کا تمام کشاکش پر مبنی ہوتا ہے۔ زمان اور شارلیمن کے مابین اور کونارڈ روم کے مابین زمانی بہاؤ میں کچھ ایسے امور ہیں جن کی توضیح ممکن نہیں' بلکہ ان کو محسوس کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ ہمیں ثقافت نو کے طلوع کا علم ہو۔ شرفا اور پجاریوں کے طبقات مدتوں سے قائم ہیں مگر پہلی دفعہ---- نہ کہ طویل عرصے سے---- وہ شرفا اور پجاری ہی تھے اور ان کو وہی اہمیت حاصل تھی جو ان الفاظ کے معانی کا تقاضا ہے۔ علامتی اچانک حملہ اس قدر پرزور ہوتا ہے کہ پہلے تمام امتیازات مثلاً دیہاتی عوام الناس اور زبان سے متعلق امتیازات پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ تمام ممالک میں جو ائرلینڈ سے کلابریہ تک اور رومی مذہبی پیشواؤں کی حکومت ایک

وقت واحد عظیم معاشرہ تھا اور ٹرائے سے قبل یا یروحلم سے قبل کا قدیم روم' ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک بہت بڑا خاندان تھا۔ قدیم مصری قبائل اور جاگیرداری ریاستیں جو چاؤ کے دور اول وجود میں آئیں' ان کا موازنہ ان ریاستوں سے کیا جائے (اور محض موازنے کے لیے) مثلاً برگنڈی اور لورین جو ہوٹن ٹافن عہد میں قائم ہو گئی تھیں۔ ہر ثقافت کے آغاز و انجام کے موقع پر شہری ریاستوں کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے مگر پہلی صورت میں یہ اس لیے قائم ہوتی ہے کہ طبقہ شرفا کی خاندانی قوت تک قومیت پر غالب ہوتی ہے' اور دوسری صورت میں اس لیے کہ غیر منظم آبادی ان کے سامنے زوال آشنا ہو جاتی ہے۔

یہ دونوں ریاستیں اصولاً ایک دوسرے کے وجود کو ختم کر دیتی ہیں۔ سب سے بڑی مخالفت عالم صغریٰ اور عالم کبریٰ کی ہے جو ہر مخلوق پر' جو اس مکان میں موجود ہے حاوی ہے۔ ان میں ہر ایک کا وجود دوسری شے پر منحصر ہے۔ ہومر کے دور میں آرفیوس کے خلاف ساکت مخالفت کا اظہار کیا گیا' اور اس کے بدلے میں (جیسا کہ ہمیں ستراط سے قبل کے عہد میں نظر آتا ہے) اول الذکر دوسرے کی نفرت اور غصے کا نشانہ بن گیا۔ رومی دور میں اصلاحی روح میں ایک مبارک جوش پیدا ہو گیا جو نشاۃ ثانیہ پر منتج ہوا۔ ریاست اور کلیسا کبھی بھی کسی معاملے میں متفق نہیں ہوئے' اور جب کبھی حکومت اور پاپائیت میں اختلافات رونما ہوئے ' تو ان کی مخاصمت کا سارا زور فاؤستی باشندوں پر ظاہر ہوا۔

ان دونوں میں بھی طبقہ شرفا ہی حقیقی ریاست ہے' جس میں خون اور نسل دونوں کا امتزاج ہوتا ہے' جو پوری طرح سے نظر آتا ہے۔ لہٰذا طبقہ شرفا ہی دراصل کاشت کاروں کی اعلیٰ جنس ہے۔ ۱۲۵۰ء میں بھی مغرب میں متعدد ایسے محاورات موجود تھے جن کا مطلب یہ تھا کہ جو شخص پہلے پہرہل چلاتا ہے وہ پچھلے پہر شاہ سوار یا فوجدار ہو سکتا ہے' اور ایک سردار کے لیے یہ عام بات تھی کہ وہ کسی کسان کی لڑکی سے شادی کرلیتا۔ کلیسا کے مقابلے میں قلعہ ترقی کا زینہ تھا' کیونکہ فرینکی دور میں یہی مقام شرفا کا گھر تھا' اور کسانوں کے بستیوں سے ممتاز تھا۔ آئس لینڈ کے رزمیات میں کسانوں کے چھوٹے کھیت قلعوں کے درمیان واقع ہوا کرتے تھے۔ شرفا اور کسان نباتات کی طرح ہیں۔ آبائی اراضی میں جبلی لحاظ سے ان کی جڑیں بہت گہری ہیں ان کے خاندانی شجرے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں پجاریوں کا طبقہ ایک علیحدہ اصل کا قبیلہ ہے' جس کی بنیاد نفی پر ہے' اس کی کوئی نسل نہیں اور یہ ارضی ماحول سے منقطع ہوتا ہے۔ آزاد' لازمانی' لاتاریخی' اور شعور بیدار سے محروم ہوتا ہے۔ ہر دہقانی دیہ میں ہر کاشتکار کے خاندان کا پتھر کے زمانے سے لے کر ثقافت کی بلندیوں تک تاریخ عالم میں کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود ان کی جدوجہد کا مقصد دوسروں کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ خون کی حفاظت' نسلوں کی تدریج کائنات مستورات' قوت اختیارات وغیرہ ان کا مقصد ہیں۔ میکبتھ اور کنگ ہیبز کی داستانوں کو آپ دیہاتی ایسے بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس حقیقت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے ایسے غلط نہیں حقیقت پر مبنی ہیں۔ تمام ثقافتوں میں شرفا اور کسان ایک ہی خاندان کا حصہ نظر آتے ہیں اور صرف لسانی اظہار ہی ان کے جنسی اختلاف کو ظاہر کرتا ہے ' جس کے ذریعے زندگی اپنی نشوونما کا سامنا کرتی ہے۔ اس کی تاریخ بھی ہوتی ہے اور یہ خود بھی تاریخ ہے اور تاریخ

میں بطور صنف نازک کسانوں اور شرفا کے خاندانوں میں اس امر کا تعین کیا جاتا ہے کہ متعلقہ خاندانوں میں مستورات کی تعداد کیا ہے اور ان کی قضا و قدر کی صورت کیا ہے کیونکہ اسی میں یہ معانی پنہاں ہیں کہ عالمی تاریخ میں خالص ترین نسل کونسی ہے۔ جس قدر بھی عوامی زندگی کی لہران میں سے گزرتی ہے اور بڑے خاندانوں کے افراد کو متاثر کرتی ہے بلاشبہ خاندانوں کے نسلی اصولوں کی بنیاد کو قائم کرتی ہے اور عالمی تاریخ کے تصور کی بنیاد پر شخصیتیں ظہور میں آتی ہیں۔ پوری ریاست چند خاندانوں پر انحصار کرتی ہے جو بہت زیادہ اثرورسوخ کی حامل ہوتی ہیں۔ پانچویں صدی کی ایتھنی تاریخ الکمائی اونی ڈائی سے متعلق ہے جبکہ رومی تاریخ چند خاندانوں کی تاریخ ہے مثلاً فابائی اور کلاڈائی' باروق کے دور میں ریاستی تاریخ عام طور پر ہابس برگ اور باؤربن کے خاندانی سیاسی عمل کے گرد گھومتی ہے اور اس کے تمام بحران ان ہی خاندانوں کی شادیوں اور جنگ وراثت سے متعلق ہیں۔ نپولین کی دوسری شادی کی تاریخ میں ماسکو کی آتش زنی اور لیپ زگ کی جنگ بھی شامل ہیں۔ پاپائیت کی تاریخ اٹھارھویں صدی تک پہنچتی ہے جس کا تعلق صرف شرفا کے چند خاندانوں سے ہے جنھوں نے ایک شاہی خاندان کے قیام کی کوششیں کیں' اس لیے انھوں نے اس انتخاب میں حصہ لیا۔ یہی حقیقت بازنطینی معززین اور انگریز وزرائے اعظم کی صورت میں بھی موجود ہے (سیسل کا مشاہدہ کریں) اور بعض صورتوں میں انقلابات کے بڑے بڑے رہنماؤں کے حالات کا مطالعہ بھی کریں۔

مذہبی پیشوائیت کے تمام نظام میں (اور اس فلسفے میں جس کا تعلق اس پیشوائیت سے ہے) خالصتاً منفی ہیں۔ خالص شعور بیدار اور ازلی صداقتوں کی کیفیت ہر صورت میں زمان' نسل اور جنس کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ مرد جب وہ کسان ہو یا طبقہ شرفا سے متعلق ہو عورت کی طرف راغب ہوتا ہے مگر مرد بطور مذہبی پیشوا عورت سے دور بھاگتا ہے۔ شرفا کا طبقہ انتشار کا خطرہ مول لیتا ہے اور اس طرح عوامی زندگی کی لہر سے دور ہو جاتی ہے اور اپنے آباد اجداد اور رشتہ داروں کے محدود چھوٹے سے حلقے میں گھر جاتی ہے۔ دوسری سمت صحیح مذہبی پیشوا نجی زندگی' جنس' خاندان' گھر کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے کیونکہ ایک دنیا دار شخص کے لیے موت اس وقت بہت بڑا المیہ ہوتی ہے۔ جب اس کا کوئی وارث نہ ہو آئس لینڈ کے باشندوں کے رزمیات' چین میں آباؤ اجداد کی پرستش سے الگ نہیں اور ہمیں بھی یہی تعلیم دیتی ہے۔ وہ شخص کلی طور پر نہیں مرتا جس کے بیٹے اور بھتیجے موجود ہوں مگر ایک صحیح پادری کے لیے صرف اس کی روح زندہ رہتی ہے وہ صرف دانش مندی کی وصیت کر سکتا ہے اور چونکہ اس نے عورت کو چھوڑ دیا ہوتا ہے اس لیے اس کی موت کے بعد کوئی عورت اس کی وارث بھی نہیں ہوتی۔ اس دوسری صورت میں ماحولی کیفیات جو بار بار وجود میں آتی ہیں غیر متاہلی صومعہ' جنسی خواہش کے خلاف جنگ جو اپنے آپ کو ہیجڑا بنانے کی حد تک ہے اور مامتا کے خلاف نفرت' جو اپنے آپ کو خود لذتی اور سطحی بیسوائی میں مبتلا کرنا اور اپنی جنسی زندگی کی ذہنی قدروقیمت کو اتنا کم کر دینا کہ کانٹ کی ازدواجی فلسفیانہ سطح تک گر جائے ۔ تمام کلاسیکی عالم میں یہ ایک قاعدہ تھا کہ کوئی بھی مقدس گردونواح میں شخص نہ پیدا ہو گا اور نہ کسی کی ولادت ہوگی' لافانی کو وقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہیے۔ پجاری کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ نسل کشی ولادت کو ذہنی طور پر قبول کر لے اور ان کا احترام کرے' مگر جہاں تک اس کی ذات کا تعلق ہے وہ ان کا تجربہ نہ کرے۔

جبکہ طبقہ اشرافیہ فی نفسہ اپنی حیثیت کا مالک ہے۔ مذہبی پیشواؤں کا طبقہ کسی اور شے کی نشاندہی کرتا ہے اور ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ ہر اس شے کا مخالف ہے جسے قضا و قدر' نسل یا جاگیر کہا جاتا ہے۔ قلعہ اپنے ایوانوں' میناروں' دیواروں اور خندقوں کے ساتھ زندگی کے ایک مضبوط بہاؤ کی نشاندہی کرتا ہے مگر کلیسا اس کے تہ خانوں اور محرابوں' ستونوں اور قوال خانوں کے ساتھ تمام کا تمام بامعنی ہوتا ہے' جسے آرائش کہنا چاہیے اور ہر محترم پیشوائی نے اپنے آپ کو اس پرشکوہ جمال سماع تک پہنچا دیا ہے جس میں کہ ہر مد' چہرے کا ہر اظہار اور انعکاس صوت' لباس اور چال ہر شے محض آرائش ہے اور اس کی وجہ سے نجی زندگی بلکہ داخلی زندگی بھی غیر ضروری سمجھ کر ترک کر دی گئی ہے۔ جبکہ بالغ نظر طبقہ اشرافیہ (جیسا کہ اٹھارھویں صدی کے فرانس میں پایا جاتا تھا) اپنے آپ کو بطور مکمل حیات کے پیش کرتا ہے۔ یہ رومی فکر تھی جس کا ارتقا مذہبی پیشوائیت کے بغیر ہوا۔ ایک ناقابل فراموش کردار جو تصورات کو ناقابل فنا زندگی عطا کرتا ہے' مکمل طور پر آزاد اور متعلقہ شخص کی زندگی کو عالم تاریخ میں مقام عطا کرتا ہے۔ مگر ہر مذہبی پیشوائیت اور اس کے نتیجے میں تمام فلسفے (مدرسہ ہائے فکر کے مفہوم میں) میں بھی یہ تصورات مضمر ہوتے ہیں اگر کسی پجاری کا تعلق کسی نسل سے ہے تو پھر اس کی خارجی دنیا بطور کسان ہوگی یا وہ سردار ہو گا یا شہزادہ۔ رومی دور کے اسقف سب نواب اور شہزادے تھے۔ فوجوں کے سالار نکتہ رس مدبر اور خاندانی سیاست کے شوقین تھے۔

قبل از بدھ دور کے برہمن باروق بہت بڑے بڑے زمیندار تھے تربیت یافتہ راہب' درباری اور شہ خرچ اور لذت پسند تھے ۔ ۔ یہ قدیم دور ہی میں شعور پیدا ہو گیا تھا کہ تصور کو شخصیت سے الگ کر کے مشاہدہ کیا جائے۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جو طبقہ شرفا کے مزاج کے خلاف ہے اور روشن خیالی کے دور تک پیشوائیت کو بطور پیشوا علیحدہ مقام نہیں ملا' اور اس کی نجی زندگی کو قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا مگر اس کے بعد اس لیے نہیں کہ زمانے کی بصارت تیز ہو گئی تھی بلکہ اس لیے کہ یہ تصور ہی ختم ہو گیا۔

طبقہ اشرافیہ کا مقام تاریخ میں ہے جبکہ پیشوا فطرت کا ہی ایک حصہ ہے۔ اعلیٰ معیار کی تاریخ صرف معاشرے کے اعلیٰ طبقات کے گرد گھومتی ہے اور مختلف واقعات کو جانچنے اور پرکھنے کا معیار دریائے وجود کی لہر کی نبض کی رفتار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کنوئے کی جنگ اور دور آخر کے رومی بادشاہوں کی جنگیں تاریخی لحاظ سے کسی اہمیت کی حامل نہیں۔ کسی قوم کا عروج اس میں ابتدائی طبقہ شرفا کے وجود میں آنے کے ساتھ منسلک ہوتا ہے۔ ایسے معاشرے کے جذبات کے مطابق شہزادے کا مقام محض رسمی بادشاہ یا شاہی خاندان کے ایک فرد کا تھا اور بے اعتمادی کی زندہ مثال۔ جب کبھی کوئی نسل بے حد مضبوط ہوتی ہے تو اسے بڑی بڑی شخصیتوں کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ ایسی شخصیتوں کا وجود اس کی اپنی قدر وقیمت کی بدنامی کا باعث ہوتا ہے لہٰذا مقامی جنگیں محض ایسی صورت کی حامل ہیں جن سے کہ قدیم ادوار کی تاریخ اپنی تکمیل کرتی ہے۔ اس کے بعد طبقہ اشرافیہ ثقافت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ جب اس کے ہاتھ میں تخلیقی قوت اور

صلاحیت بھی ہو تو یہ زیادہ متاثر کن ہوتا ہے۔

چونکہ یہ اپنا عمل خاموشی سے سرانجام دیتا ہے لہٰذا وجود اپنی ہیت اور کیفیت طے کر لیتا ہے۔ بنض میں خون کی رفتار میں اضافہ ہو جاتا ہے' جس کی مستقل تصدیق ہو جاتی ہے کیونکہ جو تخلیقی بلند پروازی عروج حاصل کرتی ہے۔

ہر قسم کے عروج تک----- اس میں قدیم روایت کی قوت موجود ہوتی ہے۔ ہر قدیم----- مدت----- جس سے مراد قدیم مضبوط نظم و ضبط ہے' یہی زندگی کی دھڑکن ہے۔ اسے اپنی ذات پر اتنا اعتماد ہے کہ اس کا دورانیہ حیات تمام خاندانوں سے زائد ہوتا ہے اور یہ مسلسل نئے افراد اور نئے موجودات کو اپنے اندر سموتا جاتا ہے۔ بلا کسی شک وشبے کے ادوار متاخر کی تمام تاریخ جو قوت ہیئت اور رفتار سے متعلق ہے جبلی اور خلقی ہوتی ہے (اور اس لیے ناقابل تنسیخ بھی ہوتی ہے) اور قدیم نسلوں سے منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اس کی کامرانیاں خون میں موجود روایات سے نہ تو کم ہوتی ہیں نہ زیادہ۔ سیاسیات میں بھی دوسرے عظیم اور پختہ فنون کی طرح کامیابی وجود کے اعلیٰ مدارج کو بطور مفروضہ طے کر لیتی ہے اور غیر شعوری طور پر قدیم شان وشوکت کے تجربات کو اور شک سے پاک جبلی ذخیرے اور ہیجانات کو روبعمل لاتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور سیاسی استاد موجود نہیں۔ ایک بڑا فرد ہر حادثے اور واقعے سے بہتر ہوتا ہے۔ وہی مستقبل کا آقا ہے اور وہی موثر ہے (یا اسے موثر قرار دے دیا گیا ہے)۔ وہی قضا و قدر کا مالک ہے یا خود ہی قضا و قدر ہے۔ تقدیر اس کی وجہ سے یا اس کے ہاتھوں میں تشکیل پاتی ہے۔ یہی وہ فرق ہے جو سطحی اور ضروری فنون کو الگ الگ کر دیتا ہے اور تاریخی لحاظ ضروری اور غیر ضروری سیاست کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں بانٹ دیتا ہے۔ اس امر کی کوئی اہمیت نہیں کہ اگر کوئی بڑا آدمی عوام الناس سے پیدا ہو (یعنی ایسے لوگوں میں سے جن کی کوئی سیاسی روایت نہ ہو) اور حکمرانوں کی سطح تک پہنچ جائے اور اگر وہ ایسے افراد ہیں جن کا ذکر القا (۳، ۱۹) میں کیا گیا ہے ۔ تو ہمیں عظمت کا مشاہدہ مذہب میں بھی ہوتا ہے۔ یہاں بھی نسلی خصوصیات قائم رہتی ہیں کیونکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ ایسے مقابلوں کے لیے زندگی میں مناسب قوت موجود ہو اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ صرف فلسفہ ہے۔

محض اسی سبب کی بنا پر دور آخر میں طبقہ شرفا کو زیادہ باآرام سمجھا جاتا رہا ہے۔ یہ خطابات اور استحقاقات اور رسومات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ ایسی داخلی خصوصیات اور قوتوں کا حامل ہوتا ہے جن کا حصول آسان نہیں۔ انھیں قائم رکھنا بھی مشکل ہے۔ یہ نعمت صرف انھیں کے لیے ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ بلند مقاصد کے لیے تمام زندگی قربان کی جا سکتی ہے۔ ایک قدیم خاندان سے مراد آباؤ اجداد کی تعداد نہیں (آباؤ اجداد تو ہم سب کے ہوتے ہیں) بلکہ ایسے آباؤ اجداد مراد ہیں جو تاریخ میں اپنی عظمت کے جھنڈے گاڑ چکے ہوں۔ یہی نہیں کہ وہ اپنی قسمت کے خود مالک تھے بلکہ وہ خود ہی تقدیر تھے جو صدیوں کے تجربات کی بنا پر ایسے مقام پر پہنچ چکے تھے کہ ان کے خون سے واقعات کی تکمیل ہوتی تھی۔ چونکہ وسیع تر مفہوم میں تاریخ کا

آغاز ثقافت سے ہوتا ہے' کولونا کے لیے گویا یہ اکسیر کا حصول تھا کہ وہ اپنے آپ کو رومی شاہی خاندان کی اولاد ثابت کر سکے۔ یہ باز نطینیوں کے مورث اعلیٰ کا عمل کہ اس نے اپنے آپ کو قسطنطین سے منسلک کر لیا بے معنی نہ تھا اور آج کے امریکیوں کے لیے یہ باعث فخر ہے کہ وہ اپنا شجرہ نسب ۱۶۲۰ء کے کسی تارک الوطن سے جوڑ لیں۔ حقیقتاً" کلاسیکی طبقہ اشرافیہ کا آغاز ٹراجن دور سے ہوتا ہے اور فرینکز یا گوتھوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور انگلستان میں سیکسن کی بجائے نارمن سے ہوتا ہے۔ ان نقاط آغاز ہی سے ان لوگوں کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے اور اسی لحاظ سے اصل طبقہ اشرافیہ کی نشاندہی ہوتی ہے اور اسی بنیاد پر اشرافیہ اور ہیروز میں فرق وامتیاز کی حد بندی کی جا سکتی ہے۔ یہی کچھ اس جلد کے پہلے باب میں لکھا جا چکا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ کائناتی حرارت یا نبض کی گرمی شرافت کی تکمیل کا لازمی جز ہے۔ جسے ہم عالم پختگی میں سفارتی عمل یا حکمت عملی کہتے ہیں جس میں تمام تزویری اشغال اور تجارتی داؤ پیچ شامل ہوتے ہیں اور عمدہ اشیا کو جمع کرنے والے کی بصارت اور ایک جج کی عقابی بصارت----- اور بالعموم وہ تمام اوصاف جو انسان کو ودیعت ہوتی ہیں اور جن کے لیے اسے اکتساب کی ضرورت نہیں ہوتی' جس سے ان لوگوں کو حسد ہوتا ہے' جو ان اوصاف سے محروم ہیں' وہ شے جو بطور ہیئت واقعات کی سمت متعین کرتی ہے۔ یہ اس مخصوص کائناتی خواب کی مانند یقین کے علاوہ اور کچھ نہیں' جس کا اظہار پرندوں کے فضا میں دائرہ بنا کر اڑنے اور اعلیٰ نسل کے گھوڑوں کی منظم حرکات میں ہوتا ہے۔

مذہبی رہنما کائنات کو فطرت کے حدود میں دیکھتا ہے اور اس کی تصویر کو اپنی فکر کے واسطے سے گہرائی عطا کرتا ہے۔ دونوں (کائنات اور فطرت) اپنی عظیم کے مطابق آگے بڑھتے ہیں۔ مگر ایک کا ارتقا اس کی ہیئت پر مبنی ہوتا ہے اور دوسرے کا تربیت پر دونوں صورتوں میں یہ بنیادی فرق ہے۔ اس کے نتیجے میں ان دونوں میں سے ایک ہی کی ہیئت مکمل ہو گی اور دوسرا اس لیے مکمل حالت میں معلوم ہوتا ہے کیونکہ دونوں میں تضاد کی کیفیت تکمیلی ہے۔ نسل کے افتراق کے میدان اور تربیت دونوں کا تعلق خون سے ہے اور اس لیے ان کے اوصاف نسلاً" بعد نسل (باپ سے بیٹے کو) منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ ہیئت کی تکمیل میں ذہانت اور ذوق شرط اول ہیں۔ لہٰذا اعلیٰ پائے کی مذہبی پیشوائی میں انفرادی خصوصیات کا پایا جانا ضروری ہے۔ یہ گروہ شعور بیدار کا محتاج ہے۔ ان کا کسی نسلی سلسلے سے متعلق ہونا ضروری نہیں۔ لہٰذا اس مفہوم میں بھی دوسرے عوامل کی طرح ان کے لیے زمان اور تاریخ کی نفی مقدر ہے۔ ذہنی کشش اور خونی کشش----- اس اظہار تضاد کی گہرائیوں میں جھانکتے اور غوروفکر کرتے ہیں۔ وراثت میں منتقل ہونے والی پیشوائیت اپنی ہی شرائط کے منافی ہے۔ ایک مفہوم میں فی الحقیقت اس کا وجود ویدوں کے زمانے کے ہندوستان میں تھا۔ مگر اس حقیقت کے در پردہ یہ راز تھا کہ شرفا کا دوسرا طبقہ بھی ہے اور وہ پیشوائیت کے استحقاق کو صرف اپنی نسلوں تک محدود رکھنا چاہتا ہے اور کسی اور جگہ پر تجرد کو منع کر دیا گیا۔ کیونکہ اس سے (خاندانی پروہت) کے اصول کی نفی ہوتی ہے۔ "پجاری ایک مرد ہے" یہ مرد پر منحصر ہے کہ وہ شریف ہو یا نہ ہو۔ لیکن اس کا وجود ایک مقدسہ سلسلہ علت و معلول پر دنیا میں قائم ہے۔ پروہت کے اختیارات بھی علت و معلول ہی کی نوعیت کے ہیں۔ البتہ اس کی علت اعلیٰ درجے سے متعلق ہیاور اس لیے یہ خود بھی ایک علت فاعلی ہے۔ پجاری

ایک درمیانی واسطہ ہے جو شعور بیدار اور حتمی راز کے مابین نمائندگی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ثقافت میں مذہبی پیشوا کو اعلیٰ علامتی احترام حاصل ہوتا ہے۔ کلاسیکی روح نے مکان کے وجود سے انکار کیا' اس لیے اسے کسی درمیانی واسطے کی بھی ضرورت نہیں' جو اس سے معاملہ طے کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کلاسیکی دور میں ابتدا ہی میں پجاریوں کی اہمیت کا وجود ختم ہوگیا۔ فاؤستی شخص لامتناہیت کے سامنے مدمقابل کے طور پر کھڑا ہے۔ اسے کسی مقدس ہستی کی ضرورت نہیں جوان قوتوں کے سامنے اس کے لیے ڈھال ثابت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ رومی پیشوائیت نے بلند پاپائیت کامقام پیدا کرلیا۔

دو جہانوں کا تصور' خون کی گردش کی دو صورتیں (جو شریانوں اور وریدوں میں رواں دواں ہے) اور روز مرہ معاملات میں وجود اور عمل کے عناصر باہم مربوط ہیں' (اور ثقافت میں) آخر کار دو اخلاقی نظام مروج ہوجاتے ہیں' جن میں سے ہر ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے' یعنی شرفا کے رواجات اور پجاریوں کے رسومات' جو ایک دوسرے کو دنیاداری اور غلامی کا طعنہ دیتے ہیں۔ یہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ کس طرح ایک قلعے سے دوسرا صومعہ اور گرجے سے اپنے سفر کا آغاز کرتا ہے ۔ ایک تاریخ کے طوفان میں اور دوسرا تنہا خدا کی راہ میں اور اس کی رضا کی تلاش میں نکل پڑتا ہے ۔ وہ قوت جس کے ساتھ انسان پر یہ ابتدائی تاثرات پیدا کرتے ہیں ' مستقبل میں انسان اس کا اندازہ بھی نہیں کرسکتا۔ لامذہبی اور روحانی طبقات کے احساسات اپنے عمودی اسلوب حیات کے ساتھ آغاز کرتے ہیں اور اپنے لیے خود ایک اخلاقی معیار مقرر کرتے ہیں' جو صرف موزوں لوگوں ہی کے لیے قابل عمل ہوتا ہے اورخود ان کو بھی اس پر چلنے کے لیے طویل تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وجود کی عظیم ندی اپنے آپ کوایک وحدت قرار دیتی ہے۔ اور مدمقابل کو بچاکھچا کند ذہن بے جان اور حیوانی خون ہونے کا طعنہ دیتی ہے۔ اعلیٰ ذہن طبقات دوسرے بقیہ افراد کے مقابلے میں اپنے آپ کو علیحدہ معاشرتی گروہ قرار دیتے ہیں ۔ ان دونوں گروہوں میں سے ایک شمشیرزنوں اور دوسرا سنیاسیوں کا گروہ ہے۔

نطشے کا یہ ایک اعلیٰ استحقاق ہمیشہ قائم رہے گا کہ اس نے تمام اخلاقی فلسفوں کی دوہری فطرت کو سب سے پہلے پہچانا ۔ اس نے آقا اور غلام کے اسما کی درجہ بندی کی ۔ اس کا اخلاقی نظام غیر معین تھااور اس نے عیسائیت کے اخلاقی نظام کو خط تقسیم کے ایک طرف ڈال دیا ۔ مگراس کی رائے کی بنیاد کے پیچھے یہ مضبوط اور واضح حقیقت موجود ہے کہ خیروشر طبقاتی اصطلاحات ہیں اور نیک وبد پادریوں کی تقسیم کا امتیاز ہیں۔ حسن وقبح جو ٹوٹمی امتیازات پر قائم ہیں اور ابتدائی گروہان انسان اور قبائل میں مروج تھے' وہ صرف مزاج یا افتاد طبع کی وضاحت نہیں کرتے بلکہ انسانوں کا بیان کرتے ہیں اور پوری وضاحت سے ان کی زندگی کے وجود کو زیر بحث لاتے ہیں۔ خیر غالب' قوی' بھرپور اور خوش قسمت ہوتا ہے۔ خیر کا مطلب ہے جلال' بہادر' اعلیٰ نسل سے متعلق ہر لحاظ سے اور ہر زمانہ عروج میں برتر۔ شر (بدی) سستا' ذلیل' عامی (اصل مفہوم میں) کمزور بے حیثیت بدقسمت بزدل ناقابل توجہ ہوتا ہے شرفا کی اولاد ۔ جیسا کہ قدیم مصر نے یہ اصول قائم کیا' خیر وشر اور مانعات کے تصورات ایسے لوگوں کی قدر و قیمت ادراک اور معقولیت کی بنا پر طے

کرتے ہیں۔ گویا یہ اس کی بیدار افتاد طبع اور شعوری فعالیت ہے۔ اخلاقیات محبت کی نسل کے مفہوم میں خلاف ورزی' غیر شریفانہ فعل ہے۔ گویا یہ کلیسا کے احکامات محبت کے خلاف گناہ بدطینتی پر مبنی ایک شرارت ہے۔ شریفانہ عادات ایک طویل اور مسلسل تربیت کا قطعی لاشعوری نتیجہ ہوتی ہیں۔ یہ صرف میل جول سے حاصل کی جاسکتی ہیں' کتابوں سے نہیں۔ یہ ایک محسوس توازن ہے' محض تصور نہیں۔ مگر دوسری اخلاقیات واضح مترتب ہوتے ہیں' جن کی بنیاد علت ونتائج پر ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ قابل ادراک اور اعتقاد پر مبنی ہوتے ہیں۔

ان میں سے ایک تو اول تا آخر تاریخی نوعیت کا ہے اور معاشرتی درجہ بندی کو تسلیم کرتا ہے۔ نیز استحقاقات کو حقیقی اور بدیہی سمجھتا ہے۔ احترام ہمیشہ سے ایک جماعت کا احترام ہی سمجھا جاتا ہے۔ دنیا میں ایسا کوئی تصور موجود نہیں کہ تمام بنی نوع انسان کا احترام کیا جائے۔ مبارزت طلبی غلام افراد کی مجبوری نہیں۔ ہر شخص خواہ وہ بدو ہو یا سموریا یا کورسی کان' کسان ہو یا کارکن' جج ہو یا ڈاکو' عزت نفس' وفاداری حوصلے' بدلے کے لیے بعض اصول مقرر کرلیتا ہے۔ مگر یہ اصول کسی دوسرے معاشرے یا طبقے پر نافذ نہیں ہوتے۔ ہر زندہ انسان کے بعض رواجی اصول ہوتے ہیں۔ اس کے بغیر سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ بچے کھیل کے اصول مقرر کرلیتے ہیں۔ وہ اپنے متعلق جانتے ہیں کہ کیا شے موزوں ہوگی۔ کوئی ان قوانین کو مرتب نہیں کرتا مگر پھر بھی یہ موجود ہوتے ہیں۔ یہ بالکل غیر شعوری طور پر وجود میں آتے ہیں۔ اس مجموعی انسانی گروہ' جس میں اجتماعی مزاج متعین ہو جاتا ہے' اس صورت میں بھی ہر انفرادی وجود کی اپنی ہیئت قائم رہتی ہے----- ہر انسانی اجتماع ایک یا زائد ہیجانات کے تحت خواہ وہ ایک ہی لمحے کے لیے کسی گلی میں جمع ہو جائے' اپنا اصول اخلاق وضع کرلیتا ہے' اور ہر وہ فرد جو اسے قبول نہ کرے اور کھلم کھلا اس سے روگردانی کرے---- بلکہ کہنا چاہیے کہ وہ اس پر عمل نہ کرے' اور متفقہ رواج کے علاوہ زیادہ معقولیت پر اصرار کرے---- تو ایسا فرد ایک کمزور' کم پایہ اور اجنبی شخص متصور ہوگا۔ بے علم لوگ اور بچے ایسے عمل کے خلاف ایک عمدہ جوابی فعالیت کے مالک ہوتے ہیں۔ بچوں کو بہرحال مذہبی عقاید کی زیادہ سے زیادہ تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح وہ خیروشر کے متعلق زیادہ علم حاصل کرسکیں گے' جو معرض تحریر میں آچکا ہے' اور واضح اور بدیہی ہے۔ رواجی اخلاقیات کو حقیقی اخلاقیات قرار نہیں دیا جاسکتا' لیکن اس کی یہ حیثیت ضرور ہے کہ یہ متعلقہ معاشرے میں موجود ہوتا ہے۔ یہ ولادت اور نشوونما سے متعلق ہے اس میں احساس اور نامیاتی منطق بھی ہے۔ مگراس کے برعکس اخلاقیات نے کبھی حقیقی صورت اختیار نہیں کی (اگر ایسا ہوتا تو دنیا کا ہر شخص ہی بزرگ ہوتا) بلکہ یہ ایک ازلی ضرورت ہے جو شعور پر (تلوار کی طرح) لٹک رہی ہے' اور تمام بنی نوع انسان کے لیے یکساں لازمی ہے۔ قطع نظر اس امر کے کہ ان کی حقیقی زندگی اور تاریخ میں اختلافات موجود ہوں۔ اس کے پیش نظر تمام اخلاقیات کی حیثیت منفی نوعیت کی ہے اور تمام رواجی اخلاقیات کی نوعیت اثباتی ہے۔ ثانی الذکر میں "عزت واحترام کے بغیر" اس کی حیثیت بدتر ہوتی ہے اور اول الذکر میں گناہ سے پاک حیات بلند تر اور ہر ایک کے لیے موزوں ہوتی ہے۔

تمام زندہ روایتی اخلاقیات سے مراد احترام ہے۔اس کے علاوہ ہر شے-----وفاشعاری' حیا' بہادری' جرات آزمائی' اپنے نفس پر قابو----- اس ایک اصطلاح عزت واحترام میں مضمر ہے عزت۔ کے معاملے میں کوئی بھی ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگانے کے لیے تیار نہیں ہوتا' کیونکہ اسے بے عزتی سمجھا جاتا ہے۔ اس معاملے کا تعلق نسل سے ہے' استدلال سے نہیں۔ عزت کے معاملے میں کوئی بھی بد نامی قبول نہیں کرتا۔ عزت کے نقصان کا مطلب یہ ہے کہ زندگی' وقت اور تاریخ میں اپنا مقام کھو دیتا ہے۔ ایک جماعت کی عزت' ایک خاندان کی عزت' جس میں عورت مرد سب شامل ہیں 'کسان اور سپاہی کی عزت' بلکہ ایک ڈاکو اور رہزن کی عزت' یعنی پورے ملک کی عزت یکساں ہے۔ عزت سے مراد ہر شخص کی زندگی کی قدروقیمت ہے - وقار' نفاست' شرافت یہ سب اس کے مختلف پہلو ہیں۔ اس کا تعلق سمتی زمان سے ہے' کیونکہ گناہ کا تعلق لازمانی مکان سے ہے۔ کسی کی جسدی عزت سے مراد یہی ہے کہ اس کی اپنی نسل کا وقار قائم ہے۔ اس کا عکس روایتی بدشکل تھرسیس ہے' جس کی روح گارے سے بنی تھی۔ کمینہ' گھٹیا جو یہ کہتا ہو کہ مجھے ٹھو کریں مارو مگر زندہ رہنے دو۔ بے عزتی کو قبول کر لینا' ذات کو بھول جانا' دشمن کے سامنے گھٹنے ٹیک دینا' ان سب کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کی قدر و قیمت ختم ہو چکی ہے اور وہ سطحی ہو چکی ہیں۔ مگر یہ حقیقتاً اخلاق نہیں ہے جو زندگی کا پورا پورا ساتھ دے سکے' بلکہ ایسا اخلاق زندگی کو مسترد کر دیتا ہے' اور اس سے تعلق منقطع کر لیتا ہے' اور اس طرح وہ عزت سے بھی منحرف ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ہر اخلاقی عمل کی تہ میں مذہبی روایات ہوتی ہیں اور کسی مخلوق کا قتل بھی اسی نوعیت کا حامل ہے اور ایسے افعال کا تاریخ عالم کے افعال سے کوئی تعلق نہیں۔

۴

اس موقعے پر کسی حد تک یہ اندازہ لگانا اور اس امر پر غور کرنا ضروری ہے کہ تاریخ عالم کب (بالخصوص عظیم ثقافتوں کے دور آخر میں اور تہذیبوں کے دور آغاز میں) اپنے رنگوں کی بھرپور بوقلمونی کا اظہار کرتی ہے۔ نیز تاریخی واقعات کے پرخلوص علامتی نظام کا کب مظاہرہ کرتی ہے۔ ابتدائی اجارہ داریاں طبقہ شرفا اور مذہبی پیشوا خالصتاً" زندگی کے دو پہلوؤں کے ترجمان ہیں۔ مگر اس معاملے میں صرف یہ دو ہی شامل نہیں۔ انتہائی قدیم زمانے میں----- اکثر" فی الحقیقت ابتدائی دور میں بھی یہ دونوں باقی عوامل پر غالب رہے----- لیکن پھر بھی وجود کی دیگر ندیاں اور بیدار سلسلے علیحدہ ہوتے رہے' جس میں زمان و مکان کی علامات زندہ اظہار کے طور پر سامنے آتی ہیں اور یہ کب (نہ کہ کب تک) ان دونوں بڑے عوامل کے ساتھ شامل ہو کر وہ ادارے تشکیل کرتے ہیں' جن کو ہم ' معاشرتی تنظیم یا معاشرہ کہتے ہیں۔

مذہبی پیشواؤں کا طبقہ کائناتی اور ذی حیات ہے' مگر طبقہ شرفا کائناتی ہونے کے علاوہ اکثریت کی بھی علامت ہے (اس لیے زمین کے ساتھ اس کے واضح تعلقات ہوتے ہیں)۔ یہ خود بھی ایک پودا ہے جو زمین میں گہری جڑیں رکھتا ہے) اگرچہ اس کا مقام زمین کی سطح پر ہے۔ اس میں بھی اور علاوہ ازیں متعدد مختلف

حالتوں میں بھی 'کسانوں کا طبقہ سب سے برتر ہے۔ یہ اسی نوعیت کی کائناتی تحدید ہے' جو مکان ' میں اجنبی نظر آتی ہے۔ صفات ابتدائی احساس کا نام ہے' یہ کوئی تصور نہیں۔ اس کا تعلق زمان' تاریخ اور قضا و قدر سے ہے۔ مگر مکان اور سلسلہ علت و معلول سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ منطقی طور پر اس کے مقام کا تعین نہیں کیا جاسکتا' مگر یہ موجود ہے پودے سے بحث کے آغاز کے بعد ہم اسی اصول کا اعلیٰ بنی نوع انسان پر اطلاق کرتے ہیں' بالکل اس اصول کے تحت کہ تاریخ میں نباتاتی اور نسلی دونوں خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔ لہٰذا جائیداد اس کی اپنی حیثیت میں صرف اراضی کی ملکیت تک محدود ہے اور اس کی تبدیلی کی ا گیمت کے نتیجے میں زمین پر اشیا کی پیداوار پر قبضہ صرف جائیداد کی مضبوط حیثیت ہی کی شہادت ہے۔ پودے کا زمین کے اتنے حصے پر قبضہ ہوتا ہے جس پر اس کی جڑیں پیوست ہوتی ہیں۔ گویا اتنی زمین اس کی جائیداد ہے اور وہ اپنی پوری قوت سے اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اس میں وہ اپنے وجود کی پوری قوت لگا دیتا ہے۔ اس میں غیر بیج ' یا دوسرے درختوں کے چھا جانے کے خلاف مدافعت کرتا ہے' اور فطرت کے تمام عوامل کا مقابلہ کرتا ہے' بلکہ اسی طرح ایک پرندہ بھی اپنے گھونسلے کا دفاع کرتا ہے' جس میں کہ وہ انڈے سیتا ہے۔ جائیداد کے لیے سخت ترین جنگیں لڑی جاتی ہیں۔ نہ صرف اعلیٰ ثقافتوں کے دور میں امیر اور غریب کے درمیان' اور صرف منقولہ اشیا کے لیے ' بلکہ نباتات کے ابتدائی دور میں جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ہے۔ جب کسی جنگل میں جب آپ کو سکون دکھائی دیتا ہے' اس وقت بھی زمین کی سطح پر شب و روز جنگ جاری رہتی ہے۔ آپ سطح کی گہرائی سے حیران ہو جائیں گے' کہ یہاں بھی کشمکش حیات کی وہی صورت ہے جو انسانوں میں ہے۔ یہاں بھی سال بھر ایک سخت جنگ جاری رہتی ہے' جس میں کمزور' طاقتور کے سامنے اپنی ناکام جدوجہد تادم آخر جاری رکھتا ہے' اور کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے' کہ فاتح ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ صورت اپنی بالکل ابتدائی حالت میں انسان کو بھی درپیش تھی' جب کہ ایک قدیم کسان خاندان اپنے ٹھنڈے گھر یعنی گھونسلے سے باہر نکال دیا جاتا ہے' یا شرفا کا کوئی خاندان تباہ کر دیا جاتا تھا' یا زیادہ درست الفاظ میں اس کی جڑیں کاٹ دی جاتی تھیں اور اس غرض کے لیے زر بھی خرچ کی جاتی تھی اس سے بھی زیادہ شدید نوعیت کے اختلافات دور آخر کے شہروں میں دیکھنے میں آئے اور وہاں ان کے معانی کسی قدر مختلف ہو گئے۔ یہاں صرف جائیداد پر قبضہ مقصود نہ تھا۔ بلکہ جائیداد کا وہ خالص تصور تھا' جس کے لیے جنگ لڑی گئی۔ جائیداد کی نفی کبھی نسلی خصوصیت نہیں ہوتی' بلکہ ایک یہ خالص عقیدے کا مسئلہ ہے۔ یہ دانش ور شہری' برباد' زراعت کے مخالف راہبوں کے شعور بیدار' فلسفیوں اور تصور پرستوں کا احتجاج ہے۔ یہی وجوہات زینو اور مارکس کو بھی درپیش تھیں - جب اشیا کی کثرت کو مسترد کیا جاتا ہے' تو یہی ردعمل نسلی آبادی میں اس رجحان کے خلاف بھی پیدا ہوتا ہے۔ ہمیشہ کی طرح اس میں بھی حقائق اور صداقتوں کی تردید کی جاتی ہے - جائیداد ایک طرح کی چوری ہے۔ یہ پرانی فکر کی حد سے بڑھی ہوئی فکر ہے۔ اس شخص کو کیا فائدہ پہنچے گا اگر اسے تمام دنیا کا قبضہ مل جائے' اور اس کے بدلے میں اسے روح سے محروم کر دیا جائے؟ جب کوئی مذہبی پیشوا اپنی جائیداد سے دست بردار ہو جاتا ہے تو وہ ایک اجنبی اور باعث خطر شے کو ترک کرتا ہے - اگر کوئی دنیادار شریف انسان ایسا کرتا ہے تو وہ اپنی ذات ہی کو دوسروں کے حوالے کر دیتا ہے۔

اس طویل بحث کے بعد جائیداد کے احساس و تصور کی ثنویت میں داخل ہو جاتے ہیں - "جائیداد بطور قوت اور جائداد بطور مال غنیمت"- یہ دونوں تصورات قدیم نسل انسان میں بہت جلد ایک ہی تصور کا حصہ بن گئے- ہر بدو اور بحری قزاق جائیداد کی دونوں صورتوں کا حصول چاہتا ہے- بحری طالع آزما صرف بحری قزاق بھی ہوتا ہے- ہر جنگ قبضے کے لیے لڑی جاتی ہے' بالخصوص زمین کے قبضے کے لیے مگر صرف ایک اقدام کی بنا پر ایک سردار ڈاکو بن جاتا ہے' اور مہم جو فاتح اور بادشاہ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے- جیسا کہ روس میں رورک اور نارمن نے کیا اور بے شمار آئریوں اور ائراسکی قزاقوں نے ہومر کے عہد میں کیا- تمام رزمیہ شاعری میں ہم دیکھتے ہیں کہ جنگوں میں فتوحات کے علاوہ اقتدار اور عورت پر بھی قبضہ کیا گیا اور اس میں خوشی' غم ' غصے اور محبت کے نغمات گائے گئے' اور مسرت انگیز نعرے بلند کیے گئے- جب او ڈی سی اس واپس وطن آیا' تو سب سے پہلا کام جو اس نے کیا' وہ یہ تھا' کہ اپنی کشتی میں موجود خزائن کو شمار کیا' اور آئس لینڈ کی ایک کہانی میں جب کسان ہجال مار اور اولوا روڈ کو معلوم ہوتا ہے کہ فریق مخالف کے جہاز مال سے خالی ہیں' تو وہ جنگ ترک کر دیتے ہیں- وہ شخص جو فخر اور عزت کے لیے لڑتا ہے وہ احمق ہے- ہندوستان میں آرزوئے جنگ کا مطلب زیادہ سے زیادہ مویشیوں پر قبضہ ہے اور دسویں صدی میں یونانی طالع آزما اور آباد کار نارمنوں کے کور سائروں کی طرح تھے- وسیع سمندروں میں کوئی اجنبی جہاز مال غنیمت ہے' مگر جنوبی عرب اور اہل فارس کے درمیان ۲۰۰ کی جنگ اور صوبائی سرداروں کی ۱۲۰۰ء کی نجی جنگیں---- جو مویشی چھیننے کی کوششوں سے زیادہ حیثیت کی حامل نہ تھیں' وہ جاگیردارانہ نظام کے خاتمے کے بعد باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کر گئیں اور ایک ایسی بڑی جنگ جس میں علاقوں اور عوام پر قبضہ مقصود تھا- ایسے تمام واقعات کے بعد امرا کا طبقہ اپنی اصل ہیئت میں بلندی پر پہنچ جاتا ہے' جبکہ اس کے مقابلے میں مذہبی پیشوا اور فلسفی ایسے عمل سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں-

جب کوئی ثقافت اپنی بلندیوں پر پہنچ جاتی ہے' تو یہ دونوں بنیادی رجحانات بالکل علیحدہ علیحدہ ہو جاتے ہیں اور دونوں کے درمیان نفرت اور دشمنی پیدا ہو جاتی ہے - اس مخالفت کی تاریخ بھی عالمی تاریخ سے مختلف نہیں ہوتی- اختیارات اور طاقت کے احساس کے بعد فتح' سیاست اور قانون وجود میں آتے ہیں' اور مال غنیمت کے بعد تجارت' معیشت اور زر کے تصورات ابھرتے ہیں- قانون طاقت ور کی جائیداد ہے- ان کا قانون ہی سب کا قانون ہوتا ہے- حصول کے لیے زر سب سے زبردست ہتھیار رہے- اس کے سامنے دنیا جھک جاتی ہے- معاشیات ایسی ریاست کو پسند کرتی اور چاہتی ہے جو اس کی غلامی قبول کر لے- سیاست یہ چاہتی ہے کہ معاشی حالت اس کی ضروریات ریاست کی شرائط کی پابندی کرے- ایڈم سمتھ اور فریڈرک لسٹ' سرمایہ داری اور اشتمالیت کے نظریات پیش کرتے ہیں- تمام ثقافتیں شروع ہی سے ایک جنگ اور تجارتی اشرافیہ کو میدان میں لاتی ہیں' پھر اس کے بعد زمینداری اور دولت کی خرافت کا تصور سامنے آتا ہے- پھر فوج اور معاشی اور جنگی اہتمام کی باری آتی ہے' اور پھر دولت کی قانون کے خلاف ناتمام جدوجہد شروع ہو جاتی ہے-

دوسری طرف بالکل اسی طرح مذہبی پیشوا اور علما کا طبقہ بھی ایک دوسرے سے الگ ہو گئے- اگرچہ دونوں واقعات کی بجائے صداقت کی تلاش کرتے ہیں- دونوں کا تعلق مانعات زندگی یعنی مکان سے ہے- قبل از مرگ خوف نہ صرف ہر مذہب میں بتایا جاتا ہے بلکہ اس کا تصور فلسفے اور سائنس بھی ہے- اسی وجہ سے دنیاداری میں سلسلہ علت و معلول کا آغاز ہوا' اور تقدیس کا تصور پس منظر میں چلا گیا- دنیا داری مذہب کے مقابلے میں ایک جدید تصور ہے - اس نے اب تک دنیائے علم کو اس لیے برداشت کیا ہے کہ وہ اس کی کنیز ہے- دور آخر کی تمام تنقید اس کی روح اور طریق کار و مقاصد سب دنیاداری کا تقاضا ہیں- دور آخر کی دینیات بھی اس سے مستثنیٰ نہیں' بہرحال تمام ثقافتوں کا علمی رجحان ہمیشہ ماضی کی مذہبی پیشوائیت کی طرف حرکت کرتا ہے ' جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ تضادات ہی اسی کی علت غائی ہیں- مگر اس کا انحصار ابتدائی تصورات ہی پر مبنی اور قائم ہے- لہٰذا کلاسیکی سائنس کا وجود محض ملکی معاشرتوں پر قائم تھا جو آرفیسی نوعیت کی تھیں مثلاً مائی لیس کا مدرسہ' فیثاغورثی معاشرت' کروٹون اور کوز کا مدرسہ طب' اتھنی اکادمی مدارس' پیری پاٹوس اور ستوآ ان سب کے رہنما قربان گاہوں کے پجاری اور نگران بھی تھے- روم کے مدارس سینائی اور پروکلیانی بھی اسی نوعیت کے تھے- ایک مقدس کتاب "القانون" سائنسی پہلو سے بلکہ ہر طرح سے عربی ہے---- بطلیموس کی سائنس قانون کی کتاب "المجلی" ہے- طب پر ابن سینا کی کتاب اور فلسفے پر اس کے رسالے ارسطو کی فکر کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں- مگر ان کی نوعیت اس قدر مصنوعی ہے ' اسی طرح (بالعموم تحریر میں نہیں آئے) قانون اور حوالہ جات کا طریق کار بھی' نیز ارتقائے فکر کی توضیح بھی ناقص ہے جامعات جو صومعات میں قائم تھیں (مدارس) جن میں طلبہ اور اساتذہ کے طعام و قیام اور لباس کا انتظام کیا جاتا تھا' اور ان کے رجحانات کے مطابق ان کی تربیت کا انتظام کیا جاتا تھا' یہ لوگ ایک برادری کی طرح مل جل کر رہتے تھے- مغربی دنیائے علم کے پاس کیتھولک کلیسا کا اپنا نظام تعلیم ہے اور یہ ان علاقوں میں بھی سرگرم عمل ہے' جہاں پروٹسٹنٹ مسلک کے افراد کی اکثریت ہے- رومی دور کے نظام تعلیم کے ساتھ مربوط سلسلہ انیسویں صدی کے مدارس کی صورت میں موجود ہے' بالخصوص ہیگل اور کانٹ کے مدارس جہاں فقہ کی تاریخ کی تعلیم دی جاتی تھی- انگلستان معدودے چند کالج اور جامعات اس سلسلے میں شامل نہیں' اور وہ مدارس جو فرانس کے ماؤر ٹسٹیوں اور بلونڈسٹوں نے ۱۶۵۰ء کے بعد قائم کیے تھے اور ان کا بڑا کارنامہ تاریخ کی سائنس کی تشکیل ہے - تمام خصوصی مہارت کی سائنسوں میں (جن میں طب اور درس والانوں کا فلسفہ بھی شامل ہیں)- وہ تمام سلسلے شامل ہیں جو مذہبی پیشواؤں کی تربیت گاہ' درجہ بندی' اور معززین کی مہارت خصوصی کے لیے ضروری ہیں- (سند فضیلت بطور فرمان عطا ہوتی ہے جو کو نسلوں کی طرف سے مذہبی رسوم کی صورت میں جاری کیے جاتے ہیں - ناآشنائے معارف کو جاہل سمجھا جاتا ہے جب کسی مذہبی گروہ میں یہ تصور پیدا ہو جائے کہ پیشوا کو ان کے درمیان رہائش رکھنا ضروری ہے تو اس کے لیے متعلقہ پیشوا کو خصوصی تربیت اور طبی علوم میں مہارت کی ضرورت ہوتی ہے- مثال کے طور پر ڈارون کے نظریات کا جواب انتہائی صبر سے دینا ضروری ہوتا ہے- ابتدا میں لاطینی ہی علمی زبان تھی مگر آج کل متعدد زبانوں میں تعلیم کا عمل پورا کیا جا سکتا ہے (مثلاً جوہری سائنس یا قانون معاہدات میں) جو بہت زیادہ مشہور و معروف نہیں- ماسوائے ان کے جو سند فضیلت حاصل کرنا چاہتے ہوں- بہت سے لوگ بعض دوسرے مدرسہ ہائے فکر کے سربراہ ہوتے

ہیں جیسا کہ کانٹ اور ہیگل کے شاگرد تھے۔ بعض مبلغین (مشنری) جگہ جگہ پھرتے رہتے ہیں۔ شوپنہار اور نطشے کی طرح کے راہب بھی ہوتے ہیں جنھوں نے اپنے اپنے مسالک ایجاد کیے۔ حکومتوں کے پاس کسی کے خلاف پابندی کا ہتھیار ہمیشہ موجود ہوتا ہے اور سائنس کے خلاف سازش کی نشاندہی کا اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ بعض اخلاقی حقائق ہوتے ہیں۔ (جیسا کہ مقاصد کو اشخاص اوراشیا میں تقسیم کر لیا جاتا ہے۔) اور بعض عقائد کا (مثلاً توانائی اور مادہ یا نظریات وراثت) بطور رسم حوالہ دیا جاتا ہے' یا کوئی قدیم تحریر پڑھ کر سنا دی جاتی ہے یا سائنسی انداز میں برکت کا اعلان کر دیا جاتا ہے

مغربی علما کے انداز میں (جو انیسویں صدی میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی اور صحیح مذہبی پیشوائیت کی نظیر قائم کر دی) اوردنیوی رہبانیت جو لاشعوری عذاب کی حال ہے۔ ایک حقارت آمیز روحانی افلاس اس لیے خریدا جاتا ہے کہ زندگی میں مالی آسائش حاصل ہو اور نہایت ہوشیاری سے دولت جمع کرلی جائے۔ ایسی پاکدامنی جس نے مجرد رہنے کی پابندی عائد کر دی' کانٹ اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔ جہاں تک اطاعت کا سوال ہے تو اس میں جان کی بازی بھی لگا دی جاتی ہے تاکہ اپنے مدرسہ فکر کی حفاظت کی جاسکے۔ مزید برآں اس میں دنیا سے بے گانگی کا رجحان نمایاں ہے' جو دنیا داری کی ایک روی صورت ہے' جس میں زندگی کی طرف سے لاپرواہی برتی جاتی ہے اورسعید معاشرے کی تشکیل سے اغماض کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی نئی ایجاد تو نہیں ہوتی پرانی اشیا کی صورت ہی کو بدل کر پیش کیا جاتا ہے۔ طبقہ شرفا آخری جوش و جنوں میں بھی جج' جاگیردار' سرکاری افسران آخری دم تک اپنی جائیداد اور اثاثہ جات کو قائم رکھنا چاہتے ہیں تاکہ ان کی عزت محفوظ رہے اور کسی حد تک اس کے ساتھ ساتھ ایک سائنسی شعور اور غیر منقطع تجارتی طریقہ کار بھی قائم رہے۔ یہ حقیقت کہ صاحبان علم وفضل روحانی دنیا سے دور ہو چکے ہیں اور اپنی خدمات کو (شاذ و نادر نہیں بلکہ ہمیشہ اور انتہائی ہوشیاری سے) حصول زر کے فن کے لیے استعمال کرتے ہیں اور یہ کہ دانشورانہ رجا و امید جس کے وجود کا ان شخصیت کی وساطت سے حوالہ دیا جاتا تھا' اب قصہ پارینہ ہو چکی ہے۔

المختصر ہم دیکھتے ہیں کہ اراضی میں ایسی فطری تعمیر و تشکیل موجود ہے جو اپنے ارتقا اور ہیئت میں ثقافت اسلوب حیات کی بنیادی راہ ہموار کرتی ہے' انقلاب کوئی خالص فیصلہ نہیں کرتا وہ صرف تبدیلی پیدا کرتا ہے' اور وہ بھی ایسی صورت میں جبکہ وہ صحیح معانی میں انقلاب ہو محض کس شخص یا گروہ کا ذاتی عزم نہ ہو یہ کبھی بھی کائناتی اہمیت کی صورت میں انسانی شعور میں داخل نہیں ہوتا' اور وہ اس کے عمل و فکر کو قبول نہیں کرتا ہے کیونکہ یہ انسانی خمیر میں موجود ہے کہ وہ محض اعداد و شمار کے کوائف کی بدیہی فہرست کی حیثیت اختیار کرنا نہیں چاہتا۔ خوبصورت نعرے انسان کو محض سطحی طور پر متوجہ کرتے ہیں اور وہ اسباب جو تاریخ کو ایسی صورت میں متاثر کرتے ہیں ان کے اثرات قرش ارض تک ہی محدود ہوتے ہیں' جو در حقیقت تشریحات کے غیر منقطع اور مسلسل عمل ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے طبقہ شرفا اور مذہبی پیشوائیت کھلی زمین ہی پر پیدا ہوتی ہے اور اس طرح اپنے وجود کے پیکر کا تعین کرتی ہے جس سے وجود محض اور وجود بیدار کا تعین ہوتا ہے' یہ زمان و مکان کے تصور سے ملتا جلتا تصور ہے۔ مال بنانے کی دو صورتیں

ہیں - مال غنیمت ' یا تحقیق کے نتیجے میں حاصل کردہ مال' اس کے نتیجے میں زریں علامتی قوت میں دو مختلف قوتیں وجود میں آ جاتی ہیں۔

جو شہری آبادی کے دور آخر میں غلبہ معاشیات اور سائنس کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ انہی دو لہروں میں قضا و قدر اور علت و معلول پر آخری حد تک فکر کی جاتی ہے جو پوری شدت سے غیر روایتی ہوتی ہے۔ ایسی قوتیں وجود میں آ جاتی ہیں' جنھیں قدیم تصورات' جرات آزمائی کی مہلک دشمنیوں اور رہبانیت سے الگ کر لیا جاتا ہے----- یہ قوتیں زر اور دانش ہیں' اوران کا مجموعی فکر ایسا ہی تعلق ہوتا ہے جیسا کہ کسی شہر کا کسی ملک سے۔ اس کے بعد املاک کو امارت اور عالی تصورات کو علم کے نام دے دیئے جاتے ہیں۔ ایک غیر محترم انجام اور دنیا داری پر مبنی علت و معلول' مگر سائنس اور طبقہ شرفا میں بھی تضاد موجود ہے۔ کیونکہ شرافت نہ تو کسی امر پر تحقیق کرتی ہے نہ کچھ ثابت کرتی ہے' بلکہ ہر شے کو بلا اعتراض قبول کر لیتی ہے۔ کیونکہ اس کا رویہ قصباتی ہوتا ہے' جسے طبقہ اشرافیہ بھی قبول نہیں کرتا' جبکہ اس کے ساتھ ساتھ مذہبی پیشوائیت کے احساس سے متضاد ہے۔اس کے نتیجے میں ناقد کی حیثیت گھریلو ملازم کی رہ جاتی ہے۔ معاشیات کا بھی اس ماحول میں ایک دشمن موجود رہتا ہے جسے اخلاقیات رہبانیت کہا جاتا ہے' جو حصول زر کے خلاف ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ حقیقی زرعی بنیادوں پر قائم معاشرہ اس سے نفرت کرتا ہے۔ تجار کا قدیم طبقہ بھی ایک طرح سے ختم ہو چکا ہے۔ (ہانس ٹاؤن' وینس' جینیوا) کیونکہ یہ اپنی روایات کے مطابق بڑے شہروں کی تجارت سے مقابلہ کرنے کی اہلیت سے محروم تھا' اور اس کی معاشیات اور سائنس خود بھی باہم مخالف ہیں۔ ایک دفعہ پھر حصول زر اور علم یا صرافہ اور کتب خانے میں اختلاف ظاہر ہونے لگا - تجارتی آزاد خیالی اور عقائد کی آزاد خیالی سے ہمیں عمل اور فکر کے شدید اختلاف کا پتہ چلتا ہے' قلعہ اور کلیسا اپنی اپنی الگ راہیں متعین کر لیتے ہیں۔ ہر ثقافت کی تشکیل میں کسی نہ کسی صورت میں عوامل کی یہ ترتیب موجود رہتی ہے۔ اس لیے تقابلی صوریات معاشرے میں موجود رہتی ہیں' جیسا کہ تاریخ کے دوسرے پہلوؤں میں بھی ان کا وجود قائم رہتا ہے

حقیقی جاگیرداروں یا زمینداری کے زمرے سے باہر نکل کر بھی کچھ پیشہ ورانہ گروہ موجود رہتے ہیں۔ یہ ہنرمندوں' سرکاری ملازموں' صناعوں اور مزدوروں پر مشتمل ہوتے ہیں' جنھوں نے اپنی اپنی تنظیمیں قائم کر رکھی ہیں۔ (مثلاً لوہاروں نے چین میں' خط کشوں نے مصر میں' اور موسیقاروں نے کلاسیکی دنیا میں) یہ تنظیمیں دور قدیم ہی سے قائم ہیں کیونکہ پیشہ ورانہ افتراق (جو کبھی کبھی اتنا شدید بھی ہو سکتا ہے کہ ایک دوسرے سے میل جول بھی قائم نہ رہ سکے) علیحدہ علیحدہ قبائل کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً حبشہ میں فلاشا اور ہندوستان میں منو کے قانون کے تحت شودروں کی طبقات کا نام لیا جاتا ہے۔ یہ امتیاز محض ان کی تیکنیکی مہارت پر مبنی ہے' اوراس لیے ان کے زمانی اور مکانی اثرات کا شاخسانہ نہیں۔ ان کی روایت محض ان کے فن سے متعلق ہے اور اس کا رواجی اخلاقیات سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ ان کے مخصوص ذاتی اخلاقی نظام سے اس کا کوئی واسطہ نہیں' جیسا کہ سائنس اور معاشیات میں پایا جاتا ہے۔

جج اور افسران بھی طبقہ شرفا ہی سے لیے جاتے ہیں۔ اس لیے بجائے خود ایک جماعت ہیں' افسران (عمال) کا تعلق ایک پیشے سے ہے اور یہ مذہبی پیشواؤں اور علما کی جماعت سے حاصل کیے جاتے ہیں' جبکہ صناع کا تعلق ان کے پیشے سے ہے احساس احترام' ضمیر وغیرہ کا تعلق معاشرتی مقام سے ہے' اور دوسری طرف کامیابی اور کامرانی سے ہے۔اس کی اپنی اہمیت ہے خواہ وہ کتنی بھی کم کیوں نہ ہو۔ ہر زمرے میں ایک طرف تو ان کی علامتی اہمیت ہوتی ہے اور دوسری سمت کچھ بھی نہیں ہوتا' اور اس کے نتیجے میں اجنبیت' بے قاعدگی اور اکثر تذلیل کی صورت ان کے ہمراہ پیوست رہتی ہے۔ مثال کے طور پر جلاد ایکٹر اور دربدر پھرنے والے گویئے یا کلاسیکی دور میں فنکاروں کی یہی کیفیت تھی' ان کی جماعتیں عام معاشرے سے علیحدہ ہوتی ہیں' یا معاشرے کے دوسرے طبقات سے تحفظ کی محتاج ہوتی ہیں۔(یا مائی سین کے سرپرست افراد)اور ایسی معاشرت میں موزونیت کی کوشش کرتے ہیں' جس کے لیے وہ موزوں نہیں ہوتے اور ان کی یہ کمزوری انھیں ایسے جنگی گروہوں میں منظم کر دیتی ہے۔ جو بالعموم قدیم شہروں میں ہر قسم کے جبلی اصولوں اور فنکارانہ اخلاق سے محروم اور بے راہرو ہوتے ہیں۔

۵

جاگیروں زمینداریوں یا طبقات کی تاریخ جو پیشہ ورانہ جماعتوں کے اصولوں کو نظرانداز کر دیتی ہے علامتی لحاظ سے اعلیٰ انسانی نوعیت کے ایسے عناصر کو روشناس کر دیتی ہے' جو نشوونمائے حیات کی علامت بن جاتے ہیں اور تاریخ ثقافت میں تکمیل کی جدوجہد کرتے ہیں۔

آغاز ہی سے حقیقی کسان کو ہمیشہ جدید سمجھا گیا ہے۔ کارولنگی دور میں' اور زار شاہی کے دور میں بھی' روس میں "میروں" کا طبقہ آزاد سمجھا جاتا تھا۔اور زراعت پیشہ بھی تھا ۔ مگر انھیں کسان نہیں کہا جاتا تھا۔ان دونوں علامات حیات کا احساس اس وقت بیدار ہوا جب کہ فرانی ڈانک کے " جیسی بیڈی اینٹ" ہمارے ذہن میں آئے کیا' ان کی زندگی کی نوعیت کو بھی جاگیر کہا جاسکتا ہے؟ یا صحیح معنوں میں زارعت کی ثقافت کی بنیاد تصور کیا جاسکتا ہے؟ جس کی وجہ ان قبائل کی زندگی کی جڑیں زمین میں پیوست ہیں' جبکہ جاگیردارانہ نظام نے ان کی محنت کا تمام ثمر اپنے قبضے میں لے لیا ہے' اور ان کو جنھوں نے یہ زمین آباد کی تھیں شمال میں دھکیل دیا۔ جہاں پر درختوں کے تنے اور شاخیں ان کی تاریخ کو نمایاں کرتی ہیں۔ کسانوں کے یہ طبقات نہ صرف یہ کہ شہری آبادی کو زمین سے حاصل کردہ توانائی بخش خوراک مہیا کرتے ہیں ' بلکہ خود اپنا خون بھی دیتے ہیں' کیونکہ صدیوں سے یہ خون دیہات سے شہروں کی طرف منتقل ہوتا رہا ہے' اور ان بلند پایہ انسانوں کی حیات کو قائم رکھتا رہا ہے۔ اس رشتے کو (شرفا کے نقطہ نظر کے مطابق) جاگیرداروں کی رعایا' آسامیاں یا غلام کہا جاتا ہے' اور ہم ایسے متعدد واقعات دیکھتے رہے' جو اس رشتے کی بدولت پیدا ہوتے ہیں' اور ہر معاملے میں جو سطحی اسباب گنوائے جاتے رہے ہیں' مغرب میں ۱۰۰۰ء سے لے کر ۱۴۰۰ء تک اور

دوسری ثقافتوں میں بھی اسی دور میں ایسے حالات نمایاں رہے ہیں۔ سپارٹا میں غلامی کا رواج اسی مزاج کا مظہر ہے' اور اسی نوعیت کا قدیم روی آسامیوں کا ادارہ تھا' جس میں سے کہ ۴۷۱ کے بعد دیہاتی عوام وجود میں آئے۔ اس کا مطلب ہے کہ ایک آزاد جنگ آزما طبقہ منظرعام پر آگیا فی الحقیقت یہی وہ لوگ تھے' جو آئندہ چل کر مشرقی روم میں قلب ماہیت کا سبب بنے' جس میں کہ آگستائن کا قائم کردہ ذات پات کا نظام (جو مجالس اعمان اور نوکر شاہی پر مشتمل تھا) اور ۳۰۰ء تک قائم رہا۔ ۱۳۰۰ کے قریب یہ نظام ان مجوسی علاقوں میں دوبارہ رائج ہوگیا جہاں جہاں کہ روی دور کی نوعیت کے حالات پیدا ہوچکے تھے۔ یہ حالات خاص طو پر ساسانی دور میں بہت نمایاں تھے۔ نوکر شاہی ہی میں سے ایک طبقہ جو اگرچہ قلت میں تھا۔ مگر انتہائی مہذب انتظامیہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ دیہاتی سردار اور قصباتی سیاستدان انھیں میں سے وجود میں آئے' جو عوام کے سامنے جوابدہ تھے' اور تمام افراد اور سامان کی برآمد کے ذمہ دار تھے۔ ایک قسم کا جاگیردارانہ نظام جو دور سابق میں مراجعت کر گیا' اور بتدریج ان لوگوں کی حیثیت کو وراثت میں تبدیل کر دیا گیا' یعنی یہ فرائض نسلاً" بعد نسل منتقل ہونے لگے' جیسا کہ مصر کے پانچویں خاندان کے دور میں تھا' اور چاؤ خاندان کی ابتدائی صدیوں میں بھی یہ رواج موجود تھا ۔ اور یورپ میں صلیبی جنگوں کے زمانے میں بھی یہ رواج پایا جاتا تھا۔ فوجی معاشرتی رتبہ افسروں اور سپاہیوں کے لیے یکساں تھا اور یکساں طور پر یہ ملازمت بھی وراثت ہی میں ملتی تھی اور جاگیرداروں کے لیے تو یہ ملازمت لازمی تھی اور باقی تمام کے لیے بھی دائیو قلیطس نے ایک قانون موضوعہ کے تحت لازمی بنا دی تھی۔ ہر فرد کی مجبوری تھی کہ وہ اس میں شمولیت اختیار کرے (فوجی لازمی بھرتی)' جیسا کہ روم اور مصر میں تھا۔ فوج کی ملازمت سب کے لیے لازمی تھی' مگر ماضی کی کلاسیکی غلامی کی معیشت کی روایت کے تحت جاگیردارانہ منظمہ کا رواج جاری ہوا۔ تمام چھوٹے کھیت نسلاً" منتقل ہونے لگے اور بڑی بڑی جاگیروں کو انتظامی اضلاع کا رتبہ مل گیا' اور جاگیردار اپنے علاقے کے محصولات اور اس کے ریکروٹوں کے کوٹے کا ذمہ دار تھا۔ ۲۵۰ اور ۳۰۰ کے درمیان آباد کار کسی اراضی کی حفاظت کا قانوناً پابند کر دیا گیا' اور اس وجہ سے مالک اور مزارع کے مابین بطور طبقات فرق پیدا ہوگیا۔ (طبقہ بمقابلہ طبقہ)

ہر نئی ثقافت میں طبقہ اشرافیہ اور پیشوائیت کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔ اس کا بظاہر استثنیٰ محض باقاعدہ روایت کا عدم وجود ہے۔ ہم آج یہ بھی جانتے ہیں کہ چین میں حقیقی پیشوائیت موجود تھی اور ہمیں اس احتمال کو بھی بدیہی طور پر تسلیم کرلینا چاہیے۔ آرفیسیوں کے دور آغاز میں (۱۱۰۰ ق م) بھی مذہبی ریاست قائم تھی۔ ہم نہایت وثوق سے کہہ سکتے ہیں کیونکہ ہمارے پاس کالچاس اور تائرتاس کے رزمیات کی شہادت موجود ہے۔ اسی طرح جاگیردارانہ دستور کے متعلق مصر کے تیسرے خاندان میں قدیم نوعیت کا نظام موجود تھا مگر ان جاگیروں کی ہیئت' وہ طریق جس کے مطابق انھوں نے یہ علاقے حاصل کیے اور پھر تاریخی دھارے کو اپنے حق میں موڑ لیا' اور اپنی قضا و قدر خود متعین کرلی' ان سب امور کا انحصار ان حالات اور پس منظر پر ہے' جو ہر ثقافت میں موجود تھا۔

طبقہ شرفا بالکل اشجار کی طرح زمین پر ہر طرف پھیل جاتا ہے جو کہ اس کی اصل جائیداد ہوتی ہے اور جس کے ساتھ یہ مضبوطی سے بندھا ہوا ہوتا ہے۔ ہر جگہ اس کے خاندان کی ابتدائی صورت موجود ہوتی ہے۔ اس کی نسلیں (جن میں صنف ثانی یعنی مستورات بھی مراد ہیں) اس سے اس کا عزم زمانی بھی ظاہر ہوتا ہے---- مدت سے مراد خون ہے------ جو کہ زمان اور تاریخ کی عظیم علامت ہے۔ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غلامانہ مزدوروں کی ریاست کی انتظامیہ ذاتی اعتماد پر قائم ہوتی۔ ہر جگہ چین میں' مصر میں' کلاسیکی اور مغربی دنیا میں ------ ہر جگہ پر اس کے حالات کی ایک ہی صورت ہے۔ سب سے پہلے نیم جاگیردارانہ عدالتیں قائم کی جاتی ہیں اور زعما کے دفتر مقرر کیے جاتے ہیں پھر زمین کے ساتھ وراثتی تعلق پیدا کیا جاتا ہے اور شجرہ نسب کی تشکیل کی نوبت بعد میں آتی ہے۔

فاؤستی ثقافت عزم لامتناہت کے اظہار کے لیے شجرہ ہائے نسب تشکیل پاتے ہیں۔ یہ صورت حال بظاہر عجیب وغریب معلوم ہوتی ہے' مگر یہ اس ثقافت کے ساتھ مخصوص ہے۔ مزید برآں یہ سرعت سے سرائیت کر جاتی ہے' اور تمام تاریخی صورتوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ تاریخی مزاج ہر شے کی قضا و قدر کا ادراک حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ ماضی میں اپنے خون کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ ہر ریاست اور صوبے کی آثار قدیمہ کے ذریعے توثیق چاہتا ہے' اور تاریخوں کی صحت کا ثبوت طلب کرتا ہے' اور مورثان اعلیٰ کی اولین سطح تک پہنچنا چاہتا ہے اور شجرہ نسب کا محتاط جائزہ لینا چاہتا ہے' اور جائیداد کی موجودہ صورت کی تصدیق کے لیے ایک ایک شادی کی تصدیق کرنا چاہتا ہے' خواہ پانچ سو سال قبل عمل میں آئی ہو۔ خالص خون کا تصور مساوات تولید اور غیر موزوں شادیوں کا پتہ لگانا چاہتا ہے۔ زمان میں یہ تمام سمتی عزم اور فاصلے سے متعلق ہے' اس کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں' ماسوائے مصری طبقہ شرفا کے مگر وہاں جو متوازی ہستیں وجود میں آئیں' بہت کمزور تھیں۔

اس کے بر خلاف کلاسیکی اسلوب کی شرافت کا تعلق دور حاضر کے یک جدی خاندان سے ہے' اور اس کے ساتھ ہی براہ راست اساطیری اصل کے ساتھ' جس کی کوئی تاریخی حقیقت نہیں' بلکہ محض ایک خواہش ہے۔ لطافت کے لحاظ سے تاریخی امکانات سے بعید تر اور اس مقام پر اور دور حاضر میں ایک اعلیٰ مرتبہ حاصل کرنے کی کوشش ہے۔ اسی بنیاد پر ہم بصورت دیگر پریشان کن حالات سے بچ سکتے ہیں۔ کسی فرد نے ایک ایسا شجرہ نسب پیش کیا' جس میں اس کی کئی نسلوں پہلے تھیسما اس اور ہر کلیز کے نام آتے ہیں۔ (ممکن ہے اس کے پاس کئی شجرہ ہائے نسب ہوں جیسا کہ سکندر اعظم کے پاس تھے) اور ازراہ تمسخر رومی یہ کرتے تھے کہ وہ بعض کونسلروں کے آبا و اجداد میں مشہور ناموں کا اضافہ کر دیتے تھے۔ رومی شرفا کی موت پر ان کے آبا و اجداد کے لاکھ اور موم سے تیار کردہ چہرے بنا دیتے۔ یہ صرف ناموں کی صوتی مشابہت کی بنا پر کیا جاتا۔ شجرہ نسب کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ روایت کلاسیکی طبقہ شرفا میں ایک عمومی رجحان کی صورت اختیار کر چکی تھی جو رومی ہیئت کے مطابق تشکیلی روحانی اور داخلی لحاظ سے ایڈوریا سے لے کر ایشیا کوچک تک یہی کیفیت تھی۔ اسی پر اس قوت کا انحصار تھا' جو طبقہ اشرافیہ کے امتیاز کا باعث تھی۔ آخری

دور کے آغاز میں بھی تمام شہروں میں بعض خاندانوں کے گروہ موجود تھے۔ (فلا نلائی' فرائٹرائی' گرائی بوس اور کیا کیا نعیں) جو محض زمانہ حال کے تعلقات کی بناپر اتحاد قائم کر لیتے۔ اور اسے مقدس نوعیت میں تبدیل کر لیتے مثال کے طور پر تین ڈورک اور چار آئی اونی' فیلائی اور تین اٹروسکی قبائل جن کا ذکر قدیم رومی قبائل کی حیثیت سے تاریخ میں آتا ہے' ٹائٹی اور رومی کہلاتے تھے۔ ویدوں میں باپ اور ماں اپنے حقوق کا مطالبہ صرف تین قریب کی اور تین دور کی نسلوں سے کر سکتے تھے تاکہ ان کی روح کی مغفرت کے لیے رسوم ادا کی جائیں ۔ بعدازاں انھیں ماضی کے حوالے کر دیا جاتا اور کلاسیکی ثقافت میں بھی روح کی ہندوستانی فاصلے سے دور تک رسائی نہ تھی' یہ چینیوں اور مصریوں کی آبا و اجداد کی پرستش سے بالکل مختلف معاملہ تھا۔ وہ ایک لا مختتم مفروضے کی صورت تھی اور اس طرح کسی کی وفات کے بعد بھی خاندان کی ترتیب میں کوئی فرق پیدا نہ ہوتا۔ چین کے زمانہ حال میں بھی کے اونگ نام کا ایک نواب رہتا ہے جو اپنے آپ کو کنفیوشس کی نسل سے کہتا ہے اور بیک وقت لاؤ تسے اور چانگ لو اور بعض دیگر افراد کی نسل سے بھی ہے' یہ متعدد شاخوں والے درخت کا معاملہ نہیں ہے بلکہ ایسے خط کا مسئلہ ہے جس کا آغاز متعدد نقاط سے ہوتا ہے۔ اگر ضروری سمجھا جائے تو متبنیٰ کی صورت بھی پیدا کی جا سکتی ہے (اور متبنیٰ شخص بھی اجداد سے نسبت قائم ہونے پر خاندان کا فرد اور وارث تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ زندگی میں کوئی بھی بے پناہ مسرت صدیوں کی مدت کے بعد عروج حاصل کرتی ہے۔ یہ سمت قضا و قدر اور نسل کا سراپا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس میں محبت کا بھی دخل ہوتا ہے کیونکہ عورت ہی تاریخ ہے اور جنگ کیونکہ جنگ سے تاریخ وجود میں آتی ہے' تاریخ ہی واقعات اور احساسات کے مسلمات مہیا کرتی ہے۔ شمالی یورپ کے بھاٹوں کی شاعری اور جنوبی غنائیہ شاعری' چین کی قدیم عشقیہ شاعری کے مطابق ہے جو شائی کز کے جرات آزما دور میں پائی یونگ کے علاقے میں گائی جاتی تھی۔ شریفانہ اطوار کی تربیت میں بھی یہ ہنر شامل تھا۔ ابتدائی کلاسیکی دور میں عوامی تیر اندازی کے اجتماعات میں ازغون بجایا جاتا تھا' جبکہ بازنطینی------ ایرانی اجتماعات میں ہومر کا انداز بہت مقبول تھا۔

اس کے برعکس آرنیسیوں کا معاشرہ ہے' وہ اپنی ثقافت کے تصور مکانی کا اظہار پیشوائیت کے اسلوب کے ذریعے کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ طریق اقلیدسی کلاسیکی توسیع کی خصوصیات کے مطابق تھا۔ انھیں اپنے قریب ترین مادی خدا کے ساتھ مکالمے میں کسی ترجمان کی ضرورت نہ ہوتی---- اس معاملے میں ظاہر ہے مذہبی پیشوا ہی یہ کردار ادا کرتے' مگر جب ان کے ذمے یہ فریضہ نہ رہا تو انھوں نے سرکاری عاملین کی ملازمت اختیار کر لی۔ بعینہٖ چینیوں نے بھی یہ محسوس کیا کہ خاندانی مذہبی پیشوا کاتب اور خرق عادت واقعات دکھانے والے پجاری' جنھیں صاحب اقتدار افراد اور سربراہان خاندان کے ساتھ مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لیے جانا ہوتا' انھیں الگ پیشے میں منظم کر دیا جائے۔ لیکن ہندوستان میں عالمی احساس نے ایک لامتناہی تصور پیدا کر لیا اور پجاریوں کی جماعت ملک کا دوسرا بڑا مقتدر گروہ بن گیا' جسے اس قدر اختیارات حاصل ہو گئے کہ وہ ہر قسم کے معاملات زندگی میں دخل دینے لگے اور وہ انسان اور دیوتاؤں میں واسطے کی حیثیت اختیار کر گئے۔ مجوسیوں میں عمق عالم میں پجاری یا تو راہب ہوتا ہے یا درویش اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کی ان صفات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے جبکہ دنیادار مذہبی پیشوا بہت جلد اپنی علامتی اہمیت کھو دیتا ہے۔

ان تمام کے برعکس فاؤستی پیشوائیت کے معاملات ہیں جو کسی مذہبی تقدس اور عظمت کے بغیر ۹۰۰ میں بنی نوع انسان (اجتماعی طور پر تمام انسانی مخلوق) اور کائنات کے مابین واسطے کی حیثت اختیار کر گئے اور اس طرح بعد ثالث کا مقام حاصل کر لیا' اور یوں انھوں نے تجرد کی زندگی کو خیرباد کہہ دیا' اور اس کی وجہ سے ان لوگوں نے پاپائیت سے اپنا ناطہ توڑ لیا' جو علامتی طور پر الوہیت کی صفات سے اس حد تک متصف ہوتا ہے جس قدر کہ کوئی انسان ہو سکتا ہے - اگرچہ پروٹسٹینوں نے پیشوائیت کا عمومی تصور پیش کیا مگر اس کے باوجود وہ پوپ کے مقام پر اثر انداز نہ ہو سکے' بلکہ انھوں نے پاپائیت کی مرکزیت کو ختم کر کے پاپائی صفات کو ہر عیسائی میں منتقل کر دیا۔

وجود اور وجود بیدار کا اختلاف جو کائنات کی ہر شے میں موجود ہے' لازماً" دونوں صاحب اقتدار طبقات کو ایک دوسرے کی مخالفت میں کھڑا کر دیتا ہے۔ زمان کی یہ خواہش ہوتی کہ وہ مکان پر قابض ہو کر اسے زیرِ نگیں کر لے۔ روحانی اور عالمی اقدار اپنی تشکیل اور رجحان میں اس قدر مختلف ہیں کہ ان کے مابین کوئی تفہیم یا تصفیہ ممکن معلوم نہیں ہوتا۔ مگر یہ اختلاف دنیا کی ہر ثقافت کی تاریخ کا حصہ نہیں بن سکا۔ چین میں اس سے تاؤ کا تصور پیدا ہوا کہ پیشوائیت کو خاندانی وجاہت پر حکمرانی نہیں کرنی چاہیے - ہندوستانی فلسفہ حیات میں مکان کا تصور لامتناہیت ' پیشوائیت کے اقتدار کا محتاج تھا۔ عربی ثقافت میں معاشرے میں موجود دنیا دار شرفا کو بھی اجماع میں شامل کر لیا گیا' اور اس طرح وہ دینی روحانی اور قانونی اجماع کا حصہ قرار پائے۔ اگرچہ ہر طبقے کی آزاد حیثیت بھی قائم رہی۔ علاوہ ازیں دونوں مقتدر طبقات میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ یہ دعویٰ درست نہیں' کیونکہ ساسانی سلطنت کے عہد میں خواتین کے طبقہ شرفا اور مجوسیوں کے فریق میں خونی فسادات ہوتے رہتے تھے۔ بعض حالات میں تو بادشاہوں کو بھی قتل کر دیا گیا۔ اور بازنطین میں تو تمام پانچویں صدی شاہی اقتدار اور مذہب کے پیشواؤں کے مابین جنگ میں گزر گئی اس کے پس منظر میں یک طبیعتی اور نسطوری عیسائیوں کے اختلافات کی شدت تھی مگر دونوں فرقوں کے بنیادی نظام پر کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا۔

کلاسیکی دنیا میں جو کائنات سے ہمیشہ گریزپا رہی' زمان کو صرف حال تک محدود کر دیا اور اس کی تمام وسعت مادی اجسام تک موجود تھی۔ اس سے عظیم علامتی ریاستیں اس قدر بے معنی ہو گئیں کہ ان کی آزادانہ حیثیت کا تصور ہی ختم ہو گیا۔ مصری نوع انسانی کی تاریخ میں' اس کے بخلاف پوری قوت سے زمان و مکان کی طرف جدوجہد کی تاریخ پائی جاتی ہے۔ فلاحین کے تمام دور میں دونوں مقتدر طبقات متواتر علامتی اور قابل شناخت حقوق کے حصول کی جدوجہد کا سراغ ملتا ہے - کیونکہ چوتھے اور پانچویں خاندان کے مابین عبوری دور میں معلوم ہوتا ہے' کہ مذہبی پیشواؤں کی جماعت نے دوسرے فریق پر فتح حاصل کر لی کیونکہ فرعون نے خود ہی دیوتا پر فوقیت اختیار کر لی' اور ری مذہب کی عبادت گاہیں' فرعونوں کے مقبروں کی عبادت گاہوں پر غالب آ گئیں اور یہ غلبہ فن تعمیر اور علامتی اظہار دونوں میں موجود تھا۔ عظیم قیصر کے بعد قائم

ہونے والی جدید سلطنت نے ایمن پیشوائیت کی سیاسی برتری کو تسلیم کر لیا۔ تھیس کے بعد دوبارہ راہب بادشاہ ایمانوفس چہارم (اخناطون) کا۔۔۔۔۔ جس میں بلاشبہ سیاسی اور مذہبی دونوں اقتدار جمع تھے۔۔۔۔۔ اس کے بعد مصر میں مذہبی اور سیاسی قوتوں کے مابین ایک ایسی طویل جنگ شروع ہو گئی اور مصر پر غیر ملکی تسلط تک جاری رہی۔

فاؤستی ثقافت میں یہ جنگ جو اعلیٰ علامتی مساوی قوتوں میں دوسری ثقافتوں کے مزاج کے مطابق ہی لڑی جارہی ہے۔ مگر اس مصری جنگ کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیجان موجود ہے۔اس کے نتیجے میں رومی عہد سے لے کر جنگ بندی تو ہوتی رہی ہے' مگر امن کبھی قائم نہیں ہوا۔ بلکہ کلیسا اور حکومت کے مابین امن کا امکان بھی کبھی پیدا نہیں ہوا مگر اس اختلاف میں شعور بیدار کے خلاف یہ رکاوٹ رہی ہے۔۔۔۔۔۔ کہ وہ وجود کے خلاف تمام مزاحمتوں سے آزاد ہو جائے ' مگر ایسا ہونا ممکن نہیں۔۔۔۔ ذہن کو خون کی ضرورت ہے' مگر خون کو ذہن کی ضرورت نہیں۔ جنگ زمان اور تاریخ کا حصہ ہے۔۔۔۔۔ ذہنی جنگ صرف استدلال سے لڑی جاتی ہے۔۔۔ صرف اختلاف تک محدود رہتی ہے۔۔۔ اس لیے اگر کوئی نبرد آزما کلیسا موجود ہے' تو اسے دنیائے صداقت سے نیچے اتر کر دنیائے واقعات میں شمولیت اختیار کر لینی چاہیے۔ اسے دنیائے یسوع کو ترک کر کے پائی لیٹ کے ساتھ ہو جانا چاہیے' اور اس طرح یہ نسلی تاریخ کا ایک عنصر بن سکتا ہے ' اور سیاسی پہلو میں موثر قوت کا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ قدیم جاگیردارانہ نظام سے لے کر جدید جمہوریت تک یہ تلوار' توپ' زہر اور چھرے سے لڑتا رہا ہے۔ اس میں رشوت اور بغاوت کے علاوہ وہ تمام اسلحہ شامل رہا ہے' جو ایسی صنعت میں متحارب فریق استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنے ایمان کی شرائط کو دنیا کے مفاد کے لیے قربان کر دیتا ہے' اور قدامت پسند ایمانی عقائد کے خلاف منکرین اور کفار سے اتحاد کر لیتا ہے۔ پاپائیت کی بطور تصور اپنی تاریخ ہے' لیکن چھٹی اور ساتویں صدی کی پاپائیت کا اس سے کوئی تعلق نہیں' کیونکہ شام اور یونان کے بازنطینی نائب المملکت اس ادارے پر چھائے ہوئے تھے' یا اس ادارے کا بعد کا ارتقا بطور طاقت ور مالکان اراضی اور بے شمار مزارعین یا روس کی قدیم روایت کے مطابق نسلی وراثت کے بل بوتے بننے والے مذہبی پیشوا۔۔۔۔۔ یا ایک قسم کی جاگیر جو بڑے خاندانوں کے قبضے میں چلی آ رہی تھی (کولونا' آرسینی - فرانجی پی) اور یہی لوگ اپنی اپنی مرضی کے باری باری پوپ مقرر کر لیتے تھے۔ یہاں تک کہ بالآخر مغربی جاگیردارانہ نظام غالب آ گیا' اور اس کے بعد رومی امرا نے بھی مقدس مقامات پر قبضہ ضروری سمجھا۔ چنانچہ ہر نئے پوپ کو جرمن یا فرانسیسی بادشاہوں کی طرح اپنی اسامیوں کے حقوق کا تحفظ کرنا پڑتا تھا۔۱۰۳۲ء میں ٹسکولوم کے شہزادوں نے ایک بارہ سالہ بچے کو پوپ مقرر کر دیا' یہ وہ دور تھا جس میں روم شہر کے اندر یا کھنڈرات آٹھ سو قلعوں کے مینار استادہ تھے۔ ۱۰۴۵ء میں تین مختلف پوپ ویٹیکن میں پوپ بنے بیٹھے تھے جن کے نام سانتا ماریہ' لیٹران اور میگینور تھے۔ ہر ایک کے دفاع کے لیے اس کے اپنے مددگار امرا موجود تھے۔

اب شہر کی اپنی روح درمیان میں حائل ہو گئی۔ پہلے اس نے دیہاتی آبادی کو اپنے ساتھ ملایا - پھر اس کے ساتھ مساوات قائم کی اور آخر میں اسے دبا کر ختم کر دیا' مگر اس ارتقا کے باعث ایک نوع کی نئی

زندگی وجود میں آئی اور جاگیرداریوں اور زمینداریوں کی تاریخ بھی مرتب ہوئی۔ ان چھوٹی چھوٹی آبادیوں کی وجہ سے ایک مجموعی روح وجود میں آئی جس میں یہ ادراک موجود تھا کہ داخلی زندگی خارجی عام سے اپنا علیحدہ وجود رکھتی ہے' اوراس کے نتیجے میں شخصی آزادی کے عمل کا آغاز ہو گیا' اوران حدود کے اندر زندگی نے زیادہ سے زیادہ نئے عوامل پیدا کیے۔ ایک تمنا پیدا ہو گئی کہ نئے شہر آباد کیے جائیں اورشہری زندگی اختیار کی جائے۔ یہی وجہ تھی' کوئی مادی حالات نہ تھے' جس کی بنا پر کلاسیکی عالم میں آباد کاری کا دور شروع ہوا۔ جو ابھی تک نئی شاخوں کی صورت میں ہمارے درمیان موجود ہے اور اپنی موجودہ حالت میں اس قابل نہیں کہ اسے آباد کاری کے عمل کا نام دیا جائے۔ کیونکہ یہ شہری آبادی کی تخلیقی صلاحیت تھی' جو دسویں صدی قبل مسیح سے (اور دوسری ہمعصر ثقافتوں میں بھی) اس جدید زندگی سے نسلا بعد نسل متاثر ہوتی رہی ہے۔ لیکن یہی اسباب تھے جن کی بنا پر بنی نوع انسان میں آزادی کا تصور پیدا ہوا۔ یہ تصور سیاسی (اور تجریدی تو قطعا نہیں) تصورات پر مبنی نہیں۔ مگر یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس نے اس حقیقت کو آشکار کیا کہ شہری زندگی نے اپنے ارضی تعلقات کو منقطع کر دیا ہے ' اور وہ رشتہ جو زندگی بھر سے قائم تھا' توڑ لیا ہے' اور دیہات اور شہروں میں ذہنی فاصلے پیدا ہو گئے ہیں ' اور اس طرح غور کریں تو آزادی کا تصور منفی عناصر کا بھی حامل ہے۔ یہ اپنا نقصان کر کے پھراس عمل کا دفاع کرتا ہے۔ اور انسان کو کسی ایسی شے سے آزاد کر لیتا ہے' جس کی اسے اپنی زندگی قائم رکھنے کے لیے ضرورت تھی۔ اس آزادی کا اظہار شہر کی صورت میں ہوتا ہے - شہر کی روح آزادی کے وجود کو سمجھتی ہے اور ہر شے کو ذہنی' معاشرتی اور قومی تحریکات کو تشکیل کرتی ہے جو دور آخر میں آزادی کے نام پر اپنی اصل کی طرف رہنمائی کرتی ہے' جس سے پتہ چلتا ہے کہ زمین سے تعلقات کا انقطاع اسلوب حیات کا ایک بہت بڑا واقعہ ہے جس نے انسانی زندگی کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔

مگر شہروں کے مقابلے میں شہر قدیم ہے۔ یہ پہلے پہل پیشہ ور لوگوں کو اپنی جانب کشش کرتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو جائیداد کی علامتی حد سے باہر ہوتے ہیں' اور جب شہروں میں منتقل ہوتے ہیں' تو اپنا اتحاد قائم کر لیتے ہیں اور پھر یہ خود ابتدائی نوعیت کی ذاتی جائیدادیں بنا لیتے ہیں۔ امرا کی اہلیت اپنے قلعے چھوڑ دیتی ہے۔ فرانسکی اپنے صومعات کو ترک کر کے دنیا کے نشیب و فراز کا سامنا کرتے ہیں' مگر اس کے باوجود داخلی طور پر کوئی خاص تبدیلی نہیں آتی۔ نہ صرف پوپ کا شہر روم بلکہ پورا اطالیہ قلعوں کے میناروں سے اٹا پڑا تھا جو سب مختلف خاندانوں کی نجی ملکیت تھے۔ انھوں نے اپنے مناقشات' قلعوں سے نکل کر گلیوں میں جنگ آزمائی کے ذریعے طے کرنے شروع دیئے - چودھویں صدی کے دوران کی ایک مشہور تصویر سینائی میں یہ مینار شہر بھر میں اس طرح نظر آتے ہیں گویا یہ کارخانون کی چمنیاں ہوں - جہاں تک نشاۃ ثانیہ کے عہد کے فلورنس محل کا تعلق ہے' جیسا کہ اس کی داخلی خوشگوار زندگی کے ماحول کا تعلق ہے' تو یہ صوبائی درباروں کا جانشین معلوم ہوتا ہے۔ اس میں ایک خستہ پیش منظر موجود ہے' اس کے باہر مگر اسی کے حصے کی صورت میں ایسے رومی قلعے موجود ہیں جو حال تک جرمن اور فرانسیسی پہاڑیوں پر تعمیر کرتے ہیں۔ نئی زندگی کے قدیم سے منقطع ہونے کا عمل آہستہ روی سے جاری رہا۔ ۱۲۵۰ء اور ۱۴۵۰ء کے مابین' تمام مغرب میں نقل مکانی کر کے آنے والے خاندان اتحاد قائم کر لیتے اور کسی ایک مقام پر جمع ہو جاتے اور اس طرح

وہ اپنے آپ کو روحانی اور دیگر معاملات میں باقی آبادی سے منقطع کر لیتے اوز اس طرح ملک کے طبقہ شرفا سے ان کا کوئی تعلق باقی نہ رہتا۔ قدیم چین ' مصر اور باز نطین کی سلطنت میں بھی بعینہ یہی حالت تھی ہم اس حقیقت کی روشنی میں قدیم شہری جماعتوں کو سمجھ سکتے ہیں (مثلاً" اٹروسکیوں اور شاید رومیوں کو بھی) اور مضافاتی شہروں کے مادر شہر سے تعلقات کا بھی اسی سے اندازہ ہوتا ہے۔ واقعات کا انعقاد' صرف شہروں ہی میں نہیں ہوتا تھا' بلکہ ان میں شامل بعض گروہی اور قبائلی بستیاں بھی ملوث ہوتیں۔ اصل بڑے شہر طبقہ شرفا کے ہم معنی تھے۔ روم کی بھی ۱۷۴ھ تک یہی حالت تھی۔ علاوہ ازیں سپارٹا اور ایڑوسکان بھی اس سے مختلف نہ تھے۔ اتحاد الملل نے اسی عمل سے نشوونما پائی اور شہری ریاستیں قائم ہونے لگیں مگر یہاں بھی جیسا کہ دوسری ثقافتوں میں ہوتا ہے۔ شہری آبادی اور دیہات کی آبادی میں اختلافات موجود تھے۔ آغاز میں تو یہ اختلاف انتہائی غیر اہم تھے۔ اس کے مقابلے میں طبقہ شرفا اور باقی ماندہ آبادی میں موجود اختلافات بہت شدید تھے۔

صحیح قصباتی زندگی کا آغاز اس وقت ہوتا ہے ' جب کہ قصباتی اور دیہاتی زندگی میں بنیادی اختلافات کی وجہ سے خاندانوں اوراتحادوں کا آپس میں اشتراک پیدا ہو جاتا ہے' حالانکہ ان کے مابین فسادات کی متعدد وجوہات بھی موجود رہتی ہیں۔ مگر طبقہ شرفا جاگیردارنہ نظام کے خلاف بالعموم اور کلیسا کی جاگیردارانہ حیثیت کے خلاف بالخصوص ان کا اتحاد العمل برقرار رہتاہے - تیسری قوت کا تصور(۱۷۸۹ء کا مقبول نعرہ) باہمی متضاد عناصر کا مجموعہ ہے ' جواثباتی عوامل سے عاری ہے' نہ تو اس کے اپنے کوئی مروجہ اخلاقیات ہیں۔ کیونکہ بورژوا کے اعلیٰ طبقے نے شرفا کے معاشرے کی مخالفت شروع کر دی اور شہری آبادی قدیم پیشوائیت کے خلاف ہو گئی----- ان کا اپنا کوئی علامتی نظام بھی نہ تھا----- کیونکہ یہ تصور ہی کہ زندگی عملی مقاصد کے لیے نہیں----- بلکہ زمان و مکان کے مسلسل اظہار کا ذریعہ ہے اور صرف اسی قدراحترام کی حامل ہے جس قدر کہ زمان و مکان کی طرف سے اسے حاصل ہوسکے اوراس لحاظ سے یہ شہری ماحول میں قابل شمولیت نہیں۔ یہ استدلال دور آخر کے تمام ادب میں بھرا پڑا ہے اور جوں جوں شہروں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے شہری ریاستوں کی تعداد بھی بڑھتی جاتی ہے ' شروع میں تو یہ عمل محض نظریاتی معلوم ہوتا ہے مگر آخر کار جب عقلیت کا ہر جگہ عمل دخل ہونے لگتا ہے' بلکہ عملاً" کشت و خون پر مبنی انقلاب آ جاتا ہے۔ طبقہ شرفا اور پیشوا جو ابھی تک موجود ہیں بظاہر مراعات یافتہ طبقات معلوم ہوتے ہیں اس کی اہمیت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنی اراضی پر قبضہ تاریخی بنیادوں پر اپنا حق سمجھتے ہیں (ان کا یہ مطالبہ غیر محدود معقولیت یا" قانون فطرت" کے مطابق ہے) جو کہ انتہائی غیر معقول مطالبہ ہے۔ اب انھوں نے اپنا مرکز دارالحکومت میں قائم کر لیا ہے۔ (یہ تصور بھی دور آخر میں پیدا ہوا) اور یہ زمانہ حال ہی کی اپج ہے کہ خاندانی شرفانے اپنے آپ کو متکبراور خوش وضع طبقات میں تقسیم کر لیا' جیسا کہ ہمیں رینالڈز اور لارنس کی تصاویر میں نظر آتا ہے۔ اس کے مخالف شہر کی نئی معیشت اور سائنس کی قوت نظر آتی ہے جو کہ صناعوں کی جمعیت' عمال اور محنت کشوں کے اتحاد کے باعث اپنے آپ کو ایک فریق سمجھتے ہیں۔ ان میں متعدد اور مختلف نوعیت کے گروہ شامل ہوتے ہیں مگر جب بھی جنگ آزادی کے لیے بلایا جائے تو یہ مضبوطی سے یکجا ہو کر قدم جما لیتے ہیں - ان کا مقصد

شہروں کے لیے آزادی کا حصول ہے جو کہ طویل مدت سے حقوق کی علامت سمجھا جاتا ہے - تیسری ریاست پر مشتمل ہونے کے باعث جو کہ سرشاری پر مبنی ہوتی ہے' جس میں کسی کے رتبے کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا' ان کو مکمل اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ ہر ثقافت کے آخری دور میں کسی نہ کسی نوعیت کی آزاد خیالی----- جس سے مراد' غیر شہری زندگی کی داخلی قوتیں ہیں۔ معیشت کو یہ آزادی ملتی ہے کہ جتنا چاہے پیسہ بنالے اور سائنس کو یہ آزادی مل جاتی ہے کہ وہ جس قدر چاہے تنقید کر لے----- چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر فیصلے میں ذہین طبقات اپنی کتابوں اور مجلسوں کے ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ وہ اپنا نعرہ (جمہوریت) اور روپیہ بنانے کو مفاد (دولت شاہی) سمجھتے ہیں۔ تصورات کی بجائے پیسہ ہی ہمیشہ فتح یاب ہوتا ہے 'مگر یہ متعفنت صداقت اور حقائق کی مخالفت کا ثمر ہے اور یہ اس کی وہ صورت ہے جس کی تشکیل شہری زندگی میں ہوتی ہے-

مزید برآں یہ اس احتجاج کا بھی نتیجہ ہے جو اراضی سے متعلق زندگی کی علامت ہے۔ شہر پیدائشی برتری کے خلاف ہے اور اس کے بجائے دولت کو معیار شرافت اور ذہانت کو معیار برتری تسلیم کرنے کا اصول تسلیم کرنے کے لیے صاف صاف مطالبہ تو نہیں کیا جاتا مگر عملاً اس کا نفاذ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں بلکہ وہ محض آنکھوں کا دھوکا ہے' جس پر کوئی اعتماد نہیں کر سکتا ہے - ہر ثقافت کے دور آخر میں قدیم طبقہ شرفا ظاہر ہو جاتا ہے--- جس میں کہ تاریخ کا ایک بڑا حصہ (مثلاً صلیبی جنگیں یا نارمنوں کی فتوحات) باقی رہ جاتا ہے جو اس عہد کی ہیئت اور رفتار کو ظاہر کرتا ہے' مگر اکثر یہ داخلی طور پر خستگی اور کہنہ سالی کا شکار ہو کر گل سڑ جاتا ہے اور بڑے درباروں تک نہیں پہنچتا اور نہ ہی اس کی حیثیت ایک حقیقی نئی فصل کی ہوتی ہے۔ یہ چوتھی صدی قبل مسیح کا واقعہ ہے کہ عظیم پلیبی خاندان رومی مجلس میں شامل ہو گئے' اور انھوں نے شرفا کے ایک ایسے طبقے کی تشکیل کی جن کے قبضے میں اپنی اراضی تھی۔ مگر وہ سرکاری عہدوں پر بھی فائز ہو سکتے تھے۔ اسی دور میں روم میں پاپائیت کے زیر اثر ایک نام نہاد طبقہ شرفا وجود میں آیا جس کی بنیاد صرف اقربا پروری پر تھی۔ اگرچہ یہ تین سو سال تک اقتدار میں رہے' ان کی تعداد پچاس خاندانوں سے تجاوز نہ کر سکی۔ امریکی اتحاد کی جنوبی ریاستوں میں بارونق کے دور کے بعد زراعت پیشہ طبقہ شرفا جسے شمال میں ۶۵- ۱۸۶۱ء کی داخلی جنگ میں ختم کر دیا گیا تھا' دوبارہ عروج میں آ گئی۔ قدیم تاجروں کا طبقہ شرفا جو پیکر' ویلسر اور میڈیسی اور عظیم وینسی اور جینوائی خاندان' جو اسی نوعیت کے تھے' عملی طور پر تمام کلاسیکی شہروں میں پھیل گئے ہوں گے' جن کی تعداد ۸۰۰ کے قریب تھی اور یقیناً" وہ اپنے آپ کو طبقہ شرفا ہی سمجھتے ہوں گے - نسل' روایت' اعلیٰ معیار اور فطری ا یکجہت ایسے ارضی تعلقات کو حصول اراضی کے بعد دوبارہ قائم کر دیتے ہیں (اگرچہ شہر میں ایک پرانا گھر کم اہمیت کا حامل نہ تھا) مگر شہری آبادی کے ہاتھ میں جب دولت آئی تو انھوں نے زمین حاصل کر کے خاندانی بلند مرتبے کو حاصل کرنا چاہا اور انھیں کا شتکاری کا چسکا پڑ گیا۔ روم میں پہلی پیونی جنگ کے بعد اور فرانس میں لوئیس چہاردہم - کے عہد میں جس نے اس ادارے کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا اور اسے غلط راستے پر ڈال دیا' جبکہ دانشور طبقہ اشرافیہ جو دور روشن خیالی سے متعلق تھا۔ نفرت سے اس پر غالب آ گیا۔ کنفیوشس کے شاگردوں' قدیم چینی تصور سپائی طبقہ اشرافیہ کی اخلاقیات سے حاصل کیا اور پائی یانگ کی تشکیل کی جو ذہانت کی خوبیوں

کی علامت تھی۔ اس کا مرکزی خیال انھوں نے سرداروں کے جنگی کھیل سے لیا اور اسے ذہنی مقابلے کی درس گاہ میں بدل دیا جسے آپ اٹھارھویں صدی کی اصلاح میں ورزش گاہ کا نام دے سکتے ہیں-

جب کبھی کوئی ثقافت اپنے آخری دور میں داخل ہوتی ہے- تو اس کی جاگیروں کی تاریخ بھی کم و بیش تشدد آمیز انداز میں ختم ہو جاتی ہے۔ محض یہ خواہش کہ غیر مستحکم زندگی بسر کی جائے' لازمی ثقافتی علامت کے طور پر پھیل جاتی ہے' مگر اس حالت میں شہری آبادی نہ تو اس حقیقت کو سمجھتی ہے اور نہ برداشت کرتی ہے۔ روپیہ پیسہ ارضی غیر منقولہ اقدار کو بالکل ختم کر دیتا ہے اور سائنسی تنقید ہر قسم کے تقدس کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ ایسی ہی ایک اور فتح کسانوں کی آزادی ہے' وہ بیگار کی زحمت سے بچ جاتا ہے مگر اسے دولت کی قوت کے حوالے کر دیا جاتا ہے' جو زمین' جائیداد منقولہ میں تبدیل کرنے کے عمل کا آغاز کر دیتی ہے---- ہمارے معاملے میں یہ اٹھارھویں صدی میں ہوا۔ بازنطین میں یہ عمل تقریباً" ۷۴۰ء میں نوموس جیارجی کوس مقننہ لیوسوم (اس کے بعد آبادکاری کا عمل آہستہ آہستہ ختم ہو گیا)۔ روم میں یہ عمل ادنیٰ طبقے کی تشکیل کے ساتھ ۴۷۱ میں واقع ہوا۔ سپارٹا میں اسی زمانے میں پاؤسانیوں کی یہ کوشش ہیلوٹوں کی آزادی کے ساتھ ہی ختم ہو گئی -

عوام کو بطور تیسری قوت دستوری لحاظ سے تسلیم کر لیا گیا۔ ان کے نمائندگان کو معدلہ کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ سرکاری ملازم تو نہیں مگر قابل اعتماد لوگ ہوتے ہیں۔ انھیں تحفظ کی ضمانت حاصل ہوتی ہے(۳۱)۔ ۴۷۱ کی اصلاحات نے تین ائرونکی قبائل کو چار شہری قبائل سے تبدیل کر دیا۔ ممکن ہے کہ چار شہری قبائل سے مراد چار محلوں کی آبادی ہو(یہ واقعہ انتہائی فکر انگیز ہے)۔ بعض لوگوں نے اسے کسانوں کی آزادی سے تعبیر کیا ہے ' اور بعض نے اسے تجارتی طبقے کی تنظیم کا نام دیا ہے' مگر عوام کا بطور تیسری قوت کے قرار پانا بظاہر منفی تعین معلوم ہوتا ہے' کیونکہ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر شخص جو مالک اراضی نہ ہو' اس میں شامل ہے' نیز وہ بھی جسے مذہبی پیشواؤں کے طبقے سے کوئی تعلق نہ ہو۔ یہ تصویر اسی قدر مبہم ہے جیسا کہ فرانس میں 1798ء کے ٹائرایٹ کی تھی۔ صرف احتجاج ہی ان کو یکجا رکھ سکتا ہے' ان میں تجار' صناع' روزانہ کے مزدور اور کلرک شامل ہیں' کلاڈی کے جین عوام اور اعیان زادوں پر مشتمل تھے' یعنی ان میں بڑے بڑے زمیندار اور تیرانداز شامل تھے۔ (مثال کے طور پر کلاڈی مارسیلی) کلاسیکی شہری ریاستوں میں عوام سے مراد کسان تھے۔ مغرب کی بارونق ریاست میں قصباتی آبادی جب احتجاج کے لیے جمع ہوئی اور سب نے مل کر شہزادے کی مطلق العنانی اور جبر و استبداد کی شکایت کی' سیاست کے میدان سے باہر یعنی معاشرتی طور پر---- عوام بطور اکائی شرفا اور روسا دونوں طبقات سے علیحدہ تھے۔ اس لیے ان کا اپنا کوئی مسلمہ وجود نہ تھا مگر جب بھی کوئی مشکل معاملہ درپیش ہوا یہ لوگ اپنے اپنے الگ قبائل میں منقسم ہو جاتے اور یہ صورت ان کی دلچسپیوں کے طور پر نمایاں ہوتی۔ یہ ایک ایسے فریق کی کیفیت ہے' جس کا مطالبہ یہ ہے کہ اسے بھی شہری آبادیوں کی نوعیت کی آزادی دی جائے۔ یہ حقیقت زیادہ نمایاں انداز میں اس کامیابی سے حاصل ہوتی ہے جو رومی اراضی مالکان کو اس کے فوراً" بعد حاصل ہوئی۔ انھوں نے سولہ دیہاتی

قبائل کو اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ اپنے نام استعمال کرنے کی اجازت دی' اور بلا شرکت غیرے تمام ذرائع پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح ہر شے پر ان چار شہری قبائل کا قبضہ ہو گیا جو دولت اور ذہانت کے اجارہ دار تھے' اور اس وقت تک' جبکہ عظیم سامانی جنگیں لڑی گئیں (سکندر اعظم کے ہمعصر' اور نوعیت کے لحاظ سے انقلاب فرانس کی طرح)اور ان کے نتیجے میں لیکس ہور ٹیشیا کا خاتمہ ہو گیا یعنی ۲۸۷ ق م تک یہی صورت برقرار رہی جبکہ معاشرتی درجہ بندی کا تصور قانونی طور پر ختم کر دیا گیا اور علامتی ریاستوں کی تاریخ بھی ساتھ ہی ختم ہو گئی۔ عوام نے بھی اسی طرح روی مقبولیت حاصل کر لی جس طرح کہ ۱۷۸۹ میں تائرای ٹاٹ نے حاصل کی تھی اور اپنے آپ کو ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے تسلیم کرا لیا۔ اس دور سے آگے ہر ثقافت میں یہ امر بنیادی طور پر مختلف ہوتا ہے اور اسے معاشرتی اختلاف کا نام دے دیا جاتا ہے۔

دور عروج میں ہر جاگیر کی تاریخ' ابتدائی مفہوم میں اعلیٰ امکانات کی حامل نسل قرار پاتی ہے۔ مذہبی پیشوائیت اس کے مقابلے میں دیہات پر مشتمل ریاست تھی' جو کچھ طبقہ شرفا دعویٰ کرتا مذہبی پیشوا اس کو رد کر دیتے اور اس طرح وہ زندگی کا یہ پہلو عظیم علامتی صورت میں نمایاں کرتے۔

تیسری قوت جو داخلی اتحاد کے بغیر تھی فی الحقیقت کوئی جاگیر یا زمینداری نہ تھی بلکہ وہ اس عہد کی زندگی کی علامات کا ایک مخالف عکس تھا۔وہ ہر اس اختلاف کو مسترد کر دیتے جو معقولیت پر پورے نہ اترتے یا عملی طور پر مفید نہ ہوتے لیکن پھر بھی ان کا کوئی نہ کوئی مطلب ضرور ہوتا اور وہ بہت نمایاں ہوتا۔ شہری زندگی بہت نمایاں حیثیت سے ایک نوعیت کی جاگیر ہی ہے۔ اگرچہ وہ دیہاتی تصور جاگیر سے مختلف ہے' اس میں ضبطی کی بجائے آزادی لازمی شرط ہے مگر جب اسے اس کے اپنے میدان کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ کسی طور بھی غیر قسم بند ماتحتی نہیں' جیسا کہ بادی النظر میں اسے ابتدائی جاگیر کی صورت میں سمجھا جاتا ہے۔بورژوائی طبقے کی اپنی معینہ حدود ہیں ان کا تعلق ثقافت سے ہے۔یہ ہر اس شے کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے جو اس کے نام منسوب کی جاتی ہیں اور عوام الناس کے نام پر کثرت آبادی کے علاقے' مظاہرے احتجاجات اور مذہبی پیشوائیت' زرنقد اور ذہن' ہنرمند اور دیہاڑی دار مزدور ہر نوع اس میں شامل ہوتی ہے۔

جب کوئی تہذیب اپنا مظاہرہ کرنے لگتی ہے تو یہ تمام علامات بھی ظہور میں آجاتی ہیں اور یہی عناصر ہیں جن کو یہ اپنے تصور چوتھی ریاست کے حصول کے لیے تباہ کر دیتی ہے۔ انبوہ عوام جو ثقافت اور اس کی پختہ صورتوں کو مکمل رد کر دیتا ہے۔ یہ اپنی بے ہیئتی کی بنیاد پر ہر ہیئت سے نفرت کرتی ہے۔ ہر درجے کی نمایاں حیثیت جاندار کی مترتب صورت' یا علم اس کو ان سب سے نفرت ہے' فی الحقیقت یہ بڑے شہروں کی خانہ بدوشی کی جدید صورت ہے' جس کے لیے کلاسیکی عالم کے وحشی اور غلام ہندوستان کے شودر اور ہر شے جس کا تعلق انسانی ذات سے ہے' جس سے کوئی غیر اختلافی شے فضا میں تیرتی ہوئی ظاہر ہوتی ہو' یہ تمام اشیا اس (تہذیب) کی ولادت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ اس کا کسی ماضی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور یہ کسی مستقبل کا عرفان نہیں رکھتی لہٰذا چوتھی ریاست سے مراد ایک ایسا اظہار ہے جس میں کہ تاریخ' لاتاریخ پر غلبہ پا لیتی ہے۔طبقہ عوام الناس (ثقافت کا) خاتمہ ہے اور انتہائی منفی عناصر کا ظہور-----

باب یازدہم

ریاست

(ب)

ریاست اور تاریخ

ا

عالم بطور تاریخ کے میدان میں' جہاں کہ ہم اپنے ادراک اور استدلال کے تانے بانے کے ساتھ مسلسل ایسی صورت میں بسراوقات کر رہے ہیں کہ ہمارا استدلال ہمارے احساسات کی اتباع کر رہا ہے' کائناتی رفتار سے اظہار ہوتا ہے کہ ہم جس شے کو حقیقت' اصل حیات اور وجود کی لہر کہتے ہیں وہ جسمانی ہیئت کے بغیر نہیں۔ ان کا مشترک نشان سمت ہے مگر ان کا ادراک مختلف انداز میں کیا جا سکتا ہے' جبکہ یہ حرکت میں ہوں یا ہم جس شے کا مشاہدہ کر رہے ہوں وہ اپنے مقام سے ہٹ جائے۔ اول الذکر پہلو کو ہم تاریخ کا نام دیتے ہیں اور ثانی الذکر کو خاندان' نسل یا ریاست یا عوام الناس کہتے ہیں مگر ایک کا وجود دوسرے پر منحصر ہوتا ہے۔ تاریخ کا وجود محض اس لیے قائم ہے کہ وہ کسی شئے کی تاریخ ہے' اگر ہم عظیم ثقافتوں کی تاریخ کا حوالہ دے رہے ہیں' تو پھر شے متحرکہ قوم ہوگی' ریاست' رتبہ' ذرائع کی کیفیت ہمارے پیش نظر ہوں گے' اور ہم اس صورت میں ریاست کے تصور سے آگاہ ہوتے ہیں' جب کہ وجود اپنی پوری رفتار سے حرکت کرتا ہوا گزر جاتا ہے' اور ہم پیچھے رہ جاتے ہیں' تو ہم ماضی کے حوالے سے اس کی ہیئت پر نگاہ ڈالتے ہیں اور یہ محسوس کرتے ہیں کہ کوئی شے وسعت پذیری کی وجہ سے لا زمانی صورت میں مستقل استادہ ہے' اور ہم سمت اور قضا و قدر کو بالکل نظرانداز کر دیتے ہیں۔ ریاست کا وجود یہی ہے جسے ہم قیام پذیر سمجھتے ہیں ۔ اور تاریخ وہ

شے ہے' جسے ہم متحرک شدہ ریاست کہتے ہیں' فی الحقیقت ریاست تاریخ کے وجود کی وحدت کی ایک قیاسی تعبیر ہے۔ صرف وہ ریاست ایک نظام ہے جسے کسی ماہر مفکر نے منصوبے کے تحت تشکیل کیا ہو۔

حرکت کی کوئی نہ کوئی صورت ہوتی ہے' اور شئے حرکت پذیر کو "ہیت پذیر" کہا جاتا ہے' یا بالحاظ دیگر "پوری قوت سے رفتار پذیر" گویا کہ وہ اپنی مکمل حالت میں ہے' یعنی وہ حالت جو دوڑ میں شامل ہونے والے گھوڑے یا کسی پہلوان کے لیے موزوں ہے' یا کسی فوج یا اس کے افراد کے لیے مقرر کی جاتی ہے۔ اس قوم کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی ہونا ضروری ہے' جو تاریخ کے ساتھ نبرد آزمائی کے لیے مستعد ہو۔ لیکن استدلال کی قوت سے اس کا ایک جزو ہی قابل ادراک ہوتا ہے۔ کوئی بھی حقیقی دستور' جب اس کا تنہا جائزہ لیا جائے اور بطور نظام کاغذ پر منتقل کر دیا جائے' تو اسے مکمل سمجھنا چاہیے۔ مگر غیر تحریر شدہ ناقابل بیان' عمومی نوعیت' کی محسوس کردہ بدیہی صورت خواہ وہ کسی بھی صورت میں ہو' اگرچہ کسی نظریہ کار نے اسے کبھی دیکھا تک نہ ہو' تو اس صورت میں ریاست کی تصویر کشی اور دستوری آثار اس کے ابتدائی خاکے کی بھی نشاندہی نہیں کرتے اور ہم اس حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں کہ اس کی آبادی کا اسلوب حیات کیا تھا جو فی الحقیقت کسی بھی ریاست کی ایک بنیادی ہیئت ہے۔ ہم کسی خطے کی تاریخی ہیئت کو مسخ کر دیتے ہیں اگر ہم اس کے تحریری دستور کے وجود پر اصرار کرتے ہیں۔

انفرادی طور پر جماعت یا خاندان سب سے چھوٹی اکائی ہے' اور دریائے تاریخ میں قوم سب سے بڑی وحدت ہے۔ ابتدائی بنی نوع انسان ایسی تحریک سے متاثر تھی جو تاریخی لحاظ سے اعلیٰ احساس کی پیداوار نہیں' ایسی حرکت یا تو ہلکی دلکی ہو گی یا پھر دوڑ' مگر اس کا کوئی نامیاتی کردار نہیں اور نہ ہی اس کی کوئی بڑی اہمیت ہے۔ بہر حال قدیم دور کا انسان ہر وقت متحرک رہتا تھا۔ فی الحقیقت یہ حرکت اتنی زیادہ تھی کہ بادی النظر میں اس کی کوئی ہیئت ہی نظر نہ آتی تھی اس کے برعکس فلاحین ایسی حرکت سے متاثر تھے جس کا وجود خارج میں تھا۔ اگرچہ اس تصادم کے ان کے لیے کوئی معانی نہ تھے۔ اول الذکر میں مائی سینی عہد کی ریاست بھی شامل ہے جو کہ تھینائی دور میں موجود تھی جو چین میں شانگ خاندان سے لے کرین کی نقل مکانی (1400) تک کا عہد تھا' اور شارلین میں یہ فرینکی حکومت تھی۔ یورچ تک ویزی گوتھک کی حکومت تھی اور پیٹری روس میں ---حکومتی انواع بکثرت اورادل رہی ہیں' مگر پھر بھی وہ اپنی علامات اور ضرورت سے محروم تھیں۔ آخری عہد رومیوں' چینیوں اور ایسی دوسری حکومتوں کا تھا' جن کی ہیئت میں کوئی قابل اظہار شے موجود نہ تھی۔

مگر ابتدائی انسان اور فلاحین کے مابین ایک عظیم ثقافت کی تاریخ موجود ہے۔ ایک ایسی قوم جو ثقافت کے اسلوب کے مطابق----- تاریخی قوم کہلانے کی مستحق ہے---- اور اس لحاظ سے اسے قوم کی اصطلاح کا بھی حق دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ ایک قوم جو اپنی زندہ حیثیت سے اشیا سے لڑتی رہی' اس نے ریاست کو نہ صرف شرائط حرکت سے حاصل کیا بلکہ (سب سے بڑھ کر) ایک تصور کے طور پر تشکیل دیا۔ ریاست اپنے

سادہ مفہوم میں اتنی ہی قدیم ہو گی جس قدر کہ انسان کو آزادانہ نقل و حرکت تفویض ہوئی۔ انتہائی ادنیٰ اقسام وانواع کے حیوانات کے گروہوں اور جھنڈوں کے پاس کسی نہ کسی قسم کا دستور موجود ہوتا ہے ---اور چیونٹیاں' شہد کی مکھیاں' کئی اقسام کی مچھلیاں اور نقل مکانی کرنے والے پرندے' اودبلاؤ ایسے شاندار طریق سے اپنے آپ کو منظم کرتے ہیں کہ ان کی تنظیم ہر لحاظ سے مکمل معلوم ہوتی ہے' مگر ریاست یا اس کے دو عظیم اسالیب زمینداری اور پیشوائیت قدیم زمانے سے چلے آ رہے ہیں۔ یہ ثقافت کے ساتھ ہی وجود میں آتے ہیں' اور اسی میں جذب ہو جاتے ہیں' خود ثقافت ہی ریاستی صورت میں قوم ہے۔

قوم بطور ریاست ایک متجانس خاندان کی صورت ہے جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سیاسی اور کائناتی تاریخ کا فرق عوامی اور نجی زندگی پر منحصر ہے۔ عوامی جائیداد اور نجی جائیداد۔ مزید برآں یہ دونوں تحفظ کی علامت ہیں عورت فی نفسہا عالمی تاریخ ہے۔ استقرار حمل اور ولادت کے عمل سے وہ خون کے تحفظ کا اہتمام کرتی ہے۔ ایک ماں اپنی چھاتی کے ساتھ بچے کو لپٹائے ہوئے کائناتی حیات کی بہت بڑی علامت ہے۔ اس لحاظ سے مرد اور عورت کی زندگی مناکحت کے بعد موزونیت کے دائرے میں آتی ہے۔ مرد بہرحال تاریخ سازی کا عمل کرتا ہے جو کہ حیات کے تحفظ کے لیے ایک لا مختتم جنگ ہے۔ ماتا کا تحفظ باپ کی شفقت کے ساتھ تکمیل کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ مرد اپنے اسلحہ کے ساتھ عزم لی البقا کی علامت ہے۔ ابتدا میں اقوام دست بدست جنگ کرتی ہیں جب معاشرت باہمی اتحاد سے ترقی کرتی ہے تو وہ اسلحہ کے استعمال کے لیے موزونیت اختیار کر لیتی ہے۔ ریاست مرد کا معاملہ ہے اس میں ہر شے کے تحفظ کا فریضہ شامل ہے (اس میں روحانی تحفظ کا پہلو یعنی عزت اور احترام ذات کو بھی شامل کیا جاتا ہے) حملوں کو روکنا' خطرات کو قبل از وقت محسوس کرنا اور سب سے بڑھ کر مثبت جارحیت جو ہر ایسی حیات کے لیے ایک فطری اور بدیہی امر ہے' جس نے اپنی نسل کے قیام و اضافے کا فریضہ انجام دینا ہو۔

اگر تمام حیات ایک متحدہ ندی کا وجود ہو تو الفاظ "قوم"' "ریاست"' "جنگ"' "حکمت عملی" کبھی بھی سنائی نہ دیتے۔ مگر حیات کی داخلی قوتیں جن کو ثقافت کی تخلیقی قوتیں شدت کے ساتھ اونچا لے جاتی ہیں' یہ ایک حقیقت ہے اور تاریخی لحاظ سے ہمارے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم اسے اس کے جملہ عواقب کے ساتھ درست تسلیم کر لیں۔ نباتاتی حیات صرف نباتاتی حیات ہے۔ حیوانی حیات اس سے اپنی صفات کے لحاظ سے مختلف ہے۔ طبقہ شرفا اور طبقہ پیشوائیت ایک دوسرے کی باہم تشریط کرتے ہیں اور ایک قوم دوسری اقوام کے مقابلے میں اسی طرح کا عمل اختیار کرتی ہے' اور اس حقیقت کا ہیولیٰ' فطری اور ناگزیر مخالفت کی بنا پر ہی ظہور میں آتا ہے' خواہ وہ حملے کی صورت میں یا دفاع کی صورت' دشمنی ہو یا جنگ۔ جنگ بہت سی عظیم اشیا کی تخلیق کرتی ہے' جو کچھ بھی ہو' زندگی کے بہاؤ میں با معنی ہے' وہ شکست یا فتح ہی کا نتیجہ ہے۔

ہر قوم اپنی صلاحیت کے مطابق تاریخ کو تشکیل کرتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کے دوران داخلی طور پر تاریخ کا

تجربہ کرتی ہے' جو اس کی تشریط میں شامل ہو جاتی ہے' اور محض اسی بنیاد پر اسے تخلیق کار کا مقام حاصل ہوتا ہے۔کوئی قوم بطور ریاست تمام واقعات کے پس منظر میں حقیقی قوت کی حیثیت اختیار کرتے ہیں۔ اس دنیا میں تاریخی لحاظ سے ان سے زیادہ اور کوئی عنصر نہیں فی الحقیقت بنی نوع انسان بحیثیت قوم خود ہی قضا و قدر ہے۔

عوامی معاملات' عوامی زندگی جو بنی نوع انسان کا بازوئے شمشیرزن ہے' ایک مخفی حقیقت ہے۔ اجنبی شخص محض انسان کو دیکھتا ہے مگر اس کے داخلی روابط سے بے خبر رہتا ہے۔ فی الحقیقت یہ امر دریائے حیات میں بہت عمیق ہوتا ہے اور اسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے' سمجھا نہیں جا سکتا۔ اسی طرح فی الحقیقت کو نہیں دیکھ سکتے' بلکہ بعض افراد کو دیکھتے ہیں' جن کے باہمی رشتوں کو ہم فی الواقع جانتے ہیں اوران سے ہمارا ذاتی تجربہ موجود ہوتا ہے' مگر ہر ایسی ذہنی تصویر میں ایسے اشخاص کا گروہ موجود رہتا ہے جن کا داخلی اور خارجی وجود بطور حقیقت حیات باہم مربوط ہوتا ہے۔یہ صورت جس کا تعلق حیات کے بہاؤ سے ہے' رواجی اخلاق کہلاتی ہے۔ جب وہ اپنی رفتار اور چال کے ساتھ رواں دواں ہوتی ہے اور شعور سے قبل غیر شعوری منزل میں موجود ہوتی ہے یعنی وہی رواجی اخلاق ہی بطور قانون پیش کیا جاتا ہے تاکہ اسے تسلیم کر لیا جائے۔

قانون----- قطع نظر اس امر کے یہ اپنا اختیار احساسات اور میجات سے حاصل کرتا ہے۔ (غیر تحریر کردہ قانون' رواجی قانون' انگلستان کی معدلت) اسے بذریعہ انعکاس رجعی جائزے سے حاصل کر کے ایک نظام کا حصہ بنا دیا جاتا ہے' اور اس غرض کے لیے اسے قانون موضوعہ کی صورت دی جاتی ہے---- یہی وجود کی عزمی ہیئت ہے۔ عدالتی حقائق جن کا اسے مقابلہ کرنا پڑتا ہے دو انواع کے ہیں' اگرچہ دونوں میں زمانی علامتی نظام موجود ہے۔ یہ اپنا تحفظ دو کیفیات میں کرتے ہیں "پیش بینی" اور "دوراندیشی"---- مگر شعور کی مقدار اور اوسط میں فرق کی وجہ سے جو کہ دونوں حالتوں میں پائی جاتی ہے' یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حقیقی تاریخ میں دو مختلف قانون ہوں گے۔ آبا و اجداد کا قانون' روایت' توارث' نمویافتہ اور آزمودہ قانون۔ مقدس اس لیے کہ یہ اتنا قدیم ہے کہ اس کی قدامت پسندی کی طوالت کسی کو معلوم نہیں۔ اسے خونی تجربے سے حاصل کیا جاتا ہے' اس لیے اس پر بھروسہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ غور و فکر اور منصوبہ بندی کے تحت استدلال پر اس کی بنیاد استوار کی گئی ہے اور اسے فطرت اور انسانی ضروریات کے مطابق تشکیل کیا گیا ہے۔ چونکہ اسے عمل انعکاس پر مرتب کیا گیا ہے اس لیے یہ ریاضی کا درجہ اول کا مُراد ہے۔ ایک ایسا قانون جو قابل عمل نہ ہو' مگر ہر لحاظ سے انصاف پر مبنی ہو' وہ قانون کے دو مختلف ناظروں سے متعلق ہوگا جن کا تعلق دیہاتی یا شہری زندگی سے ہے۔ تجربہ حیات اور تجربہ مطالعہ۔ یہ جب تک کہ اپنی پختگی حاصل کرے یہ انقلابی تلخی کی وجہ سے چکناچور ہوجاتا ہے' ایسی صورت میں قانون سازی کی بجائے دوسروں کے قانون وصول کرتا ہے۔یہ دوسروں سے حاصل کردہ قوانین ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

وہ قانون جسے معاشرہ خود مرتب کرتا ہے وہ ہر شخص کے ذمے ایک فرض عائد کرتا ہے لیکن یہ ہر رکن

معاشرہ کے اختیارات کے لیے کوئی ثبوت نہیں۔ یہ عوام کی قضا و قدر کا تکمیل ہے' فی الحقیقت وہی قانون ساز ہیں اور انھیں کے لیے قانون وضع کیے جاتے ہیں۔ قانون سازی کے بعض موضوعات ہیں اور بعض مقاصد۔ اگرچہ قانونی جواز میں ہر شخص فی نفسہ ایک مقصد یا شے ہے اور یہ حقیقت خاندانوں کی داخلی ضرورت' انجمنوں' جاگیروں' ریاستوں سب کے لیے یکساں ہے مگر ریاست کے لیے جو کہ تاریخی حقیقت کے مطابق سب سے بڑا قانونی موضوع ہے اس کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک خارجی قانون بھی ہوتا ہے جو غیر ممالک پر جنگ کے نتیجے میں نافذ کیا جاتا ہے۔ بالعموم دیوانی قانون پہلی نوعیت کا قانون ہے اور معاہدہ امن دوسرے زمرے میں آتا ہے۔ مگر ہر معاملے میں برتر قوت کا قانون کمزور قوت پر بھی عائد کر دیا جاتا ہے۔ حقوق کے حصول کے لیے طاقت کا مظاہرہ ضروری ہے۔ یہ ایک تاریخی حیقیقت ہے اور اس کی تصدیق ہر لمحے ہو جاتی ہے' مگر اسے صداقت کے میدان میں تسلیم نہیں کیا جاتا کیونکہ ایسی کوئی صورت اس دنیا میں موجود ہی نہیں۔ ان لوگوں کے تصور میں حقوق بھی دوسرے عوامل کی طرح وجود' وجود بیدار' قضا و قدر اور سلسلہ علت و معلول' اپنے مضمرات کے لحاظ سے ایک دوسرے کے خلاف کھڑے ہیں۔ حقیقی اور تصوراتی اخلاقیات خیر و شر اخلاقی حق و باطل کے معیار سے وابستہ ہیں۔ امتیاز صرف ان لوگوں میں ہے جو قانون بناتے ہیں اور وہ جن کے لیے قانون سازی کی جاتی ہے۔ انصاف کا ایک تجریدی تصور اذہان پر سوار ہے۔ یہ تحریریں صرف ان لوگوں کے لیے ہیں جن کی روح شریفانہ اور مضبوط ہے اور جن کا خون کمزور ہے۔ ان پر ہر مذہب اور ہر فلسفے کا جلد اثر ہو جاتا ہے مگر تاریخ صرف کامیابی سے آشنا ہے جو طاقت ور کے قانون کو سب کا قانون بنا دیتی ہے۔ محض تصورات پر یہ بغیر رحم کھائے چڑھ دوڑتی ہے اور اگر کبھی کوئی شخص یا قوت اس کے اختیارات کی خلاف ورزی کرے اور یہ چاہے کہ وہ حق پر رہے تو یقیناً اس کے تصورات اور نظریاتی شہرت کا چرچا دوسری دنیا میں ضرور ہوگا اور صداقت اس کا دعویٰ تسلیم کرے گی' مگر اسے جلد ہی اس قوت کا پتہ چل جائے گا جو اس دنیا کے حقائق قوت کو زیادہ بہتر سمجھتی ہے۔

جب تک کہ کوئی تاریخی قوت اپنی مشمولہ قوتوں پر اس قدر غالب ہے کہ جیسا کہ ریاست یا جاگیر اپنے اندر آباد پیشہ ور گروہوں اور خاندانوں پر غالب ہوتی ہے یا کسی خاندان کا سربراہ اپنے بچوں پر حاوی ہوتا ہے----- مبنی بر انصاف قانون کا امکان ایک تحفے کی صورت میں ہوسکتا ہے جو کہ کسی لاتعلق اور قوی ہاتھ سے کبھی وصول ہو جائے۔مگر ریاستیں کبھی کبھی اور بعض حالتوں میں کبھی بھی نہیں اس قدر کا اپنے اوپر غلبہ عائد نہیں کرتیں اور اس کے نتیجے میں زور آور کا قانون ہمیشہ فوری قوت سے نافذ ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ فاتح اور مفتوح کے مابین صلح نامہ یک طرفہ شرائط پر طے ہوتا ہے اور اس کی تشریح اور نفاذ کا عمل فاتح کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے اور داخلی اور خارجی حقوق میں یہی فرق ہے اور تاریخی وحدتوں میں اس کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ آغاز میں تو ایک موصی کی وصیت غیر جانبدارانہ اور مبنی بر انصاف ہوتی ہے اور موثر بھی ہوتی ہے۔ اگرچہ ہم کسی شے کی غیر جانبداری کے درجے کے متعلق اپنے آپ کو شدید دھوکے میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی طرف سے بھی یہ دھوکا ہو سکتا ہے' جو اپنے آپ کو انتہائی مہذب اور شریف کہتے ہیں۔ کیونکہ اس اصطلاح ہی سے صاف ظاہر ہے کہ ریاست کے قبضے میں وہ غالب قوت موجود ہے جو وہ

کسی پر بھی عائد کر سکتی ہیں۔ داخلی قوانین میں منطقی علت و معلول کا بہت خیال رکھا جاتا ہے اور صداقتوں کو زیرِ نظر رکھا جاتا ہے لیکن اسی وجہ سے ان کا نفاذ اس کے تخلیق کار کی قوت پر منحصر ہوتا ہے' ریاست ہو یا جاگیر اس اصول کا یکساں اطلاق ہوتا ہے۔ کوئی انقلاب جو اس قوت کو تباہ کردے۔ اس کے قوانین کو بھی تباہ کر سکتی ہے۔ یہ اصول ہمیشہ ہی درست رہتا ہے مگر حقیقت پر مبنی نہیں' خارجی قوانین بالخصوص صلح نامے کبھی بھی درست نہیں ہوتے مگر ہمیشہ حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں---- بلکہ افسوناک حد تک---- ایسے موقعوں پر کبھی ایسا بہانہ بھی نہیں کیا جاتا کہ انصاف کیا جا رہا ہے---- صرف اسی قدر کافی ہوتا ہے کہ انھیں نافذ کیا جاسکتا ہے۔ ان میں وہ زندگی بولتی ہے جس میں کوئی علت و معلول کی منطق نہیں ہوتی مگر نامیاتی لحاظ سے وہ زیادہ مستقل اور متواتر اور نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ کیونکہ اسے کسی استدال یا منطق کی زحمت گوارا نہیں ہوتی۔ اس کی رضا یہی ہے کہ وہ اس کا جواز ثابت کرے۔ اسے داخلی طور پر اس کا یقین ہوتا ہے کہ اسے کسی شے کی ضرورت ہے' اور اس کا مقصد کسی طرح پورا ہوسکتا ہے' اور اسی کی روشنی میں وہ اندازہ کرلیتی ہے کہ اسے اپنے لیے کس قانون کی ضرورت ہے اور دوسروں کے لیے کس نوعیت کا قانون درکار ہے۔ یہ منطق ہر خاندان اور بالخصوص قدیم کسان خاندانوں میں موجود ہوتا ہے۔ جب کبھی کوئی سربراہ خاندان اپنا اقتدار ضائع کر دیتا ہے اور اس کا مقام کوئی دوسرا شخص سنبھال لیتا ہے تو وہ یہ فیصلہ بھی کرتا ہے کہ کیفیت کیا ہے۔ یہ ہر ریاست میں ہوتا ہے' جونہی کوئی جماعت برسرِ اقتدار آتی ہے ہر جاگیردارانہ دور ایسے فسادات اور مقابلوں سے اٹا پڑا ہے' جس میں سرداروں اور مزارعوں کے مابین مقابلے ہوتے رہے ہیں' اور ہر شخص اپنا حق جتاتا رہا ہے۔ کلاسیکی دور میں یہ مجادلہ فوراً" ختم ہوگیا جب اولیں ریاست کو پورے علاقے پر غیر مشروط فتح حاصل ہوگئی' جس سے بادشاہی کا حق قانون سازی ختم ہوگیا' اور اسے اپنے حق قانون سازی کے تحت کر لیا گیا جیسا کہ آرکون کی ایتھنز میں اور ایفور کی سپارٹا میں ابتدا اور اہمیت میں کوئی شبہ نہیں' مگر مغربی میدان میں بھی ایسا ہی ہوا---- ایک لمحے کے دوران فرانس میں (ریاستی جرنیلوں کا ادارہ ۱۳۰۲) اور انگلستان میں ہمیشہ کے لیے جہاں پر کہ ۱۲۱۵ء میں سرداروں اور بلند پایہ مذہبی پیشواؤں نے منشور اعظم منظور کرا لیا' اور اس طرح وہ بیج کاشت کر دیا گیا' جس نے بعد میں پارلیمنٹ کے اختیار اعلیٰ کا تناور درخت پیدا کیا۔ اس طرح ریاستوں کے قدیم نارمن قانون کو ابدی زندگی نصیب ہوئی۔ اس کے بر خلاف جرمنی میں کمزور شاہی قوت کو مضبوط جاگیرداروں نے سختی سے دبا دیا' جنھیں جسٹائین کے رومی قانون کے تحت (یہ ایک ایسا قانون ہے جس کی رو سے مرکز کو لامحدود اختیارات تفویض کر دیے جاتے ہیں) بلایا گیا کہ وہ قدیم جرمن قوانین اراضی کے خلاف مدد مہیا کریں۔

ظالمانہ اور استبدانہ دستور جسے اولی گارتھا نے مرتب کیا' اس کی املا طبقہ شرفا نے بارہ میزوں کی انجمن منعقدہ روم کے مطابق کرائی۔ مگر اس وقت تک دور متاخر کی ثقافت کامیابی کی راہ پر گامزن تھی' اور شہر اور دولت کی قوت وجود میں آچکی تھی۔ اس لیے ان قوتوں کے خلاف عائد کردہ قوانین بہت جلد تیسری قوت کے قوانین کے ساتھ تبدیل کر دیے گئے (سولن دی ٹرائیونیٹ)' مگر یہ بھی حکومت کی طرف سے عائد کردہ قوانین تھے۔ یہ دو ابتدائی نوعیت کی درمیان جدوجہد تھی' کیونکہ مغربی تاریخ تمام کی تمام قانون سازی کے

اختیارات سے بھری پڑی ہے۔ آغاز ہی سے کلیسائی اور حکومتی لامذہبی قوانین کے مابین برتری کا شاخسانہ موجود تھا۔ یہ اختلاف (آج بھی حل نہیں ہوا) جو سول میرج کی وجہ سے وجود میں آیا اور اس معاملے میں دستوری ہدایات کیا ہیں ؟ یہ مسئلہ اٹھارھویں صدی کے اختتام تک حل نہیں ہوا۔ مگر ٹانزای ٹیٹ کے قبضے کے بعد (جو "سائیس" ۱۷۸۹ء میں دی گئی رائے کے مطابق ماسوائے اس کے اور کچھ نہ تھا "کہ جو چاہو کرو") اور ہر طبقے کے لیے قانون سازی کرو' اور انھیں اس کا پابند کرو۔ انھوں نے ایک ایسا قانون وضع کیا کہ جو قصباتی آبادی کے لیے ویسا ہی تھا جیسا کہ رومیوں کا وضع کردہ "قانون برائے شرفا" تھا۔ یہ حق جیسا کہ اپنی نمایاں حیثیت میں نظر آتا ہے' صرف طاقت کا مظاہرہ ہے (جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں)۔ ریاستوں کے مابین باہم معاہدات امن میں اور بین الاقوامی قانون میں "میرابیو" نے صرف یہ رائے دی کہ "یہ ایک زور آور کا قانون ہے' جو کمزور پر نافذ کردیا گیا ہے" عالمی تاریخ کے اکثر فیصلے اس نوعیت کے قوانین میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسا دستور ہے جس میں کہ ہنگامہ آرائی کی تاریخ اس قدر زیادہ طوالت پکڑ لیتی ہے کہ وہ دوبارہ مسلح جنگ کی صورت اختیار نہیں کرتی---- ابتدائی اور بنیادی امور جو ہر صلح نامے کے لیے ضروری ہیں اور اس کے دانش مندانہ تسلسل کا ذریعہ ہیں' ایسے عہد ناموں میں موجود نہیں ہوتے۔ اگر حکمت عملی سے مراد یہ ہے کہ اسلحہ کی بجائے دوسرے ذرائع سے جنگ جاری رکھی جائے تو یہ کامیاب فریق کی طرف سے استحصال کا ایک طریق ہے۔

۲

یہ تو اب واضح ہو چکا ہے کہ تاریخی عروج کے دور میں دو انواع حیات برتری کی دعوئی دار ہوتی ہیں ریاست اور جاگیر۔ دونوں اپنے مقام کے لحاظ سے داخلی کیفیت اور قوت کی علامت کی ندیاں ہیں۔ ان میں سے ہرایک اپنی قضا و قدر اور اجتماعی قدر وقیمت پر قابو اور دسترس حاصل کرنے کی خواہش مند ہے۔ اگر ہم اس معاملے کی تہ کو سمجھنے کی کوشش کریں تو ہمیں اپنے تصورات' متعلقہ قوم' معاشیات' معاشرے اور سیاست کو ایک طرف رکھنا ہو گا کیونکہ یہ امور ان واقعات کے معاشرتی اور سیاسی اختلافات کے واقعات کا باعث ہیں۔ معاشی اور سیاسی تصورات اس وقت تک علیحدگی اختیار نہیں کرتے تاوقتیکہ کسی عظیم ثقافت کا طلوع نہ ہو جائے یا یہ کہ جاگیردارانہ نظام ختم نہ ہو جائے اور جاگیرداروں کے مزارعین سے مراسم معاشرتی انداز نہ اختیار کر لیں اور بادشاہ اور عوام کے مراسم سیاسی صورت اختیار کرلیں' مگر قدیم دور کی معاشرتی قوت (طبقہ شعرا اور مذہبی پیشوا) ایسی فعالیت اختیار کرلے جس قدر کہ آخر الذکر (زر اور ذہن)----- اور پیشہ ور لوگ' عمال اور کارکن بھی وہ قوت حاصل کرلیں جو انھیں ابھرتے ہوئے شہروں میں حاصل تھی۔ ہرایک اپنے لیے جدو جہد کرتا ہے کہ وہ ریاستی تصورات کو اپنی جاگیر میں منتقل کرلے یا حسب معمول اپنی املاک کی بہتری کے لیے استعمال کرے' تو اس طرح وہ تمام ہموار سطح وجود میں آجاتی ہے' جس میں قومی وحدت اور انفرادی شعور میں اتحاد عمل پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر ایک اپنے مطالبات اور حدود کے لیے جدوجہد کرتا ہے اور حد سے افزوں معاملات میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک فریق اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ وہ دوسرے

کو اپنے زیرِ نگیں کرے' اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے

ہر حال میں یہ ریاست ہی کی ذمہ داری ہے کہ وہ بیرونی معاملات سے عہدہ برآ ہو' اس لیے بین الاقوامی تعلقات ہمیشہ سیاسی نوعیت کے ہوتے ہیں اور ان کا معاشرتی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس برخلاف داخلی سیاسیات میں جماعتی طبقہ بندی تمام معاملات پر حاوی رہتی ہے کہ پہلی نظر میں معاشرتی اور سیاسی طریقہ ہائے کار ایک دوسرے سے الگ محسوس نہیں ہوتے اور فی الحقیقت ان لوگوں کی سوچ کے مطابق جو (مثلاً بورژوا) صرف اپنی جماعت کے تصورات کو ہموار کرنا چاہتے ہیں' اور تاریخی حقائق کو بعینہٖ اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہتے ہیں' اس لیے وہ خارجی معاملات کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے۔بیرونی جنگوں کے لیے ریاست دوسری ریاستوں کے ساتھ اتحاد قائم کرنا چاہتی ہے۔چھٹی صدی میں مثال کے طور پر ٹائرانس نے اپنے ریاستی تصورات کو تیسری ریاست یعنی قدیم طبقہ امرا کی چند سری حکومت سے اتحاد پر محمول رکھا۔فرانسیسی انقلاب ٹائرز کی بدولت ممکن ہوا---- اس سے مراد دانش ور اور دولت مند طبقات ہیں---- اپنے مربی بادشاہ کو معیبت میں تنہا چھوڑ دیا' اور دوسری دو جاگیروں سے اتحاد کر لیا (۱۷۸۷) کی اسمبلی کے دوران)۔ اس لحاظ سے گویا ہم بالکل حق بجانب ہیں کہ ریاستی تاریخ کے ساتھ ساتھ طبقاتی تاریخ کا بھی امتیاز ضروری ہے سیاسی (افقی) اور سوشل (عمودی) تاریخ یا جنگ اور امن کی تاریخ کا فرق بھی لازمی ہے مگر جدید دور کے ماہرین اصول پرستی کی یہ سب سے بڑی غلطی ہے کہ وہ مقامی تاریخ کو بھی عمومی تاریخ ہی کا رنگ دے دیتے ہیں۔ عالم تاریخ اب بھی اور آئندہ بھی ریاستی تاریخ ہی رہے گی۔ ہر قوم کا داخلی دستور ہمیشہ ایسے حالات کو پیش نظر رکھتا ہے جو بیرونی جنگ (سفارتی' فوجی یا معاشی) میں پیش آسکتے ہیں' اور اگر کوئی شخص قومی دستور فی نفسہ خود کمتنی سمجھتا ہے' اور مذکورہ امور کا خیال نہیں رکھتا تو وہ اپنی قوم کو تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔ مگر دوسرے نقطہ نظر کے مطابق حکمرانوں کے مزاج کی داخلی سیاسی نبض (خواہ وہ پہلی یا چوتھی ریاستی قوت سے متعلق ہوں۔) کے ادارک پر منحصر ہے کہ وہ داخلی طبقاتی آویزشوں کا سدباب کس طرح کرتے ہیں' کیونکہ قومی مفادات اور تصورات جماعتی انتراقات سے وابستہ نہیں ہوتے اور نہ ہی کسی ملک کی مخالفت کو ترپ کے پتے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ریاست اور جاگیر اول اپنی جڑوں تک متجانس اور ہم اصل ہیں۔یہ محض زمانی حالات اور تحفظ کی حد تک ہی متجانس نہیں بلکہ نسلی اور نسبی لحاظ سے بھی ہم اصل ہیں۔ان کے خاندان ایک ہیں اور ان میں زراعت پیشہ ہونے کا اتحاد بھی موجود ہے۔(جس میں حتمی تجربے کے مطابق ہر ریاست اور ہر معزز طبقہ ان کی مدد کرتا ہے)نہ صرف اس وجہ سے کہ ان کے زمین سے گہرے تعلقات ہیں' بلکہ قبائلی میدان میں (یہ خواہ وراثت سے حاصل شدہ ہو یا مادر وطن کا عطیہ ہو) مجوسی اسلوب کی اقوام بھی اپنی اہمیت اس لیے کم کر دیتی ہیں' کہ اس صورت میں قدامت پسندی کا فخر بھی ہر دوسری شے پر غالب آ جاتا ہے۔مگر سب سے بڑھ کر تاریخی دنیا کے تمام حقائق میں اس کا عمل دخل قائم رہتا ہے ۔اس میں نبض' صحیح سفارت کاری' آبادی کے لیے انصاف' حکومت کا فن' قوت کی توسیع اور استحکام کا مردانہ عزم ضروری

ہیں ان کے بغیر قدیم زمانے میں بھی' جنگ کے دوران طبقہ شرفا اور طبقہ عوام میں علیحدگی پیدا ہو جاتی تھی اور بالآخر بہادری اور احترام ذات کے احساس پر ختم ہو جاتی۔ لہٰذا آخری دور تک ریاست اپنے اصولوں پر قائم رہتی ہے اور طبقہ شرفا اپنی روایات کے مطابق ملک کے متحدہ مقاصد کے لیے مستعد رہتا ہے جیسا کہ سپارٹا میں پیش آیا جب اس کا ایتھنز کے ساتھ موازنہ کیا گیا روم میں کارتھیج کے مقابلے میں اور تسین میں "تسوکی تاؤ" کے رنگ میں رنگی ہوئی ریاست میں پیش آیا۔

طبقہ شرفا کا امتیاز یہ ہے کہ یہ خود کمتنی ہے---- یا یوں سمجھیں کہ بذات خود ایک جاگیر ہے--- یہ اپنی قوم کی ماہیت کا اپنی ذات کے حوالے سے تجزیہ کرتا ہے' اور اپنی قوت کا اسی مفہوم میں استعمال کرنا چاہتا ہے۔جب کہ کسی ریاست کا سب سے اہم اصول یہ ہوتا ہے کہ وہ سب کو تحفظ فراہم کرتی ہے' اور طبقہ شرفا بھی پوری قوم کے ایک جزو ہی کی حیثیت سے اس تحفظ سے مستفید ہوتا ہے۔ مگر ایک طبقہ شرفا ریاست کے بعض فرائض کو اپنے ذمے ڈال لیتا ہے' جن میں سے فوج اور انتظامیہ کی ملازمت کو اپنا فرض اور استحقاق سمجھتا ہے اور اسی کو اپنا پیشہ بنا لیتا ہے۔

مگر جب ایسی صورت ہو کہ ریاستی تصورات اور کسی جاگیر کے تصورات میں اختلاف ہے تو اس کی صورت کسی حد تک مختلف ہوتی ہے۔تو گویا ایسی جاگیریں ریاست کے اندر ہونے کے باوجود ریاست کے لیے اجنبی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں' اور اس طرح ریاستی تصورات جو مروج کرنا چاہتے ہیں اور اپنی زندگیوں کی جو نہج متعین کرنا چاہتے ہیں' ان کا حقیقی تاریخ کی روح کی سیاسی قوت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا' کیونکہ ان کی زندگی اس کے دھارے میں پروان نہیں چڑھی ۔ لہٰذا فی الحقیقت ان کو شعوری طور پر معاشرت کا نام دیا جاتا ہے' جبکہ قدیم دور میں یہ صورت حال محض ایک تاریخی حقیقت سمجھی جاتی تھی' جو کلیسائی معاشرت کے اس لیے خلاف تھی کہ وہ اپنے مذہبی تصورات کے حصول میں کامیاب نہ ہو۔ ادوار آخر میں تجارتی اغراض اور آزاد معاشی زندگی اور بعض پر جوش افراد کے خیالی جنت کے تصورات' جو وہ محض تجریدی صورت ہی میں حاصل کر سکتے تھے' میدان میں آ جاتے۔

مگر تاریخی دنیا میں تصورات کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ صرف حقائق ہوتے ہیں صداقتوں کو یہاں کوئی کام نہیں صرف واقعات سے بحث ہوتی ہے۔ اس میں استدلال نہیں ہوتا' کوئی دیانت داری' کوئی نصف نہیں' کوئی حتمی مقصد نہیں 'بلکہ محض واقعات اور جو شخص اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا اسے سیاسیات پر کتب تصنیف کرنی چاہئیں لیکن خود سیاست کے میدان میں داخل نہیں ہونا چاہیے۔ حقیقی دنیا میں کوئی ملک تصورات پر قائم نہیں ہوتا مگر صرف وہ ریاستیں نشوونما حاصل کرتی ہیں' وہ صرف زندہ انسانوں کی ریاستیں ہوتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ ریاست ایسی ہیئت ہے جس میں زندگی اپنا اظہار کرتی ہے مگر زیادہ زور خون اور وجود پر دیا جاتا ہے جو کلی طور پر جبلی اور اضطراری نوعیت کے ہوتے ہیں اور جہاں تک ان کے اظہار کا تعلق ہے ' اگر ان کی رہنمائی کسی ماہر سیاستدان کے ہاتھ میں ہو' تو یہ اپنی سمت خون کی طرف متعین کر لیتے

ہیں' اور اگر یہ اپنے یقین کامل پر ہو---- تو دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا کوئی مقصد نہیں۔

مگر جہاں تک قضا و قدر کا سوال ہے تو ریاستوں کے لیے اس کا وجود حقیقی ہوتا ہے اور محض ذہنی منصوبہ بندی پر نہیں۔ یہ ان کی تصوراتی تشکیل یا ہیئت نہیں ہوتی بلکہ ان کے داخلی اقتدار کا مظہر ہوتی ہے اور جسے مادی ذرائع سے تادیر قائم نہیں رکھا جا سکتا' اس کا وجود محض اعتقاد پر قائم ہے--- دشمن اور دوست---- صرف اپنے تاثرات کے سہارے زندہ ہیں۔ فیصلہ کن مسائل نہ تو دستور سازی کے عمل میں ہوتے ہیں بلکہ ان کی ایسی حکومت میں مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں جو موثر طور پر اپنا فریضہ ادا کر رہی ہو۔ نہ صرف یہ کہ وہ سیاسی حقوق کو منصفانہ اصولوں کے تحت تقسیم کر رہی ہو (جو کہ اپنی تہہ میں محض ایک ایسا تصور ہیں کہ ہر جماعت خود اس کا مطالبہ کرتی ہے) بلکہ وہ پوری قوم کی بنض کا پورا شعور رکھتی ہے (اس مفہوم میں اثر آفریں کہ اپنے عضلات اور پٹھوں کا حسب ضرورت موثر استعمال کر سکے مثلاً جب ریس کا گھوڑا کامیابی کے نشان کے قریب ہو تو ہمت نہ ہارے)۔ یہ وہ موزونیت ہے جو ایک مضبوط ذہانت کو سر میں ہم آہنگ کر دیتی ہے۔ یہ صرف آخری مقام پر ہی نہیں ہوتا۔ دنیا کے ہر حصے میں اجنبی اخلاقیات کو رواج نہیں دیا جا سکتا' بلکہ استقلال' یقین' اور سیاسی رہنمائی کی برتری ہی کامیابی کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہ اشیا جس قدر زیادہ بدیہی ہوں گی' ان کے متعلق بحث ومناظرہ اسی قدر کم ہو گا۔ ریاست اگر پوری طرح سے بالغ اور پختہ ہوگی اس کا مقام اتنا ہی بلند ہو گا اور تاریخی وسعت بھی زیادہ ہوگی اور اس کے ساتھ قومی قضا و قدر کو بھی عروج ہو گا۔ ریاستی شان وشوکت اور آزادی اس کی زندگی کی اہم ترین علامات ہیں۔ یہ باشندگان اور مقاصد میں امتیاز کرتی ہیں سیاسی معاملات میں نہ صرف داخلی بلکہ (جو بہت زیادہ اہم ہے) خارجی تاریخ بھی مدنظر رہتی ہے۔ رہنمائی کی قوت ان دونوں عوامل کو علیحدہ علیحدہ زیر غور لاتی ہے۔ بلاشبہ سیاسی اتحاد میں زندہ قوت کی علامت ہے یہاں تک کہ موجود قوت کے پاش پاش ہو جانے کے بعد بھی (مثال کے طور پر دستوری تصورات کے مخالف فریق کے ہاتھوں) یہ ضروری نہیں کہ نتیجہ اسی صورت میں نکلے کہ نیا فریق ہی قانون سازی کی قوت حاصل کر لے۔ یہ ایسی صورت میں ہوتا ہے جبکہ تمام قوم ہی اجنبی قوتوں کی حکمت عملی کا شکار ہو جائے اور یہ بھی ممکن کہ صورت حال دائمی صورت اختیار کر لے۔

اس وجہ کے باعث ہر صحت مند ریاست کے لیے تحریری دستور کم اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے مقابلے میں زندہ دستور پر عمل کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ موزونیت (کھلاڑیوں کی اصطلاح کو دوبارہ استعمال کیا گیا ہے) جب زمانی تجربے سے خارج ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ قوم کی نسلی اوصاف سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ جب سیاسی جسم کی فطری قوت نے اپنے آپ کو مضبوط تر بنا لیا ہو تو غیر متوقع حالات میں بخوبی پیش بینی کر سکتا ہے۔ فی الحقیقت ایک حد تک اس امر کی کوئی اہمیت نہیں کہ سیاسی رہنما کو بادشاہ یا وزیر یا سیاسی جماعت کا رہنما کہا جائے۔ (جیسا کہ سیسل رہوڈز کے معاملے میں ہوا) کہ ریاست سے اس کا کوئی متعین رشتہ ہی نہ تھا۔

طبقہ شرفا جس نے تین پیونی جنگوں میں رومی سیاست کا انصرام کیا۔ جہاں تک دستور کا تعلق ہے ان کا کوئی قانونی وجود نہ تھا رہنمائی کی ذمہ داری صرف اس اقلیت کے ذمے ہوتی ہے۔ جس میں رہنمائی کی جبلت موجود ہو اور تاریخی جدوجہد میں باقی قوم کی نمائندگی کر سکے۔

اس لیے واضح اور متفقہ حقیقت یہ ہے کہ جماعتی ریاستیں---- یعنی وہ ریاستیں جن میں مخصوص جماعتوں کی حکمرانی ہو---- صرف وہی اصل ریاستیں ہیں۔ اسے ایسی جماعتی ریاستوں سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے جن پر بعض افراد نے قبضہ کر کے انھیں اپنی جاگیر بنا لیا ہو۔ جیسا کہ انگلستان اور سسلی کی قدیم شہری نارمن ریاستوں میں ہوا کرتا تھا۔ فرانس کے دستور ۱۷۹۱ء کی رو سے اور روس کے حالیہ دور میں بھی یہ صورت موجود ہے۔ صحیح معانی میں جماعتی ریاست وہ ہے جو جو عام تاریخی تجربے کی مظہر ہو۔ یہ ہمیشہ معاشرتی سطح واحد سطح ہوتی ہے اور دستور کے مطابق یا کسی اور طریق سے سیاسی رہنمائی مہیا کرتی ہے۔ یہ ہمیشہ اقلیت میں ہوتی ہے اور ریاست کے عالمی تاریخی رجحان کی نمائندگی کرتی ہے' اور کم و بیش انھیں حدود کے اندر اپنے ذوق کی وجہ سے یہی خود مکتفی اقلیت (اور اکثر دستور کے مطابق کافی تعداد میں) فی الحقیقت حکومت کی باگ ڈور سنبھالتی ہے۔ انقلابی وقفہ برائے تبدیلی حکومت اور قیصری حالات جس میں کہ افراد اور اتفاقی گروہ بندیاں اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں اور اس عمل میں مادی ذرائع استعمال کرتی ہیں (اور اکثر انھیں حکومت کا کوئی سلیقہ نہیں ہوتا) روایت کے مطابق ریاست پر ہمیشہ اقلیت ہی کی حکومت ہوتی ہے۔ بیشتر مواقع پر یہ اقلیت طبقہ شرفا ہی سے متعلق ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر وہ امرا جنھوں نے انگلستان پر حکومت کی اور وہ اقلیتی طبقہ شرفا جو پیونی جنگوں کے دوران روم پر حکمران تھا' اور وینس' شریف تاجروں کا گروہ اور وہ تربیت یافتہ یسوعی (وہ شرفا جنھوں نے پوپ کے دربار میں عہد باروقی کی حکمت عملی تیار کی) اس طرح ہم مذہبی ریاستوں میں ہم سیاسی رجحان کا مشاہدہ کرتے ہیں جن میں خود مکتفی گروہوں کی کثرت نظر آتی ہے۔ نہ صرف رومن کیتھولک کلیسا میں بلکہ مصر اور ہندوستان میں بھی اور ان سے بھی بڑھ کر بازنطینی اور ساسانی ادوار میں ایران میں مذہبی حکومتیں قائم رہی ہیں---- تیسری جاگیر میں اگرچہ یہ ایسے لوگ بہت کم پیدا کرتی ہے---- ایسے افراد تیسری میں روم میں پیدا ہوئے' جہاں پر ایسے افراد کی کثرت تھی' جنھیں تجارت میں خصوصی تربیت میسر تھی' اور فرانس میں ۱۷۸۹ء سے لے کر' جہاں پر کہ بورژا کا ایک عنصر قانون میں خصوصی مہارت کا حامل تھا۔ ان معاملات میں ایسے گروہ اور افراد جو آپس میں اتحاد کر لیتے ہیں' اور اس امر کو یقینی بنا لیتے ہیں کہ کوئی دوسرا شخص ان کے حلقے میں داخل نہ ہو سکے۔ متجانس افراد پر مشتمل' یہ طبقہ اپنے آپ کو بار بار سامنے لے آتا ہے اور اپنے لیے سیاسی روایت اور تجربے کے عمل کو یقینی بنا لیتا ہے۔

وہ ایک حقیقی ریاستوں کی تنظیم ہے' لیکن قرطاس پر شائع شدہ مقاصد اور مدعیان کمال کے تصورات کے صریحاً" خلاف ہے۔ دنیا میں ایسی کوئی عمدہ صحیح یا درست ریاست نہیں ہے جسے اس منصوبے کے تحت حقیقت کا روپ دیا جا سکے ۔ ہر وہ ریاست جو تاریخ کے میدان میں ابھرتی ہے ویسی ہی ہوتی ہے جیسا کہ وجود

میں آتی ہے۔ مگر کبھی کسی خاص لمحے میں اس کی حالت تبدیل بھی ہو سکتی ہے مگر دوسرے ہی لمحے خلاف توقع اس کی کیفیت مختلف ہو جاتی ہے قانونی اور دستوری لحاظ سے اس کا فرش کتنا ابھی سخت ہو اس سے اس کی تغیر ہیئت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لیے ایسے الفاظ' جمہوریہ' مطلق العنانیت' جمہوریت' کے معانی ہر مختلف ضرورت کے مطابق مختلف لے لیے جاتے ہیں۔ ان الفاظ کی مقبولیت محض فلسفیوں اور اہل فکر کے استعمال کی وجہ سے ہے' جو ان کو ان کی حقیقی معانی کی روشنی میں استعمال کرتے ہیں ۔ کسی بھی ریاست کی تاریخ قیاسی اور تعبیری ہوتی ہے' اور اس کا یہ کام نہیں ہے کہ بنی نوع انسان کس انداز میں ترقی کرتے ہیں' اور اپنے ازلی اور ابدی حقوق کس طرح حاصل کرتے ہیں' بلکہ سیاسی وحدتوں کا بیان ہے' جو فی الحقیقت عملی طور پر دنیا میں موجود ہیں وہ کس طرح نشوونما حاصل کرتے ہیں ظہور میں آتے ہیں اور غائب ہو جاتے ہیں' وہ فی الحقیقت حقیقی زندگی کے سوا اور کچھ نہیں۔ صرف ان کی ہیئت (موزونیت) کا اظہار ہوتا ہے۔ ہمیں اب اس بنیاد پر اس مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے

ریاست اور تاریخ

۳

ہر ثقافت میں تاریخ کا آغاز اپنے مخصوص اعلیٰ اسلوب کے تحت جاگیردارانہ ریاست کے طور پر ہوتا ہے۔ اگرچہ اس صورت کو عالمی معیار کے مطابق ریاست نہیں کہا جا سکتا بلکہ زندگی کے عام رواج کے مطابق جاگیر کہنا ہی مناسب ہے۔ فرش ارض کا شریف ترین عمل انسانی نسل کی افزائش ہے ۔ انتہائی دور اندیشانہ مفہوم میں معاشرتی طبقاتی تقسیم کا عمل اس وقت شروع ہوتا ہے' جبکہ قبیلے کا بزرگ ترین فرد اپنے آپ کو قبیلے کے سربراہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اس کا ہمعصر جاگیردار اس کا ہم سرو ہم مرتبت ہوتا ہے۔ اس طرح دو متوازی تعمیرات کا بیک وقت آغاز ہو جاتا ہے جن میں سے ایک کلیسا اور دوسرا اہرام (منیار) کہلاتا ہے۔ پتھر اور خون دونوں علامتی رفعت حاصل کرتے ہیں۔ ان میں ایک معنی ہے اور دوسرا وجود جاگیرداری کا تصور جو ہر دور عروج میں غالب رہا ہے۔ یہ ابتدائی دور کے بعد کا عبوری وقفہ ہے اس سے حاکم اور محکوم کے مابین خالص فعال اور مبنی بر حقیقت رشتہ استوار کرتا ہے۔ محکوم حاکم کے طابع ہوتے ہیں (خواہ انھوں نے خود اسے منتخب کیا ہو' یا قوت کے بل بوتے ان پر غلبہ حاصل کر لیا ہو)۔ اس طرح ایک نجی قانون وجود میں آ جاتا ہے' (اس لحاظ سے وہ زیادہ علامتی ہوتا ہے) جو حاکم اور رعایا کے رشتے کو متعین کرتا ہے۔ اس رشتے کا کلی انحصار طبقہ شرفا احترام اور وفاداری پر ہوتا ہے۔ آقا اور محکوم ' محکوم اور اس کے خاندانی فرائض کے مابین شدید نوعیت کے ظالمانہ اختلافات پیدا کر دیتا ہے۔ اس المیے کی ایک مثال مشرول ہنری کی ہے۔

اس سطح پر ریاست محدود تعلقات پر قائم رہتی ہے' مگر اپنے تعلقات میں وسعت مزید رعایا کی شمولیت سے

وجود میں آتی ہے حکمران کی خدمت اور اس کی نیابت---- جو ابتدا میں محض ذاتی اور محدود وقت تک محدود ہوتی ہے---- بہت جلد ایک مستقل تعلقے کی صورت اختیار کر لیتی ہے ۔ اگر اس کی ضبطی عمل میں آ جائے تو اسے دوبارہ واگزار کرنا ہو گا' (مغربی ممالک میں ۱۰۰۰ء تک مغرب میں یہ اصول تسلیم کر لیا گیا تھا کہ کوئی زمین بغیر زمیندار کے نہیں ہو سکتی) اور اس کے بعد اگلا مرحلہ یہ تھا کہ یہ وراثت میں منتقل ہوتی رہے۔ (شہنشاہ کونرڈ روم ۲۸ مئی ۱۰۳۷ء) اس قانون کی بنا پر حکمران کے سابق مزارعے بالواسطہ الحاقی قرار دے دیئے گئے اور ازیں بعد وہ کسی اور مزارعے کے ماتحت مزارعین کی حیثیت اختیار کر گئے۔ اس کے نتیجے میں متعلقہ جاگیر میں ایسا نظم و ضبط وجود میں آگیا کہ ان حالات کے تحت اسے ریاست کہا جا سکے۔

اس کلاسیکی اتحاد میں اختیارات اور مال غنیمت کا تصور موجود ہے۔ جب ۱۰۶۶ء میں ولیم اور اس کے نارمن جرات آزماؤں نے انگلستان کو فتح کر لیا تو ملک کی تمام زمین شاہی ملکیت یا موروثی جاگیر قرار دے دی گئی اور موجودہ دور تک یہ صورت حالات قائم ہے یہ کیفیت صرف بحری قزاقوں کی تقلید ہی ہو سکتی ہے جو اوڈی ہیونس کو تحفظ فراہم کرتے ہوئے خزانے کا شمار بھی جاری رکھتے ہیں اس کے فوری نتیجے میں قدیم ثقافتی دور میں خزانہ جمع کرنے اور دفتری حکومت رواج میں آ گئی۔ عمال حکومت کا قدیم خفیہ دفتروں کے حکام سے امتیاز ضروری ہے۔ وہ لوگ قدیم زمانے کی نیابت کی روایت کی پیداوار تھے یہ لوگ محرر یا کلیسائی تھے۔ ان کا وزارت سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ یہ لوگ فی نفسہ وزیر تھے۔

ملازمین---- مگر موجودہ مفہوم کے مقابلے میں ذرا زیادہ معزز۔ مالی اور کلیسائی اہل کار تحفظ کا اظہار ہیں اور یہ خاندانی تصور کے ہمراہ ہی ترقی کرتے ہیں۔ چنانچہ مصر میں قدیم بادشاہت کے آغاز ہی سے حیرت ناک بلند مقام حاصل کر لیا چین کی قدیم ریاست جس کا ذکر چاؤلی نے کیا ہے' اتنی جامع اور پیچیدہ ہے کہ اس کے اسناد کے متعلق شک پیدا ہوتا ہے مگر اس کی روح اور رجحان دائیو قلیطس سے ہم آہنگ ہے جس کی وجہ سے مالی میکانیت کی بنیادوں پر جاگیردارنہ ادارہ قائم رہا قدیم کلاسیکی عالم میں یہ صورت حالات نمایاں طور پر غیر موجود ہے۔ قدیم کلاسیکی معاشیات کے رہنماؤں کا اصول روز مرہ سے متعلق تھا۔ یہی اصول اول سے آخر تک قائم رہا۔ رواقیوں میں بھی ناعاقبت اندیشی اور خود کفالت کا اصول غالب رہا۔ اعداد و شمار کے بہترین ماہرین بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ لہٰذا ایتھنز میں یوبولوس (۳۳۰ ق م) نے اپنی تجارت فاضل اشیا کو نگاہ میں رکھ کر شروع کی اور پھر انھیں شہروں سے حاصل کر کے تقسیم کر دیا

قدیم مغرب کے ہشیار بحری قزاقوں یوبولوس کے مقابلے میں بہت زیادہ متضاد رویہ اختیار کیا' جنوں نے اپنی نارمنی ریاستوں کے مالی انتظام میں اس فاؤستی مالی نظام کی بنیاد رکھ دی' جو آج تمام دنیا میں رائج ہے۔ یہ نارمنی حسابداری کے پہاڑوں کی بنیاد پر جو رابرٹ شیطان (۳۵۔ ۱۰۲۸) نے ایجاد کیے ہمیں انگریزی زبان کے لفظ "ایکس چیکر" سے شناسائی ہوئی۔ اس سے لفظ چیک بنا اور اسی حساب داری کے ادارے نے الفاظ کنڑول کو نٹس (فارغ خطی) اور ریکارڈ رواج دیے۔ اسی موقع پر (۱۰۶۶ء کے بعد) انگلستان کی بطور مال غنیمت تنظیم کی گئی جسے اینگلو سیکسن قبائل نے اپنی ظالمانہ کاروائیوں سے جاگیروں میں تقسیم کر دیا اور اسی

دور میں سسلی کی نارمن ریاست وجود میں آئی۔ اسی پر فریڈرک دوم نے بعد میں ہوہن ثافن کی بنیاد رکھی اور میلفی (۱۲۳۱) کا دستور اپنی ذاتی کوششوں سے تیار کیا (مگر اس کے لیے اس نے جو طریق استعمال کیا وہ عربوں کی عظیم تہذیب سے مستعار لیا گیا) اسے پالش کر کے مکمل کر لیا گیا۔ اسی مترتب اور بیانیہ مالی طریق کار کے مرکز سے یہ مالی نظام' عالم تجارت' لمبارڈی اور مغرب کے دیگر تجارتی دنیا میں پھیل گیا۔

جاگیردارانہ نظام میں فروغ کے نشیب وفراز ساتھ ساتھ چلتے ہیں' جبکہ ابتدائی ریاستیں اپنی بہار اور قوت کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ مستقبل کی اقوام اور ان کے ساتھ ریاستی تصورات کے جراثیم زندگی کے میدان میں داخل ہو رہے تھے۔ دنیاوی اور مذہبی قوتوں میں اختلافات اور تاج اور رعایا کے مناقشات قومی تضادات کے تصورات کی بنا پر بار بار ظاہر ہوتے تھے۔ جرمن اور فرانسیسی آٹو اعظم کے زمانے ہی سے جرمن---۔ (اطالوی) جنھوں نے اٹلی کا کلیہ اور کمپیائن کے درمیان کا علاقہ رہن رکھ دیا تھا' اور جرمن سلطنت کو تباہ کر دیا۔ فرانسیسی ۔ انگریزوں کے معاملے میں انگریزوں نے اپنی حکومت مغربی فرانس میں قائم کر لی۔ مگر اس کے باوجود ان تمام واقعات کی اتنی اہمیت نہ تھی' جتنی کہ ان فیصلوں کی تھی' جو جاگیرداروں کے حلقوں میں کیے گئے۔ یہ وہ لوگ تھے۔ جن کے ذہن میں قومیت کا کوئی تصور نہ تھا۔ انگلستان کو (۶۰۲۵۱) جاگیروں میں تقسیم کر دیا گیا۔ فہرست حشرونشر میں ۱۰۸۴ کا اندراج تھا (اس فہرست کو اب بھی ضرورت کے مطابق بطور حوالہ استعمال کیا جاتا ہے) اور مرکزی قوت کو شدومد سے منظم کیا گیا' جس نے ذیلی مزراعین سے بھی وفاداری کا مطالبہ کیا مگر اس کو ابھی ۱۵۰ سال بھی نہ گزرے تھے کہ منشور اعظم کا (۱۲۱۵ء) اعلان ہو گیا اور حقیقی اختیارات بادشاہ کے ہاتھوں سے نکل کر مزارعین کو منتقل ہو گئے۔ بڑے بڑے جاگیرداروں اور مذہبی رہنماؤں کو ایوان بالا میں نشستیں مل گئیں اور طبقہ امرا کو ایوان زیریں میں جو بعد ازاں قومی تعمیر و ترقی کا سب سے بڑا حامی اور سرگرم قوت بن گیا۔فرانس میں جاگیرداروں کے طبقے نے مذہبی پیشواؤں اور قصباتی آبادی کو ساتھ ملا کر ریاستی جرنیل پر ۱۳۰۲ء میں دباؤ ڈالا او ۱۳۸۳ء میں عمومی استحقاق برائے سارا گوسا اور آراگون حاصل کر لیا۔ اوراس کی کورٹ آبادی نے اسے نیم جمہوری مملکت میں تبدیل کر کے اس پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ جرمنی میں چند دہائیاں قبل عوام کے ایک بڑے طبقے نے بادشاہ کا انتخاب کیا جس میں وہ خود ہی رائے دہندگان تھے۔

جاگیردارانہ تصور نے جو اپنے لیے سب سے مضبوط تصور پیش کیا-۔۔۔ نہ صرف مغرب میں بلکہ ہر ثقافت میں ۔۔۔۔۔ وہ یہ تھا کہ سلطنت اور پاپائیت کے درمیان کش مکش جاری ہو گئی۔ دونوں نے ایسے نتائج کا خواب دیکھا کہ گویا تمام دنیا ہی ان کی جاگیر کی صورت اختیار کر لے گی' اوراس خواب میں ان دونوں نے اپنے آپ کو ایسی ہیئت میں مبتلا کر لیا۔ کہ جب جاگیردارانہ نظام خستگی کا شکار ہوا دونوں ایک دردناک تباہی میں گر گئے۔

ایک ایسے حکمران کا تصور جس کے احکام پر تمام تاریخی عالم میں عمل کیا جاتا ہو جو تمام بنی نوع انسان کا

تقدیر ساز ہو' صرف تین مواقع پر عملی شکل اختیار کر سکی۔ پہلے فرعون بطور ہا روس کے دوسرے چین کا وہ حکمران جو اپنے آپ کو اپنی تمام سلطنت کا جو زیرفلک قائم تھی مرکز سمجھتا تھا اور تیسرے قدیم رومی عہد میں ۱۹۶۲ء میں آٹواعظم گہری صوفیانہ فکر کے ردعمل کے طور پر تاریخی اورمکانی لامتناہیت کی آرزو میں جو ان ایام میں دنیا میں ایک اہم موضوع سمجھا جاتا تھا' اسے ایسی مقدس رومی سلطنت کا تصور سوجھا جو قوم کے لحاظ سے جرمن ہو مگر اس سے قبل پوپ نکولس اول نے(۸۶۰) جو ابھی تک آگستینی تصورات میں پھنسا ہوا تھا۔۔۔۔ یہ مجوسی تصورات تھے۔۔۔۔۔ پاپائیت کے خطوط پر ایسی پاپائیت کا خواب دیکھا جو تمام دنیا کے شہزادوں پر فائق ہو اور ۱۰۵۹ سے گریگوری ہفتم جس میں فاؤستی وضع کی تمام اعلیٰ خوبیاں جمع تھیں اس خواب کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے تیار ہو گیا' اور اس نے پاپائیت کے تحت عالمی جاگیر قائم کرنے کے لیے عمل شروع کر دیا' جس میں تمام بادشاہ اس کی رعایا ہوں۔ پاپائیت نے اپنے داخلی مسائل کی وجہ سے فی الحقیقت کیپاگنا کی ایک چھوٹی سی ریاست تشکیل دی' جس کے شریف خاندان پوپ کا انتخاب کرتے اور یہی بت جلد استفان کی صورت اختیار کر گئے (اور یہ فریضہ ۱۰۵۹ میں انھیں تفویض کر دیا گیا) اور یہ لوگ ایک نوعیت کی حکومت عدیدیہ کی صورت اختیار کر گئے مگر خارجہ حکمت عملی کے وسیع ترپہلو کے پیش نظر جارج ہفتم نے نارمنوں پر فوقیت حاصل کر لی اور اس طرح انگلستان اور سسلی دونوں پر اس کا اقتدار قائم ہو گیا۔ یہ دونوں ممالک اس کی مدد کے مرہون منت تھے۔ فی الحقیقت اس نے پوپ کا تاج وتخت آٹواعظم کے حوالے کر دیا۔ مگر کچھ مدت بعد ہنری چہارم نے جس کا کہ تعلق ہوہن ثافن سے تھا' وہ اپنے مخالفانہ مفہوم میں کامیاب ہو گیا' یہاں تک کہ رچرڈ شیردل نے بھی انگلینڈ کی طرف سے اس کے حق میں وفاداری کا حلف اٹھا لیا۔ ایسی صورت پیدا ہو گئی تھی کہ ایک عالمی حکومت وجود میں آ جائے جبکہ عظیم پوپ انوسینٹ سوم (۱۲۱۶-۱۱۹۸) نے مختصر عرصے کے لیے عالمی حکومت کے خواب کو حقیقت میں تبدیل کر دیا۔ ۱۲۱۳ء میں انگلستان پوپ کی جاگیر قرار پایا۔ آراگون' اورلیون اورپوروگال' ڈنمارک اور پولینڈ اور ہنگری' آرمینیا اور حال ہی میں قائم کردہ بازنطینی سلطنت بھی اسی راہ پر گامزن ہو گئیں مگرانوسینٹ کی موت کے بعد گرجے کے اندر کا اتحاد بھی ختم کر دیا اور عظیم روحانی شخصیتیں جن کے خطابات نے انھیں رعایا میں تبدیل کر دیا تھا اور پوپ کو حاکم اعلیٰ تسلیم کرتے تھے جلد ہی اس مثال کی پیروی پر آمادہ ہو گئے جس کے تحت پوپ کی حاکیت ختم کر کے اسے عیسائی اداروں کا نمائندہ قرار دے دیا گیا تھا

یہ تصور کہ عمومی کونسل کا مرتبہ پوپ سے بلند ہے مذہبی بنیادوں پر استوار نہ تھا بلکہ اس کی بنیاد جاگیردارانہ اصول پر استوار تھی۔ اس کا رجحان بالکل انگلستان کے رہنماؤں کے مطابق تھا جو منشوراعظم کے کامیاب محرک تھے۔ کونسٹن کی کونسل میں (۱۴۱۴) اور بلیسل (۱۴۳۱) کلیسا کو دنیاداری کے پہلو میں تبدیل کرنے کی کوششیں کی گئیں اور اسے مذہبی جاگیر بنانے کاارادہ کیا گیا جس میں اسقف اعظم اور دیگر استفوں کی چند سری حکومت قائم کر دی جائے' اور تمام استفان مغرب کے نمائندے قرار پائیں اور وہ مقام حاصل کر لیں جو تاحال روم کے شرفا کے پاس تھا۔ لیکن اس زمانے تک جاگیردارانہ نظام ریاست کے ماتحت دوسری حیثیت اختیار کر چکا تھا اور اس کے نتیجے میں رومی سردار فتح یاب ہو چکے تھے۔ پاپائیت کے انتخاب کا میدان

محض روم تک محدود تھا اور غیر محدود قوت اور کلیسا کی تنظیم مرکز کے دائرہ اختیار میں تھی۔ جہاں تک سلطنت کا تعلق ہے یہ مدت سے محض ایک سائے کی حالت میں تھی اور چینیوں اور مصریوں کی طرح زبانی تقدیس کی علامت رہ گئی تھی۔

ان فیصلوں کے زوردار تحرک کی بنا پر کلاسیکی دنیا میں جاگیردارانہ نظام کی تعمیر و تشکیل آہستہ' جامد تقریباً خاموش تھی۔ اس لیے اس کے عبوری دور کا تعین ممکن نہیں۔ ہومر کی منظومات میں جیسا کہ اب ہم جانتے ہیں' ہر بستی کا اپنا پجاری تھا۔ اس امر کی واضح شہادت موجود ہے کہ یہ کسی وقت کوئی بڑی آسامی تھا۔ ہم آگا میمنن کی صورت میں ان شرائط کا اندازہ کر سکتے ہیں جن کے مطابق علاقے کا حاکم اپنے حامیوں کے طویل سلسلے کی مدد سے میدان عمل میں آتا تھا۔ مگر یونان میں جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ شہری ریاستوں کی وجہ سے عمل میں آیا۔ یہی اس ملک کا سیاسی محور تھا۔ اس کے نتائج میں وراثتی درباری عہدے مثلاً آرک بائی' لیمانی' پرائی ٹانیز' آرکانسز اور غالباً" ابتدائی منصفین بھی سب کا تعلق شہری آبادیوں سے تھا ' اور اس کے بعد بڑے خاندان وجود میں آنے لگے۔ یہ مصر' چین یا مغرب کی طرح اپنے علاقوں تک محدود نہ تھے بلکہ ان کا شہروں سے قریبی رابطہ تھا جہاں پر یہ شاہی حقوق پر قبضہ کرتے' یہاں تک کے بادشاہ کے پاس کچھ بھی باقی نہ رہا ماسوائے اس اختیار کے جسے یہ حاصل نہ کر سکتے تھے۔ کیونکہ اس کا تعلق دیوتاؤں سے تھا یعنی بادشاہ کا وہ حق جو قربانی سے متعلق تھا (یعنی وہ صرف قربان گاہ کا متولی رہ گیا)۔ ہومر کے رزمیے کے آخری حصے میں ۸۰۰۰ ق م) یہ طبقہ شرفا کا فریضہ تھا کہ وہ بادشاہ کو تخت پر بیٹھنے کی اجازت دیتے اور جب چاہتے معزول بھی کر دیتے۔ اوڈیسی جانتا تھا کہ بادشاہت محض ایک ڈرامہ ہے۔۔۔۔۔ اصل صورت حال یہ تھی کہ ہر شے پر چند سری حکومت کا قبضہ تھا۔ سپارٹا کے رہنے والے بھی رومی اعیان زادوں کی طرح (جن کا تعلق کو میشیا کاری آنا سے تھا) جاگیردارانہ تعلقات ہی کی پیداوار ہیں۔ فیڈانشیا میں ایک وسیع میز کے آثار باقی ہیں جو شرفا کے زیر استعمال تھا۔ مگر بادشاہ کے اختیار روم کی مذہبی۔۔۔۔۔ نسلی طبقے کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئے' یا سپارٹا کے بادشاہوں کے ہاتھوں میں جن کو ایفور کسی وقت بھی معزول یا قید کر سکتے تھے۔ ان حالات کی لازمی تطبیق ہمیں یہ تسلیم کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ روم میں بھی ۵۰۰ ق م میں طارکونین بغاوت میں بھی بلاشک وشبہ محدود انتخابات کا رواج موجود تھا کہ کونسل کسی شخص کا تقرر کر دیتی یا اپنے اراکین میں سے عبوری دور کے لیے نامزد کر لیتی کہ جب تک کوئی بادشاہ نامزد ہو مذکورہ شخص کام چلاتا رہے۔

یہاں بھی وہی صورت پیش آئی جو ہر جگہ دیکھی جاتی ہے' یعنی جاگیردارانہ نظام میں خستگی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ مگر متوقع کیفیت ابھی مکمل نہ ہوئی تھی۔ ابھی قوم اس کے لیے تیار نہ تھی۔ یہ ایک خوفناک بحران ہے جو ہر جگہ حکومتی خلا کے وقفے کی بنا پر پیش آتا ہے' اور اسی دوران حقیقی ریاست اور جاگیردارانہ اتحاد کے مابین حدود کا تعین ہوتا ہے۔ مصر کے پانچویں خاندان کے دور میں جاگیردارانہ نظام پوری طرح سے تکمیل پا چکا تھا۔ فرعون اسوسی نے حقیقی معنوں میں تھوڑی تھوڑی کر کے عوام کے حوالے کر دی اور اسی طرح مذہبی پیشواؤں کی امیرانہ جاگیریں (بالکل اسی طرح جس طرح مغرب میں ہوا۔) ہر قسم کے محصول سے

مستثنیٰ کر دی گئیں اور بتدریج ان کی ذاتی جائیداد کی صورت اختیار کر گئیں۔ (بڑے بڑے مندروں کے نام اوقاف۔۔۔۔ یہی اصطلاح موزوں معلوم ہوتی ہے) پانچویں خاندان کے دوران (۲۵۵۰ق م) ہونس ثافن دور کا خاتمہ ہوا۔ پانچویں خاندان کے مختصر دور حکومت کے تحت شہزادگان اور امرا آزاد ہو گئے۔ تمام بڑے عہدے وراثت میں ملتے اور مقبروں سے جو دستاویزات شہادت ملی ہیں' ان سے طویل شجرہ ہائے نسب کا پتہ چلتا ہے' جن کو ساتویں اور آٹھویں خاندان کے دوران مصری مورخین نے نظروں سے اوجھل کر دیا کیونکہ اس دوران تقریباً پچاس سال تک شہزادگان میں تخت نشینی کے لیے جنگ ہوتی رہی' یا فرعون کا خطاب حاصل کرنے کے لیے لڑتے رہے۔ چین میں آئی وانگ (۹۰۹۔۹۳۴) کو بھی رعایا نے اس قدر مجبور کر دیا کہ وہ اپنے تمام مفتوحہ علاقے خالی کر دے اور ذیلی مزارعین کے حوالے کر دے اور وہ اپنا نمائندہ خود نامزد کریں گے۔ ۸۴۲ میں اپنے ورثا کو ساتھ لے کر فرار پر مجبور ہو گیا' اور سلطنت کا کاروبار انفرادی طور پر دو شہزادگان نے سنبھال لیا۔ اس عبوری دور میں چاؤ خاندان کے زوال کا آغاز ہوا۔ اب اس کے لیے شہنشائی کی جگہ ایک باعزت مگر بے معنی خطاب مقرر کر دیا گیا۔ یہ صورت حالات جرمنی کے عبوری دور پر بھی منطبق ہوتی ہے' جس کا آغاز ۱۲۵۴ میں ہوا اور ۱۴۰۰ میں وینس لاس کے اختیارات نشاۃ ثانیہ کے اسلوب ہی کے مطابق پوپ کی تمام قوت زوال آشنا ہو گئی۔ بوتی فیس ہشتم کی موت کے بعد جس نے ۱۳۰۲ میں پاپائیت کی جاگیردارانہ قوت کے حصول کے لیے بل انام سینکٹم میں ایک بار پھر کوشش کی اور اس کے نتیجے میں فرانس کے نمائندگان کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ پاپائیت ایک صدی تک جلا وطنی' لاقانونیت اور کمزوری کا شکار رہی' جبکہ اگلی صدی میں انگلستان کا نارمن خاندان لنکاسٹر اور یارک کے تخت و تاج کے حصول کی جدوجہد میں بہت حد تک تباہ ہو گیا۔

۴

سلطنت اور پاپائیت کے زوال کا مطلب یہ نکلا کہ ریاست کو جاگیروں پر فتح نصیب ہو گئی۔ جاگیردارانہ نظام کی بنیادوں میں یہ احساس جاگزیں تھا کہ مقصد یہ تھا کہ زندگی کو قرار واقعی بسر کیا جائے۔ تاریخ تو شریفانہ خون کی قضا و قدر کی محافظ ہے۔ اب یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ اس کے علاوہ بھی بعض عوامل ہیں جو اپنی جگہ پر بہت اہم ہیں۔ طبقہ شرفا بھی ان عوامل کا دست نگر ہے اور اسے ان معاملات میں دوسرے گروہوں کے ساتھ اشتراک کرنا پڑتا ہے (اس میں رتبہ اور پیشہ دونوں شامل ہیں)۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جو ناقابل ادراک ہے۔ معاملات کا ظہور اس غرض سے ہوتا ہے کہ ان کا مشاہدہ کیا جائے اب انھیں نجی قوانین و قواعد کے ماتحت دیکھنا ناممکن ہے بلکہ ان کا مشاہدہ قانون عمومی کے تحت کرنا ہو گا۔ ریاست ہمیشہ (اور بلا استثنا ہمیشہ) اپنے آپ کو طبقہ اولیٰ میں مقام دیتی ہے۔ اس کی خارجی حالت' عبوری دور میں بھی شاذ ہی تغیر پذیر ہوتی ہے اور جاگیردارانہ نظام طبقاتی ریاست میں تبدیل ہوجاتا ہے اور یہ تصور کہ جو لوگ جاگیروں کے حدود سے باہر رہتے ہیں ان کے ذمے حقوق و فرائض بھی ہوتے ہیں' اس سطح پر موجود نہیں ہوتا۔ مگر احساس بدل جاتا ہے اور یہ شعور کہ زندگی کو تاریخ کی بلندیوں پر بسر کیا جائے' دوسرے جذبات کے لیے جگہ دے دیتا ہے

اور یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ زندگی بے مقصد نہیں۔ اسی لمحے فرق نمایاں ہو جاتا ہے' جب ہم رینالڈ وان ڈے سل (وفات ۱۱۶۷ء)----- جو جرمنی کی تاریخ کا سب سے بڑا آدمی ہو گزرا ہے۔ کے نظریات کا شہنشاہ چارلس چہارم (وفات ۱۳۷۸ء) سے موازنہ کرتے ہیں' اور یہ سوچتے ہیں کہ کلاسیکی احساس اس صورت حال کے کتنا مطابق تھا۔ تھمس سے لے کر شہری ریاستوں کے ڈانٹے تک احساس کی صورت مسلسل رہی ۔ تھمس صرف ایک مطالبہ پیش کرتا ہے مگر ڈانٹے اس میں فرض کو بھی شامل کر لیتا ہے۔

ریاست کا تصور جو ابھی تک ایک مضبوط جوان ہے۔ ہمیشہ سے----- اور بدیہی طور پر اور فطری طور پر حیوانیت میں گہری جڑوں کا مالک ہے----- اور ہر انفرادی حکمران سے وابستہ ہے' اسی قسم کے بدیہی امور پر ایسے ہی اصول کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ جب بھی کبھی کوئی انسانی گروہ اپنی آواز بلند کرتا ہے تو فیصلہ کن صورت حال وجود میں آجاتی ہے۔ جیسا کہ ہر فسادی اجتماع ہر لمحے نئے خطرے کا نیا مظاہرہ کرتا ہے۔ ایسے گروہ احساس کی یک جہتی سے سرشار مگر بے بصارت ہوتے ہیں' مگر یہ لوگ آئندہ واقعات کا سامنا کرنے کے لیے صرف اسی وقت مستعد ہوتے ہیں جب انھیں کسی رہنما کی نگرانی حاصل ہو۔ جو خود ان میں ہی سے اچانک نمودار ہو جاتا ہے اور اسی لمحے ان کے اتحاد احساس کو کام میں لاتے ہوئے ان کی غیر مشروط متابعت حاصل کر لیتا ہے۔ اسی طریق کار میں زندگی کا وہ اتحاد دوبارہ وجود میں آجاتا ہے جسے ہم قوم یا ریاستوں کا نام دیتے ہیں' لیکن یہ عمل بتدریج اور آہستہ روی سے مگر یقینی طور پر انجام پذیر ہوتا ہے۔ عظیم تقاضوں میں کبھی کبھی اس عمل کو دوسری موزوں کیفیات کی ضرورت کے مطابق ایک طرف کر دیا جاتا ہے یا نظرانداز کر دیا جاتا ہے تاکہ ارفع علامتی نظام اور تصنع پر قابو پالیا جائے۔ ایک انفرادی حکمرانی کے باعث خواہ وہ کسی بادشاہ کے مشیر کی حیثیت حاصل ہو یا کسی جماعت کی رہنمائی' ہر انقلابی بغاوت کے نتیجے میں حالات کی اصل صورت دوبارہ وجود میں آجاتی ہے۔

اس کائناتی حقیقت کے نتیجے میں یہ لازمی ہے کہ ایک انتہائی داخلی صفت کا ظہور ہو جو سمتِ حیات کے ساتھ سختی سے مربوط ہے اور وہ ہے "موروثی عزم" جو اپنے آپ کو ہر طاقتور نسل فطری تناظر میں ظاہر کرتا ہے اور لمحاتی طور سرگرم عمل رہنما کو بھی مجبور کر دیتا ہے' (اکثر غیر شعوری طور پر) کہ وہ اپنا کردار اپنی مدت حیات تک یا اس کے بھی بعد تک جاری رکھے کیونکہ اس کا خون آئندہ نسل یا مابعد نسلوں میں بھی جاری رہے گا۔ یہی گہری اور افراط نما صفت کسی رہنما کے پیروکاروں میں جذبہ عمل پیدا کرتی ہے اور یہی خون رہنما کا وجود یقین اور تسلسل علامت مہیا کرتا ہے۔ ہر انقلاب میں یہ قدیم جبلت بروئے کار آ جاتی ہے۔ یہ بھرپور اور مضبوط ہونے کے باوجود کسی اصول کی تبع نہیں ہوتی۔ اسی صورت حال کے نتیجے میں ہم نے فرانس میں ۱۸۰۰ء کے زمانے میں نہ صرف نپولین کو دیکھا' بلکہ اس کی وراثت کی کیفیت بھی' جس کے نتیجے میں انقلاب کی تکمیل ہوئی۔ نظریاتی لوگ جو مارکس اور روسو کو پسند کرتے ہیں اور اپنے کام کا آغاز تصوراتی اور مثالی انداز میں کرتے ہیں اور خونی حقائق کو نظرانداز کر دیتے ہیں' ایسے لوگ کبھی اس بے انتہا قوت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے جو تاریخی عالم میں مکین ہے اور اس کے نتیجے میں وہ اس کے اثرات کو رجعت پسندی اور شیطنت کہہ کر رد کر دیتے ہیں۔ مگر یہ تصورات اپنی جگہ پر موجود ہیں اور ان میں اس قدر دیرپا قوت موجود

ہے کہ اعلیٰ ثقافتوں کا علامتی نظام بھی ان پر مصنوعی اور عارضی طور پر ہی غالب آسکتا ہے۔ جیسا کہ بعض خاندان کلاسیکی دور میں اور باروق پوپ کی اقربا پروری' جس کا نظارہ ہم نے خود بھی کیا' اس حقیقت کے پیش نظر کہ رہنماؤں کا طبقہ بالاکثر آزادانہ طور پر فیصلہ کر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ اہلیت اور موزونیت ہی کو غالب رہنا چاہیے مگر اس کے باوجود رقابت موجود رہتی ہے اور تواتر کا اصول بھی موجود رہتا ہے اگرچہ انھیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا مگر اسے عملی صورت اس لیے حاصل نہیں ہوتی کہ ان میں ہر ایک خفیہ طور پر اس کا اپنی ذات کے لیے مطالبہ کرتا ہے۔ تخلیقی حسد کی یہ فعال صورت ہی وہ بنیاد ہے جس پر کلاسیکی چند سری حکومت کی تشکیل کی جاتی تھی۔

ان دونوں عناصر کا اتحاد خاندان کا تصور پیش کرتا ہے۔ کائنات میں اس کی جڑیں اس قدر گہری ہوتی ہیں اور تاریخی حقائق کے تانے بانے میں اس قدر مربوط ہوتی ہے کہ ہر ثقافت کا تصور ریاست صرف معمولی ترمیم کے ساتھ اسی ایک اصول پر قائم رہتا ہے۔ پرجوش فاؤستی ثقافت سے لے کر کلاسیکی تہذیب تک یہی صورت قائم رہی ہے۔ کسی بھی ثقافت میں ریاست کا تصور شہروں یا شہری عنفوان شباب سے ملحق ہوتا ہے۔ اقوام' تاریخی باشندے قصباتی تعمیر کے شوقین ہوتے ہیں۔ دارالحکومت قلعوں کا مقام حاصل کر لیتا ہے اور محلات اعلیٰ تاریخ کے مرکز بن جاتے ہیں اور ان کے ساتھ اختیارات کے استعمال کا احساس پیدا ہوتا ہے انصاف کی دیوی اپنے آپ کو حکومت کی پشت وپناہ کا روپ دے لیتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں جاگیرداری پر داخلی لحاظ سے قومی تصورات غلبہ پا لیتے ہیں' اس کے باوجود کہ اسے ابتدائی جاگیرداری کے انجام کا شعور باقی ہوتا ہے اور اسی بنا پر حکمرانی کا معاملہ اپنے آپ کو فرماں روائی کی علامت میں بدل لیتا ہے ۔

جاگیردارانہ نظام کے خاتمے کے ساتھ ہی فاؤستی تاریخ خاندانی تاریخ میں بدل جاتی ہے ان چھوٹے چھوٹے مراکز سے جہاں شاہی خاندان کے افراد اپنے ٹھکانے بنائے رکھتے ہیں (جہاں وہ نشوونما حاصل کرتے ہیں۔ اس جملے سے ہمارے ذہن میں نباتات اور جائیداد کا تصور پیدا ہوتا ہے۔) قوم کی تشکیل ہونے لگتی ہے۔ یہ اقوام سختی سے خاندانی وقار کا تحفظ کرتی ہیں مگر اس کے باوجود ان کے اتحاد سے جاگیردار کا تصور ابھرتا ہے۔ خاندانیت کا اصول تو جاگیرداریوں میں آغاز ہی سے ہوتا ہے اور خاندانی شرافت کو مسلمہ اصول کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ احساس وسعت پذیری اور عزم لی التاریخ اتناطاقت ور ہوتا ہے کہ قوموں کا ظہور اتحاد کے عروج کا باعث بنتا ہے' جو زبان اور میدان عمل کے لحاظ سے حکمران خاندانوں کے انجام سے منسلک ہوتا ہے۔ شادی یا موت بعض اوقات پوری قوم کے اتحاد یا انتشار کا موجب بن سکتی ہے۔ جب لوتھارنگی اور برگنڈوی خاندان اپنی صورت کے حصول میں ناکام ہو گیا تو اس کے ساتھ ہی وہ اقوام بھی جو ابھی آغاز ہی کی حالت میں تھیں ختم ہو کر رہ گئیں۔ وہ تباہی جو ہونس ٹافن کے سر پر لٹک رہی تھی اس میں شاہی تخت وتاج کے علاوہ مزید عوامل بھی شامل تھے۔ جرمن اور اطالوی صدیوں سے ایک مشترکہ قوم کی صورت میں اتحاد کے لیے کوشاں تھے اور ان کی یہ آرزو شرمندہ تعبیر ہونے سے محروم تھی۔ جبکہ اس کے بر خلاف ہیبس برگ کے خاندان نے جرمنوں کی بجائے آسٹریا کی قوم کو ترقی کرنے کے حصول میں مدد دی۔

مجوسی دنیا میں اپنے احساس عمق کے ساتھ خاندانی اصول کی تشکیل کی نوعیت مختلف تھی کلاسیکی قوم کے نزدیک ظالم حکمرانوں اور رہنماؤں کی اولاد جمہوریت پسندی کی علامت تھی جیسا کہ جینس دروازے کا دیوتا تھا اور وسٹا چولہے کی دیوی تھی اور قیصر عوام الناس کی علامت تھا۔ وہ آرفیسی مذہب کی آخری تشکیل تھا۔ انحطاط ہمسائگان کا نظریہ بنیادی طور پر مجوسی نظریہ ہے۔ اگر کوئی بادشاہ مقدس آتش کی عبادت میں شریک ہو (مزدکی سلطنت کے آتش کدہ کے' جو دور ساسانی میں قائم تھے ان میں شامل ہونے والوں کو عیسائی باز نطینی عہد میں کافر سمجھا جاتا ہے)۔ آتش پرستوں کے اعتقاد کے مطابق ایسا شخص پارسا اور معصوم ہو جاتا ہے (آخری صفت کموڈوس کے عہد میں بادشاہ کا سرکاری خطاب تھا)۔ تیسری صدی میں باز نطینی علاقے میں حکومت کا عبوری دور انھیں حالات سے گزرا جیسا کہ آگسٹس کی سول حکومت ڈائیو قلیطس کی جاگیردارانہ حکومت میں تبدیلی کے وقت پیش آیا۔ جدید تشکیل کا آرولین اور پروبس نے آغاز کیا اور ڈائیو قلیطیا کے تباہ شدہ کھنڈرات پر اسے تعمیر کیا قسطنطین کلاسیکی دنیا کے لیے اسی قدر اجنبی تھا اور اس کے اصول بھی ان کے لیے اسی قدر بیگانہ تھے جیسا کہ شارلین کی سلطنت۔ مجوسی حکمران ملک پر اجماع قوم کے ذریعے حکومت کرتے تھے اور روایت کا خیال رکھتے گویا کلیسائی ریاست کی روح کارفرما تھی

آرگسٹائن نے اپنی یاداشتوں میں اس نقطہ نظر کی تصدیق کی ہے۔ مغربی حکمران تاریخ عالم میں خدا کی مہربانی کا مظہر تھا۔ اس کی رعایا اس لیے اس کی تابع ہے کیونکہ خدا نے اسے اس مقام پر فائز کیا ہے۔ مگر جہاں تک عقائد کا معاملہ ہے تو وہ خود بھی زمین پر خدا کے نائب حکمران کا فرماں بردار ہے یا پھر اپنے ضمیر کا محکوم ہے۔ جیسی بھی صورت ہو یہیں سے کلیسا کے اقتدار اور حکومت کے اقتدار میں علیحدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ جب ۸۰۰ء میں پوپ نے بادشاہ کی تاج پوشی کی تو اس نے اپنے لیے ایک نئے حکمران کا انتخاب کر لیا تاکہ وہ خود بھی کامیاب رہے جبکہ مجوسی مزاج کے مطابق باز نطینی بادشاہ اپنی رعایا کا دینوی اور مذہبی دونوں اعتبار سے حکمران تھا۔ فرینک کے علاقوں میں بادشاہ روحانی معاملات میں خادم تھا اور دنیاداری کے معاملات میں (غالباً") بازوئے شمشیرزن تھا۔ ایک تصور کے مطابق پوپ کو خلافت سے آزاد ہونا ہی تھا کیونکہ پوپ خود بھی تو خلیفہ ہی کی ایک صورت ہے۔

اسی وجہ سے مجوسی حکومتوں میں بادشاہ کے انتخاب کے لیے وارثت کو قانون قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس کا انتخاب صرف حکمران خاندان ہی سے کیا جاسکتا ہے اور جسے روح القدس منتخب کرے اور فائز کر دے۔ جب تھیوڈوزی اس کاانتقال ہو گیا تو ۵۵۰ء میں ایک نن پل چیریا نے اپنے آپ کو قدیم رکن مجلس مارسیانوس کی کتخدائی میں دے دیا اس طرح اسے شاہی خاندان میں شمولیت کا ذریعہ میسر آگیا اور خاندانی سلسلہ حکومت بھی جاری رہا ساسانی اور عباسی خاندانوں میں اس کی تقلید میں متعدد واقعات پیش آئے۔

چین میں شہنشاہیت کا تصور چاؤ کے ابتدائی عہد میں پیدا ہوا جو جاگیرداریت سے منسلک تھا۔ بہت جلد اس خواب کی صورت اختیار کر لی اور بڑی تیزی سے ماضی کے بادشاہوں اور اساطیری شاہی خاندانوں کی

داستانیں عوام میں پھیل گئیں جن میں شاہی خاندان اور اساطیری شاہی خاندان بہت نمایاں طور پر عوام میں مقبول ہوئے مگر حکومت کا خاندانی سلسلہ جس کا اس کی بدولت آغاز ہوا (اور کنگ وانگ کا خطاب مروج ہوا) اور وراثت کے لیے سخت قوانین بھی وجود میں آئے۔ جائز اولاد یہ تصور اس سے قبل موجود نہ تھا---- اس سے متبنی کو قبول کرنے کی گنجائش ختم ہو گئی' بلکہ خاندان کا سلسلہ ہی ختم کر دیا جاتا۔ اسی کے نتیجے میں مغربی ممالک میں بالخصوص باروق کے عہد میں متعدد وراثتی جنگیں لڑی گئیں ۔ اس میں کسی حد تک جائز اولاد ہونے کا اختلاف بھی شامل تھا۔ مصر کے بارھویں خاندان میں یہ رواج تھا کہ بادشاہ اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین منتخب کر لیتے تھے اور ان کی تاج پوشی کر دیتے ۔ اس کے ساتھ ہی ثقافت کا آخری دور ختم ہو گیا ان تینوں کے خاندانی تصورات میں یکسانیت وراثت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان میں ہم آہنگی موجود تھی۔

یہ معلوم کرنے میں حالات کو گہری نظر سے دیکھنا ہو گا اور سیاسی زبان کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنا ہو گا کہ کلاسیکی عہد میں بھی معاملات کی صورت بعینہٖ وہی تھی اور نہ صرف یہ کہ یہاں بھی جاگیرداری سے حکومت کے تبادلے میں عبوری دور شامل تھا بلکہ خاندانی حکومت کا اصول بھی مروج تھا۔کلاسیکی وجود فی الحقیقت ہر اس شے سے انکار کر دیتا جو زبانی یا مکانی فاصلوں کا اقرار کرتی اور تاریخ کی واقعاتی دنیا میں بھی ہر اس شے کو تخلیق سے منسلک کر دیتے جو ان کے لیے دفاعی مسئلہ پیدا کرتی مگر یہ تمام تنگ اور مختصر ہوتے ہوئے ان کے اس مقصد کی بھی نفی کر دیتے جس کے لیے انھوں نے یہ ساری تگ و دو کی تھی۔ خاندانی روایات کا خاتمہ اور آرفیسی نفی فی الواقع اس شمسی رجحان کے خلاف احتجاج کی ایک صورت ہے جو محض اجسام کی مادیت کا مظہر ہے۔

انفرادی حکمرانی اور بعدازاں ورثا کو منتقلی قدیم بادشاہت میں ایک امر مسلمہ سمجھا جاتا تھا ۔ مگر ۸۰۰ (ق م) تک ہی اس تصور کو قابل بحث واعتراض سمجھ لیا گیا تھا۔ شاہی خطاب اکثر بڑے بڑے نائبین کو بھی مل جاتا تھا اور نمایاں شرفا کے لیے تو ایسے خطابات عام شے تھی۔ سپارٹا اور لیسیا میں دو ایسے شخصیتی موجود تھے اور متعدد شہروں میں مزید متعدد اشخاص موجود تھے جنھیں یہ خطابات حاصل تھے۔ اس کے بعد وہ مرحلہ آیا جب معززین سے خطابات واپس لینے کا آغاز ہو گیا۔ بعدازاں بادشاہت فی نفسہ ایک عہدہ قرار پایا جو شرفا کی طرف سے عطا ہوتا۔ اگرچہ آغاز میں یہ صرف قدیم شاہی خاندانوں کے افراد ہی کو عطا کیا جاتا۔ چنانچہ سپارٹا میں الیفور ہی سب سے پہلی جاگیر کی نمائندگی کرتے تھے۔ کسی طرح بھی حکمرانی کے انتخاب میں محدود نہ تھے اور کورنتھ میں ۷۵۰ ق م سے لے کر بکیاڈائی کے شاہی قبیلے نے وراثت کے سلسلے کو ختم کر دیا اور ہر موقعہ پر ایک مجلس کا انتخاب کرکے کسی نئے جانشین کو ارکان مجلس ہی سے منتخب کر لیا۔ بڑے بڑے عہدہ دار جو وراثت ہی کے حق پر نامزد ہوتے تھے' آغاز میں تو یہ زندگی بھر کے لیے ہوا کرتے تھے' پھر ان کی معیاد مقرر کر دی گئی بعد میں صرف ایک سال کے لیے منتخب ہونے لگے اور پھر ایسی صورت پیدا ہو گئی کہ عہدوں سے عہدہ داروں کی تعداد زیادہ ہو گئی اور اس طرح یہ لوگ باری باری اپنے فرائض انجام دیتے جیسا کہ ہم سب

جانتے ہیں یہ رواج کاناٹی کی تباہی کا موجب ہوا۔ سالانہ عہدہ داروں کا یہ تصور ائروسکن کی آمریت سے حاصل کیا گیا۔ ڈورک ایفوری (جو ہرکامیا' میستے اور سپارٹا میں بھی آباد ہیں) اپنے آپ کو سختی سے شہروں کا پابند سمجھتے ہیں اور یہ اپنی مکمل تشکیل میں ۶۵۰ تک پہنچے۔ مغربی ریاستوں کی ہمعصر طبقاتی ریاستوں کے ساتھ (جو پندرھویں صدی کے خاتمے تک موجود تھیں) حکومت کا وراثتی حق شہنشاہ میکسمیلین اول تک بھی موجود تھا اور اس کے خاندان میں وراثتی حکومت بھی اسی تصور کے تحت مضبوط حیثیت کی مالک تھی۔ کلاسیکی دنیا محض اسی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر منتشر ہو گئی اور یہ عمل ان کی ابتدا ہی سے شروع ہو گیا تھا کیونکہ ان کی فکر کے مطابق ہر شخص فی نفسہ خود کفتی تھا لہٰذا ایک دوسرے کی تباہی ان کا معمول ہو گیا تھا

اتحاد ممالک اس کے ممکنہ نتائج کے ساتھ جس سے کہ شہری ریاستوں کا تصور ابھرا خاندانی اشرافیہ ہی کا عمل تھا یہ ان لوگوں ہی کی کارروائی تھی کہ کلاسیکل شہری ریاستیں وجود میں آئیں اور یہ انھوں نے صرف ذاتی مفاد کے تحت کیا۔ انھوں نے سارے ملک کے طبقہ شرفا کو یکجا کیا اور انھیں اس عمل میں شامل کر لیا۔ پیشہ ور لوگ تو پہلے ہی شہروں میں موجود تھے اور کسانوں کو تو کبھی ایک جماعت کی حیثیت سے تسلیم ہی نہیں کیا گیا اور ایک مقام پر شرفا کے اجتماع کے نتیجے میں بادشاہت کا خاتمہ ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی جاگیردارانہ دور بھی اختتام کو پہنچا۔

یونان کی ان جھلکیوں کے مشاہدے کے ساتھ تمام شرائط کے باوجود ہم اتنی جرات کرتے ہیں کہ ہم قدیم روم کی تاریخ کا ایک خاکہ تیار کر لیں۔ رومی اتحاد الملل ایک نوعیت سے منتشر قبائل کا اتحاد تھا۔ یہ شہر کی بنیاد قائم کرنے کے برابر تھا۔ ساتویں صدی کے شروع میں ائروسکن نے ایک مہم کا آغاز کیا اور ایک شہر بسا لیا۔ شاہی اقتدار کے سامنے اس سے قبل بھی بڑے شہر موجود تھے جن میں سے ایک پلاٹائن تھا اور دوسرا قرانال۔ پہلا قدیم دیوی دیوا رومینا سے منسوب تھا اور ائروسکی روما قبیلے سے بھی اس کی نسبت تھی۔ دوسرے شہر کا دیوتا "فرنوس پاطر" تھا۔ اس سے یہ دہرا نام نکلا "رومی" اور "قیرانلی" اور دو مذہبی پیشوا بھی روشناس ہوئے "سالائی" اور "لوپرسی" جن کا تعلق مختلف پہاڑیوں سے تھا اب تین خونی قبائل جن کے نام "رام نیس" "تا ٹیس" اور "لوسی ریس" تھے۔ اس امر کا امکان ہے کہ یہ لوگ تمام ائروسکی مقامات میں آباد تھے لیکن یہ ان دونوں مقامات پر ضرور رہائش پذیر رہے ہوں گے جن سے اس وقت ہمارا تعلق ہے اور اس لیے ہم ان کی وضاحت بھی کرتے ہیں۔ ایک طرف تو ان چھ صدیوں میں فوجی عدالتوں کا نظام انصاف موجود تھا جن میں اعلیٰ خاندانوں کے افراد اور نائبین شامل تھے۔ دوسری طرف درجہ دوم کے منصفین (یا وکلا) جو ابتدائی زمانے میں بادشاہ سے منسلک تھے اور طبقہ شرفا کی نمائندگی کا فرض ادا کرتے تھے اور بتدریج انھوں نے اس کے تمام اثرات سے اسے محروم کر دیا۔ ۶۰۰ ق م تک رومی دستور کے مطابق وہاں چند سری حکومت قائم ہو چکی تھی جس میں خاندانوں کے سربراہان شامل تھے بادشاہ کی حیثیت محض ایک علامتی تھی ۔ اس کے بعد دونوں' یعنی بادشاہوں کو معزول کرنے کا نظریہ اور جدید طریق جس میں اقتدار بتدریج تم کر دیا جاتا' ساتھ ساتھ قائم تھے۔ پہلے معاملے میں تار قوینین ظالموں کی مثال دی جا سکتی ہے' جنھوں نے (جیسا کہ کلاسیکی عالم

میں ہر جگہ---- مثلاً ایتھنز میں پی سس ٹریٹس) چند سری حکومت کے خاتمے کے لیے کوشش کا آغاز کر دیا۔ یہ عمل چھٹی صدی کے وسط میں شروع ہوا اور بتدریج جاگیرداری کی قوت کے خاتمے کا باعث ہوا۔ (ہم کہہ سکتے ہیں) کہ ہومر کے دور کی بادشاہت کو طبقہ اشرافیہ کی شہری ریاستوں نے بحران کے نمودار ہونے سے قبل ہی ختم کر دیا تھا۔ غالباً" جب منصفین کا ظہور ہوا تو اسی دور میں کہیں دوسرے مقامات پر آرکون اور ایفور بھی اپنا ڈنکا بجا رہے تھے۔

یہ شہری ریاستیں بھی مغربی طبقاتی ریاستوں' ان کا طبقہ شرفا' مذہبی پیشواؤں اور اعلیٰ پائے کے امرا سے کم شدت پسند روسا کے گروہوں کے زیر اثر نہ تھیں۔ ان طبقات کے علاوہ جو لوگ بچ جاتے وہ محض معروضی حیثیت کی ایک مثال تھے۔ مگر مغرب میں ان کا مقصد سیاسی تحفظ کی فراہمی تھا۔ مگر کلاسیکی دنیا میں ان کی غرض سیاسی عدم احتیاط تھی کیونکہ چند سری حکومت کا مقصد صرف وقت گزاری تھا۔ یہی حالت دوسرے طبقات کی تھی۔ تھیاگونی کی نظموں اور ہابروس کریٹی کے گیتوں میں بڑے زور شور سے ان مقاصد کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں کلاسیکی معیشت کی حالت آخری وقت تک اچھی رہی۔ پولی کریٹس بحری قزاقی کے مرتکب ہوتے رہے اور اپنے لوگوں پر ہی ظلم کا بازار گرم رکھا اور رومی اتحاد ثلاثہ کا مقاطعہ جاری رہا' مگر ان کی حالت ویسی ہی ابتر رہی۔ صرف دونوں وقت کا کھانا بڑی مشکل سے میسر آتا۔ جہاں تک نظریات قانون کا تعلق ہے اس کی منطقی بنیاد کی کہیں اور مثال نہیں ملتی۔ انھوں نے قانونی مشاورت اور اراکین کی مدت ملازمت کو ایک سال تک محدود کر دیا اور بالآخر ہم دیکھتے ہیں کہ اس طریق کار میں اضافہ ہوتا گیا کہ فوجی' قانونی اور انتظامی عہدوں کو (بالخصوص جو ان میں زیادہ اہم تھے) قرعہ اندازی سے پر کیا گیا یہ لمحاتی دیوتا کی خدمت میں ایک قسم کا نذرانہ تھا۔

یہ کلاسیکی دور کی سیاسی موزونیت کا کلاسیکی طریق کار تھا اور اسی کے ساتھ فکر و احساس کی بھی یہی نوعیت تھی اس میں کسی قسم کا استثناء موجود نہیں۔ ائروسکی بھی اس غلبے سے اتنے ہی متاثر تھے جتنے کہ ڈوری اور مقدونیائی۔ جب سکندر اور اس کے جانشینوں نے مشرق میں متعدد یونانی شہر آباد کیے انھوں نے اس عمل میں کسی شعوری انتخاب سے کام نہیں لیا کیونکہ کسی اور نوعیت کی سیاسی ہیئت کا انھیں شعور ہی نہ تھا۔ انطاکیہ شام میں تھا اور اسکندریہ مصر میں۔ بعد میں یہ بطلیموس کی قلمرو میں تھے اور بعد ازاں قیصر کی سلطنت میں شامل ہو گئے۔ یہ قانونی لحاظ سے تو درست نہ تھا مگر عملی طور پر یقیناً ایسا ہی ہوا۔ ایک شہری حکومت بڑے پیمانے پر بیرون ملک مدت سے فلاحین کی آبادی میں تبدیل ہو گئی اور انتظامی لحاظ سے اجنبی سرحدی علاقوں کی ایک یادگار مثال ثابت ہوئی۔ رومی سلطنت بھی اپنے آخری دور میں ایک بڑی یونانی شہری حکومت سے مختلف نہ تھی جو اتحاد قبائل کی بنیاد پر قائم تھی۔ مارکوس اوری لیوس کے ماتحت' ارسٹائڈیس کے تھیٹر میں یہ کہا جاتا تھا کہ تمام دنیا کو ایک شہر میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور یہ کہنے میں وہ حق بجانب بھی تھے۔ کوئی شخص کہیں بھی تولد ہو وہ اس کے مرکز ہی میں رہنا پسند کرے گا۔ کسی سلطنت کی مفتوحہ آبادی' خانہ بدوش صحرائی قبائل' کوہ ایلپس کی بلند ترین وادیوں کی آبادیاں' سب میں سول حکومتیں قائم تھیں۔ شہری ریاستوں

کے متعلق لاٹوی مختلف انداز میں سوچتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ٹے سی ٹس کی رائے میں یونانی صوبائی حکومتوں کی تاریخ سرے سے موجود ہی نہیں۔ جب ۴۹ میں پومپئی قیصر کی موجودگی میں روم سے دست برادری کا اعلان کیا اور اسے فوجی لحاظ سے کم اہم سمجھتے ہوئے مشرق کی سمت نیا مرکز قائم کرنے کی کوشش تاکہ وہاں سے اپنی مہم جوئی جاری رکھ سکے' تو وہ اس کے نتیجے میں تباہ ہو گیا-جب وہ شہر سے دست بردار ہوا تو حکمران طبقے نے اندازہ کر لیا کہ اس نے ریاست بھی چھوڑ دی ہے-ان کے لیے روہی سب کچھ تھا-

ان شہری ریاستوں میں اضافہ ممکن نہ تھا-ان کی تعداد میں تو اضافہ کیا جا سکتا تھا مگر رتبے میں نہیں- یہ تصور کہ رومی آبادی کو رائے دہندگان میں تبدیل کر دیا جائے اور دیہاتی قبائل کی علیحدہ تشکیل کی جائے 'گویا یہ تسلیم کرتا تھا کہ بنیادی طور پر شہری ریاستوں کا تصور غلط تھا۔ روم میں بھی وہی صورت پیدا ہوئی جو یونان میں تھی- ریاست کی تمام زندگی صرف ایک نقطے پر مرکوز ہو کر رہ گئی جو چوک کی کشادہ جگہ تھی-مگر کچھ لوگ دور دراز علاقوں میں' جنھیں حقوق شہریت حاصل تھے' رہ رہے تھے۔ ہنی بال کے دور میں اٹلی میں یہ کسی مقام پر بھی ہو سکتا تھا اور بعدازاں تو اس کا رواج تمام دنیا میں ہو گیا کہ تمام سیاسی حقوق کا حصول چوک ہی میں ممکن ہوتا' اس لیے عوام کی اکثریت کو اگرچہ سیاسی حقوق حاصل نہ تھے' مگر وہ عملی طور پر سیاسی عمل میں بھرپور حصہ لیتے اور اپنے اثرات کو عملی جامہ پہناتے - ان کے لیے حقوق شہریت کا کیا مطلب تھا؟ وہ صرف اسی قدر تھا کہ انھیں فوجی ملازمت میں شامل ہونے کا موقع نصیب ہو' اور شہری قوانین سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملے - مگر وہ شہری جو روم میں منتقل ہو جاتے ' ان کی سیاسی قوت بھی ثانوی اور مصنوعی حد تک محدود ہوتی اور اس اتحاد قبائل سے مشروط ہوتی جو بعد میں وقوع پذیر ہوا- جہاں تک کسانوں کو حق رائے دہی دینے کا مسئلہ ہے-تو اسے صرف اسی پس منظر میں دیکھا جا سکتا ہے' کہ شہری حکومت کے تصور کو ہر قسم کے ضرر سے محفوظ رکھنا ضروری تھا-نئے شہریوں کو ان کی تعداد کے قطع نظر جدید قبائل میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور یہ مجلس قانون سازی میں ہمیشہ ایک غیر موثر اقلیت ہی رہے' اور انھیں قدیم رائے دہندگان کے مساوی حقوق کبھی نہیں ملے-

اس کا فطری نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ یہ لوگ ہمیشہ کے لیے ایک علیحدہ جماعت ہی متصور ہوتے رہے-لہٰذا وہ تمام لوگ جو اس جماعت میں بھی شامل نہ ہوسکتے انھیں بھی کسی قسم کے حقوق نہ ملتے-دیوتاؤں اور جرات آزماؤں کا مقام غلاموں سے بلند تھا-(غلاموں کو تو بقول ارسطو انسان ہی نہ سمجھا جاتا-) غلام سب سے ادنیٰ تصور ہوتے اور باقی تمام معاشرہ ان کے مقابلے میں بلند مرتبے کا حق دار تھا-غلاموں کو دوسروں کے احساس و فکر کے حوالے سے زندگی بسر کرنا ہوتی-اس کی زندگی کا حق صرف اسی بنیاد پر مبنی تھا-کہ اسے کسی شہر میں رہنے کی اجازت حاصل ہے-اس اقلیدی احساس کے بعد طبقہ شرفا ایک خود مکتفی ادارہ ہونے کی وجہ سے شہری حکومت کا ہم معنی ہو گیا-صورت حالات اس حد تک پہنچ گئی کہ نسلی حقوق کے داعیوں اور جمہوریت پسندوں نے مابین بارہ میزوں والی مجلس کا اتحاد بھی ختم ہو گیا اور سپارٹا والے اور ایفور نے پرانے رواجات کے تحت اپنے عہدوں کی میعاد دوبارہ بحال کر لی گویا ہیلوٹ کی جنگ کا اعلان کر دیا گیا-جب کبھی

کوئی انقلاب آ جاتا-تو اس کے نتیجے میں یہ صورت حال الٹ ہو جاتی اور طبقہ شرفا کی باہر کے لوگ بھی حق رائے دہی استعمال کرنے لگتے-مگر اس کا مفہوم قائم رہا اور داخلی یا خارجی تعلقات میں کوئی فرق نہ آیا-اور مجلسی سیاست تمام کلاسیکی تاریخ میں یکساں قائم رہی -

سینکڑوں شہر ایک دوسرے کے منتظر رہے-ان میں سے ہر ایک سیاسی اور معاشی طور پر خود مکتفی تھا' اس سے ممکن ہوا کہ جب کوئی چاہے ایک دوسرے پر دانت چلا دے-اور کسی معمولی سے بہانے پر معاہدے سے منکر ہو جائے 'اور جنگ کا مقصد یہی ہوتا کہ کوئی دوسری ریاست اپنے حدود سے تجاوز نہ کرلے اپنی ریاست کے حدود میں اضافے کے لیے کبھی جنگ نہ لڑی جاتی-دشمن کے شہر کی تباہی کے بعد جنگ ختم ہوجاتی-اس کے شہریوں کو یا تو قتل کر دیا جاتا یا غلام بنا لیا جاتا۔ تمام انقلابات کا انجام بھی یہی ہوتا کہ ہارنے والوں کو گھروں سے نکال دیا جاتا اور ان کی جائداد پر قبضہ کرلیا جاتا-اورفاتحین اس کے مستقل مالک قرار پاتے- مغرب میں ریاستوں کے معاملات سفارت کاری سے طے کیئے جاتے ہیں مگر یہ تعلقات بھی جنگوں کے دوران منقطع ہوجاتے ہیں-مگر کلاسیکی قانون میں جنگ ایک حسب معمول واقعہ ہوتا تھا - جو کبھی کبھی معاہدات امن کی بنیاد پر ختم کر دی جاتی-اعلان جنگ سے دوبارہ حکمت عملی کی فطری حالت لوٹ آتی-امن کے لیے چالیس یا پچاس کی مدت مقرر کر لی جاتی -(مثلاً ۴۲۱ میں نیسیا کا معاہدہ عمل میں آیا) مگر ان عارضی معاہدات امن کا مفہوم مشکوک ہو جاتا-

ریاستوں کی یہی دو اقسام تھیں جن کی حکمت عملی کا اسلوب ایک دوسرے کے رجحانات کو مدنظر رکھ کر مقرر کیا جاتا-اور انکے خاتمے کے ساتھ ہی یہ اولیں دور بھی اختتام پذیر ہوا-اور جاگیردارانہ اتحاد پر قیام ریاست کا تصور غالب آگیا- مگر پھر بھی یہ تصور جاگیروں ہی کا مرہون منت رہا-اور قوم اپنا وجود ان کے اجتماعی شعور پر ہی قائم رکھ سکتی

۵

دور آخر کے آغاز پر ہی ایک فیصلہ کن موڑ آیا- جبکہ شہر اور دیہات میں ایک توازن وجود میں آ گیا-اور شہر کی قوت زر اور ذہانت نے اتنی طاقت حاصل کر لی کہ ہم اپنے آپ کو جاگیر تو نہ سمجھتے مگر جاگیر کے برابر قرار دیتے یہی وہ لمحہ تھا کہ ریاست کا تصور حتمی طور پر وجود میں آگیا اور ریاست کو جاگیروں سے برتر تسلیم کر لیا گیا-اور اسی کے ساتھ ہی قوم کا تصور بھی وجود میں آگیا-

ریاست کو اس غرض کے لیے خاصی جدوجہد کرنی پڑی-تا کہ وہ جاگیردارانہ اتحاد سے بلند ہو کر خاندانی ریاست کا مقام حاصل کر لے-اس کے بعد جاگیروں کا وجود محض ریاست کے حوالے سے قائم رہا یہ صورت حالات ماضی کے بالکل برعکس تھی-مگر حالات کا دھارا کچھ اس طرح آگے بڑھا کہ حکومت قوم سے صرف

ایسی قوم مراد تھی جو طبقاتی تقسیم پر عمل کرتی ہو۔ ہر فرد قوم سے متعلق ہے مگر طبقات میں صرف اشرافیہ ہی شامل ہو سکتے ہیں۔ اور صرف ان افراد ہی کو سیاسی حقوق حاصل ہیں۔

مگر جونہی ریاست کی خالص صورت نزدیک آتی ہے یہ زیادہ سے زیادہ خود مختار ہوتی جاتی ہے اور کسی اور نوعیت کے تصور کو قبول نہیں کرتی۔ قوم کا تصور جس قدر گہرا ہوتا ہے۔ تو اس کے اثرات بھی طبقات پر زیادہ پڑنے لگتے ہیں۔ اور اس کا مقام امتیاز صرف معاشرتی رہ جاتا ہے یہ ثقافت کی ضرورت ہے۔ لہٰذا نا قابل تنسیخ ہے۔ قدیم طبقہ شرفا اور مذہبی پیشواؤں نے اپنی بحالی کے لیے ایک اور کوشش کی ان کے لیے تو اب محرومی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جرات آزمائی اور درویشی' قدیم قانون' رتبہ' خون اور ان کے نقطہ نظر کے مطابق ان صفات کو کس کے خلاف استعمال کیا جاتا؟

مغرب میں قدیم جاگیرداروں کی ریاست کے خلاف جدوجہد نے گمساقی صورت اختیار کرلی۔ کلاسیکی دور میں کوئی ایسا خاندان نہ تھا جو مستقبل کی نمائندگی کرتا۔ صرف طبقہ شرفا ہی سیاست کو اپنے لیے باعث قیام سمجھتا۔ لیکن ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اسی دور میں ایک خاندانی یا نیم خاندانی نوعیت کا تجسم' ریاستی تصور کی صورت میں فی الحقیقت وجود میں آگیا۔ اور قوم کے غیر مراعاتی طبقات نے اس کی حمائت کر دی اور کچھ مدت بعد یہی لوگ اقتدار میں آ گئے۔ یہ فریضہ ٹائرین نے ادا کیا۔

طبقاتی ریاست سے حقیقی ریاست کی اس تبدیلی میں ماسوائے اس کے کسی اور نظام کا جواز باقی نہ رہا۔ مغرب کی خاندانی حکومتیں۔۔ اور اسی طرح کی مصر اور چین کی حکومتیں ۔۔۔ غیر ریاستی قوتوں سے امداد طلب کرتی رہیں۔ اور اس طرح وہ ان کی سیاسی قوت کو تسلیم کرتی رہیں۔ اس عمل سے اس جدوجہد کا اندازہ ہوتا ہے۔ جو گمساق کے خلاف کی گئی آغاز میں تو شہری حکومتوں کو اس عمل میں اپنا مفاد نظر آیا کیونکہ اس میں حکمران محض ریاست کے وجود کی وجہ سے برقرار تھا۔ یہ تحفظ تو تمام معاشرتی طبقات کو فراہم کرتا مگر وہ طبقہ شرفا سے اس لیے برسرپیکار رہتا ہے کیونکہ وہ جاگیرداری کو سیاسی قدر کی حیثیت سے قائم رکھنا چاہتا تھا

شہری ریاستوں میں اس کے برخلاف ریاست کی نوعیت قطعی طور پر وراثتی سربراہی پر مبنی نہ تھی غیر طبقاتی رہنماؤں کو آگے لانے کی ضرورت نے ظالم لوگ پیدا کر لیے اور کوئی خاص خاندان یا طبقہ شرفا کے کسی حصے نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اور ایسا متحرک کردار ادا کیا کہ اس کے بغیر تیسری ریاست کا اقتدار ناممکن ہوتا بعد میں آنے والے کلاسیکی مورخین کے لیے بوجہ زمانی فاصلے کے یہ ممکن نہ تھا۔ کہ وہ ان واقعات کی تہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس لیے وہ نجی زندگی کے خارجی شواہد تک ہی محدود ہو کر رہ گئے ۔ فی الحقیقت اب یہی لوگ مجسم ریاست تھے۔ اور چند سری حکومت نے طبقاتی جھنڈے تلے اقتدار سنبھال لیا۔ اس کی قوت کا انحصار دیہاتی اور قصباتی آبادی کی مدد پر تھا۔ ایتھنز میں (۵۸۰ ق م) دیارکائی اور پارا لائی جماعتیں برسراقتدار آ گئیں لہٰذا ایک بار پھر خاندانی اور آرفیسی نوعیت کی شمسی حکمرانوں کی جگہ لینے میں کامیاب ہو گئیں چنانچہ

ایٹیکا میں پی سس ٹراٹس نے ڈایا نوسوس کی پوجا کو طاقت کے بل بوتے کسانوں کے طبقے پر مسلط کر دیا سائیسون میں کلس تھینیز نے ہومر کا مطالعہ ممنوع قرار دے دیا۔۲۔ اور روم میں یقینی طور پر طارقوین کے عہد میں تثلیت (دی میٹر' ڈائناسوس' کور) کو روشناس کرایا گیا۔۳۔ اس کا مندر ۴۸۳ ق م میں سپوری اس کاسی اس نے نذر کیا۔ یہ وہی شخص تھا جو ٹائر۔تس کو دوبارہ روشناس کرنے کی کوشش میں ختم ہو گیا۔ سیریس کا مندر عوام کی پناہ گاہ تھا۔ اور اس کے مہتم آئی ڈی لیز معدلات کے رو برو ہمیشہ نمائندگی کا فریضہ ادا کرتے ٹائرین مغربی باروق شہزادوں کی طرح بالعموم وسیع النظر تھے۔ اس وجہ سے یہ مابعد دور میں بورژا غلبے کے دوران اپنی فوقیت قائم نہ رکھ سکے مگر مذہبی پیشوا بھی ایسے الفاظ کی تکرار کرنے لگے کہ "آدمی کو دولت ہی آدمی بناتی ہے۔"۔ا۔ چھٹی صدی کے طائرینس نے شہری ریاستوں کے تصور کو اس کے منطقی انجام تک پہنچادیا اور شہری کا دستوری تصور پیش کیا جسے civis یا polites کا نام دیا گیا۔ نظم و نسق کی کوئی بھی صورت ہوتی اور انھیں کسی درجے میں بھی شمار کیا جاتا۔ اس سے مراد شہری ریاست ہی ہوتی جب بالا آخر چند سری حکومت اقتدار کے حصول میں کامیاب ہو گئی۔۔ اس ضمن میں کلاسیکی دو رہیں حال مطلق کے تصور کا شکر گزار ہونا چاہیے اور اس خوف کا بھی جو انھیں خاندانی انیم استقرار کے متعلق تھا ۔۔۔۔۔ تو شہری ہونے کا تصور مضبوطی سے قائم ہو گیا اس طرح وہ لوگ بھی جن کا بڑے خاندانوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اپنے آپ کو برابر کا شہری سمجھنے لگے ہر شخص اپنے آپ کو ریاستی فریق سمجھنے لگا اور ڈیموکریسی (جمہوریت) کی اصطلاح (بالخصوص اس کے کلاسیکی مفہوم میں) اب سنجیدہ مطالب کی حامل قرار پائی اس سے افراد کے تصور میں یہ جاگزیں ہوا کہ وہ صرف ریاست کے حامی نہیں بلکہ خود ہی ریاست ہیں۔ جیسا کہ زمانہ ماضی میں طبقہ شرفا اپنے آپ کو سمجھتا تھا۔ اب وہ شمار کرنے لگا۔ رقم اور افراد (زر شماری اور سر شماری) کیونکہ دونوں عوامل بورژوا جماعت کے مخصوص ہتھیار ہیں۔ مگر طبقہ اشرافیہ سرشماری کا قائل نہیں وہ صرف ان کی اہلیت کا اندازہ کرتا ہے اور رائے شماری افراد کی نہیں بلکہ جماعتوں کی بنیاد پر ہوتی ہے جبکہ مطلق العنان حکومت فرانڈے کی نہیں بلکہ اولیں ٹائرانس کی تھی چنانچہ یہ انقلاب فرانس میں تباہ ہو گئی اور دوسرے ٹائرانس کا دور آگیا اس دوسرے مناقشے میں جو محض اپنے دفاع کے لیے تھا' خاندانی شرفا نے طبقہ اشرافیہ کی حمایت کی طرف رجعت کی تاکہ وہ نئی جماعت حکومت یعنی بورژوا کے خلاف دفاع کر سکیں۔

مصر میں بھی فرانڈے (گمساق) اور انقلاب کے مابین کا دورانیہ سنگ میل کی نوعیت کا حامل ہے یہ وسطانی سلطنت کا زمانہ تھا' بارہواں خاندان (2000 تا 1700ق م)۔ بالخصوص ایمن ہات اول اور سی سوٹری اس اول نے طبقہ امرا سے جنگ کے بعد ایک مطلق العنان حکومت قائم کرلی اس سلسلے کا پہلا حکمران ۔جیسا کہ ایک نظم سے ظاہر ہے۔ بمشکل ہی ایک سازش سے بچ سکا اور سائنوہٹ کی سوانح حیات ہمیں یہ اطلاع فراہم کرتی ہے۔ کہ اس کی موت کے بعد جو ایک خاص مدت تک اخفا میں رکھی گئی بغاوت کا خطرہ درپیش تھا تیسرا بادشاہ محلات کے ملازمین نے قتل کر دیا ہم نواب کینوٹیپ کے خاندان کی قبروں کی تحریں سے یہ اطلاح حاصل کرتے ہیں کہ شہر آزاد ہو چکے تھے۔ اور ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے۔ یہ صرف ان پر اور چند وفادار امرا پر منحصر تھا کہ خاندان کو قائم رکھیں۔ بالاخر سے سوٹری سوم (850,1887 ق م) تخت نشین ہوا اس

معزز خاندانوں کا مکمل خاتمہ کر دیا۔

اس کے بعد صرف درباری شرفا باقی رہ گئے اور شاندار نوکر شاہی کا وجود باقی رہ گیا۔ لیکن اس سے قبل ہی یہ نوحہ خوانی شروع ہو چکی تھی کہ خاندانی لوگ تباہ و برباد ہو گئے ہیں اور ایسے لوگ حکومت میں شامل ہیں، جن کے آباؤ اجداد کا کوئی سر پیر نہیں جمہوریت کا آغاز ہوچکا تھا، اور ہا مکسوس دور کا معاشرتی ارتقا تیار ہو رہا تھا۔

چین میں اس کے مطابق مقام منگ چوپایا (685 ---- 591) تھا یہ لوگ شاہی خاندان عنمت کے محافظ تھے ان کا اقتدار اگرچہ خلاف دستور تھا مگر حقیقی قوت ان کے قبضے میں تھی وہ تمام ریاستیں ان کے زیر نگیں تھیں۔ جہاں انتہائی لاقانونیت کا دوردورہ تھا اس لیے ان میں امن وقانون کی بحالی اور مستقل سیاسی اصولوں کے قیام کی سخت ضرورت تھی۔ اس میں مرکزی حاکم کی دخل اندازی بھی ناگزیر تھی (اگرچہ ان حالات کے تحت اس کی اہمیت ختم ہو چکی تھی) تاکہ چوکے خاندان کا کوئی فرد حالات کو سنبھال سکے پہلا شخص تسائی کا ہوانگ تھا۔ (وفات ۶۴۵) جس نے ۶۵۹ میں ایک مجلس مشاورت کا اجلاس طلب کیا جس کے متعلق کنفیوشس نے لکھا ہے کہ اس کی وجہ سے چین تباہی سے بچ گیا۔ اس کے بعد منگ چو کا نام آیا اس کا نام ظالم کے لفظ کا ہم معنی ہے جو کہ رسوائی کی اصطلاح ہے۔ کیونکہ اس کے بعد آنے والے لوگ غیر قانونی اختیارات کے ماسوا کسی اور شے کے طلبگار نہ تھے مگر یہ حقیقت اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ یہ عظیم سیاست دان نہایت احتیاط سے ریاست کو جاگیرداروں کے خطرات سے محفوظ رکھنے کے لیے کام کر رہے تھے۔ ذہن اور رز کے نئے عوامل نے ان کی مدد کی جو کچھ ہمیں چینی ذرائع سے دستیاب ہوا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دور ایک عظیم ثقافت کا محافظ تھا یہ ایک بے پرواہی کا عمل ہو گا، اگر ہم ان لوگوں کو ذہنی طور پر رچی لیو یا ویلنسٹین یا پیری انڈر کے برابر قرار دیں لیکن یہی لوگ تھے جن کی وجہ سے قوم پہلے پہل ایک سیاسی وحدت کے طور پر ابھری۔ا۔

یہ حقیقی باروق کے نظریات اور حکمت عملی کا نتیجہ تھا، کہ ریاستی اقتدار اعلیٰ خاندانی ریاستوں کے خلاف آواز بلند کرتی ہے اور بالآخر کامیاب ہو جاتی ہے۔

یہ تمام حالات مغربی فرانڈے کے بالکل مطابق ہیں۔ ۱۶۱۴ء کے بعد فرانس میں بادشاہ نے جرنیلوں کو طلب کرنے کا عمل ختم کر دیا تھا۔ یہ ادارہ اس قدر مضبوط نہ تھا کہ وہ ریاست اور بورژوا کی مجموعی قوت کا مقابلہ کر سکتا۔ انگلستان میں بھی چارلس اول نے پارلیمنٹ کے خلاف ۱۶۲۸ء کے بعد حکومت کرنے کی کوشش کی۔ جرمنی میں اسی دوران تیس سالہ جنگ کا آغاز ہو گیا۔ اس کی مذہبی قوت کی قدر و اہمیت باقی تمام عوامل پر ہمیں غالب نظر آتی ہے، اور یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ یہ ایک کوشش تھی تاکہ شاہی اقتدار اور انفرادی شہزادگان کے مابین جاری کشمکش کا فیصلہ کیا جا سکے۔ نیز انفرادی شہزادگان اور فرانڈے

رائے دہندگان کے مابین الہام تفہیم کی صورت پیدا کی جائے اور مقامی جاگیروں کی مجالس کو بھی مطمئن کیا جائے۔ مگر یہ وہ زمانہ تھا جبکہ سیاست کی دنیا کا مرکز ہسپانیہ میں تھا۔ یہیں پر درباریوں سے مل کر باروق نے اپنی حکمت عملی کے تحت فلپ دوم کی کابینہ کی تشکیل کی، اور خاندانی امرا کے لیے اصول طے کیے، جس کی رو سے ریاست کی حاکمیت اعلیٰ بمقابلہ قصر شاہی طے کرنے کی کوشش کی گئی---- یہ معاملہ انتہائی پیچیدگی اختیار کر گیا اور اس طویل جدوجہد کا آغاز ہو گیا، جو باؤربن کے خاندان تک جاری رہا۔ فلپ دوم کے دور میں انگلستان کو ہسپانیہ کے ساتھ ملانے کی کوشش کی گئی جو ناکام ہو گئی، جبکہ اس کی ملکہ میری اپنے وارث کے معاملے میں ناامید ہو گئی حالانکہ اس کی متوقع ولادت کا اعلان بھی ہو چکا تھا، مگر اب فلپ چہارم کے تحت، دوبارہ عالمی حکومت کا تصور ظہور میں آگیا۔ اب قدیم رومیوں کی صوفیانہ شہنشاہیت کا خواب "مقدس رومی سلطنت" "جرمن قوم کے لیے" کے نعرے ختم ہو گئے اور عالمی حکومت کا مادی تصور، ہیز برگ کے ہاتھ آگیا، جس کا تصور ہسپانیہ میں تھا اور منصوبہ یہ تھا کہ ہندوستان اور امریکہ پر قبضہ کر لیا جائے اور قوت زر کو اس کی بنیاد بنایا جائے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ اپنی خطرے سے دوچار عظمت کو بچانے کے لیے یہ تدبیر سوجھی کہ انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کے تاج و تخت کے وارث کو ہسپانیہ کی نابالغ شہزادی سے بیاہ دیا جائے۔ مگر میڈرڈ نے بعد ازاں اس غرض کے لیے اپنے ہم نسل شہزادے آسٹریا کے ولی عہد کا انتخاب کیا اور اس کے نتیجے میں جیمز اول نے فریق مخالف بوربون کو اتحاد کتھولکی کی تجویز پیش کردی۔ ان ناکام اور پیچیدہ تجاویز کا صرف یہ نتیجہ نکلا کہ قدامت پسند مذہبی تحریک اور انگلستان کے فرانڈے ایک بڑے انقلاب سے دوچار ہو گئے۔

ان بڑے بڑے فیصلوں میں تاج و تخت کے حقیقی مالک---- جیسا کہ چین میں بھی---- ثانوی حیثیت میں رہے، جبکہ عظیم مدبران، جن کے ہاتھوں میں مغرب کی قسمت رہی میڈرڈ میں اولی وارز، اور ہسپانیہ کے آسٹریا۔ وی آنا میں سفیر "اوناتے" تھے۔ یہ دونوں اشخاص یورپ میں بہت طاقتور تھے۔ ان کے مخالفین میں ویلنس ٹین، جو جرمنی میں سلطنت قائم کرنے کے تصور میں محو تھا، اور رچی لیو جو فرانس میں ایک مطلق العنان حکومت کا حامل تھا، شامل تھے---- کچھ مدت بعد مزارین فرانس میں، کرامویل انگلستان میں، اور آسن سٹرنا سویڈن میں ان کے جانشین قرار پائے، اور یہ صورت اس وقت تک قائم رہی جب تک کہ برینڈن برگ کا عظیم الیکٹر دوبارہ بادشاہ کے روپ میں ہمارے سامنے نہیں آیا۔ اس وقت اس کی اپنی سیاسی اہمیت قائم ہو چکی تھی۔

ویلنسٹین نے غیر شعوری طور پر اپنے عمل کا آغاز وہاں سے کیا جہاں پر کہ ہو ہنس ٹافن نے اسے چھوڑا تھا۔ فریڈرک دوم کی وفات کے بعد سے جو ۱۲۵۰ء میں ہوئی جاگیروں کی قوت غیر محدود ہو گئی، اور یہ عمل اس کی حکمت عملی کے خلاف تھا، کیونکہ وہ تو ریاست کی مطلق العنان قوت کا حامی تھا۔ وہ اپنی سپہ سالاری کے دور اول میں اس مقصد کی غرض سے لڑتا رہا، اگر وہ ایک بڑا سفارت کار ہوتا، اور اپنے ذہن میں واضح اور زیادہ مستقل مزاج ہوتا (کیونکہ وہ ہر فیصلہ کن مرحلے پر بزدلی کا اظہار کرتا تھا) اگر اس نے رچی

یسو کی طرح بادشاہ کو اپنے اثر و رسوخ میں لانے کی کوشش کی ہوتی' تو یقیناً" اس کی سلطنت میں بھی نسلی حکومت کی بنیاد قائم ہو جاتی۔ اس نے شہزادگان کی بغاوت میں دیکھا کہ ان کو ان کی حیثیت اور اراضی سے محروم کر دیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ وہ اپنے عروج کے کمال پر تھا۔ (۱۶۲۹ء کے اختتام کے قریب) جب فوجی لحاظ سے جرمنی اس کے کمزور ہاتھ میں تھا' اس نے ایک ملاقات میں بلند آواز سے کہا کہ بادشاہ کو اپنی سلطنت کا مالک ہونا چاہیے جیسا کہ فرانس اور ہسپانیہ اور فرانس کے بادشاہ اپنے اپنے ممالک کے مالک تھے۔ اس کی فوج جو اپنی مدد آپ کے اصول پر قائم تھی اور اپنی کثیر تعداد کی وجہ سے وہ بھی جاگیروں کی محتاج نہ تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جرمنی میں یورپی اہمیت کی فوج تھی۔ اس کے مقابلے میں اطالیہ کی فرانڈے فوج (کیونکہ لیگ کا یہی مقصد تھا) کسی شمار قطار میں نہ تھی۔ جب ۱۶۱۸ء میں ویلنسٹین نے اتحاد کی کوشش کی' تو اس کے اس اتحاد کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ کیونکہ اس نے سٹرالس انڈ سے اس لیے رابطہ پیدا کیا کہ وہ جانتا تھا کہ ہیس برگ کی بحری قوت بحیرہ بلقان میں بہت بڑھ گئی تھی۔ اس لیے اس کی خواہش تھی کہ وہ سال کے دوران بوربن کا نظام اپنے قبضے میں لے لے۔ اسی موقع پر رچی لیئو لاروشیل کا محاصرہ کر رہا تھا' اور قسمت اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس کے اور لیگ کے مابین دشمنی ناگزیر ہو چکی تھی' اس نے ریجنس برگ کی مجلس سے اپنے آپ کو علیحدہ رکھا۔ یہ مجلس ۱۶۳۰ء میں منعقد ہوئی۔ اس نے یہ بہانہ بنایا کہ یہ مجلس موجودہ حالات میں فرانس میں منعقد کی جائے۔ یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی سیاسی غلطی تھی' کیونکہ اس کی غیر حاضری میں فرانڈسٹ الیکٹرز نے شہنشاہ کو شکست دے دی اور یہ تنبیہہ کی کہ اسے لوئیس بیزدہم کے حق میں دست بردار ہو جانا چاہیے اور اسے مجبور کیا کہ وہ جرنیل کو موقوف کر دے اور اس پس منظر میں اگرچہ اسے اپنے مقصد میں تو کوئی کامیابی نہ ہوئی مگر جرمنی کی مرکزی حکومت اپنی فوج سے دستبردار ہو گئی۔ اس کے بعد رچی لیئو جرمنی کے عظیم فرونڈے کی مدد کرتا رہا۔ اس سے اس کا مطلب یہ تھا کہ وہاں پر ہسپانوی قوت کو ختم کر دے جب کہ دوسری طرف اولی ورز اور والنسٹین' جونہی اس نے اپنی قوت دوبارہ حاصل کی' متحد ہو گئے' اور فرانسیسی طبقہ امرا سے اتحاد قائم کر لیا' اور اس کے بعد مادر ملکہ کی سرپرستی اور اور لین کے گیستان کی مدد سے حملہ کر دیا۔ مگر شاہی قوت نے اپنا موقع ضائع کر دیا۔ اسقف اعظم نے دونوں کھیلوں میں مات دے دی اور بازی جیت لی۔ ۱۶۳۲ء میں اس نے مانٹ مورینسی کے خاندان کے آخری فرد کو بھی قتل کر دیا' اور جرمنی کے کیتھولک مسلک کے پیروکاروں کا فرانس سے اتحاد کرا دیا۔ اس کے بعد ویلنسٹین کو اپنے مقاصد کے حصول کے متعلق یقین نہ رہا۔ ہسپانوی تصور کی طرف جھکتا گیا' اس کا خیال تھا کہ وہ اس طرح جاگیرداروں کے نقطہ نظر کے قریب ترین پہنچ سکے گا۔ اور چند سال بعد وہ بھی مارشل ٹورینی کی طرح فرانسیسی فرانڈے سے اتحاد قائم کر لے گا۔ جرمنی کی تاریخ میں یہ ایک نہایت اہم موڑ تھا۔ ویلنسٹین کی موجودگی میں' ایک مطلق العنان بادشاہی ریاست کی علیحدگی ناممکن ہو گی۔ ۱۶۳۴ء میں اس کے قتل سے بھی صورت حال میں کوئی بہتری پیدا نہ ہوئی' کیونکہ ایسا کوئی متبادل شخص موجود نہ تھا' جو بادشاہ کی جگہ لے سکتا۔

اور اتفاق سے اسی دوران حالات نے ایک بار پھر بہتر صورت اختیار کر لی۔ کیونکہ ۱۶۴۰ء میں بادشاہ اور جاگیرداروں کے مابین فیصلہ کن اختلاف بیک وقت ہسپانیہ' فرانس اور انگلستان میں نمودار ہو گیا۔ ہسپانیہ

کے ہر شہر میں کورٹز اولی واریز کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ پرتگال اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان اور افریقہ بھی ہمیشہ کے لیے علیحدہ ہو گئے اور کیٹلونیا اور نیپلز کو بھی واپس لینے میں برسوں گزر گئے۔ انگلستان میں---- جیسا کہ تیس سالہ جنگ کے دوران ہوا تھا---- بادشاہ اور امرا کے مابین دستوری تنازع نہایت ہشیاری سے انقلاب کی تحریک سے علیحدہ کر دیا گیا' دونوں کی سنجیدگی اور تعبیر کو سیاسی معاملات سے الگ کر کے شدت اختلاف کو کم کر دیا گیا' اور وہ بڑھتی ہوئی مخالفت جس سے کرامویل آبادی کے ادنیٰ طبقات میں دوچار تھا---- جس کی وجہ سے وہ غیر ارادی طور پر ایک طرف ہٹ گیا تھا' اور فوجی آمریت کی پناہ میں چلا گیا' اور بعد میں بادشاہت کے دوبارہ قیام میں کامیاب ہو گیا' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام اختلافات سے بالاتر امرا کے مفادات' خاندانی وقار کو گرانے میں کامیاب رہے۔

چارلس اول کے خلاف کارروائی کی سماعت کے دوران اور پیرس میں انقلاب کے دوبارہ ابھرنے کی وجہ سے فرانسیسی دربار کو فرار پر مجبور کر دیا گیا۔ عوام نے جمہوریت کے حق میں نعرے لگائے اور سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں۔ اگر کارڈینل رنتز بھی کرامویل ہی کی طرح ہوتا' تو مزارین پر فتح کا امکان بھی پیدا ہوتا۔ مگر اس عمومی بحران کے پس منظر میں متعدد شخصیات کا وزن اور تقدیر اس کے خلاف تھی۔ حالات نے کچھ اس طرح رخ بدلا کہ انگلستان میں بااثر طبقے نے (جسے پارلیمنٹ میں موثر نمائندگی حاصل تھی) حکومت اور بادشاہ' دونوں کو اپنے زیر اثر کر لیا' اور شاندار انقلاب کے تحت ۱۶۸۸ء میں اس کی تصدیق بھی کر دی۔ یہ اس قدر خوبصورتی سے ہوا کہ آج بھی نارمنی ریاست کے اہم حصے اپنی اصل حالت پر قائم ہیں' فرانس اور ہسپانیہ میں' بادشاہت نے غیر مشروط فتح حاصل کر لی۔ جرمنی میں مغربی فالیہ کا امن' انگلستان کے زیادہ بڑے شہزادگان اور فرانس میں کم درجے کے شہزادگان کے موثر طبقات سے تعلقات میں بہتری آ گئی۔ لہٰذا سلطنت میں جاگیردار ہی صاحب اختیار تھے' جبکہ صوبوں میں خاندانی امرا حاکم رہے اس کے بعد خاندانی بادشاہت' جس طرح کہ انگلستان میں مروج ہے' صرف نام کی حکومت رہ گئی' ہسپانیہ میں شاہی حکومت کا سلسلہ عہد بارق ہی سے چلا آتا تھا' جبکہ بعض شہزادگان انفرادی طور پر' جس طرح کہ انگلستان میں بعض سرکردہ خاندان تھے جو پیرس کے نمونے سے بہت متاثر ہوئے اور مطلق العنان حکمرانی کی وہ صورت پیدا کرنا چاہتے تھے جو ورسائی میں تھی۔ صورت جیسی بھی ہوتی' فیصلہ بوربن کے حق میں ہو گیا' اور ہیس برگ کی کسی نے شنوائی نہ کی۔ جب ۱۶۵۹ء میں پائرینس کا معاہدہ امن کیا گیا' تو اس فیصلے کا سب کو علم تھا۔

ریاست کے اس زمانی انقلاب کی وجہ سے' جو امکانی طور پر ہر ثقافت کے معمول کا حصہ ہے حالات پر نہ صرف یہ کہ تصرف حاصل کیا گیا' بلکہ اسے ہمیشہ کے لیے اتنی اہمیت دینے کی کوشش کی گئی کہ نہ تو اس میں مزید اضافہ ممکن تھا' بلکہ اسے اس صورت میں قائم رکھنا بھی دشوار تھا خزاں کا پہلے ہی سے خاصا غلبہ ہو چکا تھا' جب فریڈرک اعظم نے سانس سوسی میں دعوت دی۔ یہ وہی سال تھے' جب فنون لطیفہ اپنے عروج کو پہنچتے ہیں اور اعلیٰ ذہنی بلوغت حاصل کرتے ہیں اور ایتھنی چوک میں زیوکسس پراکسٹیلز کا غلغلہ بپا ہوتا ہے۔ اور کابینہ کی حکمت عملی کے ساتھ ساتھ باخ اور موزارت کی موسیقی اپنے ترانے بلند کرتی ہے۔

کابینہ کی حکومت فی نفسہ ایک ہنر ہے۔ ایک فنکارانہ تسکین کے لیے ضروری ہے کہ اسے اپنے فن پر پوری دسترس حاصل ہو۔ وہ لطافت اور نفاست میں اعلیٰ ذوق رکھتا ہو اور دور دور فاصلوں تک اس کی چشم بینا کی رسائی ہو۔۔۔۔ کیونکہ روس کو' اس سے قبل ہی شمالی امریکہ کی نو آبادیوں کو' بلکہ ہندوستان تک کی قوت کو اس غرض کے لیے متحرک کیا جا رہا ہے کہ وہ کرہ ارض کے دیگر حصوں پر اپنے اثر و رسوخ سے درست فیصلوں کے لیے استعمال کریں۔ یہ ایک ایسا کھیل ہے جس کے اپنے قوانین ہیں۔ یہ ایک ایسا کھیل ہے جس میں حروف کی تعبیر کی جاتی ہے اور خفیہ رازوں کو آشکارا کیا جاتا ہے۔ اتحاد اور سیاسی جماعتیں بنائی جاتی ہیں۔ یہ دونوں عوامل حکومت کا حصہ سمجھے جاتے ہیں' جو اس عہد میں (گہرے معانی کے ساتھ) یہ طاقت کے معانی کا تماشا تھا۔ اس میں شرافت اور روح دونوں کا امتزاج ہے۔ اگر اس زمانے کے جملوں ہی کو استعمال کیا جائے تو کیفیت تاریخ کو موزوں رکھنے کی بات ہو گی۔ کہیں اور اس کا تصور موجود نہیں' بلکہ اس کے متعلق سوچا بھی نہیں گیا۔

مغربی دنیا میں' جس کا دائرہ اثر پورے کرہ ارض پر ہے' مطلق العنان حکومتیں صرف صدی یا ڈیڑھ صدی تک چل سکیں۔۔۔۔۔ ۱۶۶۰ء سے لے کر' جبکہ پائرین کے معاہدہ امن میں بورین کو ہیس برگ پر فتح حاصل ہوئی' اور سٹوئرٹ انگلستان میں واپس آ گئے' اور انقلاب فرانس کے خلاف متحدہ جنگ شروع ہو گئی۔ اس میں لندن کو پیرس پر فتح نصیب ہوئی اور اگر کوئی شخص یہ کہنا پسند کرے تو یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ وی آنا کی کانگریس پر جس میں کہ خون اور زر کی قدیم حکمت عملی غالب تھی' دنیا سے آخری بار الوداع ہو گئی۔ اس کے مطابق پرنی کلیز کا دور ہے' جس میں اول اور دوم ٹائیرین "بہار اور خزاں" کی صورت میں تھے۔ چینی اس محاورے کو "محافظ اور دعوے دار" ریاستوں کے حوالے سے پیش کرتے ہیں۔

شان و شوکت کی ریاست کے اس آخری دور میں' جس میں روایتی نظام قائم تو تھا' مگر مقبول نہ تھا۔ ہر شخص اس سے واقف تھا مگر کوئی خوش نہ تھا' اس کا نقطہ عروج پر ہیس برگ کے خاندان کے دو یکے بعد دیگر جلد جلد برسر اقتدار آئے اور بعض جنگی نوعیت کے واقعات بھی دیکھے گئے۔ ایک تو ۱۰۔ ۱۷۰۰ء ہسپانیہ کے گرد و نواع میں' اور ۶۰۔ ۱۷۴۰ء میں آسٹریا کی جنگ وراثت کے سلسلے میں دیکھے گئے ۔ یہ اس سلسلے اور شجرہ ہائے نسب کے اصول کا دور عروج ہے۔ آسٹریا کے خلاف جنگ جویانہ نظرفی الحقیقت جنگ کی توسیع کی صورت تھی۔ یہ جملہ تو بہت پہلے سے تشکیل دیا جا چکا تھا۔ (میکسی ملن اول کے حوالے سے) مگر اس کے پورے اثرات اس دور میں آ کر ظاہر ہوئے۔ طبقاتی جنگیں وراثت تخت و تاج کی جنگوں میں منتقل ہو گئیں۔ ان کا فیصلہ کابینہ کے اجلاسوں میں ہوتا مگر جنگیں باہر میدانوں میں مختصر افواج کے ساتھ جرات آزمائی کے جذبوں کے تحت لڑی جاتیں' اور ان میں قدیم جنگی روایات کا خاص خیال رکھا جا ۔ چونکہ باروق کے عہد میں شاہی خاندانوں کی شادیوں کی وجہ سے تقریباً" نصف دنیا پر ان کا قبضہ ہو چکا تھا' اس لیے جنگ تخت نشینی کے دائرہ زیر عمل میں بھی وسعت آ گئی۔ کیونکہ ہیس برگ کے زیر دست بہت بڑے بڑے قطعات

ارض تھے۔ ریاست کی صورت اس عہد تک "حدود موزونیت" کے اندر ہی تھی۔ طبقہ شرفا نے درباریوں اور ملازموں کی صورت اختیار کر لی تھی اور درباری وفاداری کا دم بھرنے لگا تھا۔ شاہی احکام کے تحت جنگیں لڑنا اور ملکی انتظام چلانا' یہی دو اس کے فرائض منصبی تھے۔ لوئیس چہار دہم کے فرانس کے ساتھ ساتھ پروشیا میں ایک شاہکار ریاستی تنظیم وجود میں آ گئی۔ عظیم الیکٹر کا اپنے ملک کی جاگیرداریوں سے مناقشہ پیدا ہو گیا' (۱۶۶۰ء) فریڈرک اعظم کی موت کی وجہ سے۔ (جس نے میرابیو کو بیسٹائل کی شکست سے تین سال قبل اپنے دربار میں بلایا تھا) پروشیا کی شاہراہ بھی وہی ہے جو فرانس کی ہے' اور دونوں کے طریق کار کا نتیجہ ہر صورت میں انگریزی تنظیم کے خلاف تھا۔

کیونکہ انگلستان اور اس کی سلطنت کی صورت حال مختلف تھی۔ یہاں موثر طبقات غالب آ چکے تھے' اور مفتوحہ اقوام پر حکومت مطلق العنان صورت میں نہ کی جاتی تھی' بلکہ شاہانہ شوکت کا مظاہرہ کیا جاتا تھا۔ انگلستان اور اس کی سلطنت میں شامل ممالک میں ایک اختلاف اور بھی تھا' وہ یہ کہ انگلستان ایک جزیرہ ہونے کی حیثیت سے اپنی حکومت کی نگہداشت کرے اور اس کے ایوان بالا کے نمائندگان اور ایوان زیریں کے اراکین انگلستان کی عظمت کو قائم رکھیں ۔ برطانیہ اپنی سلطنت میں شامل ممالک میں جاگیرداریوں اور زمینداریوں کو قائم رکھتا' مگر ان میں سے نمایاں افراد کی تعلیم و تربیت کا بھی اہتمام کرتا' جو حادثاتی طور پر ان کے زیر نگیں آ گئے تھے۔ اور اپنی سلطنت کے منتشر اور وسیع خطوں کے مابین نقل مکانی کا ایک حد تک عمل جاری رکھتا۔ عالمی افق کے پیش نظر جو کہ رومی دور سے قائم تھا' صوبائی افق کا قیام فکر و عمل کی وجہ سے وجود میں آیا۔ قوم کا تصور ترک کر دیا گیا اور اس کی جگہ خواب آور تصورات کو ہوا دی گئی۔ نیا تصور یہ پیش کیا گیا' کہ دنیا کی تقسیم اقوام کی بنیاد کی بجائے زبان کی بنیاد پر کی جائے۔ قضا و قدر کی بجائے سلسلہ علت و معلول کو اہمیت دی جائے' اور اسی بنیاد پر یہ تصور ابھرا کہ قوم کی حقیقت کا شعرا اور مفکرین کا کام ہے' جنھوں نے منطق اور نظم کے بادلوں میں جمہوریت کے قیام کی کوشش کی' اور بالآخر یہ تسلیم کرنے پر آمادہ ہو گئے کہ سیاست کا انحصار تصوراتی' تحریروں' مطالعے اور تقاریر پر ہے' اور عمل اور فیصلے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔۔۔۔ چنانچہ آج بھی حقیقی اعمال اور فیصلے محض رجحانات کے اظہار تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔

انگلستان میں شرفا کی فتح اور حقوق کے اعلان (۱۶۸۹ء) نے ریاست کے تصور کو غائب کر دیا۔ پارلیمنٹ نے ولیم سوم کو تخت پر بیٹھا دیا' جیسا کہ بعد میں جارج اول اور جارج دوم کو اپنے اپنے تخت و تاج چھوڑنے پر مجبور کیا گیا' کیونکہ یہی عمل اس جماعت کی دلچسپی میں تھا۔ "ریاست" کا کلمہ جو ٹیوڈر عہد سے زیر استعمال تھا' اب استعمال سے خارج ہو گیا۔ لوئیس چہار دہم اور فریڈرک اعظم کے مخصوص فقرات کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں ممکن نہیں۔ البتہ لفظ "سوسائٹی" (سماج) سے یہ مراد لی جانے لگی کہ قوم اپنی موزوں حالت میں ہے۔ اس کا تعلق طبقات سے ہے اور ریاستی حکومت سے نہیں۔ اسی لفظ نے روسو اور دستوری مفکرین کو گمراہ کیا' اور انھوں نے تیسری ریاست کے اقتدار کی مخالفت کی۔ مگر انگلستان میں اقتدار

اور ریاست کے تصورات بہت واضح تھے' اور انھیں ہر شخص سمجھتا تھا۔ جارج اول کے بعد سے اقتدار کا مرکز کابینہ کے پاس تھا۔ یہ ایک ایسا ادارہ تھا' جس کا دستور میں کوئی ذکر نہ تھا۔ فی الحقیقت یہ ایک انتظامی ادارہ تھا' جو طبقہ امرا کی نمائندگی کرتا تھا' اور انتظامی معاملات پر نظر رکھتا' اور اس کی حیثیت محض عارضی تھی۔ مطلق العنانیت قائم تھی' مگر یہ مطلق العنانیت طبقاتی اختیارات کی مرہون منت تھی۔ یہ تصور' رومی حکومت کی طرف سے طبقہ امرا کو ودیعت کیا گیا تھا اور یہی استثنا' معدلات کو حاصل تھا۔ شجرہ نسب کا اصول بھی اس کے ساتھ ہی چل رہا تھا۔ مگر یہ اعلیٰ طبقہ امرا میں خاندانی تعلقات کی بنا پر اس کا اظہار ہوتا تھا۔ اور اس کا اثر و رسوخ پارلیمنٹ پر بھی پڑتا۔ ۱۹۰۲ء میں لارڈ سالسبری' نے بطور سیسل اپنے بھتیجے بالفور کو لارڈ جوزف چیمبرلین بنانے کے لیے مشورہ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ٹوری اور وہگ دونوں پارٹیاں ایک دوسرے سے الگ ہو گئیں اور اکثر ایک ہی خاندان میں اختلاف پیدا ہو جاتا کہ کیا اختیارات کی اہمیت مال غنیمت سے زیادہ ہے؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ زر کی قیمت سے اراضی کی قیمت زیادہ تھی یا کبھی کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ۔ اور یہ ایک ایسا اختلاف تھا' اٹھارھویں صدی میں بھی جاری تھا۔ حالانکہ جو اصطلاحات اس کے لیے استعمال ہوتیں' وہ انتہائی بورژوا نوعیت کی تھیں۔ مثلاً "قابل احترام" "رواج کے مطابق" وغیرہ۔ یہ شرفا کے طبقے کے دو مختلف رجحانات کی ترجمانی کرتی تھیں۔ ریاست کے تحفظ کو کھلم کھلا جماعتی مفاد میں بدل دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر فرد آزادی کا مطالبہ کرتا تھا اور انگریزی زبان میں "Freedom" کا مطلب یہی ہے۔ مگر تنگ نظری پر مبنی معاشرہ' اور معاشرتی تشکیل نے اپنے مابین ایسے روابط قائم کر لیے جن کو ہر ایک کے لیے آخری پناہ گاہ کہا جا سکتا تھا۔ (جو معاشرتی درجے کی آمریت ایک لمحاتی معاملہ ہے) گویا ہر شخص کسی نہ کسی جماعت کے ساتھ اپنی دلچسپی کا مظاہرہ کر سکتا تھا۔

یہ آخری مسلسل ثابت قدمی جو اپنی ہیئت کے لحاظ سے گہری اور پختہ تھی' جو مغربی بنی نوع انسان کے تاریخی احساس کی پیداوار تھی' مگر کلاسیکی عالم میں موجود نہ تھی۔ ٹائرینی ختم ہو گئے' ان کی چند سری حکومت بھی ختم ہو گئی۔ وہ عوامی حکومت جو چھٹی صدی میں شہری حلقوں میں تخلیق کی گئی' وہ مختلف طبقات کے وقفوں کے ساتھ صدمات کے اثرات کے تحت بدل گئی۔ اس کی شرافت قائم نہ رہی اور ریاستوں میں داخلی اختلافات نمودار ہو گئے' اور ریاستوں کے مابین بھی اختلافات ظاہر ہونے لگے۔ جب ۵۱۱ء میں---- یعنی ٹائرین کے عہد میں---- سائبارلیس' نیشا غورثیوں کو تباہ کر رہے تھے' یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا' اور اس نے تمام کلاسیکی عالم کو صدمہ پہنچایا' یہاں تک کہ دور دراز فاصلے پر واقع ملائٹس پر بھی سوگ طاری ہو گیا۔ اب شہری حکومتوں کا یا سیاسی جماعت کا خاتمہ معمول کی کارروائی ہو گئی کہ اس کے لیے باقاعدہ طریق کار اور انتخاب کے متعلق عام سوچ کی جانے لگی' اور یہ عمل باروق کے مغربی معاہدات امن کے عین مطابق ہونے لگا---- یعنی بے کار اشیا کو ٹھکانے لگانے کا عمل جاری ہو گیا۔ مثلاً مفتوحہ آبادی کا قتل عام کر دیا جائے یا ان کو غلام بنا کر بیچ دیا جائے۔ مکانات گرا دیے جائیں یا بطور مال غنیمت تقسیم کر لیے جائیں---- مطلق العنانی کے ارادے موجود تھے---- پرشیا کی جنگ کے بعد یہ معاملہ عالم گیر صورت اختیار کر گیا۔ روم میں' سپارٹا میں اور ایتھنز میں کسی صورت سے کم نہیں---- مگر شہری ریاستوں کا عزم کم

سے کم تر ہوتا گیا۔ ان کی سیاسی کیفیت اور مختلف عہدوں کی معیاد میں کمی' اور منصوبہ بندی میں تعجیل کی وجہ سے کبھی اس فیصلے پر ہی پہنچ پائے کہ "ریاست" سے مراد کیا ہے ۔ سفارت کاری کا اعلیٰ فن جو مغرب میں مروج تھا۔ ایک روایتی کابینہ کے ہاتھ میں' مگر کلاسیکی دنیا میں یہ متعدد مجبوریوں کا شکار تھا۔ اسے چلانے والے ناتجربہ کار تھے۔ یہ عمل حادثاتی نہ تھا' بلکہ تربیت یافتہ افراد ہی وجود نہ تھے---- کچھ لوگ موجود بھی تھے---- لیکن وہ محض سیاسی نوعیت کے تھے---- ٹائرین اول سے لے کر ٹائرین دوم جو وقت گزرا' وہ کسی بھی ثقافت میں اس وقت ظہور میں آتا ہے جبکہ متعلقہ ثقافت کا دم آخریں ہو۔ مگر سطحی کلاسیکی اسلوب بالکل غیر منظم معلوم ہوتا ہے' اور اس کا وجود محض حادثاتی اس لیے تھا کہ وہ ایک ایسے فلسفہ حیات کا نتیجہ تھا' جو اپنے آپ کو حال مطلق کی لمحاتی فکر سے کسی صورت میں بھی آزاد نہ کرا سکتا تھا۔

اس کی سب سے نمایاں مثال پانچویں صدی کے روم میں ملتی ہے---- یہ ایک ایسا دور ہے' جس کے متعلق مورخین نے بہت ہنگامہ آرائی کی' کیونکہ اس میں ان کو ایسا استقرار نظر آیا۔ حالانکہ وہاں بھی اس کی صورت وہی تھی جو دوسری کلاسیکی ریاستوں میں تھی۔ غلط فہمی کا ایک اور منبع یہ ہے کہ ان علاقوں میں ترقی کا معاملہ بالکل ابتدائی حالات کی صورت میں تھا۔ مگر حقیقت میں ٹرقوینین کا شہر بھی بہت زیادہ ترقی یافتہ ریاست کا درجہ رکھتا تھا اور پس ماندہ روم کی حالت بھی ان کے مقابلے میں پس ماندہ تھی۔ پانچویں صدی میں ان ممالک کے تعلقات کی نوعیت کم و بیش وہی تھی' جو قیصر کے عہد میں تھی۔ مگر یہ اس قدر بدحال نہ تھے۔ مگر ہمیں حالات کا پورا اندازہ اس لیے نہیں کہ اس عہد کی تحریری روایات ناقص تھیں۔ (جو ماسوائے ایتھنز ہر مقام میں یکساں تھیں۔) تعلیم کی تحریک جو پیونی جنگ کے بعد پیدا ہوئی' اس نے شاعری اور بالخصوص (جیسا کہ یونانی دور میں توقع تھی) قدیم دور کی تصوراتی کہانیوں سے کمی پوری کر دی۔ مثال کے طور پر سنسنالس کی داستان بہت مقبول ہوئی' اور جدید علمی دنیا نے اگرچہ ان اساطیری حکایات کی صحت پر اعتماد چھوڑ دیا ہے' مگر آج بھی وہ ذوق اور نظارے کی دلآویزی کا موجب بنتی ہیں۔ جتنی تعجیل سے روم اور یونان کی تاریخ کو دو علیحدہ علیحدہ خانوں میں بانٹ دیا جاتا ہے' اور اس سے بھی بری عادت یہ ہے کہ تاریخ کا آغاز اس دور سے کیا جائے' جب سے کہ دستاویزی' شہادت موجود ہے۔ فی الحقیقت ۵۰۰ ق م کے دستاویزی حالات ماسوائے ہومر کے بیان کے کوئی اور دستاویز موجود نہیں جب کھنڈرات کی دیواریں دیکھیں کہ روم ٹارقوین کے عہد میں اپنے رقبے کے لحاظ سے اٹلی کا سب سے بڑا شہر تھا' اور ایتھنز اور تھیموسٹوکلیز سے بھی بڑا تھا ۔ وہ شہر جو کار تھیج کے ساتھ تجارتی معاہدے کرتا تھا' اسے زرعی آبادی نہیں کہا جا سکتا۔

اراضی کی ملکیت کے وقار کو بلند معاشرتی مقام حاصل تھا۔ مگر ۱۷۲۰ میں بعض ایسے واقعات پیش آئے جس نے معاشرتی توازن کو ہلا کر رکھ دیا۔ خاندانی قبائل کو چار الفاظ سے تبدیل کر دیا گیا۔ (آباؤ اجداد کون تھے؟ یعنی کیا وہ کسی شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے ایک ایسا استحقاق جو بالعموم حاصل ہونا ممکن نہ تھا) اور سب سے بعد یہ کہ تمام کسانوں کو طبقہ شرفا سے خارج کر دیا جائے۔

منبر سب سے خوش گوار مقام تھا۔ مگر یہ صرف اسی عہد تک محدود نہ تھا۔ بلکہ قدیم شہری ریاستوں میں بھی اس کی یہی حیثیت تھی۔ اس کی رو سے ٹاریئی قبائل کو بھی دستور کی رو سے مکمل معاشرتی مقام حاصل ہو گیا' اور انھیں دوسروں کے ساتھ مساوی مقام میسر ہو گیا۔ مزید برآں قدیم چند سری حکومت کے عہدہ داروں کو بھی ان کے مقام پر بحال رکھا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ معاشرتی انقلاب کا عمل بھی قانون کے مطابق کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں دوسرے مقامات جو عمل اور ردعمل کے نتیجے میں وجود میں آتے تھے اور جنگ وجدل کا باعث بنتے تھے' یہاں پر موضوع بحث بن کر سامنے آئے اور ان پر مناظرے ہونے لگے اور ان کا فیصلہ پرچی سے ہونے لگا۔ کسی ظلم کو روا رکھنے کی ضرورت نہ رہی' کیونکہ یہ تو معاشرے میں پہلے ہی موجود ہوتا ہے۔ منبر کے وہ تمام حقوق مستقل ہو گئے جو پہلے ہی سے اس کے پاس موجود تھے۔ یہ کسی عہدے کا نتیجہ نہ تھے۔ اسے حاصل شدہ استثنا کی بدولت اسے ان انقلابی افعال پر دسترس حاصل ہو گئی جو کسی دوسرے معاشرے میں گلیوں میں جنگ وجدل سے حاصل ہوتی۔ یہ تخلیق ایک سانحہ تھا' مگر ایسی کوئی اور تخلیق روم کے لیے مددگار نہ ہوتی' اور اسے وہ ترقی نصیب نہ ہوتی جو اس وجہ سے ہوئی۔ صرف روم میں اول ٹاریئس سے دوسرے تک اور اس کے بعد کازامہ کا عبوری دور میں بغیر کسی صدمے کے تو کامیابی حاصل نہ ہوئی' مگر کم از کم یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے کوئی بڑی تباہی وجود میں نہ آئی۔ کیونکہ قیصر اور ٹارقوئیز کے مابین منبر کا واسطہ ضرور موجود تھا۔ ۲۸۷ کے واقعے لیکس ہور-ٹشیاء کے نتیجے میں وہ اور زیادہ مضبوط ہو گیا۔ یہ ٹاریئس کے تسلسل کی دوسری ہیئت تھی۔ دوسری صدی میں منبر نے اراکین اور نگرانوں کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ گریکی نے منبر سنبھالا اور قیصر نے دائمی منصف قائم کر دیے۔ اور آگستس کی شہزادگی کے دوران وقار کا مسئلہ اس کے لیے شدید اہم تھا' اور یہی ایک ذریعہ تھا' جس کی وجہ سے وہ حقوق کا آزادانہ استعمال کر سکتا۔

۴۷۱ کا بحران نادر الوقوع نہ تھا' بلکہ عمومی کلاسیکی نوعیت کا تھا۔ اس کا ہدف چند سری حکومت تھی' جو اس وقت تک دیموس میں ٹاریئن نے قائم کر رکھی تھی' اور مروجہ حالات میں ایک مسخ کی حیثیت کی حامل تھی۔ اب اس کی صورت ہسی اوڈ کے زمانے کی سی نہ تھی۔ چند سری حکومت درحقیقت جاگیرداروں کے باہمی مناقشات کا نتیجہ تھی' بلکہ اس سے بھی بڑھ کر چند سری جماعت بمقابلہ دیگر تصورات اختلاف کا مظہر تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس مسئلے میں اختلاف نمودار ہوا۔ ایتھنز میں ۴۸۷ ق م میں آرکان کو اقتدار سے ہٹا دیا گیا اور ان کے حقوق قومی اداروں کو تفویض کر دیے گئے۔ ۴۶۱ میں اریئیو پیگس کو جو ایتھنز کی مجلس اعلیٰ کے مساوی ادارہ تھا' برطرف کر دیا گیا۔ سسلی میں (جن کے روم کے ساتھ قریبی تعلقات تھے) اگراگاس میں جمہوریت کو کامیابی نصیب (۴۷۱) ہوئی' (جسے ریگیری جنٹم بھی کہتے تھے۔) سیراکیوز میں ۴۶۵ ریھیم اور سسانہ میں ۴۷۰ میں اس عمل کا تکرار ہوا ۔ سپارٹا کے بادشاہ کلیومینس (۴۸۸) اور پاسانیا (۴۷۰) نے بھی کوشش کی مگر ناکام رہے' اور ہیلوٹز کو آزادی نہ مل سکی----- روی شرائط کے تحت کلا نشیلا اور اس کی وجہ سے بادشاہت کے حصول کی کوشش کی گئی' اور ایفور کی چند سری حکومت کا خاتمہ کرنا چاہا۔ اس سے روم میں معدلات و منبر کا وقار بڑھ گیا۔ اس معاملے میں گمشدہ عنصر کسانوں کا تھا۔ (اگرچہ ہمارے محققین

زوالِ مغرب (جلددوم)

اسے نظر انداز کر دیتے ہیں) روم کی آبادی میں اکثریت تاجر آبادی کی تھی۔ وہی اس تحریک کو اہمیت اور رہنمائی مہیا کرتی تھی۔ یہ اسی کی وجہ سے تھا کہ ۴۶۴ میں ہیلوٹ نے بغاوت کی تھی۔ (یہی واقعہ غالباً" رومیوں کی جرات کا باعث بنا اور انھوں نے مونس سیسر کے خاتمے کی کوشش کی۔)

شہری ریاستوں میں دیہاتی شرفا اور خاندانی امرا نرمی اختیار کر لیتے ہیں۔ (اتحاد الملل کا یہی مدعا ہے جیسا کہ ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں) مگر قصباتی اور دیہاتی آبادی میں یہ شعور موجود نہیں۔ جہاں تک ان کی واحد سیاسی جماعت کا تعلق' وہ ڈیموکریٹ (جمہوری پارٹی) کے نام سے موسوم ہے------ مگر فی الحقیقت یہ دو جماعتوں کا اشتراک ہے اور اگلے بحران میں اس کا بخوبی اظہار ہو گیا' اس میں (۴۵۰ء) روی امرا نے اپنی علیحدہ جماعت بنا کر اقتدار پر دوبارہ قابض ہونے کی کوشش کی۔ اس غرض سے ہمیں ڈیسے میور کی توضیح کی دوبارہ ضرورت پیش آئی ہے اور معدلات کے خاتمے کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ بارہ میزوں کی قانون سازی جس کے باعث عوام کو سیاسی استحکام نصیب ہوا تھا' اس کو عائلی اور تجارتی حقوق حاصل ہوئے تھے' اور مزید برآں چھوٹے چھوٹے دیہاتی قبائل جن میں قدیم خاندانوں کے اثرات موجود تھے' (قانونی طور پر تو نہیں مگر عملی طور پر) اور غالب صورت میں تھے' (جس میں کہ قدیم دستور کے ساتھ ساتھ مجالس انصاف بھی قائم کر دی گئیں) اور انھیں اس میں ۴ کے مقابلے میں ۱۶ کی اکثریت حاصل تھی۔ ان کا مطلب یہی کہ کسانوں نے شہری حلقوں کی عددی اکثریت پر قابو پا لیا' اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ طبقہ امرا ہی کی طرف جاری کردہ ایک تحریک تھی جو اپنی اور کسانوں کی طرف زرعی معاشی قوت پر ایک فیصلہ کن اقدام کی صورت تھی۔

اس کے خلاف جوابی حملہ بھی بڑی تیزی سے ہوا۔ اسے معدلات کے سلسلہ دہم (ڈیسیم دیر) کی مراجعت کے بعد وجود میں آیا' شناخت کیا جا سکتا ہے۔ مگر علاوہ ازیں اور معاملات بھی تھے جو اسی دور میں وجود میں آئے۔ مثلاً سپ ماؤلی اس کی کوشش کہ ٹاریئس کو بحال کرے۔ (۴۳۹) کونسلر معدلات کی تنظیم و تشکیل' جس میں سول افسران کی بجائے فوجی افسران کو شامل کیا گیا اور لیکس کینؤلیا (۴۴۵) جس نے پٹریشین اور پلیبین میں سلسلہ مناکحت کو ختم کر دیا۔

اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ امرا اور کسانوں کی دونوں جماعتوں میں ایسے فریق موجود تھے جو رومی بڑے شہروں کی روایات کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔ مجلس اعلیٰ اور معدلت گاہیں ان تصورات کی مخالف تھیں اور ان میں سے کسی ایک کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ مگر ان کی ہیئت اس قدر درست تھی کہ انھیں سنجیدہ مخالفت کا کبھی بھی سامنا کرنا نہیں پڑا۔ عوامی افواج کی تشکیل کی وجہ سے اور انھیں اعلیٰ عہدوں پر فائز کرنے کی وجہ سے (۳۹۹) ان کے مابین مقابلے کی صورت بدل گئی۔ پانچویں صدی کو داخلی سیاست کی طرف مائل قرار دینا چاہیے۔ جیسا کہ ٹاریئن کی قانونی جدوجہد شمار کی جاتی ہے۔ بعد ازاں دستوری تضادات کو تسلیم کر لیا گیا اور سیاسی جماعتوں نے اس کی تنسیخ کا اس کے بعد کبھی مطالبہ نہیں کیا' مگر وہ اعلیٰ عہدوں پر قابض ہونے کی کوشش کرتے رہے۔ اس انقلاب کا یہی مقصد تھا جو سمنائی جنگوں کی وجہ سے وجود میں آیا۔ ۲۸۷ء کے

بعد عوام کو ہر ملازمت میں نمائندگی ملنی شروع ہو گئی' اور معدلات کی تجویز بھی منظور کر لی گئی اور یہ عمل خودبخود ایک قانون کی صورت اختیار کر گیا۔ اس کے برعکس اس کے بعد مجلس اعلیٰ کے لیے یہ قابل عمل سمجھا گیا کہ وہ حسب منشا ناجائز ذرائع سے یا کسی اور طریق سے کسی نہ کسی معدلہ کو اس امر پر آمادہ کر لے کہ وہ اپنے خصوصی اختیارات کو کام میں لاتے ہوئے فریق مخالف کو اس کے جائز حق سے محروم کر دے۔ یہ دو بااختیار فریقوں کے مابین جدوجہد کا معاملہ تھا جس کی بنا پر روم میں عدلیہ کی بلیغ لطافت وجود میں آئی۔ دوسرے مقامات پر فیصلے بالعموم مکے اور ڈنڈے کے زور سے ہوتے تھے۔ اس کے لیے تیکنیکی اصطلاح "گھونسے" کا انصاف ہے۔ مگر رومی دستوری قانون کا یہ سب سے عمدہ دور ہے جو تھی صدی' میں تشریح' زور بیان اور دلائل کے استعمال کی عادت پختہ ہو چکی تھی' اور دلائل کے پیش کرنے کی صلاحیت کو اس طرح زیر عمل لایا جاتا کہ معمولی نقاط کی بنیاد پر مقدمہ جیت لیا جاتا۔

مگر روم' تمام کلاسیکی تاریخ میں قانون سازی اور عدالتوں کے نظام کی وجہ سے بے مثال تھا۔ باقی کسی جگہ بھی توازن کا اس قدر خیال نہیں رکھا جاتا تھا' بلکہ تغیر و تبدلُ غالب تھا۔ کبھی چندسری حکومت اور کبھی انبوہ شاہی۔ مطلق العنان شہری حکومتیں' اور قوم ان کے نزدیک ایک ہی شے کے دو نام تھے' اور انھیں بطور حقیقت تسلیم کر لیا گیا تھا۔ مگر داخلی لحاظ سے ان دونوں میں سے کسی کو بھی استحکام حاصل نہ تھا۔ ایک فریق کی فتح کا مطلب یہ ہوتا کہ دوسرے فریق کے تمام اداروں کا خاتمہ ہو گیا' اور اس کے نتیجے میں عوام عدم استقرار کے عادی ہو گئے۔ وہ ہر روز کے جنگ وجدال اور اس کے نتائج کی توقع رکھتے۔ سپارٹا کی ہیئت مجلسی' ایتھنز کی معدلاتی' اور پیلوپونیشی جنگ کے آغاز کے وقت ۴۳۲ میں تغیر و تبدل کا تصور اس قدر سختی سے پختہ ہو چکا تھا کہ بہت زیادہ انقلابی حل ہی ممکن رہ گئے تھے۔

اس عمل کے نتیجے میں روم کا مستقبل متعین ہو گیا۔ یہ واحد ملک تھا جس میں سیاسی آرزو میں افراد کو زیادہ اہمیت حاصل تھی اور اداروں کی حیثیت محض ثانوی تھی۔ وہ اپنے ہدف پر سختی سے کاربند تھے۔ مجلس ارکان ہی روم کی محافظ ہے' جس کا تعلق ملک کی کل آبادی سے ہے---- اس سے مراد مجلس اعلیٰ اور معدلات تھیں۔ اس کی صورت دھاتوں کا آمیزہ تھا۔ کوئی شخص اس کا سودا نہیں کر سکتا تھا۔ جب کہ کلاسیکی دور کی تمام ریاستوں میں داخلی سیاست اس لیے قائم تھی کہ بیرونی سیاست کا امکان باقی رہے۔

۶

ایسے مقام پر جبکہ ثقافت تہذیب کی صورت اختیار کر رہی ہو غیر جاگیری عناصر معاملات میں فیصلہ کن دخل اندازی کے مرتکب ہو سکتے ہیں---- اور اولین طور پر---- ان کی یہ دخل اندازی آزاد قوت کی حیثیت سے زیر عمل آئی ہے۔ ٹائرین اور فرانڈے کے زیر اختیار' حکومت نے جاگیروں کے خلاف قوت استعمال کی' اور ریاست کو پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ وہ فی نفسہ ایک موثر قوت ہے۔ اب اس نے اپنی قوت کو اپنی ذات کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا اور اس کی نوعیت یہ تھی کہ گویا ایک جماعت اپنے آپ کو

دوسری قوتوں سے آزاد کرا رہی ہے۔ اب وہ مطلق العنان قوت کی صورت اختیار کر گئی۔ اس کی متعدد صورتیں وجود میں آ گئیں' تاج' عمیق ادارے' قدیم جاگیرداریوں کے فطری اتحادی ادارے' اور صحیح معانوں میں علامتی روایت کے صحیح نمائندگان کی آخری صورت۔ اس کا اظہار ان تمام صورتوں میں ہونے لگا۔ اول اور دوم ٹائرین کے مابین یہی فرق ہے۔ یہی فرق فرانڈے اور بورژوا انقلاب میں ہے اور کرام ویل اور روبس پری میں بھی یہی فرق ہے۔

ریاست اپنے حدود میں آباد ہر فرد سے متعدد مطالبات کی متقاضی ہے۔ ان مطالبات کو شہری آبادی بوجھ سمجھتی ہے اور اسی صورت میں باروقی فنون اپنے آپ کو پابند سمجھنے لگتے ہیں اور کلاسیکی یا رومانی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ مریضانہ یا غیر ہیئتی تشکیل ہے' یعنی نامکمل صورت میں ہے۔ ۱۷۷۰ء کے بعد کا جرمن ادب کے خلاف' بعض افراد نے شاعری کے خلاف' بالخصوص بڑی شدومد سے مخالفت کی۔ تمام قوم کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اس کے لیے تربیت اور مخصوص ہیئت کی ضرورت ہے۔ جب کبھی کوئی شے اپنی مخصوص داخلی ہیئت سے محروم ہو جاتی ہے' تو اسے ہر کوئی ناپسند کرنے لگتا ہے۔ یہ اصول اخلاقیات' فنون لطیفہ اور کیفیات فکر میں تو درست معلوم ہوتا ہے مگر سیاست میں نہیں۔ ہر بورژوائی انقلاب بڑے بڑے شہروں میں وجود میں آتا ہے' اور ان کا سب سے بڑا ناقابل فہم قدیم علامتی نظام ہے' جو مادی مفادات کی جگہ لے لیتا ہے (محض آرزو کے لیے بھی) عالمی مفکرین اور مصلحین اپنے تصورات کو حقیقت کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اب کسی ایسی شے کی کوئی قدر و قیمت نہیں جو محض استدلال سے جائز ثابت کی جا سکے۔ مگر وہ اس شے سے ضرور محروم ہو جاتے ہیں جو انھیں عظمت ہیئت عطا کرتی ہے' جو کہ بنیادی طور پر علامتی ہے' اور مابعد الطبیعیاتی طور پر کام کرتی ہے۔ قومی حیات اپنی سربلندی کی قوت' اور دریائے تاریخ کے وجود کی توانائی سے محروم ہو جاتی ہے۔ فرانسیسی حکومت کی مایوس کوششوں کو دیکھیں جبکہ لوئیس چہار دہم جیسا کہ اوسط قابلیت کا حکمران برسر اقتدار تھا' تو ان کے لیے ملکی عمومی حالت کو برقرار رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ جب ۱۷۸۷ء میں ویجی نس کی موت کے بعد' ان کی تمام خارجی قوت کی کشش ثقل ظاہر ہو چکی تھی۔ اس سفارت کار کی موت کے بعد فرانس یورپ کے لیے سفارتی مقابلے سے کئی برس کے لیے خارج ہو گیا۔ مگر اس کے باوجود بادشاہ کی متعدد اصلاحات تمام تر مخالفت کے باوجود زیر عمل آ گئیں---- مزید برآں اس سال کی عمومی انتظامی اصلاحات جو آزاد ترین نجی انصرام سے متعلق تھیں---- بالکل غیر موثر ہو کر رہ گئیں---- کیونکہ ریاستی تکمیل کے باوجود جاگیرداریوں کے اختیارات کا مسئلہ وقتی طور پر ادھورا رہ گیا ۔ اس سے ایک صدی قبل اور ایک صدی بعد جنگ یورپ بظاہر قریب تر معلوم ہو رہی تھی' گویا ایک سنگدلانہ لزوم تھا' جس کی کسی کو بھی پرواہ نہ تھی' اور کوئی شخص امور خارجہ کی طرف توجہ نہ دے رہا تھا۔ طبقہ شرفا کی تو تھوڑی بہت توجہ اس طرف تھی' مگر بورژوا نے تو بطور طبقہ خارجی حکمت عملی کے متعلق کبھی سوچا تک نہ تھا۔ علاوہ ازیں انھیں تاریخ عالم سے بھی کوئی سروکار نہ تھا۔ کیا ریاست اپنی نئی ہیئت کے ساتھ قائم رہ سکے گی اور دوسرے ممالک سے قدم ملا کر چل سکے گی؟ کبھی کسی نے یہ سوال نہیں کیا' ہر شخص کو صرف ایک ہی خبط تھا کہ وہ اپنے حقوق حاصل کر لے۔

مگر بورژوا جن کا تعلق شہری آبادی سے ہوتا ہے' آزادی کے لیے اس قدر شدید احساس رکھتے ہیں کہ جتنا کہ ان کو اپنے طبقاتی احساس سے نسلوں سے چلا آ رہا ہے۔ (مغربی یورپ میں ۱۸۴۸ء کے بعد تک یہ خیال قائم رہا) مگر یہ لوگ اپنے افعال کو اپنی مرضی کے مطابق کبھی بھی انجام نہیں دے سکے۔ کیونکہ سب سے پہلے سنجیدہ ترین حالات میں یہ ظاہر ہو گیا کہ ان کا اتحاد منفی نوعیت کا تھا' جو صرف وقتی ہوتا' اور جب کبھی کسی معاملے میں تھوڑا سا اختلاف بھی ہوتا' تو یہ اتحاد ختم ہو جاتا۔ اختلاف رائے اور مخالفت قریباً" ہم معنی صورت اختیار کر گئے اور جب کبھی کوئی تعمیری کام کرنا ہوتا' تو اس وقت ہر گروہ کو اپنی ذاتی دلچسپیوں کا خیال آ جاتا۔ ذمہ داری سے گریز---- یہ سب کی خواہش ہوتی۔ مگر دانش ور طبقہ ریاست کو تاریخی حقائق کی قوت کے خلاف' انصاف کی فراہمی چاہتا اور انسانی حقوق کی حفاظت کا اہتمام کرتا۔ یا اس تنقید سے بچنے کی کوشش کرتا' جو غالب مذہبی طبقات کی طرف سے ہوتی' اور زردار کی خواہش تو یہ ہوتی کہ اسے اپنے تجارتی کاروبار میں کامیابی نصیب ہو۔ ایسے لوگوں کی تعداد بھی کم نہ تھی' جو آرام کرنا چاہتے تھے اور تاریخی عظمت سے گریز پا تھے' یا یہ خواہش رکھتے کہ یہ یا وہ روایت' مجسم شکل میں انھیں حاصل ہو جائے' جس پر کہ وہ روحانی یا مادی حالت میں رہ رہے ہوں۔ مگر ایک عنصر اور بھی تھا' جو اس سے قبل فرانڈے میں نہیں ہوا تھا (اس میں انگلستان کی سول وار بھی شامل ہے۔) یا ٹاڑائنس کا دور اول۔ مگر اس وقت یہ لوگ اقتدار پر قبضے کے خواہش مند تھے---- یہ صورت حال تمام تہذیبوں میں پائی جاتی ہے مگر صرف نام مختلف ہوتے ہیں---- پست ترین طبقہ---- بھیڑ' ہجوم' اجتماع---- مگر سب کا مطلب ایک ہی ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں' جن کے ہاتھ میں فیصلے تھے مگر کھلے میدان ہی تقدیر کو ٹال سکتے تھے جیسا کہ اٹھارھویں صدی میں نتیجہ نکلا(۴۶)۔ ایک ایسا گروہ جس کی معاشرے میں جڑیں موجود نہ ہوں' تمام معاشرتی روابط سے محروم ہوتا ہے' یہ لوگ اپنے آپ کو کسی شے سے بھی منسلک نہیں سمجھتے' نہ جاگیر سے' نہ کسی پیشہ ورانہ تنظیم سے' اور نہ ہی یہ کسی کارکن طبقے سے متعلق ہوتے ہیں۔ حالانکہ کام کے بغیر ان کا گزارہ ممکن نہیں ہوتا۔ مختلف حالات اور طبقات سے اخذ کردہ عناصر جبلی طور پر اس سے متعلق ہیں---- تباہ شدہ کسانوں کا طبقہ' خواندہ آبادی' تباہ شدہ تاجر طبقہ' اور سب سے بڑھ کر (جیسا کہ کٹے لائن کا دور خوفناک وضاحت سے بیان کرتا ہے) شرفا کا طبقہ تھا' جسے اپنی راہ سے ہٹا دیا گیا تھا۔ کیونکہ ان کی قوت ان کی تعداد سے بھی زیادہ ہے۔ یہ لوگ ہر وقت موقع پر موجود رہتے ہیں۔ جب کبھی کسی بڑے فیصلے کا موقع ہو یہ دستیاب ہوتے ہیں۔ ہر شے کے لیے تیار' انھیں نظم و ضبط کی پرواہ نہیں ہوتی۔ ان میں وہ تنظیم بھی نہیں ہوتی جس کی ایک انقلابی جماعت کو ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں' جن سے تباہ کن قوت حاصل کی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے انقلاب فرانس اور انگلستان کا فرق ظاہر ہوتا ہے' اور ٹائرین کا دوسرا دور پہلے سے بہتر نظر آتا ہے۔ بورژوا طبقہ ان اجتماعات کو بے آرامی اور بغیر کسی دفاع کے دیکھتا ہے' اور چاہتا ہے کہ وہ اس سے علیحدہ ہی رہیں---- یہ اس زمرے کا دفاعی عمل ہے۔ تیرھواں ونڈی وائر جو نپولین کی کامیابی کا باعث بنا' مگر حقائق کے دباؤ کے تحت حدود کے خط نہیں کھینچے جا سکتے۔ جو کچھ بھی قدیم نظام کے خلاف بورژوا پیش کرتا ہے وہ اس کی جارحیت پسندی کا کمزور وزن ہے---- جو تعداد میں کم اور داخلی اتحاد میں بھی کمزوری کا مظہر ہے'

جس میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ مادیت ان کی صفوں میں سرایت کر چکی ہے' وہ سامنے لائی جا چکی ہے۔ اس میں وہ عناصر موجود ہیں' جن سے فتح حاصل کی جا سکتی ہے' اور اکثر اپنے لیے فتح و نصرت کا مقام حاصل کرتی ہے۔ اسے تصوراتی عالمانہ مدد اکثر دستیاب نہیں ہوتی' اور قوت زر کی مادی مدد بھی حاصل نہیں ہوتی' جس سے اس کا اپنا خطرہ طبقہ شرفا اور مذہبی پیشواؤں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

اس حقیقت کا ایک اور پہلو بھی ہے' جس کے تحت یہ دور نو اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے ذریعے پہلی دفعہ تجریدی حقائق مادی دنیا میں سرایت کرتے ہیں۔ دارالحکومتی شہر اس قدر بڑے ہو گئے ہیں اور شہری افراد اتنے برتر اور موثر ہو گئے ہیں کہ تمام ثقافت کے شعور بیدار میں (یہ وہ اثر ہے جسے عوامی رائے کہا جاتا ہے) اس میں خون اور روایت دونوں قوتیں موجود ہیں' ان کی ناقابل شکست قوت ان کے خون میں موجود ہے۔ یہ یاد رہے کہ بارونق ریاست اور خود مختار شہر' اپنی آخری تعبیر میں' وہ اپنی نسلی خوبی کا زندہ اظہار ہیں' اور تاریخ جس قدر کہ وہ اپنی شکل و صورت کا مظاہرہ کرتی ہے' اس میں ان کی نسلی نبض کے نشانات موجود ہوتے ہیں۔ ریاست کا کوئی بھی نظریہ جسے یہاں تشکیل کیا جائے۔ وہ حقائق سے اخذ کردہ ہو گی' اور حقائق ہی کی عظمت کا احترام کرے گی۔ ریاست کا تصور سب سے پہلے کسی پہلی جاگیر میں پیدا ہوا' اور اس نے اسے مکمل طور پر ریاست کی خدمت میں پیش کر دیا۔ مطلق العنانیت کا مطلب یہ ہے کہ وجود کا بڑا دریا بطور وحدت اپنی موزوں کیفیت میں ہے' اور اس میں جبلت اور نبض کی یگانگت موجود ہے۔ اس نبض کا مظہر خواہ سفارت کارانہ آداب پر مبنی ہو' یا اس کی کوئی مخصوص حکمت عملی ہو' یا اخلاقی تصورات کی عظمت کا ترجمان ہو یا اس کے فکر و فن کے معیار اور ذوق بہت بلند ہو۔

اس عظیم حقیقت کا برعکس' جسے تحریک روشن خیالی کہا جاتا ہے' ایسے مظہر کی اشاعت کرتا ہے' جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ کیونکہ معاشرے کا شعور بیدار' تعلیم یافتہ طبقے میں' جس کا مذہب ہی تنقید ہے' اور جس کے معبود پتھروں کے پیکر یا دیوی دیوتا نہیں اب ہم ایسے دور میں داخل ہو گئے ہیں جہاں پر کہ کتابوں اور عام نظریات کے سیاست پر اثرات ظاہر ہونا شروع ہو گئے۔ لاؤتسے کے عہد کے چین میں اور سوفسطائیوں کے یونان میں اور موفسیقو کے دور یورپ میں---- اور عمومی رائے جو ان کی وجہ سے وجود میں آئی اس نے سفارت کاری کی راہ ہموار کی۔ یہ سیاسیات میں ایک نئی قدر کا اضافہ تھا۔ یہ فرض کر لینا غلط ہو گا کہ پی سس ٹریٹس یا رچی لیتو یا کرام ویل نے بھی اپنے نظریات کی بھی تجریدی نظام کے نظریات کے تحت مرتب کیے تھے۔ مگر دور روشن خیالی کی کامیابی کے بعد جو نتیجہ نکلا وہ یہی تھا۔

اس کے باوجود عظیم تہذیب کے عظیم تصورات کا تاریخی کردار ان نظریات سے قطعاً" مختلف تھا جو تجریدی مفکرین نے قائم کیے تھے۔ صداقت کے اثرات اس کے رجحانات سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ حقائق کی دنیا میں صداقت ایک ایسا ذریعہ ہے' اور یہ اسی قدر موثر ہوتا ہے جس قدر کہ مزاج پر حاوی ہوتا ہے۔ اور اس لیے افعال کے تعین پر اثرات ڈالتا ہے۔ ان کی تاریخی حیثیت کا تعین محض اس بنا پر نہیں ہوتا کہ

کیا وہ عمیق' درست' یا محض منطقی ہیں' بلکہ اس بنا پر ہوتا ہے کہ کیا وہ کسی امر کا اظہار کرتے ہیں؟ "مقبول نعرے" ایک ایسی اصطلاح ہے جس سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ بلا حقیقت دعووں کا کوئی مقام نہیں۔ بعض علامات زندگی میں بعض تجربات کا اضافہ کرتی ہیں۔ اس کا احساس مذہبی عروج کے دور میں ہوتا ہے مقدس مرقد مسیح' صلیبی جنگ آزماؤں کے لیے' نظارت کے موقع پر حضرت عیسیٰؑ کے خطاب کا متن۔ یہ ایسے دو تین جملے ہیں' جو ہمیشہ تحریک عمل کا باعث بنتے ہیں۔ لیکن مقبول عام نعروں کی بدولت ہی مہذب انقلاب برپا ہوتے ہیں۔ فلسفے / معاشرے کے نظام کا باقی ماندہ حصہ' جب کبھی بھی ظہور میں آتا ہے' اس سے تاریخ پر کوئی اثرات مرتب نہیں ہوتے۔ مگر جہاں تک مقبول عام نعروں کا تعلق ہے وہ دو صدیوں تک فضا میں گونجتے رہتے ہیں اور ان کے اثرات نبضوں میں دوران خون سے بھی زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ مگر یہی گراں قدر الفاظ جب شہروں کی متحجر فضاؤں میں داخل ہوتے ہیں تو ان میں زندگی کی حرارت ختم ہو جاتی ہے۔

لیکن---- تنقیدی روح دو رجحانات میں سے ایک پُر ضرور مبنی ہوتی ہے' جو غیر جاگیردارانہ تباہ کن مادیت سے برآمد ہوتے ہیں۔ تجریدی تصورات کے ساتھ ساتھ' تجریدی زر بھی وجود میں آ جاتی ہے---- زر کی وجہ سے برتر ارضی قوت ختم ہو چکی ہے...... مطالعہ کے ساتھ اعداد و شمار زر کے مراکز بھی سیاسی قوت بن چکے ہیں۔ داخلی طور پر یہ دونوں باہم متجانس ہیں' اور ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیے جا سکتے۔ پجاری اور شرفا میں قدیم مخالفت جاری رہی' اور اس میں ہمیشہ کی طرح شدت بھی قائم رہی۔ بورژوا ماحول اور شہری طریق کار میں اختلاف قائم رہا۔ ان دونوں میں مزید برآں زر کی صورت یہ ہے کہ یہ ہمیشہ تصوراتی صداقتوں کے مقابلے میں غیر مشروط طور پر اپنے آپ کو برتر ظاہر کرتی ہے' اور فی الحقیقت صورت بھی یہی ہے' (جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں) یہ تمام مقبول عام نعرے ہیں' اور ان سے اسی قدر مفہوم برآمد ہوتا ہے۔ اگر جمہوریت سے ہماری مراد صرف تیسری دنیا کی وہ خواہش ہو' جو وہ دنیا پر مسلط کرنا چاہتی ہے تو ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہیے کہ جمہوریت اور افلاطونیت دونوں ایک ہی شے ہیں' جس کے دو پہلو ہیں' خواہش اور حقیقت۔ نظریات اور عمل' علم اور فعل۔ یہ ایک السیاتی طربیہ عالم ہے' جس کا مظاہرہ مصلحین کی طرف سے ہو رہا ہے' اور آزادی کے مبلغین جو زر کے خلاف مصروف جہاد ہیں مگر ان کی وجہ سے زر کی قوت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اکثریت کے لیے احترام---- مگر زبانی نعرے کہ ہر شخص کو متوقع مساوات حاصل ہے۔ فطری حقوق' اور عالمی رائے عامہ---- یہ سب غیر جماعتی پردے کے عقب میں جماعتی مفادات کا تحفظ ہے۔ عوامی رائے کی آزادی (بالخصوص صحافت کی آزادی) کا مطلب یہی ہے۔ تصورات موجود ہیں مگر فی الحقیقت رائے عامہ کی آزادی میں وہ عنصر بھی شامل ہے جیسے زر کی قوت بھی شامل ہے۔ جب آپ صحافت کی آزادی کی بات کریں' تو اس کے ساتھ پریس کا ہونا بھی ناگزیر ہے' جو بغیر زر خرچ کیے حاصل نہیں ہوتا' اور جب رائے عامہ کے جائزے کے لیے انتخاب کرائے جاتے ہیں تو انتخابات کے عمل اور نظریات کے ابلاغ کے لیے بھی رقم درکار ہوتی ہے۔ جو رقم خرچ کر سکتا ہے وہ اپنی مرضی کی ڈفلی بھی بجا سکتا ہے۔ تصورات کی نمائندگی اس عمل کا صرف ایک پہلو ہے جبکہ زر کی نمائندگی اپنا کام اس کے برعکس دکھا سکتی ہے۔ آزادی اور اشتمالیت کے تصورات کو بھی رقم کے خرچ کے ساتھ ہی موثر بنایا جا سکتا ہے۔ ٹائبری اوس گریچس کی

جماعت کو مقبول بنانے کے لیے زر ہی نے اپنا کردار ادا کیا' اور جونہی انھوں نے اپنی مرضی کی اصلاحات کو انھوں نے قانونی شکل دے لی' انھوں نے اس تحریک سے اپنے آپ کو منقطع کر لیا اور تحریک ختم ہو گئی۔ قیصر اور کراسس نے کیٹی لی ناری تحریک پر اٹھنے والے اخراجات برداشت کیے اور اسے ارتکاز جائیداد کی بجائے مجلس قانون ساز کے خلاف استعمال کیا۔ انگلستان میں ۱۷۰۰ء ہی میں مشہور سیاست دانوں نے یہ کہہ دیا کہ جو شخص رائے دہندگان کی آرا میں تبدیلی لا سکتا ہے وہ حصص اور سرمائے میں بھی تبدیلی لانے کا اہل ہے۔ جس طرح ایک ایکڑ زمین کی قیمت ہر شخص کو معلوم ہے' اسی طرح ووٹ کی قیمت بھی خفیہ نہیں۔ جب واٹرلو کی شکست کی خبر پیرس میں پہنچی۔ ---- جیکوبیوں نے خونی مجبوریوں اور ذمہ داریوں کو نظر انداز کر کے دولت وصول کر لی۔ اور اس طرح خطہ زمین پر ان کا قبضہ ہو گیا نہ کوئی ایسا پرولتاری ہے اور نہ کوئی کمیونسٹ' جس نے دولت کے حصول کے لیے احتجاج نہ کیا ہو۔ اور وہ اس راستے پر نہ چلا ہو جو دولت طے کرتی ہے' اور جس کے لیے متعلقہ حالات میں دولت نے اجازت نہ دی ہو' اور اس تحریک کے تصور پرستوں کو کبھی اس طرز عمل کے خلاف شک تک نہیں ہوا جس شے سے دانش منع کرتی ہے' دولت اسے قبول کر لیتی ہے---- لہٰذا ثقافت کے دور آخر میں ہر ڈرامے میں دولت کا دخل ہوتا ہے۔ جب شہروں' ریاستوں نے تمام ذرائع اپنے قبضے میں لے لیے اور اس عمل میں دانش کو کوئی شکایت پیدا نہ ہوئی' کیونکہ آخر کار اسی کو فتح حاصل ہوئی---- کیونکہ دنیائے صداقت اور کتب میں جو تصورات پیش کیے گئے' ان کا اس حقیقی دنیا سے کوئی تعلق نہ تھا۔ انھیں تصورات کے تحت تہذیب کا ظہور ہوتا ہے مگر دولت جیت جاتی ہے' یہ تمام تصورات اسی کی دنیا میں پیدا ہوتے ہیں اور یہ دنیا اسی کی ہے۔

مغربی ریاستوں کی دنیا میں انگلستان میں تیسری ریاست کی سیاست کے دونوں پہلوؤں---- تصوراتی اور حقیقی---- کی درجہ بندی کا عمل مکمل کر لیا گیا۔ صرف اسی صورت میں یہ ممکن ہوا' کہ تیسری قوت مطلق العنان حکومت کے خلاف ایسے جلوس نہ نکالے جو اس کی تباہی کی غرض سے ہوں تاکہ اس کے کھنڈرات اپنی حکومت قائم کی جا سکے۔ کیونکہ اگر ایسی صورت پیدا نہ ہوئی تو یہ خود درجہ اول کی قوت میں ابھرے گی' اور اس طرح اپنی مرضی کی حکومت بنا سکے گی' اور اپنے مقصد کی تکمیل کی خاطر متعلقہ عناصر سے مدد حاصل کر سکے گی' اور ایسی حکمت عملی کی تشکیل کر سکے گی' جو اصلاح پسند اور ترقی یافتہ ہو گی' لہٰذا شورائیت کا ایسا حقیقی نظام وجود میں آ گیا جس کی نقل ممکن نہ تھی' جسے یہ مقام حاصل تھا کہ وہ خود ریاست کی بجائے نقطہ آغاز کا مقام حاصل کر لے' اور وہ تیسری قوت کی بجائے اول قوت بن جائے۔ مزید برآں ایسے حالات تھے' کہ یہ تحریک اس زمانے میں شروع ہوئی' جبکہ باروق اپنے اقتدار کی معراج پر تھے' اس لیے اس میں نغمہ و نے بھی تھا۔ شورائی نظام اور پارلیمانی نظام میں کوئی فرق نہ تھا ۔ اس کی کامیابی میں خلاف جمہوریت کا درپردہ دخل موجود تھا۔

یہ بھی انگلستان ہی میں ہوا کہ بھڑکیلے اور مقبول عام دانشورانہ نعرے وجود میں آئے اور مانچسٹر کے مدرسہ فکر سے ان کا تعلق بہت گہرا تھا۔ ہیوم' ایڈم سمتھ کا استاد تھا۔ "آزادی" سے مراد' ذہنی اور تجارتی

آزادی تھی۔ جارج سوم کے دور کے انگلستان میں حقیقی سیاست اور ناممکن تجریدی صداقتوں میں اختلاف نمایاں تھا۔ لوئیس چہار دہم کے فرانس میں بھی یہ حالات ناگزیر تھے۔ بعد ازاں ایڈمنڈ برک نے میرا بیو کو ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ "ہمیں اپنی آزادی چاہیے' جو صرف بنی نوع انسان کی آزادی نہ ہو بلکہ صرف انگریز کی آزادی ہو۔" فرانس نے اپنے تمام انقلابی تصورات بلا استثنا انگلستان سے حاصل کیے۔ جیسا کہ اس نے مطلق العنان حکمرانی کا تصور ہسپانیہ سے حاصل کیا تھا۔ ان دونوں تصورات کو ان کی شاندار حقیقی صورت میں حاصل کیا اور جلد ہی یہ تمام یورپ میں پھیل گئے۔ مگر ان کے عملی نفاذ کے متعلق اسے کوئی علم نہ تھا۔ بورژوا' مقبول عام الفاظ کا سیاست میں استعمال' حکمران جماعت کی دانش مندی اور اقتدار کے حصول کی خواہش تو پوری کر سکتا ہے مگر اس سے اس اقتدار کا بقا ممکن نہ ہو گا۔ تاوقتیکہ انتظامی معاملات کا بھی سلیقہ حاصل نہ ہو۔ انگلستان اس میں بھی کامیاب تھا۔ مگر انگلستان میں بھی دولت بلا جھجک خرچ کی گئی۔ نہ صرف یہ کہ اعلیٰ طبقے کے افراد کو رشوت دی گئی جو کہ ہسپانیہ اور وینیکن میں ایک معمول کا عمل تھا' پہلے پارلیمنٹ کا انتخاب اور پھر پارلیمنٹ کے فیصلے دونوں کو انصرام زر کے بل بوتے ممکن ہوتا انگلستان میں بھی آزاد صحافت کا تصور موجود ہے' اور سب کو معلوم تھا کہ صحافت اپنے مالک کی خدمت بجا لاتی ہے۔ یہ اپنی آزادانہ رائے کی تشہیر نہیں کرتی----- حالانکہ ایسے تصورات اس کے اپنے تخلیق کردہ ہوتے ہیں۔

دونوں مل کر حریت پسندی کو تشکیل دیتے ہی (وسیع مفہوم میں) یعنی ارضی زندگی میں حرکات و سکنات کے متعلق۔ استحقاق' ہیئت یا احساسات خواہ کوئی بھی صورت ہو' ہر قسم کی تنقید کے خلاف' اور دولت کو کسی بھی تجارت میں لگانے کے خلاف آزادی۔ مگر یہ دونوں بلا جھجک غلبہ حاصل کرنے کو اپنا مقصد بناتے ہیں' ایسی جماعت منظم کرنا چاہتے ہیں' جو ریاست کی غالب جبری حیثیت کو تسلیم نہ کرے۔ غالب علامتی نظام کا احترام کرے' اور حصول مقاصد کے لیے انجن کا کام دے۔ اس طرح ان قوتوں اور سریع الاعتقادی کے فرق کی بنیادی اہمیت تسلیم کرنا پڑتی ہے کیونکہ ثانی الذکر کا ردعمل قدیم روی طریق کار کا' ناجائز باروتی دخل اندازی کے خلاف دفاع ہے جو ہر لحاظ سے موزوں اسلوب حیات ہے۔ اب یہ دونوں باہم متحد ہیں اور تقریباً" ناقابل شناخت ہیں۔ صرف انگلستان میں (اس پر کئی بار زور دینا چاہیے) غالب طبقات نے نہ صرف ریاست کو مغلوب کر لیا' بلکہ تیسری قوت کو بھی اپنی داخلی قوت کے بل بوتے زیر کر لیا' اور اس طرح درجہ اول کی جمہوریت کو بھی رائج کر لیا۔ یہ قابل عمل جمہوریت ہے جس کی نہ تو قبل از وقت منصوبہ بندی کی گئی' نہ اس کے متعلق جلد بازی سے کام لیا گیا' اور یہ خود بخود ہی پختگی حاصل کر گئی۔ قدیم نسل کا اظہار' ایک ایسی حکمت عملی کا تسلسل' جو ہر جدید طریق کار پر عمل کا اہل ہے' جو زمانی تبدیلیاں اس کی تحویل میں دے دیں۔ پس اس کے نتیجے میں انگلستان کی پارلیمنٹ' مسلسل جنگوں میں حصہ لینے کے قابل ہو گئی اور مطلق العنان حکومتوں کے خلاف کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ ان جنگوں کو بھی تجارتی بنیادوں پر لڑا اور سر کر لیا۔ غیر ریاستی عناصر کی طرف سے بے اعتباری اس قدر شدت سے ہوئی کہ وہ ہر آن اس کی آزادی سلب کرنے کے درپے ہے----- سب سے اور ہر طرح سے----- آمریت کے ذریعے' جو کسی قانون کی پابند نہیں اس لیے ہر ترقی کے خلاف ہے۔ مزید برآں اپنے میکانکی رجحانات کے مطابق یہ دونوں دانش ور طبقات

اور زردار گروہوں میں مقبول ہے۔ مثال کے طور پر فرانس کی ریاستی مشین پر غور کریں جسے روبس پیری نے شروع کیا اور نپولین نے مکمل کیا۔ آمریت ایک ایسا جماعتی تصور ہے جو روسو' سینٹ سامن' روڈا طوس' اور لبلی کو بہت پسند تھا' جیسا کہ یہ چوتھی صدی کے کلاسیکی تصور پسندوں کو مرغوب تھا' جن میں ایکس ای نو فون سائرلوپیڈیا میں اور آئسو کوسٹ نکوکلیز میں مقبول تھے(۵۴)۔

مگر روبس پیری کا یہ مشہور عام فقرہ "کہ انقلابی حکومت ظلم کے خلاف آزادی کی مطلق العنان قوت ہے" ہمارے نقطہ نظر سے بھی زیادہ پرجوش ہے۔ یہ اس خوف کو زائل کر دیتا ہے جو ہر قدر کو ہلا کر رکھ دیتا ہے' اور مشکل حالات میں اپنے آپ کو موزوں نہیں سمجھتی۔ ایک فوجی دستہ جو تنظیم اور نظم و ضبط سے محروم ہو' وہ کسی بھی لمحے کسی قوت کے رہنما کے سامنے ہتھیار ڈال سکتا ہے۔ وہ اس حد تک گر سکتا ہے جتنا کہ ایک جائز حاکمیت کبھی سوچ بھی نہیں سکتی' برداشت کرنا تو بہت بعد کی بات ہے مگر بڑے پیمانے پر ہر تہذیب کے آغاز میں متعلقہ خطہ ارضی کی یہی حالت ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ گرتی ہوئی سیاسی قوت کی کوئی اور مثال نہیں' کہ وہ تمام کمزور ادارے جو اپنی لاطاقتی کی وجہ سے نمایاں ہوتے ہیں' جیسا کہ نپولین ازم کے متعلق کہا جا سکتا ہے' اپنے عہد میں کس قدر جرات اور دلیری سے رچی لیو ڈٹا رہا' اور انگلستان کا انقلاب اپنے خارجی حالات اور جبلی طور پر کسی قدر مستحکم تھا۔ یہاں حالات اس کے بالکل برعکس تھے۔ فرانڈے اپنی ہیئت قائم رکھنے کے لیے لڑ رہے تھے اور مطلق العنان حکومت اپنی موزوں صورت میں تھی' اور بورژوا اپنی حالت کو غیر موزوں بنا چکے ہیں' کسی نظام کا خاتمہ جو اپنی قدر و قیمت کھو چکا ہو' کسی جدت کا حامل نہیں----- کرامویل اور ٹائرین اول نے یہی کیا' مگر مرئی اشیا کے کھنڈرات میں کسی غیر مرئی کی کوئی علامت دستیاب نہیں ہوئی۔ رابس پیری اور نپولین نے کوئی ایسی بدیہی بنیاد نہیں چھوڑی' جس سے ان کی تخلیقی جدت کا اظہار ہوتا ہو۔ انھوں نے حکومت کی کوئی شاندار روایات قائم نہیں کیں۔ وہ صرف حادثاتی حاکمیت قائم کر سکے' جس کا کوئی ایسا معیار نہ تھا کہ ایک تربیت یافتہ اور موزوں باسلیقہ حکومت کا ہوتا ہے۔ ایسی حکومتیں تو اس انتظار میں ہوتی ہیں کہ کوئی ان پر غلبہ پائے اور اپنے قبضے میں کر لے۔ انقلاب زمانہ کے نشانات کی صورت یہی ہوتی ہے۔ دوسری صورت اس وسیع برتری کی ہوتی ہے' جو نسلوں تک قائم رہتی ہے اور جن کی روایت دوسرے کے مقابلے میں طویل ہوتی ہے۔

ٹائرین اول نے اپنی شہری حکومت غیر شرفا طبقات کی مدد سے مکمل کی' اور دوسرے ٹائرین کی مدد سے تباہ کر دی۔ ایک تصور کے مطابق چوتھی صدی کے بورژوا انقلاب کے تحت اس کا خاتمہ ہوا۔ ان سب کے لیے اس کا وجود' بطور انتظام' یا بطور عادت' یا لحاتی قوت کی صورت میں قائم رہا۔ فی الحقیقت کلاسیکی انسان کا کبھی خاتمہ نہیں ہوا۔ فی الحقیقت وہ اپنی سیاسی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہا' لیکن اس کی یہ حیثیت محض ایک علامتی قدر سے زیادہ نہیں ہوئی۔ وہ احترام اور عزت کا سزاوار رہا۔ یہ صورت وہی تھی جو مغرب میں بادشاہ کے ازلی حقوق کے یورپی تصور میں موجود رہتے ہیں' لیکن نپولین کی موت کے ساتھ ان کا وجود ختم ہو گیا' وہ ایک نیا شاہی خاندان قائم کرنے کے نزدیک پہنچ چکا تھا کہ خود ہی ختم ہو گیا۔

مزید برآں ان انقلابات میں جیسا کہ کلاسیکی تاریخ میں بالعموم پایا جاتا تھا' صرف عارضی اور مقامی حل ہی پیش کیے جاتے تھے۔ فرانسیسی انقلاب کی شان کی کہیں اور مثال نہیں ملتی۔ سطائل سے واٹر لو تک ان کے نظارے انتہائی سفاکانہ ہیں' کیونکہ اس ثقافت کی وجہ سے' جو بنیادی طور پر اقلیدسی احساسات کا حامل ہے' صرف ایک ہی امکان باقی رہ جاتا ہے کہ ایک فریق دوسرے فریق سے ٹکرائے اور ہار جانے والے کا ایک انجام ہی رہ جاتا ہے کہ اسے جڑوں اور شاخوں سمیت تباہ کر دیا جائے' اور مغرب کی طرح اسے فعالیت نظام میں شامل نہ کیا جائے۔ کور سائرا کے مقام پر (۴۲۷) اور آرگوس (۳۷۰) میں مقبوضہ جماعتوں کا قتل عام کر دیا گیا۔ لیوطینی میں (۴۲۲) طبقہ شرفا کو ادنیٰ ذاتوں کے لوگوں نے شہر سے باہر نکال دیا۔ انھوں نے غلاموں سے کچھ عرصے تک معاملات جاری رکھے۔ لیکن خارج کردہ آبادی کی واپسی کے خوف سے وہ خود ہی علاقہ چھوڑ کر سیرا کیوز میں بھاگ گئے۔ اس انقلاب کے نتیجے میں مہاجرین کی کثرت کی وجہ سے شہر بھر گئے۔ دوسرے ٹائرین میں سے کرائے کے فوجیوں کے لشکر تیار کیے گئے۔ ڈایا ڈوچی کی طرف سے اور بعد ازاں رومیوں کی طرف سے بھی شرائط صلح میں خارج کردہ افراد میں سے افواج کی تیاری ایک ایسا واقعہ ہے' جس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ مگر دوسرے ٹائرین نے تو اسی نوعیت کے اقدامات سے اپنی حیثیت بحال کی۔ ڈائیونا سیئس اول (۳۶۷-۴۰۷ ق م) نے سیرا کیوز پر غلبہ پا لیا۔ اس انقلاب کے نتیجے میں بے گھر ہونے والے سینکڑوں پناہ گزین مختلف شہروں میں پھیل گئے اور ٹائرین دوم کی افواج میں بھرتی ہو گئے اور شاہراہوں اور بحری راستوں میں بھیڑ لگا دی۔ ڈائیا ڈوچی اور بعد ازاں رومیوں نے جو شرائط صلح پیش کیں' ان میں ان پناہ گزینوں کا خصوصی ذکر ہے۔ مگر ٹائرین دوم نے بھی اسی قسم کے افعال سے اپنی حیثیت کو مضبوط بنا لیا۔ ڈائیو نامی اس (۴۰۷ - ۳۶۷ ق م) نے سیرا کیوز پر اپنا اقتدار قائم کر لیا------ یہ ایک ایسا شہر تھا جس کا اعلیٰ طبقہ ایتھنیوں کے ہمراہ ہیلا کی پختہ ثقافت میں مرکزی حیثیت کا حامل تھا۔ یہ وہی شہر تھا جس میں آنچی لس نے ۴۷۰ ق م میں اپنی فارسی زبان کی سہ ڈرامائی تشکیل کی۔ اس انقلاب کے بعد پڑھے لکھے افراد کو قتل کر دیا گیا اور ان کی جائیداد پر قبضہ کر لیا گیا اور اس کی غرض و غایت یہ بتائی گئی کہ آبادی کو دوبارہ منظم کیا جائے گا اور اعلیٰ طبقات کو مزید جائیداد دی جائے گی۔ اس کے متعلقین سے اسے مربوط کیا جائے گا اور ادنیٰ آبادی میں غلاموں کو عام شہریوں کے برابر درجہ دیا جائے گا۔ ان کے درمیان (کوئی غیر معمولی بات نہ تھی) بیویوں اور مفتوحین کی لڑکیوں کو تقسیم کیا جائے گا

کلاسیکی مخصوص رواج کے مطابق اس قسم کے انقلابات کی نوعیت ایسی تھی کہ ہمیشہ ایسی زیادہ تعداد بتائی جاتی' جس کا حقیقی وجود ہی نہ ہوتا۔ ان کا انبوہ کثیر ہوتا مگر ان میں سے ہر ایک اپنی مرضی سے راستہ اختیار کرتا' اور اپنی منزل پر روانہ ہو جاتا۔ ان کے اجتماعی وجود کا باعث صرف اسی قدر تھا کہ وہ سب ہمعصر تھے اور ایک ہی دور سے متعلق تھے۔ اسی طرح نپولین ازم میں ایک ایسا غیر ہیئتی نظام پہلی دفعہ قائم ہوا' جو ریاستی حدود سے بالاتر تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ریاستی حدود سے اپنے آپ کو منقطع نہ کر سکا۔ یہ سب سے پہلے فوج پر منکشف ہوا کہ قوم اپنی ہیئت کھو چکی ہے اور اس طرح فوج نے اپنے آپ کو آزاد قوت

سمجھنا شروع کر دیا۔ روبس پیری سے بونا پارٹ تک کا یہ مختصر راستہ ہے۔ جیکوبین کے زوال کے بعد کشش ثقل سول انتظامیہ سے فوج کی طرف منتقل ہو گئی' اور اولوالعزم جرنیل مختار کل بن گئے۔ مغرب میں یہ نیا رجحان کس قدر عام ہوا۔ برانڈوٹ اور ولنگٹن کی مثال سے دیکھا جا سکتا ہے اور اس سے بھی زیادہ فریڈرک ولیم سوم کی "اپنی قوم سے خطاب" (۱۸۱۳ء) ظاہر کرے گا۔ اس معاملے میں اس خاندان کے تسلسل پر فوج نے اعتراض کیا ہوتا اگر بادشاہ نے نپولین سے تعلقات منقطع کرنے میں سختی سے کام نہ لیا ہوتا

ٹائرینی دوم کے مخالفین السی بیاڈی اور لائی سینڈر' نے بھی اپنے آپ کو فوج میں اسی حالت میں مستحکم کر لیا اور اپنے اپنے شہروں پر پیلو پونیشی جنگ کے آخری مراحل میں قبضہ کر لیا۔ یہ شہری حلقوں کی کیفیت سے ایک مختلف صورت تھی۔ اول الذکر تو سرکاری حیثیت سے محروم کردہ شخصیت تھی۔ یہ شخص ملکی انتظامیہ کی رضامندی کے بغیر ۴۱۱ ق م تک ایتھنی بحریہ کی سربراہی کرتا رہا۔ دوسرا اگرچہ سپارٹا کا رہائشی نہ تھا' اپنے آپ کو فوج کا سربراہ سمجھتا تھا اور اس طرح اپنی ذاتی خواہشات کو پورا کرتا۔ ۴۰۸ ق م میں آڑ پر بالادستی قائم کرنے کے لیے دونوں افراد میں تنازع اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد ہی' سیرا کیوز کے ائیالوسی اس نے اپنی ذاتی فوج بڑی تعداد میں کھڑی کر لی' اور جنگ میں استعمال ہونے والے انجن (توپ خانہ) بنا لیے۔ ڈایا ڈوچی اور روم نے بھی اس کی تقلید کی۔ اس کے بعد فوج کی قوت اپنے آپ پر انحصار کرنے لگی' اور سیاسی قوت کی صورت اختیار کر لی۔ یہ معاملہ سنجیدگی اختیار کر گیا کہ ریاست کا مقام کیا تھا اور اس کی فوج اس کے کس قدر ماتحت تھی۔ یہ حقیقت کہ حکومت روم ۳۹۰ تا ۳۶۷ ق م پوری طرح افواج کے ہاتھوں میں رہی اس سے واضح ہوتا ہے کہ فوج کی اپنی حکمت عملی تھی۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ رومانیت جو ٹائرین دوم کے عہد میں ظہور میں آئی' وہ جرنیلوں کے زیر اثر تھی' جنھوں نے نہ صرف ہندوستان سے واپسی پر مجبور کیا' بلکہ وراثت کو اپنے گروہ میں معمول کے مطابق تقسیم کر لیا۔

یہ فی الحقیقت نپولین ازم ہے اور کسی قوم پر ذاتی حکومت' جو نہ قومی ہو نہ عدالتی' وہ بھی اسی ضمن میں آتی ہے۔ فوجی اور انتظامیہ کی حکمرانی بھی نپولین ازم ہی ہے۔ مگر کسی کی حکومت میں توسیع شہری حکومتوں کے قیام ہی کی ایک صورت ہے۔ صرف کلاسیکی ریاست ہی دنیا میں واحد مثال ہے جو اپنے حدود میں اضافے کے قابل نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ٹائرین دوم نے ان کا خاتمہ کر دیا اور دونوں علاقوں کو (شہری اور مقبوضات) ایک ہی وحدت میں مدغم کر لیا۔ ان دونوں کا انضمام آغاز میں حادثاتی تھا اور بروقت باعث خطر تھا' چنانچہ اچانک یونانی۔ رومی دنیا کے اتحاد کی صورت ظاہر ہوئی' جس کی اصل اہمیت کو ابھی تک درست طور پر نہیں سمجھا گیا۔ حدود پر واقع علاقے کا دائرہ اور اس کے اندر واقع چھوٹی چھوٹی شہری ریاستیں' جو مختصر ہونے کے باوجود ایک مکمل ریاست کا وجود پیش کرتی تھیں' عوامی معاملات جائیداد کا اصول اپنی حالت پر ہمیشہ قائم رہا۔ اس کے درمیان میں (فی الحقیقت جہاں تک افراد کا تعلق ہے ہر شخص کی برتری کسی ایک ہی امر تک محدود تھی) حقیقی سیاست کا تماشا ہو رہا تھا۔ استبداد اس صورت حال کے بیان کے لیے درست اصطلاح ہے۔ یہ حصول مقصد کا ایک ذریعہ تھا۔ رومنوں کا شہنشاہی کا تصور' جس میں انتظامیہ کے اختیارات کو شہر کے باہر

علاقوں تک محدود کر دیا گیا تھا اور یہ اختیارات اس وقت خود بخود ختم ہو جاتے' جب کوئی شخص شہری حدود
کے اندر داخل ہو جاتا۔۔۔۔۔ جہاں تک صوبائی علاقوں کا تعلق ہے تو وہ عوامی مفادات کے مستحق نہ تھے۔
اگر کلاسیکی مزاج کا اظہار کیا جائے تو وہ صرف شہری آبادی ہی کو ریاست سمجھتے تھے' اور ان کو ہی سیاسی حقوق
حاصل تھے' اور ان سے باہر کے لوگوں کو ان سے تعلقات کی بنا پر ہی کوئی رتبہ دیا جا سکتا۔ ڈائیانوسی اس
نے سیراکیوز کے شہر کو ایسا قلعہ بنا دیا' جس کے اردگرد ریاستوں کے ملبے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے' اور اس
کے بعد اپنے دائرہ اختیار کو شمالی اٹلی اور ڈالماتی ساحل' شمالی اڈریاٹک کے جنوب تک بڑھا لیا۔ مقدونیہ کا
فلپ اپنے استاد قرائی کے جیسون (جسے ۳۷۰ ق م میں قتل کر دیا گیا تھا) کے نمونے پر برعکس منصوبہ قبول کر
لیا' اور اپنا مرکز ثقل دائرہ محیط میں قائم کر لیا۔ (اس سے مراد یہ ہے کہ عملی طور پر افواج پر انحصار کرنے
لگا) اور اس طرح یونانی ریاستوں کو بھی اپنے دائرہ اختیار میں لے آیا۔ اس طرح مقدونیہ کی سرحدیں
ڈینیوب تک پھیل گئیں اور سکندر کی موت کے بعد اپنی حدود میں سلیوکس اور بطلیموس کے علاقے بھی شامل
کر لیے۔ ان میں سے ہر ایک پر کسی شہری ریاست اقتدار قائم رکھا جاتا (انطاکیہ اور سکندریہ) مگر ان کے
انتظام میں مقامی آبادی کے بعض افراد کو بطور ایجنٹ شامل کر لیا جاتا اور اس طرح مقامی انتظامیہ کا نظام چلایا
جاتا۔ اس سے نظم و نسق کی حالت اس کے مقابلے میں بہت خراب ہو گئی' جو کلاسیکی علاقوں میں تھی۔ اس
دوران (۳۲۶ ۔ ۲۶۳ ق م) روم نے بھی' اطالیہ کے مرکز میں اپنے علاقے کی تعمیر کی' اور اسے سرحدی
ریاست قرار دیا' اور اسے ہر طرف سے نو آبادیوں' اتحادیوں اور اضافی بستیوں سے مضبوط بنایا' اور انھیں
لاطینی حقوق بھی دیے۔ پھر ۲۳۷ ق م سے کار تھیج کے لیے ہال برکا فتح کیا۔ اس پرانے شہر کو کلاسیکی اسلوب
حیات کے مطابق تعمیر کیا' اسی طرح ہسپانیہ میں بھی کلاسیکی سلطنت کے اثرات قائم ہو گئے۔ سی فلیمین نے
(۲۲۵) وادی پو کو روم کے لیے فتح کیا' اور بالاخر قیصر نے اپنی کیلک سلطنت قائم کر لی۔ یہی وہ بنیاد تھی جس
پر کہ مشرق میں ڈایا ڈوچی کی نپولین کے لیے پہلی جدوجہد کا آغاز ہوا' اور مغرب میں سکائی پیو' اور ہینی بال
نے جدوجہد کی۔۔۔۔۔ دونوں صورتوں میں شہری حدود میں اضافہ ہو گیا۔۔۔۔۔ بالاخر قیصری ٹرانمووائرس نے'
تمام سرحدی ریاستوں نے اپنی مدد آپ کے تحت روم میں اولین مقام حاصل کر لیا۔

۷

روم میں مضبوط اور مسرت آگیں تصور کی ریاست نے جو ۳۴۰ ق م تک قائم رہی' معاشرتی انقلاب
کو دستوری حدود کے اندر رکھا۔ نپولین کے اطوار کا ایک شخص "اپی اس کلاڈی اس" جو ۳۱۰ ق م میں
ایک محتسب تھا اور جس نے اپی ان کی شاہراہ کے علاوہ ایک بہت بڑا بند تعمیر کرایا تھا' اس نے روم پر
ایک ظالمانہ حکومت کی۔ جب اس نے کوشش کی کہ ایتھنی نمونے پر ایک شہری ریاست قائم کرے اور
کاشتکاروں کے طبقے کو تباہ کر دے' تو وہ بہت جلد اپنے منصوبے میں ناکام ہو گیا۔۔۔۔۔ کیونکہ اس کا ارادہ یہ
بھی تھا کہ غلاموں کی اولاد کو بھی مجلس انتظامیہ میں شامل کر لے اور طبقہ شرفا کے لیے زمین کی بجائے زر کو
معیار بنایا جائے اور تقسیم اراضی کے لیے آزاد اور بے زمین کاشتکاروں اور دیہاتی قبائل بھی شامل کر لیے

جائیں تاکہ دیہاتی آبادی کے ووٹ کم ہو جائیں (کیونکہ جب کبھی مجلس کے لیے رائے شماری کی جاتی تو دیہاتی
ووٹوں کی تعداد زیادہ ہوتی)۔ مگر احتساب میں اس کے جانشینوں نے بلا تاخیر اس کی اس حکمت عملی کو بدل
دیا اور بے زمین زراعت پیشہ افراد کو دوبارہ شہروں میں منتقل کر دیا۔ بے زمین کاشتکار خود بھی بعض نمایاں
خاندانوں کی اقلیت کی اہل رہنمائی میں اپنا مقصد پا لیا (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اور سمجھ گئے کہ انھیں
تباہی کی بجائے تعمیر میں فائدہ ہے مگر زمین کے حصول کے لیے مجلس کی منظوری لازمی تھی۔ چنانچہ انھوں نے
تمام عہدوں پر اپنی نمائندگی کا اہتمام کر لیا (اور ۳۰۰ ق م میں منعقد ہونے والی مجلس میں بھی یہی صورت
قائم رہی) اور ۲۸۷ ق م میں ہونے والے فسادات میں انھوں نے عوامی رائے دہی کا حق حاصل کر لیا اور
اس کے لیے مجلس قانون ساز کی منظوری بھی ضروری نہ سمجھی گئی۔

اس تحریک آزادی کا عملی نتیجہ اس سے بالکل مختلف نکلا جس کی تصوراتی لوگوں نے توقع کر رکھی
تھی' مگر روم میں کوئی تصوراتی آبادی نہ تھی۔ اس تحریک کی کامیابی نے غیر زمیندار طبقات سے اس کا مقصد
چھین لیا اور انھیں قوت متحرکہ سے محروم کر دیا۔ کیونکہ جب وہ حزب مخالف میں تھے تو مضبوط تھے۔ یہ
صورت نہ رہی تو وہ اپنی قوت سے بھی محروم ہو گئے۔ ۲۸۷ ق م کے بعد ریاستی ہیئت محض سیاسی مفادات
کے لیے قائم رہی۔ کیونکہ اس کا محل وقوع ایسا تھا کہ اس کے اردگرد روم' کار تھیج' مقدونیہ' شام اور مصر
کی حیثیت بہت نمایاں تھی۔ چنانچہ کسی طرح بھی اسے عوامی حقوق کی نفی کا خطرہ نہ رہا اور اسی تحفظ کی بنیاد
پر یہ قوم اپنی ہیئت پر قائم رہی اور شان و شوکت کی عظمت سے ہمکنار ہوئی۔

ایک طرف تو اس نے عوام میں مقبولیت حاصل کی۔ لیکن دوسری طرف آزاد آبادی کی بڑی تعداد کی
اس میں شمولیت کی وجہ سے اس کا قومی شعور کمزور پڑ گیا(۵۹)۔ سیاسی رجحانات' درجہ بندی اور دولت کے
باعث اس میں ایک بالائی طبقہ پیدا ہو گیا جس نے اپنی قوت کو قدیم خاندانوں میں جلد ہی مدغم کر لیا۔ اس
کے نتیجے میں افراد کا ایک تنگ دائرہ وجود میں آگیا' جو اپنی نسلی برتری' پرشکوہ زندگی' اور وسیع تر سیاسی نقطہ
نظر کا مدعی تھا' جس میں کہ حکومت سپہ سالاری' اور کلام کی تمام خوبیاں موجود تھیں' اور اسے ان کا وسیع
تجربہ تھا' جو گزشتہ نسلوں سے ان میں منتقل ہوتا رہا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ کاروبار حکومت ان کا ورثہ ہے' اور
اس کا حصول ان کے لیے لازمی ہے اور وہ اپنے بچوں کو بھی حکومت کے کاروبار کی تعلیم دیتے اور اپنی
خاندانی روایات پر فخر کرتے۔ طبقہ شرفا کا کوئی دستوری جواز تو موجود نہ تھا لیکن وہ اسے مجلس انتظامیہ میں
منظور کرا لیتے۔ یہ ایسا ادارہ تھا جو آغاز ہی سے طبقہ اشرافیہ کا ممد و معاون رہا تھا (یعنی وہ طبقہ اشرافیہ جس کا
ذکر ہو مرنے کیا ہے)' مگر چوتھی صدی کے وسط سے یہ لوگ خارج کیے جا چکے تھے۔۔۔۔۔ یعنی وہ لوگ جو
حکمرانی اور سپہ سالاری انجام دیتے تھے اب تاحیات رکنیت حاصل کر چکے تھے اور اسمبلی اور ریاست دونوں پر
قابض ہو چکے تھے۔ ۲۷۹ ق م میں بھی مجلس کے متعلق سائناس نے' جو پائرا ہوس کا سفیر تھا' یہ رائے ظاہر
کی کہ مجلس کا عام وطیرہ ایسا ہے کہ وہ بادشاہوں کی انجمن معلوم ہوتی ہے اور اس کے اراکین اپنے آپ کو
شہزادگان' نواب اور معززین کہلاتے ہیں۔۔۔۔۔ اعلیٰ رتبہ' اختیارات' اور شان و شکوہ کے مدعی ہیں اور

اپنے آپ کو ان کا ساتھی سمجھتے ہیں جنھوں نے ڈایا ڈوچی کے ساتھ حکمرانی کی تھی پھر ایک ایسی حکومت وجود میں آئی جس کی مثال کسی اور ثقافت میں شہری ریاست کے طور پیش نہیں کی جا سکتی۔ ایک ایسی روایت قائم ہوئی جس کی اور مثال تلاش نہیں کی جا سکتی۔ ممکن ہے کہ وینس اور پوپ کی باروتی ریاست کا حوالہ دیا جا سکے اور اس طرح ایک مختلف صورت حال پیدا ہو گئی۔ یہاں ایسے کوئی نظریات نہ تھے' جو ایتھنز کے کھنڈرات سے منسوب ہیں۔ کوئی ایسی صوبائیت نہ تھی' جیسی کہ سپارٹا میں پیدا ہوئی اور اس نے مقابلے کی صورت اختیار کر لی۔ مگر محض رواجات میں شان و شکوہ کا اسلوب پیدا کیا گیا۔ اگر دنیائے تاریخ میں روم ایک نقید المثال تناظر پیش کرتا تھا تو یہ محض رومیوں کی وجہ سے نہیں۔ عوام الناس کی صورت تو خام مال کی سی ہوتی ہے جو فی نفسہ دوسروں ہی کی طرح ہوتے ہیں اور ان کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں ہوتی۔ لیکن یہ ایک خاص طبقہ تھا' جس نے روم کو یہ صورت بخشی۔۔۔۔ خواہ مخواہ۔۔۔۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ مخصوص اسلوب حیات کی قوم' جو ۳۵۰ ق م تک کسی اہمیت کی حامل نہ تھی (ماسوائے مرکزی اٹلی کے) بتدریج تمام کلاسیکی تاریخ کا مرکز بن گئی' اور جس کی بدولت تاریخ کے آخری دور کا نام رومی دور کی تاریخ قرار پایا۔

اس مختصر دائرے میں مکمل سیاسی صلاحیت کا ثبوت مہیا کیا (یہ ایسا علاقہ تھا' جسے کوئی سیاسی حقوق حاصل نہ تھے)۔ اس نے جمہوری حکومت کو اسی طرح منظم کیا کہ اس علاقے میں انقلاب آ گیا۔۔۔۔ ایسی ہیئت کو وجود دیا کہ جن سے باقی مقامات پر بھی اقتدار کے تعین کا کام سہل ہو گیا۔ اس میں صرف ایک ایسا عامل تھا کہ اگر اسے غلط طریق سے استعمال کیا جاتا تو وہ فوری تباہی کا باعث بنتا۔ وہ قواعد و ضوابط میں درج وہ مخصوص اختیارات کی تعبیر تھی۔۔۔۔ مگر انھوں نے ان اختیارات کو عمدگی اور خاموشی سے استعمال کیا کہ اعلیٰ درجے کے تجربے کا مظاہرہ نظر آتا ہے۔ جبکہ عوام کو ہمیشہ یہ یقین رہا کہ فیصلے صرف ان کی مرضی کے مطابق ہی کیے جا رہے ہیں۔

مقبولیت حاصل کرنا اور تاریخ میں شاندار کامیابی حاصل کرنا۔۔۔۔ اس کا راز حکمت عملی میں ہے اور اس معاملے میں حکمت عملی کا امکان' بالخصوص ان مخصوص حالات میں' رومی حکومت جیسی کوئی دوسری حکومت آج تک مثال پیش نہیں کر سکی۔

اس کے باوجود' اس تصویر کا دوسرا رخ' زر کی قوت کی بالاتری میں ظاہر ہوا۔ اس کے بعد ملکی معاملات میں زر کا پلہ ہمیشہ بھاری رہا جس نے اپنے آپ کو کثیر الذرائع کہا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس کے پاس زر کی مقدار دوسروں سے زائد ہے اور اس کے لیے حکام کے دائرے میں عوام کے رد عمل کا احساس بھی ناگزیر تھا اور فوج کی قوت کی اہمیت کو بھی پیش نظر رکھنا بھی لازمی تھا اور طبقہ شرفا کے خاندانوں کی رہنمائی میں' اکتیس دیہاتی قبائل کا خیال رکھنا بھی ضروری تھا' جن کی شہری آبادی میں کوئی نمائندگی نہ تھی۔ اس لیے وہ تمام شدید اقدامات جو اسی اس کلاڈی نے اختیار کیے تھے' دوبارہ عمل میں لائے گئے۔ اعلیٰ درجے کے مالی طبقات اور عوام کے مابین تعلقات جو کہ بعد کے زمانے میں بہت عمدہ رہے (گر یکی اور ماری

اوس کے دور میں)۔ ان کی وجہ سے خونی تعلقات کی روایت کا خاتمہ ہو گیا ۔ جو کہ کئی نسلوں سے مسلسل چلا آ رہا تھا اور اس سے نجات ناممکن معلوم ہوتی تھی۔ بورژوائی اور چھوٹے زمیندار' زر اور جاگیرداری' نے ایک توازن قائم رکھا اور اپنی اپنی علیحدہ حیثیت بھی قائم رکھی۔ آپس میں متحد رہے اور ان کی وجہ سے ریاست کا تصور بھی قائم رہا (ان میں طبقہ شرفا روح رواں تھا)۔ مگر اس دور میں آ کر یہ صورت چکنا چور ہو گئی اور دونوں رجحانات ایک دوسرے کے خلاف کام کرنے لگے۔ پہلی پیونی جنگ ایک تاجرانہ جنگ تھی' اور اس کا ہدف کسان تھے۔ اس لیے اسی اس کلاڈی اس نے (جو کہ ایک بڑے محتسب کی نسل سے تھا) یہ معاملہ بڑی کونسل کے سامنے پیش کر دیا۔ دوسری طرف پو کے میدانوں کی فتح' زراعت پیشہ قبائل کے مفاد میں تھی۔ اس لیے یہ معاملہ بھی کونسل کے ایجنڈے میں شامل کر لیا گیا۔ سی فلے می نس کی معدلہ نے اسے منظور کر لیا۔ رومی تاریخ میں یہ پہلا عمل تھا جو قیصریت کا غماز تھا' اور فلامی نس سرکس کی نوعیت کا تھا۔ جب اس حکمت عملی کے نفاذ کا وقت آیا (۲۲۰ ق م کے احتساب میں) تو اراکین مجلس تجارت میں لگ گئے اور عوام کو سو سپاہیوں کے دستوں میں شمولیت کی اجازت دے دی۔ عملی طور پر وہ صرف اول پیونی جنگ کے نو دولتے شرفا کی مدد کرنا چاہتا تھا (اس کے باوجود کہ وہ خود بھی ان میں شامل تھا) اور اس طرح وہ زر کی ریاست کا عظیم خالق بن کر سامنے آیا۔۔۔۔ اس طرح اس نے ایک ایسے عمل کا آغاز کیا جس کی رو سے ایک صدی بعد طبقہ شرفا کا کلی طور پر خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد جب ہینی بال (جس کے سامنے فلیمی نس میدان جنگ میں گر گیا تھا) کا خاتمہ کر دیا گیا تو زر حکومت کے لیے بھی "آخری دلیل" بن گئی' تو یہ اس کی حکمت عملی کا کمال تھا۔۔۔۔۔ یہ آخری ریاستی حکمت عملی تھی' جس کا کلاسیکی دنیا کو علم تھا۔

جب سکیپیو اور اس کے حواریوں کا حکومت میں عمل دخل ختم ہو گیا' تو ماسوائے انفرادی آرا کے کسی حکمت عملی کا وجود باقی نہ رہا جو بلا کسی جھجک کے' اپنے اپنے مفادات پر عمل پیرا رہتے اور زر ناجائز کو مال غنیمت سمجھتے۔ پولی بی اس مورخ (جس کا تعلق اسی حلقے سے تھا) فلے مینی اس کو محض ایک جذباتی مقرر قرار دیتا ہے اور گر یکی دور کے تمام مصائب کا اسی کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ جہاں تک فلے کے ارادوں کا تعلق ہے' تو یہ مورخ بالکل غلطی پر ہے۔ مگر اس کے اعمال کے اثرات کے متعلق اس کا بیان درست ہے۔ فلے می نس بھی قدیم کاٹو کی طرح۔۔۔۔ جس نے اپنی اندھی خواہشات کے تحت عظیم سکیپیو عالی حکمت عملی کے تحت اقتدار سے محروم کر دیا۔۔۔۔ مگر اس کا نتیجہ اس کی خواہشات کے برعکس نکلا۔ زر' خونی رشتوں کی جگہ لے گیا' اور تین سالوں سے بھی کم عرصے میں چھوٹی زمینداریوں کا خاتمہ ہو گیا۔

کلاسیکی عوام کے لیے یہ امر باعث خوش قسمتی تھا کہ صرف ایک شہری ریاست' یعنی روم اپنے غیر متغیر قانون کے ساتھ باقی رہ گئی اور اس پر انقلاب کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کے برعکس یہ ایک معجزہ ہی تھا' کہ مغرب میں' جہاں کہ شجرہ ہائے نسب لوگوں کے خون میں رچے بسے ہیں' کسی ایک مقام پر بھی کوئی تشدد آمیز انقلاب وجود میں آ جائے۔۔۔۔ اس وقت پیرس مراد ہے یہ طاقت نہیں' بلکہ کمزوری کا مظاہرہ تھا جو فرانسیسی مطلق العنانیت کی وجہ سے پیدا ہوئی' جس کی وجہ سے انگلستان کے تصورات' زر کی قوت سے مل کر

دھماکہ خیزی کا باعث ہوئے اور اس طرح دور روشن خیالی کے مقبول عام دلاویز الفاظ' نیکی اور تشدد' آزادی اور قوت استبداد باہم جمع ہو گئے اور ۱۸۳۰ء اور ۱۸۴۸ء کے چھوٹے چھوٹے واقعات اور جدید دور کی اشتمالیت' جو کسی حادثے کے انتظار میں ہیں خود انگلستان میں بھی خاندانی امرا کی حکومت قائم رہی۔ فرانس میں ان لوگوں نے پہلے سے بھی زیادہ شان و شوکت کا مظاہرہ کیا مگر وہاں پر یقینی طور پر فاکس اور شیریڈان کے اردگرد ایک ایسا چھوٹا سا گروہ موجود تھا' جو انقلاب کے تصور سے متاثر تھے۔ یہ تمام کے تمام انگریزی صوبے سے متعلق تھے اور یہ لوگ بالغ رائے دہی اور پارلیمانی نظام کی بات کرتے تھے لیکن دونوں سیاسی جماعتوں کو ایک ٹوری (پٹ دی ینگر) کی رہنمائی میں اس پر رضا مند کر لیا گیا کہ وہ ہر اس تحریک کو مات دے دیں جو بورژوا کے مفادات اور خاندانی امرا میں ذرہ برابر بھی دخل اندازی کرے۔ انگریز امرا نے فرانس کے خلاف بیس سالہ جنگ کا آغاز کر دیا اور یورپ کے باقی بادشاہوں کو بھی اس پر رضامند کر لیا کہ بالاخر نہ صرف نپولین کو ختم کر دیا جائے بلکہ انقلاب فرانس کا بھی خاتمہ کر دیا جائے۔ انقلاب فرانس نے سادہ دلی سے ایسے اقدامات کیے کہ متعدد انگریز مفکرین سیاسیات کے متعلق نجی طور پر سوچنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریز حلقوں نے فرانسیسی معاملات کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا

انگلستان میں جسے حزب اختلاف کہا جاتا تھا' وہ صرف اسی قدر تھا کہ وہ اس طبقہ امرا کے خیالات کا پرچار کرے جو دوسری سیاسی جماعت یعنی حکمران جماعت میں شامل نہ ہو۔ اس سے مراد دوسری یورپی حکومتوں کی طرح پیشہ ورانہ تنقید حکومت نہ تھی اور یہ دعویٰ نہ تھا کہ حکومت کے مقابلے میں یہ کام حزب اختلاف زیادہ بہتر انداز میں کر سکتا تھا' بلکہ یہ ایک عملی کوشش ہوتی' جس میں حزب اختلاف اپنے آپ کو تیار اور موزوں رکھتا کہ جب بھی ضرورت پڑے حکومت پر قبضہ کر لے۔ مگر یہ حزب اختلاف فورا"----- اور اپنے معاشرتی مفروضات سے قطعا" بے خبر----- اس طریق کار کو اپنے لیے نمونہ قرار دیتی جو فرانس یا کسی اور ملک کے تعلیم یافتہ طبقات نے اپنا مقصد بنا رکھا ہو' کہ ایک ایسے طبقے کا اقتدار جو خاندانی امرا کا تحفظ کا ضامن ہو اور ثانی الذکر کے مستقبل کا محافظ ہو۔ موتس کیو کے بعد سے انگریزی نقطہ نظر میں جوش و خروش اور غلط فہمی کا غلبہ تھا۔ مگر براعظم یورپ کے ممالک جزائر پر مشتمل نہ تھے اور اس طرح انگلستان کے ارتقا کی شرط اول ہی کو پورا نہ کرتے تھے۔ انگلستان صرف ایک پہلو سے نمونہ قرار دیا جا سکتا تھا' کہ جب بورژوا طبقے نے ملک کو مطلق العنانیت سے جاگیردارانہ ریاستوں کے مجموعے میں واپس لا کھڑا کیا' تو انھوں نے دیکھا' کہ وہ ابھی تک اسی مقام پر کھڑے ہیں' جہاں سے کہ ہم روانہ ہوئے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ انگلستان میں ہمیشہ طبقہ امرا ہی نے حکومت کی ہے----- کچھ بھی ہو تاج کے پاس اختیارات موجود نہ تھے۔

اس مراجعت کا نتیجہ اور براعظم یورپ کی ریاستوں کی بنیادی ہیئت' تہذیب کے آغاز میں "دستوری بادشاہت" رہی ہے۔ یہ ایک ایسی صورت ہے جیسے ہم آج کل زبان میں "جمہوریہ" کا نام دیتے ہیں----- یہ امر ایک دفعہ ہمیشہ کے لیے واضح ہو جانا چاہیے کہ ایسے عقائد والوں کی دبی دبی گفتگو' جو لازمانیت کے تصورات کے تحت گفتگو کرنے کے تحت اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں' اور یہ سمجھتے ہیں کہ جمہوریت نفی

نفی ایک ہیئت کا نام ہے۔ انیسویں صدی کے جمہوری تصور کا قدیم کلاسیکی عوامی حکومت کے تصور سے کوئی تعلق نہیں' اس کا قدیم اور ابتدائی سوئٹزر لینڈ کے جمہوری اداروں سے بھی کوئی مماثلت نہیں۔ انگریزی دستور یورپ کے دستوری مزاج کے مطابق ایک رہنما تصور ہے۔ وہ شے جسے ہم جمہوریہ کا نام دیتے ہیں' وہ ایک منفی عمل ہے' جو ایک داخلی لزوم کا اصول موضوعہ ہے' اس میں متروک اشیا کا امکان بھی ہر وقت موجود' یہ بادشاہ سے حاصل کردہ عدم شاہی کا تصور ہے۔ مغربی بنی نوع انسان میں شجرہ نسب کا احساس بہت مضبوط ہے' وہ ہر وقت یہ اظہار کرتا ہے کہ اس کے احساسات کا سرچشمہ خاندانی روایات ہیں۔ اگرچہ اس کے خاندان کا کوئی وجود باقی نہیں ہوتا۔ اس میں تاریخی مضمرات جاگزین ہوتے ہیں' اور تاریخی مضمرات کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس سے بہت فرق پڑتا ہے کہ کیا کلاسیکی دنیا میں' خاندانی اصول کا کوئی مقصد یا وجود تھا بھی یا نہیں۔ خاندانی مضمرات کسی انسان کی داخلی احساس پر قطعا" کوئی اثر پیدا نہیں کرتے یا جیسا کہ مغرب کا معاملہ ہے کہ اپنی ذات تک پہنچتے پہنچتے کم از کم چھ تعلیم یافتہ نسلیں گزر چکی ہوں۔ احساس تمام دساتیر کا خفیہ دشمن ہے۔ یہ محض منصوبہ بندی ہے اس سے ارتقا عمل میں نہیں آتا۔ آخری تجزیے کے مطابق یہ خوف اور عدم تحفظ کے خلاف ایک ہتھیار کی حیثیت کا حامل ہے۔ آزادی کا شہری تصور----- آزادی کسی شے سے----- انسان کو غیر خاندانی تنگ حالات میں مقید کر دیتی ہے۔ گویا خاندان کے خلاف تصورات زیادہ اہم ہیں اور جمہوری تصورات کی زندگی ان سے ہی عبارت ہے' یعنی جمہوری روایات میں خاندانی روایات کا کوئی مقام نہیں۔

اس قسم کی نفی نظریات کے وزن کو شامل کر لیتی ہے جب کہ خاندانی تصورات اور اس کا متجانس نظریہ "حکمت عملی" نبض کی قدیم روایت کا تحفظ کرتے ہیں۔ جبکہ دستور میں مختلف نظاموں کا بھاری وزن بھی شامل ہوتا ہے' جن میں کتابی اصولوں اور موضوعہ تصورات کی بھرمار ہوتی ہے----- ایسے تصورات کو انگلستان میں سوچا بھی نہ جا سکتا تھا۔ جہاں حکومت کی ہیئت کسی شے کی نفی اور دفاع کی صورت موجود نہ تھی۔ یہ بلاوجہ نہیں کہ فاؤستی ثقافت میں مطالعہ اور تحریر کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ مطبوعہ کتاب مادیت کی علامت ہے اور مطبع وسعت مکانی اور لامتناہیت کا تصور پیش کرتا ہے۔ ان علامات کی بے بہا قوت اور جبر کے باوجود چینی تہذیب تحریر سے خالی نظر آتی ہے۔ دستور میں ادب کو علم انسان اور علم الاشیا کے برعکس پیش کیا گیا ہے۔ زبان کو نسل کے خلاف اور تجریدی حقوق کو کامیاب روایت کے خلاف سمجھا گیا ہے----- اس امر کے قطع نظر کہ کوئی قوم جب حالات کے مدوجزر میں الجھی ہوئی ہو' اس وقت بھی وہ کسی کام کے قابل ہو سکتی ہے اور اپنی ہیئت کو قائم رکھ سکتی ہے۔ میرا بیٹو نہ صرف تنہا تھا' بلکہ وہ اس قابل بھی نہ تھا' کہ وہ اسمبلی کا مقابلہ کر سکے جو سیاست کو داستان طرازی سے خلط ملط کر رہی تھی۔ اس عہد میں دستور کے تین بڑے عوامل تھے۔ ۱۷۹۱ء کے فرانسیسی' ۱۸۴۸ء اور ۱۹۱۹ء کے جرمن----- مگر عملا تمام ایسی کوششوں میں انجام کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جاتی ہیں اور عملی دنیا میں----- ذرا اس کا تصور کریں----- کہ یہی عمل خود مقصد کی شکست کا باعث ہے۔ غیر متوقع واقعات کی بجائے مضبوط شخصیت اور حکمانہ ماحول میں صرف سلسلہ علت و معلول کی حکومت ہوتی ہے۔ اس پر وقت کی قید نہیں انصاف پرور' غیر متبدل' معقول

جسے علت و معلول کا توازن برقرار رہتا ہے۔ یہی علامت اس کی تائید کرتی ہے کہ کسی بھی دستور میں زر کو سیاسی قوت نہیں سمجھا گیا۔ اس میں صرف نظریات کی ابتدا سے انتہا تک بحث ہوتی ہے۔

دستوری بادشاہت کے متعلق اختلاف ناقابل علاج ہے۔ اس میں حقیقی اور تصوراتی' عمل اور تنقید' فطری طور پر ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ یہ اس باہمی جنگ کی وجہ سے ہے جو بتدریج ناکارہ بنا دیتی ہے' جسے عام پڑھا لکھا طبقہ بین الاقوامی سیاست کا نام دیتا ہے۔ پروشیا' جرمنی اور آسٹریا کے معاملے سے علاوہ جہاں پر کہ سب سے پہلے دستور وجود میں آیا' مگر موجودہ حالات میں قدیم سیاسی روایات کا کوئی اثر نہیں پایا جاتا------ یہ صرف انگلستان تھا جس میں کہ حکومت کے عمل کو متجانس رکھا گیا۔ اس ملک میں نسل اور اصول کو اپنے اپنے مقام پر رکھا گیا۔ لوگوں کو اس امر کا شعور تھا کہ سیاست یعنی حقیقی سیادت کا ہدف تاریخی کامزانی ہے۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا تعلق تربیت سے ہے' ظاہری ہیئت سے نہیں۔ مگر ایک کائناتی حقیقت جو اس سے ظاہر ہوتی ہے' وہ یہ ہے کہ انگلستان میں گھوڑوں کی دوڑ کا تربیت دینے والا دنیا کے تمام فلسفیوں سے زیادہ دانا ہے۔ شکل و صورت تربیت میں عمدگی پیدا کرتی ہے' مگر اس کا بدل نہیں ہو سکتی اور اس طرح انگلستان کا اعلیٰ طبقہ جو ا-ٹن اور بالیول میں تربیت حاصل کرتا ہے' اور ان درسگاہوں سے ایسے سیاسی رہنما نکلتے ہیں جو مستقل یقین سے لیس ہوتے ہیں۔ ایسے افراد پروشیا کے ادارہ تربیت افسران ہی میں پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ صاحب ذوق نکتہ رس' اور روانی نبض کے ماہرین (خفیہ طریق کار' رائے اور تصورات اس سے مستثنیٰ نہیں) اس لیے جب یہ نوجوان ان درس گاہوں سے تیار ہو کر نکلتے ہیں' تو اس قابل ہوتے ہیں کہ اس بورژا طوفان کا مقابلہ کر سکیں جس نے ۱۸۳۲ء سے قوم کو اپنے دباؤ میں لے رکھا تھا اور اس طرح وجود کی لہروں کو اپنی مرضی کے مطابق سمت مہیا کر سکیں۔ انھیں ایسی تربیت حاصل ہوتی ہے کہ وہ لطافت اور حسن ذوق کی پوری مہارت کے ساتھ' حالات کے گھوڑے پر سواری کر سکتے ہیں' اور انھیں اپنی فتح قریب سے قریب تر محسوس ہوتی ہے۔ وہ اپنے اصولوں پر عمل کر کے عوام کی رہنمائی کرتے ہیں' کیونکہ وہ جانتے ہیں' کہ بھنور کا باعث وہ دولت ہے جو ان کے اصولوں کی راہ میں حائل ہو سکتی ہے۔ ان عظیم اصولوں کو انھوں نے ظالمانہ سختی کی جگہ استعمال کیا جو اٹھارھویں صدی میں بالعموم مروج تھی۔ یہ طریق کار کتنا بھی عمدہ ہو' اچھے اثرات پیدا نہیں کرتا۔ سادہ ترین عمل یہی ہے کہ اپنے حریف کو انتخابات میں مات دی جائے۔ یورپ کے اصول پسندوں نے جمہوریت کے صرف ایک رخ کا مطالعہ کیا۔ ایسے ممالک میں جہاں دستور موجود نہ تھا مگر انسانوں کو تربیت حاصل تھی۔ چنانچہ ان کا اجتماعی طور پر مشاہدہ کیا گیا۔

یورپ میں بھی اس غیر واضح احساس کو کبھی پوری طرح سے نظر انداز نہیں کیا گیا۔ کیونکہ باروق کی مطلق العنان حکومت کا تصور یہاں موجود تھا' جس کی ہیئت سب پر واضح تھی۔ مگر دستوری بادشاہت پر اتفاق رائے غیر مسلسل ہی رہا۔ قدامت پسند اور آزاد خیال سیاسی جماعتوں کی پوری طرح شناخت کی جاتی تھی' نہ صرف کیننگ کے انگلستان کے دور کے بعد بلکہ بعد میں قائم ہونے والی' آزمودہ حکومتی طرز عمل سے بھی ان کے مختلف رنگ مشاہدے میں آتے رہتے تھے۔ باری باری سے آنے والی تمام حکومتوں کی کارکردگی سے

لوگ واقف تھے اور ان کے زیر اثر وہ اپنے دستور میں مناسب تبدیلیاں پیدا کرنے کے خواہش مند تھے۔ یعنی روایت اور نظریہ دونوں کا' کیا پارلیمنٹ خاندانی روایات کا احترام کرے گی؟ یا اس کے برعکس خاندانی عناصر پارلیمنٹ کا احترام کریں گے؟ یہ مسئلہ موضوع بحث و اختلاف تھا۔ اس اختلاف کی وجہ سے یہ فراموش کر دیا گیا کہ اصل مقصد تو حکمت عملی مرتب کرنا تھا' ہسپانوی اور انگریز دساتیر یکساں طور پر اور مل جل کر ترقی نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ انیسویں صدی میں یہ صورت پیدا ہو گئی کہ داخلہ اور خارجہ حکمت عملی کو علیحدہ علیحدہ بنیادوں پر قائم کیا جائے اور دونوں کی سمتیں الگ ہوں' یہ دونوں احساس بنیادی ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے اجنبی بن گئے۔ زندگی میں ایسی تلخی پیدا ہوئی کہ وہ کبھی بھی اپنی ذات سے باہر نہیں نکلی۔ تھری ڈور کے بعد فرانس' بورژوائی طبقے کے زیر اقتدار آ گیا۔ اسے قابو میں رکھنے کے لیے کئی دفعہ فوجی آمریت وجود میں آئی (مثلاً ۱۸۰۰' ۱۸۵۱' ۱۸۷۱' ۱۹۱۸ء میں)۔ بسمارک کا وجود فی الحقیقت خاندانی اقتدار کا نمائندہ تھا' جس کے ساتھ پارلیمانی نظام کو اس کی سربراہی میں دے دیا گیا تھا اور داخلی احساس اور اختلافات کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ وہ سیاسی توانائی پر قبضے کی خواہش دونوں فریقوں میں تھی اور بالآخر ۱۹۱۶ء کے بعد خود جسم نامی ہی ختم ہو گیا' فوج کی اپنی تاریخ تھی اس کی عظیم روایت فریڈرک ولیم تک پہنچتی تھی اور اس طرح انتظامیہ کی بھی اپنی روایت تھی اور ان کے مابین اشتمالیت کی تربیت کی سیاسی نوعیت بھی موجود تھی۔ یہ سب کے سب انگریزی طریق کار کے مخالف تھے۔ افسروں اور کارکنوں کی اعلیٰ تربیت کی گئی تھی مگر اس کے سیاسی تربیت کی غرض و غایت کو محسوس نہیں کیا گیا تھا۔ اعلیٰ معاملات کو انتظامی طریق کار کے تحت انجام دیا جاتا اور معمولی واقعات کو صرف اچٹتی نظر سے دیکھ لیا جاتا۔ اس کے نتیجے میں فوج اور انتظامیہ بجائے خود ایک مقصد کی صورت اختیار کر گئے۔ بسمارک کے منظر سے ہٹ جانے کے بعد یہ محسوس ہوا کہ ملک میں کوئی ایک بھی ایسا افسر موجود نہیں' جو اس کی جگہ لے سکے (یہ صورت حال ہی کسی ایسے شخص کو وجود میں لا سکتی تھی) اور اس کی حکمت عملی اور کام کو جاری رکھ سکے۔ مگر جنگ عالم گیر نے اعلیٰ سطح کو تباہ کر دیا تھا اور صحیح معنوں میں کچھ بھی باقی نہ بچا تھا۔ سیاسی جماعتیں' صرف حزب اختلاف کے طور پر تربیت یافتہ تھیں اور انھوں نے معیار حکومت کو اتنا پست کر دیا کہ کسی بھی مہذب ملک میں ایسی مثال موجود نہ تھی۔

مگر آج پارلیمانی نظام مکمل حالت خستگی میں ہے۔ یہ بورژوا انقلاب کے تسلسل ہی کی ایک صورت تھی۔ ۱۷۸۹ء کی تیسری ریاست کا ارتقا جسے ایک قانونی شکل دے دی گئی تھی اور اسے ایک حکومتی ادارے کے طور پر اسے مخالف خاندانی نظام کے ساتھ منسلک کر دیا گیا تھا۔ تمام جدید انتخابات فی الحقیقت ایک نجی جنگ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جو بیلٹ باکس کے ذریعے لڑی جاتی ہے اور اس میں ہر نوع کے تقریری اور تحریری مہمات کا استعمال کیا جاتا ہے اور اس میں ہر پارٹی لیڈر ایک نوعیت کا نپولین ہی ہوتا ہے۔ اس ہیئت میں بھی اسے مغربی تہذیب میں لامحدود جواز حاصل ہے۔ مگر اس کے دائرے سے باہر یہ ایک احمقانہ اور ناقابل عمل فعالیت قرار پائے گی اور مستقبل بعید میں اس کی بدولت بورژوا معیار غالب آ جائیں گے

اس تمام کے باوجود پارلیمانی نظام مطلق العنان شہری حکومتوں اور باروق ریاستوں کی طرح سربراہی

نظام نہیں------ بلکہ ایک مختصر عبوری صورت ہے------ جس کا مطلب یہ ہے کہ ثقافت کے آخری دور اور اس عہد کے مابین کا ایک دور ہے جو افراد اور دنیائے سیاست کے عدم امتیاز پر مبنی دور ہو گا جو کسی کے نام سے منسوب نہ ہو گا۔ اس کی صورت انیسویں صدی کے پہلے نصف کے مکانات اور فرنیچر سے ہو گی' جسے عہد باروق کی باقیات کہنا مناسب ہو گا۔ پارلیمانی عادت انگریزی رکوکو ہے---- مگر اس میں شعور ذات اور خون کی کمی ہے۔ مگر ایک سطحی آغاز کار ہے جو دوسروں کی رضامندی اور خیر خواہی پر منحصر ہے۔ صرف اس کے ابتدائی اور مختصر ایام میں اس میں گہرائی اور جوش و خروش کا مظاہرہ کیا گیا۔ اس کے بعد یہ صرف ظفریاب طبقات کے ایسے نقل کی صورت اختیار کر گئی جو شکست حریق پر اپنی برتری کو طول دینے کی ایک خواہش کی صورت ہے۔ ہیئت کے قیام کی خواہش خواہ اس سے ذاتی مفادات اور روایات کی تردید بھی ہوتی ہو۔ مگر جب ان روایات کا سنجیدہ مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ فی الحقیقت پارلیمانی نظام کا اس سے قبل ہی اختتام ہو چکا ہے۔ غیر جاگیر دارانہ طبقات دوبارہ اپنے فطری مفادات کی بنیاد پر مختلف گروہوں میں تقسیم ہو چکے ہیں اور ظفریاب اور مغلوب سیاسی جماعتوں کے مابین شدت آرزو میں کمی آ چکی ہے۔ جونہی اس جدید تصور کی کشش میں کمی واقع ہو جائے گی' تو حدود کی پابندی' مقاصد کے حصول کے لیے غیر پارلیمانی طریقہ ہائے کار کے استعمال کے بغیر (اور اس کے باوجود بھی) بیلٹ باکس نمودار ہو جائیں گے---- جیسا کہ زر' معاشی دباؤ اور سب سے بڑھ کر ہڑتال' اپنے موزوں اوقات میں ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ کسی بڑی شہری ریاست کے باشندوں میں' یا مضبوط دل و دماغ کے لوگوں میں اس نظام کے لیے کوئی عزت نہیں۔ کیونکہ نہ تو اس کا کوئی ماضی ہے اور نہ اس کے اثرات میں گہرائی موجود ہے اور جب یہ معلوم ہو جائے کہ متعدد طریقہ کار ہائے حکومت میں سے یہ بھی ایک صورت ہے تو یہ صرف ایک نشان اور سائے کی صورت میں باقی رہ جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز سے (انگلستان میں بھی) پارلیمانی نظام وہ کردار ادا کر رہا ہے جو کسی وقت صرف بادشاہ کر سکتے تھے۔ یہ قدامت پسندی کی قدر کا مظہر بن چکا ہے جبکہ عظیم حکمت عملی کا مرکز ثقل بادشاہوں کے ہاتھوں سے نکل کر عوام کو منتقل ہو چکا ہے اور اب یہ عوام کے ہاتھوں سے نکل کر غیر سرکاری گروہوں اور ان کے ارادوں کو منتقل ہو رہا ہے۔ جنگ عالم گیر نے یہ کارروائی مکمل کر دی ہے اور قدیم پارلیمانی نظام کی طرف اب مراجعت کا کوئی راستہ نہیں جو فی الحقیقت لائیڈ جارج اور نپولین کے فرانسیسی فوجیوں کی طرف سے مراجعت کا دوسرا نام ہے۔ جہاں تک امریکا کا تعلق ہے وہ اب تک ایک طرف الگ تھلگ خود کفتنی حالات میں پڑا ہوا ہے۔ وہ حکومت یا ریاست کی بجائے ایک خطہ ہے اس میں صدر اور کانگریس دو متوازی قوتیں ہیں' جو اس نے موٹیسکیو کے ایک نظریے سے اخذ کیے ہیں۔ اسی پس منظر میں وہ دنیا کے سیاسی تناظر میں داخل ہوتا ہے اور حقیقی خطرات کے زمانے میں وہ ایسی غیر ہیئتی قوتوں کے لیے راستہ خالی چھوڑ دیتا ہے جن سے میکسیکو اور جنوبی امریکا مدتوں سے آشنا رہے ہیں۔

۸

اس کے ساتھ ہی عظیم تصادمات کا دور شروع ہوتا ہے' جس میں کہ ہم آج مبتلا ہیں۔ یہ نپولین ازم

اور قیصریت کے مابین کا عبوری دور ہے جو ارتقا کا ایک عمومی پہلو ہے اور دو صدیوں تک تمام ثقافتوں میں موجود رہے گا۔ چینی اسے شان کو کہتے ہیں۔ یہ دعویٰ دار ریاستوں کا دور ہے (۴۸۰ تا ۲۳۰ ق م)۔ یہی صورت حال کلاسیکی دنیا میں (۵۰-۳۰۰) میں قائم تھی   آغاز میں صرف سات عظیم قوتوں کو تسلیم کیا گیا۔ آغاز میں تو اس عمل میں کوئی منصوبہ بندی نہ تھی' لیکن بعد میں ان کے مقاصد واضح سے واضح تر ہوتے گئے اور ان کے ناگزیر نتائج میں انقلابات اور جنگوں کا وجود نمایاں ہوتا گیا۔ ایک صدی گزرنے کے بعد بھی ان میں سے پانچ موجود ہیں۔ ۴۴۱ چاؤ خاندان کا حکمران ایک مشرقی نواب کی ریاست کا وظیفہ خوار بن گیا اور اس کے پاس جو باقی ماندہ علاقہ تھا' وہ بھی ضائع ہو گیا اور بعد کی تاریخ میں اس کا کوئی ذکر موجود نہیں۔ شمالی مغربی علاقے میں اسی دور میں غیر فلسفیانہ   انداز میں تسین کے نام سے ایک رومی ریاست وجود میں آ گئی جس نے اپنے اثرات کے حلقے میں مغرب اور جنوب کی سمت میں تبت اور یونان میں ایک طویل قوس کی صورت میں اضافہ کیا اور اس طرح دوسری ریاستوں کو بھی اپنے حلقے میں لے لیا۔ تاؤسٹ کے جنوب میں واقع تسو کی حکومت کی طرف سے مخالفت کا مظاہرہ ہوا   جبکہ چینی تہذیب نے دریا سے آگے مزید جنوب میں ایسے علاقوں کی سمت پیش قدمی کی' جن کے متعلق پہلے کچھ بھی علم نہ تھا' اسی زمانے میں روم اور یونان میں بھی مخالفت کا آغاز ہو گیا جس میں ایک طرف واضح طور پر عزم لی القوت کا اظہار ہوتا تھا اور دوسری طرف عالی ترقی کا رجحان بھی موجود تھا۔ ۳۴۰ - ۳۶۸ ق م میں (جو پیونی جنگ دوم کا زمانہ تھا۔ اسی دور میں چین کے اندر ایسی جنگ اقتدار شروع ہو گئی جس نے تمام چین کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اس قدر کشت و خون ہوا کہ چین کی آبادی میں کمی واقع ہو گئی۔ اتحادی جن کی زمینیں تسین کے مقابلے میں دس گنا زیادہ تھیں۔ انھوں نے دس لاکھ کے قریب آدمی کٹوا دیے۔ تسین کے پاس ابھی بھی محفوظ فوج موجود تھی۔ شروع سے آخر تک دس لاکھ انسان کام آئے۔ بعد ازاں وہ جمعیت الاقوام کا حامی بن گیا (باب تسونگ) (جو اس وقت تک محض ایک تصور ہی تھا) اور دو عظیم متحد حکومتیں ترتیب دیں (۳۳۳ اور ۳۲۱ ق م میں) چونکہ ان دونوں فریقوں میں پہلے جنگیں ہو چکی تھیں' اس لیے یہ دونوں ہی جلد ختم ہو گئیں اور ان میں صحیح اتحاد کبھی قائم نہیں ہوا۔ اس کا سب سے بڑا مخالف چانگ آئی تھا جو شہنشاہیت کا پکا حامی تھا وہ ۳۱۱ ق م میں ایسے مقام پر پہنچ گیا تھا کہ چین کی حکومت پر قبضہ کر لے جبکہ اس کے منصوبے میں تبدیلی کی وجہ سے اسے ناکامی نصیب ہوئی۔ ۲۹۴ ق م میں اس نے پی کائی کی مہم کے لیے کوشش شروع کر دی'   ۔ اس کی فتوحات کے اعزاز میں تسین کے بادشاہ نے اپنے آپ کو اساطیری عہد کا صوفی بادشاہ قرار دیا   اس سے اس کی مراد یہ تھی کہ وہ تمام دنیا کا حاکم ہے۔ مشرق میں طائی   ۔ کے بادشاہ نے بھی اس کی تقلید میں یہی وطیرہ اختیار کیا اس کے ساتھ ہی دوسری فیصلہ کن جدوجہد کے دور کا آغاز ہو گیا۔ تعداد کے حوالے سے آزاد ریاستوں نے کم ترقی کی۔ ۲۴۶ ق م میں کنفیوشس کی ریاست "لو" ختم ہو گئی اور ۲۴۹ ق م میں چاؤ خاندان کا اختتام ہو گیا۔ ۲۴۶ ق م میں طاقت ور وانگ چینگ تیرہ سال کی عمر میں تسین کے تخت پر بطور شہنشاہ جلوہ گر ہوا اور ۲۴۱ ق م میں اپنے اتالیق لوئی شائی کی مدد سے (چین کے مائی سین   اس نے اپنی آخری جنگ لڑ کر فتح حاصل کی۔ شہنشاہ تسو کو شکست ہوئی جس نے جنگ آزمائی کا ارتکاب کیا تھا۔ ۲۲۱ ق م میں یہ واحد حکمران تھا۔ اس نے شائی کا خطاب اختیار کیا (جو آگسٹس کا ہم معنی ہے) ' اس سے چین میں شہنشاہیت کا

آغاز ہو گیا۔

بنی نوع انسان کو ایسے دور کا کبھی سامنا نہیں ہوا' جس میں ہیئت کی اس قدر مختلف انواع ہوں' یا افراد کے ہاتھ میں اتنی بڑی قوت ہو جس قدر کہ دعوئی دار ریاستوں کے زمانے میں پیش آیا۔ اس درجے تک جس میں کہ پوری قوم کی اس قدر سیاسی تشریط عمل میں آ چکی ہو۔ ایسی صورت میں ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ افراد سیاسی تخلیقات کے قابل ہو جاتے ہیں' اور یہ سوچنے لگتے ہیں کہ ہمیں ہر قیمت پر اقتدار ملنا چاہیے اور قوت کے تناظر میں پوری قوم یا ثقافت کی تقدیر اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں' ایسے حالات کی قبل از وقت کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔ متعلقہ روایت کی جگہ' جو ذہین و فطین افراد کے ساتھ فیصلہ کر سکتی ہے (کیونکہ یہ خود بھی ایک بہت بڑی کائناتی قوت ہے)۔ اب ہم نے عظیم سانحاتی انسان کا مشاہدہ کر لیا ہے۔ ان کا عروج کا حادثہ کمزور آدمی کو اوپر لے آتا ہے۔ (مثال کے طور پر اہل مقدونیہ) راتوں رات عروج کی انتہائی منازل طے کر گئے' اور ان کی موت کا حادثہ (مثلاً قیصر کا) مفتوحہ عالم کو پستی میں دھکیل سکتا ہے۔

فی الحقیقت قدیم عبوری ادوار میں بھی ظاہر ہوتا رہا ہے۔ فرانڈے جس میں منگ شو پہلا ٹائرین تھا' جب کہ عوام کی حالت موزوں نہ تھی اور وہ موزونیت کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ ایسے حالات میں ہی وہ بڑے لوگ پیدا ہوتے ہیں جو اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ ان کی عظمت کا تعین اور فرائض منصبی کی حد بندی مشکل ہو جاتی ہے۔ ثقافت میں سے تہذیب میں تبدیلی بھی جو کہ خصوصی طور پر نپولین ازم کا وطیرہ ہے' اس مقام تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی۔ مگر اس کے ساتھ ہی جو فی الواقع غیر متصور تاریخی حقیقت کی تمہید ہے' عظیم افراد کا حقیقی دن طلوع ہوتا ہے۔ ہمارے لیے یہ دن جنگ عالم گیر (اول) کے دوران طلوع ہوا تھا۔ کلاسیکی عالم میں یہ ہنی بال کے ساتھ منسلک تھا' جنھوں نے روم کو یونان کے نام پر دعوت مبازرت دے دی (داخلی طور پر وہ ان سے ہی متعلق تھا)۔ مگر حقیقی طور پر وہ مشرقی یونان کا باشندہ تھا۔ بالکل کلاسیکی رواج کے مطابق' وہ اپنے وقت کے معانی بہت دیر سے سمجھ سکا یا یہ بھی ممکن ہے کہ سمجھنے سے قطعاً" قاصر رہا ہو اور اس کے زوال کے ساتھ وہ دور شروع ہوا' جو سی پی اس سے لے کر' ا ملیڈس پالوس تک جاری رہا۔ جس میں فلے می نس' کاٹوز' گر یکی' ماری اوس اور سلا اور آگسٹس' سب کے ادوار گزر گئے۔ چین میں اس دور میں' جب کہ دعوئی دار ریاستیں برسر عمل تھیں' مدبروں اور جرنیلوں کا ایک سلسلہ تسین میں اسی طرح جمع ہو گیا' جیسا کہ کلاسیکی پیکر روم میں جمع تھے۔ چین کی تاریخ کے سیاسی پہلو کو سمجھنے کے لیے ان لوگوں کو بالعموم سوفسطائی کہا جاتا ہے   یہ ایسا ہی تھے۔ مگر صرف ایسے مفہوم میں یہ لوگ ایسے ہی تھے مگر اسی دور کی رومیوں کی طرح رواقی تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھیں مشرقی یونان کے فلسفے اور فصاحت و بلاغت کی تعلیم دی گئی تھی۔ یہ تمام ماہر مقرر تھے اور کبھی کبھی فلسفے پر کتابیں بھی لکھتے رہتے تھے۔ قیصر اور بروٹس کسی طرح بھی' کاٹو اور سسرو سے کم نہ تھے۔ مگر وہ یہ شغل بطور پیشہ ور فلسفی اختیار نہ کرتے تھے' کیونکہ اس دور میں یہ شرفا کا وطیرہ تھا کہ وہ فلسفے سے دلچسپی رکھیں۔ وہ حقائق کے ماہر تھے۔ خواہ وہ میدان جنگ میں یا سیاسی میدان میں وہ اس مہارت کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ استاد چانگ آئی اور سو تسین کے متعلق بھی یہ حقیقت

اسی طرح درست ہے   ۔ اور فان سائی بدقسمت سفارت کار جس نے پی کائی جیسے جرنیل کا تختہ الٹ دیا تھا۔ وائی تسائی ایک قانون ساز تھا' اس کا تعلق تسین سے تھا۔ لوئی شائی پہلے شہنشاہ کا مائی سی تاس تھا اور متعدد دیگر افراد بھی ان میں شامل تھے۔

ثقافت نے ان تمام قوتوں کو ایک مقام پر قابو کر رکھا تھا اور ایک مخصوص صورت دے رکھی تھی اور وہ اب آزاد ہو چکے تھے اور فطرت----- جو ایک کائناتی امر ہے----- فوراً" ان پابندیوں سے بے پرواہ ہو گئی۔ مطلق العنان ریاستی حیثیت سے ایسی ریاستوں کی حیثیت میں تبدیلی جو جدوجہد میں معروف ہوں' تہذیب کے ظہور کی علامت ہے۔

نظریات اور تصورات کے پرستار اسے جو چاہیں سمجھ لیں----- مگر حقائق کی دنیا میں اس کی حیثیت ایک عبوری دور کی ہے جو ایک دستوری حکومت اور مطلق العنان شخصی حکومت کے مابین ناگزیر ہے' بہت زیادہ علامتی اور شخصی اقتدار کسی ثقافت کے دور آخر کے ہمراہ وقوع پذیر ہوتا ہے۔ چین میں یہ ۶۰۰ ق م کلاسیکی دنیا میں ۲۵۰ ق م اور ہمارے لیے ۱۷۰۰ء اس کا وقوع ہوا۔ سلا اور پومپئی میں اس کے اثرت کم از کم تھے اور ہم تک اس کی رسائی اگلے سو سال میں متوقع ہے (غالباً" ہو بھی چکی ہو)۔ متعدد بین الریاستی' اور داخلی تضادات' خوفناک انقلابات' کثرت سے زندگی میں داخل ہوتے رہتے ہیں مگر ان کی وجہ سے جو سوالات بلا استثنا پیدا ہوتے ہیں (شعوری طور پر یا بلا تکلف غیر شعوری طور پر) غیر دستوری اور بالاخر خالص ذاتی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ان کی کوئی تاریخی اہمیت نہیں ہوتی جو کچھ بھی ان کا نظریاتی مقصد ہو' لیکن ہم ان مقبول عام نعروں سے نا آشنا ہیں جو چین اور عرب میں انقلاب کی اس سطح پر رواج پذیر ہوئے۔ ہم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ اس دور میں کوئی مقبول عام نعرے تھے بھی یا نہیں۔ اس عہد کے متعدد انقلابات میں سے کوئی بھی' جو زیادہ سے زیادہ بے بصر ہو وہ کسی تباہ شدہ شہری ثقافت کے عوام کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس نے شاید ہی کبھی کوئی کامیابی حاصل کی ہو یا کبھی اس کے لیے کامیابی کا کوئی امکان بھی پیدا ہوا ہو جو باقی رہ جاتا ہے وہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے' جو قدیم ہیئت کی تباہی اور قیصریت کے نفاذ کے لیے راستے کی ہمواری ہے۔

مگر جنگوں کے متعلق بھی صداقت یہی ہے کہ ان میں افواج' ان کی حکمت عملی اور طریق کار زیادہ سے زیادہ تخلیقی ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کا تعلق دور سے تو نہیں' مگر ایک بے قابو انفرادی قائدین' جنھوں نے اپنی صلاحیتوں کو بہت تاخیر سے اور حادثاتی طور پر دریافت کیا۔ جبکہ ۳۰۰ ق م میں بھی روم میں افواج موجود تھیں' مگر ۱۰۰ ق م میں ماری اس' سلا اور قیصر کی بھی اپنی افواج موجود تھیں' اور ہشت پہلو فوج' جس میں قیصر کے قدیم اور تجربہ کار فوجی شامل تھے۔ ان افواج پر جرنیلوں کا کوئی حکم نہ چلتا تھا' بلکہ یہ لوگ جرنیلوں کو اپنے زیر اثر رکھتے تھے۔ مگر اس سے طریقہ ہائے جنگ' اس کے ذرائع' اور مقاصد میں وحشیانہ فطری تندی کی صورت پیدا ہو گئی   جو قدیم روایات سے بالکل مختلف تھی۔ ان کے آمنے سامنے مقابلے

اٹھارھویں صدی کی مبارزت طلبی کی نوعیت کے نہ تھے۔ ان کے یہ مقابلے فوجی سرداروں کی طرح کے نہیں تھے۔ ان کے لیے کوئی قواعد و قوانین مقرر نہ تھے نہ اس امر کی گنجائش تھی کہ ایک فریق جب چاہے' دست برداری یا تکان کا اظہار کرے یا یہ کہ زیادہ سے زیادہ کتنی قوت استعمال کی جائے اور کس صورت میں کسی ایک فریق کو فاتح قرار دے دیا جائے۔ یہ جنگیں ایک دائرے کے اندر مکوں اور دانتوں سے لڑی جاتیں۔ یہ ایک فریق کی جسمانی تباہی تک جاری رہتیں اور فاتح فریق پر کوئی پابندی یا اصول کا اطلاق نہ ہوتا۔ فطرت کی مراجعت کی سب سے پہلی اور بڑی مثال انقلاب فرانس اور نپولین کی افواج نے پیش کی۔ جنھوں نے کم افواج کے ساتھ مصنوعی معرکہ آرائی کی بجائے' قتل عام کے طریق کار پر عمل کیا اور نقصانات کا کبھی خیال نہیں کیا اور روکوکو کے دور کی عمدہ تہذیب کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ قوم کے تمام مردوں کو میدان جنگ میں گھسیٹ لائے۔ جبری بھرتی کا نظام رائج کیا۔ یہ تصور فریڈرک اعظم کے اصولوں کے بالکل برعکس تھا(۷۷)۔

بالکل اسی طرح ہر ثقافت میں یہ طریق عمل کسی قدر رکاوٹ اور جھجک سے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن ہنر میں ترقی کے ساتھ' یہاں تک کہ دور تہذیب نمودار ہو جائے' یہ اچانک مزید آگے بڑھتا ہے اور تمام میکانکی امکانات پر دباؤ ڈال کر انھیں اپنی خدمت میں لگا لیتا ہے' اور فوجی ضروریات کے مطابق ایسے نئے میدان عمل بھی تلاش کر لیتا ہے' جو ابھی تک پوشیدہ تھے---- مگر ایسے وقت میں اعلیٰ نسلوں کے افراد کی ذاتی جرات' اور شریفانہ روایات اور گزشتہ ثقافت کی لطیف ذہانت غیر موثر ہو جاتی ہیں۔ کلاسیکی دنیا میں جہاں پر کہ بڑی بڑی افواج کا وجود بالکل ناممکن ہو چکا تھا اور وہ چھوٹی چھوٹی افواج رکھنے پر مجبور تھے' ان میں کینائی' فلی اور ا یکٹیم کی تعداد بہت زیادہ ہوتی۔ (سیراکیوز کے ڈائنی سوس اکثریت میں تھے(۷۸)۔ انھوں نے جنگ کے دوران میکانکی تیک نیک کو دوران جنگ بہت بڑے پیمانے پر استعمال کیا۔ اس کے بعد محاصرے کے عمل کا آغاز ہوا۔ رہوڈس میں ۳۰۵ ق م اور سیراکیوز میں ۲۱۳ ق م' کار تھیج ۱۴۶ ق م اور ا یلبسیا ۵۲ ق م ان سب میں سرعت رفتار اور تیزی عمل کی اہمیت' کلاسیکی حکمت عملی کا ایک حصہ بن گئی۔ یہ رومی لشکریوں کے رجحان کے عین مطابق تھا' جس کی تشکیل یونانی عہد میں مکمل ہوئی۔ ایتھنز اور سپارٹا کے ملیشیا پانچویں صدی ق م سے اس راہ عمل پر گامزن تھے۔ چین میں ۴۷۴ ق م سے لوہا اسلحہ جنگ کے لیے کاٹ کر استعمال کیا جاتا تھا۔ منگولی رسالے بھی اسی سال سے بھاری جنگی رتھیں استعمال کر رہے تھے۔ پھر اچانک ہی قلعہ بند ہو کر لڑنا بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ۔ مہذب انسان تیز رفتاری کی فطری خواہش رکھتا ہے۔ رفتار اور تحرک یورپ اور امریکا میں باہم جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ فاؤستی عزم تسخیر فطرت کے شامل ہونے کے باعث جنگ کے لیے ایسی ترکیبیں اختیار کیں اور ایسے اسلحات ایجاد کیے' کہ فریڈرک اعظم انھیں دیوانگی قرار دیتا۔ مگر ہمارے لیے جب ہم نقل و حمل اور دوسری صنعتوں میں اس قدر ترقی کر چکے ہیں' ان جنگی ہتھیاروں کو دیکھ کر کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ نپولین نے اپنے توپ خانے میں گھوڑے استعمال کیے۔ اور اس طرح اسے بہت زیادہ متحرک بنا لیا (اس نے اسی طرح انقلاب فرانس کی افواج کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے خود کتنی متحرک دستوں میں تبدیل کر لیا) اور ویگرام اور بروڈینو میں اس نے اپنی مادی تاثریت کو اس

قدر مستحکم کر لیا جسے ہم آج کل تیز گولہ اندازی اور بلند بانگ گولہ اندازی کے نام سے موسوم کرتے ہیں(۸۰)۔

دوسرا درجہ زیادہ اہم ہے۔ اس میں امریکی خانہ جنگی ۶۵-۱۸۶۱ء میں فوجیوں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ وہ نپولین کی جنگوں میں شامل تعداد کی حد بھی پار کر گئی اور پہلی دفعہ افواج کی نقل و حرکت کے لیے افواج کا استعمال کیا گیا۔ پیغام رسانی کے لیے تار برقی' اور بحری راستوں کی بندش کے لیے دخانی جہاز استعمال میں لائے گئے۔ اسلحہ بردار جہاز' تار پیڈو' رائفلیں' بڑی بڑی توپیں استعمال کی گئیں ۔ اس سلسلے کا تیسرا درجہ جنگ عالم گیر (اول) کا تھا جو روس اور جاپان کی لڑائی سے قبل عمل میں آیا۔ اس میں آبدوزیں اور ہوائی جہاز بھی استعمال ہوئے۔ ایجادات کی رفتار فی نفسہ ایک بہت بڑا ہتھیار ہے اور اس پر اٹھنے والا خرچ (اگرچہ اس میں اس کی شدت شامل نہیں) بساط سے زیادہ ہے۔ ان فوجی اخراجات کے علاوہ ہر جگہ جو فیصلے کیے گئے وہ بھی انتہائی احمقانہ تھے۔ چینی شان کاؤ کے دور آغاز ہی میں' ہم دیکھتے ہیں کہ وو کی ریاست کو مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا۔ یہ ایک ایسا فعل تھا جو چن تسیئو کے دور میں ناممکن ہوتا اور جرات آزمائی کی غیرت اسے روک لیتی۔ کامپو فورمیو کے معاہدہ امن کے موقع پر نپولین برافروختہ ہو گیا اور اٹھارھویں میں قائم کردہ تمام روایات کو بھول گیا۔ اور ماسوائے مادی تحدید کے اسے کسی اور شے کا خیال نہ رہا۔ اس سلسلے کا آخری اقدام معاہدہ ورسائی تھا۔ جس میں جان بوجھ کر تصفیے کی حتمی صورت کو نظر انداز کر دیا گیا اور اس امر کو ایسی حالت میں چھوڑ دیا گیا کہ حالات کی ہر تبدیلی پر نئی شرائط عائد کی جا سکیں۔ تینوں پیونی جنگوں میں حالات کے ارتقا کا یہی سلسلہ نظر آتا ہے۔ یعنی یہ کوشش نمایاں معلوم ہوتی کہ دنیا کی ایک عظیم قوت کو تباہ کر دیا جائے۔ یہ واقع سب کو معلوم ہے کہ کاٹو جان بوجھ کر اپنے نقطہ نظر پر ڈٹا رہا۔ اس نے زامہ کے فاتح کے مزاج کو سمجھنے کی ذرا بھر بھی کوشش نہ کی۔ کیونکہ کلاسیکی شہروں کے جنگی اخلاقیات کے مطابق یہی ممکن تھا کہ لائی سانڈر کو ایتھنز کی فتح کے بعد ہر مقامی دیوتا میں کوئی نہ کوئی نقص نظر آنے لگا تھا۔

کلاسیکی دور میں دعوئی دار ریاستوں کا معاملہ (۳۰۱ ق م) جو آپسوس جنگ کے ساتھ شروع ہوا۔ اس سے مشرق میں تین بڑی طاقتوں کی ایک تثلیث قائم ہو گئی اور جب رومیوں اٹروسکیوں اور سامانیوں پر فتح حاصل کی (۲۹۵ ق م) تو اس سے کارتھیج کی حامی ریاست اٹلی کے وسط میں قائم ہو گئی۔ چونکہ یونانی صرف حال کا خیال رکھتے تھے اور مستقبل بعید کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ اس لیے انھوں نے روم کی فتح پر آنکھیں بند کر لیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ متعدد علاقوں پر روم کا یکے بعد دیگرے قبضہ ہوتا گیا۔ پیر کی مہم ان کی آنکھوں کے سامنے ہوئی اور جنوبی اطالیہ پر روم کا قبضہ ہو گیا۔ پھر پہلی پیونی جنگ میں بحری ساحل بھی گیا۔ اس کے بعد شمال کا کلٹی علاقہ بھی ہاتھ سے نکل گیا اور سی فلے ی انس اپنے ارادوں میں کامیاب ہو گیا۔ پھر ہینی بال کی اہمیت (غالباً" اس عہد میں یہی ایک شخص تھا' جو حالات کی رفتار پر بھرپور نظر رکھتا) اس کی طرف کسی نے دھیان نہ دیا۔ اس سے خود رومی بھی مستثنیٰ نہ تھے۔ زاما کے مقام پر یہ تجربہ ہوا' اور نہ صرف بعد میں میگنیشیا اور پڈنا میں بھی یونانی افواج کو شکست ہوئی' ہر کوشش میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا' ہر شہری

ریاست آرزوؤں اور تمناؤں میں بے تاب دنیا پر قبضے کے خواب دیکھتی رہا۔ مگر اس کا نتیجہ یہی نکلا کہ بالآخر سب کچھ ترک کرنا پڑا اور ہر معاملے میں ناکامی ہوئی۔ جنگ مقدونیہ کے ذریعے ایک اور کوشش کی گئی۔ اس مہم پر کوئی فریق بھی راضی نہ تھا مگر اس مہم کی وجہ صرف یہ تھی کہ مشرق کو بے ضرر بنا کر اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ ہر تہذیب کی ایک پیداوار سامراجیت ہے جب کوئی قوم آقا کا کردار کرنے سے انکار کر دیتی ہے اور اسے قابو کر کے سامراجیت کے قبضے میں دے دیا جاتا ہے۔ رومی سلطنت کو کسی نے فتح نہیں کیا مگر حالات انھیں ایسے مقام پر لے آئے کہ ان کے نام کے ساتھ یہ کیفیت منسلک ہو گئی۔ یہ سب کا سب کلاسیکی انداز ہے۔ آخر میں جو تھوڑی بہت آزادی انھیں حاصل بھی تھی وہ تلخی آمیز ہو گئی۔ ۱۴۶ ق م کے بعد روم اس پر مجبور ہو گیا کہ تمام مشرقی علاقوں کو صوبائی حیثیت دے دے کیونکہ اب بد انتظامی کے خلاف ان کے پاس ذرائع موجود نہ تھے اور خود روم کی داخلی حالت بھی اس سے مختلف نہ تھی جو کچھ ان کے پاس باقی رہ گیا تھا' وہ گر کچھی بد نظمی کی نذر ہو گیا اور (کہیں اور غیر متوازی انداز میں)۔ اب جو جنگیں ہوئیں وہ ریاستوں کے مابین آخری مراحل طے کرنے یا سلطنت کے قیام کے لیے نہ تھیں بلکہ صرف مختلف جماعتوں کے مابین جس کا تعلق ایک ہی شہر سے ہوتا----- شہری ہیئت ہی ایسی تھی کہ اس کے علاوہ کوئی اور نتیجہ برآمد ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ قدیم دور میں سپارٹا اور ایتھنز میں جنگیں ہوا کرتی تھیں اور اب یہ طبقہ شرفا اور عوامی جماعتوں میں تھا۔ گرد کچھی انقلاب میں جو (۱۳۴ ق م) پہلی سروائل کی جنگ میں شروع ہو چکا تھا۔ اس میں نوجوان ٹیکیبنو کو خفیہ طور پر قتل کر دیا گیا اور سی گر پکوس کو کھلے عام ذبح کر دیا گیا ان میں سے ایک پہلا صدر اور دوسرا پہلا منصف اعلیٰ تھا۔ ایسی دنیا میں جہاں کسی قسم کا نظام باقی نہ رہا تھا ان لوگوں کی کوئی ہیئت نہ رہی تھی۔ جب ۱۰۴ ق م میں رومیوں نے ایک عام آزمی ماری اوس کو غیر قانونی طور پر تخت پر بٹھا دیا' اس سے جو اس ڈرامے کی گہری اہمیت پیدا ہوتی ہے' اس کا موازنہ' اساطیری بادشاہ تیس کے ۲۸۸ ق م شہنشاہی کا خطاب حاصل کرنے سے کیا جا سکتا ہے۔ ایسے حالات کی ایک پیداوار کا سٹرزم اچانک نمودار ہوا اور افق پر چھا گیا۔

ٹریبون کا وارث ماری اس تھا۔ اس نے بھی اپنے پیش رو کی طرح ۸۷ ق م میں عوام اور اعلیٰ زردار طبقے کو باہم منسلک کر دیا اور طبقہ شرفا کے خاندانوں کو قتل کر دیا۔ پر نسیپ کا وارث سلا قرار پایا جس نے ۸۲ ق م میں سوداگران کی ایک بہت بڑی تعداد کو بذریعہ قانون سازی ملک بدر کر دیا۔ اس کے بعد حتمی فیصلہ قریب آ گیا۔ جیسا کہ چین میں وانگ چینگ کے برسر اقتدار آنے کے بعد ہو گیا تھا۔ پو مپئی' پر نسپ اور قیصر عدل پسند------ یہ معدلت کے عہدے پر تو فائز نہ تھا بلکہ اس کی طبیعت میں عدل گستری موجود تھی------ یہ سب لوگ اپنی اپنی جماعتوں کے سربراہ تھے مگر اس کے باوجود وہ لوقا کے مقام پر کراسوس کے ساتھ مل کر اور ایک دوسرے کی مشورت سے دنیا کو آپس میں تقسیم کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے جب قیصر کے جانشینوں نے فلپی کے قاتلوں کے ساتھ جنگ لڑی' تو دونوں بطور فریق باقی نہ رہے اور اسکیم کے معاملات افراد کے مابین طے ہوئے اور قیصری ایسے اہم موقعے پر بھی مجلس سے باہر رہے۔

اس کے متوازی انقلاب میں' جو عرب دنیا میں جاری تھا۔ یہ مجوسی اجماع تھا' جس نے مادی طور پر شہری حکومتوں پر قبضہ کر لیا۔ اسی بنیاد پر انھوں نے کامیابی حاصل کر لی اور یہ ایسی ہیئت تھی جس نے سیاسی اور مذہبی علیحدگی کا امکان ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا اور یہ رجحان اس حد تک پہنچا کہ شہری بورژوا بھی آزادی کا مطالبہ کرنے لگے (اور باقی دنیا کی طرح اس خطے میں بھی دعوئی دار ریاستیں وجود میں آ گئیں)۔ اس میں قدامت پسندی کے پردے میں اپنے آپ کو پیش کرتے رہے اور اس طرح انھیں کوئی بھی پہچان نہ سکا(۸۳)۔ یہ تحریک اپنے آپ کو خلافت سے انقطاع تعلق کے لیے پیدا ہوئی۔ بعد میں ساسانی اور دائیو قلیطی بھی اس میں شامل ہو گئے اور انھوں نے مل کر ایک جاگیردارانہ ریاست قائم کر لی۔ جسٹینین اور کوسٹروس کے عہد سے لے کر' اس کا مقابلہ ورق برداروں سے ہوتا رہا---- یہ لوگ یونانی اور مزد کی کلیساؤں کے پیروکار تھے۔ یہ لوگ طبقہ شرفا سے تعلق رکھتے تھے۔ فارسی متروک (سب سے بڑھ کر عراقی) اور یونانی (بالخصوص ایشیائی) اور آرمینائی جرات آزما جو دو مذہبی گروہوں میں منقسم تھے۔ انھوں نے ساتویں صدی عیسوی میں مطلق العنانیت حاصل کر لی۔ اس کے بعد یہ لوگ اسلامی حملوں کے باعث تباہ ہو گئے۔ اپنے سیاسی آغاز کے دور میں اسلام سختی سے شرافت پسند تھا۔ چند ممتاز خاندان ایسے تھے جو ہر مقام پر رہنمائی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ انھوں نے جلد ہی مفتوحہ علاقوں میں ایک اعلیٰ طبقہ شرفا' اعلیٰ خاندانوں کے افراد پر مشتمل' بالکل زیریں سطح تک قائم کر لیا' جیسا کہ ان کے انگریز ہمعصروں نے اپنے ملک میں قائم کر رکھا تھا۔ عثمانؓ اور علیؓ کے مابین (۶۶۱ - ۶۵۶) کی خانہ جنگی خالص خاندانی مناقشت کا مظہر تھی اور یہ تحریکات صرف دو قبائل اور ان کے حامیوں کے مابین تھیں۔ آٹھویں صدی کے مسلمان قدامت پسند اور جدت پسند' اٹھارھویں صدی کے انگریزوں کی طرح اعلیٰ سیاسیات میں دخل دینے لگے تھے۔ ان کے پیروکاروں اور خاندانوں میں جنگیں بنی امیہ کے حکمران خاندان (۷۵۰ - ۶۶۱) کے واقعات کے مقابلے میں زیادہ اہم ہیں۔

مگر دمشق کے ان روشن خیال اور زندہ دل خاندانوں کے باعث' مغربی آرامی اور شامی سوفسطائی----- عربوں کی فطری ثقافت کا مرکز ثقل دوبارہ وجود میں آ گیا۔ یہ مشرقی آرامی علاقہ تھا۔ جو کسی وقت ساسانیوں کا علاقہ تھا اور اب سلطانت عباسیہ کے قبضے میں تھا۔ مگر اپنی ہیئت میں یہ کبھی ایرانی ہوتا اور کبھی عربی یا کبھی اپنے مذہب کا مظہر ہوتا' یعنی مزدکی' نسطوری یا اسلام۔ یہ علاقہ ترقی کی ہمیشہ یکساں مثال پیش کرتا اور شام اور بازنطیہ کے لیے ایک عمدہ مثال پیش کرتا۔ اس تحریک کا آغاز کوفہ سے ہوا جس نے بنی امیہ اور ان کی قدیم حکومت کو زوال آشنا کیا اور اس تحریک کا کردار' جس کا آج تک پوری طرح مشاہدہ نہیں کیا گیا----- ایک نوع کا معاشرتی انقلاب تھا جو قدیم اقدار اور طبقہ شرفا کی روایات کے خلاف تھا۔ اس تحریک کا آغاز موالی طبقے سے ہوا' جو مشرق کے معمولی اور چھوٹے سے بورژوا طبقے پر مشتمل تھے اور عربوں کے خلاف شدید عناد رکھتے تھے۔ انھیں غازیان اسلام کی بجائے غازیان تجدید کا نام دینا زیادہ مناسب ہو گا۔ موالی جو ماضی قریب ہی میں اسلام لائے تھے' یہ سب کے سب سابق مزد کی تھے اور عربوں کے مقابلے میں اسلام کے متعلق زیادہ سنجیدہ تھے۔ کیونکہ عرب طبقاتی درجہ بندی کے قائل تھے۔ حضرت علیؓ کی فوج میں بھی

جمہوریت پسند اور قدامت پسند قرامطی موجود تھے' جو ان کے لشکر سے علیحدہ ہو گئے تھے اور ان لوگوں میں ہی ہم پہلی دفعہ ایسے لوگوں کا اجتماع دیکھتے ہیں' جو نہ صرف حد سے بڑھے ہوئے فرقہ پرست تھے بلکہ ان میں انقلابی عناصر بھی پائے جاتے تھے۔ اسی دور میں شیعی رجحانات دیکھنے میں آئے' بلکہ اشتمالی قرامطی تحریک کے مسیحات بھی نظر آنے لگے جن کا قدیم مزدکیوں سے بھی سلسلہ منسلک کیا جا سکتا ہے اس کے بعد بابک کے تحت انھوں نے بہت بڑی بغاوت کر دی۔ عباسیوں کو باغیوں میں کوئی مقبولیت حاصل نہ تھی' مگر کوئی باغیوں میں بہت مقبول تھے۔ یہ ان کی سفارتی مہارت کا نتیجہ تھا کہ پہلے انھیں مناسب عہدہ حاصل ہو گیا اور اس کے بعد----- بالکل نپولین کی طرح----- یہ انقلابی تحریک میں شامل ہو گئے' جو جلد ہی تمام مشرق میں پھیل گئی۔ اپنی فتح کے بعد انھوں نے بغداد کی تعمیر کی۔ گویا کٹسفون دوبارہ زندہ ہو گیا اور عرب جاگیر داری نظام کو زوال آ گیا اور اس نئی تہذیب کا یہ پہلا عالمی شہر ۸۰۰ سے ۱۰۵۰ء تک ایسے واقعات کا مرکز بنا رہا' جو نپولین ازم سے قیصریت تک یعنی خلافت سے سلطنت تک جاری رہے۔ بغداد کی حکومت کسی طور بھی باز نطی سلطنت سے کم نہ تھی۔ صرف اس کی صورت مختلف تھی----- اس دور میں اسی نوعیت کی قوت ہی کا امکان تھا۔

ہمیں اچھی طرح سے یہ سمجھ لینا چاہیے' کہ باقی دنیا کی طرح عرب دنیا میں بھی جمہوریت ایک طبقے کا شعور تھا یہ شہری حلقوں کا تصور اور ان کے عزم آزادی کا اظہار تھا۔ اور زمین سے ان کی قدیم وابستگی کی علامت تھا' خواہ وہ صحرا ہو یا قابل کاشت مزروعہ اراضی۔ خلفا کی روایت نے جس شے سے انکار کیا وہ اپنے آپ کو کئی صورتوں کے پردے میں پیش کرتی رہی اور یہ نہ تو آزاد فکر پر مبنی تھی' اور نہ ہی دستوری نظام اس کے لیے اس طرح ضروری تھا' جو اس دور میں ہمارے تصور سے مخصوص ہے۔ مجوسی ذہن اور مجوسی زر اپنے مختلف تصورات کے تحت آزاد ہیں۔ ان کا تصور آزادی ہم سے مختلف ہے۔ باز نطینی رہبانیت' شورش پسندی اور ہنگامہ پروری کی حد تک آزاد تھی۔ نہ صرف دربار اور شرافت کی حدود تک' اس نے ایک اپنا نظام مرشد شاہی قائم کر رکھا تھا۔ (جس کی رومی نظام سے تطبیق کی جا سکتی ہے بلکہ نکایا سے قبل کا نظام بھی اس میں شامل کیا جا سکتا ہے۔) اجماع امت یا رائے عامہ کو بڑے دلیرانہ انداز میں رضائے الٰہی کا نام دیا جاتا تھا (روسو اسے فطرت کہتا) جو خون کی تمام قوتوں سے آزاد اور برابر ہوتی۔ وہ مشہور نظارہ جس میں کہ سٹوڈی اون کے ایبٹ تھیوڈور نے شہنشاہ لیو پنجم کا (۸۱۳ء میں) حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا' مجوسی مزاج کے مطابق ایک طوفان بہیبت ہوتا اس کے تھوڑی مدت ہی بعد پال کے پیروکاروں نے بغاوت کر دی۔ اگرچہ ان کی نیت صاف تھی' مگر وہ معاشرتی معاملات میں وہ بہت انقلابی تھے انھوں نے طاروس کے شمال میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ تمام ایشیائے کوچک میں لوٹ مار کی' اور شاہی نائبین کو یکے بعد دیگرے تباہ کرتے گئے۔ یہ ۸۷۴ء تک کسی کے قابو نہیں آئے۔ یہ کرامیہ کی مذہبی اشتمالی تحریک سے مطابقت رکھتے تھے۔ جو فرات سے مرو تک پھیلی ہوئی تھی اور جس کا رہنما بابک بیس سالہ جدوجہد کے بعد ہی قابو میں آیا۔ (۸۱۷ ـ ۸۳۷ء) اور اس کے ساتھی قرامطیوں کی بھی یہی صورت تھی' انھوں نے مغربی علاقوں میں (۹۴ ـ ۸۹۰) میں اپنے اثرات عرب سے لے کر شامی شہروں تک قائم کر لیے اور ایرانی ساحلوں

تک بغاوت کا پرچار کرتے رہے۔ مگر ان کے علاوہ اور بھی متعدد گروہ تھے جو درپردہ سیاسی عمل میں مصروف تھے۔ اب جبکہ ہمیں یہ بتایا جا رہا ہے کہ باز نطینی فوج بت شکن تھی اور یہ کہ فوج بت پرستی کی مخالفت کرتی تھی تو ہم ایک ایسی صدی (۸۴۰ ـ ۷۴۰) کا تصور کرتے ہیں اور اس کا نئی روشنی سے جائزہ لیتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ ۸۴۳ میں اس کا خاتمہ' بت شکنوں کی حتمی شکست اور اس کے ساتھ آزاد کلیسائی راہبانہ حکمت عملی کے ساتھ ہی ہوا تو اس سے اس لفظ کے اس مفہوم کا پتہ چلتا ہے جو ۱۸۱۵ء میں لیا جاتا تھا' اور آخر میں اسی عہد میں عراق میں غلاموں کی خوفناک بغاوت شروع ہو گئی۔ ایسے مقام پر جو عباسی سلطنت کا مرکز تھا----- اس سے ان شورشوں پر بھی روشنی پڑتی ہے جو اس عہد میں جلد جلد پیدا ہونے لگی تھیں۔ علی نام کا ایک شخص جسے اسلام کا سپارٹاکوس کہنا چاہیے' اس نے ۸۶۹ء میں بغداد سے مشرق کی سمت ایک حبشی ریاست قائم کر لی۔ اس میں متعدد مفرور شامل تھے۔ اسی لیے مختارہ نام کا ایک شہر تعمیر کر کے اس میں اپنا دارالحکومت قائم کر لیا اور اس نے ایک عرب اور دوسری طرف ایران کی طرف پیش قدمی کی۔ اس کے ساتھ متعدد قبائل شامل ہو گئے۔ ۸۷۱ء میں اس سب سے بڑی اسلامی بندرگاہ جس کی آبادی دس لاکھ تھی' قبضے میں لے لی اور اس میں قتل عام کیا' اور شہر کو جلا دیا۔ یہ ظلم و ستم ۸۸۳ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد غلاموں کی اس ریاست کو فتح کر کے غارت کر دیا گیا۔

لہٰذا بتدریج نرم رفتار سے ساسانی باز نطینی ہیئت کا خاتمہ کر دیا گیا' قدیم روایت اور اعلیٰ دفتر شاہی کی جگہ شخصی اقتدار اور موقع شناس قوتوں نے مقام حاصل کر لیا جسے سلطنت کا نام دیا گیا۔ یہ خصوصی طور پر عربی ہیئت ہے اور یہ باز نطیہ اور بغداد میں بیک وقت اقتدار میں آئی اور اس نے ۸۰۰ء کے قریب نپولین کی طرز کی حکومت کی داغ بیل ڈالی اور سلجوقی ترکوں کے عہد میں اس نے قیصریت کی تکمیل کر لی۔ یہ ۱۰۵۰ء کا دور تھا۔ یہ ہیئت خالص مجوسی ہے اور اس کا اسی ثقافت سے تعلق ہے اور جب تک اس کی روح سے پوری طرح شناسائی نہ ہو اسے سمجھنا ممکن نہیں۔ خلافت جو ایک سیاسی (اسے کائناتی نہیں سمجھنا چاہیے) رفتار اور اسلوب ہے اسے کبھی منسوخ نہیں کیا گیا۔ کیونکہ کوئی خلیفہ جب اجماع امت کے نتیجے میں منتخب ہو جاتا ہے تو وہ خدا کا نمائندہ اور رائے دہندگان کے مقدس عمل کا امین ہوتا ہے مگر اس کے پاس وہ اختیارات نہیں ہوتے جو قیصریت کے لیے ناگزیر سمجھے جاتے ہیں۔ جیسا کہ فی الحقیقت پومیسٹی اور آگسٹس کے پاس تھے یا سلا اور قیصر کے برائے نام اختیارات تھے۔ یہ اختیارات روم کے قدیم دساتیر سے اخذ کیے گئے تھے اور آخری دور میں خلیفہ کے پاس محض اسی قدر اختیارات تھے جو اسے مجلس قانون ساز یا دیگر مجالس کی طرف سے تفویض کیے جاتے۔ دیکھنے میں اس کی امارت بے حد و حساب تھی----- اس کا لباس بھی اخلاقی قانون کے مطابق ہوتا----- کسی دور میں وہ اقتدار کی علامت تھا' اور اب وہ صرف ایک جامہ یا ملبوس تھا جس کے پاس کوئی اختیار نہ تھا اور محض ایک نمائشی سربراہ مملکت رہ گیا تھا۔

چنانچہ ہم دیکھتے کہ مائیکل سوم کے ساتھ ساتھ (۸۶۷ ـ ۸۴۲ء) بارداس بھی موجود تھا اور قسطنطین ہفتم (۹۵۹ ـ ۹۱۲) کے ساتھ رومانوس----- آخر الذکر تو خاندانی لحاظ سے شریک شہنشاہ تھا(۸۹)۔ ۸۶۷ء

میں سابقہ باسی لی اوس' جو نپولین ہی کی نوعیت کا ایک پیکر تھا؟ بار داس کو معزول کر دیا اور آرمینیا کا ثمیسری خاندان قائم کیا (جو ۱۰۸۱ء تک قائم رہا۔)۔ یہ وہ دور تھا جس میں بادشاہوں کی بجائے جرنیلوں کی حکومت قائم رہی۔ فوجی افراد جیسا کہ رومانوس' نائیسی فوروس' اور باردوس فوکاس تھے۔ ان میں سے سب سے عظیم جان زمیکس تھا (۹۶۹ - ۹۷۴) جو آرمینیا کے علاقے کیورزن سے تعلق رکھتا تھا۔ بغداد میں ترکوں نے وہی کردار ادا کیا' جو آرمینیا نے ادا کیا تھا۔ ۸۴۲ء میں خلیفہ واثق نے ان رہنماؤں میں سے ایک کو سلطان کا خطاب دیا۔ ۸۶۲ء سے لے کر ترک درباری خلیفہ پر غالب آتے گئے اور اسے اپنا محتاج بنا لیا۔ ۹۴۵ء میں احمد نامی ایک شخص نے سلطان خاندان قائم کیا اور خلیفہ کے اختیارات کو مذہبی لمور تک محدود کر دیا۔ یہ وہ عہد تھا جبکہ دو عالی شہروں میں صوبائی امرا نے مرکزی حکومت کے تخت پر قابض ہونے کی جدوجہد کا آغاز کیا۔ عیسائیوں کے معاملے میں ہم دیکھتے ہیں کہ فی الحقیقت باسی لی اس دوم نے لارڈ تھیلی فنڈا کا حکم ماننے سے انکار کر دیا لیکن اس کا کوئی معاشرتی مقصد نہ تھا اور نہ کوئی اس کا قانونی جواز تھا۔ اس عمل کا تعلق ذاتی دفاع سے تھا جو لمحاتی حکمران امکانی ورثا کے خلاف کر رہے تھے اور اس طرح یہ اور ٹرائم ویر کی جلاوطنی سے ملتا جلتا تھا۔ ایشیائے کوچک کا نصف حصہ نوابوں کے قبضے میں تھا جن کا تعلق فوقا اور سکارسرو خاندانوں سے تھا۔ یہ لوگ اپنے غیر محدود ذرائع سے خود اپنی افواج رکھ سکتے تھے۔ مدت سے انھیں کراسوس(۹۰)۔ کے مطابق سمجھا جاتا ہے۔ مگر حقیقی شہنشاہیت سلجوقی ترکوں سے شروع ہوتی ہے ان کا رہنما طغرل بیگ عراق پر قابض ہو گیا (۱۰۴۳ء) اور ۱۰۴۹ء میں اس نے آرمینیا پر بھی قبضہ کر لیا اور ۱۰۵۵ء میں اس نے خلیفہ کو مجبور کر لیا کہ اسے خاندانی سلطانی کا پروانہ لکھ دے۔ اس کے بیٹے لپ ارسلان نے شام فتح کر لیا اور منلیکرت کی فتح کے بعد مشرقی ایشیائے کوچک بھی حاصل کر لیا۔ بازنطینی سلطنت کی باقیات کی اہمیت باقی نہ رہی اور اس لیے غیر موثر ہو گئی۔ اس طرح اسلامی ترکی سلطنت اپنی تقدیر کی خود مالک بن گئی۔

یہ وہ دور تھا جس میں مصر ہا ئکسوس کے پردے میں پنہاں تھا۔ بارھویں اور اٹھارھویں خاندان کے مابین دو صدیاں گزر گئیں اس کا آغاز سی سوترس سوم کے عروج اور قدیم حکومت کی تباہی کے ساتھ ہوا اور جدید سلطنت کے قیام کے ساتھ اس کا خاتمہ ہو گیا۔ خاندانوں کی تعداد ہی یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس دور میں متعدد تباہ کن واقعات ظہور میں آئے ہوں گے۔ بادشاہوں کی فہرست میں مسلسل یکساں نوعیت کے نام آتے ہیں یا ان کے مد مقابل نامعلوم خاندانوں کے گمنام جرنیل' ایسے لوگ جن کے خطابات عجیب و غریب تھے۔ ان میں سے اکثر صرف چند روز کے حاکم ہوتے۔ تیرھویں خاندان کا پہلا بادشاہ ہی دریائے نیل کا ذکر کرتے ہوئے سینے کے علیحدہ ہو جانے کا ذکر کرتا ہے اور اس کے جانشین کے متعلق کاہون کی کھدائی اور آثار قدیمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کا اسی پر خاتمہ ہو گیا۔ یہی وہ دور ہے جس کے متعلق لائڈن کے پاپائرس عظیم انقلاب کی اطلاع ملتی ہے

حکومت کا زوال اور عوام کی فتح کے نتیجے میں فوج میں بھی بغاوت پیدا ہو جاتی ہے اور طالع آزما فوجی میدان میں آ جاتے ہیں۔ مصر میں ۱۶۸۰ء ق م سے "ہائی کوسس" کا نام سامنے آتا ہے یہ ایک ایسا

نام ہے' جس کے متعلق جدید دور کے مصنفین نہ تو کچھ جانتے ہیں اور نہ ہی انھوں نے کچھ جاننے کی کوشش کی ہے کیونکہ ان کا وجود اپنے دور کے لیے باعث شرم ہے۔ بلاشک و شبہ ہائی کوسس نے مصر میں وہی کردار ادا کیا' جو آرمیناؤں نے بازنطینی میں ادا کیا تھا۔ کلاسیکی دنیا میں بھی کیریوں کا انجام ٹیوٹون میں ویسا ہی ہوتا اگر ماری آس اور اس کے شہری لشکریوں نے کینائل کو شکست دی ہوتی۔ یہ لوگ ٹرائینوم ویر کی فوجوں میں بار بار بھرتی ہو جاتے اور انجام کار وحشیانہ حکومتیں قائم کر لیتے کیونکہ جوگورتھا کے معاملے میں اس طویل عرصے کا پتہ چلتا ہے جس میں کہ غیر ملکی اس عہد کے روم کی حمایت کی جرات کرتے تھے۔ دخل انداز کس علاقے سے تعلق رکھتے تھے یا کون تھے' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ محافظ ہوں گے یا بھگوڑے غلام' یا کوئی اجنبی قبائل ہوں گے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس صدی کے مصر پر ان لوگوں کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔ بالآخر انھوں نے مغربی دھانے پر ایک حکومت قائم کر لی اور اوری اس کے نام سے دارالحکومت بھی تعمیر کر لیا ان کا ایک رہنما جس کا نام خیان تھا وہ اپنے آپ کو فرعون تو نہیں کہتا تھا مگر ملک کا نجات دہندہ اور نوجوانوں کا شہزادہ کہلاتا تھا (یہ نام قیصر کے دور کے آمرین یا انقلابی رہنماؤں کے مماثل تھا)۔

غالبا" اس شخص کا تعلق وادی فرات سے تھا مگر اس کے بعد تمام اضلاع اپنی اپنی سلطنت قائم کرنے کے لیے لڑنے لگے اور شیبان خاندان بالآخر فتح یاب ہوا۔

ہمارے لیے دعوئی دار ریاستوں کا یہ زمانہ نپولین اور اس کی تشدد پسند من موجی حکومت کے آغاز سے شروع ہوا۔ ہماری دنیا میں وہ پہلا شخص تھا جس نے فوج کو موثر انداز میں استعمال کرنے کے متعلق سوچا اور دنیا پر غلبے کا منصوبہ بنایا----- اس کی سوچ کا انداز چارلس پنجم کے تصور سے بالکل الگ تھا اور اپنی ہمعصر برطانوی قوت سے بھی مختلف تھا۔ اگرچہ انیسویں صدی میں بڑی بڑی جنگیں نہیں ہوئیں----- اور انقلابات بھی نہیں آئے----- اور تمام مسائل سفارت کاری کے میدان میں حل کر لیے گئے یا سیاسی جماعتوں نے حل کر دیئے تو اس کی وجہ محض یہ تھی کہ تمام ممالک جنگی تیاریوں میں مصروف رہے۔ جس کی وجہ سے فریقین ایک دوسرے سے ڈرتے رہے اور جنگ کے آغاز کا فیصلہ بار بار ملتوی کرتے رہے اور جنگ کی بجائے سیاست کے میدان میں شطرنج کی چالیں چلتے رہے۔ پس یہ مستقل افواج کی بڑی تعداد کی صدی ہے اور فوج میں جبری بھرتی کی صدی ہے اور دنیا میں ایک خطرناک جنگی حادثے کو دیکھنے کے منتظر ہیں جس کے اثرات خوفناک ہوں گے جس کی تاریخ عالم میں کوئی نظیر نہ ہو گی۔ نپولین کے مقابلے میں بھی لاکھوں انسان معرکہ آرائی کے لیے تیار بیٹھے ہیں اور بڑے بڑے بحری جنگی جہاز بندرگاہوں میں لنگرانداز ہیں' جن کی ہر دس سال بعد مرمت کر لی جاتی ہے اب ایک غیر جنگی جنگ لڑی جا رہی ہے اسلحہ کے میدان میں سبقت حاصل کرنے کی جنگ اور جنگی تیاریوں کی جنگ' ایک ایسی جنگ' جس میں پیکر رفتار اور سامان جنگ نیز سفارت کاری کی جنگ جاری ہے۔ یہ جنگ نہ درباروں سے متعلق ہے نہ میدان جنگ سے' بلکہ مرکز بمقابلہ مرکز ہو رہی ہے۔ یہ تیاریاں جس قدر طول پکڑیں گی' آئندہ جنگ میں تباہی میں اتنا ہی اضافہ ہو گا۔ تباہ کے ذرائع اور کشاکش بھی زیادہ ہوتی جائے گی۔ دعوئی دار ریاستوں کی یہ فاؤسٹی اور متحرک صورت ہے۔

اس کا آغاز اس صدی کے آغاز ہی سے ہو گیا تھا مگر (پہلی) جنگ عظیم کے بعد کسی قدر استفراغ ہو گیا۔ مگر ان چار سالوں میں جو مطالبات سامنے آئے' وہ عالمی خدمت کے اصول کے مطابق نہ تھے۔ انقلاب فرانس کا بچہ سرتاپا انقلابی ہی ہو گا کیونکہ اس کی ہیئت ہی ایسی ہے۔ کیونکہ ہر لحاظ سے ان حالات کا رخ ہی اس طرف ہے۔ مستقل افواج کی جگہ پیشہ ور رضاکار لے لیں گے جو جنگ کے امور میں ماہر ہوں گے۔ مگر اگلی صدی دعویٰ دار ریاستوں کی صدی ہو گی۔ یہ افواج جنگ کا بدل نہیں' بلکہ فی نفسہ جنگ ہیں۔ دو نسلوں بعد دنیا پر افواج کا غلبہ ہو گا اور آسائش کی تمام سہولتیں ان کے قبضے میں ہوں گی۔ ان کی جنگوں میں دنیا کا تمام ورثہ لگا دیا جائے گا۔ تمام براعظم ہندوستان' چین' جنوبی افریقہ' روس' اسلام سب شامل ہو جائیں گے۔ ہر کوئی نئی نئی چالیں چلے گا اور ایک دوسرے کا توڑ کرے گا۔ ہر بڑا ملک چھوٹے کو ہضم کر لے گا۔ ان کے علاقے' معاشی ذرائع اور ان کی آبادی سب پر غلبہ حاصل کر لے گا۔ ابھی تک یہ صورت محض احتمالی ہے انفعالی اور قریب الاختتام ہے جس رفتار سے معاملات چل رہے ہیں ان کے انجام کے متعلق کوئی شبہ نہیں۔ آئندہ چند سالوں میں جو کچھ ہونے والا ہے اس کے متعلق ہم نے کبھی غور نہیں کیا' کہ دنیا کے لیے جنگ کس قدر خوفناک ہو گی۔ آج کوئی بھی نہیں سوچتا!

آگ اور خون کی خوفناک ہولی کے درمیان بار بار انسانی اتحاد کی آواز بلند ہوتی ہے اور زمین پر امن قائم کرنے کے دعوے کیے جاتے ہیں' مگر یہ سب بڑے بڑے واقعات کی صدائے باز گشت کے پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ اس قدر ضروری ہے کہ ہم یہ مفروضہ قائم کرلیں کہ ایسا عمل فی الواقع موجود ہے۔ جس طرح مصر میں ہا یکسوس' اور بغداد اور باز نطیم میں ہمیں اس کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ اس عمل کی ہم جتنی بھی خواہش کریں اور اسے جتنا بھی مقدس سمجھیں' مگر ہمیں حقائق کا اسی صورت میں مشاہدہ کرنا ہو گا جیسے کہ وہ موجود ہیں۔ انسان کا یہی نمایاں نشان ہے' یہی اس کی نسلی خصوصیت ہے اور ایسے ذی شعور انسانوں کی وجہ سے تاریخ آج تک باقی ہے۔ زندگی اگر عظیم ہو گی تو مشکل بھی ہو گی۔ ہمیں فتح اور تباہی میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہو گا۔ جنگ اور امن میں سے ایک کا' اور ایسی فتح کا جو فتح کو قربان کر دے۔ کیونکہ وہ شے جو شکوہ شکایت اور حسد کے ساتھ اپنا مقام بدلتی رہتی ہے وہ صرف ادب ہے۔ اگرچہ ادب ہمیشہ صداقتوں پر مبنی ہوتا ہے' مگر یہ صداقتیں واقعات کے دباؤ کے تحت دب جاتی ہیں۔ تاریخ کبھی بھی ایسے عمل کو احترام کی نظر سے نہیں دیکھتی جو محض تصورات پر مبنی ہو۔ چینی دنیا میں ہیانگ سوئی نے ۵۳۵ ق م کے قدیم دور میں انجمن امن قائم کرنے کی کوشش کی۔ دعویٰ دار ریاستوں کے دور میں شہنشاہیت (لین ہینگ) انجمن اقوام کے تصور کے خلاف تھا۔ (ہوب تسونگ) بالخصوص جنوبی علاقوں میں اس کا ذکر ہوتا تھا' مگر یہ تجویز بھی نیم دلانہ رویے کی وجہ سے تباہی سے دوچار ہو گئی اور اس سے قبل کہ شمال کو فتح نصیب ہوتی یہ منصوبہ ہی ختم ہو گیا۔ مگر ان دونوں رجحانات نے تاؤ کے سیاسی ذوق کی تردید کر دی' جو ان خوفناک صدیوں میں تخفیف اسلحہ کا مطالبہ کرتا تھا اور اس طرح وہ اپنے آپ کو ایسی سطح پر لے جانا چاہتا تھا' کہ دوسرے جس طرح چاہیں' اسے استعمال کر سکیں اور وہ عظیم فیصلوں میں کسی طرح بھی اثر انداز نہ ہو سکے۔ رومی سیاست بھی------ اپنے آپ کو جان بوجھ کر کلاسیکی ذہن سے ہمہ پہلو ہم آہنگ کرنے کے تیار

تھی------ اس نے کم از کم ایک کوشش ضرور کی کہ تمام دنیا کو ایک نظام کے تحت لے آئے تاکہ آئندہ کی جنگوں کا خاتمہ ہو جائے------ جب ہینی بال کو شکست ہوئی تو روم نے مشرقی علاقوں کو اپنے ساتھ ملانے کی ایک کوشش کو ضرور ترک کر دیا مگر اس تذبذب کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ نوجوان سکیپیو کی جماعت نے آگے بڑھ کر کھلم کھلا سامراج قائم کر لیا اور اس کا مقصد یہ بتایا کہ وہ بدانتظامی کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ ہر بالغ نظر جانتا تھا کہ اس سے شہر کی تباہی مقصود تھی۔ بدقسمتی یہ تھی کہ قدیمی کلاسیکی نااہلیت کی روایت کے تحت یہ شہر (کسی صورت میں بھی) اپنے دفاع کے لیے کوئی تنظیم قائم نہ کر سکتا تھا۔ اسکندر سے لے کر قیصر تک تمام طریق کار مبہم اور ناگزیر ہی رہا اور ہر ثقافت کی کسی بھی مضبوط قوم کو شعوری یا غیر شعوری طور پر' مرضی سے یا خلاف مرضی' اسی راستے پر چلنا پڑا۔

ان حقائق کی درشتگی سے کوئی امان نہیں۔ ۱۹۰۷ء میں ہیگ میں ایک کانفرنس ہوئی تھی۔ یہ گویا جنگ عظیم کی تمہید تھی۔ ۱۹۲۱ء میں واشنگٹن میں ہونے والی کانفرنس مزید جنگوں کی تمہید ثابت ہو گی۔ اس دور کی تاریخ اس ذہانت کی جمع تفریق کی' کیفیات کا مقابلہ نہیں کر سکتی جن میں سے کوئی بھی فریق جب بھی چاہے اپنے آپ کو فارغ کر لیتا ہے۔ صرف یہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ اسے برداشت کیا جائے یا اس کا مقابلہ کیا جائے۔ کوئی درمیانہ راستہ موجود نہیں۔ اخلاقی منطق کی یہی صورت دستیاب ہے کہ جرات سے پہاڑی پر چڑھ جائیں۔ آپ نے ایک لمحہ کے لیے کمزوری دکھائی تو تمام معاملہ تلپٹ ہو جائے گا۔ زمانہ حال میں فلسفہ بے سود ہے۔ یہ صرف ارادے کی کمزوری کا دوسرا نام ہے۔ تصوف کے نام پر حقائق کی دنیا سے آنکھیں بند کرنے اور بے عملی کا مظاہرہ کرنے کا حیلہ ہے۔ رومی عہد میں بھی صورت حال کچھ ایسی ہی تھی۔ مشہور موسوتی اس روفوس نے خانہ جنگی سے بچنے اور امن قائم رکھنے کی کوشش کی۔ اس نے ان لشکریوں کو قائل کرنے کی کوشش کی جو ۷۰ ق م میں روم کے دروازوں پر کھڑے تھے اور ان کی ضربات سے بمشکل ہی بچ سکا۔ فوجی کمان دار ایوی ڈی اوس کاسی اوس نے شہنشاہ مارکوس اورای لی اوس کو بوڑھی فلسفی عورت کا خطاب دیا۔

ان حالات کے تحت قدیم اور عظیم روایات میں سے کیا باقی رہ گیا ہے' تاریخی لحاظ سے موزونیت اور تجربہ جو بیسویں صدی کے خون میں منتقل ہوا ہے اس کی بنا پر بے شمار صلاحیت کا سرمایہ دستیاب ہوا ہے۔ ہمارے لیے تخلیقی تقدس (یا مزید بنیادی اصطلاح کے استعمال کے مطابق) وہ نبض جو ہمیں منتقل ہوئی ہے صرف ان صورتوں تک باقی رہتی ہے جو انقلاب فرانس اور نپولین کی مہم جوئی سے قدیم ہیں۔ یہ وہ ہیئت ہے جس نے نشوونما پائی' اسے بنایا نہیں گیا۔ اس کی تمام باقیات خواہ وہ کتنی بھی قدیم ہوں' جو کسی نہ کسی طرح سے برخود مکتفی لحاظ سے قائم رہی ہوں' خواہ کسی وقت اس میں لامحدود اقدار کا وجود پیدا ہو اور ایسے تاریخی اثرات وجود میں آئیں جن کا دور حاضر میں اندازہ بھی ممکن نہ ہو۔ کسی پرانی شہنشاہیت کی روایت' کوئی قدیم خاندانی امارت' جو ابھی تک اس قدر تندرست ہوں' کہ ابھی تک پیشہ ورانہ اور عملی سیاست پر اثر انداز ہو سکیں۔ جب تک کہ ان میں احترام' دست کشی' نظم و ضبط اور اپنے مقصد کے حصول

کی لگن' (قومی معیار جو تربیت کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے) ادائیگی فرض کا احساس اور قربانی کا جذبہ موجود ہو تو وہ پوری قوم کے دریائے وجود کو باہم متحد رکھ سکتا ہے۔ اس دور میں زندہ رہ سکتا ہے اور مستقبل کے لیے باعث امید ہو سکتا ہے۔ موزوں حالت میں قائم رہنا ہی سب کچھ ہے۔ عظیم ثقافتوں کا سبق اور روایت یہی ہے کہ ہر حال میں مقابلہ کرو اور زندہ رہو۔ آخری قوم جس نے اپنی ہیئت قائم رکھی' آخری زندہ روایت' آخری رہنما' جن کی تائید میں یہ دونوں عوامل موجود ہوں' وہ ہر مشکل سے گزر کر فتح یاب نکلیں گے۔

۱۰

قیصریت سے میری مراد ایسی حکومت سے ہے' جو ہر قسم کی دستوری دستاویزات کے باوجود' اپنے اندر لاقانونیت کی طرف مراجعت کا رجحان رکھتی ہو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آگسٹس روم میں تھا' اور ہوانگ تائی چین میں' آماسس مصری تھا' اور الپ ارسلان کا تعلق بغداد سے تھا۔ ان سب نے اپنی کیفیت کو قدیم ہیئات میں چھپا رکھا ہے۔ ان صورتوں کی روح مردہ ہو چکی تھی چنانچہ تمام ادارے خواہ ان کی کتنی احتیاط سے حفاظت کی گئی ہو' ان کی نہ کوئی قدر و قیمت باقی رہی نہ وزن (مذکورہ بالا غداروں کی وجہ سے)۔ اصل قوت تو وہی تھی' جسے قیصر نے استعمال کیا تھا یا کوئی دوسرا شخص جو اس کی جگہ قائم ہو اور ان اختیارات کو کام میں لائے۔ یہ انسان کی ابتدائی زندگی میں قائم کردہ ہیئت کی باقیات میں سے ہے مگر تاریخ کائنات میں اس کا ذکر موجود نہیں۔ حیاتیات کا زمانی پھیلاؤ دوبارہ وہ مقام حاصل کر لیتا ہے جسے تاریخی ادوار خالی کرتے ہیں

آغاز میں جبکہ تہذیب اپنی بہار پر ہوتی ہے۔ (آج) تو شہری ریاستوں کا معجزہ وجود میں آتا ہے۔ عظیم تجر' جو بے ہیئتی کی ایک علامت ہوتا ہے---- وسیع' شاندار اور گستاخی میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ اپنے اندر وجود کی وہ لہریں رکھتا ہے جو دیہات میں اب بھی ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ وہ انسانی اجتماع جو ریت کے تودوں کی طرح جمع ہیں' یا ذروں کی طرح اڑتے پھرتے ہیں' اور پتھروں کی چٹانوں پر گرتے رہتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں زر اور ذہانت اپنی فتح کا آخری ڈنکا بجاتے ہیں۔ یہ بہت مصنوعی کیفیت ہے' انتہائی چالاک مظہر' جو انسانی بصارت کے اعلیٰ مقام میں اپنا اظہار چاہتا ہے---- پراسرار' غیر ارضی۔ اتنا عمدہ کہ اسے سچ سمجھنے میں مشکل پیش آئے اور کائناتی تصورات اور امکانات سے ماورئی بلند و بالا مقام پر مکین ہے۔

دور حاضر میں بہرحال ایسے حقائق سامنے آتے ہیں جن کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ بے حد بڑے مگر عریاں۔ ازلی کائناتی نبض نے بالاخر ذہانت آمیز چند صدیوں پر قابو پا لیا ہے۔ جمہوریت کی صورت میں زر نے فتح حاصل کر لی ہے۔ ایک وقت تھا کہ سیاست اس کے قبضہ قدرت میں تھی مگر جب سے کہ اس نے ثقافت کا پرانا نظام بدل لیا ہے تو بدنظمی جدید اور غالب عوامل کو جنم دیتی ہے جو وجود کے حقیقی عناصر میں سرائیت کر جاتے ہیں---- قیصر کے آدمی ایسے ہی تھے۔ ان سے قبل نظام زر ختم ہو چکا تھا۔ ہر ثقافت میں دور شہنشاہی ذہن اور زر کی سیاست کے خاتمے کی نشاندہی کرتا ہے۔ خونی قوئی جو غیر انفعالی جسدی قوتیں ہیں دوبارہ اپنی قدیم حکمرانی کو سنبھال لیتی ہیں۔ نسل کا تصور دوبارہ ابھرتا ہے جو خالص ناقابل مزاحمت اور دلکش

ہوتا ہے---- یہی سب سے بڑی فتح اور مال غنیمت ہے۔ وہ دنیاؤں کا نظام سنبھال لیتے ہیں۔ کتابوں کی حکومت اور مسائل کو یا تو متحجر کر دیتے ہیں یا یہ عوامل حافظے سے خارج کر دیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد قبل از ثقافت عہد کا اسلوب دوبارہ تازہ ہو جاتا ہے اور شعور کو بغیر علت و معلول نظر آنے لگتا ہے۔ اس کے بعد سیپ ٹی می اس سرورس' اور گیلیا نوس اور الارک اور اوڈواسر را میسز' ٹروجن' دوتانی میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ یہ لوگ تاریخی زمانی نشیب فراز میں یکساں متحرک نظر آتے ہیں ۔

ایک دفعہ جب شاہی دور وجود میں آ جاتا ہے تو تمام سیاسی مسائل ختم ہو جاتے ہیں۔ عوام انتظامیہ سے اس کی کیفیت کے مطابق بسر کر لیتے ہیں اور اقتدار سے تعاون کرتے ہیں۔ دعوئی دار ریاستوں کے دور میں تمام عالمی شہروں کی گلیاں خون سے سرخ ہو جاتی ہیں تاکہ جمہوریت کی عظیم صداقتیں' حقیقت کا روپ اختیار کر لیں اور وہ حقوق حاصل ہو جائیں جن کے بغیر زندگی گزارنے کے قابل نہیں ہوتی۔ جب یہ حقوق حاصل ہو جاتے ہیں مگر تیسری نسل کے بچے (پوتے) سزا دینے کے باوجود ان سے استفادہ نہیں کرتے۔ ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی مورخین اس تنازعے کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ قیصر کے عہد میں بھی مشاہیر نے انتخاب میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا ۔ عظیم طبری اس نے اپنی زندگی میں اس پر تلخی کا اظہار کیا کہ اس کے عہد کے لائق فائق لوگ سیاست سے الگ تھلگ رہے اور نیرو متعدد تنبیہوں کے باوجود اپنے حامیوں کو شہر آ کر رائے دہی کے عمل پر راضی نہ کر سکا۔ عظیم سیاست کا انجام یہی ہے۔ ذہانتی مناقشات جن کو جنگ کے بدل کے طور پر استعمال کیا گیا فی الحقیقت انتہائی قدیم ہیئت میں حقیقی جنگ کے لیے مقام خالی کر رہے ہیں۔

لہٰذا یہ اس دور کے مطالب کے سمجھنے میں انتہائی غلط فہمی کی وجہ سے یہ فرض کر لیا گیا ہے۔ جیسا کہ موم سن سے بھی یہی غلطی ہوئی ۔ اس نے مجلس قانون ساز میں متعدد گروہوں کے مختلف رنگ ڈھنگ بیان کیے جو آگسٹس نے مروج کیے تھے۔ اس کی وجہ طبقہ امرا اور مجلس قانون ساز میں اختیارات کی تقسیم تھی۔ ایک صدی قبل ایسا دستور حقیقت پر مبنی ہوتا مگر اس عہد میں ارباب اختیار کے اذہان میں ایسا تصور پیدا ہونا ہی عجیب معلوم ہوتا ہے اور ناممکن نظر آتا ہے۔ اب اس کا ماسوائے اس کے کوئی اور مطلب نہیں کہ یہ ایک کمزور شخصیت کی ایک ایسی کوشش ہے کہ وہ اپنے آپ کو ظالم حقائق سے پردے میں رکھ کر ان کے وجود سے انکار کر دے۔ قیصر نے ان اشیا کے وجود کو اس طرح دیکھا جیسا کہ وہ فی الحقیقت تھیں اور اس نے اپنی حکومت کو حقیقی' غیر جذباتی اور عملی غور و فکر سے چلایا۔ اس کے آخری ایام کی تمام قانون سازی عبوری نوعیت کی تھی۔ ان میں کوئی بھی قانون ایسا نہ تھا جسے وہ مستقل حیثیت دینا چاہتا ہو۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے بالعموم نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ وہ اپنے عہد کا ایک ماہر مزاج شناس تھا' وہ ہر شے کو اس کی ضروریات اور ماحول کے مطابق پرکھتا اور پھر فیصلہ کرتا۔ اسے اندازہ تھا کہ پارتھی جنگ سر پر منڈلا رہی ہے مگر اس کے مقابلے میں آگسٹس کو اور اس سے قبل آنے والے پومپائی کی طرح اپنی رعایا پر کوئی اختیار نہ تھا۔ بلکہ وہ حالات کے تحت قطعی طور پر ان پر انحصار کرنے پر مجبور تھا۔ مجلس امرا کے تصور سے اس کا کوئی واسطہ نہ تھا' یہ تو سسرو کے ذہن کی تخلیق تھی' جو اسی نوعیت ہی کا ایک کمزور شخص تھا۔ جب ۱۳ جنوری ۲۷ء کو آگسٹس نے ریاستی اختیار روم کے عوام کو واپس لوٹا دیے تو یہ ایک اور بے معنی عمل تھا کیونکہ وہ

کسی بھی معاملے میں مخلص نہ تھا۔ اس نے خصوصی عدالتوں کو اپنی غرض کے لیے قائم رکھا۔ فی الحقیقت یہی ایک ایسا ادارہ تھا جو اپنے آپ کو منوا سکتا تھا۔ معدلہ ظلم جاری رکھنے کا جائز بہانہ تھا اور ۱۳۲ ق م کے قدیم دور میں گر یکوس نے محدود اختیارات دے کر اسے قابل قبول بنا لیا تھا' کیونکہ ایسے کسی ادارے کے قیام کا کوئی قانونی جواز نہ تھا۔ اس کا جواز محض اس کے ارکان کی ذاتی اہلیت کو قرار دیا گیا۔ اسی دور سے اس کا سلسلہ ماری اوس' قیصر اور نوجوان نیرو تک جاری رہا۔ اس نے اپنی والدہ اگری پینا کے سیاسی مقاصد کو شکست دینے کا منصوبہ بنا لیا۔ طبقہ امرا' اس کے بعد صرف ایک خلعت یا لفظی عہدہ ہی رہ گیا۔ معاشرے میں ممکن ہے اس کی کوئی حیثیت ہو' مگر سیاست میں اس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ سسرو کے نظریات شان و شوکت کا یہی ما حصل تھا۔ جو آغاز ہی سے چلا آ رہا تھا------ اور اس کے ساتھ اس کے عوام بھی ہمنوا تھے------ یہ تصور ڈائی ووس کے تصور سے ملتا جلتا تھ   ------ مجلس قانون ساز اور عوام میں تعاون کی روایت' اس کے برخلاف' قدیم دور سے ہی ایک رسمی صورت میں چلی آ رہی تھی۔ اس میں رواج کا اتنا ہی دخل تھا' جتنا کہ فریٹر ارویلز کے معاملے میں تھا۔ آگسٹس نے اس کو بھی دوبارہ نافذ کر دیا۔ گر سپکن عہد کی بڑی بڑی جماعتیں صرف خدم و حشم بن کر رہ گئی تھیں۔ قیصری اور پومپائی------ اور بالآخر ایک طرف تو بے ہیئت' طاقت ور' ظالم حقیقت یعنی قیصر------ یا ہر وہ شخص جس کا قیصر پر کسی حد تک اثر و رسوخ تھا اور دوسری طرف مٹھی بھر تصور پرست جو پہلے تو فلسفے میں پناہ ڈھونڈتے رہے اور اس کے بعد اپنے تصورات کے متعلق سازشیں کرنے میں مصروف ہو گئے۔ یہ رومی رواقیوں کی نوعیت ہی کے لوگ تھے۔ چین میں ایسے لوگ کنفیوشس کے پیروکار تھے------ ان کو کتابیں جلاتے ہوئے دیکھا گیا۔ ۲۱۲ق م میں چین کے آگسٹس نے انھیں یہی حکم دیا تھا۔ انتہائی تہذیب سوزی پر ملامت کی وجہ سے یہ قابل فہم نظر آنے لگے اور بعد میں آنے والے تعلیم یافتہ لوگ ان کی تقلید کرنے لگے۔ بالآخر ان رواقیوں نے ایک ناممکن مقصد کے حصول کے لیے قیصر کو قتل کر دیا   ۔ کاٹو اور بروٹس مسلک ڈائی ووس کے خلاف تھے۔ مجلس قانون ساز (جو اس زمانے میں صرف شرفا کے کلب کی حیثیت اختیار کر چکا تھا) آزادی کے تنزل اور سازشوں کے جال (مثلاً پیسو کی ۶۵ء کی سازش) پر ہمیشہ نوحہ خوانی جاری رہتی۔ اگر یہ نیرو کی موت کا نوحہ ہوتا' تو سلا دوبارہ برسر اقتدار آگیا ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ نیرو نے رواقی تھراسیا پائی ٹوس کو قتل کرا دیا۔ ویسپا سین نے بلوویڈی اوس پرسکیوس کو کیوں قتل کرایا' اور تاریخ کی وہ نقول جن میں بروٹس کی بطور آخری رومی تعریف کی گئی تھی' جمع کر کے جلا دی گئیں؟ یہ تمام دفاعی اقدامات تھے کیونکہ ہم ایسے بے بصر واقعات سے ناواقف نہیں' جو اپنے اپنے دور میں کرام ویل اور روبس پیری سے سرزد ہوئے۔ چین میں بھی اسی نوعیت کی صورت حال درپیش تھی جہاں چینی قیصریت کا مقابلہ کنفیوشس سے درپیش تھا۔ اس نے پہلے تو ریاستی دستور کا تصور پیش کیا اور اب وہ حقیقت کے تصور کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ کتابوں کی اتنی بڑی آتش زنی کا مقصد صرف یہ تھا کہ سیاسی فلسفے کے ایک حصے کو تباہ کر دیا جائے اور خفیہ اداروں کے پروپیگنڈے کو ختم کر دیا جائے   ۔ یہ دفاع تقریباً" سو سال تک دونوں سلطنتوں میں جاری رہا۔ بعد ازاں سیاسی جماعتوں کے اثرات تقریباً" ختم ہو گئے اور دونوں فلسفے بادشاہی دور کے عالمی تصورات کے بالغ نظر نقیب بن گئے   ۔ مگر اب دنیا میں تاریخی ایسے خاندانی بنیادوں پر رونما ہونے لگے اور ریاستوں کی تاریخ ان میں تحلیل ہو گئی۔ جولین

کلاڈئین خاندان نے رومی تاریخ کو تباہ کر دیا اور شائی ہوانگ کے خاندان نے (۲۰۶ ق م سے بھی قبل) چینیوں کو تباہ کر دیا اور ہم تاریکی کے باوجود صاف صاف دیکھتے ہیں کہ مصری شہزادی ہیت شپ سوت اور اس کے بھائی (۱۴۴۷ ـ ۱۵۰۱ ق م) اسی نوعیت کے انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔ طریقہ معینہ کا یہ آخری اقدام تھا۔ امن عالم کے ساتھ------ اعلیٰ حکمت عملی سے پیدا شدہ امن------ جو بزور شمشیر بادشاہوں نے قائم کیا تھا' مراجعت اختیار کر لیتا ہے اور اس کی جگہ تکلے کا امن دوبارہ برسر اقتدار آ جاتا ہے اور اس کے بعد صرف نجی تاریخ باقی رہ جاتی ہے۔ نجی انجام' نجی آرزوئیں فلاحین کی طرف سے پیدا کردہ معمولی تکالیف اور قیصریت کے لیے عالمی مقبوضات پر نجی قبضوں کے معاملات کی وجہ سے مناقشات کے سوا تاریخ میں کچھ بھی باقی نہ بچا۔ جب امن عالم قائم ہو' تو صرف نجی جنگیں باقی رہ جاتی ہیں۔ یہ ملکی جنگوں سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہیں' کیونکہ ان کی کوئی ہیئت یا وضع نہیں ہوتی۔

امن عالم کے لیے------ جو فی الحقیقت اکثر موجود ہوتا ہے------ ایک بڑی اکثریت کو ترک مجادلات کا تہیہ کرنا ہو گا اور اس کے ساتھ اس عمل کی تیاری بھی لازمی ہے کہ جو لوگ ایسا نہیں کرتے ان کی زیادتیوں کو بھی بلا چون و چرا تسلیم کرنا ہو گا۔ اس کا آغاز ملکوں کی تباہی کی بجائے عالمی صلح جوئی کے عمل سے ہو گا اور ہر ایک کو وعدہ کرنا ہو گا کہ وہ اس وقت تک انگلی بھی نہیں ہلائے گا جب تک کہ اس کے ہمسائے تک بدقسمتی نہ پہنچ جائے۔ مارکوس اور می لی اس کے عہد میں ہر شہر اور ہر قطعہ زمین صرف اپنی ذات کے متعلق سوچ رہا تھا اور حکمران کے افعال بھی عام رعایا کے افعال کی طرح ان کی نجی فعالیت سمجھے جاتے تھے۔ دور دراز پر رہنے والے لوگ اس سے اتنے ہی بے پرواہ تھے' جس قدر کہ اس کے فوجی اور اس کا مقصد صرف اسی قدر رہ گیا تھا کہ وہ جرمن فوجی دستوں کو جنگ کے لیے تیار رکھے۔ روحانی قصے پر ایک دوسرا وا ٹکنگ ازم پیدا ہو گیا۔ ہر وقت "حالت موزونیت" پر رہنا' قومی زندگی کی جگہ گروہی زندگی کو قبول کرنا' اور مہم جوئی اور ضبط نفس پر کاربند ہونا۔ ایک نوع کی خود ساختہ قیصریت جس میں برطرف شدہ جرنیل' وحشی بادشاہ' اور علیٰ ہذا القیاس کیا کچھ شامل نہیں جس کی آنکھوں میں آبادی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور وہ صرف قطعہ ارضی کی صورت میں باقی رہ جاتی ہے۔ قدیم دور کے مائی سینی بطلان جلیل اور شاہ روم کے فوجیوں اور رامیس دوم کے رضا کاروں میں ایک گہرا رشتہ ہے۔ ہم جرمنوں کی دنیا میں الارک کی روح اور تھیوڈور کا عزم دوبارہ پیدا ہو گا------ سیسل رہوڈز کی صورت میں پہلا اشارہ------ اور روسیوں کا اجنبی فوجوں کے ہاتھوں قتل عام جو چنگیز خان سے شروع ہوا اور ٹراٹسکی تک جاری رہا۔ (اس کے مابین زار شاہی کی خاندانی حکومت کا دور بھی آیا) جب سب کچھ کہہ دیا گیا اور اس پر عمل ہو چکا تو حالات لاطینی امریکی نمائشی جمہوری ریاستوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں رہے جن کی جدوجہد مدت سے ہسپانوی بارونق کے بھرپور دور کا خاتمہ کر چکی تھی۔

جب کوئی ریاست تشکیل پا لیتی ہے تو اعلیٰ تاریخ بھی تھک ہار کر سو جاتی ہے۔ انسان دوبارہ نباتات بن جاتا ہے' وہ زمین سے پیوست ہو جاتا ہے' بہرہ اور گونگا بن کر سب کچھ برداشت کر لیتا ہے۔ لازمانی دیہات اور ازلی کسان دوبارہ ظاہر ہو کر بچے پیدا کرنے لگتے ہیں اور مادر ارض میں بیج کاشت کرنے لگتے ہیں------ وہ مصروف ہو جاتے ہیں۔ ان کے جھنڈ ناکافی نہیں ہوتے کہ سپاہی بادشاہ انھیں بینڈ باجوں سے

اڑا دیں۔ زمین کے وسط میں قدیم عالمی شہروں کے آثار موجود ہیں جن کی روح مردہ ہو چکی ہے جن میں ایسے بے روح افراد آباد ہیں جن کی تاریخ بتدریج ختم ہو رہی ہے۔ یہ لوگ ہاتھ چٹائی پر گزارہ کرتے ہیں اس کے پاس کچھ نہیں یا بہت کم ہے۔ اس لیے اس کی بچت بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ بس وہ صرف گزارہ کر رہا ہے۔ عوام فاتحین کے سامنے جھک جاتے ہیں جو اس دنیا کے اقتدار اور مال غنیمت کا مطالبہ کرتے ہیں جو لوگ بچ جاتے ہیں وہ قدیم زرخیزی سے خلا کو دوبارہ پر کر لیتے ہیں اور تکلیف برداشت کرتے رہتے ہیں۔ اگرچہ اعلیٰ مقامات پر فتح و شکست ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں۔ جو لوگ زیر ہوتے ہیں' وہ دعا کرتے ہیں۔ وہ تمام تقدیس کے ساتھ' دوسری مذہبیت کو بروئے کار لا کر دعا کرتے ہیں' جس سے ہمیشہ کے لیے ان کے شکوک و شبہات رفع ہو جاتے ہیں۔ ان کی ارواح کو دنیاوی سکون میسر آتا ہے۔ یہ سکون اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ سفید مو راہبوں اور تارک الدنیا درویشوں کی برکت' حقیقت کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ یہ سعادت صرف ان لوگوں ہی کو نصیب ہوتی ہے جن میں تکلیف کی برداشت کی گہرائی کا وجود ہو جس کا مورخین کو ہزاروں سالوں میں بھی تصور پیدا نہیں ہوتا۔ عظیم تاریخ کے اختتام کے بعد ہی مقدس وجود دوبارہ ظہور میں آتا ہے۔ یہ ایک ایسا کھیل ہے جو اپنی بے مقصدی کے باوجود بھی مقدس ہے۔ یہ ستاروں کی راہگذر کی طرح کسی منزل کا پابند نہیں۔ یہ زمین کی گردش کی طرح رواں دواں ہے اور خشکی اور سمندر کے پانی کی طرح اپنی حدود سے تجاوز نہیں کرتا۔ یہ زمین پر برف اور جنگلات کا حسن پیدا کرتا ہے۔ ہم اس پر خوش ہوں یا نوحہ خوانی کریں مگر یہ ایک حقیقت ہے اور موجود ہے۔

باب دوازدہم

ریاست

(ج)

فلسفہ سیاسیات

(ا)

سیاسیات کے متعلق ہم نے اس سے زیادہ توجہ دی ہے جتنی کہ ہمارے لیے مفید ہوتی' اسی مماثلت سے سیاسی تبصروں کو بطور حقیقت کم سمجھتے ہیں۔ عظیم سیاستدانوں کو حقائق کے لرزاں شعلوں کی بنیاد پر فوراً عملی میدان میں اترنے کی عادت ہوتی ہے' ان کے لیے یہ حقیقت اتنی بدیہی ہے کہ یہ امر کبھی بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کبھی اپنے عمومی بنیادی اصولوں پر بھی غور کر لیں' بشرطیکہ ایسے کوئی اصول موجود بھی ہوں۔ ہر دور میں انھیں علم ہوتا ہے کہ انھیں کیا کرنا ہے اور اس سلسلے میں قائم کردہ ہر نظریہ ان کی اہلیت اور ذوق کے لیے اجنبی ہوتا ہے۔ مگر پیشہ ور مفکرین جنھوں نے اپنی توجہ اس اٹل حقیقت پر منعطف کر لی ہے کہ داخلی لحاظ سے عوام الناس ان حقائق سے اس قدر لاتعلق رہے ہیں کہ انھوں نے ان کے لیے تجریدات کا ایک جالا بن دیا ہے---- کیونکہ ترجیحی طور پر' تجریدی اساطیر' انصاف' نیکی اور آزادی کی طرح قبول کر لی جاتی ہیں اور پھر انھیں ماضی اور بالخصوص مستقبل کے تاریخی واقعات پر چسپاں کر دیا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ تصورات تو محض تصورات ہی ہوتے ہیں اور یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ کوئی ایسی سائنس بھی موجود ہے جسے سیاسیات کی سائنس کہا جا سکے۔ جس کی بنیاد پر ہم دنیا کے لیے ایک راستہ متعین کر سکتے ہیں' گویا ہمارے ہاتھ میں پرچہ ترکیب استعمال آ گیا ہے۔ اگرچہ اس

نوعیت کی کوئی شے دنیا میں کہیں بھی موجود نہیں۔ اس لیے تجریدی عمل کے مقابلے میں سیاسی عمل کو اتنا معمولی سمجھا جاتا ہے کہ کتابوں میں اس معاملے پر اس انداز میں بحث کی جاتی ہے کہ کیا فی الحقیقت ایسی کوئی غیر معمولی فعالیت موجود بھی ہے یا نہیں؟

اس کے برعکس اس موقع پر ہم یہ کوشش کریں گے کہ ایک تصوراتی نظام کی بجائے' سیاسیات کی ایک تدبیری صورت کو پیش کیا جائے جیسی کہ تاریخ طریق کار کے مطابق ہمیشہ سے زیر عمل رہی ہے' مگر ایسی نہیں کہ جسے زیر عمل لانا ضروری اور ناگزیر سمجھا گیا ہو' مگر اس پر کبھی عمل نہ ہوا ہو۔ مسئلہ ہمیشہ سے یہی رہا ہے اور اب بھی ہے کہ عظیم مطالب کو گہری نظر سے دیکھا جائے' اور ان میں علامتی اہمیت کا مشاہدہ کیا جائے' محسوس کیا جائے اور بیان کر دیا جائے۔ عالمی ترقی کے منصوبوں اور تاریخی حقائق میں کوئی چیز بھی مشترک نہیں ۔

دریائے حیات انسانی کے وجود کو تاریخ کہا جاتا ہے' جب ہم اسے ایک تحریک سمجھنے کی کوشش کریں' اور خاندان' جاگیر' عوام اور قوم کو اشیائے گزشتہ محسوس کریں۔ سیاست ایک ایسا طریق عمل ہے جس میں کہ وجود رواں اپنے آپ کو قائم رکھتا ہے' نشوونما حاصل کرتا ہے اور زندگی کی دوسری ندیوں پر فتح یاب ہوتا ہے۔ تمام حیات سیاست ہی ہے' یہ جبلت کی ہر صنعت میں موجود ہے یہ ہڈیوں کے اندر گودے میں موجود ہے جسے ہم آج کی زبان میں زندگی کی توانائی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ہمارا داخلی وجود جو ہر قیمت پر آگے بڑھنے اور بلند ہونے اور فضاؤں میں پرواز کرنے کے لیے مستعد رہتا ہے اور حصول قوت کی کوشش میں مبتلا رہتا ہے' بیک وقت نباتات کی طرح اور نسلی لحاظ سے مادر ارض کے ساتھ بھی وابستہ رہتا ہے۔ گھر' زمین' ہمیت' واقعت کالزوم' یہ وہ صفات ہیں جو ہر بلند پایہ بنی نوع انسان میں پائی جاتی ہیں۔ اس کی یہی سیاسی زندگی ہے جس کے تحت وہ فطری اور ناگزیر انداز سے بڑے بڑے فیصلے کرنا چاہتا ہے' کیونکہ اس کی صرف دو صورتیں ہی ممکن ہیں کہ وہ نشوونما پائے یا مرجائے تیسرا کوئی امکان نہیں۔

اسی وجہ سے طبقہ شرفا' جس سے مراد اعلیٰ نسلی خصوصیات کے حامل افراد ہیں' حقیقتاً" ایک سیاسی تنظیم ہے۔ ان کی یہ خصوصیت ان کی تربیت پر مبنی ہے' اس میں شکل و صورت کا کوئی دخل نہیں۔ ہر بڑی سیاسی شخصیت' واقعات کی ندی میں مرکزی قوت ہوتی ہے۔ وہ اپنی داخلی ذمہ داریوں اور ذاتی کاروبار کے احساس میں شریفانہ طرز عمل کا حامی ہوتا ہے۔ دوسری طرف یہ تمام صفات کائناتی ہوتی ہیں اور ذہانت کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے منصوبہ بندی کی سیاست اور تصور میں ایسے عناصر موجود ہوتے ہیں جن میں بچاری شامل نہیں ہو سکتے۔ بچے بہترین سفارت کار ہوتے ہیں۔ اپنے کھیل کود میں یا جب وہ کوئی چیز طلب کریں تو ایک "کائناتی وجود" جو ہر فرد میں موجود ہوتا ہے فوراً" ظاہر ہو جاتا ہے۔ بحالت خواب چلنے والوں کی طرح اس کی چال میں یقین ہوتا ہے۔ وہ کچھ سیکھنے کی بجائے سیکھے ہوئے بعض خصائص کو فراموش کر دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسا ہنر ہے' جب وہ بچپن سے ذرا اوپر آتے ہیں تو ان کے کام آتا ہے۔ لہٰذا یہ نادر

فن' بالغوں کی دنیا میں صرف مدبرین میں پایا جاتا ہے۔

وجود کی ان ندیوں کے درمیان واقع اعلیٰ ثقافتی خلا کو اعلیٰ حکمت عملی پر کرتی ہے۔ اس لیے یہ عمل اسی صورت میں ممکن ہوتا ہے' جبکہ انسان زیادہ تعداد میں موجود ہوں۔ ایک قوم کا وجود عوام الناس ہی پر منحصر ہے' مگر نسلی لحاظ سے یہی عمل باہمی جنگ وجدال کی صورت اختیار کر لیتا ہے------ یہ ایک ایسی حقیقت ہے' جسے کوئی بھی صداقت تبدیل نہیں کر سکتی۔ ہر زندہ شے کی ابتدائی سیاست جنگ ہی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے' یہاں تک کہ اگر گہرائی میں سوچیں تو زندگی اور جنگ ایک ہی ہیں۔ وجود اور عزم جنگ کا خاتمہ بیک وقت ہوتا ہے۔ جرمن زبان کے قدیم الفاظ "OERUSTA" اور "ORLAG" کا مطلب سنجیدگی اور تضاد قدر ہے' مذاق یا کھیل نہیں۔ ان میں تضاد کی شدت ہے' معیاری اختلاف نہیں۔ اگرچہ ہر اعلیٰ سیاسی رہنما اس کوشش میں رہتا ہے کہ وہ تلوار کی بجائے اعلیٰ ذہانت کا اسلحہ تیار کرے اور اگرچہ ہر ثقافت کی معراج یہ ہے' کہ وہ جنگ کا تصور ہی ختم کر دیے لیکن اس کے باوجود سفارت کاری اور جنگ کے ہنر کے ابتدائی تعلقات قائم ہیں۔ لڑائی کا کردار دونوں میں یکساں ہے۔ مصاقیات' حکمت عملی اور پس منظر میں مادی قوتیں دونوں میں مددگار ہوتی ہیں۔ مقصد بھی ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے کہ اس کی اپنی وحدت حیات (جماعت یا قوم) کو دوسرے کی قیمت پر اضافہ حاصل ہو۔ جب کبھی بھی نسلی عنصر کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے تو یہی مناقشات کسی اور میدان میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اب ملکوں کے جھگڑوں کی بجائے جماعتوں کے جھگڑے یا علاقہ جات کے تنازعات (اگر عزم ترقی ختم ہو گیا ہو) تو مہم جوؤں کے خدم و حشم کے حوالے سے تنازعات پیدا ہو جاتے ہیں' ان کے اعمال کو برداشت کرنے کے لیے باقی ماندہ آبادی اپنے آپ کو آمادہ کر لیتی ہے۔

زندہ قوتوں کی ہر جنگ میں مسئلہ زیر بحث یہ ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر حکومت کس کے ہاتھ میں ہو۔ یہ مسئلہ ہمیشہ زندگی کا ہوتا ہے' صرف نظام' قانون' یا منصوبہ بندی کا نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے واقعات کی رفتار میں اضافہ ہو جاتا ہے ۔ تمام افعال میں مرکزی حیثیت حاصل کرنے کے لیے کسی فرد کی ذاتی شخصیت کو تمام آبادی اور تمام ادوار سمو دینا' تاریخ پر حکمران ہونا' اور یہ غرض ہو تا کہ اپنی ذات یا خاندان کو تمام واقعات کا محرک بنا دیا جائے------ یہ ایک کمیاب شعور ہے۔ مگر ہر شخص میں ایک ناقابل مزاحمت سچ کی صورت میں موجود ہے اور اس میں تاریخی پیشے کا عنصر شامل ہے۔ تاریخ کا تعلق ہمیشہ شخصیات سے ہوتا ہے۔ اس لیے سیاست کا تعلق بھی شخصیات ہی سے ہوتا ہے ۔ اصولوں کے مابین کشمکش نہیں ہوتی بلکہ انسانوں کے مابین ہوتی ہے۔ جدوجہد تصورات کے لیے نہیں بلکہ نسلی معیاروں کے لیے کی جاتی ہے۔ انتظامی قوت ہی حقیقی اہمیت کی حامل ہے۔ انقلابات کو بھی اس میں کوئی استثنا حاصل نہیں کیونکہ "حتمی قوت' عوام کے ہاتھ میں ہے" اس سے یہی حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ حکمران قوتوں نے اپنے آپ کو بادشاہ کہنے کی بجائے عوامی رہنما کا خطاب دے لیا ہے۔ مگر اس سے طریق حکمرانی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور محکوموں کی حالت بھی اپنی جگہ پر قائم ہے' بلکہ عالمی امن بھی جہاں تھا' اس میں بھی کوئی تغیر نہیں ہوا' بلکہ چند حاکم اقوام نے جو حکومت کرنا چاہتی ہیں تمام دنیا پر قبضہ کر رکھا ہے۔

انتظامی اختیارات کے تصور میں وحدت زندگی کا مفہوم مضمر ہے۔ حیوانات کے معاملے میں بھی----- زندہ افراد ہی حکومت کا موضوع اور مقصد ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت اتنی بدیہی ہے کہ کسی بھی اجتماعی وحدت نے ایک لمحے کے لیے بھی' شدید ترین بحران میں بھی (جیسا کہ ۱۷۸۹ء میں پیش آیا تھا) اپنی اس داخلی تشکیل کو نظر انداز نہیں کیا۔ صرف متعلقہ فرد ہی اوجھل ہوتا ہے مگر اس کا عہدہ نہیں۔ اگر کوئی قوم حالات کے مدوجزر میں فی الحقیقت گم ہو جائے تو وہ اپنے رہنماؤں سے محروم ہو کر ادھر ادھر تیرتی پھرتی ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ کسی بیرونی قوت کے قبضے میں ہے اور اب اس کی حیثیت انسان کی بجائے محض شے کی ہو چکی ہے۔

ایسے لوگ موجود نہیں جنھیں سیاسی بصیرت حاصل ہو اور وہ لوگ جن پر ایسا ہونے کا گمان کیا جاتا ہے وہ بھی حکمران اقلیت کے ہاتھوں میں ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ اپنے آپ کو موزوں حالت میں سمجھتے ہیں۔ انگریز بطور قوم' بے سمجھ' تنگ نظر' اور سیاسی معاملات میں بے عمل ہیں' اور بالکل دوسری اقوام ہی کی طرح ہیں----- مگر ان میں ایک خصوصیت موجود ہے----- وہ ہر معاملے کو عوامی بحث کا موضوع بنا لیتے ہیں----- اس سے اعتماد کی روایت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس میں سادہ ترین فرق یہ ہے کہ انگریزوں میں بعض قدیم عادات پختہ ہو چکی ہیں۔ ان پر یہ عمل کرتے ہیں کیونکہ تجربے نے انھیں بتا دیا ہے کہ یہ ان کے لیے باعث افادہ ہے۔ ایسے اتحاد خیال کی بنا پر جو خارجی طور پر اتفاق رائے معلوم ہوتا ہے یہ اس اعتماد کی طرف صرف ایک قدم ہے کہ جو حکومت قائم ہے وہ اس کی منشا اور منظوری کے مطابق ہے۔ حالانکہ صرف ظاہری طور پر اور تیکنیکی لحاظ سے ہی یہ حکومت اس کی ہو سکتی ہے اور یہ تصور بار بار اس کے سر میں ہتھوڑوں کی ضربات کی طرح ٹھونسا جاتا ہے۔ انگلستان میں حکمران جماعت نے اپنے مقاصد اور طریق کار وضع کر لیے ہیں جن میں قوم کے عوام کا کوئی دخل نہیں۔ یہ اپنا کام بغیر کسی تحریر شدہ دستور کے انجام دیتی ہے جس سے متعلق شائستگی----- جو محض تجربے کی بنا پر وجود میں آئی ہے اور اس کا کسی نظریے سے کوئی تعلق نہیں----- کو اس لیے خارج کرنا پڑتا ہے کہ وہ مبہم اور غیر واضح ہے۔

مگر ہر لشکر کا حوصلہ اس کے سپہ سالار پر منحصر ہوتا ہے' اور اعتماد کا مطلب یہ ہے کہ تنقید سے رضا کارانہ گریز کیا جائے۔ یہ افسر کا کام ہے کہ وہ بزدلوں کو دلیر بنا دے یا دلیروں کو بزدلی کا شکار کر دے۔ یہ اصول' افواج' عوام الناس' جماعتوں' اور فریقوں پر یکساں درست بیٹھتا ہے۔ کسی قوم میں سیاسی شعور کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ اپنے رہنماؤں پر اعتماد کرے مگر یہ اعتماد مدرکہ نہیں' بلکہ وقت کے ساتھ خود پختگی حاصل کرتا ہے' کامیابی سے اسے مزید استحکام حاصل ہوتا ہے اور اس طرح یہ روایت کا حصہ بن جاتا ہے۔ جب کسی محکوم طبقے میں بے یقینی پیدا ہو جائے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس کے رہنماؤں میں مطلوبہ اہلیت موجود نہیں؟ بنا پر غیر جبلی انداز میں تکرار و تنقید وجود میں آتی ہے۔ یہ عمل ہی یہ ظاہر کرتا ہے کہ قوم اپنے مقام سے ہٹ گئی ہے۔

۲

سیاست پر عمل کیسے ہوتا ہے' پیدائشی سیاستدان سب سے بڑھ کر ماہر تشخیص ہوتے ہیں۔ وہ انسانوں کی تشخیص کرتے ہیں' حالات اور اشیا کی تشخیص کرتے ہیں۔ اسے ایسی بصارت حاصل ہوتی ہے جس سے وہ بلا جھجک اور بلا روک ٹوک اپنے ماحول کے تمام امکانات کا جائزہ لے لیتا ہے۔ جس طرح گھوڑوں کا پرکھنے والا ایک ہی نگاہ میں دیکھ لیتا ہے کہ کون سا گھوڑا دوڑ کے میدان میں کیا مقام حاصل کرے گا۔ کسی شے کو اچھی طرح سے جانے بوجھے بغیر یا تو ضرورت سے زیادہ تنگ کرنا ہے یا ڈھیلا چھوڑ دیتا ہے۔ یہ صلاحیت اس شخص سے قطعاً" مختلف ہے جو صاحب نظریات میں ہوتی ہے۔ ہر وجود کی خفیہ نبض یکساں ہوتی ہے اور تاریخ سے بھی مماثلت کا عنصر موجود ہوتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے لیے زندہ رہتے ہیں۔ وہ شخص جو حقیقت پر انحصار کرتا ہے' وہ جذبات یا منصوبہ بند سیاست پر عمل کرنے سے پرہیز کرتا ہے۔ وہ صرف الفاظ پر اعتماد نہیں کرتا' اس کے لبوں پر صرف رہنما الفاظ ہی کا ورد رہتا ہے----- صداقتیں؟ ایک پیدائشی رہنما حق و باطل کے مناقشات سے بھی ماورئی ہوتا ہے۔ وہ واقعات کی منطق کو نظام کی منطق سے کبھی خلط ملط نہیں کرتا۔ صداقت یا غلطی----- اس کے لیے دونوں برابر ہیں----- اس کا تعلق صرف ذہانتی لہروں سے ہے اور وہ صرف کام کے حوالے سے بات کرتا ہے۔ وہ ہر شے کی قوت آفرینی' استدام اور سمت کا محاسبہ کرتا ہے اور جلد ہی وہ ان کا انجام متعین کر کے ان کی قوت اور طریق رہنمائی کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ اس کی کچھ تیقنات ہوتے ہیں وہ یقیناً" اسے بہت عزیز ہوتے ہیں۔ مگر وہ ان کو اپنی ذات تک محدود رکھتا ہے مگر کوئی بھی حقیقی سیاستدان اپنی عملی سیاسی زندگی میں ان سے پیوست نہیں رہتا۔ نظام ہمیشہ بے ضمیر ہوتا ہے' تماشائی کے بغیر کسی اور شخص کے پاس ضمیر نہیں ہوتا' یہ گوئٹے کا قول ہے مگر سلا اور روبس پیری' بسمارک اور پٹ سب اس اصول کے قائل ہیں۔ عظیم پوپ' اور انگریز سیاسی رہنما جب تک وہ ملکیت اشیا کی کوشش میں مصروف رہے ہیں۔ بطور فاتحین اور نو ساختہ امرا ہر دور میں اسی اصول پر عمل درآمد کرتے رہے ہیں۔ انوسینٹ سوم کے معاملات کا اندازہ کریں' جو تمام دنیا پر کلیسا کی حکومت قائم کرنے میں بہت حد تک کامیاب ہو گیا تھا اور اس نے کامیابی کے لیے سوال و جواب تیار کر لیے تھے لیکن اس کے بغیر کسی اور شخص کا وجود کلیسا کے لیے قابل برداشت نہ ہوتا۔ انگریز آباد کاروں' امریکی خوش قسمتوں' فاتح انقلابیوں یا اس معاملے سے متعلق ریاستوں' فریقوں' یا قوموں کا تو ذکر ہی لاحاصل ہے۔ یہ افراد کا معاملہ نہیں بلکہ حیات بحیثیت مجموعی ہی ضمیر سے بے نیاز ہے۔

ضروری امر یہ ہے کہ انسان اس وقت کو سمجھے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ شخص جو اس کی انتہائی قوتوں سے واقف نہیں' جو اپنے اندر متجانس اشیا کو محسوس نہیں کرتا' جو اسے ایسے راستے پر چلا رہی ہیں' جس پر نہ کوئی باڑ یا رکاوٹ ہے نہ متعین تصورات موجود ہیں' جو صرف سطحی' عوامی رائے' طویل فقرات اور روز مرہ کے نئے تصورات پر یقین رکھتا ہے۔ وہ ان معاملات کے مقابلے کا اہل نہیں ایسا شخص

عوام کی قوت کا اسیر ہے' عوام اس کی اتباع میں ہیں۔ جرنیلین ناپنے کے لیے ماضی کی طرف نہ دیکھیں' اور دوسری کے نظام دیکھنے کے لیے ادھر ادھر بھی نہ دیکھیں۔ اقوام پر ایسے وقت آتے ہیں' جو اب ہم پر ہے یا گر یکین پر گزرا تھا جبکہ دو خطرناک تصوراتی نظام وجود میں آئے------ رجعت پسند' اور جمہوری------ ان میں سے ایک تاریخ کو بدلنا چاہتا ہے اور دوسرا تاریخ کی علت نمائی سے متعلق ہے۔ مگر ان دونوں کے کسی قوم پر اثرات میں کوئی فرق نہیں' جس کی قضا و قدر کے متعلق انھیں قدرت حاصل ہے۔ خواہ یہ حافظے سے متعلق ہو' یا تصورات پر مبنی ہو' یہ دونوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ حقیقی مدبر تاریخ مجسم ہوتا ہے۔ اس کا سمتی اظہار ایسی صورت میں ہوتا ہے کہ اس کی انفرادی رضا معلوم ہو اور اس کی نامیاتی منطق' کردار کا روپ دھار لیتی ہے۔

مگر حقیقی مدبر لفظ کے وسیع تر معانی میں معلم بھی ہوتا ہے۔ وہ کسی عقیدے یا اخلاقی مسلک کا ترجمان نہیں ہوتا' مگر وہ اپنے عمل سے مثال پیش کرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مذہب کبھی کسی قوم کا اسلوب حیات نہیں بدلتا۔ یہ صرف ضمیر بیدار میں سرایت کرتا ہے' جس سے ذہین افراد متاثر ہوتے ہیں۔ وہ ایک نئی دنیا پر روشنی ڈالتا ہے' وہ انسانیت کو نئی مسرتیں فراہم کرتا ہے۔ ارادہ اور برداشت کی صفات تاحیات قائم رکھتا ہے' مگر حیات کی قوتوں پر اسے کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ وہ زندگی کے دائرے میں ایک بڑی شخصیت کا کردار ادا کرتا ہے۔ وجود' نسل' اور کائناتی قوتیں اس بڑی شخصیت سے مربوط رہتی ہیں۔ یہ ہمیشہ سے تخلیق کار رہا ہے (یہ کسی کی ہیئت متعین نہیں کرتا' مگر ان میں صفات پیدا کرتا ہے اور اس غرض سے تربیت کرتا ہے) اور طبقات اور قوم کی نوعیت میں موثر تبدیلیاں پیدا کرتا ہے۔ اس سے مراد صداقت' خیر یا دیانت نہیں بلکہ رومی' سخت گیر' یا پروشین ہے۔ احترام' فرض' نظم و ضبط' عزم مصمم' کتابیں پڑھنے سے نہیں آتے بلکہ ایک زندہ دریائے وجود کی مثال سے پیدا ہوتے ہیں۔ فریڈرک ولیم اول کو کیوں ایک معلم سمجھا جاتا ہے' وہ ہر دور کے افراد سے عظیم تھا' نسلیں گزر گئیں مگر اس کا ذاتی تشکیل قوم کا کردار ختم نہیں ہوا۔ حقیقی مدبر ایک عام سیاست کار سے الگ پہچانا جاتا ہے۔ وہ کھلاڑی جو محض کھیل سے لطف اندوز ہونے کے لیے کھیلتا ہے' وہ تاریخ میں بلند مقام حاصل کر لیتا ہے------ وہ شخص جو دولت یا شہرت کے لیے------ وہ اس مقام سے محروم رہتا ہے۔ اگر کوئی مدرس کسی تصور کی تبلیغ کرتا ہے' فی الحقیقت وہ قربانی کا مطالبہ کرتا ہے اور فی الحقیقت اسے حاصل کر لیتا ہے۔ کیونکہ اسے وقت اور قوم کی ضروریات کا احساس ہے۔ اس کے خیالات کی ہزارہا لوگ تائید کرتے ہیں۔ وہ اپنے خیالات کو ان کے دلوں میں بٹھا دیتا ہے اور ان میں کارنامے انجام دینے کی اہلیت پیدا کرتا ہے' اس کے بغیر وہ کبھی بھی یہ منزل حاصل نہ کر سکتے -

بلند تر خوبی عمل نہیں بلکہ حکمرانی کی اہلیت ہے۔ اسی وجہ سے کوئی شخص اپنی ذات سے باہر نکل کر ایک دنیا کا مرکز بن جاتا ہے۔ ایک ایسی حکمرانی بھی ہے' جس کی اطاعت انسان کو فخر عطا کرتی ہے اور اسے آزاد شریفانہ عادت کی صورت دیتی ہے۔ یہ وہ صفت ہے جو نپولین میں مفقود تھی۔ اس کی لیفٹیننی کی عادت کی باقیات' اسے اپنے آدمیوں کی تربیت میں مانع آتی اور وہ بھی اپنے آپ کو صرف سرکاری آدمی سمجھتے۔

اور وہ انھیں شخصی اثرات کی بجائے احکام کی طاقت سے مطیع رکھنا چاہتا۔ وہ حکمرانی کے لطیف جذبات کو سمجھنے سے قاصر تھا اور ہر امر کا فیصلہ خود کرنا چاہتا ہے۔ وہ انسانی اہلیتوں کو سمجھنے سے قاصر رہا اور آہستہ آہستہ اپنی حکمرانی کی کم اہلی کی نذر ہو گیا۔ مگر ہر وہ شخص جو قیصر یا فریڈرک اعظم کی طرح انسانیت کے اعلیٰ اوصاف سے مالا مال ہوتا ہے وہ محسوس کرتا ہے------ ایک ایسی شام میں جبکہ تمام منصوبے مرضی کے مطابق جا رہے ہوں' اور ساری مہم جوئی فتح میں تبدیل ہو رہی ہو' جب کسی ایسی دستاویز پر دستخط ہو چکے ہوں جو ایک عہد کے خاتمے اور دوسرے کے ظہور کی علامت ہو تاریخ کے اس موقع پر اختیارات کا وہ عجیب و غریب احساس پیدا ہوتا ہے جسے صداقتوں کا پرچارک انسان کبھی بھی آشنا نہیں ہو سکتا۔ ایسے لمحات بھی ہوتے ہیں------ جن سے کائناتی رفتار کی زیادہ سے زیادہ تیز رفتاری کا پتہ چلتا ہے جب کہ فرد خود قضا و قدر کا متجانس بن جاتا ہے۔ دنیا میں مرکز کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اسے اپنی شخصیت وہ غلاف نظر آنے لگتی ہے جس میں کہ مستقبل کی تاریخ لپیٹ دی جائے گی۔

پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ اپنی ذات کا وجود منوایا جائے۔ دوسرا جو زیادہ اہم نہیں' مگر اپنے اثرات کے لحاظ سے مشکل اور عظیم ہے------ وہ ایک نئی روایت کی تشکیل ہے۔ دوسروں کو ساتھ ملاتا ہے تاکہ اس کا منصوبہ اس کی تجاویز اور روح کے مطابق جاری رہ سکے۔ ایسی فعالیتوں کی لہریں پیدا کرنا جو ابتدائی رہنما کی ضروریات کو ختم کر دے اور منصوبہ بدستور جاری رہے۔ یہی وہ مقام ہے جبکہ کوئی مدبر ایسے مقام تک پہنچتا ہے' جسے کلاسیکی دور میں الہیاتی سمجھا جاتا۔ وہ نئی زندگی کا خالق بن جاتا ہے' نوجوان نسل کا روحانی مورث اعلیٰ قرار پاتا ہے۔ وہ فی نفسہ ایک وحدت کی حیثیت سے ختم ہو جاتا ہے یعنی چند سالوں واقعات کی ندی سے ایک طرف ہو جاتا ہے لیکن اس کی پیدا کردہ ایک اقلیت اس کی جگہ لے لیتی ہے اور اس کے منصوبوں کو ہمیشہ کے لیے جاری رکھتی ہے۔ یہ کائناتی وجود جس میں حکمرانوں کی روح موجود ہوتی ہے دوسروں کو تربیت دیتا ہے اور ان کو بطور ورثا چھوڑ دیتا ہے۔ تمام تاریخ میں ایسے افراد ہی نے دائمی اثرات پیدا کیے ہیں۔ عظیم رہنما کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں خواہ وہ آئے' جلد فتح کر لے یا دیر سے' وہ اپنے معاملات کا درست تعین کرتا ہے۔ عظیم افراد اکثر تباہی زیادہ پھیلاتے ہیں اور تعمیر کم کرتے ہیں۔ ان کی موت سے جو خلا پیدا ہوتا ہے اس سے واقعات کی رفتار میں اضافہ ہو جاتا ہے' مگر روایت کے قیام کا مطلب حادثات کو کم کرنے کا نام ہے۔ روایت سے اوسط میں اضافہ ہوتا ہے جس سے کہ مستقبل کو فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ کسی قیصر کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ ایک مجلس قانون ساز اس کی جگہ پر کر لیتی ہے۔ نپولین کی جگہ منتظمین اور افسران کا گروہ سنبھال لیتا ہے۔ ایک مضبوط روایت اہل افراد کو ہر جگہ سے یکجا کر لیتا ہے اور معمولی عطیات سے بڑے بڑے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اٹلی اور ہالینڈ کے مصوری کے مدارس اس کے ثبوت میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان کی اہمیت پروشیا کی افواج اور رومی محکمہ امور خارجہ کے سفیروں سے کم نہیں۔ بسمارک میں یہ سب سے بڑی کمی تھی (اگر اس کا فریڈرک ولیم اول سے موازنہ کیا جائے) کہ وہ کامیابی حاصل کر سکتا تھا مگر روایت قائم نہیں کر سکتا تھا۔ مگر وہ مولٹکے کے دفتری اہل کاروں کی مثال پیدا نہ کر سکا' حالانکہ یہ اس کا ہمعصر تھا اور اس کے پاس سفارت کاروں کی ایسی نسل موجود تھی' جو ریاست کے نئے منصوبوں پر عمل درآمد

کر سکتے تھے۔ ضروری تھا کہ نچلی سطح سے اہل لوگ اوپر لائے جاتے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ بسمارک کے کارناموں کی روایت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا۔ اگر تشکیل روایت کی یہ صورت پیدا نہ ہو سکے تو پھر متجانس حکمرانوں کی جگہ ایسے دماغ اکٹھے کر لیں گے کہ جب ان کے سامنے کوئی خلاف توقع معاملہ پیش آ جائے تو اپنے آپ کو مجبور سمجھیں گے۔ اگر ایسی صورت ظہور میں آ جائے تو آخری اختیار عوام کے ہاتھ میں ہے (یہ وہ جملہ ہے جو عوام کی اہمیت کا مظہر ہے)۔ عوام کسی ایسی اقلیت کو اقتدار میں لا سکتے ہیں' جو اعلیٰ تربیت یافتہ ہوں اور بتدریج ایک پختہ روایت قائم کر سکیں۔ یہ لوگ اہل افراد کو اپنے ساتھ جمع کر لیں گے اور ان کی اہلیت کا بھرپور استعمال کریں گے اور اپنے آپ کو قوم کے افراد کے ہم نوا رکھیں گے کیونکہ انھیں اس قوم پر ہی حکومت کرنا ہے۔ ایسی اقلیت یقینی طور پر ایک اعلیٰ نسل کی صورت اختیار کر لے گی۔ قطع نظر اس امر کے کہ ان کی ابتدا ایک جماعت کی حیثیت سے ہوئی مگر ان کو جو اعتماد حاصل ہوا وہ اعلیٰ خون پر مبنی ہے نہ کہ استدلال پر۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ جو امور وقوع پذیر ہوتے ہیں وہ خودبخود وجود میں آ جاتے ہیں اور اس کے لیے کسی اعلیٰ دماغ کی ضرورت نہیں ہوتی اور یہ کہنا چاہیے کہ عظیم سیاسیات' عظیم سیاست دانوں کی جگہ لے لیتی ہیں۔

پھر سیاست کیا ہے؟ یہ امکانات کا فن ہے۔ یہ ایک قدیم مقولہ ہے مگر ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ ایک مالی ایک بیج سے ایک درخت حاصل کر سکتا ہے یا وہ پودوں کے معیار کو بہتر بنا سکتا ہے۔ وہ اس کو بہار دے سکتا ہے یا اسے مرجھا کر ختم کر سکتا ہے۔ خود اس بیج کے اندر بعض صفات پوشیدہ ہیں۔ وہ اس کی نشوونما' رنگ' پھول اور پھل ہیں۔ مالی کی نظر ان تمام امکانات پر ہوتی ہے۔ پس وہ اپنی ضروریات کے لیے اس کی تکمیل' قوت اور آخری انجام تک نگاہ رکھتا ہے۔ مگر اس کے وجود کی بنیادی سمت بندی کی مختلف سطوحات اور رفتار' یہ کسی کے اختیار میں نہیں ہیں۔ وہ پودا ان صفات کو خود حاصل کر لے گا یا ختم ہو جائے گا۔ اور یہی اصول اس عظیم وحدت کے متعلق بھی درست ہے' جسے ہم ثقافت کہتے ہیں۔ انسانوں کے خاندانوں کی ندیاں اس کے کھیتوں میں موجود ہیں اور عظیم مدبر اپنی قوم کا مالی ہے۔

ہر فعال شخص کسی خاص وقت میں اور خاص وقت کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی کامرانیوں کے حدود متعین کر دیے جاتے ہیں۔ اس کے دادا' اس کے پوتے کے اعداد و شمار' مقاصد اور حکمت عملی اس لیے یکساں نہیں ہوتے۔ اس کی شخصیت کے پیش نظر اس کا دائرہ مزید محدود کر دیا جاتا ہے۔ اس کی قوم کے اوصاف' کیفیت حالات اور وہ لوگ جن کے ساتھ اسے کام کرنا ہے تمام پر غور کیا جاتا ہے۔ یہ اعلیٰ سیاست کاروں کا سب سے بڑا وصف ہے کہ وہ کبھی بھی ان حدود سے تجاوز نہیں کرتا۔ لیکن اس کے ساتھ وہ کبھی ان فوائد کو بھی نظر انداز نہیں کرتا جو اس عمل سے وابستہ ہوں----- ان حدود کے ہوتے ہوئے ہم جرمنوں کے متعلق اکثر تکرار نہیں کرسکتے۔ اس سے اس یقینی عزم کا پتہ چلتا ہے کہ کیا کیا جا سکتا ہے اور کیا ہو سکے گا۔ کسی ملک کی سیاسی زندگی کی بنیادی صورتیں' ان کی سمت بندی اور بدرجہ ارتقا کی اقدار ایسے وقت سے منسلک کر دی جاتی ہیں' جس میں تغیر و تبدل ممکن نہیں ہوتا۔ یہ سیاسی کامیابی کا صرف ایک راستہ

ہے' منزل آخر نہیں۔ دوسری طرف سیاسی تصورات کے پجاری' جو کچھ تشکیل کرتے ہیں' اس کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔ ان کی ذہانتی آزادی حیران کن ہے۔ مگر ان کے ذہنی قلعے جن ہوائی بنیادوں پر تعمیر ہوتے ہیں' ان میں دانائی' صداقت' آزادی اور مساوات سب شامل ہیں اور یکساں حیثیت کے حامل ہیں۔ یہ بالائی منزل سے نیچے کی طرف تعمیر کیے جاتے ہیں' حقائق کا آقا اس حد تک مطمئن ہے کہ وہ بغیر ادراک کے انھیں دیکھتا بھی ہے اور بطور حقیقت تسلیم بھی کر لیتا ہے۔ یہ بہت زیادہ اہم معلوم نہیں ہوتا۔ پھر بھی یہ آزادی کا نقطہ ضرور ہے۔ اس لفظ کا سب سے بڑا مفہوم یہی ہے کہ سلیقہ اور مہارت چھوٹی چھوٹی اشیا میں بھی ہوتا ہے۔ چوٹی کو چھو لینے کے لیے آخری محتاط لمس' انتہائی نازک لطیف جنبش جو انفرادی بھی ہو اور اجتماعی بھی درکار ہے۔ ایک مدبر کا فن نہ صرف صحیح خطوط پر قائم کردہ واضح تصورات اور غیر متغیر صورت میں اس کے سامنے رہتا ہے' بلکہ وہ ایک ایک معاملے اور ایک ایک فرد کو انھیں خطوط پر پرکھتا ہے' جس کی وجہ سے امکانی تباہی فیصلہ کن کامیابی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ان تمام کامیابیوں کی بنیاد غیر واضح امکانات کی تنظیم پر ہیں۔ اس کھیل کا ماہر ٹیلی رانڈ کی طرح شکست خوردہ فریق کی سفارت کاری کے لیے وی آنا گیا اور کامیاب ہوا۔ لوقا کے اجلاس میں قیصر نے جس کی حالت بالکل مایوس کن تھی' نہ صرف پومپئی کی خدمات کو اپنے لیے حاصل کر لیا' بلکہ اسی دوران میں اس کی اہمیت بھی کم کر لی اور اس نے اپنے مخالف فریق کو اس حقیقت کا پتہ بھی نہ چلنے دیا۔ مگر امکانات کی سرحدیں ہمیشہ خطرناک ہوتی ہیں اگرچہ عظیم باروق کے سفارت کار ہمیشہ اپنے مقاصد کا واضح بیان کرتے تھے مگر ماہرین تصورات کا یہ استحقاق ہوتا ہے کہ وہ ان کا بطلان ثابت کرتے رہیں۔ تاریخ میں ایسے موڑ ضرور آئے ہیں جن میں ماہر سیاست کار بھی حالات کے ساتھ بہ گئے۔ تاکہ ان کا مقام رہنمائی ضائع نہ ہو۔ اگرچہ حالات کی تحدید لچک دار ہوتی ہے اور ان حدود کی نشاندہی میں چھوٹی سے چھوٹی غلطی بھی گوارا نہیں کی جاتی جب کبھی کوئی انقلاب دھماکہ خیز نقطے پر پہنچ جائے تو یہ اس امر کو ثابت کرتا ہے کہ اس انقلاب کے منتظمین اور مخالفین سیاسی نبض کا صحیح مشاہدہ نہیں کر سکے۔

مزید برآں لازمی امور کو ضرور عمل میں آنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب مناسب موقع موجود ہو تو حکمران جماعت کو اپنے لیے اعتماد حاصل کر لینا چاہیے۔ اگر ایسے موقعے کو بطور قربانی ضائع کر دیا جائے تو اس میں کمزوری کا اظہار ہو گا اور بے عزتی کا باعث ہو گا۔ سیاسی ہیئتیں زندہ ہوتی ہیں جن میں شدید تبدیلیاں ایک متعین راستے پر چلتی ہیں۔ اور اس سمت یا راستے کو تبدیل کرنے کی کوشش یا انھیں کسی دوسرے مقصد پر لگانے کے اہتمام کا مطلب اعتراف شکست ہے۔ رومی سلطنت میں یہ تطابق و تماثل موجود تھا مگر سپارٹا والوں میں نہیں تھا۔ جب جمہوریت کا دور عروج پر ہوتا ہے تو ہمیں یہ بار بار معلوم ہوتا ہے (جیسا کہ فرانس میں ۱۷۸۹ء میں ہوا اور جرمنی کی ۱۹۱۸ء سے قبل حالت تھی) کہ ایک تباہ کن لمحہ آ رہا ہے۔ جس کے بعد ضروری اصلاحات کو بطور تحفہ پیش کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہو گا پھر ایسا وقت آ جاتا ہے کہ جو کچھ آپ پوری قوت سے سنبھالے رکھتے ہیں بطور خیرات آپ کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے اور اس طرح تحلیل کا نشان بن جاتا ہے۔ مگر وہ لوگ جو اس لزوم کو مناسب وقت پر تشخیص کرنے سے محروم رہتے ہیں وہ دوسری صورت حال کو سمجھنے میں بھی ناکام رہیں گے کسی منزل کے لیے سفر کا آغاز یا بہت پہلے ہو گا یا بہت تاخیر

ہے۔ صحیح وقت کا تعین ہی قوم کی قسمت کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ کیا وہ دوسروں کے قضا و قدر یا خود دوسروں کی قضا و قدر کے ہاتھوں میں کھیلیں گے۔ مگر جمہوریت کا زوال بھی وہی غلطی دہراتا ہے کہ وہ ایسی شے پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتا ہے جو ماضی میں مقبول تصور تھا۔ ہماری بیسویں صدی کا یہی بہت بڑا خطرہ ہے' قیصریت کے راستے پر چلتے چلتے کبھی کبھی کاٹو سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے۔

وہ اثرات جو ایک مدبر۔۔۔۔ خواہ وہ کتنی بھی مضبوط حالت میں ہو۔۔۔۔ ایسے طریقہ ہائے عمل اختیار کرلیتا ہے' جو بہت چھوٹے ہوتے ہیں اور بلند پایہ مدبر کی یہی خوبی ہے کہ وہ اس معاملے میں اپنے آپ کو کبھی دھوکا نہیں دیتا۔ اس کا فرض منصبی یہی ہے کہ وہ کام کرتا رہے اوراس طرح تاریخ میں اپنا نام زندہ رکھے۔ یہ صرف نظریاتی' ہی کا رویہ ہے کہ وہ جوش و خروش سے حد سے فزوں تصوریت کو تلاش کرتا ہے۔ مگر وہ لوگ جو سیاسی طور پر موزوں ہوتے ہیں۔ وہ لازماً' اور اشیا کے علاوہ غیر مشروط انداز میں زیادہ سے زیادہ جدید ذرائع پر قابو پانا چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی دوسری صورت موجود نہیں' ذرائع اور طریق ہائے کار زمان کے مقدمات ہیں اور زمان کی داخلی ہیئت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر کوئی شخص آگے بڑھ کر ان کو تمام لے تو وہ اپنے ذوق یا احساس کو اس امر کی اجازت دیتا ہے کہ وہ اس کی نبض پر قابو حاصل کر لے۔ اس لیے وہ فوری طور پر حقائق سے ہاتھ دھولیتا ہے۔ طبقہ شرفا کے لیے خطرناک مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنے ذرائع میں قدامت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہیں مگر جمہوریت کے لیے باعث خطر معاملہ یہ ہے کہ وہ طریق کار اور ہیئت کو خلط ملط کر لیتے ہیں۔ زمانہ حال میں' اور آئندہ متعدد برسوں میں پارلیمانی ذرائع۔۔۔۔۔ انتخابات اور صحافت ہی رہیں گے' کوئی شخص ان کے متعلق جو چاہے سوچ سکتا ہے۔ وہ ان کا احترام کر سکتا ہے یا انہیں نظر انداز کر سکتا ہے مگر یہ ضروری ہے کہ وہ ان کو اپنی تابع میں رکھے۔ ہر میدان میں ہنرمندی اور سلیقے کا یہی اہم نشان ہے اور سیاست کاری کے لیے بھی اس میں کوئی استثنا نہیں۔ اب خارجی ابلاغ عامہ ان کے حوالے سے ضروری نہیں بلکہ صرف ایک نوعیت کی پردہ داری ہے اور نتیجتاً" اس میں تبدیلی پیدا کی جا سکتی ہے' اور معقولیت کی حد میں لایا جا سکتا ہے اور ان کو دستوری متن کے مطابق بنایا جا سکتا ہے۔۔۔۔ اس کے حقائق کو معمولی حد تک بھی تبدیل کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔۔۔۔ اسی باعث انقلابیوں کی آرزوئیں' حقوق' اصولوں اور رائے عامہ کے کھیل تاریخی میدان میں کھیلنا شروع کر دیتے ہیں۔ مگر ایک مدبر سمجھتا ہے کہ رائے دہی کے عمل میں وسعت کی کوئی اہمیت نہیں' اصل اہمیت طریق کار کو حاصل ہے۔۔۔۔۔ ایتھنی' یا رومی' جاکوبی' یا امریکی' یا دور حاضر کے جرمن۔۔۔۔۔ رائے دہی کو ہی اپنائے ہوئے ہیں۔ انگریزوں کا دستور کیا کہتا ہے' اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں' اصل معاملہ تو یہ ہے کہ انگلستان کی تمام سیاست کا اہتمام چند خاندانوں کے چھوٹے سے گروہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے ایڈورڈ ہفتم بھی گویا اپنی وزارت کا ایک وزیر ہی ہے جہاں تک جدید صحافت کا تعلق ہے کوئی جذباتی ہی اس پر مطمئن ہو سکتا ہے' جبکہ دستور کی رو سے صحافت آزاد ہے۔ مگر ایک حقیقت پسند شخص ضرور یہ سوال کرے گا کہ اس پر کس کا اختیار ہے۔

بالآخر سیاست ہی ایک ایسا عمل ہے جس کے تحت اجتماعی عالمی تاریخ کے تناظر میں کسی قوم کی تاریخ کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کمال صرف یہ ہے کہ اپنی قوم کو خارجی عوامل کے مقابلے میں داخلی طور پر "موزوں" رکھا جائے۔ امور خارجہ اور امور داخلہ کی سیاست میں یہی امر فطری اور حقیقی ہے۔ صرف عوام' جاگیروں اور ریاستوں پر ہی قبضہ ضروری نہیں' بلکہ ہر نوع کی حیات پر خواہ آپ کو جانوروں کے ریوڑوں تک جانا پڑے یا نچلے درجے کے افراد کی انفرادی سطح تک پہنچ کر قابو پانا ہوگا اور ان دونوں کے درمیان اول الذکر ثانی الذکر کے لیے اپنا وجود قائم کرتا ہے' مگر اس کے برعکس نہیں ہوتا۔ صحیح جمہوریت پسند داخلی امور کو ہی اپنا مقصد سمجھتا ہے اور سفارت کاروں کے گروہ در گروہ صرف خارجی امور ہی پر غور کرتے ہیں مگر یہ نہیں سوچتے کہ محض ایک پہلو میں کامرانی سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوتا اور سارا عمل فضول جاتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک سیاسی رہنما' امور داخلہ میں اپنی عملی بصیرت کا کمال مظاہرہ کرتا ہے اور معاشی اور معاشرتی میدانوں میں اصلاحات کرتا ہے اور وہ اپنی ہوشیاری کی بنا پر عوامی مسائل کو مجموعی انداز میں حل کرتا ہے اور عوام کے حقوق اور آزادی کو زمانے کے ذوق کے مطابق مناسب سطح پر رکھتا ہے اور محسوسات کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرتا ہے جن کے بغیر کوئی قوم اپنا صحیح مقام حاصل نہیں کر سکتی۔ یعنی وہ اپنے رہنماؤں کے احترام و اعتماد پہ بھروسا نہیں کرتی' حالات کے مطابق قناعت نہیں کرتی (اور جب ضروری ہے) تو جوش و خروش کا مظاہرہ نہیں کرتی۔ مگران تمام عوامل کی قدر و قیمت کا انحصار' تاریخ کے ان بنیادی حقائق پر ہے' کہ دنیا میں کوئی بھی قوم تنہا نہیں ہوتی اور اس کے مستقبل کا فیصلہ اس کے ان تعلقات کی قوتوں پر قائم ہوتا ہے جو اس نے دوسری اقوام اور ممالک سے قائم کر رکھے ہیں اور اس کا انحصار محض داخلی حسن ترتیب پر نہیں ہوتا۔ چونکہ عام آدمی اس قدر پیش بین یا وسیع النظر نہیں ہوتا اس لیے یہ حکمران اقلیت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس وصف کی حامل ہو اور پوری قوم کی ترجمانی کرے۔ جب تک ایسی اقلیت موجود نہ ہو کسی مدبر کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اپنے تصورات کو حقیقت کا جامہ پہنائے۔

۳

تمام ثقافتوں کی ابتدائی سیاست میں حکمران طبقہ پہلے سے طے کر لیا جاتا ہے اور کوئی اس پر اعتراض نہیں کرتا۔ تمام وجود آبا و اجداد کے حوالے سے اور علامتی نوعیت کا ہوتا ہے۔ مادر ارض سے تعلقات اس قدر مضبوط ہوتے ہیں کہ جاگیر دارانہ تعلقات اور ریاست امرا جو اول الذکر کی جانشین ہوتی ہے اور یہ امر اس دور کی حیات میں اس قدر بدیہی ہوتا ہے کہ ہومر اور لاطینی دور کی سیاست صرف متعینہ ہیئت تک ہی محدود رہتی ہے۔ جب تک کہ یہ ہیئت قائم رہے کسی نوعیت کی تبدیلی کا خیال کسی کے ذہن میں نہیں آتا' خواہ بادشاہ وقت کا تختہ الٹ دیا جائے یا طبقہ شرفا کو غربت میں مبتلا کر دیا جائے۔ سیاست کی صرف یہی صورتیں ہوئی ہیں۔ طبقاتی سیاست' بادشاہت' پاپائیت یا مزارعان اور غلامان کی سیاست۔ خون اور نسل ایسے افعال کے ذریعے اپنا اظہار کرتے ہیں جو جبلی یا نیم شعوری طور پر انجام دیے جاتے ہیں۔ پجاری کا کردار بھی سیاست دانوں جیسا ہی ہوتا ہے یا جیسا کہ نسلی بنیادوں پر دیکھا جاتا ہے۔ ریاست کے مسائل کا ابتدائی دور

میں شعور نہیں ہوتا۔ اقتدار اعلیٰ کی ابتدائی نوعیت خدا کی عطا کردہ سمجھی جاتی تھی اور عوام کے لیے اس کی صورت مسلمہ ہوتی تھی' وہ اس پر بحث و اعتراض کرنے کے مجاز نہ تھے۔ نامیاتی اقلیتیں اپنی جنگ جاری رکھتیں ان اقلیتوں کو گروہوں کا نام دیا جاتا ہے۔

معاشرے کے کسی حصے (گروہ) کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ قومی منصوبے کو تبدیل کر سکے۔ اس کا کام صرف اسی قدر ہے کہ وہ اپنے لیے معاشرتی رتبہ' اختیارات' یا مقبوضات اسی مروجہ نظام کی حدود میں حاصل کریں ۔ اور ترقی پذیر دنیا میں اپنی نمو کا اہتمام کریں۔ ایسے گروہ بھی ہوتے ہیں جن میں گھروں' وقار' وفاداری اور تمام اساطیری ذرائع اتحاد' تعاون باہم کا سبب بنتے ہیں۔ یہ عوام اپنا حصہ ادا کرتے ہیں مگر ان کی وجہ سے تجریدی تصورات بالکل غائب رہتے ہیں۔ ایسے گروہ ہومر رومی عہد میں موجود تھے۔ طیلمیاقوس اور مدعیان غالب "اتھاکا" میں' اور جسٹانین کے دور میں نیلی پوش اور سبز پوش' لنکاسٹر اور یارک میں پروٹسٹنٹ ' ہیوگوناٹ اور بعد میں فرانڈے اور ٹارین اول کی متحرک قوتیں سب اپنے اپنے وقت میں نمایاں تھے۔ میکیاولی کی تمام کتاب اسی روح کی ترجمان ہے۔

جونہی کسی بڑے شہر میں غیر جاگیردارانہ بورژوا طبقہ' اول درجے کے کردار پر فائز ہو جاتا ہے تو تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے ۔ اب صورت حال اس کے برعکس ہے سیاسی نوعیت میں اختلاف پیدا ہو چکا ہے اور یہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اب اس کے بعد جو کچھ بھی وجود میں آئے گا اسے ہیئت عطا کرنی ہو گی۔ اس کے بعد اسے مناسب ہیئت میں تبدیل کرنا ہو گا۔ سیاست جاگ اٹھتی ہے ۔ اسے نہ صرف سمجھ لیا گیا ہے بلکہ قابل فہم تصورات میں منتقل کر لیا گیا ہے۔ زر اور ذہانت کی قوت خون اور روایت کے خلاف کھڑے ہو جاتی ہیں۔ نامیاتی وجود کی جگہ ہمارے ہاتھ میں منظم وجود آ چکا ہے۔ اب ہمارا واسطہ جاگیر سے نہیں بلکہ جماعت سے ہے۔ سیاسی جماعت نسل کی ترقی یافتہ صورت نہیں بلکہ وہ سروں کا مجموعہ ہے اور اس لیے وہ قدیم ریاستوں کے مقابلے میں ذہانت میں برتر مگر جبلت میں کم تر ہوتے ہیں۔ یہ جماعت فطری طور پر جماعتی طبقہ بندی کی قاتلانہ مخالف ہے۔ اس کا محض وجود ہی اس کی روح کے متناقض ہے۔ نتیجتاً" سیاسی جماعت کا تصور ہی غیر مشروط' منافی اور تباہ کن ہوتا ہے اور معاشرتی لحاظ سے مساوات کو ختم کر دیتا ہے۔ اس میں صرف پیشے دلچسپی کی بنیاد بنتے ہیں ۔ یہ خالص شہری تناظر ہے۔ شہر کے وجود میں آ جانے کے بعد دیہات میں ہر جگہ (خواہ ہمیں اس کا علم ہو یا نہ ہو) جاگیردارانہ سیاست' جماعتی سیاست سے مغلوب ہو جاتی ہے----- مصر میں وسطانی حکومت کے خاتمے پر' چین میں دعویدار ریاستوں کے ساتھ اور بغداد اور بار نطینم میں عباسی دور کے خاتمے پر ایسی صورت حال پیدا ہو گئی۔ مغرب کے دارالحکومتوں میں پارلیمانی اسلوب میں جماعتوں کا کردار نمایاں ہے۔ یونانی کلاسیکی شہری ریاستوں میں ایسی جماعتیں تھیں جو صرف بحث و مناظرے تک محدود تھیں۔ مگر ہم جن جماعتوں کو منظور کرتے ہیں' ان کی نوعیت مجوسی ہے' جن میں موالی' راہبان اور اجتماعات طلبا کے رہنما موجود ہیں ۔

مگر یہ صورت ہمیشہ غیر جاگیرداری ہوتی ہے۔ جاگیردارانہ مزاج کے خلاف جو احتجاج کیا جاتا ہے' اس کی رہنما اقلیت----- تعلیم یافتہ اور مالی لحاظ سے مستحکم ہوتی ہے----- وہ کسی جماعت میں ایک منصوبے کے ساتھ شامل ہوتی ہے' جس کو صرف محسوس نہیں کیا جاتا' بلکہ ان کا اچھی طرح سے تعین بھی کر لیا جاتا ہے

دیہات اور قصبات میں زمین پر قبضہ باعث اعزاز ہوتا ہے مگر شہروں میں دولت خاندانی اعزاز پر غالب آ جاتی ہے اور اس شے سے انکار جس کا حصول ناممکن ہو' لہٰذا اس کی تہ میں صرف ایک ہی جماعت ہے وہ صرف بورژوا کی جماعت ہے جو آزاد خیال ہے اور اپنی حیثیت سے بخوبی آگاہ ہے۔ یہ اپنے آپ کو عوام کے ساتھ ہم آہنگ سمجھتی ہے (اور سب سے بڑھ کر حقیقی جاگیر----- جس میں غیر منقولہ جائیداد اور افراد دونوں شامل ہوں۔) اس کے مخالفین عوام اور قوم کے دشمن ہیں۔ اس حقیقت کو تمام دستیاب مواقعات اور سیاسی جماعتوں کی احتیاط اور نگہداشت اور جلسوں میں فصاحت و بلاغت سے کی جاتی ہے۔ مغرب میں صحافت اس کا پرچار کرتی ہے یہاں تک کہ یہ آرا فی الحقیقت درست نمائندہ آرا سمجھی جانے لگیں۔

سب سے بڑی جاگیریں' طبقہ شرفا اور طبقہ رہنمایان مذہب ہے اور سب سے بڑی سیاسی جماعت زر اور ذہانت ہے۔ اس کا تعلق شہروں سے ہوتا ہے اور یہ آزاد خیال بھی ہوتی ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر تمام ثقافتوں میں طبقہ شرفا اور جمہوریت کا جواز پیدا ہوتا ہے۔ طبقہ شرفا شہری مزاج کو ناپسند ہوتا ہے جبکہ جمہوریت دیہاتی طبقے کو اجڈ اور احمق سمجھ کر ناقابل نفرت قرار دیتی ہے۔ جاگیردارانہ سیاست اور جماعتی سیاست میں یہی فرق ہے ۔ طبقاتی شعور اور جماعتی جھکاؤ' نسل اور ذہانت' نمو اور تعمیر' یہ اوصاف ہی فرق کو نمایاں کرتے ہیں۔ ایک تکمیل شدہ ثقافت میں طبقہ شرفا' اور شہری تہذیب کی ابتدائی حالت میں جمہوریت اس وقت تک ایک دوسرے کے خلاف کھڑے رہتے ہیں جب تک کہ قیصریت میں دونوں مدغم نہ ہو جائیں۔ اتنے ہی یقین کے ساتھ جیسا کہ طبقہ شرفا' جاگیرداری ہی کی ایک صورت ہے (اور طبقاتی درجہ بندی کبھی بھی اپنے آپ کو جائز ثابت نہیں کر سکتی)۔ اس لیے طبقہ شرفا اپنے آپ کو کسی جماعت میں منظم کرنے سے یقینی طور پر قاصر رہتے ہیں۔ اگر وہ ایسی تنظیم قائم بھی کر لے' پھر بھی اسے اس میں ناکامی ہی رہے گی۔

مگر اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور راستہ بھی نہیں۔ اسے مجبوراً" ایسا کرنا ہی پڑے گا تمام جدید دساتیر جاگیرداری سے اجتناب کرتے ہیں اور سیاسی جماعتوں پر مبنی نظام ہی کو بدیہی سیاسی ہیئت سمجھتے ہیں۔ انیسویں صدی----- جو تیسری صدی قبل مسیح کے متوازی ہے' جماعتی سیاست کی معراج ہے۔ اس کا جمہوری کردار اسے مجبور کرتا ہے کہ ایک دوسرے کے مخالف جماعتیں تشکیل کرے اور گزشتہ زمانے میں بلکہ اٹھارھویں صدی تک ہمیں قدامت پسند اندفاعی جماعت کا وجود ملتا ہے۔ اسے آزاد خیال طبقات سے نقل کیا گیا ہے ۔ اور اس لیے اپنی ہیئت میں بھی اس سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ یہ بورژوا نہ ہونے کے باوجود بھی بورژوائی ہے اور وہ اسے قواعد و طریقہ ہائے کار سے مخالفت کرنے پر مجبور ہے جو آزاد خیال جماعتوں

نے مرتب کیے ہیں۔ یہ اپنے مخالفین کے مقابلے میں اپنے معاملات طے کرنے میں زیادہ آزاد ہے ۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں یہ فناہ ہو جائے گی۔ ایک جاگیر کی ایک آزادانہ تشکیل بھی ہوتی ہے' جو حالات کو سمجھنے سے قاصر رہتی ہے اور دشمنوں کی مبارزت کی بجائے اپنی ہیئت سے جنگ آزما ہو جاتی ہے اور ایسے انتہائی اقدامات عمل میں لاتی ہے جن کا مظاہرہ ہر ابتدائی تہذیب میں ریاستوں کی داخلی سیاست میں ہوتا رہتا ہے اور اس طرح وہ بلا چون و چرا اپنے آپ کو مخالفین کے حوالے کر دیتی ہے ۔ ہر جماعت کو جو مجبوری حائل ہے' وہ بورژوائیت کو قبول کرنے کی ہے۔ کم از کم ظاہری طور پر ہی سہی' مگر اس سے جو ہیئت وجود میں آتی ہے وہ بے حد مضحکہ خیز ہوتی ہے اور جو آبادی ان جماعتوں میں نہیں کھپ سکتی ہے وہ اپنی علیحدہ جماعت بنا لیتی ہے' مثال کے طور پر مارکسیت نظریاتی طور پر بورژوائیت کی نفی ہے' مگر بطور جماعت یہ درمیانے طبقے کا ایک رویہ اور رہنمائی ہے۔ اس کے عزم میں ایک مسلسل تضاد موجود ہے جو لازمی طور پر جماعتی سیاست کے دائرہ کار کے باہر کام کرتا ہے اور اس لحاظ سے وہ بھی ایک دستوریت ہی ہے (یہ دونوں بطور خاص آزادانہ تناظر سے متعلق ہیں) اور دیانت دارانہ رائے کے مطابق انھیں خانہ جنگی کا نام ہی دیا جا سکتا ہے۔ یہ جس عملی مظاہرے کے لیے یہ مجبور ہے' وہ اپنی ذات سے انصاف ہے تاکہ تسلسل قائم رہے۔ مگر مارکسیت کے لیے اس نوعیت کا مظاہرہ ناگزیر ہے۔ اگر طویل المدت کامیابی کا حصول مقصود ہے تو اس پر قائم رہنا ہو گا۔ ایسی پارلیمنٹ میں شرفا کا طبقہ داخلی طور پر پرولتاری طبقے کی طرح ہی جعلی ہے صرف بورژوازی اپنے فطری مقام پر قائم ہے۔

روم میں ۴۷۱ ق م میں معدلات کو روشناس کرانے کے بعد' اور ۲۸۷ ق م کے انقلاب میں قانون سازی کے تمام اختیارات کے بعد' خاندانی امرا اور عوام میں بطور جاگیر اور طبقات کے جنگ آزمائی ہوئی۔ مگر بعد ازاں ان کی مخالف جماعت کے پاس ماسوائے شجرہ ہائے نسب کی اہمیت کے کچھ بھی باقی نہ رہا۔ اس لیے ان کی جگہ ایسی سیاسی جماعتیں وجود میں آ گئیں جنھیں آزاد خیال اور قدامت پسند کہا جانے لگا اور یہی ایک معقول صورت باقی رہ گئی تھی---- عوام الناس جو مرکز مباحثہ غالب اکثریت کے حامل ہیں اور طبقہ شرفا جسے ایوان بالا میں لاحقہ کی حیثیت حاصل ہو گئی (تقریباً" ۲۸۷ ق م میں) ثانی الذکر نے قدیم قبائل کی خاندانی کونسل سے اپنے آپ کو ریاستی کونسل میں طبقہ شرفا کا نمائندہ بنا لیا اور اکثریت نے اپنا اتحاد صاحبان جائیداد اور متوسط طبقے سے قائم کر لیا اور طبقہ شرفا نے چھوٹے زمینداروں کو اتحادی بنا لیا کیونکہ یہ لوگ معدلت گاہوں میں اپنا اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ ذرا گریکی اور ماری اوس کی طرف نگاہ ڈالیں تھوڑے سے غور و فکر کے بعد کونسلوں اور معدلت گاہوں کی حیثیت کا پتہ چل جائے گا۔ اب وہ درجہ اول یا درجہ سوم کی جاگیروں کے متولی نہیں رہے۔ تاکہ ان کے کردار کے مطابق مذکورہ حقائق کا تعین کیا جا سکے۔ اب وہ بعض سیاسی جماعتوں کے نمائندہ ہیں اور مناسب مواقعات پر پارٹیاں بدلتے بھی رہتے ہیں۔ بعض آزاد خیال نمائندگان بھی تھے' مثلاً ایلڈر کاٹو اور قدامت پسند ارباب عدل بھی تھے' مثلاً اوکتاوی اس' جو ٹائی گر یکوس کی مخالفت کرتے رہے۔ دونوں فریقوں نے انتخابات میں اپنے اپنے نمائندگان کھڑے کیے اور ہر طرح کے جذبات انگیز حیلے کیے تاکہ وہ پارلیمنٹ میں داخل ہونے میں کامیاب ہو جائیں۔ وہ دولت جو انتخابات جیتنے میں

کامیاب نہ ہو سکی اس نے بعد میں (پہلے سے بھی زیادہ) زیادہ کام دیا اور منتخب شدہ ارکان ہی کو خرید لیا گیا۔

انگلستان میں ٹوری اور وِگ جماعتیں انیسویں صدی کے آغاز ہی میں قائم ہو گئی تھیں۔ دونوں کی صورت بورژوائی تھی اور دونوں ہی آزادانہ منصوبہ بندی پر عمل کر رہی تھیں۔ ان کے منصوبوں کو عوام کی تائید اور قبولیت حاصل تھی ۔ یہ ایک ماہرانہ چال تھی جسے بالکل درست موقعے پر ، فعال کیا گیا اور ایسی کسی جماعت کی تشکیل کو روک دیا گیا' جو جاگیردارانہ اصولوں کی مخالفت کرتی' جیسا کہ فرانس میں ۱۷۸۹ء میں ایک جماعت وجود میں آ گئی تھی۔ ایوان زیریں کے اراکین ابھی تک تو حکمران طبقہ کے ممبر تھے ' اب عوام کے مقبول نمائندگان کی صورت اختیار کر گئے۔ مگر اب بھی وہ اپنے مالی معاملات اسی طبقے کے دست نگر ہی رہے' رہنمائی انھیں ہاتھوں میں رہی' اور جماعتوں کا باہمی اختلاف جو ۱۸۳۰ء سے آزاد خیال اور قدامت پسند کے خطابات اختیار کر چکے تھے' وہ ہمیشہ اپنے طریق کار' ان کی صورت مثبت اور منفی کی تھی' یہ کبھی بھی صاف صاف ایک دوسرے کا بدل نہیں بن سکے۔ ان سالوں میں ہی' نوزائیدہ جرمنی کی ادبی آزادی کی تحریک سیاسی جماعت کی تحریک میں تبدیل ہو گئی اور امریکہ میں اینڈریو جیکسن کی رہنمائی میں قومی وِگ' اور جمہوری جماعتوں نے اپنے آپ کو منظم کر لیا اور اس امر کی کھلے عام منظوری دے دی گئی اور یہ تسلیم کر لیا گیا کہ انتخابات ایک قسم کی تجارت ہے اور ملک کے تمام عہدے اوپر سے نیچے تک فاتح جماعت کا مال غنیمت ہیں۔

مگر حکمران اقلیت' جاگیر کی حالت سے جماعت میں اور پھر انفرادی اطاعت میں بتدریج اپنی تشکیل کرتی ہے۔ جمہوریت کا ظاہری خاتمہ اور قیصریت کی منزل تک کا عبوری دور' مثال کے طور پر متوازی نشستوں کی جماعت کا خاتمہ جو آزاد خیال کہلانے لگے' مگر ان کی اصل ہیئت کا نشان باقی نہ رہا۔ جذبات' مقبول عام مقصد' تجریدی تصورات' جو تمام حقیقی جماعتی سیاست کو متعین کرتے ہیں' تحلیل ہو کر نجی سیاست میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ چند اعلیٰ نسلوں کے لوگ ایسے عزم لی القوت کا مظاہرہ کرتے ہیں' جس پر کوئی تحدید نہیں ہوتی' ہر جاگیر کی اپنی جبلت ہوتی ہے۔ مگر ہر جماعت کا اپنا منصوبہ ہوتا ہے۔ مگر عوام کو دونوں صورتوں میں آقا مل جاتا ہے۔ جدی اور عوامی' سیاست کی دونوں صورتوں میں واقعات کا یہی طریق ہوتا ہے۔ آپٹومیٹ اور پالولارز سے لے کر پومپئی اور قیصریت تک یہی مزاج قائم رہا۔ حقیقی جماعتی حکومت کبھی بھی دو صدیوں سے زیادہ نہیں چلتی اور ہمارے معاملے میں تو جنگ عظیم (اول) کے بعد یقینی طور پر زوال پذیر ہے کہ رائے دہندگان کی تمام آبادی کا مزاج یکساں ہو چکا ہے۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ ایسے افراد حکومت میں بھیجے جائیں جو حالات پر قابو پا سکیں---- یہ تصور تمام دساتیر میں موجود ہے اور سادہ لوحی پر مبنی ہے---- یہ صرف پہلی سریع مفروضے کی بنا پر ممکن ہو سکتا ہے کہ کسی بھی سیاسی گروہ میں انتظامی صلاحیت کے بنیادی عناصر بھی موجود نہیں۔ چنانچہ ۱۷۸۹ء میں فرانس میں اور دوبارہ ۱۸۴۸ء میں ایسا ہی ہوا۔ ایک اسمبلی کا وجود لازمی ہے اور اس میں حکمت عملی طے کرنے والے ادارے جلد وجود میں آ جائیں گے' جن کا اتحاد خیال ان کی حاصل کردہ کامرانیوں کے استقرار پر مبنی ہو گا۔ مگر وہ اپنے مختلف شامل گروہوں کی نمائندگی سے قطعاً" لا

تعلق رہیں گے، جس کے نتیجے میں یہ لوگ احتجاج کے لیے تیار ہو جائیں گے، تاکہ وہ اپنے مقاصد اور مفادات کے حصول کے لیے اثر انداز ہو سکیں۔ یہ ایک ایسا رجحان ہے جو عوام میں پیدا ہو چکا ہے اور نتیجتاً" ہر تنظیم اسے ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی ہے اور یہ اسی صورت میں اس وقت جاری رہتی ہے جب تک کہ رہنما بھی اسے بطور ہتھیار استعمال کرنا نہ شروع کر دے۔ عزم لی القوت تمام نظریات سے مضبوط تر ہے۔ آغاز میں تو رہنما مع ساز و سامان کسی منصوبے کی تکمیل کے لیے ظاہر ہوتے ہیں، پھر انھیں ان کے عہدہ دار اختیارات اور مالی منفعت کے لیے اند وفائی کیفیت میں پابند کر لیتے ہیں------ زمانہ حال میں ہر جگہ یہی حال ہے کیونکہ ہزارہا لوگ اپنا معاش سیاسی جماعت اور اس کے ذریعے حاصل کردہ عہدوں اور فعالیتوں سے حاصل کرتے ہیں۔ جو انھیں تفویض کیے جاتے ہیں۔ بالآخر منصوبے دماغ سے نکل جاتے ہیں اور تنظیم محض اپنے لیے کام کرنے لگتی ہے۔

بزر کرسکی پیئو یا کوا کسٹی اس ۔ خلافتی نس کا مہم جوئی کے لیے اتحاد ابھی تک مضمرات سے باہر نہیں آیا اور ہم اس پر تبصرہ کر رہے ہیں اور ان کے دوستوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ مگر سکی پیئو خورد اس سے بھی آگے نکل گیا اور اس کے قبیلے کے لوگ بلا شک و شبہ سیاسی پیروکاروں کی پہلی مثال تھے، جن کی فعالیت قانونی عدالتوں اور انتخابات پر حاوی تھی ۔ بالکل اسی انداز میں جدی اور مقدس نسلی رشتے بھی آقا اور متبعین کی صورت اختیار کر گئے اور ان کی بنیاد محض مالی منفعت رہ گئی۔ قیصر سے قبل بھی بعض دستاویزات کا ثبوت ملتا ہے جو منتخب نمائندگان اور رائے دہندگان میں مالی ادائیگیوں اور روانگئی فرائض سے متعلق طے کر لیے جاتے تھے، جیسا کہ دور حاضر کے امریکہ میں ۔ کلب اور انتخابی مجالس تشکیل دی جاتی ہیں جو رائے دہندگان کو ڈراتی دھمکاتی ہیں، جس کے نتیجے میں ان مجالس کے اراکین اس قابل ہو جاتے ہیں کہ وہ رہنماؤں کے ساتھ سودا بازی کر سکیں، جیسا کہ قیصر سے قبل بھی ہوتا تھا، کہ اس فریق کی مدد کی جاتی جس سے سودا طے ہو جاتا۔ بات چیت دونوں سے ہوتی اس کا صحیح مطلب ہی یہی ہے اور یہ موضوع لازمی بھی ہے اور تارکین دنیا کے تصور پرستوں کی نوحہ خوانی جو اس تباہی کے حوالے سے کی جاتی ہے اور اس کے باوجود دامن امید سے وابستگی یا تو ان کی بے بصر جہالت کو ظاہر کرتی ہے، یا صداقت اور واقعات کی ثنویت یا ذہانت اور زر کے باہمی تعلقات کو ظاہر کرتی ہے۔

جماعتی انتخابات میں سیاسی معاشرتی نظریات کی صرف ایک ہی بنیاد ہے مگر یہ انتہائی لازمی ہے۔ وہ قابل فخر سلسلہ جو روسو سے مارکس تک چلتا ہے، اس کے خلاف کلاسیکی دور میں بھی مخالفانہ آرا موجود تھیں جن میں افلاطون اور زینو کا نام سرفہرست ہے۔ چین کے معاملے میں اسی نوعیت کے اصول کنفیوشش اور تاؤ کے ادب سے ابھی تلاش کرنے باقی ہیں۔ اشتمالی موہ تائی کا نام ہی کافی ہے۔ باز نطینی اور عباسی دور کے عربی ادب میں، جس میں کہ ہر معاملے میں انتہا پسندی دستور کی قدامت پسندانہ مذہبیت کی پیداوار ہے۔ انھیں انتہائی اہم مقام حاصل ہے اور نویں صدی میں تمام بحرانی معاملات میں بھی یہی تصورات غالب قوت تھے۔ ایسے تصورات مصر اور ہندوستان میں بھی موجود تھے۔ یہ ہائی کوسس اور گوتم بدھ کے زمانے کے واقعات سے

عیاں ہے۔ ایسے خیالات کی تشہیر میں ادبی اسلوب کی کوئی اہمیت نہیں ان کی زبانی کلامی بھی اشاعت کی جا سکتی ہے۔ ایسے قبائل اور مجالس میں جو سماعت کے لیے مستعد ہوں وعظ و تبلیغ ہی کافی ہے۔ فی الحقیقت سخت گیر تحریکات کا معیاری اور مقبول عام طریق کار یہی ہے (اسلام اور اینگلو امریکن عیسائیت ان میں شامل ہیں۔)

کیا یہ عقائد درست ہیں یا غلط------ ہمیں بار بار کہنا چاہیے یا اس پر زور دینا چاہیے---- یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا سیاسی تاریخ سے قطعاً" کوئی تعلق نہیں۔ مارکسیت کا انکار صرف علمی مباحث کا حصہ ہے اور اس پر عوامی مناظرے بھی ہو سکتے ہیں۔ ان میں ہر شخص اپنے آپ کو درست اور مخالف کو غلط سمجھتا ہے۔ مگر کیا یہ تحریکات موثر ہیں؟------ ان کا اجرا کس کی طرف سے ہوا اور کب تک جاری رہا؟ وہ عقیدہ جو کسی نظام سے بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ یہی درست طریق کار ہے جو سیاست دانوں کو بطور حقیقی قوت تسلیم کرنا چاہیے۔ دور حاضر میں ہم اپنے آپ کو عقل و استدلال کی وسیع قوت کا غلام تسلیم کرتے ہیں، اور بے پناہ اعتماد کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ آزادی انصاف، انسانیت، ترقی جیسے بڑے بڑے عمومی نظریات، اپنے کلیدی الفاظ کی روشنی میں بہت مقدس مفروضات ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ تاثر بڑی بڑی آبادیوں والے بڑے شہروں اور دور روشن خیالی کی پیداوار ہیں، جو کہ تعلیم یافتہ افراد کے مذہب کی حیثیت رکھتی ہے۔ جہاں تک کسانوں کا تعلق ہے ان پر اس کا کوئی اثر نہیں اور شہروں کی عام آبادی پر بھی اس کے اثرات صرف ایک خاص وقت تک ہی رہتے ہیں مگر اس دوران ان میں ناقابل مزاحمت تاثیر کے جدید انکشافات پائے جاتے ہیں۔ وہ خود کو اسی کے مزاج میں تبدیل کر لیتے ہیں اور الفاظ میں جوش اور ولولہ پیدا کر دیتے ہیں اور اس کے مبلغین پابندی کی صورت میں شہادت تک قبول کر لیتے ہیں۔ میدان جنگ میں اتر جاتے ہیں اور پھانسی قبول کر لیتے ہیں۔ ان کی نگاہ دوسری دنیا کی سیاست اور معاشرت پر ہوتی ہے اور ان کی نگاہ میں خشک اور متحمل تنقید، سفلی، ناپاک اور قابل تلفی سمجھی جاتی ہے۔

اور صرف اسی وجہ سے کہ معاشرہ مخالف دستاویزات اور اشتمالی منشور طاقت ور ہاتھوں میں اتنی قوت رکھتے ہیں کہ وہ اپنی سیاسی جماعتوں کی زندگی کی بالائی سطح پر فائز ہو چکے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ مغلوب بنی نوع انسان کے اعتقادات کو کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے اور ان پر حکومت کیسے کی جا سکتی ہے ۔

وہ قوت جو ان تجریدی تصورات میں پائی جاتی ہے، جس کا اظہار سیاسی جماعتوں کے ذریعے ہوتا ہے کبھی بھی دو صدیوں سے زیادہ نہیں چلتی اور ان کا خاتمہ تردید و تغلیط کی وجہ سے نہیں ہوتا، بلکہ لوگ ان سے تنگ آ جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے لوگ روسو کو نظر انداز کر چکے ہیں اور اب مارکس کو بھول جائیں گے۔ بالآخر لوگ دست کش ہو جاتے ہیں۔ یہ امر کسی ایک نظریے سے متعلق نہیں ہوتا بلکہ اس امر پر مبنی ہوتا ہے کہ لوگوں کا متعلقہ نظریے پر اعتقاد باقی نہیں رہتا اور اس کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ حقائق جو اٹھارھویں صدی میں اس قدر مقبول ہوئے تھے، دور حاضر میں ان کے نفاذ کے لیے ان میں اصلاح کی جائے۔ جب

افلاطون' ارسطو اور ان کے ہمعصر فلسفیوں نے مختلف الانوع کلاسیکی دساتیر مدون کیے' تاکہ خوب صورت ترین اور انتہائی معقول نتائج برآمد ہو سکیں' تمام دنیا نے ان کی طرف توجہ دی اور افلاطون نے فی نفسہ اسی کوشش کی' کہ سیراکیوز پر اپنے تصوراتی نسخے کو آزما لیا جائے اور اس شہر کو تباہی کی طرف دھکیل دیا مجھے یہ یقینی معلوم ہوتا ہے کہ اسی قسم کا کوئی تجربہ جنوبی چین میں بھی کیا گیا ہو گا' جس کی بنا پر یہ ریاستیں مفلوک الحال ہو گئیں اور تسین کی شہنشاہیت کی قلمرو میں شامل ہو گئیں ۔ آزادی کے جاکوبی متوالوں اور مساوات کے طلب گاروں نے فرانس کو فوج اور بورژوا کے ہاتھوں میں ہمیشہ کے لیے دے دیا اور ہر نئی اشتمالی تحریک سرمایہ داری کے نئے شعلوں کو بلند کرتی ہے۔ مگر جب سسرو نے پومپئی کے لیے اپنا Re Publica De تحریر کیا اور سیلوٹ نے سیزر کے لیے Two Comminations لکھا' کسی نے بھی ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ طیری اس میں گر یکوس پر بلوسی اوس رواقی پرجوش مبلغ اثرات محسوس ہوتے ہیں' اس نے جب پارا گوم کے ارس ٹونی کوس کو اقتدار میں لا کر مذکورہ شہر کو برباد کر دیا تو خود خودکشی کر لی ۔ مگر پہلی صدی قبل مسیح میں' یہ نظریات صرف مدارس میں مشق کا وسیلہ رہ گئے تھے اور اس کے بعد کے زمانے میں تو صرف اقتدار ہی اہمیت کا حامل رہ گیا۔

ہمارے لیے بھی----- اس کے متعلق کوئی غلطی کا احتمال نہیں رہنا چاہیے----- نظریات کا دور قریب الاختتام ہے۔ آزاد خیالی اور اشتمالیت کے بڑے بڑے نظام ۱۷۵۰ء اور ۱۸۵۰ء کے درمیان وجود میں آئے۔ مارکس کا دور تو تقریباً" نصف صدی پرانا ہو چکا ہے (یعنی اس کتاب کی تحریر کے وقت) اور اس کے بعد کوئی اور اس کا جانشین پیدا نہیں ہوا۔ داخلی طور پر اس کا مقصد ہے: تاریخ کا مادی نقطہ نظر' یہ قومی شعور کا یہ انداز اب اپنے منطقی اختتام سے دو چار ہے۔ یہ اب اس کا آخری دور ہے۔ مگر جیسا کہ روسو کے انسانی حقوق کے نظریے نے (تقریباً") ۱۸۴۸ء سے اپنی قوت زائل کر دی۔ اسی طرح اشتمالیت کی قوت میں بھی جنگ عظیم (اول) کے بعد سے کمی آنے لگی۔ جب انقلاب فرانس کے حوالے سے دیکھا جائے کہ روسو میں لوگوں کا اعتقاد کس طرح اپنے انجام کو پہنچا اور اس کا ۱۹۱۸ء کے انقلاب سے موازنہ کیا جائے جو اپنے اور اپنے لیے معتقدین کے سامنے ایسے عقیدے کا اظہار کرتے تھے' جس پر انھیں خود بھی ایمان نہ تھا----- نہ صرف تصور کے لیے' بلکہ اس قوت و اقتدار کے لیے جو انھیں محض اس عقیدے کی بنیاد پر حاصل تھی----- تو اس کے نتیجے میں آئندہ آنے والی شاہراہ کے موڑوں کا اندازہ کر لیتا ہے جو کچھ بھی اس منصوبے میں باقی رہ گیا ہے وہ بھی جلد ہی تباہی سے دوچار ہونے والا ہے' جسے اب تک حصول اقتدار میں محض ایک رکاوٹ سمجھا جا رہا تھا۔ منصوبے پر اعتقاد ہمارے آبا و اجداد کی کامرانیوں کی کلید تھی۔ مگر ہمارے پوتوں کی نظر میں یہ صوبائی عصبیت کا ایک ثبوت ہو گا۔ اس کی جگہ پر ایک نئی فیصلہ کن تقدیس کے بیج اگ رہے ہیں' جو ستم رسیدہ ضمیر اور روحانی اشتہا سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کا فرض منصبی یہ ہو گا کہ وہ آہنی تصورات کی بجائے ایسے راز افشا کرے جن کی بنا پر ثانوی مذہبیت وجود میں آ سکے۔

۴

جمہوریت کا یہ صرف ایک پہلو ہے' زبانی پہلو۔ اب ہمیں دوسرے پہلو پر بھی غور کرنا ہو گا۔ یہ نسل کا فیصلہ کن پہلو ہے۔ جمہوریت صرف ذہنوں میں یا صفحات کاغذ پر ہی رہ جاتی اگر اس کے حامیوں میں ایسے ماہرین فطرت کا وجود نہ ہوتا ممکن ہے کہ وہ غیر شعوری طور پر اس کی حمایت کرتے ہوں' اور اکثر وہ حقیقتاً" ایسا کرتے ہیں----- جن کی نزدیک عوام الناس کی حیثیت مقصد کی ہے اور تصورات اس کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اس کے تمام پہلو جن میں زعمائے عظیم کی فصاحت و بلاغت کے انداز بھی شامل ہیں' غیر ذمہ داری کا ارتکاب کرتے ہیں۔ داخلی لحاظ سے وہ قدیم حکومتوں کی حکمت عملی سے قطعاً" مختلف نہیں' لیکن اسے صرف عوام الناس پر ہی نافذ کیا جاتا ہے۔ شہزادگان اور سفرا کو مستثنیٰ کر دیا جاتا ہے۔ تند و تیز آرا اور جذبات اور عزمی نعروں کو مزاج منتخب کی جگہ اور سرود خلوت کی جگہ پیتل کے ساز استعمال کیے جاتے ہیں----- یہ تمام منصوبہ بندی دیانت دار مگر عملی جمہوریت پسندوں کی تیار کردہ ہے اور روایتی جماعتوں نے یہ فن انھیں سے سیکھا ہے۔

بہرحال یہ انداز عمل جمہوریت کے ساتھ مخصوص ہیں' مقبول عام دساتیر کے مصنفین کو اپنے منصوبوں پر حقیقی عمل کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔ ان میں روسی دستور کے مصنف سروٹین اور فرانس کی قومی اسمبلی بھی شامل ہیں۔ چونکہ ان کی یہ ہیئت جاگیردارانہ نظام سے مختلف ہے۔ یہ نشوونما کی علامت ہے مگر صرف فکری حد تک (نیز اس کی بنیاد انسان اور اشیا کے متعلق گہرے غور و فکر پر نہیں بلکہ حقوق و انصاف کے تجریدی تصور پر ہے)۔ قانون کے ذہنی پہلو میں اور ان عملی عادات میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے جو کسی دباؤ کے تحت خاموشی سے ان میں پیدا ہو جاتی ہیں' یا وہ اپنی قوت ارادی کے زور پر انھیں حقیقی زندگی سے خارج کر دیتے ہیں' یا قبول کر لیتا ہے۔ سبق صرف تجربے سے حاصل ہوتا ہے اور تمام متعلقہ عمل کے اختتام پر یہ امور سمجھ میں آتے ہیں کہ عوام کے حقوق اور عوام کے اثرات الگ الگ شے ہیں' جس قدر بھی رائے دہی کا عمل وسیع ہو گا' رائے عامہ کی قوت اسی قدر کم ہو جائے گی۔

جمہوریت کے آغاز میں میدان صرف اہل دانش کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ تاریخ کے پاس اس سے زیادہ شریفانہ اور خالص کوئی اور شے نہیں کہ انھیں ۴ اگست ۱۷۸۹ء کا اجلاس اور ٹینس کے میدان میں ہونے والے حلف یا فرینکفرٹ پالز کرچ کا ۱۸۴۸ء کا اجتماع دکھا سکے۔ جب کہ عوام نے اپنی پوری قوت اپنے ہاتھوں میں لے کر اس وقت تک عمومی حقائق پر بحث کرتے رہے جب تک کہ حقیقی قوتیں خواب دیکھنے والوں پر غالب نہ آ گئیں۔ مگر اسی دوران جمہوریت کی دوسری قوت نے بھی کوئی وقت ضائع کیے بغیر اپنا مظاہرہ کیا اور لوگوں کو یہ حقیقت یاد دلائی کہ انسان صرف اسی صورت میں دستوری حقوق حاصل کر سکتا ہے' جب کہ اس کے پاس دولت ہو ۔ رائے عامہ کے تصورات کو کسی حد تک زیر عمل آنا چاہیے۔ کیونکہ تصور پرست یہ فرض کر لیتے ہیں کہ رائے دہندگان کو ایسی کوئی منظم رہنمائی حاصل نہیں۔ (جس میں کہ اسے دلچسپی ہے) اس لیے وہ رائے دہندگان کو صرف اسی حد تک متاثر کر سکتا ہے جس حد تک کہ اس کے مالی ذرائع اجازت دیں۔ جونہی کہ ایسی رہنمائی وجود میں آ جائے گی تو ووٹ کی اہمیت کم ہو جائے گی اور اسے

معاشرتی اقتدار کا احتساب نہیں کیا جا سکے گا۔ کیونکہ ایسی صورت میں انھیں سیاسی جماعتوں کے اس پر اثرات کا خاتمہ ہو جائے گا اور مغربی دساتیر میں شامل ہر شہری کا یہ بنیادی حق کہ وہ اپنا نمائندہ اپنی خواہش کے مطابق منتخب کر سکتا ہے' صرف نظریہ کی حد تک ہی رہ جاتا ہے' کیونکہ عملی طور پر ہر ترقی یافتہ تنظیم اپنے نمائندگان کا خود انتخاب کرتی ہے۔ بالآخر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ عمومی رائے دہی میں موثر حقوق کا قطعاً" کوئی وجود نہیں۔ اتنا بھی نہیں کہ آپ کسی جماعت ہی کا انتخاب کر سکیں۔ کیونکہ وہ صاحب اقتدار لوگ جو متعلقہ علاقے میں وجود میں آ چکے ہیں' ان کے ہاتھ میں دولت بھی ہے' تحریر و تقریر کے تمام ذرائع ان کے قبضے میں ہیں اور ایک طرف تو وہ اس قابل ہیں کہ رائے عامہ کو حسب منشا قابو میں رکھ سکیں' اور افراد کو ان کی جماعتوں سے بالا بالا اپنی مرضی کے مطابق چلا سکتے ہیں' اور دوسری طرف اپنی سرپرستی میں قانون ساز اداروں کو بھی متاثر کر سکتے ہیں اور مقننہ کے اندر بھی وہ ایک ایسا گروہ منظم کر لیتے ہیں جو ان میں رائے دہی کے متعلق بے حس بنا دیتا ہے' اور اس سے ایسی نفسیاتی کیفیت وجود میں آتی ہے کہ سخت بحرانی حالت میں بھی اراکین ان کے اثر و رسوخ سے باہر نہیں نکل سکتے۔

بظاہر مغربی پارلیمانی جمہوریت* میں اور مصری' چینی اور عرب تہذیبوں کی جمہوریت میں بہت زیادہ فرق ہے' ان میں بالغ رائے دہی کا نظام بالکل اجنبی ہے۔ مگر حقیقت میں ہمارے لیے اس دور میں عوام اس نظام کے لیے موزوں ہیں' کیونکہ رائے دہندگان کی وہی صورت ہے' جبکہ وہ اجتماعی محکومیت کے لیے ماضی میں انتہائی موزوں تھے' یعنی وہ رعایا کے تمام اوصاف سے متصف تھے۔ جیسا کہ وہ بغداد میں تھے یا بارنلین میں وہ راہبوں کے فرمان بردار تھے یا دنیا میں کہیں بھی مغلوب اقوام' یا خفیہ معاشرہ یا کسی ملک کے اندر کوئی با بکار ریاست ہو۔ آزادی ہمیشہ ایک منفی حقیقت ہے اس کے لیے روایت' خاندان اور خلافت سے انکار کرنا پڑتا ہے۔ مگر اس کے وجود کے ساتھ ہی تمام انتظامی اختیارات بجنسہٖ فوراً" ان اداروں سے نئے اداروں کو منتقل ہو جاتے ہیں۔ جماعتی رہنما' آمرین' صدر' انبیا اور ان کے معتقدین جن کے متعلق عوام غیر مشروط طور پر انفعالی ردعمل کا اظہار کرتے ہیں ۔ اس کے لیے مقبول عام تعین ایک نرم مزاج جملہ ہے---- فی الحقیقت عام رائے دہی میں اس کے اصل معانی عرصے سے گم ہو چکے ہیں جتنے زیادہ شدید انداز میں اگر جاگیروں اور پیشوں کا نظام ختم کر دیا جائے گا' رائے دہندگان کے گروہ اسی قدر پابجولاں ہوں گے۔

نئی قوتوں کے ہاتھ میں جس قدر مکمل اختیارات منتقل ہوں گے وہ اسی قدر زیادہ انتظامی مشینری کا استعمال کریں گے۔ وہ ایسے ذرائع اور حد بندیاں اختیار کریں گے کہ دوسرے ان کے معاملات میں دخل نہ دے سکیں۔ ایسی صورت پیدا ہو گی جسے عوام نہ سمجھ سکیں گے نہ اس کا ادراک کر سکیں گے اور وہ رائے عامہ کو محض ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کریں گے' جسے وہ ایک دوسرے کے خلاف استعمال کریں گے اگر اسی عمل کو دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو یہ ایک ناقابل مزاحمت رجحان نظر آئے گا' جس کی بنا پر ہر جمہوریت زیادہ سے زیادہ خودکشی کے راستے پر چل نکلے گی

کلاسیکی باشندوں (آزاد اور دیگران) کے بنیادی حقوق' میں اضافہ انھیں بڑی انتظامی اور عدالتی آسامیاں دے کر کیا گیا ۔ کیونکہ یہ اختیارات استعمال کرنے کے بعد لوگ اپنے آپ کو موزوں حالت میں سمجھنے لگتے ہیں اور وہ چوراہوں میں تقریر کرنے لگتے ہیں۔ جہاں پر کہ اقلیدسی مسلک کے لوگ جمع ہو جایا

کرتے تھے' اور اس میں کلاسیکی اسلوب کا بھرپور مظاہرہ ہوتا تھا' یعنی جسمانی قرب اور حسی ادراک میں بھی قریب تر---- وہ فصاحت و بلاغت جو ہر آنکھ اور کان پر اپنا عمل کرتی ہے۔ ایسے ایسے طریق ایجاد ہو رہے ہیں' جو ہمارے لیے ناگوار اور ناقابل برداشت ہیں' مثلاً رونے دھونے کے اثرات' اور لباس کی مختلف صورتیں ۔ تماشائی ایسی شرمناک صورتوں کی بھی داد دیتے ہیں' مخالفین کے متعلق ناقابل یقین غلط بیانی سے کام لیا جاتا ہے۔ ایسے فقرات استعمال کیے جاتے ہیں جو ذومعنی ہیں (جو کسی خاص وقت اور مقام کے مقصد کے لیے زیادہ سے زیادہ موزوں ہوں)۔ کھیل' تحفے تحائف' تنبیہات اور مکہ زنی' مگر سب سے بڑھ کر نقد رقم۔ اسی ایتھنز میں ۴۰۰ ق م میں ہوا تھا ۔ اور اس کا پریشان کن انجام قیصر اور کسرو کے روم میں ظاہر ہوا' جیسا کہ ہر جگہ ہوتا ہے۔ انتخابات بھی مختلف طبقات کی نامزدگی ہی ہوتی ہے۔ اب مختلف جماعتوں کے نمائندگان کا میدان جنگ بن گیا ہے۔ ایک ایسا اکھاڑہ جو دولت کی دخل اندازی کا منتظر رہتا ہے۔ زاما کے دور سے لے کر دولت کا استعمال زیادہ سے زیادہ تر ہوتا جا رہا ہے۔ رقم جس قدر بھی زیادہ خرچ کی جائے گی اسی حساب سے سیاسی اقتدار اس کا محتاج ہوتا جائے گا ۔ اگرچہ بظاہر زیادہ سے زیادہ دولت کا ضیاع غیر ضروری ہے مگر اس کے باوجود گہری فکر کے مطابق اس رشوت ستانی کا ذکر غلط ہو گا۔ یہ معاملہ صرف اخلاقی گراوٹ کا نہیں' یہ تو جمہوری اخلاقیات کا حصہ ہے اور اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ کسی کا اس سے انکار باعث تباہی ہو گا۔ ابھی اس کلاڈی اس کی اصلاحات (۳۱۰ ق م) کا موضوع یہی ہے۔ یہ شخص صحیح معانی میں یونانی' اور اس نوعیت کا دستوری تصور پرست تھا' جسے مادامو رولینڈ کا حلقہ کہا جا سکتا ہے۔ مگر اس نوعیت کا عمل رائے دہی جو کلی طور پر انتخابی رشوت ستانی اور ناجائز ذرائع پر مبنی ہو اس کے اختیار کرنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ نسلی معیار کا احساس پیدا ہونے لگا اور جلد ہی اس نے اس عمل میں اپنا مقام پیدا کر لیا' اور چھا گیا۔ اس تمام عمل کے باوجود' جب دولت کی آمریت کا سکہ چلتا ہو' تو یہ کہنا کہ دولت کا اس عمل میں استعمال زوال کی علامت ہے' غیر مناسب ہو گا۔

روم میں کسی منصب کو بطور پیشہ اختیار کرنا' خاص طور پر ایسے دور میں جبکہ اسے بار بار انتخابات کے عمل سے گزرنا ہو' اسے اس قدر سرمائے کی ضرورت ہوئی' کہ ہر سیاست دان اپنے تمام حاشیہ نشینوں کا مقروض رہنے لگا۔ یہ صورت حال بالخصوص اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ ہر متعلقہ عہدہ دار کو اپنے پیش رو کے معاملے میں اپنے عوامی کھیلوں کی اہمیت میں ہر لحاظ سے اضافہ کرنا ہوتا تاکہ اس کے نتیجے میں تماش بین اس کے حق میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں رائے دیں۔ سلاجِ بننے میں اس لیے ناکام رہا۔ کیونکہ سابقہ دور میں اس نے کھیل تماشوں کی نگرانی نہیں کی تھی۔ علاوہ ازیں آوارہ گرد اجتماعات پر اثر انداز ہونے کے لیے یہ ضروری تھا کہ متعلقہ عوامی نمائندہ ہر روز چوک میں اپنی موجودگی ثابت کرے اور اس کے ساتھ اس کا حلقہ اثر بھی ہو۔ ایک ایسا قانون موجود تھا کہ تنخواہ دار خدمت گزار نہ رکھے جائیں۔ مگر اعلیٰ طبقے میں یہ رواج تھا کہ لوگوں کو قرض دے کر ان سے ایسی خدمات حاصل کر لی جائیں یا ان کی سرکاری اور کاروباری عہدوں کے لیے سفارش کر دی جائے۔ ان کی مقدمہ بازیوں کے اخراجات ادا کیے جائیں اس کے بدلے میں وہ اس کے ساتھ چوک میں رفاقت کرتے اور باقی اوقات میں خدمت بجا لاتے۔ یہ صورت حال تنخواہ دینے کے مقابلے میں زیادہ مہنگی پڑتی۔ پومپئی نصف دنیا کا سرپرست اعلیٰ تھا۔ اس کے زیر دستوں میں دیہاتی کسان سے

لے کر شاہان مشرق تک شامل تھے۔ وہ ان تمام کی نمائندگی کرتا اور انھیں تحفظ بھی فراہم کرتا۔ یہی اس کا سیاسی سرمایہ تھا' جسے وہ کراسوس اور گلڈنگ کے مقابلے میں استعمال کرتا ۔ ہر اولی العزم انسان فاتح گال تک رسائی حاصل کر لیتا۔ تمام محافظوں کو کھانے پر مدعو کیا جاتا' یا مبارزت طلبی کے تماشوں میں مفت داخلے کا انتظام کیا جاتا' بلکہ (جیسا کہ مائلو کے معاملے میں) زر نقد گھر پر پہنچا دی جاتی۔ سسرو کے قول کے مطابق یہ عمل روایتی اخلاق کا حصہ تھا' یا احترام کا مظاہرہ تھا۔ الیکشن پر خرچ ہونے والا سرمایہ امریکی حساب سے بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ اس کی حد اتنی بڑھ گئی کہ روم کے پاس اتنا سرمایہ ہی موجود نہ تھا۔ ۵۴ء میں ہونے والے انتخابات پر اتنا خرچ ہو گیا۔ کہ قرضوں پر شرح سود ۴ فی صد سے ۸ فی صد تک بڑھ گئی۔ قیصر نے اس سلسلے میں اس قدر خرچ کیا کہ مبارزت طلبی کے سرکس اور کراسوس کو اس کے لیے دو کروڑ مروجہ زر کی ضمانت مہیا کرنی پڑی' تاکہ اس کے قرض خواہ اسے اپنے صوبے میں واپسی کی اجازت دیں اور ماکسی موس نے اپنی مذہبی رہنمائی کی امید واری میں اپنے قرضوں کی ادائیگی میں اس قدر تاخیر کر دی کہ یہ ناکامی اس کی تباہی کا باعث ہو سکتی تھی اور اس کا مخالف کیٹ لوس سنجیدگی سے اسے خرید لیتا۔ مگر گال کی فتح اور استحصال----- یہ مہم بھی دولت کے حصول ہی کی خاطر عمل میں لائی گئی----- کی وجہ سے وہ دنیا کا امیر ترین انسان بن گیا۔ فی الحقیقت فراسالوس کو قبل از وقت ۔ ہی اپنے ساتھ ملا لیا گیا تھا۔ اس کی وجہ صرف اقتدار کا حصول ہی تھا کہ قیصر نے ہزارہا لوگوں کو اپنے ساتھ ملا رکھا تھا' مثلاً سیسل رہوڈز اس کی وجہ حصول زر نہ تھی' جیسا کہ ویرس' یا کراسوس کا رویہ تھا۔ ثانی الذکر تو بنیادی طور پر ایک سرمایہ پرست انسان تھا اور اس کی سیاسی خواہشیں محض ثانوی حیثیت کا درجہ رکھتی تھیں۔ قیصر کو یہ اچھی طرح سے معلوم تھا کہ ایک جمہوری خطے میں دستوری حقوق کا دولت کے مقابلے میں کوئی مقام نہیں۔ ہر شے صرف دولت ہی سے خریدی جا سکتی ہے۔ جب پومپئی ابھی تک یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ موقع پر ادائیگی کر کے لشکر خرید لے گا۔ قیصر اس سے مدتوں پہلے اپنی دولت کے بل بوتے یہ سب کچھ حاصل کر چکا تھا اور اپنے خوابوں کو حقیقت میں بدل چکا تھا۔ بہرحال یہ واضح طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ یہ طریق کار اس کی ایجاد نہ تھی' یہ پہلے ہی سے موجود تھا۔ اس نے انھیں اپنے ہاتھوں میں تو لے لیا مگر کبھی بھی انھیں اپنی شناخت نہیں بنایا۔ کیونکہ عملی طور پر یہ عمل گزشتہ ایک صدی سے جاری تھا۔ ایسے بہت سے گروہ تھے جو اسی نوعیت کی سیاست میں مشغول تھے۔ وہ نجی سیاست میں ماہر تھے اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اپنے وقت کے سیاسی ہتھیار بخوبی استعمال میں لا سکتے تھے۔

ان ذرائع کے علاوہ وہ اثر و رسوخ تھا جس کی بنا پر عدالتوں کو خریدا جا سکتا تھا۔ جب سے کلاسیکی اسمبلیوں کے لیے رائے شماری ہوئی تھی انھوں نے کسی موضوع پر تبادلہ خیالات نہیں کیا تھا۔ میز کے سامنے کھڑے ہو کر تقریر کرنا ایک جماعتی جنگ تھی' اور یہ ایک قسم کا ادارہ تربیت تھا۔ جس میں سیاسی عمل کی تعلیم حاصل ہوتی۔ نوجوان سیاستدان یہیں سے اپنی عملی تربیت حاصل کرتے اور پختہ سیاست کاروں میں اپنا مقام پیدا کرتے ۔ جیسا کہ انیس سالہ نوجوان کراسوس نے ری پبری اس کاربو کو میدان سے نکال دیا' جو گریکی کا دوست تھا۔ وہ اپنے آخری دور میں انتہائی منازل طے کر گیا۔ یہی وجہ ہے کہ کاٹو پر چوالیس دفعہ

مقدمہ قائم کیا گیا اور ہر دفعہ وہ بری ہوا۔ اس مقدمے کا قانونی پہلو ان معاملات ہی کے تحت تھا۔ اصل فیصلہ کن عناصر سیاسی ۔ جماعتوں سے اور جج صاحبان سے تعلقات' سرپرستوں اور تائید کنندگان کے گروہوں کی تعداد تھی۔ گواہوں کی تعداد کے جلوس نکالے جاتے تاکہ مدعی کی سیاسی قوت کی تشہیر کی جا سکے۔ سسرو کی تقریروں کا اسلوب ججوں کو ویرس کے خلاف متاثر کرنا تھا اور اخلاقی جذبات کے ذریعے سے دباؤ ڈالنا' اور یہ ثابت کرنا کہ ملزم کو سزائے موت دینا خود ان کے مفاد میں ہے۔ اگر غور سے مشاہدہ کیا جائے تو یہ معلوم ہو گا کہ کلاسیکی دور کی ریاستیں صرف نجی اور جماعتی مفادات کی حفاظت کے لیے مقرر تھیں۔ ایتھنز میں جمہوری مدعیان اپنے دلائل کے آخر میں یہ کہنے کے عادی تھے' کہ اگر عدالت نے امیر مدعا علیہ کو بری کر دیا تو اسے مطلوبہ عوضانہ سے ہاتھ دھونا پڑے گا ۔ رومی مجلس قانون ساز کی لامحدود قوت اس امر پر منحصر تھی کہ ہر عدالتی عہدہ انھیں کے پاس تھا (یعنی تمام منصف ان کے اپنے تھے)۔ وہ منصفین جو عوام کی تقدیر کا فیصلہ کرتے تھے' خود اراکین مجلس کے رحم و کرم پر تھے۔ اس لیے ۱۲۲ ق م کے گر یکچن قانون' جس کی رو سے مقدمات عدالتوں سے واپس لے کر شرفا کے حوالے کر دیے گئے' بہت دور رس اثرات کا حامل سمجھا گیا----- یہ ایک دفتری جماعت تھی----- جو مالی لحاظ سے اہم افراد کو مجلس میں واپس لے آئی تھی اور انھیں عدالتی اختیارات تفویض کر دیے تھے۔ جن کو بعد میں سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا اور اس طرح طاقت ور حکمرانوں کو ایک اور موقع میسر آ گیا' کہ وہ منتخب شدہ ججوں کے مزاج کو تبدیل کر سکیں۔

اب' جبکہ کلاسیکی اور روم کے چوکوں' کی برتری' نے عوام کو ایک ہی جماعت میں یکجا کر لیا' اور انھیں یہ موقع فراہم کیا کہ وہ اپنے حقوق استعمال کریں جو ان کی اپنی خواہش تھی۔ ہمارے دور کے انگریزی اور امریکی معاشروں میں سیاست نے یہی صورت صحافت کے ذریعے پیدا کر لی ہے' جو موجودہ دنیا کی اتنی بڑی قوت ہے جس کی وجہ سے دنیا بھر میں دانش اور مالیت کا ہیجان پیدا کیا جا سکتا ہے اور اس کی وجہ سے دنیا کا ہر شخص وہ حیثیت قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے جو اسے اس ادارے کی طرف سے عنایت کی گئی ہو۔ ہر فرد کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ بعینہ اسی طرح سوچے اور اسی طرح عمل کرے' جس طرح کہ کہیں دور مقام پر بیٹھا ہوا مناسب سمجھتا ہے اور عمل کرتا ہے اور اسے درست سمجھتا ہے۔ اس عمل میں محرکات' اعداد و شمار کے خلاف کام کرتے ہیں فاؤسٹی بخلاف کلاسیکی عالمی احساس اور بعد ثالث کی آرزوئیں خالص اور محسوس حال مطلق کے خلاف عمل کرتی ہیں۔ انسان' انسان سے بات نہیں کرتا ۔ صحافت اور اس کے ساتھی' برقی خبر رسانی کی خدمت' تمام دنیا کے شعور بیدار کو اپنے شور و غوغا سے بہرہ بنائے رکھتے ہیں۔ مقبول عام الفاظ نقطہ ہائے نظر نظاروں' احساسات کا ہر روز' ہر ماہ' ہر سال ہدف بنائے رکھتے ہیں تاکہ ہر خودی کسی اور کی فکر کی محتاج رہے۔ سیاسی عمل میں رقم ایک ہاتھ میں منتقل نہیں ہوتی۔ یہ جوئے اور شراب سے منتقل نہیں ہوتی۔ یہ قوت میں تبدیل ہوتی ہے اور شدید عملی اثرات پیدا کرتی ہے

بارود اور نشر و اشاعت ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ دونوں کی دریافت اس وقت ہوئی جب رومی اپنی معراج پر تھے۔ ان دونوں کی بنیاد جرمن فنی فکر پر ہے----- کیونکہ دونوں ہی فاصلاتی حکمت عملی کا

مظہر ہیں۔ تحریک اصلاح صرف ان کا نقطہ آغاز ہے۔ اسی کے ساتھ پہلا اخباری صفحہ اور پہلا بارودی گولا دیکھا گیا۔ تہذیب کے آغاز میں انقلاب فرانس نے ۱۷۸۸ء میں کتابچوں کا طوفان اور توپ خانے کی مسلسل گولہ باری کا نظارہ کیا اور اس قدر زیادہ مطبوعہ مواد وجود میں آیا کہ اسے بہت بڑے علاقوں میں تقسیم کیا گیا۔ یہ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں بطور پراسرار قوت منتقل ہو گئی جو جانتے تھے کہ اسے کس انداز سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ فرانس میں تو یہ صورت ۱۷۸۸ء میں پیدا ہوئی اور اسے نجی اعتقادات کے اظہار و تبلیغ کا وسیلہ بنایا گیا مگر انگلستان میں یہ تجربہ اس سے بہت پہلے کیا جا چکا تھا اور جان بوجھ کر قارئین کی آرا کو بھی شائع کیا جا رہا تھا۔ مقالات کی جنگ' ضمیے' جعلی یادداشتیں' لندن کی سرزمین سے نپولین کے خلاف استعمال کی گئیں۔ یہ اس نوعیت کی پہلی مثال تھی۔ دور روشن خیالی کے منتشر خاکے اشاعتی اداروں کے حوالے کیے گئے اور گمنام افراد کے ناموں سے یا بغیر نام کے شائع کیے گئے۔ اب صحافت کی مہم جوئی یا تو طویل ہو جاتی ہے یا---- تیاری کے مراحل میں ہوتی ہے---- اور عملی جنگ کے بدل کے طور پر استعمال ہوتی ہے اور انیسویں صدی میں تو یہ جنگ آخری حدود پر لڑی جاتی تھی۔ دھوکا بازی' اچانک حملہ' یا ہلہ بول دینا اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ پہلی گولی چلائے بغیر ہی ایک فریق جنگ ہار جائے' کیونکہ اس دوران صحافت میدان مار چکی ہے۔

دور حاضر میں ہم اس ذہنی بم باری کے سائے میں زندگی اس طرح بسر کر رہے ہیں کہ بمشکل ہی کوئی شخص اپنے آپ کو اس داخلی کیفیت سے نجات دلا سکے' جو اس خوفناک واضح ڈرامے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ عزم لی القوت جو خالص ڈرامائی پردے کے تحت شروع کیا گیا تھا' اب بخیر و خوبی ختم ہو چکا ہے کہ اب صحافت کی غلامی اپنی فکری آزادی کی تعریف کرتی ہے' جو اس سے قبل کبھی بھی اس کے تجربے میں نہیں آئی تھی۔ آزاد خیال بورژوا اس پر فخر کرتا ہے کہ وہ احتساب سے آزاد ہو گیا ہے اور اس پر آخری عاید شدہ پابندی بھی ختم ہو چکی ہے جبکہ صحافت کا آمر---- نارتھ کلف---- اپنے قارئین پر مشتمل غلاموں کے گروہ پر فخر محسوس کرتا ہے۔ وہ اپنے اداریوں کے چابک سے اپنے راستے پر لگائے رکھتا ہے۔ برقی تار اور تصاویر اس کے علاوہ ہیں۔ اخبار بینی نے کتابوں کو لوگوں کے گھروں سے نکال دیا ہے۔ کتابوں کی دنیا' جس میں کہ نقطہ ہائے نظر کا اظہار ہوتا تھا اور منطقی تنقید کی جاتی تھی' اب صرف چند لوگوں کے قبضے میں رہ گئی ہیں۔ لوگ ایک اخبار پڑھ لیتے ہیں' اپنا پسندیدہ اخبار' جو لاکھوں کے گھروں میں سامنے والے دروازے سے پہنچ جاتا ہے' قاری صبح سے شام تک اس کے جادو میں مبتلا رہتا ہے اور کتاب کو تغافل شعاری کے حوالے کر دیتا ہے۔ کبھی کبھار کوئی کتاب الماری سے اس لیے باہر آ جاتی ہے کہ اس پر اخبار میں تبصرہ شائع ہوا ہو یا اسے دیکھ کر اپنے تاثرات کا جائزہ لینا ہو۔

حقیقت کیا ہے؟ ان لاکھوں انسانوں کے لیے جو اخبارات کو مسلسل پڑھتے ہیں' یا سنتے ہیں۔ ان کے لیے پانی کا کوئی تنہا اور مجبور قطرہ' کہیں ٹھہر جائے اور جمع ہو جائے جس پر وہ اپنی صداقت کی بنیاد رکھ سکے۔ مگر مقصد تو اس کی حقیقت کو معلوم کرنا ہے مگر جو کچھ ادراک کیا جا سکتا ہے وہ صرف اس کی صداقت ہے۔

علاوہ ازیں عوامی لمحاتی صداقت ہی وہ حقیقت ہے جو اپنے اثرات' کامرانیوں کی وجہ سے حقائق کی دنیا میں اہمیت کی حامل ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ صحافت کی تخلیق ہے۔ جو صحافت چاہے وہی حق ہے۔ اس کے کماندار یاد تازہ کرتے ہیں' جذبات ابھارتے ہیں' کایا پلٹ دیتے ہیں' یا حقائق کو ایک دوسرے سے بدل دیتے ہیں۔ تین ہفتے اگر صحافت کسی منصوبے پر کام کرے تو اسے ہر شخص سچ سمجھنے لگے گا ۔ اس لیے اس کی بنیاد اس وقت تک ناقابل تردید ہے' جب تک دولت دستیاب ہے' جو اسے برقرار رکھ سکتی ہے۔ کلاسیکی فصاحت و بلاغت کا مقصد تاثرات پیدا کرنا تھا' متن مقصود نہ تھا---- بالکل وہی انداز اختیار کرنا جو شیکسپیئر نے انٹونی دفن کے عمل کے بیان میں کیا۔ مگر اس نے آپ کو حاضرین اور موقع محل تک محدود رکھا۔ ہماری صحافت کس تحرک کی طلب گار ہے اور وہ کس دائمی تاثریت کو پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اس کے لیے اسے عوام کے اذہان کو مسلسل اپنے زیر اثر رکھنا پڑتا ہے۔ اس کے تمام دلائل کو اسی وقت ہٹا دیا جاتا ہے' جونہی کہ اس کے مخالف دلائل ان پر غالب آتے ہیں۔ اگرچہ یہ طویل مدت تک لوگوں کی سماعت و بصارت پر اپنے اثرات کے نشانات ظاہر کرتے رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود رائے عامہ کی سوئی مضبوط قطب کی طرف حرکت پذیر رہتی ہے۔ ہر شخص اپنے آپ کو نئی صداقتوں کا قائل کرتا رہتا ہے اور اپنی دانست میں یہ سوچتا ہے کہ اس نے اپنی بہت بڑی غلطی پر قابو پا لیا ہے۔

سیاست کے اثرات کے تحت صحافت مجبور ہے کہ وہ اپنے آپ کو علمی مدارس تعلیم سے وابستہ رکھے جو کلاسیکی عالم میں تو موجود ہی نہ تھا۔ اس طلب میں یہ عنصر شامل ہو جاتا ہے کہ---- اگرچہ بالکل غیر شعوری طور پر---- کہ صحافت گڈریے کا کردار ادا کر کے' عوام کی رہنمائی کرے اور جماعتی سیاست کو اخبارات کے دائرہ قوت میں لے آئے اور اس طرح مخصوص سیاسی مقاصد حاصل کرے۔ قدیم جمہوریت کا تصور پرست عوام تعلیم کو کسی مخصوص انداز فکر سے وابستہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے خالص اور سادہ روشنی سے تعبیر کرتا تھا اور آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بعض کمزور دماغ لوگ آزادی صحافت کے متعلق بہت پرجوش ہیں---- لیکن اس کا حقیقی مقصد یہی ہے کہ عالمی صحافت کی قیصریت کے لیے راستہ ہموار کیا جائے۔ جو لوگ پڑھنا جانتے ہیں' وہ صحافت کی گرفت میں آ جاتے ہیں اور ماضی کی جمہوریت کے مسائل کے متعلق ذاتی تعین کو' ایسے عوامی تاثر سے مغلوب کر دیں جن پر کہ مطبوعہ مواد کی حکمرانی ہے۔

آج کی حکمت عملی کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا مقصد فریق مخالف کو ان سہولتوں سے محروم کرنا ہے۔ جب صحافت اپنے معصوم بچپن کے دور سے گزر رہی تھی تو اس پر احتساب اور نگرانی کا عمل بھی حاوی تھا۔ روایت پرستی کے شیدائی اسے اپنے دفاع کے لیے ضروری سمجھتے تھے اور بورژوا طبقہ چیخیں مار رہا تھا کہ آزادی کی روح کو سخت خطرات درپیش ہیں۔ دور حاضر میں انبوہ در انبوہ لوگ تحمل مزاجی اور بردباری سے اسے برداشت کر رہے ہیں۔ صحافت نے یقینی طور پر آزادی کی یہ جنگ جیت لی ہے۔ مگر پس منظر میں غیر مرئی طور پر نئی قوتیں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں اور صحافت کو خریدنے کا عزم رکھتی ہیں۔ مگر قاری اس کا اندازہ نہیں کر سکتا' کہ صحافت موقع بموقع اپنے آقا تبدیل کرتی رہتی

ہے ۔ اس موقع پر بھی دولت ہی کو فتح حاصل ہوتی ہے' اور وہ آزادی ضمیر پر اپنا قبضہ جما لیتی ہے۔ جانوروں کو سدھانے والے کسی بھی ہنر مند کے پاس اتنی قوت موجود نہیں۔ جب آپ کسی گروہ قارئین کو بطور گروہ کھلا چھوڑ دیں تو وہ گلیوں میں گھوم پھر کر اس نشان پر ہلہ بول دیں گے جو ان کے لیے متعین کر دیا گیا ہو۔ وہ لوگوں کو ڈرائیں گے اور کھڑکیاں توڑ دیں گے اور اگر انھیں پریس کی طرف سے ذرا سا اشارہ بھی مل جائے تو وہ خاموش ہو کر اپنے گھروں میں واپس چلے جائیں گے۔ آج کی صحافت بذات خود ایک فوج ہے' اس کی کئی شاخیں اور منظم شعبے ہیں' کالم نگار اس کے سپہ سالار ہیں اور قارئین اس کے سپاہی۔ مگر اس میں بھی' جیسا کہ ہر فوج میں ہوتا ہے' سپاہی بغیر سوچے سمجھے حکم مانتے ہیں اور دوران جنگ انھیں اطلاع دیے بغیر منصوبہ بندی تبدیل کر دی جاتی ہے اور قاری جب تک اس کے پاس مطلوبہ رقم موجود ہو' وہ اخبار کو اپنے لیے برقرار اور جاری رکھتا ہے۔ قاری کو نہ اس کا علم ہوتا ہے' نہ اسے اس کی اجازت دی جاتی ہے کہ اسے ان مقاصد کا علم ہو سکے جن کی اسے عادت پڑ چکی ہے' نہ اسے اس کردار کا علم ہوتا ہے' جو اسے ادا کرنا ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ مضحکہ خیز آزادیٔ فکر کا تصور بھی ممکن نہیں' ماضی میں کوئی شخص آزاد فکر کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا مگر اب وہ دلیر تو ہو گیا ہے مگر اس پر عمل نہیں کر سکتا۔ اس کا عزم فکر صرف خواہش فکر بموجب حکم تک محدود ہو کر رہ گیا اور اسی کو وہ اپنی آزادی تصور کرتا ہے۔

دوسری جانب یہ موخر کردہ آزادی کے مطابق------ ہر شخص کو یہ اجازت حاصل ہے کہ جو چاہے کہے۔ مگر پریس کو یہ آزادی حاصل ہے کہ قاری کی رائے کا احترام کرے یا اسے نظر انداز کر دے۔ وہ کسی صداقت کو فناہ نہیں کر سکتا' محض اس وجہ سے کہ دنیا میں اس کا ابلاغ نہیں ہو سکا------ خاموشی احتساب بھی ایک خطرناک عمل ہے' جس کے متعلق اخبارات کے قاری مطلقاً" لاعلم ہیں کہ اس کا کوئی وجود ہے بھی یا نہیں ۔ اس موقع پر بھی' جیسا کہ عام رواج ہے قیصریت کا ورد زہ ایک مدفون بہار کی طرح ابھرتا ہے۔ واقعات کی قوس خود اپنا مقام تنگ کر لیتی ہے جس طرح کہ لوہے اور کنکریٹ کی عمارتیں قدیم رومی عزم کے اظہار کی صورت میں ایک دفعہ پھر وجود میں آ جاتی ہیں۔ مگر اب ان کی صورت میں خنکی' نظم و ضبط اور تہذیب کے آثار شامل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ رومی کلیسا کی قوت کا دوبارہ اظہار ہوتا ہے------ جسے آزادی جمہوریت کا نام دیا جاتا ہے۔ کتابی دور دونوں طرف سے گھیرے میں لے لیا جاتا ہے ایک طرف مذہبی مواعظ اور دوسری طرف سے اخبار گھیر لیتے ہیں۔ کتابیں ذاتی کیفیات کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔ مگر اخبارات غیر ذاتی تصورات و مقاصد کی مثال پیش کرتے ہیں۔ مدریت کا دور' عالمی تاریخ میں ذہنی ضبط کا ایک ایسا نمونہ پیش کرتا ہے جسے تمام دنیا میں نافذ کیا گیا۔ اس میں کسی ایسی تحریر' تقریر' اور فکر کی اجازت نہیں دی جاتی' جو عزم اتحاد کو کمزور کرے۔ یہ روحانی تحرکات ہیں۔ کلاسیکی' ہندوستانی' یا چینی بنی نوع انسان یہ نظارہ دیکھ کر دہشت زدہ ہو جاتا ہے۔ مگر وہی اشیا بالتکرار ظاہر ہوتی رہتی ہیں اور یورپی------ امریکی آزاد خیالی کے نتیجے میں------ ظلم و ستم کے مقابلے میں استبداد آزادی پیش کر دیا جاتا ہے۔ (یہ راس پیری کا قول ہے) جماعتی رہنمائی کی آمریت صحافت کی پشت پناہی کرتی ہے۔ مقابلے کے فریق' قارئین' بلکہ عوام کو بھی------ دولت کے زور پر اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں------ اپنے مخالفین پر شدید الزامات لگائے

جاتے ہیں اور انھیں اپنے مطلب کی ذہنی تربیت دی جاتی ہے اور جو کچھ وہ اس ذہنی تربیت کے نتیجے میں سوچتے ہیں۔ وہ صرف وہی ہوتا ہے' جو یہ رہنما چاہتے ہیں کہ وہ سیکھ لیں۔ اگر وہ بلند عزم کا مظاہرہ کریں گے اور ان پر حدود و قیود کو پار کر لیں گے تو انھیں علم ہو جائے گا کہ انھیں جان بوجھ کر اندھیرے میں رکھا جا رہا ہے۔ اب یہ ضروری نہیں رہا کہ باروق کے شہزادوں کی طرح عوام پر جبری فوجی بھرتی کا قانون نافذ کیا جائے۔ اس کے مقابلے میں یہ آسان ہے کہ اخبارات میں مقالہ جات' تار اور تصاویر کی اشاعت سے کام لیا جائے۔ (نارتھ کلف) یہاں تک کہ وہ خود ہی اسلحہ کے لیے اصرار کریں اور اپنے رہنماؤں کو ایسے جھگڑے میں الجھا دیں' جس میں کہ وہ الجھائے جا سکتے ہوں۔

جمہوریت کا اختتام یہی ہے۔ اگر حقائق کی دنیا میں یہ کوئی فیصلہ کن امر ہے تو اس صورت میں واقعی یہ کامرانی کی دلیل ہے کامیابی کا مطلب یہی ہے کہ ایک کو دوسرے پر فتح حاصل ہو۔ زندگی پر قابو حاصل ہو چکا ہے اور دنیا کو ترقی دینے کے خواب دیکھنے والے خوہی انسانی فطرت کے ماہرین کے آلہ کار بن چکے ہیں' موخر جمہوریت میں نسل اپنا سر اٹھا لیتی ہے۔ وہ مقاصد کو اپنا غلام بنا لیتی ہے یا کسی گڑھے میں پھینک دیتی ہے۔ مصری تیمیسس' روم اور چین میں یہ عمل اسی انداز میں ہوا مگر کسی بھی تہذیب میں یہ عزم اقتدار ظاہر نہیں ہوا اور اس میں وہ شدت ظاہر نہیں ہوئی' جو ہم اپنی تہذیب میں دیکھتے ہیں۔ فکر' اور اس کے نتیجے میں عوامی عمل' کو آہنی دباؤ کے تحت رکھا جاتا ہے------ صرف اسی سبب کے باعث عوام کو اخبارات کے مطالعے اور رائے دہندگی کی اجازت دی جاتی ہے------ گویا ان پر دوہری غلامی عائد ہوتی ہے------ جبکہ جماعتیں چند ہاتھوں کی ملکیت بن جاتی ہیں اور ان پر قیصریت کے سائے پہلے ہی سے منڈلانے لگتے ہیں' جیسا کہ برطانوی شہنشاہیت کی انیسویں صدی میں صورت بن گئی تھی۔ وہی صورت بیسویں صدی میں پارلیمنٹوں کی بھی ہو جائے گی۔ ایک سنجیدہ مگر خالی شان و شوکت کا تماشا نظر آئے گا۔ جیسا کہ عصائے شاہی اور تاج کی نمائش کی جاتی تھی' اب انسانی حقوق کا عوام کو دل خوش کن نعرہ سنایا جاتا ہے اور یہ کام اتنی ہوشیاری سے کیا جاتا ہے کہ ان کی بظاہر کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ محتاط آگستوس کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا' جس میں کہ وہ قدیم رومی آزادی کا تذکرہ نہ کرتا اور ان رسوم و رواجات کا ذکر نہ کرتا جو اس دور میں مروج تھیں۔ مگر اقتدار آج بھی نقل مکانی میں مصروف ہے اور انتخابات اسی طرح ہمیں بھی زوال آشنا کر رہے ہیں جس طرح کبھی روم کو کیا تھا۔ دولت صرف ان لوگوں کے لیے ہی طریق کار وضع کرتی ہے جن کے قبضے میں ہوتی ہے اور انتخابات کا معاملہ ایک قبل از وقت طے شدہ کھیل بن جاتا ہے' جسے مقبول عام رائے دہی کے طور پر کھیلا جاتا ہے۔ اگر ماضی میں انتخابات صحیح معنوں میں کسی انقلاب کا مظہر ہوتے تھے' تو اب ان میں وہ صلاحیت باقی نہیں رہی اور اب جو کچھ ہوتا ہے وہ اسی قدر ہے کہ لوگ اپنی قضاء و قدر کا فیصلہ ابتدائی دور کے طریقے سے کرنے لگے ہیں' جس میں فسادات ہوتے اور خون بہایا جاتا' جبکہ دولت پر مبنی سیاست ناقابل برداشت ہو چکی ہے ۔

دولت کی وجہ سے جمہوریت اپنی تباہی خود لاتی ہے جیسا کہ اس سے قبل دولت نے دانش مندی کو

تباہ کیا ہے مگر اس اقتباس کی وجہ سے کہ زینو یا مارکس کے تصورات نے صورت حال میں تبدیلی پیدا کر دی ہو گی اور فی الواقع اس معاملے میں بہتری آ چکی ہو گی۔ کیونکہ عوام الناس کو معلوم ہے کہ فی الحقیقت عزم لی القوت سے ایک تصور دوسرے پر غالب آ سکتا ہے اور اسی کی جگہ لے سکتا ہے (کیونکہ مدنی ریاستوں کے دور سے انسان کو یہی سب سے بڑا تجربہ حاصل ہوا ہے)۔ ایسی صورت میں تمام قدیم اور قابل قدر روایات کے لیے آرزو بیدار ہو جاتی ہے جو کسی نہ کسی صورت میں ابھی تک قائم ہیں۔ لوگ زر کی معیشت سے بیزار ہو چکے ہیں۔ وہ متمنی ہیں کہ انھیں کسی طرف سے نجات کا سہارا ملے۔ کیونکہ عزت اور وقار کی اصل داخلی شرافت نفی ذات اور فرض کی بجا آوری پر مبنی ہے اور اب وہ وقت آ رہا ہے جبکہ خون کی ہیئت سے بھرپور قوت' جسے شہری دانش نے نیچے دبا رکھا تھا' گہرائیوں سے دوبارہ ابھر کر ظاہر ہو رہی ہے۔ ہر وہ شے نسلی روایات اور قدیم شرافت پر منحصر ہے جو مستقبل کی ضروریات کے لیے محفوظ ہے۔ ہر وہ شے جو دولت کے حقیر اخلاق پر مبنی ہے' ہر وہ شے جو بنیادی طور پر اتنی مضبوط ہے کہ اپنا وجود قائم رکھ سکے' وہی برقرار رہ سکتی ہے۔ فریڈرک اعظم کے الفاظ میں' ایک خادم--- جو محنت سے کام کرتا ہو اپنی ذات کی قربانی دینے والا' محتاط اور تحفظ فراہم کرنے والا خادم----- جسے اپنے ملک کی خدمت کا شوق ہو' جیسا کہ میں قبل ازیں بیان کر چکا ہوں' تو یہ خدمت سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلے میں اشتمالیت بخوبی ادا کر سکتی ہے----- اس کی وجہ سے زندگی کی تمام لامحدود قوتیں اچانک ظاہر ہو کر غلبہ پا لیتی ہیں۔ قیصریت' جمہوریت کے میدان ہی میں فروغ پاتی ہے مگر اس کی جڑیں زیر زمین روایات کے خون میں پیوست ہوتی ہیں۔ کلاسیکی قیصر اپنی قوت معدلات سے حاصل کرتا تھا اور اپنی شان و شوکت اور استقرار کے لیے اپنی شاہزادگی پر تکیہ کرتا تھا۔ ایسے موقع پر بھی رومی قدیم روح دوبارہ بیدار ہو جاتی ہے۔ قدیم سرداروں کی روحوں کا نظام' بحری قزاقوں کی قزاقی پر غالب آ جاتا ہے۔ مستقبل میں صرف صاحب قوت افراد ہی زمین پر قبضہ کریں گے اور اسے نجی ملکیت میں تبدیل کر لیں گے--- کیونکہ ثقافت کی عظیم سیاسی ہیئت تباہی کے دہانے پر پہنچ چکی ہے----- مگر اس تصور کی کوئی اہمیت نہیں' کیونکہ لاہیئت اور لامحدود قوت کے ذمے ایک فرض منصبی ہے' جو یہ ہے کہ اس دنیا کی خواہ یہ کسی بھی حالت میں ہو حفاظت کی جائے۔ یہ فریضہ ناقابل مزاحمت قوت دولت کے بالکل برعکس ہے اور انتہائی احترام اور شعور و ادراک کا مطالبہ کرتی ہے۔ مگر محض اسی سبب سے قیصریت اور جمہوریت کے مابین' زر کے آمرانہ نظام معیشت اور خالص سیاسی قیصری عزم ضبط کے مابین جنگ جاری ہے اور معاشیات اور سیاسیات کے مابین حتمی جنگ کو سمجھنے کے لیے ہمیں معاشی تعبیرات کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنا ہو گی۔

باب سیزدہم

معاشی زندگی کی عالمی ہیئت

(ا)

زر

ا

ہم جس نقطہ نظر سے عظیم ثقافتوں کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں' ہم اسے معاشی میدان میں تلاش نہیں کر سکتے۔ معاشی فکر و عمل ایک ایسی زندگی کا نمایاں پہلو ہیں کہ اگر اسے برخود مکتفی قرار دیا جائے تو وہ مصنوعی چہرہ لگا لیتی ہے۔ سب سے مشکل ایسے زاویہ کی تلاش ہے جس کی روشنی میں ہم جدید دور کے عالمی معاشی نظام کا جائزہ لے سکیں جو گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے عجیب و غریب انداز اور خطرناک حد تک اور آخر میں عالم مایوسی میں جان پر کھیل کر آگے بڑھتا رہتا ہے---- اسے معاشیات کہا جاتا ہے---- مزید برآں یہ شعبہ علم خالص مغربی محرکات کا نتیجہ ہے۔ اسے آپ کوئی بھی مقام دے سکتے ہیں مگر عوام الناس کی عمومی دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

آج جسے ہم قومی اقتصادیات کہتے ہیں' یہ جن بنیادوں پر استوار ہوئی' وہ کھلم کھلا اور بالخصوص انگلستان سے متعلق ہیں۔ مشین سازی کی صنعت جس کا دوسری ثقافتوں میں کوئی علم نہیں' ملکی معیشت میں مرکزی اہمیت کی حامل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی یہ حیثیت ایک معمول کا واقعہ ہو۔ عوام کے علم کے بغیر یہ تشکیل تصورات اور استخراج قانون کا عمل جاری رکھتا ہے۔ عالمی تجارت اور برآمد کی صنعت کے تعلقات کے حوالے سے زر اعتماد کا تصور وجود میں آیا۔ انگلستان کے زرعی معاشرے کے علاوہ تمام کاروبار میں زر اعتماد بنیاد فراہم کرتی ہے۔ اس کے لیے سرمائے قدر و قیمت اور جائیداد کی اصطلاحات حسب ضرورت متعین کر لی جاتی ہیں۔ یہ تعریفات بلا تامل دوسری ثقافتوں میں بھی منتقل ہو جاتی ہیں اور ان کے اسلوب زندگی کی مختلف سطحوں کو اپنے دائرہ عمل میں لے آتی ہیں۔ انگلستان چونکہ ایک جزیرہ ہے اسے اپنی سیاست اور اقتصاد کے لیے مختلف جدید نظریات کی ضرورت تھی' مگر امتداد زمانہ کے ساتھ یہ نظریات تمام معاشی اصولوں پر حاوی ہو گئے۔ ان نظریات کے خالق ڈیوڈ ہیوم اور ایڈم سمتھ تھے۔ اس کے بعد سے ان کے نظریات کے حق میں یا خلاف جو کچھ بھی لکھا گیا ہے' اس میں ان کے نظامات کو بنیاد بنا کر تنقیدی تشکیل کے مفروضات قائم کیے گئے ہیں۔ یہ حقیقت کارے اور لسٹ کے متعلق بھی اسی قدر درست ہے۔ جیسا کہ فوریئر اور لاسال کے متعلق صحیح ہے۔ سمتھ کا سب سے بڑا مخالف مارکس تھا۔ یہ امر زیادہ اہمیت کا حامل نہیں کہ انگلستان کے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف کوئی کتنی بلند آواز سے احتجاج کرتا ہے اگرچہ وہ خود بھی اس نظام کے تصورات سے رگ و پے تک سرشار ہو۔ کسی کے خلاف احتجاج فی نفسہ اس کے عرفان کا اعتراف ہے۔ اور اس تنقید و احتجاج کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ ایک نئے انداز سے اس کا جائزہ لیا جائے اور اس کے مفادات و موضوعات کو زیر بحث لایا جائے۔

ایڈم سمتھ سے لے کر مارکس تک کے دور میں صرف اسی قدر کام ہوا کہ ایک ہی ثقافت کے پس منظر میں معاشی فکر اور ترقی کا مخصوص انداز میں جائزہ لیا گیا۔ یہ سراپا ایک عقلی مبحث تھا۔ جس کا آغاز انسان کی مادی ضروریات سے ہوتا ہے۔ اس علم کا انسان کی روحانی زندگی سے کوئی تعلق نہیں' اسے بنی نوع انسان کی مختلف نسلوں' جاگیروں یا اقوام سے کوئی سروکار نہیں۔ اور نہ ہی انسانی تخلیقی قوت سے اس کا کوئی واسطہ ہے۔ یہ انسان کو کسی کیفیت کے ترکیبی اجزا کا درجہ دیتا ہے مگر کسی فرد یا گروہ کے تاریخ ساز شخصیات کے عزم کو زیر بحث نہیں لاتا' معاشیات میں جس عزم کو زیر بحث لایا جاتا ہے وہ صرف معاشی حقائق سے متعلق ہے اور فی نفسہ یہ کوئی مقصد نہیں بلکہ حصول مقصد کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ معاشی زندگی کی اس سطح کو موضوع بحث لاتا ہے' جس کا حساب کتاب کیا جا سکے اور اسے علت و معلول کی بھول بھلیوں سے آزاد رکھا جا سکے۔ اس کی تشکیل خالص میکانکی نوعیت کی ہے اور مکمل طور پر برخود کتفی ہے' بلکہ حتمی طور پر یہ مذہب اور سیاست سے منسلک اسباب کی علت کو بھی قبول کر لیتا ہے------ لیکن ان عوامل کو صرف انفرادی خود کتفی حیثیت سے ہی زیر غور لایا جاتا ہے' چونکہ یہ ایک منظم نظام ہے اور تاریخی نہیں' اس لیے اس کے تصورات اور قواعد کا عالم گیر اور دائمی جواز مسلمات میں شامل سمجھا جاتا ہے اور اس کی الوالعزمی اسی میں ہے کہ علم الصرام میں صرف ایک ہی طریق کار کا نفاذ کیا جائے' اور اس کے نتیجے میں جہاں

کہیں بھی اس کی صداقتیں حقائق سے منسلک ہوں' تو اس کے اصولوں کا نفاذ کر دیا جائے۔ اسے اس وقت سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا جبکہ بورژوا طبقے کی جنگ عظیم (اول) پیش گوئیاں غلط ثابت ہوئیں ۔ اور اس کے ساتھ ہی روسی معاشیات کے پرولتاری نظریات نافذ ہو جائیں گے۔

لہٰذا آج تک کسی ایسی قومی معیشت کا وجود سامنے نہیں آیا' جس کی وجہ سے زندگی کے معاشی پہلو میں قلب ماہیت پیدا ہوئی ہو' بالخصوص اعلیٰ ثقافتوں میں اس کا کوئی اظہار ہوا ہو' یا تشکیل متاثر ہوئی ہو یا سطح' میقات اور دورانیہ کے معاشی اسلوب میں کمی واقع ہوئی ہو۔ معاشیات ایک نظام نہیں بلکہ قیافہ شناسی کی ایک صورت ہے اس کے داخلی رازوں کے عرفان کے لیے یا اس کی روح کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ہمیں قیافہ شناسی ہی سے کام لینا ہو گا۔ اس علم کی صحیح قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے بہت زیادہ قوت فیصلہ کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ انسانوں یا گھوڑوں کی درجہ بندی میں خصوصی مہارت کا ہونا لازمی ہے' بلکہ گھوڑوں کے ماہر کے مقابلے میں معاشیات کی تعبیرات میں مقابلتاً "کم علمیت بھی کتفی ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی یہ ضروری ہے کہ انصاف کی پوری استعداد کو بروئے کار لایا جائے۔ قوت فیصلہ کی بیداری کے لیے تاریخی تناظر کا ہمدردانہ رویہ لازمی ہے۔ جو ہمیں نسلی جبلتوں کا درست اندازہ مہیا کرتا ہے' جو معاشیات میں بھی دوسری فعال حیاتیاتی طبائع کی طرح ہی سرگرم عمل ہیں' اور متعلقہ شعبے کی خارجی ہیئت کو متعین کرتے ہیں۔ معاشی عوامل اپنے داخلی کردار کے ساتھ اتحاد عمل کے بغیر نہیں چل سکتے۔ اس لیے تمام معاشی زندگی روحانی زندگی ہی کا اظہار ہے۔

جرمنی میں معاشیات کے متعلق یہ ایک جدید تصور ہے۔ یہ دنیا کے تمام سرمایہ دارانہ نظام یا اشتمالیت سے مختلف ہے۔ کیونکہ وہ تمام اٹھارھویں صدی کے دور روشن خیالی کی پیداوار ہیں۔ اس کا مقصد ماسوائے معاشیات کے مادی تجزیے کے مزید کچھ نہیں۔ اس کے متعلق آج تک جو کچھ پڑھایا جا رہا ہے۔ وہ ابتدائی مساعی سے زائد نہیں۔ قانونی فکر کی طرح معاشی فکر بھی' اب ایسے مقام پر پہنچ چکی ہے جہاں سے وہ حقیقی تعمیر و ترقی کے راستے پر گامزن ہو سکے (ہمارے لیے بھی اسی طرح جس طرح کہ یونانی اور رومی ادوار میں تھی) جس طرح کہ ادب و فلسفہ بغیر کسی دقت کے گزر چکے ہیں۔

یہ کوشش جو آئندہ صفحات میں کی گئی ہے یہ صرف ایک طائرانہ جائزے کی حیثیت کی حامل ہے۔ جس کی رو سے دستیاب امکانات کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔

معاشیات اور سیاسیات ایک زندہ وجود کی رواں لہریں ہیں' ان کا شعور بیدار سے جسے عقلیت پسندی بھی کہا جاتا ہے کوئی تعلق نہیں۔ ان میں سے ہر ایک کائناتی بہاؤ کی لہر کا اظہار کرتا ہے' جو انفرادی حیات کی آئندہ آنے والی نسلوں کی ترجمانی کرتی ہے۔ ان کا بیان تو ممکن ہے مگر ان کی کوئی تاریخ نہیں ہوتی' بلکہ یہ خود ہی تاریخ کا حصہ ہیں۔ یہ وہ زمان ہے جو کبھی بھی مراجعت پذیر نہیں ہوتا۔ ان کے اندر زمانی علامتوں کی

حکمرانی ہوتی ہے۔ ان کا دونوں سے تعلق ہے مگر یہ تعلق اس نوعیت کا نہیں جیسا کہ نسل اور مذہب کا سائنس سے ہے' یا زبان کا مکانی---- علتی کشمکش سے ہے۔ یہ صرف واقعات سے متاثر ہوتے ہیں۔ صداقتوں سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ جس طرح سیاسی میدان میں بعض امور کا انجام متعین ہوتا ہے اسی طرح معاشیات میں بھی یہ صورت پیدا ہو سکتی ہے' جبکہ سائنس اور مذہب میں سلسلہ علت و معلول کا کوئی وقت مقرر نہیں۔

لہٰذا زندگی میں سیاسی اور معاشی شرائط موجود ہیں جو تاریخ کے لیے موزوں سمجھی جاتی ہیں۔ کبھی تو یہ ایک دوسری کو نیچے دبا لیتی ہیں کبھی باہم مدد کرتی ہیں' اور کبھی ایک دوسری کی مخالفت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ مگر سیاست کا مقام غیر مشروط طور پر اولیں ہے۔ مگر عزم حیات تحفظ ذات اور حصول برتری ہے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے آپ کو مضبوط بناتی رہتی ہے تاکہ غلبہ حاصل کر سکے۔ مگر معاشی ضبط اور موزونیت کے لیے وجود کی ندیاں تحفظ ذات کے لیے کافی ہیں' جبکہ سیاست اپنے میدان میں تحفظ ذات کی بجائے دوسروں کے لیے کوشاں رہتی ہے۔ یہ اصول تمام سلسلہ ہائے مخلوقات کے لیے یکساں درست ہے۔ یک خلیہ مخلوق سے لے کر مکڑی کے جھنڈ' اشجار اور آزادانہ نقل و حرکت کے قابل حیوانات اور فضا میں اڑنے والے پرندوں کے لیے اور بنی نوع انسان سب کے لیے یکساں نافذ ہوتا ہے۔ تغذیہ اور اس کا حصول سب میں قدر مشترک ہے۔ ان دونوں پہلوؤں میں صرف وقار کا فرق ہے۔ جو ان کے موت سے تعلق کی بنیاد پر پہچانا جا سکتا ہے۔ اس سے زیادہ افتراق زندگی کے کسی اور پہلو میں نمایاں نہیں' جو بھوک سے مرنے اور جان بازوں کی موت میں ہے۔ معاشیات کی رو سے زندگی کو متعدد خطرات درپیش رہتے ہیں۔ عام مفہوم میں اسے ڈرایا دھمکایا جاتا ہے' اس کی بے عزتی کی جاتی ہے یا اس کی ہتک اور بے قدری کی جاتی ہے' اور اس کی سب سے بڑی وجہ اشتہا ہے---- جس کے ساتھ---- امکانات کی بے ہوشی' تکلیف دہ ماحول' اندھیرا اور صحیح معنوں میں فاقہ کشی کا مزید اضافہ کرلیں۔ تمام افراد ایسی صورت حال میں اپنی نسلی ہیجان خیزی کو فراموش کر کے اپنی زندگی کی گھن کی طرح چاٹ جانے والی بدبختی کے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں انسان کسی وجہ سے مرجاتا ہے مگر کسی مقصد کے لیے جان نہیں دیتا۔ سیاست میں انسان کی موت کسی مقصد کے حصول کے لیے ہوتی ہے۔ وہ کسی اعلیٰ تصور کو حقیقت کا رنگ دینے کی غرض سے موت کو گلے لگا لیتا ہے۔ مگر معاشیات کے اثرات کے تحت جان دینے کا مطلب زندگی کو ضائع کرنا ہے۔ جنگ کا عمل تخلیقی بھی ہوتا ہے مگر فاقہ کشی صرف تباہی کا حیلہ ہی ہے۔ اس سے دنیا کی بڑی بڑی قوتیں ڈھیر ہو جاتی ہیں۔ جنگ میں مرجانے سے زندگی معراج حاصل کرتی ہے۔ اکثر ایسی حد تک کہ موت ناقابل مزاحمت جذبات کو بیدار کرتی ہے۔ ان جذبوں کا محض وجود ہی فتح کا بہانہ بن جاتا ہے' مگر معاشی انحطاط میں فاقہ کشی سے بدصورتی' سوقیانہ پن اور کلی طور پر غیر مابعد الطبیعیاتی اثرات پیدا ہوتے ہیں' مثلاً اپنی زندگی کے متعلق خوف' جو اعلیٰ ثقافتی اقدار کو تباہ کر دیتا ہے اور انسان اپنی بقا کے لیے درندوں کی طرح کی حرکات کرنے لگتا ہے۔

تمام تاریخ میں مرد اور عورت کے وجود کا دہرا مفہوم کسی پہلے باب میں بیان کیا جا چکا ہے۔ ایک نجی

تاریخ بھی ہے' جو خلا میں زندگی بسر کرنے سے متعلق ہے' جس سے انسانی نسل کا سلسلہ جاری رہتا ہے یعنی افزائش نسل کا عزم۔ سیاسی تاریخ اس عمل کا دفاع کرتی ہے اور اسے سیاسی موزونیت میں مدد لیتی ہے۔ یہ وجود کی تکلے اور تلوار کی زندگی کا فرق ہے۔ افزائش نسل سے خاندان اور ریاستیں وجود میں آتی ہیں' اسی سے گھر کا تصور بھی ابھرتا ہے جس میں کہ عروسی کا پلنگ' جی نی اس اور جونو کے رومی افسانوی کرداروں کا احیا ہوتا ہے۔ قدیم رومی اسلوب حیات کی یاد تازہ ہوتی ہے' گھر جسے دروازے کا تحفظ حاصل ہے' خاندان کی اس نجی تاریخ میں معاشیات بھی شمولیت اختیار کر لیتی ہے۔ ایک خوشگوار زندگی بسر کرنا' قوت حیات سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا راز استقرار حمل اور عمل تولید میں پوشیدہ ہے۔ انسانی وجود کی خالص حالت مضبوط کسان کی توانا نسل میں پائی جاتی ہے۔ یہ عالم انسانیت کا وہ نمونہ ہے جس کی جڑیں زمین میں پیوست ہیں' جو سطح ارضی پر توانا اور ثمربار زندگی بسر کرتا ہے۔ خدا نے انسانی جسم کی اس طرح تخلیق کی ہے کہ جنسی اعضا کو گردش خون سے منسلک کر دیا گیا ہے' گویا مقدس اعضائے تولید کو مرکزی مقام حاصل ہے۔

انھیں اسباب کی بنا پر معاشی تاریخ' سیاسی تاریخ سے ایک مختلف شے ہے۔ ثانی الذکر میں پیش منظر کا اظہار انفرادی انجام سے ہوتا ہے' جو اپنے دور میں اپنے آپ کو دوسروں سے علیحدہ یا متعلقہ گروہ کو منتشر ہونے سے محفوظ رکھتا ہے۔ مگر اس کے باوجود ان گروہوں میں شامل فی نفسہ ایک مکمل شخصیت کا مجسم ہے۔ اول الذکر کا سب سے بڑا مسئلہ اور تاریخ خاندان' ان منازل پر مشتمل ہے جو مروجہ زبان کی تخلیق و تشکیل کے دوران پیش آئے۔ ہر وہ واقعہ جو ایک دفعہ ظہور میں آتا ہے اور اس کا تعلق کسی بھی فرد کی ذات سے ہوتا ہے' اس کی کوئی اہمیت نہیں' کیونکہ وہ ایک نجی فعالیت ہے۔ اہمیت صرف ان معاملات کو حاصل ہوتی ہے جو لاکھوں افراد پر یکساں اثر انداز ہوتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود معاشیات صرف ایک بنیاد ہے' اور اسی لیے ہر لحاظ سے بامعنی اور اہم ہے۔ اس کی اہمیت صرف اس حد تک محدود نہیں کہ کوئی شخص یا قوم اچھی حالت میں ہے' خوب کھاتا پیتا ہے' اور ثمربار ہے' مگر اس کی اہمیت ان ذرائع سے متعلق ہے جس کی وجہ سے اسے یہ تمام کیفیات حاصل ہوئی ہیں۔ اعلیٰ نوعیت کے انسان تاریخ کے ساتھ عروج حاصل کرتے ہیں۔ اس کی سیاسی اور مذہبی زندگی جتنی زیادہ نمایاں ہو گی اسی قدر اس کا داخلی علامتی نظام اور قوت اظہار دوسروں سے بلند و بالا ہو گی' اور اسے زندگی میں وہ گہرائی اور گیرائی حاصل ہو گی' جو معاشی زندگی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ یہ صرف تہذیب کے آغاز ہی میں ہوتا ہے کہ تمام دنیا کی ہیئت ایک کنارے پر پہنچ جاتی ہے۔ یہی وہ موقع ہے کہ زندگی اپنے اجمالی خاکے کا تحفظ شروع کر دیتی ہے' اس کا یہ عمل عیاں اور اسرار پر مبنی ہوتا ہے۔ یہی وہ موقع ہے جس میں اس مقولے کی صداقت ظاہر ہوتی ہے۔ "بھوک اور عشق اتنی مضبوط قوتیں ہیں کہ جن کے نتیجے میں کچھ بھی کر گزرنے پر شرم نہیں آتی۔" جب زندگی موم کی پتلی محسوس نہ ہو' اور ادائیگی فرض کی قوت موجود ہو تو اسے زیادہ سے زیادہ افراد کے لیے خوشی اور مسرت کا سامان بہم پہنچانا چاہیے۔ جب ہم اجتماعی سیاسی عمل کی بجائے صرف معاشی عمل میں پھنس کر رہ جائیں گے تو یقینی طور پر ہمارا خاتمہ قریب آ جائے گا۔

چونکہ معاشیات کا تعلق انسانی زندگی کے نسلی پہلو سے ہے' اس لیے اس میں بھی سیاسیات کی طرح روایتی آداب ہونے میں اخلاقیات کا وجود نہیں ہوتا۔۔۔۔ اس کے باوجود شرافت اور مذہبی رہنمائی۔۔۔۔ واقعات اور صداقت کے حدود قائم رہتے ہیں۔ ایک پیشہ ور جماعت بھی ایک جاگیر کی طرح اچھے برے کی تمیز کرتی ہے۔ (اس سے مراد خیر و شر نہیں بلکہ) اچھائی اور برائی ہے' اگر یہ احساس موجود نہ ہو' تو عزت اور قانونی حیثیت کو ضرر پہنچنے کا احتمال ہے۔ کیونکہ وہ لوگ جو معاشی زندگی سے وابستہ ہیں' ان کے لیے بھی عزت و احترام کی حیثیت مرکزی ہے۔ یہی وہ حکمت عملی کی عمدہ صلاحیت حصول ہے کہ انسان یہ شناخت کر سکے کہ صحیح اقدامات کیا ہیں۔ اس میں جو کیفیت وجود میں آتی ہے وہ عالمی مذاہب کی تعلیمات سے بالکل علیحدہ ہے۔ سوداگروں' ہنرمندوں' اور کسانوں کے لیے کسی مخصوص قسم کے پیشہ ورانہ احترام کا نظام موجود نہیں۔ مگر اس سلسلے میں ایک مخصوص نزولی درجہ بندی کا طریق ضرور موجود ہے جو دکانداروں' برآمد کنندگان' بینک کاروں اور ٹھیکیداروں بلکہ ہم سب جانتے ہیں کہ چوروں اور بھک منگوں کے بھی اپنے اپنے نظامہائے اخلاق موجود ہیں۔ حالانکہ ان میں سے صرف دو یا تین ہی مل کر اپنا کام سرانجام دیتے ہیں۔ کسی شخص نے ان مروجہ اخلاقیات کو نہ بیان کیا ہے اور نہ لکھا ہے' مگر یہ موجود ہیں اور جماعتی اخلاق کی طرح ہر جگہ اور ہمیشہ اپنے پیشہ ور اراکین کے لیے پابندی کا تقاضا کرتے ہیں جس طرح طبقہ شرفا میں وفا اور حوصلے کے علاوہ جرات آزمائی اور باہمی تعاون کے عناصر موجود ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہر پیشے سے منسلک افراد میں اپنی صنعت و حرفت سے متعلق واضح اخلاقی اقدار کا نظام موجود ہوتا ہے' جن کے اثرات ان کے کاروبار کی کامیابی اور انفرادی امتیاز پر بھی پڑتے ہیں۔ ہر وہ شے جو کسی شخص کے پاس ہو' ضروری نہیں کہ اسے اس کی تمام تفصیلات کا علم ہو' کیونکہ عام رویہ یہی ہے کہ جب وہ شے ہاتھ سے نکل جائے تو اس کا احساس بڑھ جاتا ہے' جبکہ اس کے برعکس مذہبی امتناعات جو ہمیشہ اور ہر جگہ دنیا میں قابل جواز سمجھے جاتے ہیں' مگر قابل حصول نہیں ہوتے' ایسے تصور کا اس وقت سے قبل ادراک لازمی ہے' جبکہ کوئی شخص انھیں جاننے کی کوشش کرے یا ان پر عمل کا سامان کرے۔

مذہب کی بعض بنیادی شرائط مثلاً "بے غرضی"' "معصومیت" کا معاشی زندگی میں کوئی مطلب نہیں' کیونکہ معاشی زندگی کا سب سے بڑا بزرگ بھی خطاکار ہوگا ۔ نہ صرف یہ کہ وہ امارت میں دلچسپی لے گا بلکہ دولت سے لطف اندوز بھی ہو گا' اور غریب افراد کے حسد کا ہدف بھی ہو گا۔ "کھیت میں اگائے گئے گل سوسن" ایک خالص مذہبی اصطلاح ہے' (اور فلسفیانہ بھی ہے) اور غیر مشروط طور پر درست ہے۔ ان کے وجود کا تمام وزن معاشیات اور سیاسیات کے میدان سے باہر ہے کیونکہ یہ دونوں علوم کا (بعض دیگر دنیوی علوم کی طرح) صرف اسی دنیا سے تعلق ہے' کیونکہ ہم نے حضرت عیسیٰؑ کے دور میں دیکھا' سینٹ برنارڈ کا زمانہ مشاہدہ کیا اور آج کا روس بھی ہمارے سامنے ہے۔ دائیو جینی اور کانٹ کی زندگی بھی ہم سے پوشیدہ نہیں' کیونکہ مذہب کی خاطر لوگ رضاکارانہ غربت قبول کر لیتے ہیں۔ غریب الوطنی قبول کرتے ہیں' حجروں اور کتب خانوں میں اپنے آپ کو بند کر لیتے ہیں۔ مذہب یا فلسفے میں کوئی معاشی فعالیت وجود نہیں پاتی' البتہ کلیسا کے سیاسی پہلو یا معتقدین کے سماجی پہلو میں اسے کسی حد تک عمل دخل کی اجازت ہوتی ہے۔ مگر یہ ایک نوعیت

کی مجبوری سمجھوتا ہی ہوتا ہے جو اس دنیا سے کیا جاتا ہے اور یہ عمل عزم لی القوۃ کی نشاندہی کرتا ہے۔

۲

جسے ہم کسی پودے کی معاشی زندگی قرار دیتے ہیں اس کے حصول میں خود اس کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ تو محض ایک تماشا گاہ ہے اور فطری طریق کار کا ایک بے عزم معروض ہے ۔ یہ عنصر انسانی جسم کے عناصر کی نشاندہی بھی کرتا ہے جو ابھی تک ناقابل تغیر نباتاتی اور خواب زدہ ہے۔ اور اپنے لاعزم (اس پہلو سے اس کی شخصیت مطلق اجنبی کی ہو جاتی ہے) وجود کا محتاج ہے' جو ایک سیلان کے نظام سے منسلک ہے۔ جب ہم حیوانی جسم کا ذکر کرتے ہیں' جو آزادی سے فضا کی وسعتوں میں حرکت پذیر ہے تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ وجود تنہا نہیں۔۔۔۔ وجود بیدار اس کا ہم سفر ہے۔ یہ ہر نوع کے خطرات کو قبل از وقت بھانپ لیتا ہے اس لیے یہ بقائے حیات کے لیے آزادانہ فکر مہیا کرنے پر مجبور ہے۔ یہاں سے زندگی کے متعلق تشویش کا عمل شروع ہوتا ہے' جو حواس خمسہ' لامسہ' شامہ' باصرہ اور سامعہ' میں زیادہ سے زیادہ تیزی پیدا کرتا ہے اور فی الفور فضا میں تلاش' جمع کرنے' پیچھا کرنے' دھوکا دینے' چوری کرنے' کے مقاصد کے لیے حرکت کی قوت جو مختلف جانوروں میں پیدا ہو جاتی ہے (مثلاً اودبلاؤ' چیونٹیاں' شہد کی مکھیاں اور مختلف قسم کے پرندے اور شکاری درندے) یہ تمام استعداد' معاشیات کی ابتدائی ٹیکنیک ہی سے متعلق ہے اور اس لیے تحسس کی بنیاد پر ادراک کی ایک نوعیت کا مظہر ہے۔ انسان حقیقی طور پر انسان اس وقت بنتا ہے جب اس کا ادراک اپنے آپ کو تحسس کی محتاجی سے آزاد کر لے اور اس کی فکر عالم صغریٰ اور عالم کبریٰ کے مابین تعلقات کی نوعیت کو سمجھنے لگے ۔ حیوانات میں مونث' مذکر کے ساتھ چالاکی سے کام لیتی ہے۔ اسی طرح مزارع کی ہشیاری کا ذکر کیا جا سکتا ہے' تاکہ وہ معمولی سا ناجائز فائدہ اٹھا سکے۔۔۔۔ یہ دونوں اپنی مکاری میں لومڑی سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ دونوں میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اپنے شکار کو صرف ایک نظر میں دیکھ لیں۔ اس سارے عمل کے پس منظر میں معاشی فکر موجود ہے جو اپنے میدان میں کاشت کرتا ہے' جانوروں کو پالتو بناتا ہے۔ اشیا کو تبدیل کرتا ہے اور ان کا معیار مقرر کرتا ہے اور اشیا کا تبادلہ کرتا ہے اور ہزاروں راستے اور ذرائع تلاش کرتا ہے تاکہ زندگی کی بہتر حفاظت ہو سکے' اور وہ ماحول پر انحصار کی بجائے اسے اپنے تسلط میں لانا چاہتا ہے۔ یہ عمل تمام ثقافتوں میں یکساں پایا جاتا ہے۔ ہر نسل معاشی فکر کو استعمال کرتی ہے۔ ایسی صورت میں وہ اتنی قوت حاصل کر لیتی ہے کہ وہ اپنے مقاصد متعینہ سے الگ ہو جائے۔ ہوائی قلعے تعمیر کرے' اور بالآخر اپنے آپ کو تصوراتی شہروں کے تصور میں گم کر دے۔

اعلیٰ نوعیت کی تمام معاشی زندگی کسانوں کی محنت اور کاوش پر اپنے آپ کو قائم کرتی ہے۔ کاشتکار لوگ خود اس عمل سے بے خبر ہوتے ہیں۔ گویا یہ کہنا چاہیے' کسانوں کا طبقہ اگرچہ تعداد میں زیادہ ہے مگر اپنی تاریخ سے محروم ہے' جو کچھ وہ پیدا کرتا ہے' اپنی ذات پر خرچ کر دیتا ہے۔ اس کا دنیا کے متعلق نظریہ یہ ہے کہ اس کے علاوہ دنیا میں اور جو کچھ بھی موجود ہے اس کا معاشی وجود حادثاتی اور قابل حقارت ہے۔

اس پیداواری معیشت کے مقابلے میں ایک اور معیشت بھی ہے' جسے اکتسابی کہا جاتا ہے' جو کسان کو بطور شے استعمال کرتی ہے----- اس سے غذائی ضروریات حاصل کرتی ہے' اس سے خراج وصول کرتی ہے اور اس کا استحصال کرتی ہے۔ آغاز میں سیاست اور تجارت کو علیحدہ علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں میں آقائی' شخصی اور جنگ جوئی کی صفات پائی جاتی ہیں۔ دونوں میں اقتدار کی شدید خواہش اور مال غنیمت کی ہوس موجود ہوتی ہے۔ جس سے ان کے عالمی تصور میں تبدیلی آ جاتی ہے۔ یہ تصور نگاہ کسی زاویے سے منعکس نہیں ہوتا بلکہ اوپر سے نیچے کی طرف ہوتا ہے' جس سے وہ اس کی عدم تنظیم کا جائزہ لیتی ہے۔ یہ اسی نوعیت کا جائزہ ہے جو شیر' ریچھ' شہباز' عقاب اور بجو لیتے ہیں۔ قدیم دور کی جنگیں ہمیشہ مال غنیمت کے لیے لڑی جاتیں' اور قدیم دور کی تجارت کا مقصد بھی لوٹ مار اور چھین جھپٹ ہی تھی۔ آئس لینڈ کے رزمیے یہ اطلاع فراہم کرتے ہیں کہ کس طرح بحری قزاق کسی قصبے کی آبادی سے یہ سمجھوتہ کر لیتے کہ وہ پندرہ دن کے لیے منڈی میں امن کو خراب نہیں کریں گے' اس کے بعد وہ دوبارہ تلواریں نکال لیتے اور مال غنیمت اکٹھا کرنے لگتے۔

سیاست اور تجارت تعمیر و ترقی کی صورت میں----- مادی کامیابی کے حصول کا فن ہے' اور فریق مخالف کو ذہنی برتری کے بل بوتے زیر کرنے کا ہنر ہے----- یہ دونوں صورتیں جنگ ہی کا بدل ہیں۔ صرف ذرائع میں تبدیلی آ جاتی ہے۔ ہر نوع کی سفارت کاری بھی تجارت ہی کی ایک قسم ہے اور ہر قسم کی تجارت بھی سفارت کاری ہی ہے۔ یہ دونوں عمل انسانی اطوار کے متعلق فیصلے اور تعبیرات کی حکمت عملی پر مبنی ہیں۔ بحر نوردوں کی مہم جویانہ روح مثلاً فونیقیوں' اٹروسکیوں' نارمنوں' وینیسیوں' ہانسیتوں اور بینک کاری کے ماہرین مثلاً فگیٹ اور میڈوسی' اور مضبوط ترین سرمایہ کار مثلاً کراسوس اور اپنے دور کے کان کن معتبر عظیم متولیان' اپنے اپنے عمل میں اسی وجہ سے کامیاب ہوتے ہیں کہ انھیں متعلقہ فنون میں کامل مہارت حاصل ہے۔ اپنے قبیلے کے ٹھکانے' آبائی وراثت' خاندانی روایات' معاشی اور سیاسی دائروں میں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ عظیم خوش قسمتی مثلاً بادشاہت وغیرہ کی اپنی اپنی تاریخ ہوتی ہے ۔ مگر پوی کریٹس اور سولون' لور-نزو' ڈی میڈیکی اور جیگر وولن دیبر' ہی صرف ایسے سیاسی کارکن نہیں' جو کاروباری طبقے سے نکل کر بلند سیاسی مقامات تک پہنچے۔ ان کے علاوہ بھی متعدد مثالیں موجود ہیں۔

مگر ہر اصل شہزادہ اور مدبر حکومت کرنا چاہتا ہے اور صحیح سوداگر کا مقصد محض امارت ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے اکتسابی معیشت دو حصوں میں منقسم ہو جاتی ہے ۔ کوئی شخص مال غنیمت' اقتدار کی ہوس کے لیے حاصل کرتا ہے۔ بڑے بڑے حکمران ہوانگ تی' طبری اوس' فریڈرک دوم----- حصول دولت' قبضہ اراضی اور رعایا کی تعداد میں اضافے کے خواہاں رہے۔ مگر ان کے عمل میں ان کا احساس ذمہ داری ہمیشہ غالب رہا۔ کوئی شخص اگر ساری دنیا کے خزانچیوں پر قبضہ پا لے مگر اس کا ضمیر صاف ہو' وہ شان و شوکت بلکہ عیش و طرب کی زندگی بسر کرے اور اسے معمول اور جواز نہ سمجھے' بشرطیکہ وہ اپنے آپ کو کسی اجتماعی مقصد کا رہنما سمجھتا ہو (نپولین' سیسل رہوڈز اور تیسری صدی کے اراکین مجلس قانون ساز روم' ایسے

ہی تھے) اگر وہ محسوس کرتا ہو کہ ارتکاز زر غیر مناسب ہے' تو نجی جائیداد کے تصور کا وجود ہی ختم ہو جائے گا

وہ شخص جس کا مقصد ہی معاشی مفاد ہو----- جیسا کہ رومی دور میں کار تسیمی گروہ کا عمل تھا۔ اور ان سے بھی بڑھ کر ہمارے دور کے امریکی ہیں---- ایسے لوگ سیاسی فکر کے اہل نہیں ہوتے۔ جب سیاسی معاملات میں بڑے بڑے فیصلے کرنے کا وقت آتا ہے' یہ لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں اور دوسروں کے ہاتھوں میں کھیلتے ہیں' جیسا کہ ولسن کے معاملے میں ہوا---- بالخصوص ایسے وقت میں اپنی کرسی خالی چھوڑ دینا' جبکہ مدبرانہ جبلت اس کے خلاف ہو' اور اس کے اخلاقی جواز کا بہانہ بنایا جائے۔ یہی وجہ ہے دور حاضر کے معاشی گروہ (مثلاً کارکن اور کارکنوں کی مجالس) اپنی ناکامیوں کو ایک دوسری کے اوپر رکھ کر مینار بناتے جاتے ہیں۔ یہ عمل اس وقت ختم ہوتا ہے جبکہ انھیں کوئی سیاسی رہنما میسر آ جائے۔ اور وہ----- ان کو اچھی طرح سے کام میں لا سکے۔ معاشی اور سیاسی فکر' اعلیٰ پائے کی موافقت کے باوجود' اپنی اپنی سمت کے پابند ہیں۔ (اس لیے ان کی حکمت عملی کی تفصیلات بھی مختلف ہیں) عظیم تجارتی کامیابی - بے راہرو عوامی قوت کا مزاج وجود پاتا ہے---- "سرمائے" کے لفظ ہی میں یہ مزاجی کیفیت موجود ہوتی ہے۔ مگر بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے رنگ' سمت' رضا اور معیار اشیا کے مزاج کے متعلق کوئی تبدیلی وجود میں آتی ہے۔ صرف اسی صورت میں جبکہ کوئی صنعتکار اپنے منصوبے کو ذاتی کاروبار سمجھنا چھوڑ دے۔ متعلقہ مالک ایک مدبر یعنی سیسل رہوڈز کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ مگر اس کے برعکس سیاست کی دنیا کے لوگ جب صرف ذاتی زندگی کی آسایشوں کی خاطر اپنے عزم و فکر کے زوال کا شکار ہو جائیں تو وہ خطرات سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں شرفا قزاقوں کا گروہ نظر آنے لگتے ہیں' اور ہم نے اس نوعیت کے شہزادگان اور وزرا اکثر دیکھے ہیں۔ ایسے بازاری لیڈر اور انقلابی ہیرو بھی دیکھے ہیں' جن کا تمام عزم و حوصلہ آرام دہ زندگی کی نذر ہو جاتا ہے۔ وہ بے شمار دولت جمع کر لیتے ہیں---- اس کے بعد ورسائی اور جاکوبیوں میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ تجارت کے زعما اور پیشہ ورانہ یونین کے رہنما' روسی حاکموں اور بالشویکوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا اور جب جمہوریت اپنے بلوغ کو حاصل کرتی ہے تو ایسے رہنما' نہ صرف خود تاجر ہی ثابت ہوتے ہیں بلکہ سٹہ بازی کے بڑے شہروں کے عمل میں شریک ہو جاتے ہیں۔

یہ تمام کیفیت بلند پایہ ثقافت کے پوشیدہ راستوں کی مظہر ہے۔ آغاز میں تو ابتدائی نوعیت کی تنظیمیں وجود میں آتی ہیں----- طبقہ شرفا اور مذہبی پیشوا----- اور زمان و مکان کی علامات کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ سیاسی زندگی بھی مذہبی زندگی کے مطابق اپنا مستقل مقام رکھتی ہے۔ اس کے عقائد کے معتقد اور اس کے معین مقاصد' حقائق اور صداقت کے میدان میں یکساں ہیں۔ ایسا معاشرہ جو اچھی طرح سے منظم ہو' اس کی معاشی زندگی بھی غیر شعوری طور پر صراط مستقیم پر رواں دواں رہتی ہے۔ اس کے بعد دریائے وجود کو شہر کے خشت و سنگ الجھا لیتے ہیں اور زر اور ذہن تاریخی رہنمائی کا فرض سنبھال لیتے ہیں۔ ہیرو اور درویش اپنی جوان علامتوں کے ساتھ اپنے تنگ سے تنگ تر حلقوں میں محدود ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ خنک مزاج بورژوا ان کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ اس کی تہ میں ایک نظام اپنے اختتام کو پہنچتا ہے' اور ایک سمجھوتا بھی

تکمیل پاتا ہے۔ دونوں عوامل ایک ہی نوع کی پیشہ ورانہ ذہانت پر عمل کرتے ہیں۔ اب کسی بھی علامتی قوت سے ان میں امتیاز باقی نہیں رہتا۔ سیاسی اور معاشی زندگی مذہبی اور سائنسی تجربہ' بمشکل علیحدہ کیے جا سکتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے تعلقات استوار کر لیتے ہیں' زور آزمائی کرتے ہیں پھر باہم مدغم ہو جاتے ہیں۔ شہر کی فضا میں دریائے وجود اپنی ہیئت کی درشتی کھو دیتا ہے۔ ابتدائی معاشی عوامل سطح پر ابھر آتے ہیں اور سیاست کی باقیات کے ساتھ کھیل جاری رکھتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ صاحب اختیار' مقتدر سائنس مذہب کو بھی اپنے دامن میں سمیٹنے کی کوشش کرتی ہے تاکہ اس کے مقاصد اور ذخیرے میں اضافہ ہو۔ معاشی زندگی پر سیاست اپنے ذاتی اطمینان کے لیے اپنی اخلاقی برتری کی چادر چڑھا دیتی ہے۔ جس سے عالمی جذبات میں ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ مگر اس سارے عمل کی وجہ سے خستگی کے شکار جاگیردارانہ نظام کی باقیات سے انفرادی راہ حیات وجود میں آتی ہے جسے سیاسی اور مذہبی عظمت کا تعاون حاصل ہوتا ہے۔ یہی وہ عناصر ہیں جو مل کر سب کا مقدر بنتے ہیں۔

اور اسی بنا پر ہم معاشی تاریخ کی قلب ماہیت کے فرق کا امتیاز کرتے ہیں۔ آغاز میں انسان کی ایک قدیم معیشت ہوتی ہے جو----- جو اشجار اور حیوانات کی طرح حیاتیاتی پیمانہ زمان پر چلتی ہے اور اس طرح اپنی مختلف ہیئات کو تشکیل کرتی ہے۔ ابتدائی دور پر یہ مکمل طور پر غالب ہوتی ہے اور مسلسل آگے بڑھتی رہتی ہے کبھی کم کبھی زیادہ رفتار سے۔ ارفع ثقافتوں کے مابین اور زیر سطح اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ حیوانات اور نباتات اس کے تحت لائے جاتے ہیں' ان کی ہیئت میں تبدیلیاں لائی جاتی ہیں' انھیں قابو میں لایا جاتا ہے اور ان میں سے موزوں جانوروں اور پودوں کے بیجوں کو نسل کشی اور کاشت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ آگ اور مختلف دھاتوں کو کام میں لایا جاتا ہے' اور غیر نامی نوعیت کے اوصاف کو زندگی کی تسکین کے لیے تیکنیکی مراحل سے گزار کے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ تمام سیاسی---- مذہبی اخلاقیات کے تحت کیا جاتا ہے' اور ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ ٹوٹم اور امتناعات' اشتہا' روحانی خوف' جنس' محبت' فن' جنگ' قربانی کی رسوم' اعتقادات اور تجربات کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا

تصور اور ارتقا دونوں لحاظ سے' اس سے بالکل مختلف اور رفتار اور امتداد میں بھی علیحدہ' اعلیٰ ثقافتوں کی معاشی تاریخ ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا معاشی اسلوب ہے۔ جاگیردارانہ نظام میں غیر شہری دیہاتی آبادی شامل ہوتی ہے۔ ریاست پر حکومت شہری مراکز سے کی جاتی ہے۔ جہاں پر زر کی معیشت مروج ہوتی ہے۔ جب تہذیب کا آغاز ہوتا ہے تو اس میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ زر کی حاکیت کے ساتھ ساتھ بیک وقت شہری جمہوریت کو فتح نصیب ہو جاتی ہے۔ ہر ثقافت کی ایک اپنی آزادانہ تشکیل کردہ عالمی ہیئت ہوتی ہے۔ شمسی ثقافت کا اسلوب زر (مہر شدہ سکوں کی صورت میں) ہمارے دور کی فاؤستی زر کے متحرک نظام سے (جو جمع کردہ وحدتوں پر مبنی ہے) اتنی ہی مختلف ہے جس قدر کہ چارلس پنجم کی حکومت کلاسیکی شہری حکومتوں سے مختلف تھی۔ مگر معاشی زندگی' معاشرتی زندگی کی طرح مینار کی صورت میں تشکیل پاتی ہے۔ اپنی کمزوری تہ میں' مکمل طور پر قدیم حالات اپنے آپ کو قائم رکھتے ہیں اور ثقافت کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

دور آخر کی شہری معیشت' جو کہ ایک پرعزم اقلیت کی فعالیت ہے جو قدیم زرعی معاشرے کی معیشت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے جبکہ ثانی الذکر اس کی طرف جل بھن کر دیکھتی ہے اور اس کے اردگرد ہر طرف اپنا مقام مسلسل قائم رکھتی ہے' اور اس کی ذہنی برتری سے مرعوب نہیں ہوتی جو چار دیواریوں میں بند ہوتی ہے۔ بالآخر شہر تہذیبی عالمی معیشت کو آشکار کرتی ہے' جو چند مراکز میں انتہائی مختصر طور پر عمل اشعاع جاری رکھتی ہے' اور ریاست کی بقیہ تمام معیشت کو صوبائی معیشت کا نام دے دیتی ہے' جبکہ دور' وسیع میدانوں میں ہر طرح سے قدیم (پدرسری) رواجات: اکثر غالب رہتے ہیں۔ شہروں میں اضافے کی وجہ سے اسلوب حیات مزید نازک اور پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ قیصر روم کے بڑے شہروں کے کارکن' ہارون الرشید کے بغداد اور آج کے برلن کے مزدوروں کو دیہاتی جرات آزما بنظر استحقار دیکھتے ہیں' اور ان کی پر آسایش زندگی کو احمقانہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس بدیہی معیار کا حصول اور اس کے بعد اس کا استقرار بہت مشکل کام ہے۔ ہر ثقافت میں کام کی مقدار بڑھتی رہتی ہے' یہاں تک کہ تہذیب کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ معاشی زندگی میں شدت آ جاتی ہے' جس میں کہ کشاکش میں اضافہ ہو جاتا ہے اور صورت حال خطرناک ہو جاتی ہے' جسے طویل عرصے تک برداشت کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ آخرکار ایک جامد' مستقل' حالت پیدا ہو جاتی ہے' عجیب و غریب بے ڈھنگی جو خوش ذوق دانشوروں کی پیدا کردہ ہوتی ہے اور سادہ قدیم عوامل' اس نوعیت کے' جیسے یونانیوں نے مصر میں مشاہدہ کیے تھے' یا ہمیں جدید ہندوستان اور چین میں نظر آتے ہیں' یہ اس وقت تک قائم رہیں گے جب تک کہ عالمی طریق کار تبدیل نہ ہو جائے اور زیر پا فرش ارض پھٹ نہ جائے اور جدید ثقافت کا بوجھ اپنے اثرات ظاہر نہ کر لے جیسا کہ دائیو قلیلس کے دور میں قدیم کلاسیکی ثقافت میں ہوا۔ صورت حال میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو گی۔

اس معاشی تحریک میں مقابلتاً" مرد زیادہ موزونیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں' جیسا کہ سیاسی میدان میں بھی مردوں کو اس لحاظ سے موزونیت حاصل ہے۔ ہر فرد کی اپنی معاشی حالت ہوتی ہے' جسے وہ کائناتی تنظیم کے حوالے سے پیش کرتا ہے' جیسا کہ ہر معاشرے میں طبقاتی اور انفرادی درجہ بندی ہوتی ہے۔ اب فرماں برداری کی یہ دونوں اقسام احساس' فکر اور تعلقات کی بنا پر فوری مطالبات کے لیے تقاضا کرتی ہیں۔ زندگی وجود کی متقاضی ہے اور یہ بھی کہ وجود بامقصد اور بامعنی ہو۔ لیکن دور حاضر میں سیاسی جماعتوں کی بے ترتیبی کے باوجود ان میں یہ خواہش ضرور موجود ہے کہ عوام کی مالی حالت کو بہتر بنایا جائے۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ جس طرح کلاسیکی یونان میں ہوا تھا' مذکورہ سیاسی جماعتوں نے بھی بعض گروہوں کو بہت سر پر چڑھا لیا ہے اور وہ سیاسی جاگیر داریوں کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ جیسا کہ مارکس نے کارخانوں کے مزدوروں کو بہت زیادہ سر پر چڑھا لیا تھا۔

اس عدم ترتیب کی ابتدائی اور حقیقی صورت جاگیر داری ہے۔ اس کی وجہ سے عمال حکومت اور عدلیہ کے افسران بہت زیادہ متکبر ہیں۔ اس کے اثرات انتظامیہ پر بھی نمایاں ہیں۔ سیاسی جماعتوں میں شامل یہ گروہ جاگیرداروں کی صورت اختیار کر گئے ہیں' اور ضرورت سے زیادہ اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔ اسی طرح

صاحبان علم و سائنس مذہبی رہنماؤں کا روپ دھار چکے ہیں اور اس طرح معاشرے میں ایک علیحدہ جماعتی حیثیت سے نمایاں ہیں۔ مگر جاگیر داری کی عظیم علامات قلعے اور کلیسا کے ساتھ ہی رخصت ہو چکی ہیں۔ توازن میں تو جاگیرداری کا کوئی دخل نہیں۔ اس کے علاوہ باقی متفرقات تو مختلف سطحات پر مشتمل ایک ڈھیر ہے، ماسوائے سیاسی احتجاج کے ان گروہوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ لہٰذا جب کبھی یہ کوئی اہمیت جتاتے ہیں تو وہ صرف جماعتی نوعیت کی ہوتی ہے۔ ہر فرد اپنی ذات کے متعلق باشعور ہے، بحیثیت بورژوا نہیں، بلکہ اس لیے کہ وہ آزاد خیال ہے۔ اس لیے ایک بہت بڑے کل کا ایک جزو ہے۔ اس لیے وہ صرف اپنی ذات کی نمائندگی نہیں کرتا، بلکہ اپنے تیقن کی وجہ سے وہ اپنے تصور کی پیروی کرتا ہے۔ اس کمزوری کے نتیجے میں اس کی بورژوائی معاشرتی ہیئت اور معاشی ہیئت، اس کے پیشے، اتحاد اور یونین میں مزید نمایاں ہو جاتی ہے۔ شہروں میں ابتدائی طور سے ہر شخص کو اس کے پیشے کے لحاظ سے مخاطب کیا جاتا ہے۔

معاشی طور پر اولاً (اور قدیم دور میں تقریباً" صرف) کیفیت زندگی زراعت پیشہ افراد سے متعلق تھی ۔ جو خالص پیداوار ہے، اور اس طرح ہر کیفیت کے وجود میں آنے سے قبل ہی بطور شرط مقرر کر لی جاتی ہے۔ دور اول کی ابتدائی جاگیریں بھی اپنے نظام معیشت کی بنیاد، شکار، مویشی پالنے اور زرعی اراضی پر قبضے پر رکھتی تھیں، اور ان کا تمام اسلوب حیات ان اشغال ہی سے متعلق تھا، اور دور متاخرین بھی طبقہ شرفا اور مذہبی رہنماؤں کے گروہ کے لیے زمین ہی عزت و احترام کا موجب تھی۔ اس کے مخالف پیشوں میں تجارت، دلالی یا مداخلت کاری تھی ۔ یہ اپنی تعداد کی نسبت ہر لحاظ سے زیادہ قوت کے حامل تھے---- اور قدیم حالات میں بھی ان کا وجود ناگزیر تھا۔ ایک شائستہ طفیلی مخلوق، جو خود مکمل غیر پیداواری، اسی لیے ارضی اجنبی اور انتہائی آزاد، جو کسی طرح بھی کسی دوسری قسم کے اسلوب حیات کو قبول نہ کر سکتے تھے۔ ان دونوں کے مابین ایک تیسری نوعیت کی معیشت بھی جسے تیکنیکی کہنا چاہیے، لاتعداد پیشوں، ہنروں اور کاروباروں کی صورت میں وجود میں آ گئی۔ ان کی تخلیقی قوتیں فطرت پر اثر انداز ہوتی ہیں ۔ ان کا ضمیر اور احترام ان کی کامرانیوں کے نتائج سے وابستہ ہے۔ یہ ایک قدیم ترین پیشہ ورانہ انجمن ہے اس کی روایت کا سلسلہ قدیم ترین دور تک چلتا ہے۔ یہاں تک کہ تاریک دور سے منسلک ہو جاتا ہے۔ اس زمانے کی رزمیہ نظمیں، رواجات اور تصورات میں لوہاروں کی پیشہ ورانہ انجمن کی نشاندہی ہوتی ہے جو کسانوں سے اپنی منفرد علیحدگی کے باعث اور اس خوف کی وجہ سے جو ہمیشہ ان پر غالب رہا، کبھی احترام اور کبھی امتناع کے باعث ان میں شمولیت سے گریزاں رہے۔ اس لیے علیحدہ قبائل کی صورت اختیار کرنے کے بعد علیحدہ نسلی حیثیت سے معروف ہو گئے۔ جیسا کہ سیاہ فام یہودیوں کے فلاشا قبائل جو ابھی تک اپنی علیحدہ شناخت کے حامل ہیں ۔

جیسا کہ معیشت کے دیگر شعبہ جات میں بھی ہوتا ہے، ان تینوں معیشتوں میں بھی، پیداوار، تیاری اور تقسیم کا تعلق سیاست اور عمومی زندگی سے ہے، رہنمائی میں بھی موضوعی اور معروضی عناصر موجود ہیں۔ اس معاملے میں وہ تمام گروہ جو فروخت کرتے ہیں، فیصلہ کرتے ہیں یا تنظیم کے ذمہ دار ہیں، دریافت کرتے ہیں،

اور ان کے علاوہ وہ تمام گروہ جن کا فریضہ عمل کرنا ہے، ان کی درجہ بندی کا تعین مشکل اور ناممکن ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ قابل ادراک ہی نہ ہو ۔ اس کی ترقی ناممکن، یا بلا رکاوٹ ہو سکتی ہے۔ ایسے فرائض سے ملحق وقار ہر جگہ اور طویل زمانے تک یکساں ہو سکتا ہے، اور یہ عبوری دور تادیر چل سکتا ہے اور ایسی صورت میں اس کا مقابلہ یا موازنہ ممکن نہیں رہتا۔ روایت اور قانون، اہلیت یا قبضہ، تعداد آبادی، ثقافتی سطح، اور معاشی صورت حالات اس موضوعی یا معروضی تناقص و تضاد پر غالب آ سکتی ہے، لیکن زندگی کے ساتھ ساتھ اس کا وجود قائم رہتا ہے اور اس میں کوئی تغیرِ و تبدل نہیں آ سکتا۔ بہرحال معاشی لحاظ سے کوئی ایسا مخصوص طبقہ نہیں، جسے کارکنوں کا طبقہ کہا جا سکے۔ یہ صرف نظریہ کاروں کی ایجاد ہے، جن کی نگاہ ہمیشہ انگلستان کے کارخانوں کے مزدوروں پر لگی رہتی ہے---- کوئی صنعتی، غیر زرعی معاشرہ صرف عبوری دور میں قائم رہ سکتا ہے---- اور اس کے بعد وہ تمام ثقافتوں پر (اپنی حاصل کردہ معیشت کو) ہمیشہ کے لیے حاوی کر دیتا ہے۔ سیاسی رہنما اس سے استفادہ حاصل کر کے اپنی جماعتیں تشکیل دینے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ درحقیقت کارگاہوں اور شمار خانوں میں لاتعداد نوعیت کی خدمات موجود ہیں۔ بندرگاہوں کی گودیوں میں سامان اتارنے چڑھانے والے، سڑکوں، کانوں کے گڑھوں، کھیت کے میدانوں اور وادیوں میں کارکنوں کی بے شمار گنجائش موجود ہے۔ یہ شمار کا عمل، حمل و نقل، پیغام رسانوں کی دوڑ بھاگ، ہتھوڑا چلانے والوں کی خدمت گزاری اور ازراہ کرم گستری کسی کا کام کر دینے میں وہ عنصر شامل نہیں ہوتا جس سے زندگی میں مقام کی بلندی پیدا ہو، یا کارکن عزت و وقار سے اپنی محنت کا ثمر حاصل کرے اور اس کے نتیجے میں اسے وہ مسرت حاصل ہو جو اس استفادہ محنت کے ساتھ مخصوص ہے، کسی افسر یا ملازم کے فرائض منصبی کا رتبہ، یا کسی انجنیئر کی ذاتی کامرانیاں، یا کسی مہتمم یا سوداگر کی اپنے شعبے میں نمایاں کامیابی---- مگران امور کے قطع نظر بھی ان تمام امور کا باہمی موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ کام میں استعمال کیا جانے والا دماغ، یا جسمانی قوت، خواہ وہ دیہی مقام پر ہو یا بڑے شہر میں، اس عمل کی شدت یا دورانیہ، ہر اس شے کو اپنے زیر عمل لے آتی ہے، جو کھیتوں کے مزدور، بینک کے کلرک، یا درزی کے ہاتھ کی محنت کی صورت میں ہو۔ یہ تمام لوگ مختلف انواع کے معاشی میدانوں کے شاہسوار ہیں، اور میں بالتکرار کہتا ہوں کہ یہ صرف دور آخر کے سیاسی عمل کا نتیجہ ہے کہ ان تمام کو مقبول عام نعروں کی بدولت احتجاجی اجتماع میں یکجا کر لیا جاتا ہے۔ کلاسیکی دور کے غلام کا اس کے برخلاف دستوری قانون کے تحت---- جس حد تک کہ شہری مقننہ کا دخل تھا، وجود ہی تسلیم نہ کیا جاتا تھا---- مگر معاشیات کی رو سے وہ زرعی کارکن ہو سکتا ہے، یا ہنرمند شمار ہو سکتا ہے، یا ڈائریکٹر ہو سکتا ہے، یا وہ ایسا سوداگر ہو سکتا ہے جو بہت بڑے سرمائے کا مالک ہو، وہ محلات کا مالک ہو سکتا ہے یا دیہات میں اس کی بڑی بڑی عمارتیں ہو سکتی ہیں اور خود اس کے پاس متعدد ماتحت کارکن ہو سکتے ہیں---- جن میں آزاد بھی شامل ہو سکتے ہیں اور اس کے باوجود وہ بالآخر کیا بنے گا۔ اس کا اندازہ رومی دور کے عاقبتہ الامر میں ہو گا۔

۳

ہر ثقافت کے دور عروج میں معاشی زندگی کا آغاز ہوتا ہے' جس کی صورت مستقل ہوتی ۔ ۔ اس دور میں کسان کی زندگی کھلے میدانوں میں بسر ہوتی تھی۔ شہری زندگی کا تجربہ اس وقت تک وجود میں نہیں آیا تھا' جو کہ باشندوں کو دیہات' قلعوں' محلات' خانقاہوں' مندروں' حجروں سے باہر نکالتا ہے۔ وہ شہر نہیں بلکہ منڈی ہے جو صرف ارباب مفاد کا باہمی ملاقات کا مخصوص مقام ہے۔ اس نے بھی بہت جلد ایک مخصوص مذہبی اور سیاسی مقام حاصل کر لیا۔ مگر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ منڈی کی کوئی اپنی بھی حقیقی زندگی ہوتی ہے۔ اس کے باشندے اگر صنعت کار بھی ہوں' یا تاجر ہوں' وہ خود کو کسان ہی سمجھیں گے یا وہ یہ سمجھیں گے کہ زراعت ہی کی نوعیت کا کوئی اور کام ہے جو وہ انجام دے رہے ہیں۔

وہ عمل جو مذکورہ زندگی سے علیحدگی کا موجب ہوتا ہے' وہ اشیاے صرف ہیں' یا اشیائے صرف کی حمل و نقل ہے۔ اسی عمل سے یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ اشیا صرف قرب و جوار کے کھیتوں سے ایک جگہ لا کر جمع کی جائیں یا انھیں دور دراز علاقوں سے لایا جائے۔ اشیاے صرف کی موجودگی ہی دو مختلف طبقات میں رشتہ پیدا کرتی ہے' جن میں سے ایک ان اشیا کی پیداوار سے منسلک ہے اور دوسرا ان کے صرف سے۔ ایک کسان اپنی گائے لے کر منڈی میں آتا ہے۔ ایک خاتون اپنی عمدہ مصنوعات کو الماری میں سجاتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ایک مرد اپنے عالم کو اشیا کا سلیقہ دار ہے' اس میں قبضے یا "ملکیت" کی اصطلاح ہمیں واپس اس دور میں لے جاتی ہے' جہاں جائیداد کی کوئی حد نہیں تھی' جس میں متعلقہ مخصوص وجود------ اس کے بغیر کوئی اور نہیں------ مخصوص بنیادوں پر ظہور میں آیا۔ اس دورمیں تبادلہ اشیا سے مراد یہ ہے کہ اشیا ایک دائرے سے نکل کر دوسرے دائرے میں داخل ہوں۔ ان کی قدر و قیمت زندگی کے حوالے ہی سے متعین کی جاتی ہے اوراس کے لیے ایک تدریجی پیمانہ وضع کیا جاتا ہے جس میں مدت یا دور کا بھی دخل ہوتا ہے اس میں نہ تو قدر و قیمت کا دخل ہوتا ہے۔ اور نہ معینہ رقم کا جسے زر سے منسلک کیا گیا ہو۔ کیونکہ سکے بھی اشیا ہی میں شامل ہیں۔ سونے کو برتر حیثیت اس کی کمیابی اور فنا نا پذیری (بقا) کی وجہ سے حاصل ہوئی ۔

اس تبادلہ اشیا کے عمل اور توازن کے دوران بیوپاری محض دخل انداز کے طور شامل ہوتا ہے ۔ منڈی میں تخلیقی معیشت کے حریص ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہیں' مگر ان مقامات پر جہاں جہاز یا کاروان اپنا سامان اتارتے ہیں' تجارت صرف دیہی ذرائع حمل و نقل کے ظاہر ہوتی ہے ۔ یہ معیشت کی ازلی صورت ہے۔ شہروں سے دور پھیری والے گھومتے پھرتے تھے' اور بعض غیر ملحق علاقوں میں تبادلہ اشیا کا کاروبار کرتے تھے' اور نجی کاروبار میں ہر وہ شخص شامل ہو جاتا' جو شہر کی عملی زندگی میں کسی فعالیت میں شامل نہ ہوتا۔

شہروں کے آغاز کے ساتھ ہی ایک مختلف قسم کی زندگی کا آغاز ہو جاتا۔ جوں ہی مارکیٹ قصبے کی شکل اختیار کرتی' تو یہ صرف دیہات سے شہروں کی طرف اشیا فراہمی کے مراکز نہ رہتے' بلکہ ایک دوسری دنیا دیواروں کے احاطوں کے اندر تعمیر ہو جاتی' جہاں پر زندگی کی نمو ماسوائے معروض اور ذرائع کے کسی اور

حیثیت کی حامل نہیں۔ یہاں سے ایک اور ندی گھومنے لگتی ہے۔ فیصلہ کن امر یہ ہے کہ شہری انسان کوئی شے پیدا نہیں کرتا۔ اس کا قشر ارض اور ان اشیا کے ساتھ کوئی داخلی رشتہ نہیں' جو اس کے ہاتھ سے گزرتی ہیں۔ اس کی حیات ان سے وابستہ نہیں' وہ ان کا خارج سے مشاہدہ کرتا ہے اور صرف اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے ان کو جانچتا ہے۔

اس عمل کی وجہ سے اشیا مصنوعات کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں' یا اشیائے مبادلہ کی حیثیت اپنا لیتی ہیں اور اب انسان اشیا کی بجائے زر کے متعلق سوچنے لگتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ایک خالص توسیعی کیفیت ظہور میں آتی ہے اور فکر اشیا کی مادی حیثیت کی بجائے تجریدی ریاضی کی صورت اختیار کرنے لگتی ہے بلکہ ماحول کا تصور بھی تجریدی ہو جاتا ہے' تجریدی زر تجریدی اعداد ہی کے مطابق ہوتی ہے ۔ دونوں ہر طرح سے غیر نامی ہیں۔ معاشی تصویر کلی طور پر مقداریت تک محدود ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اشیا کی اہم خصوصیت ان کا معیار ہوتا ہے۔ قدیم دور میں کسان کے لیے اس کی گائے' اپنی حیوانی حیثیت کا مظہر تھی' اور ثانوی دور میں تبادلہ اشیا کا ایک ذریعہ ثابت ہوئی۔ مگر صحیح شہری کے معاشی تصور کے مطابق دنیا میں صرف تجریدی زر کی قدر موجود ہے' جو شے اس کے سامنے موجود تھی' وہ تو ایک گائے تھی' جو اس کے نزدیک ایک بینک نوٹ ہی تھا۔ جب کوئی انجینئر کسی آبشار کو دیکھتا ہے' وہ اسے ایک فطری شاہکار کی بجائے' توانائی کا ایک بڑا ذخیرہ سمجھتا ہے' جس سے ابھی تک کام نہیں لیا گیا۔

تمام جدید نظریات زر میں یہ غلطی موجود ہے کہ وہ اپنا آغاز قدر کی علامت سے کرتے ہیں' بلکہ ذریعہ ادائیگی کی مادیت کو معیار بناتے ہیں مگر معاشی فکر کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ فی الحقیقت زر بھی عدد اور قانون کی طرح فکر کے زمرے میں آتے ہیں' جس طرح کہ قانونی اور ریاضیاتی فکر کا اپنا وجود ہے اسی طرح معاشیاتی فکر بھی تمام دنیا میں پائی جاتی ہے۔ کسی گھر کے حسی تجربے کی بنا پر ہم اپنے مزاج یا ذہنی تجربات کی روشنی میں ہم مختلف تصورات پیدا کرتے ہیں۔ ایک سوداگر کو' ایک جج کو یا ایک انجینئر کو اور کچے چھتے کے حوالے سے ایک قانونی مقدمے کا تصور ابھرتا ہے' یا یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ مکان کہیں گر ہی نہ جائے۔ ہر شخص اپنے پیشے یا سابقہ تجربے کے حوالے سے سوچتا ہے۔ اب اگر اسے زر کے حوالے سے جانچا جائے تو ہم ریاضی کے میدان میں داخل ہو جائیں گے ۔ لیکن اگر تجارت کے حوالے سے غور کیا جائے تو ہم حساب کتاب میں مشغول ہو جائیں گے۔ زر کے حوالے سے کسی شے کی قدر' عددی قدر ہے' جو کسی حساب و کتاب کے معیار ہی سے متعین ہو گی' جس طرح ایک عدد فی نفسہ اسی طرح درست قدر بھی فی نفسہ کو ایک شہری باشندہ (جس کی اپنی جڑیں مشکوک ہیں) سب سے پہلے متعین کرے گا۔ کیونکہ ایک کسان کے لیے تو قدر کا معاملہ مستقل نہیں بلکہ عارضی ہوتا ہے' اور جب بھی وہ اپنی پیداوار کا کسی نئی شے سے تبادلہ کرے گا تو اس کی قیمت میں تبدیلی آتی رہے گی۔ جو شے وہ استعمال نہیں کرتا یا حاصل کرنا ہی نہیں چاہتا اس کے لیے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ صرف شہری باشندوں کے لیے معروضی اقدار کا وجود ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک اشیا کی قیمت کا معیار اس کی ذاتی ضروریات پر مبنی نہیں۔ اگرچہ ہر شخص کا ایک اپنا نظام قدر ہوتا ہے اور اس کے لیے اپنے ذخیرہ اقدار کی مختلف جزئیات بھی ہوتی ہیں' اور اسی کے مطابق وہ منڈی میں رائج قیمتوں کو سستا یا مہنگا قرار دیتا ہے

جبکہ قدیم بنی نوع انسان اشیا کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرتی تھی اور اس میں محض استدلال ہی اہم نہ ہوتا تھا' بعد کی نسلیں اشیا کی قدر کا تعین کر لیتی ہیں اور اس امر کے لیے غیر مشروط اور واضح معیار (پیمانے) مقرر کر لیتی ہے' اب گائے کا معیار قدر سونا ہے' سونے کا معیار گائے نہیں۔ اب نتیجے کا اظہار تجریدی انداز میں کیا جاتا ہے' یعنی اشیا کی قیمت کا تعین ہو جاتا ہے۔ قدر و قیمت کا یہ معیار اپنے علامتی اظہار کے لیے کیا صورت اختیار کرتا ہے' اس کی تحریری یا تقریری صورت کیا ہو گی یا اسے کسی عددی صورت میں ظاہر کیا جائے گا؟ اس کا انحصار متعلقہ ثقافت کے اسلوب پر ہے۔ کیونکہ ہر ثقافت میں زر کے پیداواری انداز مختلف ہیں۔ اس کے ظہور کے لیے تمام ثقافتوں کی مشترکہ شرط صرف شہری آبادی کا وجود ہے' کیونکہ یہی لوگ ہیں جو معاشی اصطلاحات کے تحت سوچتے ہیں' اور یہ اسی کا مخصوص کردار ہے' جو یہ فیصلہ کرتا ہے۔ کیا یہ قدر کی علامت ادائیگیوں کے ذریعے کی خدمت ادا کر سکتی ہے یا نہیں۔ کلاسیکی سکے اور بابلی چاندی یہ خدمت بجا لاتی تھی جبکہ مصر میں تانبے کا مرطِل (مصر میں تانبے کو وزن کر لیا جاتا تھا) تبادلے کا معروف ذریعہ تھا۔ مگر اس کے باوجود نہ اسے زر کی حیثیت حاصل تھی اور نہ اسے بطور علامت زر استعمال کیا جاتا تھا۔ دور حاضر کے مغربی اور چین میں مروج بینکوں کے جاری کردہ نوٹ ۔ ذریعہ تبادلہ تو ہیں' مگر معیار نہیں۔ چونکہ ہماری معیشت میں طویل عرصے سے قیمتی دھاتوں کے سکوں کا عرصہ دراز سے استعمال مروج رہا ہے' اس لیے ہم بہت جلد دھوکا کھا جاتے ہیں۔ دور حاضر کے سکے صرف کلاسیکی رواج مضروبات کی نقل ہیں' اور اس طرح اصلات زر کو بھی قیمت تسلیم کر لیتے ہیں' اور اس طرح ان کی قدر و قیمت بھی مسلمہ قرار پاتی ہے۔

اس طریق فکر کا نتیجہ یہ ہے کہ قدیم مملوکات جو زندگی اور اراضی سے وابستہ تھیں' دولت سے بدل گئیں' جو حرکت پذیر' اور صفاتی طور پر غیر معین ہے۔ یہ اشیا کی شکل میں نہیں ہوتی' بلکہ اس میں شامل ہوتی ہے۔ اس کی اپنی حیثیت ہوتی ہے' یہ خالص عددی مقدار ہے جس سے زر کی قدر کا معیار متعین ہوتا ہے ۔

چونکہ مرکز فکر یعنی شہر' زر کی منڈی اور اقدار کا مرکز قرار پاتا ہے۔ اس لیے اس میں دولت کی اشیا کی مختلف نہریں بہنے لگتی ہیں' اور اس کے ساتھ ہی تجار بھی جو معاشی زندگی کے آقا سمجھے جاتے ہیں' ظاہر ہونے لگتے ہیں اور بازار پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ زر کے متعلق فکر کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ تجارت یا کاروبار کی صورت میں فکر کا عمل----- اس میں اراضی کی پیداواری معیشت کو بطور مفروضہ تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ یہ ہمیشہ ابتدا ہی سے اکتسابی ہوتی ہے کیونکہ کوئی تیسرا راستہ ہی موجود نہیں۔ اکتساب' منفعت' سٹہ بازی' منافع کی نشاندہی کرتے ہیں' جو اشیا سے گاہک تک پہنچتے پہنچتے حاصل کر لیا جاتا ہے۔ اسے عقلی لوٹ کھسوٹ کا نام دیا جا سکتا ہے----- اور اسی وجہ سے قدیم دور کے کسانوں کے طبقے پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ صرف اس کے بعد کہ ہم شہری حلقوں کے معاشی تصور کو اچھی طرح سے سمجھ لیں' تو ہم اس کی روح تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے کاروبار نہیں کرتا بلکہ اس کا مقصد فروخت ہے' جس کے بدلے میں وہ زر حاصل کرتا ہے ۔ تجارتی نقطہ نظر بتدریج ہر قسم کی فعالیت پر آمادہ کر لیتا ہے۔ دیہاتی شخص جو اپنی اشیا کے نقل و حمل کے متعلق متفکر تھا' اب خرید و فروخت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ قدیم دور کا تاجر

بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں' مگر صانع اور صارف کے مابین تبادلہ اشیا کے ساتھ' زر کا لین دین بھی اسی طرح شروع ہو جاتا ہے' جس طرح کہ دو مختلف دنیاؤں کے مابین تعلقات قائم ہوں۔ اسی سے فریق ثالث وجود میں آ جاتا ہے جسے "دلال" کہا جاتا ہے جس کی فکر کو تجارت میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ صنعت کار کو مجبور کرتا ہے کہ اسے پیش کش کرے اور صارف کو آمادہ کرتا ہے کہ اس سے مشورہ طلب کرے' وہ ثالثی کا عمل ذاتی اجارہ داری میں تبدیل کر دیتا ہے' اور اس کے نتیجے میں معاشی برتری حاصل کر لیتا ہے' اور دوسرے دونوں عوامل کو موزونیت کے لیے مجبور کرتا ہے' اس میں اس کا ذاتی فائدہ ہے کہ وہ مصنوعات کو اپنے حساب کے مطابق تیار کرنے اور اپنی پیش کش کے دباؤ کے تحت انھیں سستا رکھے۔

وہ شخص جو اس طریق فکر کا ماہر ہے' وہی زر کا مالک بھی ہے ۔ تمام ثقافتوں میں ارتقا کا عمل' یہی راستہ اختیار کرتا ہے۔ لانسی اس اپنے ایک خطبے میں ہمیں اطلاع فراہم کرتا ہے کہ مکئی کے سوداگر اگر سٹہ بازی کے مرتکب ہوتے ہیں اور پیرزی اوس میں ہر روز یہ افواہیں پھیلا دیتے ہیں کہ غلے سے لدا ہوا ایک جہاز تباہ ہو گیا ہے یا جنگ چھڑ رہی ہے تاکہ لوگوں میں خوف و ہراس پھیلے۔ یونانی ۔ رومی ادوار میں بھی یہ طریقہ اختیار کیا جاتا تھا کہ اراضی پر کاشت کا عمل ختم کر دیا جائے یا درآمدی اشیا کو کہیں راستے میں روک لیا جائے اور مصنوعی طریقے سے اشیا کی قیمت میں اضافہ کر دیا جاتا۔ مصر کی جدید سلطنت کے دور میں ٹیچک پر امریکی طرز کا بٹا لگا کر قیمت میں اضافہ کر دیا جاتا ہے' یہ عمل موجودہ مغربی بینک کاری کے مشابہ ہے ۔ کلیمونن نے جو سکندر اعظم کا مصر میں منتظم تھا' محض کھاتہ بہی میں تبدیلی کی بدولت مکئی کا تمام غلہ اپنی تحویل میں لے لیا اور اس کے نتیجے میں یونان میں قحط پڑ گیا' اور اس عمل سے اس نے بے حد منافع کما لیا۔ آپ معاشیات کی جو چاہیں اصطلاحات استعمال کریں' مطلب یہی نکلتا ہے کہ یہ لوگ شہری سرمائے کے ہاتھوں میں محض شطرنج کے مہرے تھے۔ یہ طریق فکر جلد ہی تمام شہری آبادی پر غالب آ جاتا ہے اور اس طرح ہر وہ شخص جو معاشی تاریخ میں کوئی بھی سنجیدہ کردار ادا کرتا ہے' اس کا غلام ہو جاتا ہے۔ کسان اور قصباتی باشندے نہ صرف دیہاتی اور شہری زندگی میں مختلف الخیال ہیں بلکہ زر کے ارتکاز اور قبضے میں بھی ان کے تصورات مختلف ہیں۔ ہومر کے دور کی شاندار ثقافت اور شہزادگان کی علاقائی عدالتیں' ان لوگوں کے ساتھ ہی عروج و زوال کا شکار ہوتی رہیں۔ ہم آج بھی بعض خاندان کی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ وہ دیہات میں رہائش کے باوجود بورژوائی تصورات کے زیر اثر' تمام شہری سہولتوں کو اپنے گھروں میں منتقل کر رہے ہیں۔ بعض اشیا باہر سے آ رہی ہیں اور ان کی قیمت ادا کی جا رہی ہے ۔ ہر طرح سے برتر معیشت شہری معیشت ہے۔ عالمی معیشت اور ترقی یافتہ تہذیبوں کی معیشت کو عالمی شہری معیشت ہی کا نام دینا چاہیے۔ اب تو ہر معیشت کی قضا و قدر ۔ کا فیصلہ زر کی عالمی منڈیوں ہی میں ہوتا ہے جو چند مقامات پر واقع ہیں----- بابل اور تھیبس میں تھیں' اور روم اور بازنطین اور بغداد میں بھی تھیں۔ موجودہ دور میں لندن' نیویارک' پیرس اور برلن زر کے اہم مراکز ہیں۔ علاوہ ازیں بعض اور مراکز موجود ہیں' جو چھوٹے پیمانے پر کام کرتے ہیں ان کو علاقائی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے دائرہ ہائے کار مختصر ہیں' مگر انھیں اس امر کا احساس نہیں کہ ان کا انحصار عالمی مراکز پر ہے' اور ان کی کوئی آزادانہ حیثیت نہیں۔ آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ زر' معاشی توانائی ہی کی ایک حیثیت ہے' جس میں حکمران طبقے ہی کا عزم سیاست' معاشرت' تکنیک' ذہن اور

تخلیقی قوت پر حاوی رہتا ہے' اور زندگی کے مکمل ہیولے کی کیفیت اسی پر مرکوز رہتی ہے۔ شاہ بالکل درست کہتا ہے کہ رجائی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ تمام دنیا کا انحصار زر پر ہے۔ یہی ہماری تہذیب کی خصوصیت ہے۔ دو اشیا (زر اور زندگی) کو علیحدہ علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ دولت ایک ایسا چبوترہ ہے جہاں سے زندگی کو مختلف معاشرتوں میں تقسیم کیا جاتا ہے' بلکہ یہ زندگی ہے...... جس شے کو یہاں تہذیب کہا گیا ہے' یہ ثقافت کی وہ سطح ہے جہاں پر روایت اور تشخص اپنے فوری تاثر سے محروم ہو جاتے ہیں اور ہر وہ تصور جو حقیقت کا رنگ اختیار کر سکتا ہو' اسے زر کی اصطلاحات کی مدد سے بیان کیا جاتا ہے۔ ابتدائی دور میں اس شخص کو امیر سمجھا جاتا ہے جس کے ہاتھ میں اقتدار ہوتا۔ اب وہ اس لیے بااختیار ہے کہ اس کے قبضے میں "زر" کی قوت ہے۔ ذہانت اسی وقت اقتدار حاصل کر سکتی ہے جب دولت اسے اس مقام پر پہنچا دے۔ جمہوریت بھی صرف اسی صورت میں چل سکتی ہے جب سیاسی قوت کے ساتھ زر کا اضافہ کیا جائے۔ اگرچہ ہر ثقافت کی معاشیاتی تاریخ اس اختلاف کا مشاہدہ کرتی ہے جسے کسی نسل کی ارضی بنیادوں پر قائم روایات نے زر کی روح کے خلاف چھیڑ رکھا ہے۔ کلاسیکی عہد میں کسانوں کی وہ جنگیں (۷۰۰ - ۵۰۰ ق م) اور مغرب میں (۱۶۵۰ - ۱۴۵۰) اور مصر میں (قدیم حکومت کے خاتمے کے ساتھ) ردعمل کی ایک صورت تھی جبکہ خون نے زر کے خلاف زرعی اراضی کے حق میں صدائے احتجاج بلند کی ۔ شین کی یہ تنبیہ کہ "جو شخص زمین کو الٹ پلٹ کرتا ہے وہ اسے خاک میں تبدیل کرتا ہے۔" ایک ایسے خطرے کی نشاندہی کرتی ہے جو تمام ثقافتوں کے لیے مشترک ہے۔ اگر دولت کسی قبضے کو زیر تسلط نہیں لا سکتی' تو یہ اپنے آپ کو ان شریفانہ تصورات پر تعریض کرتی ہے' جو قابض مزارعان سے متعلق ہیں۔ یہ صورت حالات اس وقت قائم رہتی ہے جبکہ زرعی خاندانوں میں افراد کی تعداد اس قدر زیادہ ہو جائے کہ خاندان کے تمام ذرائع بھی قابل کاشت زرعی اراضی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے کوئی منفعت حاصل نہ کر سکیں۔ جہاں تک دولت کے مزاج کا تعلق ہے متحرک زر' ہر شے کو متحرک بنا دیتی ہے ۔ عالمی معاشیات کا تعلق معاشی اقتدار سے ہے جو قطعی طور پر ایسی فکر ہے' جس کا اراضی سے کوئی تعلق نہیں' اور اسے غیر قطعی اور تغیر پذیر بنا دیا گیا ہے ۔ ہنی بال کے دور ہی سے کلاسیکی فکر زر نے تمام شہروں کو سکوں میں تبدیل کر دیا اور تمام آبادی کو غلام بنا دیا اور اس طرح دونوں کو سرمائے میں تبدیل کر دیا' جو ہر جگہ سے روم میں منتقل کیا جا سکتا تھا اور اسے روم سے باہر بطور قوت استعمال کیا جا سکتا۔

فاؤستی نظام زر تمام براعظموں کو ایک دوسرے پر کھول دیتا ہے۔ "آبی توانائی جو بڑے بڑے دریاؤں کے طاس مہیا کرتے ہیں اور وسیع علاقوں میں رہائش پذیر افراد کے عضلات کی قوت' کوئلے کے ذخائر' محفوظ جنگلات' قوانین فطرت' ان تمام اشیا کو مالی قوت میں تبدیل کر دیا جاتا ہے' جسے کسی نہ کسی طرح سے صحافت یا انتخابات یا میزانیہ یا افواج میں مرتب کر لیا جاتا ہے تاکہ ان کے مالکوں کے منصوبے تکمیل پذیر ہوں۔ ایسے تمام مالی ذرائع جو ابھی تک ایسی صورت موجود ہیں کہ ان کے متعلق کسی نے مطالبہ پیش نہیں کیا' ان کے لیے ہر روز نئے نئے تصورات اقتدار پیش کیے جا رہے ہیں۔ جیسا کہ جان گیبریل بورک مین کہتا ہے کہ "سونے کی خفتہ روح" اور اسی قبیل کی دیگر اشیا بذات خود کسی معاشی اہمیت کی کسی طور بھی حامل نہیں۔

۴

جیسا کہ ہر ثقافت کے فکر زر کے متعلق اپنے اپنے انداز ہیں' اسی طرح اس کی اپنی علامات زر بھی ہیں' جن کے ذریعے اس کی قدر کے اصولوں کا معاشی میدان میں اظہار ہوتا ہے۔ یہ امر فکر کو حقیقت کا رنگ دینے کا ذریعہ ہے اور اس کی اہمیت 'بیان کردہ' تحریر کردہ یا شمار کردہ اعداد و شمار کے مساوی ہے۔ اگر اس کے علاوہ کوئی اور ریاضیاتی علامات کا نظام ہو' تو اسے بھی شامل کر لیا جائے' یہی وہ تحقیق کا میدان ہے جس میں ابھی تک کوئی کام نہیں ہوا۔ نہ صرف یہ کہ بنیادی تصورات درست انداز میں وضاحت سے بیان نہیں کیے گئے' اس لحاظ سے اب یہ قطعاً" ناممکن ہو گیا ہے کہ ان تصورات اور اس طریق کار کی مکمل وضاحت کی جا سکے' جو مصر کے مبادلہ اشیا اور ہنڈی کے نظام میں مروج تھے۔ ہمیں بابل کے نظام بینک کاری کی تفصیلات معلوم نہیں۔ اور چین کے کھاتہ بہی کے نظام سے بھی ہم بے خبر ہیں اور یہودیوں' پارسیوں اور ہارون الرشید کے دور کے عربوں کے سرمایہ دارانہ نظام کی جزئیات سے بھی ہم آگاہ نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ شمسی نظام زر اور فاؤستی نظام زر کا باہم موازنہ کیا جائے' ایک کو بطور قدر اور دوسرے کو عملی حیثیت سے استعمال کیا جائے ۔

معاشیات میں بھی' دوسرے امور کی طرح' کلاسیکی باشندے اپنے اردگرد کی دنیا کو گھومتے پھرتے' جگہ بدلتے' نقل مکانی کرتے' سواری کرتے' نشانہ بنتے اور ایک دوسرے کو تباہ کرتے دیکھا۔ دیماء قرائطس نے فطرت کے متعلق ایسا ہی تصور پیش کیا ہے۔ انسان بھی دوسری تجسیمات کی طرح ایک جسم ہی تھا بالکل اسی طرح جس طرح اپالو کا مجسمہ یا کوئی دیوتا ہو۔ شہر میں بے شمار انسانی گروہ مقیم تھے' اس لیے اس کا رتبہ انسان سے برتر تصور ہوتا تھا۔ انسانی ضروریات مادی اشیا ہی سے پوری ہوتی تھیں۔ اس لیے زر بھی ایک مادی شے ہی تھی۔ ۶۵۰ء کے قریب ایک ڈورک مندر میں پتھر کا ایک مجسمہ دستیاب ہوا۔ اس کے ساتھ ایک اور پیکر بھی ملا جو گولائی میں تراشا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ دھات سے بنایا گیا سکہ ہے۔ اس پر خوبصورت شبیہہ کندہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدر بطور معیار مدت سے قائم ہے۔۔۔۔۔ فی الحقیقت یہ نظام بھی اتنا ہی قدیم ہے جتنی کہ کوئی ثقافت قدیم ہو۔۔۔۔۔ ہومر کے بیان کے مطابق سونے کے وزن کرنے کے لیے ٹیلان معیار تھا۔ سونے اور دوسرے سامان آرائش میں وزن سے ہی قدر کا تعین کیا جاتا تھا۔ اچیلس کی ڈھال کی قیمت دو ٹیلان سونا بیان کی جاتی ہے اور رومیوں کے متاخر دور تک سونے اور چاندی کے ظروف کا وزن بیان کیا جاتا تھا

کلاسیکی دور کے مجسمے کی شکل کے سکے کی دریافت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زر کی قیمت بہت اونچی رکھی گئی تھی۔ ہمیں ابھی تک صحیح اندازہ نہیں ہوا کہ حقیقی معیار کیا تھا' اور درست اہمیت کا تعین کیا تھا۔ لیکن اس سے انسانی کامرانیوں کی تاریخ کا ضرور پتہ چلتا ہے۔ ہمیں اس نوعیت کے سکے مختلف مقامات پر دستیاب ہوئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اپنے گھروں کے صحنوں میں انھیں دفن کر دیتے تھے۔ اس سے زیادہ معلومات ہماری بساط سے باہر ہیں۔ ہم اس شکل کی نقل تو تیار کر سکتے ہیں مگر ہم اس کی اس دور میں مالی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ سکہ سازی' زر کی طرح ایک خالص کلاسیکی اختراع ہے۔ یہ صرف

اقلیدسی ماحول ہی میں ممکن تھا۔ مگر جب یہ نظریہ وجود میں آ گیا' تو تمام ماحول پر چھا گیا۔ اس نوعیت کے تصورات مثلاً آمدنی' ذرائع' قرضہ' سرمایہ' وغیرہ سے کلاسیکی شہروں میں جو مراد لی جاتی تھی' وہ اس سے قطعاً" مختلف تھی جو ہمارے ہاں دور حاضر میں مروج ہے۔ وہ اسے کسی نقطے سے اشعاع توانائی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کی ان سے مراد قیمتی اشیا پر دست تصرف اور قبضہ تھا۔ دولت سے مراد زر نقد کی متحرک فراہمی تھی' جس میں قیمتی اشیا کی جمع تفریق سے تبدیلی ہوتی رہتی ہے' اور قبضہ اراضی کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا------ کیونکہ کلاسیکی نقطہ نظر کے مطابق دونوں عوامل قطعی طور پر ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ کسی کو نقد رقم ادھار پر اس توقع سے دی جاتی کہ وہ بھی اس کی واپسی اسی طرح زر نقد کے حوالے سے کرے گا۔ کیٹی لائن کو اس لیے غریب سمجھا جاتا تھا' کہ اس امر کے باوجود کہ وہ وسیع و عریض قطعات اراضی کا مالک تھا' اسے کوئی شخص نقدی کی صورت میں ادھار دینے کے لیے تیار نہ تھا' جس کی مدد سے وہ اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کر سکتا' اور رومی سیاست کاروں کے ذمے ادھار کی رقومات بہت زیادہ تھیں جن کی حتمی ضمانت کے لیے ان کی مملوکہ اراضی ناکافی تھی' چنانچہ ان کو اپنی غیر منقولہ جائیداد بھی رہن میں رکھنی پڑتی۔

اس کی روشنی میں اور صرف اس کی روشنی میں ہمیں کسی حد تک ثاریزن ثانی کے عہد میں امرا کے قتل عام' اور رومی جلاوطنی کا معاملہ (جس کا مقصد متعلقہ قبیلے کی کثیر دولت پر قبضہ کرنا تھا) اور مقدس جنگ کے دوران فونیقیوں کا دالفی خزائن کو پگھلا دینا' اور کارتھیجیوں کے فنون لطیفہ کے شاہکاروں کا میوتھ کے ہاتھوں تباہی سے دوچار ہونا' اور بعد میں قیصر کی طرف سے روم میں نذر کی پیشکش' یونان میں سلا' ایشیائے کوچک میں بروطوس اور کاسی اوس' نے فنون لطیفہ کی کوئی پرواہ نہ کی۔ جب انھیں دھاتوں اور دندان فیل کی ضرورت تھی ۔ مجسمے اور جہاز جن پر جنگ کے دوران قبضہ کر لیا جاتا تماشائیوں کی نگاہ میں زر نقد کی حیثیت کے حامل تھے۔ مومسین اس امر کی کوشش کرتا رہا کہ اسے وہ مقام معلوم ہو جائے جہاں پر رومیوں نے وہ قیمتی اشیا ذخیرہ کی تھیں جو اس کے آباؤ اجداد کی یادگار تھیں اور بالجبر اتار لی گئی تھیں اور اس کے جہاز پر سے بھی تمام سامان اتار کر لے گئے تھے ۔ کلاسیکی اثاثہ جات کے لیے یہ ضروری نہ تھا کہ وہ زیر قبضہ ہوں مگر زر نقد کے ڈھیر لگانا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ زر نقد کی کلاسیکی منڈی ہمارے بازار حصص کی طرح مرکزی حیثیت کی حامل نہ تھی۔ قدیم شہر تھیسس اس لحاظ سے منفرد ہے کہ تمام دنیا کی زر نقد کا اہم حصہ وہاں جمع کیا جاتا تھا اور یہ بھی معلوم ہو کہ قیصر کے زمانے میں کلاسیکی دنیا کا نصف سے زائد سونا روم میں جمع تھا۔

مگر تقریباً" ہنی بال کے دور سے یہ دنیا غیر محدود طبقہ امرا کی حکومت کے زیر نگیں ہو گئی۔ اس کے دور میں سونا' قیمتی نوادرات اور فن پارے طلب کے مقابلے میں بہت کم رہ گئے۔ اس لیے یہ سوچ بچار ہونے لگی کہ کون سی نئی اشیا ایسی ہوں جنھیں زر کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔ انسان کی آنکھیں غلاموں پر مرکوز ہو گئیں' جو ایک دوسری وضع کا جسد تھا۔ مگر اسے شے سمجھ لیا گیا اور اس کی کوئی شخصی حیثیت نہ تھی' اور اس لیے اسے نقد مال کی حیثیت دی جا سکتی تھی۔ تمام تاریخ معاشیات میں کلاسیکی غلامی اپنی نوعیت کی بے مثال حیثیت کی حامل ہے۔ اب زر نقد کے اوصاف ایک زندہ شے میں منتقل کر دیے گئے۔ لہٰذا بعض علاقوں میں انسانی منڈیاں کھل گئیں' اور سرکاری عمال کے لیے استحصال کا ایک اور ذریعہ نکل آیا' اور دہقان بھی قیمتی دھاتوں کی طرح دلچسپی کا سامان بن گئے۔ ایک عجیب و غریب نوعیت کی دہری قیمت کا رواج ہوا۔

غلاموں کی تو منڈی میں قیمت تھی مگر زمین اور اراضی کی کوئی قیمت نہ تھی۔ وہ ایسے لوگوں کی قسمت بنانے کے لیے کام کرتا' جنھوں نے اپنی جیب سے کچھ بھی خرچ نہ کیا تھا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ روم میں غلاموں کی تعداد بہت زیادہ تھی' اور ان کی اس موجودگی کی ماسوائے اس کے کوئی اور وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ عام حالات میں کسی شخص کو صرف اسی قدر غلاموں کی ضرورت ہوتی ہے' جن کو وہ کام پر لگا سکے' اور اس کے مقصد کے لیے معمولی تعداد ہی کافی تھی کیونکہ جنگی قیدی بھی بڑی تعداد میں موجود تھے' اور وہ لوگ بھی موجود تھے جو مقروض ہونے کی وجہ سے عدالتوں کی طرف سے ان کی تحویل میں دے دیے گئے تھے۔ چھٹی صدی میں بدنظمی کا آغاز ہوا جبکہ خرید کردہ غلاموں کی درآمد ہونے لگی۔ ان غلاموں اور اجرتی مزدوروں کے مابین فرق شروع شروع میں صرف سیاسی اور قانونی تھا' اور اس کی نوعیت معاشیاتی نہ تھی۔ چونکہ کلاسیکی معیشت جامد تھی' متحرک نہ تھی اور انھیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ توانائی کے عام ذرائع کو کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے' اس لیے رومی دور کے غلاموں کو کام میں نہیں لگایا جا سکتا تھا' بلکہ انھیں اس طرح کام پر لگایا جاتا کہ ان کی زیادہ سے زیادہ تعداد کھپ سکے۔ بالخصوص ایسے غلام جن کی شکل و صورت اچھی ہو یا کوئی اور خوبی ان میں موجود ہو ترجیح کے مستحق ہوتے' کیونکہ انھیں یکساں قیمت ہی پر حاصل کیا جاتا مگر وہ اثاثے کے لحاظ سے بہتر ہوتے۔ وہ زر نقد ہی کی طرح قرضے پر دیے جاتے' اور وہ اپنے لیے تجارت بھی کرتے تاکہ وہ مزید دولت حاصل کر سکیں ۔ آزاد مزدور کم قیمت پر فروخت کر دیے جاتے' تاکہ سرمایہ محفوظ رہے ۔ ان کو زندہ رکھنے کے لیے اس قدر خرچ ہو جاتا کہ ان کا رکھنا مشکل ہو گیا۔ ان کے رکھنے کی صرف ایک ہی صورت باقی رہ گئی تھی کہ انھیں زر نقد کی صورت میں رکھا جائے جس کے لیے کوئی حد معین نہ تھی' جبکہ دھات کے ذخائر کی مقدار محدود تھی۔ اسی حقیقت کی وجہ سے غلاموں کی طلب میں اضافہ ہو گیا اور یہ اضافہ متواتر ہوتا گیا۔ غلاموں کے حصول کے لیے جنگیں لڑی جانے لگیں۔ بعض نجی ادارے بھی غلاموں کے حصول کی غرض سے حرکت میں آ گئے' اس کے لیے بحیرہ روم کے ساحل شکار گاہیں بن گئیں۔ اگرچہ روم کی حکومت ان لوگوں پر نظر رکھتی تھی' سرکاری عمال کے لیے دولت کمانے کا ایک اور حیلہ پیدا ہو گیا۔ کسی ایک علاقے پر حملہ کر کے خون بہایا جاتا اور وہاں کی باقی آبادی کو غلام بنا کر دوسرے علاقوں میں بیچ دیا جاتا اور اس طرح اپنا قرضہ چکا لیا جاتا۔ ڈیلوس کی منڈی میں دس ہزار غلاموں کا روزانہ کاروبار ہوتا۔ جب قیصر انگلستان میں گیا تو روم میں بہت مایوسی پیدا ہوئی' کہ انگلستان کی افلاس کا علاج غلاموں کی مال غنیمت میں تلاش کر لیا گیا تھا۔ مثال کے طور پر جب کارتھیج تباہ ہوا تو بتوں کو پگھلا کر سکے بنانا' اور مقامی باشندوں کو غلاموں کی منڈی میں فروخت کرنا کلاسیکی ذہن کے لیے ایک ہی عمل تھا' اور اس سے مراد یہ تھی کہ مادی اشیا کو زر میں تبدیل کر لیا گیا۔

فاؤستی تصور زر اس کے بالکل برعکس ہے----- زر بطور فعالیت----- اس کی قیمت کا انحصار اس کے تاثر پر ہے صرف وجود پر نہیں۔ معاشیات کا یہ اسلوب فکر ۱۰۰۰ء کے نارمنوں نے انسانوں اور اراضی کو مال غنیمت اور معاشی قوت کے طور پر استعمال کیا ۔ ان نواب حاکمان کی خالص کتابی قدر و قیمت کا مشاہدہ کریں۔ (ان حسابی اصطلاحات کو ہم چیک ۔ حساب اور پڑتال کی اصطلاحات سے یاد کرتے ہیں) ۔ ایلنڈ میں جس سونے کے رطل کا ذکر کیا گیا ہے' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دور جدید کے

ادھار کھاتے کے نظام کی پہلی خشت تھی جو کہ اس معاشیات کی قوت پر اعتماد کی مستقل کیفیت کا باعث ہے۔ ہمارا تصور زر اسی نظریے کے مماثل ہے۔ روجر دوم نے یہ معاشی طریق کار سسلی کی رومی حکومت کو تبدیل کیا' پھر اسے ہومن ٹافن کے شہنشاہ فریڈرک دوم (تقریباً ۱۲۳۰ء) نے اسے ایک مضبوط نظام میں تبدیل کر دیا۔ اس نے ابتدائی عمل تحرک میں تبدیلی پیدا کر کے لوگوں کو حیران کر دیا' اور اپنے آپ کو دنیا کی اولیں معاشی قوت میں تبدیل کر دیا ۔ جبکہ ریاضیاتی فکر کی بدحواسی کی قوت اور اس کے ساتھ بادشاہی عزم اقتدار جسے نارمنڈی سے فرانس تک وسیع کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی مفتوحہ انگلستان کا زبردست استحصال کیا گیا' (آج تک انگلستان میں دستوری بادشاہت قائم ہے)۔ اس کی سسلی کی نوعیت کا پہلو اطالوی شہری جمہوریتوں میں نقل کیا گیا' (ان کے حکمران طبقے نے جلد ہی اس معاشرتی معاشیات کو اپنے نجی حساب کتاب میں شامل کر لیا) اور تجارتی فکر و عمل کو تمام مغربی دنیا میں پھیلا دیا۔ تھوڑا عرصہ بعد طاطونی سرداروں کے حکم کے تحت سسلی کا طریق کار اور آرگونوں کے خاندان نے یورپ کے بیشتر حصوں میں رائج کر دیا۔ اس کی ابتدا کو ہسپانیہ کے شاہ فلپ دوم کے اور پروشیا کے بادشاہ فریڈرک ولیم اول کی تحریک پر اس نمونے کے حساب کتاب کا آغاز ہوا۔

ایک ایجاد جو فیصلہ کن ثابت ہوئی وہ ۶۵۰ میں کلاسیکی سکہ سازی تھی۔ اس کی ہمعصر ہی دہرے اندراج کی کھاتہ نویسی تھی مگر سب سے پہلے اسے فرالو کا پاسی اولی نے اس نظام کو عملی طور پر ۱۴۹۴ء میں رواج دیا۔ گوئٹے نے اسے ولیم میسٹر میں انسانی ذہن کی عمدہ ترین ایجاد قرار دیا۔ اس کے موجد کو کولمبس اور کوپر نیکس کے مساوی قرار دینا چاہیے' جبکہ نارمنوں کو گنتی اور حساب فہمی کے بعض اصولوں کی ترویج پر شاباش دی جا سکتی ہے' مگر لومبارڈ دہرے اندراج کی کھاتہ داری کی ترویج کے لیے باعث ستائش ہیں۔ یہ ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو جرمن سرمایہ حصص کے کاروباریوں ہی کا کارنامہ تھا کہ انھوں نے قدیم رومی دور میں عدالتی مشاورت کے لیے دو شاہکار تصنیفات تیار کیں اور دور دراز واقع سمندروں کو سر کرنے کی ان کی آرزو نے امریکہ کے متعلق دو اہم دریافتیں کیں۔ دہرے اندراج کی کھاتہ داری کا نظام بھی گلیلیو اور نیوٹن کی دریافتوں سے کم نہیں۔ اس کی وجہ سے حساب کتاب کے معاملات میں بہت بہتری پیدا ہوئی۔ اس کے متعلق یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ میکانکی فکر کی ایک کائنات ہے۔ دہرے اندراج کی کھاتہ داری کا نظام ہمیں اسی طریق کار سے آشنا کرتا ہے جو بعد کے زمانے میں طبیعیات کے فلسفیوں نے کائنات میں واقع کہکشاؤں کے وجود کے ذریعے دریافت کیے۔ دہرے اندراج کی کھاتہ داری کا نظام بھی اسی اصول پر قائم ہے جس پر کہ منطقی طور پر زیر عمل لایا جانے والا نظام تناظرات مقدارات ہے۔

دہرے اندراجات کی کھاتہ داری' اقدارات کے مکان کا تجزیہ ہے جس کا حوالہ تحلیلی نظام ارتباط میں دیا جاتا ہے' جس کی اصل انتہائی مضبوط ہے۔ کلاسیکی دور کی سکہ سازی نے حساب کو قدر و قیمت کی تدوین کا ذریعہ بنا دیا تھا۔ اس معاملے میں بھی نیثا غورث اور ڈیکارٹیس ایک دوسرے کے متخالف مقام پر استادہ ہیں۔ ہمارے لیے اس امر کا جواز موجود ہے کہ ہم کسی منصوبے کی تکمیل کا جائزہ لیں۔ ارتسای خم کی معاشیات میں بھی وہی معاون حیثیت ہے' جو سائنس میں ہے۔ کلاسیکی دنیائے معاشیات ایک مرتب کردہ نظام تھا بس طرح کہ ڈیمو قراطس کا نظام فلکیات تھا۔) یعنی اشیا اور ان کی ہیئت پر مبنی تھا۔ جب کوئی مواد سکے

کی صورت میں ہو' تو اس میں معاشی تحرک موجود ہوتا ہے اور بوقت استعمال طلب کردہ شے مقداری قدر کو اپنے مساوی طلب کرتا ہے۔ ہماری معاشی دنیا مادی قوت پر تشکیل و ترتیب پاتی ہے۔ کشاکش زر مکان میں موجود ہوتی ہے اور ہر معروضی شے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ اس کی مخصوص تاثراتی قدر مثبت ہے یا منفی ۔ مگر فعالی زر کی علامت صرف تصوراتی ہوتی ہے جس کا کلاسیکی سکوں سے بھی موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ حقیقی کتابی اندراج کی حیثیت کا حامل نہیں' یہ حصص کی دستاویز بھی نہیں' چیک یا نوٹ بھی نہیں مگر وہ عمل جس کی رو سے یہ تکمیل پذیر ہوتا ہے اور اسے حیطہ تحریر میں منتقل کیا جاتا ہے اس کے حوالے سے قدر کے حامل کاغذ کا کردار اس عمل کی عمومی تاریخی شہادت کا رہ جاتا ہے۔

اس کے باوجود مغرب میں اس کے ساتھ ساتھ کلاسیکی تعریف پر حرف گیری کیے بغیر سکہ سازی کا عمل جاری ہے۔ نہ صرف یہ کہ اسے اقتدار اعلیٰ اور اختیارات کلی حاصل ہیں بلکہ یہ یقین بھی موجود ہے کہ سکوں یا نوٹ کی شکل میں مروجہ زر نقد کو فی الحقیقت فکری معاشیاتی اسناد بھی حاصل ہے۔ بالکل اسی انداز میں رومی دور میں بھی' ہم نے رومی قانون کو قبول کر لیا' جس میں اشیا کا معیار ان کے حجم کو قرار دیا گیا تھا اور اقلیدسی ریاضی کو بھی قبول کر لیا جس میں عدد کو بطور جسامت تسلیم کیا گیا تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ذہنی ارتقا کی تینوں صورتوں میں ہماری دنیا کی رفتار پھول کی طرح کھل اٹھنے والی نہ تھی' بلکہ آہستہ آہستہ بتدریج باروق عہد کے خاتمے کے بعد آزادی اقدار حاصل کی ۔ جہاں تک اصول قانون کا تعلق ہے اسے ابھی تک اپنے فرض منصبی کا بھی ادراک نہیں۔ مگر یہ صدی اس کا تعین کر دے گی اور وہی مراعات طلب کرے گی جو رومیوں کے دور میں قانون کی بدیہی بنیاد سمجھی جاتی تھیں یعنی قانونی اور معاشی فکر میں داخلی تطبیق اور دونوں کے مابین باہمی شناخت اور عرفان کے عناصر موجود تھے۔ سکوں کا علامتی نظام زر کلاسیکی قانون اشیا کے ساتھ بالکل ہم آہنگ تھا۔ مگر ہماری ثقافت میں اس امر کا دور دور تک نشان نہیں ملتا۔ ہماری تمام زندگی کا چلن متحرک ہے' اس میں جمود کا نام تک نہیں۔ اس لیے ہماری معاشرتی قوت اور عمل درآمد یا کارگزاری بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ ان قوتوں کی اہلیت اور انسلاک بنیادی اہمیت کے حامل ہیں----- اہلیت اور جبلی ذہانت میں باہمی تطبیق اور تنظیم' اعتماد' تصورات' طریق کار' توانائی کے منابع----- مگر ان سب کا انحصار محض مادی اشیا پر نہیں۔ اشیا کے متعلق ہماری رومی فکر یا ہمارے نظام عدل کے کارکنوں کا نظریہ زر' شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کا آغاز سکوں کی بنیاد پر ہوتا ہے' جن کا ہماری اصل زندگی سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اجنبی ہی ہیں۔ دھاتوں کے انبار جو ہم کلاسیکی تقلید میں جنگ عظیم (اول) تک لگا رہے تھے' بلکہ ان میں اضافہ کر رہے تھے' ان کا ایک اپنا کردار ہے' جو زندگی کی شاہراہ سے قدرے ہٹ کر ہے مگر جو مقاصد اس کے ساتھ داخلی طور پر وابستہ کیے گئے ہیں۔ اور جنھیں جدید معاشیات کا ہدف مقرر کیا گیا ہے' ان کا ان انباروں سے کوئی تعلق نہیں اور اگر جنگ کے نتیجے میں انھیں سکہ رائج الوقت سے خارج ہی ہونا تھا تو اس اخراج سے عام نظام زر میں کوئی تبدیلی نہ آتی ۔

بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ تمام جدید معیشتیں کلاسیکی طریق کار کی نقل کے مطابق ہی تشکیل ہوئیں۔ جیسا کہ صرف بت گری' ظروف سازی اور سنجیدہ ڈرامے ہی حقیقی اقدار کے حامل سمجھے جاتے تھے اور انہی کو فن کا صحیح نمونہ سمجھا جاتا تھا۔ جوشیا ویج وڈ (۱۷۵۸ء) میں اپنی برجستہ کاری اور ظروف کی نقاشی میں شاہکار

تخلیق کرتا رہا' ان تخلیقات کو بھی ایڈم سمتھ قدر وقیمت عطا کرتا ہے اور اپنے نظریہ قدر میں شامل کرتا ہے۔ یعنی یہ بھی ساری اقدار کی حیثیت کی حامل ہیں' کیونکہ یہ عمل اس التباس سے ہم آہنگ ہے کہ زر اور سکوں کے ٹکڑے ایک ہی شے ہیں اس لیے کسی شے کی قیمت کو کسی انسان کی مقدار کار سے ناپا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں "کار" دنیائے اثرات میں مزید کوئی تاثر پیدا نہیں کر سکتا۔ ہر وہ فعالیت جو ہر معاملے میں داخلی قیمت اور شدت اور دائرہ عمل میں بہت زیادہ مختلف ہو' جو اپنی ذات کا مظاہرہ وسیع سے وسیع تر صورت میں کرتا رہے----- وہ برقی میدان میں قابل پیمائش تو ہے مگر اس کی نشاندہی ممکن نہیں------ مگر تاثرات کے نتائج ہمیشہ مادی صورت میں زیر غور لائے جاتے ہیں' مگر ہر وہ شے جس پر ارتکاب فعل ہوا ہو اس سے کسی ایسے نشان کا پتہ نہیں چلتا جو قابل غور ہو' ماسوائے تعمیم العباد کے اور کوئی اثرات کا وجود ظاہر نہیں ہوتا۔

فی الحقیقت یورپ اور امریکہ کی تہذیب کی معیشت ایک ایسے کام پر تشکیل کی گئی ہے جس میں امتیاز صرف اس کے داخلی معیار پر قائم کیا جاتا ہے----- چین اور مصر میں یہ خصوصیت اس سے بھی زیادہ تھی۔ صرف کلاسیکی دنیا اس سے مستثنٰی ہے۔ معاشی تحرکات میں ہم کسی ایسے مفاد کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے جس میں کہ کسی فرد کی محنت میں' اقلیدسی طریق کار کے مطابق اضافہ نہ ہو سکے' بلکہ محض فعالیتی لحاظ ہی سے باہم دگر منسلک ہو۔ خالص انتظامی فعالیت (مارکس صرف اسی کو اہمیت دیتا ہے) ماسوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ یہ ایک موجدانہ عمل ہے' جس میں کام کو ترتیب میں منسلک کیا جاتا ہے اور اسے منظم کیا جاتا ہے۔ اسی عمل سے دیگر کارکن اپنے عمل کو بامعنی بناتے ہیں' اسے اضافی قدر کا مستحق بناتے ہیں۔ فی الحقیقت کام کا امکان اسی عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ جب سے کہ بھاپ کا انجن ایجاد ہوا ہے تمام دنیا میں چند ایسے اعلٰی دماغ سامنے آئے ہیں' جن کی کوشش کے بغیر تمام ایجادات وجود میں نہ آتیں۔ یہ کامرانی تخلیقی فکر کی بدولت وجود میں آئی ہے۔ یہ مقدار کا معاملہ نہیں ۔ اور اس کی قدر چند سکوں کے ساتھ تولی نہیں جا سکتی۔ یہ کامرانی تو فی نفسہ "زر" ہے----- فاؤستی زر' اسے ٹکسال میں ضرب نہیں کیا جاتا' بلکہ یہ تو ایک مستعد مرکز ہے جو زندگی سے برآمد ہوتا ہے----- اور یہ حقیقت ہے زر کے متعلق سوچنے سے زر ہی پیدا ہوتی ہے----- عالمی معاشیات کا یہی راز ہے۔ جب کوئی عالی وقار مہتمم کاغذ کے کسی ٹکڑے پر دس لاکھ لکھ دیتا ہے تو وہ دس لاکھ موجود ہوتے ہیں' کیونکہ ایک ایسی شخصیت جس کی حیثیت معاشی مرکز کی ہے اپنے میدان عمل میں ایسی توانائی کا مالک ہے' جو اس ذمہ داری کو پورا کر سکے۔ "اعتماد" کا یہی مطلب ہے۔ ہم اس کے علاوہ کسی اور توضیح سے آشنا نہیں۔ اگر دنیا میں موجود سونے کے تمام ٹکڑے جمع کر لیے جائیں تو ان سے کسی دست کار کی فعالیتوں کی قیمت نہیں چکائی جا سکتی' اور اس لیے اگر قدر کا مفہوم' دخل اندازوں کی بیدخلی ہے یعنی ان کی اعلٰی تخلیقات میں سے ان کی اہلیت کی منہائی مقصود ہے۔ اگر یہی عمل مراد ہے تو یہ عمل بے روح' بے عزم' خالی گھونگوں کی صورت میں باقی رہ جائے گا۔ اس لحاظ سے مارکس بھی کلاسیکی ڈگر پر ہی چلتا ہے' جس طرح روی قانونی فکر کا نتیجہ ایڈم سمتھ کی صورت میں سامنے آیا۔ وہ صرف ایک تکمیل شدہ قدر کا مشاہدہ کرتا ہے اس کی فعالیت سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ وہ ذرائع پیداوار کو ان دماغوں سے

علیحدہ کرنا چاہتا ہے' جن کی ایجادات طریق کار کی تعینات' منفعت بخش صنعتیں وجود میں آتی ہیں۔ اگر کسی صنعت کے پاس باہر کی منڈی کے دروازے کھلے ہوں تو اسی صورت میں کارخانے میں خشت و آہن کی تیاری ہو گی۔ اگر ان کے کھیلنے کے لیے میدان ہی نہ ہو تو ان کا پیداواری وجود ختم ہو جائے گا۔ مصنوعات کی نکاسی کی منڈی ناگزیر ہے ۔

اگر کوئی شخص کسی جدید کام کے متعلق کوئی نظریہ قائم کرنا چاہتا ہے' تو اسے تمام حیات کی اس بنیادی وصف پر غور و فکر کے بعد اپنے کام کا آغاز کرنا چاہیے۔ ہر قسم کی حیات جسے ہم گزارتے ہیں اس میں موضوعات اور معروضات موجود ہیں' پھر اپنی ہیئت میں خود زندگی ہی ان کے مابین واضح امتیاز کی حیثیت کی حامل ہے۔ کیونکہ وجود کی ہر ندی میں ہم دیکھتے ہیں کہ چند آدمی رہنمائی کا فریضہ ادا کرتے ہیں اور باقی تمام ان کی ہدایات پر چلتے ہیں۔ چنانچہ ہر قسم کی معیشت میں دو قسم کی فعالیتیں نہایت اہم ہوتی ہیں۔ لہٰذا مارکس کا مینڈک کا تناظر اور اور معاشرتی اخلاقی تصورات ساز صرف آخری چھوٹی چھوٹی اشیا کے مجموعے ہی کو بیان کرتے ہیں' مگر ان کا وجود اولین اشیا کی بنیاد ہی پر قائم ہے اور عملی دنیا کی روح کا اندازہ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے زیادہ سے زیادہ امکانات کو زیر غور لایا جائے۔ بھاپ کے انجن کا موجد اہم ہوتا ہے' اس میں کوئلہ ڈالنے والا نہیں' فکر وہ شے ہے' جو باعث اہمیت ہو۔

اسی طرح زر کے متعلق فکر میں بھی موضوعات اور معروضات کا وجود ہوتا ہے وہ لوگ جو اپنی شخصیت کی طاقت پر زر کی رہنمائی کرتے ہیں اور وہ لوگ جن کا گزارہ زر پر ہوتا ہے' فاؤستی نوعیت کی زر فاؤستی نوعیت کے معاشی تحرکات سے کشید کی جاتی ہے' اور وہ اقرار کی قضا و قدر کو موزونیت عطا کرتی ہے (اس کی زندگی کے معاشی پہلو کی قضا و قدر) داخلی طور پر اس کی تشکیل اس انداز سے ہوتی ہے کہ وہ اس قوت کے ایک جزو کی نمائندگی کرتا ہے یا یہ کہ اس کی اپنی کوئی حیثیت نہ تھی' بلکہ اسی ڈھیر کا ایک حصہ ہے۔

۵

سرمائے کی اصطلاح اس فکر کے مرکز کی نشاندہی کرتی ہے----- اس کی مجموعی قدر کو نہیں------ مگر صرف اسی شے کو متحرک رکھے۔ سرمایہ داری کا نظام عالمی شہری تہذیب کے ساتھ ہی وجود میں آتا ہے اور یہ صرف ان لوگوں تک ہی محدود ہوتا ہے جو اپنی شخصیت کے حوالے سے اور ذہانت کے زور سے اس کی نمائندگی کرتے ہیں اس کے مقابلے پر علاقائی معیشت کا وجود ہوتا ہے۔ اسی بناء پر کلاسیکی حیات میں سکوں کو فوقیت حاصل ہوئی (اس دور کی سیاسی حیات پر بھی ان کا غلبہ تھا) اس کی بنا پر جامد سرمائے کا جامد نقطہ آغاز وجود میں آیا۔ اس کے وجود کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے اپنے اندر ایک قسم کی مقناطیسی کشش پیدا کر لی اور ہر شے کو اپنی طرف کھینچ لیا' اشیا ڈھیروں کے حساب سے اس کے اردگرد جمع ہونے لگیں۔ یہ کتابی قیمت کی برتری کی وجہ تھی کہ اس نے بہت جلد اپنے آپ کو دوہرے اندراج کے کھاتے کے نظام سے بہت جلد علیحدہ کر لیا اور اپنے داخلی نظام تحرک کی بنا پر ترقی کا عمل شروع کر دیا اور اس سے اس جدید سرمائے کا وجود پیدا

ہوا جس نے اپنی قوت کی بنیاد پر تمام دنیا پر قبضہ کر لیا

اس کے اپنے مخصوص اثرات کے تحت' صوبہ جات سے سونے کی نہر روم کی طرف اور واپس بہنی شروع ہو گئی اور ہمیشہ یہ لوگ نئے علاقوں کی تلاش میں رہتے' جہاں سے یہ سونا خرید سکتے' یا سونے کا کاروبار کر سکتے۔ بروٹس اور کاسی اس ایشیائے کوچک سے سونا خچروں پر لاد کر فلپی کے میدان جنگ میں لے جاتے رہے۔ ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ اس کاروبار کی کیا نوعیت ہو گی' جو دشمن کی شکست پر لوٹ مار کے نتیجے پر ختم ہوتا ----- اور سی کروچس نے بھی ایک صدی قبل امعزائیوں پر ہلہ بول دیا جو روم سے شراب کے کنستر بھر کر لے گئے تھے اور جب واپس آئے تو سونے سے لدے ہوئے تھے۔ اجنبی ممالک کے سونے کا شکار بعینہٖ اسی طرح تھا' جیسا کہ آج کل کوئلے کے لیے تگ و دو کی جاتی ہے' کوئلہ اپنے گہرے معانی میں اشیا میں شمار نہیں ہوتا' بلکہ یہ ایک توانائی ہے۔

مگر یہ امر اپنی جگہ درست ہے کہ کلاسیکی شہری تصورِ' جس کا تعلق حال مطلق اور قرب و جوار کی اشیا تک محدود تھا' اس میں بھی معاشی خود کفالت کی خواہش پائی جاتی تھی۔ اس کی معاشی جوہر پاشی سیاسی عمل سے مطابقت رکھتی ہے۔ ان میں ہر ایک چھوٹی سی حیاتیاتی وحدت کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اپنی آزاد اور خود کفیل معاشی ندی ہو' جو بلاشرکت غیرے اس کی ذاتی ملکیت ہو' اور تاحد نظر اس کے گرد چکر کاٹ رہی ہو۔ اس کا متخالف پہلو مغرب کا مشترکہ کاروبار کا نظریہ ہے' جسے کلی طور پر غیر ذاتی اور غیر مجسم مرکز قوت ہے' اس فعالیت کے نتیجے میں اس کے چاروں طرف لہریں نکلتی ہیں اور لامتناہی فاصلے طے کر لیتی ہیں لہٰذا اس کا مالک زر کے معاملات میں اہلیت کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ اس پر قبضہ کر کے اس کی رہنمائی کرتا ہے------ یہ عوامل اس کے قبضہ قدرت میں ہیں----- گویا یہ بھی ایک چھوٹی سی کائنات ہے۔ اس مشترکہ کاروبار کی ثنویت اور ملکیت کا معاملہ کلاسیکی ذہن میں قطعاً" نہیں آ سکتا تھا۔

جہاں تک تنظیم کا تعلق ہے' مغربی ثقافت میں یہ عمل بکثرت جاری ہے مگر کلاسیکی دور میں اس کا وجود کم سے کم تھا' کیونکہ کلاسیکی آبادی میں اس کا تصور تک موجود نہ تھا۔ اس کا مالی نظام بتقاضائے مصلحت ہی چلتا تھا۔ یہی ان کا طریق کار تھا' جو عادت کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ ایتھنز اور روم کے قصباتی اور شہری جنگی جہازوں کے مالک تھے' اور رومی امرا کی سیاسی قوت (اور قرضہ) اس پر منحصر تھی کہ وہ کھیلوں کا اہتمام کر سکتا تھا۔ گلیاں اور عمارتیں تعمیر کر سکتا تھا اور ان کے اخراجات پورے بھی کر سکتا تھا------ یعنی اس ادائیگی کے بعد وہ اپنے علاقوں میں لوٹ مار مچا کر اپنے اخراجات کی تلافی کر لیتا تھا۔ وہ ذرائع آمدنی کے متعلق اسی وقت سوچتے جب انھیں رقوم کی ضرورت ہوتی۔ اس کی پرواہ نہ کی جاتی کہ جن کو لوٹا جا رہا ہے' وہ مستقل طور پر تباہ ہو جائیں گے۔ وہ اپنے مندروں کو بھی لوٹ لیتے۔ اپنے شہر کے باسیوں کو بحری قزاقی کا نشانہ بنا لیتے اور ان کی دولت ضبط کر لیتے۔ ان کے مال گزاری کے نظام میں یہ روز مرہ کا معمول تھا۔ اگر کبھی ضرورت سے زائد دولت دستیاب ہو جاتی تو وہ شہریوں میں تقسیم کر دی جاتی------ یہ ایک ایسا طریق کارروائی تھا جس کی بدولت بہت سے لوگ منجملہ یوبولوس اسٹیمپنی کی مقبولیت کا راز پوشیدہ تھا۔ ان کی مالی حکمت عملی میں بجٹ (میزانیہ) کا کوئی تصور نہ تھا۔ رومی صوبوں کی مالی تنظیم کا قزاقی پر دارومدار تھا۔ جو عوامی بھی ہوتی اور نجی بھی۔ عوامی ادارے اور عام افراد دونوں اس کا شکار ہوتے' اراکین مجلس اور ساہوکار

دونوں اس پر عمل پیرا تھے۔ انھوں نے اس کا کبھی ذرہ بھر خیال نہیں کیا کہ برآمدات اگر معاہدے کے مطابق نہ ہوں گی تو تلافی ناگزیر ہو گی۔ کلاسیکی انسان نے اپنے مالی معاملات کو منظم کرنے کے متعلق کبھی سوچا تک نہ تھا' بلکہ ہمیشہ وقتی نتائج پر انحصار رکھتا۔ روم کی سلطنت تباہ ہو جاتی اگر اس کے مقبوضات میں مصر کی قدیم تہذیب شامل نہ ہوتی' جس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہزاروں سال سے مالی نظام پر غور و فکر کی عادی تھی۔ رومی نہ تو اس مسئلے کا ادراک رکھتے تھے' نہ وہ اس اسلوب حیات کی نقل کے اہل تھے مگر حادثاتی طور پر اس فلاحین کی دنیا کا مصری قصبہ جس میں سونے کے بڑے بڑے ذخائر موجود تھے' ان کی وجہ سے ملک میں ایک فیصلہ شدہ مقاطعہ کی صورت وجود میں آ گئی۔ اس سلسلے کا سب سے بڑا قتل عام وہی تھا' جو مصر پر قبضے کے دوران عمل میں آیا۔ ایشیائے کوچک کے سونے کے ذخائر جو بروٹس اور کیسی اوس لا رہے تھے' اس کے لیے کثیر افواج اور دنیا پر قبضے کی ضرورت تھی۔ اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ دو سو اطالوی امیر ترین خاندانوں کو قتل کر کے ان کے سر بوریوں میں بھر کر مجلس کے روبرو پیش کیے گئے۔ اس سے مراد یہ تھی کہ مقاطعہ کے عمل کی تکمیل ممکن ہو' اور اس طرح قاتلوں کو انعامات سے نوازا گیا۔ یہ بھی ممکن نہ ہوا کہ اپنے رشتہ دار بچوں اور بوڑھوں کو چھوڑ دیا جاتا یا ان لوگوں سے کوئی مواخذہ نہ کیا جاتا جنھوں نے سیاست میں کبھی کوئی حصہ نہ لیا تھا' صرف اسی قدر کافی تھا کہ ان کے پاس زر نقد کا ذخیرہ موجود تھا' اور اگر یہ ظلم و ستم نہ کیا جاتا' تو بہت کم مالی فائدہ حاصل ہو سکتا۔

مگر جب قدیم شاہی دور کے متعلق کلاسیکی احساس ختم ہو گیا تو زر نقد کے متعلق بہت زیادہ سوچ بچار بھی ختم ہو گئی سکے دوبارہ مروج ہو گئے کیونکہ لوگ دوبارہ زرعی معاشرے میں لوٹ آئے اور اس طرح یہ مسئلہ پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ سونے کی اتنی بڑی مقدار ہنڈرائی کے علاقوں سے بھی مزید مشرق میں کس طرح منتقل ہو گئی' جس کا اس وقت تک کسی نے کوئی مواخذہ نہیں کیا تھا۔ ایک نئی ثقافت کے ظہور کے ساتھ ہی سونے کی نہروں کی معاشی زندگی کا خاتمہ ہو گیا' اور اسی طرح غلاموں کی زر نقد کی حیثیت کا بھی اختتام ہو گیا' اور سونے کی کمزوری غلاموں کی آزادی کا باعث بنی۔ آگسٹائن کے عہد سے لے کر مابعد متواتر ایسے قواعد و قوانین تشکیل دیے گئے تاکہ اس عمل کو روکا جائے مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ دایا کلیٹیس کے زیادہ سے زیادہ محصول کی وجہ سے زر نقد کی معاشیات میں معیاری اہمیت نہ رہی اور غلاموں کی بطور زر کلاسکی اہمیت کا وجود ختم ہو گیا

باب چہار دہم

معاشی زندگی کی عالمی ہیئت

(ب)

مشین

ا

ٹیکنیک بھی آزاد متحرک حیات ہی کے برابر قدیم ہے——— صرف نباتات' ہی جیسا کہ ہمیں مطالعہ فطرت میں دکھائی دیتا ہے——— ٹیکنیکی طریق کار کا سب سے بڑا میدان ہے۔ حیوان چونکہ متحرک ہے اس لیے حرکت کے ہنر سے آشنا ہے تاکہ وہ اپنے لیے غذا فراہم کر سکے اور اپنا تحفظ کر سکے۔

عالم کبریٰ بیدار اور عالم صغریٰ کا حقیقی تعلق——— فطرت——— لس بالحواس پر مبنی ہے۔ اس کا آغاز تاثرات احساس سے ہوتا ہے اور فیصلہ حواس پر منتج ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا سارا عمل تنقیدی اور سنجیدہ ہوتا ہے (یعنی وہ ان میں باعث علیحدگی ہوتا ہے) یا پھر یہی عمل علتی تجزیے پر مبنی ہوتا ہے جو بعینہ سابقہ عمل ہی ہے۔ ہم نے جس ذخیرے کا تعین کر لیا ہے وہی آگے بڑھ کر نظام کی صورت اختیار کرے گا اور وہ اتنا مکمل ہو گا جتنا کہ ممکن ہے——— اس کے نشانات کی شناخت ہو سکے گی——— ایک بے ساختہ

طریق کار جس میں کہ کوئی شخص سکون محسوس کرتا ہے وہ اس کی اپنی دنیا ہے۔ بہت سے حیوانات میں اس تجربے کی وجہ سے حیران کن صلاحیتوں کا ظہور ہوا ہے' جس تک ابھی تک کسی انسانی سائنس کی رسائی نہیں ہو سکی۔ مگر ابتدائی شعور بیدار ہمیشہ فعال رہتا ہے۔ اس کا تعلق روز مرہ کی زندگی کی ابتدائی ٹیکنیک سے ہے' اور ایسی اشیا پر مبنی ہے جو اب مردہ ہو چکی ہیں یعنی یہ تجربات اضطراری طور پر حاصل کیے جاتے ہیں۔ مسلک اور اساطیر میں یہی مسلک ہے کیونکہ اس سطح پر مذہب پرست اور لادین میں کوئی فرق نہیں رہتا——— تمام شعور بیدار مذہب ہی ہو جاتا ہے۔

اعلیٰ حیات کی تاریخ میں جب فطرت کی منطقی تعریف (تاکہ اس سے رہنمائی حاصل کی جا سکے) تعینات میں بدل جائے——— یعنی مجوزہ تبدل فطرت کی صورت اختیار کر لے۔ اس ٹیکنیک کی وجہ سے انسان کم و بیش بااختیار ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو حقیقی طور پر باشعور ادراک اعلیٰ کا حامل بنا لیتا ہے۔ فکر نے اپنا وجود احساس سے حاصل کیا ہے۔ یہ الفاظ کی بان ہے جو اس دوری تبدیلی کو وجود میں لاتی ہے۔ جب کلام محض بولنے سے آزادی حاصل کرتا ہے تو وہ ایسی علامتوں کے ذخیرے کو جنم دیتا ہے جو ابلاغ کے لیے گفتگو معانی عطا کرتا ہے۔ یہ ایسے الفاظ ہوتے ہیں جو معانی اور مفہوم سے منسلک ہوتے ہیں۔ اس طرح انسان کو دیوی دیوتاؤں کے راز سمجھ میں آنے لگتے ہیں (دیوتاؤں سے مراد فطرت کی قوتیں ہیں)۔ اس کے زیر تصرف قوت اور اعداد (مسلمات اور سادہ قوانین) جس کی بنیاد پر حادثاتی تحس سے حقیقت کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی شناخت کے نشانات کا نظام ایک نظریاتی تصویر میں ترقی حاصل کر لیتا ہے۔ جو اپنے آپ کو روز مرہ کی تکنیک سے علیحدہ کر لیتا ہے ۔ خواہ یہ بلند سطح کی مہذب تکنیک ہو' یا یہ سادہ آغاز کا روز اول ہی ہو' یا یہ تجریدی راہ پر گامزن ہو' بطور شعور بیدار یہ کسی فعالیت سے پابندی اختیار نہیں کرتا۔ یہ جاننے کے لیے کہ کسی شخص کی خواہش کیا ہے اس کے متعلق جاننے کے لیے متعدد واقعات سے گزرنا پڑتا ہے اور ہمیں اس کے کردار کے متعلق کسی غلطی کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے۔ عددی تجربے کے بعد انسان کو اتنی قدرت حاصل ہو گئی ہے کہ وہ رازہائے سربستہ کو عام کر سکتا ہے' یا اپنی حالت پر چھوڑ سکتا ہے مگر ابھی تک انسان کی اس سے شناسائی نہیں ہو سکی۔ جدید جادوگر کی شکل و صورت——— ایک سوئچ بورڈ کی طرح ہے۔ جس پر بیرم اور نشانات ثبت ہیں جس کی مدد سے ایک طاقت ور کارکن مناسب بٹن پر اپنی انگلی کے دباؤ سے بغیر اس کی میکانیت سے مکمل آگاہی سے اسے بروئے کار لا سکتا ہے۔ یہ عمل انسان کی عمومی تکنیک کی ایک علامت ہے۔ وہ عالم نور جو ہمیں ہر طرف سے محیط رکھتا ہے' اس کی مصنوعی تصویر' جیسی کہ ہم نے تنقیدی اور تجزیاتی طور پر تشکیل کی ہوئی ہے اور اسے نظریاتی حیثیت عطا کر رکھی ہے' بطور تصویر اس کی ماسوائے اس کے کوئی حیثیت نہیں کہ وہ ایک نوع کا سوئچ بورڈ ہے' جس پر بعض مخصوص اشیا کی اس طرح نشاندہی کر دی گئی ہے (گویا کہنا چاہیے) کہ کسی مخصوص بٹن کو دبانے سے ایک مخصوص عمل یقیناً" وجود میں آ جائے گا۔ اس صورت میں وہ راز بھی اس حوالے سے سمجھ میں آ جائے گا۔ مگر اس تکنیک کی بدولت شعور بیدار' دنیائے حقائق میں داخل ہو جاتا ہے۔ زندگی فکر کو تمام مشکلات کا حل تصور کرتی ہے' اور اکثر تہذیبوں کے بڑے بڑے شہروں میں ایک وقت آ جاتا ہے جبکہ تنقیدی ناقد تھک جاتا ہے اور وہ مزید خدمت زندگی

سے تنگ آ جاتا ہے اور ظلم و ستم پر اتر آتا ہے۔ مغربی ثقافت بھی اب اس عیش و نشاط کی محفل کے تجربے سے گزر رہی ہے اور بے لگام فکر سے تنگ ہے' اور اب تو یہ کیفیت الیمے کی صورت اختیار کر گئی ہے۔

انسان نے فطرت کی چال کو دیکھ لیا ہے اور اس کے اشاروں کو اچھی طرح سے سمجھ لیا ہے وہ انھیں ایسے انداز اور طریق کار کے مطابق استعمال کرتا ہے جو کائناتی مزاج کے مطابق ہوں۔ وہ خدائی کردار ادا کرنے کی جرات کرتا ہے اور اس سے یہ بات سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے کہ کس طرح قدیم دور کے موجد اور تخلیق کار اور ان مصنوعی اشیا کے ماہرین----- کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں فن فطرت کے انعکاس کی صورت میں منتقل ہو جاتا ہے----- بالخصوص کہ دھات کار کے فن کے محافظین ان لوگوں کو جو ان کے آس پاس تھے غیر معمولی محسوس ہوئے اور حیرت و خوف سے مبہوت ہو گئے۔ اس نوعیت کی ایجادات میں اضافہ ہوتا گیا' اکثر تو کوئی شخص ایک شے بناتا اور پھر اسے بھول جاتا' اور پھر دوبارہ بناتا' اس کی نقل کرتا' غلطیوں سے بچتا پھر اسے مزید ترقی دیتا' اور پھر انھوں نے اپنی مصنوعات میں اتنا اضافہ کر لیا کہ وہ تمام براعظموں کے لیے کافی ہوتے' اور بدیہی طور پر وہ ذرائع استعمال کیے جو باسانی دستیاب تھے۔ دھات کو آگ کی مدد سے استعمال کیا۔ اوزار' اسلحہ' ہل' کشتیاں' مکانات' جانوروں کو سدھانا' اور ان کی پرورش کرنا' اور سب سے بڑھ کر دھاتوں کی تلاش قدیم دور کا انسان تو ان تک کسی متصوفانہ روایت کے تحت ہی پہنچ پایا ہو گا۔ ناقابل فراموش حد تک' قدیم تجارتی راستے خام دھاتوں کے ذخائر تک رسائی کا باعث ہوئے ہوں گے اور ان لوگوں نے جنھوں نے ان تک رسائی حاصل کی' مقامی افراد کو ان کے راز سے آگاہ نہ کیا ہو گا۔ اگرچہ دیہات میں آباد لوگوں اور سمندروں میں سفر کرنے والے ملاحوں اور ان کے ساتھ ساتھ بعد میں وجود میں آنے والے سیاحت کے مسالک' زیورات' ٹن اور سونے کے جزیروں اور ارضی قطعات کے متعلق نہ ختم ہونے والی داستانیں' لوگوں کو دھاتوں کی طرف مائل کرتی تھیں۔ تمام تجارتی اشغال میں سب سے اول دھاتوں کی تجارت ہے' اور اس کے ساتھ پیداواری معاشیات اور محنت کی معاشیات کے ساتھ ایک تیسرا----- اجنبی مہم جویانہ جو اراضی پر آزادی سے عمل پیرا رہتا ہے۔

اس بنیاد پر ارفع ثقافتوں کی تکنیک استوار کی جاتی ہے۔ تمام بڑے بڑے موجودات کے معیار کے تاثر اور تمام رنگ و آرزو کی روح کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے اظہار کی کوئی ضرورت نہیں کہ کلاسیکی انسان جو اپنے آپ کو اور اپنے ماحول کو اقلیدسی نقطہ نظر کے مطابق محسوس کرتا ہے۔ اس لیے اس نے اپنی ترجیح میں تکنیک کی مخالفت کو اول درجہ دیا۔ اگر کلاسیکی تکنیک سے مراد کوئی ایسی ہی شے ہے (ان اشیا کے ساتھ جو ہم بطور صفات استعمال کرتے ہیں) پکے ارادے اور کوشش سے' مائی سینیٹوں کے دور کی طرح مکمل عالی تکمیل حاصل کر لیتے ہیں' مگر اس کے مقابلے میں کسی کلاسیکی تکنیک کا وجود نہ تھا۔

ان کے سہ منزلہ جنگی جہاز' عام قسم کی چپو چلانے والی کشتیاں تھیں۔ ان کے غلیل اور سنگ انداز گھمانیاں صرف کمنیوں اور مکوں ہی کا بدل تھیں' اور ان کا چینیوں اور شامیوں کی جنگی مشینوں سے کوئی مقابلہ نہ تھا' اور جہاں تک ہیرو اور اس نوعیت کی دیگر اشیا کا تعلق تھا' وہ محض اتفاقی طور پر بن گئی تھیں' کسی کی ایجاد نہ تھیں کہ انھیں کامرانی سمجھا جائے۔ وہ اپنے نوشتہ تقدیر کے لمحاتی وزن سے نا آشنا تھے جو کہ ایک اہم ترین لزوم ہے۔ ادھر ادھر کوئی شخص اعداد و شمار کا سہارا لیتا تھا (اور وہ ایسا کیوں نہ کرتا)۔ یہ

روایت غالباً مشرق سے ان تک پہنچی تھی مگر کسی نے ان کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہ دی' اور سب سے بڑھ کر کسی نے بھی انھیں مجموعی ہیئت حیات میں روشناس کرانے کی جرات نہیں کی۔

فاؤستی تکنیک اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ جسے تمام آرزوؤں کے ساتھ بعد ثالث کہا جاتا ہے اور قدیم گوتھک ایام سے یہ فطرت پر غلبہ حاصل کرنے میں مشغول ہے اور اسے مسخر کرنے کے عزم صمیم کی حامل ہے۔ اسی مقام پر اور صرف اسی مقام پر داخلیت اور طریق کار کے اصول یقینی معلوم ہوتے ہیں(۳)۔ نظریات زیر عمل مفروضات ہیں اور ارسطو کے دیوی دیوتاؤں کی طرح ان کا تصور کیا جا سکتا ہے' جن سے اس کا داخلی تعلق بھی موجود تھا۔ عربوں نے کیمیا کو جادو کے لیے استعمال کیا (جیسا کہ فلسفے میں انھوں نے پتھر سے کام لیا) گویا وہ فطرت کے خزائن کو بغیر کسی کوشش کے مسخر کرنا چاہتے تھے۔ مگر مغرب فطرت کو اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہتا ہے۔

فاؤستی موجد اور دریافت کنندہ ایک عجیب قسم کا شخص ہے' اس کے عزم کی ابتدائی قوت اس کی بصارت کی تیزی' اس کے سیاسی غور و فکر کی عملی توانائی' آغاز میں عجیب و غریب اور ناقابل ادراک معلوم ہوتی ہے۔ اس کی سیاسی غور و فکر کی وزدانہ توانائی کسی اجنبی ثقافت کے لیے عجیب و غریب اور ناقابل ادراک محسوس ہو سکتی ہے۔ مگر ہمارے تو یہ خون میں شامل ہے۔ ہماری تمام ثقافت میں موجد کی روح موجود ہے۔ ایسی شے کی دریافت جو نظر نہیں آتی' اسے روشنی میں لے آنا' موجد کی روح کا کمال ہے' اور اسے بصیرت کے تجربے میں لانے کا مقصد یہ ہے کہ اسے مسخر کر لیا جائے۔ پہلے دن ہی سے اس میں یہ ضدی آرزوئیں مچل رہی تھیں۔ اس کی بڑی بڑی ایجادات بتدریج اس کی داخلیت میں بتدریج پختگی حاصل کرتی ہیں اور بالآخر قضا و قدر کے لزوم کو تسلیم کر لیتا ہے۔ ان تمام کو وسیع القلب روی راہبوں نے اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا - یہ وہ دور ہے جس میں کہ تمام مذاہب میں تمام تیکنیکی فکر کا پتہ چلتا ہے - اگر کسی مقام پر تیکنیکی فکر کا مذہب میں پتہ چلتا ہے تو اسی کی صورت یہی ہے۔ ہر راہب کے حجرے میں جو عبادت اور روزہ داری سے اپنے لیے راز ہائے خداوندی کو تلاش کرتے ہیں' وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ وہ خدا کی خدمت کر رہے ہیں۔ آپ کے سامنے فاؤسٹ کا پیکر ہے' جو ثقافت کی تلاش کی سب سے اہم علامت ہے۔ سائنس اسے دریافت کرتی ہے۔ روجر بیکن سب سے پہلا شخص تھا' جس نے فطرت کے متعلق تحقیق کرنے کی دعوت دی۔ اس نے کہا کہ ان سوالات کا جواب بیرم اور پیچ سے حاصل کیا جائے اس طرح اس عمل کا آغاز ہوا' جس کی بدولت دیہاتی علاقوں میں بڑی بڑی چمنیاں اور ستون اپنے عمل میں مصروف ہو گئے۔ مگر ان سب کے لیے بھی حقیقی فاؤستی خطرہ موجود ہے کہ شیطان اس سارے کھیل میں اپنا عمل دخل شامل نہ کر لے اور وہ ان کو اس پہاڑی پر نہ لے جائے' جہاں پہنچ کر تمام دنیا کے اختیارات ان کے حوالے کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ استمراری حرکت کی یہی اہمیت ہے جس کا خواب پطروس بیری گرینس جیسے عیسائیوں نے دیکھا تھا' جو خداوند سے اس کی الوہیت بھی چھین لینا چاہتے تھے۔ کئی بار انھوں نے اس حوصلہ مندی کا ارتکاب کیا۔ انھوں نے خدا سے یہ راز حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ خود ہی خدا بن سکیں۔ انھوں نے کائنات کے راز ہائے سربستہ کو جاننے کی کوشش کی تاکہ وہ اسے مسخر کر لیں۔ اسی سے ان کے دماغ میں مشین بنانے کا تصور ابھرا' اور اس طرح انھوں نے مشین کی صورت میں ایک چھوٹی سی کائنات وضع کر لی' جو

صرف انسان کا حکم مانتی ہے۔ اس طرح انھوں نے وہ نازک سرحد پار کر لی جہاں سے کہ دوسرے لوگ قابل احترام تقدیس کا آغاز کرتے تھے۔ یہیں سے تصور گناہ کا آغاز ہوتا ہے اور اسی مقام پر روجر بیکن سے لے کر جیار ڈنو برونو تک ہر شخص کو ملال کا تجربہ ہوا۔ با تکرار سچے عیسائیوں نے مشین کو شیطان کا کارنامہ قرار دیا۔

جذبہ ایجاد گوتھک فن تعمیر کے دور ہی سے ----- اس کا مقابلہ ڈورک کی دانستہ افلاس کو اختیار کرنے کی کوشش قرار دیا ------ اور یہ صورت ابھی تک ہماری موسیقی میں موجود ہے۔ کتابوں کی طباعت وجود میں آئی اور اس کے ساتھ ہی دور مار کرنے والا اسلحہ ایجاد ہو گیا۔ کولبس اور کوپر نیکس کے فوراً" بعد دوربین وجود میں آئی۔ اس کے ساتھ ہی خردبین' کیمیائی عناصر اور سب سے آخر میں ابتدائی باروق کی ٹیکنالوجی میں شدید مہارت کا مظاہرہ ہوا۔

اس کے فوراً" بعد دور روشن خیالی کا غلغلہ بلند ہوا پھر بھاپ کا انجن دریافت ہوا' جس کی بدولت ہر شے میں انقلاب آ گیا' اور معاشی زندگی کی بنیادوں سے لے کر اوپر تک ہر سطح پر تبدیلی آ گئی۔ اس زمانے تک فطرت خدمات مہیا کرتی رہی تھی۔ اب اسے غلاموں کی طرح زنجیر پہنا دی گئی تھی ----- اور اس کے کام کی گھوڑوں کی قوت کا معیار بنا کر پیمائش کی گئی۔ اب حبشی غلاموں کی عضلاتی قوت سے ------ جسے منظم معمول کے مطابق مرتب کر لیا گیا ------ ہم ان نامیاتی قوتوں تک پہنچ گئے جو ہزاروں سال سے قشر ارض کی تہ میں مدفون پڑے تھے۔ آبی قوت کو بھی کوئلے کی قوت میں اضافے کے لیے استعمال کیا جانے لگا جبکہ گھوڑوں کی قوت لاکھوں اور کروڑوں تک پہنچ گئی۔ آبادی میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا اور یہ رفتار اس قدر زیادہ تیز ہو گئی کہ کسی بھی ثقافت نے اس کا کبھی تصور بھی نہ کیا ہو گا۔ یہ اضافہ مشین ہی کا عطیہ ہے۔ مشین بضد ہے کہ اسے استعمال میں لایا جائے' اور اس پر حکم چلایا جائے اور اس سے ہر فرد کی قوت کار میں سو فیصد اضافہ ہوا۔ مشین کی بدولت انسانی زندگی کی قدر و قیمت بڑھ گئی ہے' کام کا لفظ اخلاقی فکر کا مظہر بن چکا ہے۔ اٹھارھویں صدی میں ہی دنیا کی تمام زبانوں میں اس لفظ کے معانی سے بے عزتی کا عنصر خارج کر دیا گیا ہے۔ مشین خود کام کرتی ہے اور انسان کو تعاون کے لیے مجبور کرتی ہے۔ تمام ثقافت فعالیت کے اس درجے پر پہنچ چکی ہے کہ زمین بھی اس کے پاؤں کے نیچے کانپ رہی ہے۔

اس کے صرف ایک صدی بعد کیا کیا تبدیلیاں ظہور میں آئیں' اس کا بیان بھی ایک عظیم ڈرامہ معلوم ہوتا ہے۔ مستقبل کی ثقافت کے لوگ جن کی روحیں' آرزوئیں' ہم سے مختلف ہوں گی' یہ خیال کرنے سے باز نہیں رہیں گے کہ ماضی میں خود فطرت بھی لڑکھڑا کر چلتی تھی۔ سیاست شہروں اور شہریوں پر منڈلاتی تھی۔ معاشیات جو کہ عالم نباتات اور حیوانات کو بہت زیادہ متاثر کرتی ہے انسانی زندگی کے ایک کنارے کو چھو کر پاس سے گزر جاتی ہے۔ مگر یہ تکنیک اپنے دور عروج کے نشانات چھوڑ جائے گی جبکہ باقی ہر شے گم ہو جائے گی اور فراموش کر دی جائے گی اور اس کی وجہ سے فاؤستی جذبات نے روئے زمین کا چہرہ تبدیل کر دیا ہے۔

احساس زندگی کی یہ خارجی اور عمودی جدوجہد ہے ----- اس لحاظ سے یہ روحی تہذیب کی حقیقی وارث ہے ----- جیسا کہ اس کا اظہار گوئٹے نے اپنے کردار فاؤست کی ایک خود کلامی میں کیا ہے جبکہ

بھاپ کا انجن ابھی نیا نیا ایجاد ہوا تھا۔ مدہوش روح فضا کے اوپر تیرنا چاہتی ہے یعنی زمان و مکان دونوں سے ماورئی ہونا چاہتی ہے۔ ایک بے حد شدید آرزو اسے ایسی لامتناہیت میں لے جانا چاہتی ہے جو بیان سے باہر ہے۔ انسان اپنے آپ کو زمین سے آزاد کر لے گا' لامتناہیت میں پہنچ جائے گا' جسمانی تعلقات کو ترک کر دے گا اور خود بھی کرہ ارض کے ساتھ ہی خلا میں گردش کرتا رہے گا اور ستاروں کے ساتھ قدم ملا کر چلے گا۔ یہ وہی جذبہ ہے جس کی آرزو سینٹ برنارڈ نے آغاز میں کی تھی اور گرون والڈ اور ریم برانٹ نے اس کا تخیل اپنے پس منظر میں دیا ہے اور بی تھون نے اپنے آخری مربع نغموں میں جسے اجاگر کیا ہے۔ اب دوبارہ ان مدہوش کن ایجادات کی صورت میں دوبارہ ظاہر ہو رہا ہے' جو ایک دوسری کے اوپر سرعت کے ساتھ وجود میں آ رہی ہیں۔ اب ایسے ذرائع منتقلی موجود ہیں جو کم سے کم وقت میں برا عظموں کو پار کر جاتے ہیں۔ چند ایام بعد سمندروں میں شہر تیرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ پہاڑوں میں سے سوراخ کر کے گزر جائیں گے اور سطح زمین سے نیچے گھورکھ دھندوں کو پار کر جائیں گے۔ بھاپ کے انجن کو اس کے حتمی امکانات تک استعمال کیا جائے گا اور پھر یہ گیس کے انجن تک پہنچ جائیں گے اور بالآخر یہ ریلوے کی پٹڑی اور شاہراہوں سے بلند ہو کر ہوا میں اڑنے لگیں گے اور وہ وقت بھی آئے گا کہ منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سات سمندر پار کر جائیں گے اور اس میں ایک لمحہ بھی نہیں لگے گا۔ بڑی بڑی مشینوں کے لیے بڑے بڑے دالان تعمیر کیے جائیں گے۔ بڑے بڑے پل ہوں گے جن کے نیچے سے بڑے بڑے جہاز گزر جائیں گے۔ ایسی عمارتیں بنیں گی جو بادلوں کو نیچے چھوڑ جائیں گی۔ اتنی عظیم قوتیں ایک معصوم بچے کے ہاتھ میں کھیلیں گی۔ شیشے اور فولاد کی ایسی تعمیرات ہوں گی' جن میں انسان گھومتا پھرتا ہوا بہت چھوٹا نظر آئے گا مگر ان کا بادشاہ ہو گا اور یہ فطرت اسے اپنے زیر نگیں معلوم ہو گی۔

یہ مشینیں اپنی ہیئت میں انسان کے قریب تر ہوتی جائیں گی اس لیے زیادہ سے زیادہ تارک الدنیا' صوفی اور باطنی لوگ پیدا ہوں گے۔ وہ لامتناہیت پر' لطیف قوتوں' لہروں اور کشاکش کی قوس تیار کریں گے اور ان کے جسم زیادہ سے زیادہ غیر مادی اور کم شور انگیز ہوں گے۔ جیسے' رولر' بیرم زیادہ شور و غوغا نہیں کریں گے۔ ہر وہ شے جو اہم ہے داخلیت کی طرف رجوع کرے گی۔ انسان نے مشین کو شیطانی چرخا محسوس کیا ہے اور یہ بات درست بھی ہے۔ یہ معتقدین کے لیے تصور الوہیت کا سبب بنتی ہے۔ یہ مقدس علیت کو انسان کے حوالے کرتی ہے اور اس کی وجہ سے پیشین گوئیوں کا ایک سلسلہ وجود میں آ جاتا ہے' وہ انسان کے اندر خاموشی سے داخل ہوتا ہے مگر اس کی مزاحمت ممکن نہیں۔

۲

اس دنیا میں اس سے قبل کبھی بھی عالم کبریٰ نے عالم صغریٰ پر اس قدر فوقیت محسوس نہیں کی مگر اس دور میں حیات کی چھوٹی چھوٹی اکائیوں نے محض اپنی ذہانت کی قوت پر' اپنی حیات کا انحصار اپنی ذات تک محدود کر لیا۔ جیسا کہ ہم مشاہدہ کر سکتے ہیں یہ ایک فتح کی صورت ہے جس کی اس سے قبل کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ کامرانی صرف ہماری ثقافت ہی نے حاصل کی ہے اور غالباً" یہ سب کچھ چند صدیوں کے دوران

ہی ظہور میں آیا ہے۔

اسی باعث فاؤستی انسان' اپنی تخلیقات کا خود ہی غلام بن گیا ہے۔ اس کا انصرام حیات' اور اس میں قطعی مقام مشین ہی سے قائم ہوتے ہیں۔ اس سے وہ ایک ایسے راستے پر چل نکلا ہے جس میں نہ کوئی عارضی قیام ہے اور نہ کوئی صورت مراجعت۔ کسان' دست کار' بلکہ تاجر کے مقابلے میں بھی ان تینوں عوامل نے غیر ضروری طور پر بہت زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے۔ یہ تینوں عوامل مشین کے پیدا کردہ ہیں اوراس کی خواہش کے مطابق وہ ترقی کے عمل میں اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں : کارجو (بالعموم سرمایہ کار) انجنیئر اور کارخانے کا مزدور------ اس کا مطلب یہ ہے کہ صنعتی معاشیات میں------ ان لوگوں نے اپنا مقام پیدا کر لیا ہے (یہ صرف ایک ہی ثقافت کا ذکر ہے) اور اس طرح ایک ایسا تناور درخت پروان چڑھ گیا ہے' جس کا سایہ تمام دوسرے پیشوں پر بھی پڑ رہا ہے------ اس سے مراد مشین کی معاشیات ہے(٦)۔ یہ کارجو کو بھی اتنا ہی مجبور کرتی ہے جتنا کہ کارکن کو' وہ اس کا حکم تسلیم کریں۔ دونوں اس کے مالک نہیں بلکہ غلام ہیں۔ یہی وہ موقع ہے جس پر وہ اپنی شیطانی اور خرق عادت قوت کا مظاہرہ کرتی ہے' لیکن اس کے باوجود کہ زمانہ حال کی اشتراکیت نے صرف اس کے پیداواری عمل کی صلاحیت کی طرف دھیان دیا ہے اور کام کی اصطلاح صرف اسی کے ساتھ مخصوص کر دی گئی ہے۔ اس لیے اسے اول الذکر کے آقا کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے اور یہی اس کی اقتداری کامرانی ہے۔ "مضبوط بازو" کا مشہور جملہ جو ہر پہیے کو رواں رکھتا ہے اب بے معنی بلکہ غلط ہو کر رہ گیا ہے۔ اچھا ہوتا اسے بند کر دیا جاتا------ مگر ایسا کرنے کے لیے بھی اسے کسی کارکن کی ضرورت نہیں' تو پھر کیا اسے چلانے کے لیے کارکن کی ضرورت ہو گی------ نہیں اس کے لیے بھی نہیں------ اس کا مرکز معنوی اور پیچیدہ ہے اور مشین منتظم اور مہتمم کے دائرہ کار میں شامل ہے۔ صرف ذہن جس میں ہاتھ کا کوئی کردار نہیں۔ ذہن ہی اسے کارگزاری میں مشغول رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے ہر وقت خطرے سے دوچار تشکیل کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک شخص باقی سب سے زیادہ اہم ہے' وہ وہی مہم جو ہے' جس کا ذکر اوپر آیا ہے' یہ وہی شخص ہے جو خالی میدان میں شہر آباد کرتا ہے' جس سے فطری مناظر کی صورت تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی شخصیت' جو ممکن ہے کہ سیاسی ہنگاموں میں گم ہو جائے اور لوگ اسے فراموش کر دیں------ انجنیئر------ مشین کا پجاری' جو اسے بخوبی جانتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس کی اپنی ذاتی اہمیت ہے بلکہ اس کے ساتھ لاکھوں کی تعداد میں وہ دماغ بھی شامل ہیں' جنھیں اس سلسلے میں خصوصی تربیت دی گئی ہے۔ وہ نہ صرف اس پر کام کرتے ہیں بلکہ اس کی ترقی کے لیے کوشاں بھی رہتے ہیں۔ خاموش انجنیئر وہ شخص ہے جو اس کے تمام معاملات کا ذمہ دار ہے اور امور قضا و قدر سے باخبر ہے' بلکہ اس کا تعین بھی کرتا ہے۔ مشین جو ہمیں فی الحقیقت نظر آتی ہے' وہ اسی کے فکر کے امکانات کی عملی صورت ہے۔ لوگوں میں ایسے خوف رہے ہیں جو مادیت پر مبنی تھے کہ ممکن ہے کسی روز کوئلے کے ذخائر ہی ختم ہو جائیں۔ مگر جب تک ایسے ماہرین موجود ہیں جو نئے نئے ذخائر کے راستے تلاش کر سکتے ہیں' ہمیں اس نوعیت کا کوئی خطرہ درپیش نہیں۔ یہ خطرہ صرف اس صورت میں درپیش آ سکتا ہے کہ جبکہ یہ کام کرنے والے لوگ ہی اس میدان میں آنا ترک کر دیں۔ کارکنوں کی ایک فوج ہے جو ان مشینوں پر کام کرتی ہے' ان کا فکری عمل مشین کی داخلی زندگی کو باقاعدہ رکھتا ہے۔ صنعت و

حرفت کا شعلہ توانا اور بلند رکھنے کے لیے اسی منتظموں اور کارکنوں کا عمل ناگزیر ہے۔ فرض کریں کہ مستقبل کی نسلیں اپنی روحانی زندگی کو دنیاوی معاملات کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دینے لگیں' فرض کریں کہ مابعد الطبیعیات اور تصوف کے زیر اثر آج کل کی روشن خیالی کا مقام لے لیں اور وہی ذہین طبقہ جو آج مشین کا دلدادہ ہے' شیطانی قوتوں کے زیر اثر آ جاتا ہے۔ (یہ ایک ایسا اقدام ہے جو روجر بیکن سے شروع ہوا برٹرینڈ کلیرواکس تک جاری رہا)------ پھر اس عظیم ڈرامے کے اختتام میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی دانش وروں کا کھیل تھا۔ ان کے حمایتی ہاتھ صرف معاونین کا کردار ادا کرتے رہے۔

مغربی ثقافت نے دوسری ثقافتوں کی قدیم روایات کا بھی رخ بدل دیا۔ معاشیات حیات کا دریا کوئلے کی بادشاہت کی جانب رواں دواں رہا اور خام مال کے علاقوں کی طرف متوجہ ہونے لگا۔ فطرت تھک چکی ہے۔ توانائی کے موضوع پر فاؤستی ثقافت نے غلبہ پا لیا۔ فعال ارض فاؤسٹ کے حصہ دوم میں جو پہلو اختیار کیے گئے۔ وہ مہم جوئی کی اعلیٰ ترین صورت کے ترجمان ہیں------ وہ اس منصوبہ بندی کے دوران ہی مر گیا۔ کلاسیکی سلطنتوں کی اس سے بڑی طنزیہ اور مخالفانہ ہجو اس سے قبل وجود میں نہیں آئی۔ کلاسیکی فکر میں انجنیئر کا کوئی مقام نہ تھا۔ اس سے ہمیں معلوم ہو گا کہ معاشیات کے اپنے قوانین ہیں' اس میں قوتیں اور اہلیتیں' اشخاص اور اشیا کی جگہ لے لیتی ہیں۔

۳

لیکن زر کی عظمت بھی فکر و دانش کی قوتوں پر ایک حملہ ہے۔ صنعت بھی جرات آزماؤں کے میدان ہی میں شامل ہے۔ اس کا اپنا مخصوص مقام ہے اور اس کی مادی قوتیں زمین سے باہر برآمد ہوتی رہتی ہیں۔ صرف سرمایہ کاری کی بہت بڑی مقدار ہی آزاد ہو سکتی ہے اور یہ مسئلہ سمجھ میں بھی آتا ہے۔ ۱۷۸۹ء سے لے کر بینک اور ان کے ساتھ بازار حصص اس پر رضامند ہوئے ہیں کہ صنعت کو بھی اپنی ترقی کی عظیم رفتار قائم رکھنے کے لیے ادھار سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ صنعت ہر روز ترقی کی نئی نئی منزلیں طے کر رہی ہے اور ان کے نزدیک صنعت بھی ایک بڑی قوت ہے اور ان کا عزم یہ ہے (جیسا کہ ہر تہذیب میں زر کا عزم ہوتا ہے) راہ دنیا میں واحد قوت کی حیثیت حاصل کر لیں' پیداواری اور متجسس معاشیات کے مابین قدیم دور کا دنگل' اب خاموش ہو کر ذہین و فطین افراد کا موضوع بن چکا ہے اور اس کا اکھاڑہ دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں منتقل ہو چکا ہے۔ اس یاس انگیز جدوجہد کی یہ جنگ تکنیکی فکر کی اس خواہش کا نتیجہ ہے کہ وہ فکر زر کے مقابلے میں اپنی آزادی برقرار رکھ سکے

زر کی آمریت جاری ہے اور مادیت کی چوٹی تک پہنچ چکی ہے۔ یہ صورت فاؤستی ثقافت میں بھی اسی طرح قائم ہے جس طرح کہ دوسری ثقافتوں میں اور اب کچھ واقعات ظہور میں آ رہے ہیں جو صرف اس شخص کی فہم و فراست سے باہر ہیں جس نے زر کی روح کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اگر یہ کوئی مادی شے ہوتی تو اس کا وجود ہمیشہ کے لیے قائم رہتا------ لیکن چونکہ یہ ایک فکری ہیئت ہے' اس لیے یہ جونہی اپنی معاشی دنیا کو حتمی شکل دیتی ہے' خود بھی غائب ہو جاتی ہے۔ اس کے پاس کوئی سامان باقی نہیں بچتا' جس سے یہ اپنی

غذا حاصل کر سکے۔ لہٰذا یہ اپنا رخ بہادر دیہاتیوں کی طرف موڑ لیتی ہے' اور اراضی کو حرکت پذیری عطا کرتی ہے۔ اس کی فکر ہر نوع کی دستکاری کی کایا پلٹ دیتی ہے۔ آج یہ صنعت پر اپنی فتح کا اظہار کرتی ہے اور سرمایہ کار' انجینئر اور کارکن کے کاموں کو اپنا مال غنیمت سمجھتی ہے۔ مشین اپنے انسانی حذم و حشم کے ساتھ اپنے آپ کو اس صدی کی شہزادی سمجھتی ہے اور خطرہ یہ ہے کہ یہ کسی غالب قوت کے ہاتھوں چل نہ بسے۔ مگر اس کے باوجود "زر" کو بالآخر کامیابی نصیب ہو گی اور آخری آویزش کچھ دور نہیں' جس میں کہ تہذیب اپنی فیصلہ کن ہیئت اختیار کر لے گی۔ یہ آویزش زر اور خون کے درمیان ہو گی۔

قیصریت کی آمد نے زر کی آمریت اور اس کے سیاسی حریف جمہوریت کا خاتمہ کر دیا ہے۔ بڑے شہروں کی معیشت اور دلچسپیوں کی سیاسی تخلیقی قوت پر فتح کے بعد حیات کا سیاسی پہلو دونوں پر اپنی برتری اور غلبے کا اظہار کرتا ہے۔ تلوار زر پر ہمیشہ غالب رہتی ہے۔ آقا لٹیروں کے عزم کا خاتمہ کر دے گا۔ اگر ہم قوت زر کو "سرمایہ دارانہ نظام' کا نام دیں ۔" تو پھر ہمیں زندگی میں مضبوط سیاست پر مبنی معاشی نظام کو "اشتراکیت" کا نام دینا ہو گا۔ تمام طبقات کی دلچسپیوں سے ماورئی ایک ایسے نظام کی صورت میں ظاہر ہو گا جو بہت بلند فکر' ادائیگی فرائض کے جذبات سے معمور' اور ہر شے کو حسن ترتیب سے آراستہ کرے گا تاکہ تاریخ کی فیصلہ کن جنگ جیت لے اور یہ جنگ زر اور قانون کے مابین ہوگی ۔ عظیم ذرائع کے حصول کے لیے معاشیات کی نجی قوتیں ایسے راستوں کو تلاش کرتی ہیں' جن میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اس لیے کوئی قانون بھی ان کے لیے سد راہ ثابت نہیں ہو گا۔ وہ اپنے لیے خود قانون سازی کرنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے وہ اپنا خود ساختہ ہتھیار جمہوریت کو بطور فریق معاون استعمال کرتے ہیں۔ قانون کو ایسے مہلک حملوں سے بچنے کے لیے' اعلیٰ روایات اور موثر خاندانوں کی اولوالعزی درکار ہوتی ہے جو دولت کے تعاقب میں نہ بھاگیں بلکہ فرائض حکمرانی کی ادائیگی میں تسکین محسوس کریں اور اسے مال و دولت کے تمام منافع جات سے برتر سمجھیں۔ ایک قوت کو دوسری قوت ہی اپنے مقام سے ہٹا سکتی ہے۔ اسے محض اصولوں کی قوت سے نہیں ہٹایا جا سکتا۔ زر کی قوت کا مقابلہ کرنے کے لیے صرف یہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ زر کی حاکیت کو خون کی قوت سے ہٹا کر منسوخ کر دیا جائے۔ زندگی تو دو کیفیات مثبت اور منفی پر مشتمل ہے۔ کائناتی اشیا عالم صغیر پر چھائی رہتی ہیں۔ تاریخ کی دنیا میں یہ بہت بڑی صداقت ہے کہ نسلی تعلقات کے سامنے عقل و دانش کی دنیا ختم ہو جاتی ہے۔ تاریخ کی رو سے صرف زندگی ہی اہم ہے------ نسلی کیفیت عزم لی القوت ہے' عزم لی الحق کو (مورخین کے نزدیک) کوئی اہمیت نہیں۔ ایجادات اور زر کی اپنی جگہ اپنی اہمیت ہے۔ تاریخ عالم' عدالت عالم ہے اور اس نے ہمیشہ قوی' مکمل اور پُراعتماد زندگی کے حق میں فیصلے دیے ہیں------ اس کا فیصلہ زندہ رہنے کے حق میں ہوتا ہے۔ اسے اس امر کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ اس کا فیصلہ شعور بیدار کی عدالت میں برقرار رہے گا' یا نہیں۔ اس نے ہمیشہ حق و انصاف کو قوت اور نسل کے سامنے قربان کیا ہے اور ایسے لوگوں کو موت کی سزا دی یا تباہ و برباد کیا ہے' جن کے ہاں اعمال کے مقابلے میں صداقت کا عنصر زیادہ تھا بلکہ ایسی صورتوں میں بھی جن میں انصاف کا پہلو قوت سے زیادہ متاثر کن تھا۔ مگر فیصلہ قوت ہی کے حق میں ہوا اور اعلیٰ ثقافتوں کا یہی تماشا ہے------ کہ اس میں دیوی دیوتاؤں کی عجیب و غریب دنیا------ فن و فکر کا عالم------ جنگیں------ شہر------ داخلی خالص خون کی واپسی کے بعد فوراً" بند ہو جاتے

ہیں۔ یہ صورت بعینہٖ وہی ہے' جو کائنات کی مسلسل دوری گردش کی ہے۔ شاندار متخیلہ شعور بیدار اپنے آپ کو وجود کی خاموش فطرت کے حوالے کر دیتا ہے۔ چینی اور رومی سلطنتوں کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمان مکان پر غالب آ جاتا ہے اور یہ زمان ہی کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی ناقابل عفو حرکت کو اس طرح مرتب کرے' جو ثقافت کے عارضی حادثات کے مطابق ہو اور اس سطح ارضی پر جو انسان کی پناہ گاہ ہے------ انسانی حیات سب کی رہنمائی کرے اور اس کے عقب میں تمام ارضیاتی اور ستارگان کی دنیا کی تاریخ ہماری چشم بصیرت کے عالم نور کے سامنے ہو۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے' ہماری قضا و قدر 'ی ثقافت کے ساتھ وابستہ کر دی گئی ہے اور اس کی ترقی کے ان لمحات میں' جبکہ زر اپنی آخری فتوحات کی جشن آرائی میں مصروف ہے اور قیصریت جو اس کی جانشین ہو گی' آہستہ آہستہ مضبوط قدموں سے آگے بڑھ رہی ہے۔ عزم مصمم کے ساتھ 'لازماً" فوری طور پر ہم سے بالکل قریب پہنچ چکی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر شرائط کے تحت زندگی قابل برداشت نہیں رہتی۔ ہمیں یہ آزادی حاصل نہیں کہ ہم اس کا یا اس کا انتخاب کر لیں' بلکہ ہمیں یا تو لازمی فرائض بجا لانے ہوں گے یا پھر کچھ بھی نہیں کرنا ہو گا اور وہ فرض منصبی جو ہر فرد کے ذمے عائد کر دیا گیا ہے وہ اسے بجا لانا ہو گا یا پھر فیصلہ اس کے خلاف ہو جائے گا۔